SALMAN's CHOICE



چراغوں کی قطار



نام	محمد سعید راشد
نصابی تعلیم	ادبیات اردو، انگریزی اور فن تعلیم
درسگاہیں	اسلامیہ انٹر کالج بریلی، بریلی کالج بریلی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
مربی اساتذہ	جناب مبارک حسین، مولانا محمد حسین، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر داس گپتا ڈاکٹر عشرت حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں
ذہنی پس منظر	تحریک پاکستان کا دور
پیشہ	تدریس ملٹری کالج جہلم از ۱۹۵۰ء تا ۱۹۸۸ء
مشغلہ	تصنیف و تالیف
مشن	پاکستانیت کا فروغ

تصانیف و تالیفات

۱) IN SEARCH OF LIGHT
۲) RIPENESS IS ALL
۳) LEARNING TO LEAD
۴) LIVING WITH LEADERSHIP
۵) A LASTING LIGHT HOUSE
۶) حیاتِ قائداعظم
۷) گفتار و کردار قائداعظم
۸) تذکرہ اقبال
۹) مکالمات اقبال
۱۰) شاد باد منزل مراد
۱۱) تذکرۂ شہدا (جنگ ستمبر و دسمبر کے پندرہ شہیدوں کا تذکرہ)
۱۲) میجر اکرم شہید نشانِ حیدر
۱۳) کرنل حق نواز کیانی شہید ستارہ جرأت
۱۴) جرأتوں کے نشان
(پاک و ہند جنگوں کے ۲۴ جنگی اعزاز یافتہ غازیوں کا تذکرہ)
۱۵) کردار ساز
۱۶) کردار کی کرنیں
۱۷) داستانِ علم و عمل حصہ اوّل اور دوم
۱۸) علوی نامہ
۱۹) چراغوں کی قطار

چراغوں کی قطار

سعید راشد

SALMAN SALEEM
PRESENTS

تخلیق مرکز ۳۳/اے شاہ عالم گیٹ، لاہور فون ۲۵۱۸۶۷

سلمان

SALMAN SALEEM

PRESENTS

روشنی
کے
سفر
کی
داستان

ملٹری کالج جہلم

کے

کردار ساز سٹاف

(۱۹۲۵ء تا ۱۹۸۸ء)

کے حوالے سے

ناشر: عالمگیر مینزر ایسوسی ایشن

اہتمام: کرنل سلطان حیدر

کاتب: محمد اسلم کیلیانوالہ

پرنٹرز: نیا پیام پرنٹرز ۶۔سی دربار مارکیٹ لاہور
فون: ۲۲۸۶۹۰

تعداد ۱۲۵۰

سنِ اشاعت: اگست ۱۹۹۰ء

انتساب

پاکستان کے ان تمام استادوں کے نام جو ناقدری کی ایک عمومی فضا اور
نامساعد حالات میں تخلیقی معلمی کے ساتھ ساتھ پاکستان کے حوالے سے کردار سازی
کی خدمت عظیم بھی انجام دے رہے ہیں۔ گویا آندھیوں میں چراغ جلا رہے ہیں یہ لوگ!
قوم و ملک کے ان خاموش اور گمنام پرعزم اور باحوصلہ، پس منظر کے معماروں اور
حقیقی محسنوں کو میرا سلام پہنچے۔ صبح و شام!

راشد

عنوانات

پہلا باب

خادم حسین

۵۔ صوبیدار فیض محمد خاں

کیپٹن محمد زر

میجر محمد نواز

بریگیڈیئر محمد عباس بیگ

۶۔ رسالدار میجر ایم اے لطیف ایم اے

میجر محمد نواز

بریگیڈیئر محمد حیات

بریگیڈیئر رب نواز

لیفٹیننٹ کرنل محمد گلشیر

لیفٹننٹ کرنل خوشی محمد

لیفٹیننٹ جنرل رحمان گل ایم سی ستارہ پاکستان

میجر گل حیدر خان

لیفٹیننٹ کرنل شیر محمد ستارہ جرأت

۷۔ صوبیدار ولایت شاہ

لیفٹیننٹ کرنل خداداد خان

۸۔ صوبیدار جعفر شاہ

لیفٹیننٹ جنرل رحمان گل ایم سی

لیفٹیننٹ کرنل محمد گلشیر

بریگیڈیئر امیر خان

پروفیسر سعید راشد

۹۔ محمد بخش کمپاؤنڈر

بریگیڈیئر محمد حیات

۱۰- کریم بخش مالی

صوبیدار میجر حق نواز

بریگیڈیر رب نواز

۱۱- چوکیدار غزن خان

میجر مولا بخش

۱۲- کیپٹن ایچ ایچ کلارک

بریگیڈیئر محمد عباس بیگ

۱۳- مسز کلارک

صوبیدار میجر خداداد خان

۱۴- وارنٹ آفیسر مسٹر ایٹن

کمانڈر محمد نواز

بریگیڈیئر محمد عباس بیگ

لیفٹیننٹ کرنل محمد گلشیر

۱۵- مولوی محمد یوسف

لیفٹیننٹ کرنل فضل الرحمان ایم سی

۱۶- رسالدار میجر احمد علی خان

میجر گل حیدر خان

۱۷- کیپٹن (لیفٹیننٹ کرنل) ولیم فلپ سیلی ایم اے، ایم سی، ایم بی ای، اے ای سی

بریگیڈیئر محمد حیات

بریگیڈیئر محمد عباس بیگ

صوبیدار میجر جمروز خان

لیفٹیننٹ کرنل محمد گلشیر

لیفٹیننٹ جنرل رحمان گل ایم سی

میجر حبیب خان

میجر جنرل محمد جمشید ستارہ جرأت، ایم سی (ویمبلڈن)

کرنل حضور احمد خاں ایم سی

بریگیڈیئر امیر خاں

صوبیدار سردار بیگ

بریگیڈیئر امیر جان

بریگیڈیئر محمد صادق خان

میجر جنرل محمد بشیر خان

بریگیڈیئر سید اکابر حسین

لیفٹیننٹ کرنل اورنگ زیب خاں

بریگیڈیئر عطا محمد خان ستارہ پاکستان

بریگیڈیئر محمد اقبال

میجر محمد حسین

بریگیڈیئر اکرم ظفر

۱۸- مسز سیلبی

بریگیڈیئر رب نواز

لیفٹیننٹ جنرل رحمان گل

لیفٹیننٹ کرنل محمد گلشیر

شہزادہ ہارون اسماعیل

۱۹- تاج بگلر

لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد

بریگیڈیئر محمد اسلم جنجوعہ

۲۰۔ صوبیدار سید عالم شاہ

کرنل حضور احمد خان ایم سی

بریگیڈیئر امیر خان

۲۱۔ صوبیدار ڈاکٹر نصیر الدین

لیفٹیننٹ کرنل اورنگ زیب خان

۲۲۔ جمعدار منگا خان

کرنل حضور احمد خان ایم سی

صوبیدار سردار بیگ

لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد ستارہ جرأت

۲۳۔ حوالدار اولیاء خان

صوبیدار سردار بیگ

لیفٹیننٹ کرنل اورنگ زیب خان

۲۴۔ مسٹر بشیر احمد

لیفٹیننٹ کرنل محمد گلشیر

میجر حبیب خان

بریگیڈیئر امیر خان

۲۵۔ دفعدار آغا علی احمد شاہ

لیفٹننٹ کرنل اورنگ زیب خان

لیفٹیننٹ کرنل خداداد خان

مسٹر عبدالغنی

۲۶۔ صوبیدار سکندر خان

لیفٹیننٹ کرنل شیر محمد ستارہ جرأت

کیپٹن محمد فیروز ملک

لیفٹیننٹ کرنل اورنگ زیب خان

میجر جنرل محمد بشیر خان

لیفٹیننٹ کرنل خداداد خان

مسٹر عبدالغنی

لیفٹیننٹ کرنل احمد خان ستارۂ جرأت

مسٹر محمد افضل کیانی

۲۷۔ رسالدار میجر کامیاب خان

کرنل حضور احمد خاں

میجر جنرل محمد بشیر خاں

مسٹر عبدالغنی

صوبیدار صالح محمد

۲۸۔ وارنٹ آفیسر ٹرنر

بریگیڈیئر امیر خاں

۲۹۔ صوبیدار انور شاہ

بریگیڈیئر محمد صادق

لیفٹیننٹ کرنل شاہ محمد

مسٹر عبدالغنی

بریگیڈیئر عطا محمد

۳۰۔ لیفٹیننٹ کرنل ٹی ایچ ایل سٹیبنگ ایم اے، ایم سی، او بی ای

لیفٹیننٹ کرنل محمد وزیر خاں ملک

صوبیدار میجر فتح خان

مسٹر فضل حق حیدری

مسٹر نواب دین انصاری

کرنل حضور احمد خاں ایم سی

صوبیدار سردار بیگ

کیپٹن محمد فیروز ملک

بریگیڈیر محمد صادق، اسلام آباد

میجر جنرل محمد بشیر خاں

لیفٹیننٹ کرنل اورنگ زیب خان

لیفٹیننٹ کرنل خدا داد خاں

لیفٹیننٹ کرنل شاہ محمد امتیازی سند

کیپٹن عبدالرحمان

مسٹر عبد الغنی انجینئر

بریگیڈیر عطا محمد خاں ستارۂ پاکستان

بریگیڈیر بشیر احمد

بریگیڈیر محمد اقبال

لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین ملک ستارۂ جرأت

بریگیڈیر محمد حیات ستارۂ جرأت

لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد کیانی ستارۂ جرأت

میجر محمد حسین

میجر محمد اسلم

لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی ستارۂ جرأت دو بار

لیفٹیننٹ کرنل احمد خان ستارۂ جرأت

میجر جنرل ممتاز علی ستارۂ جرأت دو بار

لیفٹیننٹ کرنل اصغر علی راجہ ستارۂ جرأت

میجر جنرل غلام محمد۔ ہلال پاکستان

لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین بھٹی

لیفٹیننٹ کرنل محمد فرید ملک

لیفٹیننٹ کرنل رحیم اللہ

لیفٹیننٹ کرنل محمد یعقوب ملک ستارۂ جرأت

بریگیڈیئر محمد صادق خان

میجر ابرار حسین

بریگیڈیئر محمد خان

جنرل محمد اقبال خان، نشان امتیاز (ملٹری) ستارۂ بسالت

بریگیڈیئر محمد اسلم جنجوعہ ستارۂ جرأت

بریگیڈیئر محمد اکرم ظفر

کیپٹن سید شہزادہ عالم

ائیر چیف مارشل ذوالفقار علی خان نشان امتیاز (ملٹری)

لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال، ہلال امتیاز، ستارۂ بسالت

لیفٹیننٹ جنرل محمد صفدر، ہلال امتیاز، ستارۂ بسالت

۳۱۔ مسز کرنل سٹیبنگ

کرنل محمد وزیر خان ملک

مسٹر این ڈی انصاری

کرنل حضور احمد خان ایم سی

لیفٹیننٹ کرنل خداداد خان

بریگیڈیئر بشیر احمد

شہزادہ ہارون اسماعیل

بریگیڈیئر محمد اقبال

مسز وزیر سلطانہ ملک

مسز پروین ملک

۳۲۔ وارنٹ آفیسر لیوس

کیپٹن محمد فیروز ملک

میجر جنرل محمد بشیر خان

بریگیڈیر عطا محمد خان

لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد کیانی

کرنل محمد وزیر خاں ملک

۳۳۔ مسز لیوس

کیپٹن محمد فیروز ملک

لیفٹیننٹ کرنل خداداد خان

۳۴۔ کرنل محمد وزیر خان ملک

لیفٹیننٹ کرنل منصبدار خاں

۳۵۔ صوبیدار فتح خاں

بریگیڈیر محمد اسلم جنجوعہ ستارۂ جرأت

۳۶۔ حوالدار میجر نذر حسین

لیفٹیننٹ کرنل منصبدار خان

۳۷۔ وارنٹ آفیسر ہے ہرسٹ

میجر محمد حسین

۳۸۔ رسالدار عبدالوہاب خاں

مسٹر عبدالغنی

بریگیڈیر عطا محمد خان

میجر محمد حسین

سید شہزادہ عالم

خادم حسین

واجد علی واجد

۳۹۔ صوفی عزیز احمد

بریگیڈیئر محمد اقبال

لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد کیانی ستارۂ جرأت

بریگیڈیئر اکرم ظفر

مسٹر محمد اعظم خان

بریگیڈیئر امتیاز احمد ستارۂ جرأت

کرنل محمد یامین

شربت خان محسود

۴۰۔ جناب فضل حق حیدری

لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد کیانی ستارۂ جرأت

میجر عاقل داد ستارۂ جرأت

شہزادہ ہارون اسماعیل

بریگیڈیئر محمد صادق خان

میجر ابرار حسین

بریگیڈیئر محمد اکرم ظفر

سید عترت حسین

لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال

ائیر چیف مارشل ذوالفقار علی خان

میجر محمد رفیق

تنویر احمد سید

بشیر احمد مرزا

لیفٹیننٹ جنرل محمد صفدر

خادم حسین چودھری

محمد زمان بھٹی

محمد یونس کیانی

بریگیڈئر سلطان احمد

کیپٹن (نیوی) محمد جمیل خان

واجد علی

شربت خاں محسود

بریگیڈئر امتیاز احمد ستارۂ جرأت

میجر اختر حسین

بریگیڈئر عبدالرزاق

لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر

لیفٹیننٹ کرنل سردار محمد

لیفٹیننٹ کرنل خالد محمود کیانی

سلیم اختر کیانی

نثار کیانی

لیفٹیننٹ کرنل اقبال شاہین

بریگیڈئر مقصود الحسن

ڈاکٹر مقصود الحسن نوری پی ایچ ڈی

بریگیڈئر محبوب المظفر

کرنل منیر چوہان

لیفٹیننٹ کرنل اعجاز رفیع

لیفٹیننٹ کرنل خالد مسعود

میجر ساجد مجید بھٹی

میجر جاوید اقبال ملک

میجر وجاہت حسین

میجر شاہد وہاب راؤ

رفقاء کار:

میجر عبدالرشید اے ای سی

پروفیسر سعید راشد

۴۱۔ مسٹر انصاری، نند لال اور مسٹر کمار

لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین بھٹی

۴۲۔ مسٹر اشوک سنگھ

میجر ابرار حسین

۴۳۔ حوالدار کرم داد پی ٹی انسٹرکٹر

لیفٹیننٹ کرنل احمد خان ستارۂ جرأت

۴۴۔ حوالدار میجر محمد عنایت

بریگیڈیئر محمد اسلم جنجوعہ ستارۂ جرأت

۴۵۔ بھر تو مہتر

لیفٹیننٹ کرنل رشید کیانی ستارۂ جرأت

۴۶۔ مسز کمار

لیفٹیننٹ کرنل محمد فرید ملک

۴۷۔ کیپٹن جائلز

لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال ہلال امتیاز، ستارۂ بسالت

۴۸۔ احمد صاحب

صوبیدار فتح محمد خان

۴۹۔ وی ٹی صاحب

بریگیڈیئر اکرم ظفر

۵۰۔ صوبیدار عبدالمغنی کوارٹر ماسٹر

لیفٹیننٹ کرنل محمد اکرم

لیفٹیننٹ جنرل محمد صفدر

مسٹر شہاب الدین

لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال

۵۱۔ کالاخان۔ سٹور اردلی

میجر عبدالجبار

۵۲۔ مسٹر محفوظ اور مسٹر مدن لال

ائر چیف مارشل ذوالفقار علی خان

۵۳۔ سارجنٹ شا

سید شہزادہ عالم

مسٹر عترت حسین

۵۴۔ شمسی برادران

بریگیڈیئر اکرم ظفر

۵۵۔ مسٹر سلطان حسین شمسی

لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال

مسٹر محمد زمان بھٹی

کرنل محمد یونس

کیپٹن (نیوی) محمود علی ڈوگر

۵۶۔ سارجنٹ بروئبرو

مسٹر محمد زمان بھٹی

۵۷۔ سارجنٹ کوری

بریگیڈئر محمد اشرف

۵۸۔ میجر ہولڈین

مسٹر محمد زمان بھٹی

میجر جنرل غلام محمد

شہزادہ ہارون اسماعیل

۵۹۔ مسز ہولڈین

میجر جنرل غلام محمد

لیفٹیننٹ کرنل محمد فرید ملک

۶۰۔ کیپٹن ڈاکٹر شام لال

بریگیڈئر محمد خان

۶۱۔ میٹرن مس سدھو

میجر ابرار حسین

کرنل محمد وزیر خاں ملک

دُوسرا باب

۱۹۴۷ — ۸۷

۱۔ کیپٹن عبدالحمید ابراہیم اے ای سی

میجر عبدالجبار

بریگیڈیئر محمد اکرم ظفر

ائر چیف مارشل ذوالفقار علی خان

بشیر احمد مرزا

کرنل محمد یونس

لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین

لیفٹیننٹ کرنل محمد یونس

شوکت جنجوعہ

کرنل محمد افضل خان

۲۔ جناب اقبال احمد

میجر ابرار حسین

لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال

بریگیڈیئر محمد اشرف

بشیر احمد مرزا

محمد اعظم خاں

لیفٹیننٹ جنرل محمد صفدر

محمد زمان بھٹی ایڈووکیٹ

کرنل محمد یونس

لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین

محمد لطیف ڈی ایس پی
بریگیڈیئر سلطان احمد ستارۂ جرأت دو بار
علی اختر
لیفٹیننٹ جنرل رحمدل بھٹی
واجد علی
لیفٹننٹ جنرل محمد اشرف
میجر راؤ عبدالقادر

۳۔جناب عبدالحمید قریشی

محمد اعظم خان
لیفٹیننٹ کرنل خالد اسماعیل قاضی
شاہد احمد بھٹہ بی سی ایس

۴۔قدوس صاحب اکاؤنٹنٹ

میجر عبدالرشید اے ای سی
سعید احمد شاہ صاحب
جعفر علی صاحب
مختار احمد صاحب

۵۔جناب محمد ایوب خان

شوکت جنجوعہ
لیفٹیننٹ کرنل اقبال شاہین
لیفٹیننٹ کرنل شمیم احمد جاوید
لیفٹیننٹ کرنل خالد اسماعیل قاضی
قمر الٰہی (پٹارو)

۶۔ جناب زیڈ اے صدیقی

محمد زمان بھٹی

محمد لطیف ڈی ایس پی

بریگیڈیئر سلطان احمد ستارہ جرأت دوبار

۷۔ جناب مرزا عبدالحمید

بریگیڈیئر محمد مشتاق

۸۔ جناب مفتاح الدین ظفر

بریگیڈیئر محمد اکرم ظفر

لیفٹیننٹ کرنل غلام فرید کیانی

۹۔ جناب مظہر علی خاں

کیپٹن محمد امین

خادم حسین

کرنل محمد یونس

لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین

بریگیڈیئر سلطان احمد ستارہ جرأت دوبار

کرنل محمد افضل خاں

واجد علی

نثار کیانی

لیفٹیننٹ کرنل اعجاز احمد

کیپٹن (نیوی) محمود علی

ڈاکٹر فاروق احمد

بریگیڈیئر غلام علی

بریگیڈیئر یعسوب علی ڈوگر

میجر طارق حبیب

میجر خالد اسماعیل قاضی

میجر ساجد مجید بھٹی

میجر عبدالرشید اے ای سی

۱۰۔ کیپٹن منظور الرحمان اے ای سی

سید عترت حسین

محمد زمان بھٹی ایڈووکیٹ

لیفٹیننٹ کرنل محمد یونس ستارۂ جرأت

میجر گل بادشاہ۔ آصف سعید راشد

بریگیڈیر سلطان احمد ستارۂ جرأت دو بار

۱۱۔ جناب سراج احمد علوی

محمد زمان بھٹی

میجر گل بادشاہ

راجہ محمد افضل

محمد یونس کیانی

واجد علی

۱۲۔ محترمہ مسز کارنیلئس

شربت خاں محسود

لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر

بریگیڈیر یعسوب علی ڈوگر

میجر عبدالرشید، اے ای سی

۱۳۔ کیپٹن ستار بخش ملک اے ای سی

بریگیڈیر محمد اکرم ظفر

۱۴- جناب سید آفاق احمد

بریگیڈیر محمد اکرم ظفر

سید عترت حسین

لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال

تنویر احمد سید

۱۵- کیپٹن محمد شفیع اے ای سی

خادم حسین

کرنل محمد یونس

لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین

۱۶- جمعدار میر حیدر علی سخی اے ای سی

تنویر احمد سید

۱۷- صوبیدار عریف الحسن

خادم حسین

۱۸- کیپٹن محمد اسماعیل اے ای سی

محمد اعظم خان

لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین

منصور احمد

بریگیڈیر سلطان احمد ستارہ جرأت دو بار

۱۹- جناب ماجد حسین صدیقی

لیفٹیننٹ کرنل سردار خاں

۲۰- جناب ریحان احمد بلگرامی

شوکت جنجوعہ

واجد علی

لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر

سلیم اختر کیانی

بریگیڈئر یعسوب علی ڈوگر

لیفٹیننٹ کرنل شمیم احمد جاوید

میجر عبدالرشید اے ای سی

۲۱۔ قادر بخش مالی

پروفیسر سعید راشد

۲۲۔ قاضی عبدالحکیم صاحب

بریگیڈئر عبدالرزاق

کرنل اخلاق احمد

۲۳۔ جناب برکت علی چوہان

بریگیڈئر عبدالرزاق

۲۴۔ جناب محمد حسین

منظور حسین

لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر

ڈاکٹر سرفراز مرزا

لیفٹیننٹ کرنل منیر افضل پراچہ

لیفٹیننٹ کرنل اعجاز احمد

بریگیڈئر محمد مشتاق

لیفٹیننٹ کرنل شمیم احمد جاوید

بریگیڈئر غلام علی

بریگیڈئر یعسوب علی ڈوگر

۲۵۔ جناب قاضی حامد علی

حسن اختر کیانی

کرنل محمد یامین

۲۶۔ جناب شفیق احمد

لیفٹیننٹ کرنل محمد ایوب

سید زمان خان

بریگیڈیئر یعسوب علی ڈوگر

لیفٹیننٹ کرنل محمد اقبال اکبر خان

سید شاہین پرویز

میجر وجاہت حسین

میجر نوشاد حمید

میجر اختر نواز

ڈاکٹر تنویر الحق گھمن

کیپٹن محسن عباس

میجر علی طاہر سید

کیپٹن طارق محمود

میجر حسن منصور شیرازی

۲۷۔ حوالدار پہلوان خان

لیفٹیننٹ جنرل پیر داد خان ستارۂ جرأت

لیفٹیننٹ جنرل محمد اشرف

میجر جنرل نذر حسین

بریگیڈیئر عبدالرزاق

کرنل اخلاق احمد

۲۸۔ جمعہ لانگری

شربت خان محسود

۲۹۔ کیپٹن این۔ڈی۔احمد

بریگیڈئر عبدالرزاق

لیفٹیننٹ کرنل محمد اسحاق

شاہد احمد بھٹہ

پروفیسر سعید راشد

۳۰۔ کیپٹن واصف علی

سید زمان خان

پروفیسر سعید راشد

۳۱۔ کیپٹن اے اے مختار، اے ای سی

راجہ محمد اعظم خان

کیپٹن (ریٹائرڈ) محمود علی ڈوگر

۳۲۔ میجر عبدالعزیز ہاشمی اے ای سی

نثار کیانی

میجر عبدالرشید اے ای سی

۳۳۔ کیپٹن آئی آر صدیقی اے ای سی

لیفٹیننٹ کرنل اعجاز رفیع

چیف وارنٹ آفیسر فضل کریم

لیفٹیننٹ کرنل ذوالفقار ارشد۔ تمغہ بسالت

ونگ کمانڈر ارشاد نواز

میجر ساجد مجید بھٹی

۳۴۔ کیپٹن اعجاز اکبر

منظور حسین

چیف وارنٹ آفیسر فضل کریم

ہارون رشید

میجر ساجد مجید بھٹی

۳۵۔ لیفٹیننٹ شاہد محمد احمد اے ای سی

منظور حسین

لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر

سید زمان خان

۳۶۔ کیپٹن آغا نسیم

کرنل اخلاق احمد

لیفٹیننٹ کرنل شمیم احمد جاوید

۳۷۔ کیپٹن عبدالرشید اے ای سی

کرنل اخلاق احمد

لیفٹیننٹ کرنل اعجاز رفیع

پروفیسر سعید راشد

۳۸۔ مسٹر عبدالرشید

لیفٹیننٹ کرنل اقتدار علی

چیف وارنٹ آفیسر فضل کریم

عرفان الرشید

میجر نوشاد حمید

لیفٹیننٹ زاہد نسیم اکبر

لیفٹیننٹ ساجد شکور

۳۹۔ جناب توقیر افضل

لیفٹیننٹ کرنل اعجاز رفیع

لیفٹیننٹ کرنل ذوالفقار ارشد

۴۰۔ لیفٹیننٹ عبدالغفور

سی، ڈبلیو آر فضل کریم

۴۱۔ جناب مصطفٰے کمال

ونگ کمانڈر ارشد نواد

میجر وجاہت حسین

۴۲۔ کیپٹن غلام سرور اے ای سی

کرنل اخلاق احمد

کمانڈر عبدالسلام قدوس

لیفٹیننٹ کرنل افتخار حسین شاہ

۴۳۔ لیفٹیننٹ احسان الحق

چیف وارنٹ آفیسر فضل کریم

۴۴۔ میجر عبدالرحمان اے ای سی

لیفٹیننٹ کرنل اقتدار علی

۴۵۔ میجر محمد عارف چوہان

ڈاکٹر زبیر خورشید

۴۶۔ کیپٹن محمد بشیر (چچا) اے ای سی

لیفٹیننٹ کرنل اعجاز رفیع

ہارون رشید

۴۷۔ فضل حسین شاہ میس ویٹر

میجر عبدالرشید اے ای سی

۴۸۔ نور حسین صاحب چپراسی

میجر عبدالرشید اے ای سی

۴۹۔ خوشاسپ خان صاحب گیٹ کیپر

محمد رفیق

۵۰۔ عبدالرحمٰن صاحب ککّ

میجر عبدالرشید اے ای سی

۵۱۔ مسٹر سیموئیل سوبئیر

ڈاکٹر محمد سرفراز عالم

پروفیسر سعید راشد

۵۲۔ صوبیدار عبداللہ اے ای سی

میجر ظفر اقبال

۵۳۔ آر۔پی حوالدار خان بہادر

میجر پرویز خالد

۵۴۔ میجر محمد الیاس اے ای سی

شاہد احمد بھٹہ پی سی ایس

۵۵۔ کرنل ظہور الحق

جناب محمد ایوب خان

۵۶۔ میجر غلام عباس اے ای سی

کیپٹن شوکت چاندنا۔

۵۷۔ کرنل ایم اکرام امین

میجر جاوید مجتبیٰ

کیپٹن رانا شرافت علی

مسعود راشد

کیپٹن احسان الحق

کیپٹن شوکت چاندنا

کیپٹن جمیل سرور

ڈاکٹر زبیر خورشید

پروفیسر سعید راشد

مسٹر مختار احمد

تیسرا باب

لیفٹیننٹ کرنل محمد رفیق[1]

۱۔ میجر عمر حیات

۲۔ کرنل محمد افضل جنجوعہ

۳۔ میجر محمد صفدر

۴۔ تنویر احمد سید

۵۔ محمد اعظم خان

۶۔ بریگیڈیئر محمد مشتاق

۷۔ میجر محمد صادق

۸۔ کرنل محمد یونس

۹۔ محمد احمد

۱۰۔ لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین

۱۱۔ بریگیڈیئر محمد اکرم

۱۲۔ عبدالحفیظ

۱۳۔ لیفٹیننٹ کرنل مہدی حسن

۱۴۔ راجہ محمد افضل

۱۵۔ محمد یونس کیانی

۱۶۔ بریگیڈیئر سلطان احمد ستارہ جرأت

۱۷۔ لیفٹیننٹ جنرل پیرداد خان ستارہ جرأت

---

[1] کمانڈانٹ ملٹری کالج ۵۳-۱۹۵۲ء ۵۹-۱۹۵۵ء

۱۸۔ میجر نصیر احمد

۱۹۔ صوبیدار محمد اکرم

۲۰۔ شوکت جنجوعہ

۲۱۔ میجر جنرل محمد اکرم

۲۲۔ میجر محمد اختر

۲۳۔ محمد عنایت بھٹی

۲۴۔ لیفٹیننٹ جنرل رحمدل بھٹی

۲۵۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد قربان

۲۶۔ بریگیڈیئر سلطان جہانگیر

۲۷۔ کموڈور سجاد حیدر

۲۸۔ بریگیڈیئر عبدالرؤف

۲۹۔ بریگیڈیئر محمد ایوب ملک

۳۰۔ لیفٹیننٹ کرنل عطا محمد

۳۱۔ لیفٹیننٹ کرنل سردار خان

۳۲۔ ڈاکٹر سرفراز مرزا پی ایچ ڈی

۳۳۔ میجر جنرل طارق نظامی

۳۴۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد سعید ستارۂ جرأت

۳۵۔ ایم گلستان خان

۳۶۔ بریگیڈیئر سعید اختر

۳۷۔ بریگیڈیئر محمد اقبال

۳۸۔ شربت خان محسود

۳۹۔ لیفٹیننٹ جنرل محمد اشرف

۴۰۔ راجہ حامد نواز

۴۱۔ ڈاکٹر محمد خان پی ایچ ڈی

۴۲۔ بریگیڈیئر رب نواز خان

۴۳۔ بریگیڈیئر امتیاز احمد ستارہ جرأت

۴۴۔ محمد اعظم

۴۵۔ میجر جنرل نذر حسین

۴۶۔ سید زمان خان

۴۷۔ تنویر حسین شاہ

۴۸۔ میجر اختر حسین

۴۹۔ بریگیڈیئر عبدالرزاق

۵۰۔ لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر

۵۱۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد زمان

۵۲۔ رسول خان

۵۳۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد اسحاق

۵۴۔ لیفٹیننٹ کرنل عبدالجلیل

۵۵۔ لیفٹیننٹ کرنل منیر افضل

۵۶۔ کیپٹن (نیوی) گل زمان ملک ستارہ جرأت

۵۷۔ کیپٹن (نیوی) سکندر حیات ستارہ جرأت

۵۸۔ سلیم اختر کیانی

۵۹۔ کرنل اخلاق احمد

۶۰۔ نثار کیانی

۶۱۔ لیفٹیننٹ کرنل اعجاز احمد

۶۲۔ لیفٹیننٹ کرنل اقبال شاہین

۶۳۔ ضمیر حسین

۶۴۔ کیپٹن (نیوی) محمود علی ڈوگر

۶۵۔ محمد ایوب ملک

۶۶۔ میجر محمود اختر شاہین

۶۷۔ اصغر علی خان

۶۸۔ ڈاکٹر فاروق احمد

۶۹۔ محمد یونس

۷۰۔ لیفٹیننٹ کرنل عبدالمجید

۷۱۔ لیفٹیننٹ کرنل نصیر عابد

۷۲۔ بریگیڈیئر نعیم اکبر خان

۷۳۔ بریگیڈیئر مقصود الحسن

۷۴۔ ڈاکٹر مقصود الحسن نوری پی ایچ ڈی

۷۵۔ ممتاز اختر

۷۶۔ نصیر پراچہ

۷۷۔ میجر سلیم اصغر

۷۸۔ تاج محمد خٹک

۷۹۔ بریگیڈیئر ذوالفقار علی شاہ

۸۰۔ لیفٹیننٹ کرنل اعجاز رفیع

۸۱۔ بریگیڈیئر غلام علی

۸۲۔ بریگیڈیئر یعسوب علی ڈوگر

۸۳۔ محمد رشید

رفقاء کار

۱۔ جناب فضل حق حیدری
۲۔ میٹرن مسز کارنیلس
۳۔ جناب عبدالحمید قریشی
۴۔ جناب محمد ایوب خان
۵۔ بریگیڈیر محمد شفیع
۶۔ ریحان احمد صاحب بلگرامی
۷۔ میر کارواں کی یادیں۔ پروفیسر عین الدین علوی
۸۔ کیپٹن سید واصف علی
۹۔ میجر عبدالعزیز ہاشمی
۱۰۔ بریگیڈیر آئی آر صدیقی
۱۱۔ لیفٹیننٹ کرنل جی آر تسنیم
۱۲۔ پروفیسر سعید راشد
۱۳۔ تاج (بیگلر)
۱۴۔ نادر خاں (مالی)
۱۵۔ صادق مسیح (ہیڈ سوئیپر)

چوتھا باب

(پروفیسر عین الدین علوی)

پروفیسر علوی کا خاندانی اور ذہنی پس منظر

انٹرویو از پروفیسر فخرالدین علوی

پروفیسر علوی ملٹری کالج میں

انٹرویو از پروفیسر سعید راشد

پروفیسر علوی عالمگیزیر کی نظر میں

۱۔ لیفٹیننٹ کرنل اورنگزیب خان

۲۔ حسن اختر کیانی

۳۔ جنرل محمد اقبال خان

۴۔ لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال

۵۔ شوکت جنجوعہ

۶۔ لیفٹیننٹ جنرل آر ڈی بھٹی

۷۔ واجد علی

۸۔ لیفٹیننٹ کرنل سردار خان

۹۔ ڈاکٹر سرفراز مرزا پی ایچ ڈی

۱۰۔ میجر جنرل طارق نظامی

۱۱۔ محمد سرور خان

۱۲۔ شربت خان محسود

۱۳۔ لیفٹیننٹ جنرل محمد اشرف

۱۴۔ محمد اعظم

۱۵۔ میجر اختر حسین

۱۶۔ بریگیڈئر عبدالرزاق

۱۷۔ ارشد رانا

۱۸۔ لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر

۱۹۔ سلیم اختر کیانی

۲۰۔ کرنل اخلاق احمد

۲۱۔ نثار کیانی

۲۲۔ لیفٹیننٹ کرنل اعجاز احمد

۲۳۔ لیفٹیننٹ کرنل اقبال شاہین

۲۴۔ لیفٹیننٹ کرنل غلام سرور

۲۵۔ کمانڈر غلام مصطفےٰ کیانی

۲۶۔ لیفٹیننٹ کرنل احمد شاہد پرویز

۲۷۔ محمد ایوب خان ملک

۲۸۔ بریگیڈئر محمد مشتاق

۲۹۔ لیفٹیننٹ کرنل شمیم احمد جاوید

۳۰۔ لیفٹیننٹ کرنل عبدالمجید

۳۱۔ بریگیڈئر مقصود الحسن

۳۲۔ ڈاکٹر مقصود الحسن نوری پی ایچ ڈی

۳۳۔ بریگیڈیئر یعسوب علی ڈوگر

۳۴۔ لیفٹیننٹ کرنل افتدار علی

۳۵۔ کیپٹن مشتاق فرید

۳۶۔ لیفٹیننٹ کرنل ذوالفقار ارشد

۳۷۔ لیفٹیننٹ کرنل نثار احمد

۳۸۔ ہارون رشید

۳۹۔ لیفٹیننٹ کرنل اسد کمال خان

۴۰۔ میجر شیخ حسین

۴۱۔ میجر عبدالغفور

۴۲۔ نوید ابرار

۴۳۔ میجر محمد خالد سعید

۴۴۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد اقبال اکبر

۴۵۔ لیفٹیننٹ کرنل سید افتخار حسین شاہ

۴۶۔ لیفٹیننٹ کرنل خالد اسماعیل قاضی

۴۷۔ میجر ساجد مجید بھٹی

۴۸۔ محمد ضرار

۴۹۔ اصغر نواز کیانی

۵۰۔ میجر وجاہت حسین

۵۱۔ شاہد سہیل

۵۲۔ کیپٹن اختر نواز

۵۳۔ کیپٹن احسان الحق

۵۴۔ محمد آصف خان

۵۵۔ کیپٹن شجاعت علی قاضی

۵۶۔ سید اختر عباس

۵۷۔ کیپٹن حسین عباس

۵۸۔ کیپٹن امجد کیانی

۵۹۔ کیپٹن منصور شیرازی

۶۰۔ کیپٹن فاروق احمد صدیقی

۶۱۔ کیپٹن خالد محمود

۶۲۔ ناصر محمود اعوان

۶۳۔ خرم حسنین ہمدانی

۶۴۔ لیفٹیننٹ سہیل فاروق

۶۵۔ لیفٹیننٹ زاہد محمود

۶۶۔ آصف سعید راشد

۶۷۔ ابرار حسین

۶۸۔ ذوالفقار احمد

۶۹۔ یاسر منیر بٹ

۷۰۔ عاکف مشتاق

۷۱۔ عنایت حسین

۷۲۔ محمد قمر الاسلام

۷۳۔ جمیل احمد

رفقاء کار کی نظر میں

میجر جنرل عبدالمجیب چوہدری

کرنل این ڈی احمد

میجر عبدالرشید

جناب محمد لطیف عباسی

پروفیسر محمد مشتاق

کیپٹن غلام فرید

خطیب جناب عبدالغفار

بریگیڈیئر عثمان شاہ

لیفٹیننٹ کرنل نصراللہ خان خٹک

پروفیسر سعید راشد

پیش لفظ

انسان کی تہذیبی تاریخ کا یہ ایک مسلمہ اصول اور مشاہدہ ہے کہ مستحکم قومی ادارے ہی قوموں اور ملکوں کو صحیح معنوں میں مستحکم و ترقی پذیر بناتے ہیں اور قومی اداروں میں، تعلیمی ادارے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی مضبوطی یا کمزوری سے ملک کے تمام دوسرے سماجی، سیاسی اور معاشی ادارے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں بلاشبہ، جیساکہ ہم سب جانتے ہیں، مرکزی حیثیت ان کے اساتذہ کو حاصل ہوتی ہے۔ تعلیمی اداروں کے لیے وسیع و عریض سبزہ زاروں، بلند و بالا عمارات، بام و در کی آرائش، بہتر رہائشی سہولتیں، تدریس کا وافر امدادی سامان اور اعلیٰ امتحانی نتائج ان سب چیزوں کی اہمیت و ضرورت اپنی جگہ لیکن بڑے تعلیمی ادارے بڑے اساتذہ سے بنتے ہیں اور بڑے استاد وہ ہوتے ہیں جو "خبر" ہی میں نہیں "نظر" میں بھی یکتا ہوں۔ پاکستان ایسی نظریاتی مملکت میں اساتذہ کا کتابی علم ہی نہیں، ان کا سوزِ دروں بھی اہمیت رکھتا ہے تاکہ وہ تعلیم کے معلوماتی پہلو کے ساتھ ساتھ تعلیم کے اقداری پہلو پر بھی پوری توجہ دے سکیں۔ آدمی عمل طبعی سے پیدا ہوتا ہے لیکن انسان تہذیبی عمل سے بنتا ہے اور آدمی کو انسان وہی بنا سکتا ہے جو اقبال کے الفاظ میں "مردِ خود آگاہ" ہی نہیں "خدا مست" بھی ہو۔

پروفیسر سعید راشد کی زیرِ نظر تالیف "چراغوں کی قطار" ایسے ہی اساتذہ کے بارے میں لکھی گئی ہے جو ملک کے ایک اہم اور معروف تعلیمی ادارے "ملٹری کالج جہلم" میں برسہا برس لیتے طلباء کے ذہنوں کو روشنی اور دلوں کو گرمی دیتے رہے، جنہوں نے رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلام اور پاکستان کے حوالے سے کردار سازی بلکہ شخصیت سازی پر بھی بھرپور توجہ دی اور یوں بالواسطہ طور پر پاکستان کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔

اساتذہ کی تعلیم و تکریم ہمیشہ سے ہماری تہذیب کی ایک روایت بلکہ شناخت رہی ہے، لیکن ادھر کچھ عرصے سے یہ روایت کمزور پڑ گئی ہے۔ پروفیسر سعید راشد کی یہ کتاب اس

لحاظ سے تازہ ہوا کا ایک جھونکا ہے کہ اس میں یہ روایت زندہ اور تابندہ نظر آتی ہے غالباً اپنی نوعیت کی اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں متعدد شاگردوں نے اپنے پرانے اساتذہ کو ان کے طرز تعلیم، طریق تربیت اور سب سے بڑھ کر ان کے کردار اور شخصیت کے حوالے سے اتنے خلوص اور گہرے جذبے سے یاد کیا ہے۔ تعلیمی و قومی نقطۂ نظر سے یہ بہت اچھی علامت اور بہت اچھی مثال ہے۔ اس کتاب کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تاثرات کے ذریعہ سے نہیں بلکہ واقعات کے ذریعے سے اساتذہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس طرح جو لوگ ان اساتذہ سے ذاتی طور پر متعارف نہیں ہیں وہ بھی ان تحریروں کو پڑھ کر ان سے اچھی طرح متعارف ہو جائیں گے۔ بظاہر یہ تذکرہ ایک مخصوص ادارہ کے اساتذہ اور سٹاف کا ہے لیکن ان اساتذہ میں ملک کے بے شمار نامور اور گمنام اساتذہ کے ذہن اور کردار کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ یہی اس کتاب کی امتیازی خصوصیت اور افادیت ہے۔

پروفیسر راشد کا نام ملک کے علمی و ادبی حلقوں خصوصاً آرمی میں نیا نہیں۔ اس سے پہلے جنگ ستمبر و دسمبر کے شہیدوں اور جنگی اعزاز یافتہ غازیوں پر ان کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ قائداعظم اور علامہ اقبال پر بھی، ان اکابر کے کردار کے حوالے سے، انہوں نے دو دو کتابیں مرتب کی ہیں۔ لیڈرشپ پر اپنی انگریزی کی دو کتابوں میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی اسی زاویے سے لکھا ہے۔ کردار اور پاکستانیت پروفیسر راشد کا خاص موضوع ہے جو اب خود ان کی پہچان بن گیا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ آرمی کے ایک مقتدر تعلیمی ادارہ سے وابستہ ایک صاحب قلم نے اپنے قلم کو کسی غیر قومی موضوع سے آلودہ نہیں ہونے دیا اور تحریک پاکستان کے ایک پرانے کارکن ہونے کے ناتے اس تحریک کو جاری رکھا۔

میں پروفیسر راشد کو جنہوں نے ان اوراق کو مرتب کیا اور ان تمام "عالمگیرینز" کو جنہوں نے اپنے محسن اساتذہ کو اتنے ذوق و شوق سے یاد کیا، مبارکباد دیتا ہوں۔ یہ مبارکباد صرف اس لیے نہیں ہے کہ انہوں نے ایک فرض کفایہ کو ادا کیا جو سعادت مندی کا تقاضا بھی تھا بلکہ اس لیے بھی ہے کہ قومی زاویۂ نظر سے یہ ایک خوش آئند علامت اور نیک فال ہے۔ امام غزالیؒ نے کہا تھا کہ ادارے ساز و سامان سے نہیں بلکہ استاد سے بنتے ہیں۔ معلم کو اہمیت دینا اصل

میں علم کو اہمیت دینا ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ تالیف بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہو گی۔ ملک کے دوسرے عام اور خاص، معروف اور غیر معروف تعلیمی ادارے بھی اپنے اپنے چراغوں کی قطاریں اسی انداز سے آراستہ کریں گے۔ تاکہ ان چراغوں سے چراغ جلتے رہیں کہ اس وقت ملک و قوم کو سب سے زیادہ ضرورت روشنی کی ہے اور یہ ضرورت ہمیشہ رہے گی۔

اسلام آباد : مورخہ یکم اگست ۱۹۸۹ء

ڈاکٹر جمیل جالبی

(صدر نشین مقتدرہ قومی زبان)

تبصرہ

ڈاکٹر غلام حسین اظہر

پروفیسر سعید راشد ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک تحریک کا نام ہے، پاکستانیت کے فروغ کی تحریک۔ اپنی سرزمین سے والہانہ شیفتگی اوران افکار کی آبیاری اور پاسداری کی تحریک، جن اقدار نے پاکستان کو جنم دیا، اورجن افکار کے فروغ سے پاکستان کا روشن اور تابناک مستقبل وابستہ ہے، گذشتہ چالیس برس سے وہ بڑے انہماک سے یہ خدمت سرانجام دے رہے ہیں، قائداعظم، علامہ اقبال کی شخصیت اورافکار سے روشناس کرانے کے علاوہ انہوں نے ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ کے شہدار کا تذکرہ بھی لکھا ہے، ملٹری کالج جہلم کی تاریخ بھی انہوں نے قلمبند کی ہے، ان کی نئی تالیف "چراغوں کی قطار" بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

قوموں کی زندگی کی تعمیر وتشکیل ہمیشہ اعلیٰ تعلیمی اداروں سے وابستہ رہی ہے علی گڑھ، اسلامیہ کالج لاہور، اسلامیہ کالج پشاور نے تحریک پاکستان میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے اس سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ جب تک نئی نسل کسی قومی فریضہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہ لے، کامیابی وکامرانی کی منزل سامنے نہیں آسکتی، تعلیمی اداروں کی اہمیت بھی ان کے در و دیوار کی آرائش و زیبائش نہیں بلکہ اساتذہ سے وابستہ ہوتی ہے، اس اہم حقیقت کا احساس دلانے کے لیے انہوں نے "چراغوں کی قطار" مرتب کی ہے، اس میں بظاہر ملٹری کالج جہلم کے اساتذہ کا شخصیت اور کردار کے تناظر میں تذکرہ ہے لیکن بالواسطہ طور پر اس کتاب میں ہمیں اس امر سے روشناس کرایا گیا ہے کہ اساتذہ کا کام محض معلومات مہیا کرنا نہیں بلکہ طلبا کی زندگی میں تعمیری انقلاب پیدا کرنا ہے، ایک اچھا استاد طلبار کی تخلیقی صلاحیتوں کا پتہ لگاتا ہے اور انہیں نکھارتا ہے، ان کے انفرادی تشخص کو ابھارتا ہے، انہوں نے

کئی اساتذہ کے طریقۂ تعلیم اور انداز تربیت سے اس اہم تعلیمی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے، کہ تدریس کا مقصد تخلیقی جوہر کی تلاش اور اس میں نکھار پیدا کرنا ہے، ملٹری کالج جہلم کے اساتذہ میں سے بالخصوص علوی صاحب کا تذکرہ استاد کی اس بڑی خوبی کو نمایاں کرتا ہے کہ اچھا استاد طلبا کی اصلاح کرتے ہوئے نہ تھکتا ہے، نہ خود مایوس ہوتا ہے، نہ دوسروں کو مایوس کرتا ہے، ان کی دانست میں تعلیم کا بنیادی مقصد دلوں کو حرارت اور ذہنوں کو روشنی عطا کرنا ہے، یہ تخلیقی منزل اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک کہ تعلیم کو مروجہ نصاب کے جوہڑ سے نہ نکالا جائے اور نصاب کو جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کیا جائے، علامہ اقبال نے تو تعلیم کے بارے میں، ہمیں یہ تلقین کی تھی "علم حاصل کرو اور علم پیدا کرو" علم پیدا کرنے کی صلاحیت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی، جب تک ہم رٹانے کے بجائے طلباء کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے پر زور نہ دیں ہمارے پبلک اسکولوں کا ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس نظام تعلیم میں محبت کے مقابلے میں قوت ارادی اور اقتدار کی خواہش کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے - اس خامی کی وجہ سے گرم جوشی کا وہ جذبہ بیدار نہیں ہوتا، جو انسان میں ایثار کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور ذاتی مفادات سے بلند کر کے اجتماعی فلاح و بہبود کی لگن اور لطف سے بہرہ ور کرتا ہے، پبلک اسکولوں نے ملکہ وکٹوریہ کی سلطنت کو پھیلانے اور مستحکم کرنے میں یقیناً تاریخی رول ادا کیا، واٹرلو کی جنگ یقیناً ایٹن کے کھیل کے میدان میں جیتی گئی، لیکن برطانوی سلطنت کے زوال کے اسباب بھی وہیں پیدا ہوئے - ای - ایم - فارسٹر نے صحیح لکھا ہے۔

An Empire was lost for want of a smile.

جب اخوت و محبت کے سوتے خشک ہو جائیں، تو مادی وسائل کی فراوانی بھی کسی قوم کو ہلاکت سے نہیں بچا سکتی۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں بھی آہستہ آہستہ دردمندی اور دلسوزی کا جوہر عنقا ہوتا جا رہا ہے، اور اب حالت یہ ہے۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک   نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

ہمیں بڑی شدت سے ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جو دلوں میں درد و سوز پیدا کر سکے ؎

یک ذرہ دردِ دل از علم فلاطوں بہ

ہمارے ہاں قحط الرجال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اب تعلیمی اداروں میں وہ اساتذہ موجود نہیں، جو اپنی عظمت کردار سے طلبا کے دلوں میں اپنے لیے احترام کا جذبہ پیدا کر سکیں استاد کی بات میں تاثیر اس کی اعلیٰ ڈگریوں سے نہیں بلکہ اس کی لگن سے پیدا ہوتی ہے "چراغوں کی قطار" کی تالیف کا بنیادی مقصد ہمارے اندر یہ احساس پیدا کرنا ہے کہ جن اداروں کو اہل احسان اساتذہ نصیب نہ ہوں، وہ بام و در کی آرائش کے باوجود اجڑ جاتے ہیں، ہمیں قومی سطح پر اعلیٰ و ارفع عمارات سے بڑھ کر بلند کردار اور وسیع النظر اساتذہ کی ضرورت ہے جن کی حیثیت محض استاد کی نہیں بلکہ روحانی مرشد کی بھی ہو، جس کی نظر سے دلوں میں ایک ولولۂ تازہ پیدا ہو، دردمند استاد ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے، میر حسن موجود ہو تو اقبال پیدا ہو سکتا ہے، آج ہمارے ہاں جو جنس سب سے نایاب ہے، وہ اچھا استاد ہے۔ پروفیسر سعید راشد نے "چراغوں کی قطار" کی قطار لکھ کر بالواسطہ طور پر ہمیں اس اہم ضرورت سے آگاہ کیا ہے۔ برسہا برس کی تدریس اور تصنیف و تالیف کے بعد وہ اب برصغیر کے ممتاز اساتذہ کا تذکرہ لکھنے کے لیے پر تول رہے ہیں تاکہ استاد کے مقام کو پہچان سکیں اور ایسے اساتذہ پیدا کر سکیں، جو نئی نسل میں سوز دروں میں پیدا کر کے انہیں مستقبل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل بنا سکیں "چراغوں کی قطار" محض ایک کتاب نہیں، بلکہ ایک دردمند استاد کے دلِ دردمند کی آواز ہے، جو یقیناً اثر کرے گی، اور ہمیں خواب غفلت سے بیدار کرے گی۔

معروضات

مؤلف

تعلیم کے بارے میں میرا Conviction یہ ہے کہ تربیت کی ضرورت اور اہمیت نصابی تعلیم سے بھی زیادہ ہے۔ نصابی تعلیم بھی اسی وقت انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر فلاح وخیر کا ذریعہ بنتی ہے جب اس کی رگوں میں صحیح اسلامی اور انسانی قدروں اور رویّوں کا خون دوڑ رہا ہو۔ جس پڑھے لکھے اور Professionally competent انسان کی اقداری تربیت ناقص ہو وہ سماجی اعتبار سے خطرناک، نفسیاتی اعتبار سے بے سکون اور تنہا، اور بحیثیت مجموعی بالآخر ناکام انسان ثابت ہوتا ہے اس لیے کہ انسان کی کامیابی یا ناکامی کی آخری کسوٹی یہ ہے کہ اس نے دنیا کو کیسا پایا تھا۔ اور کیسا چھوڑا۔ جو شخص ہمیشہ اپنا فائدہ سوچے وہ آخر کار سب سے زیادہ نقصان میں رہتا ہے۔ زیادہ چالاک بننے کی بے وقوفی سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ سلامتی (اسلام) کا راستہ یہ ہے کہ انسان لازماً آگے بڑھے لیکن دوسروں کو ساتھ لے کر آگے بڑھے۔ عدل بنیادی انسانی قدر ہے۔ کوئی معاشرہ — اسلامی یا غیر اسلامی — عدل کے بنیادی تقاضوں کو پورا کیے بغیر مستحکم تو کیا برقرار بھی نہیں رہ سکتا۔ احسان اور ایثار اسلامی قدریں ہیں جن کے پھلے پھولے بغیر معاشرہ میں خیر وبرکت، جمال اور کمال کے گلاب نہیں کھل سکتے۔ (مثال اس امر کی یہ ہے کہ گھر ایک ایسی معاشرتی اکائی ہے جہاں فطری طور پر احسان وایثار کی لہر بہر ہوتی ہے اگر کسی وجہ سے کسی گھر میں بھی احسان وایثار کی فضا باقی نہ رہ سکے تو ایسا گھر بھی جہنم بن جاتا ہے)

اقداری تعلیم کا تقاضا ہے کہ طلبا کی اقداری تربیت کی جائے یعنی ان میں شعوری طور پر اور ایک مربوط پروگرام کے ذریعے بنیادی انسانی اور اسلامی قدروں اور رویوں کو پروان چڑھایا جائے۔ تاکہ ان کا کتابی علم اور Professional proficiency ان کے لیے ذاتی طور پر اور دنیا کے لیے باعث فوز وفلاح ثابت ہو۔ مجرد علم تو دو دھاری تلوار ہے اسے باعث خیر بنانا تربیت کا مقصد وحید ہے۔ مولانا روم نے اپنے

مشہور شعر

علم را برتن زنی مارے بود
علم را بر جان زنی یارے بود

میں یہی بات کہی ہے۔

تربیت ایک ایسا ہمہ گیر عمل ہے جس میں استاد اور غیر استاد ایک ادارہ کے چھوٹے بڑے تمام کارکنوں کی قدریں ان کے رویے ان کے کردار، ان کی شخصیتیں ___ ادارے کے ماحول میں جذب ہو کر ہوا اور روشنی طرح کی طلبا کو محسوس اور لامحسوس طریقے سے متاثر کرتی رہتی ہیں۔

اقداری تربیت کس طرح ہوتی ہے اور کون کرتا ہے اور یہ کس طرح یہ تربیت طلباء کی زندگی کی راہوں کو روشن کرتی ہے یہ اس کتاب:

"چراغوں کی قطار کی تھیم Theme ہے۔ جو ملٹری کالج جہلم کے چیدہ چیدہ اساتذہ اور دوسرے ارکان کے حوالے سے Build up کی گئی ہے۔ اس کتاب کو ملٹری کالج کے سٹاف کا تذکرہ نہ سمجھا جائے۔ اس میں بہت سے اساتذہ کا ذکر ہے تو بہتوں کا نہیں بھی ہے۔ دراصل ہماری دلچسپی اقدار سے ہے اشخاص سے نہیں۔ کمانڈانٹ ہو، استاد ہو، حوالدار پی ٹی انسٹرکٹر، بگلر یا سوپئیر ہو اگر کوئی قدر اس کے حوالے سے اجاگر ہوتی ہے تو اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ طلبا کے اپنے تاثرات پر مبنی ہے جو انہوں نے واقعات اور اپنے مشاہدات کے حوالے سے بیان کیے ہیں۔ جو میں نے ایڈٹ کر کے اور بیشتر صورتوں میں کتاب کے سٹائل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے دوبارہ لکھ کر کتاب میں شامل کیے ہیں شخصیتوں کا انتخاب میرا نہیں شاگردوں کا اپنا ہے۔

لیکن چونکہ کتاب کا اصل موضوع شخصیتیں نہیں اقدار ہیں۔ اس لیے نام سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ بہر حال جس جس کا بھی ذکر ہے وہ سراسر سچا ہے یہ وہ برگزیدہ لوگ تھے جن کے فیض تربیت بہت سے ذرے آفتاب ہوئے جن سے آج پاکستان کے بام و در روشن ہیں۔

اب جبکہ میرے طویل معلمانہ اور تخلیقی سفر کی شام ہونے لگی ہے جی چاہتا ہے کہ اپنے کچھ محسنوں کا شکریہ بھی ادا کروں۔ سب سے پہلا نام تو ملٹری کالج ہی کا ہے جس کے

مہربان چھاؤں میں میں نے یہ اور دوسرے تخلیقی کام کیے اور جس کی علم پرور فضا میں میری اپنی شخصیت نے بہت سی ارتقائی منزلیں طے کیں۔ ملٹری کالج کے حوالے سے میں پاکستان کو اپنا ملجا و ماویٰ ہی نہیں۔ اپنا مربی بھی سمجھتا ہوں۔ اس کے ذرے ذرے کو میرا سلام پہنچے۔ چند دوستوں اور رفقا رکار خاص طور سے مرحوم علوی صاحب اور بریگیڈیئر محمد شفیع کا شکریہ واجب ہے جن کی پر مغز حوصلہ افزائیاں مسلسل میرے شامل حال رہیں۔ علاوہ ازیں بے شمار اولڈ بوائز کی محبتیں ارادتیں اور خدمتیں میرے لیے ایک مستقل Source of inspiration. رہی ہیں کس کا نام لوں اور کس کا نہ لوں۔ سب ہی مجھے عزیز ہیں۔ لیکن دو نام ایسے ہیں جن کا تعلق براہِ راست اس کتاب کی اشاعت اور طباعت سے ہے۔ ایک ۲۰۷۹ لیفٹیننٹ جنرل محمد اشرف جن کی توجہ سے اس کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکی اور ۲۱۹۶ لیفٹیننٹ کرنل سید سلطان حیدر جن کی نگرانی میں اس کتاب کی طباعت کے صبر آزما مراحل طے ہوئے۔ خدا ان سے خوش ہو۔ کتاب کا سرورق بنوانے کے لیے ملک کے مایہ ناز خطاط اور مصور جناب اسلم کمال کی خدمات حاصل کرنا بھی حیدر ہی کا کارنامہ ہے۔

میں جناب ڈاکٹر غلام حسین اظہر کا بھی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اس پر بڑا خوبصورت تبصرہ لکھا۔

اور جناب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کا بھی از حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کو اپنے گرانقدر پیش لفظ سے نوازا۔ سبحان اللہ!

سعید راشد

کیپٹن ڈبلیو ایل کلارک، ایم بی ای

—— بریگیڈئر محمد حیات[1]

ملٹری کالج جہلم جب ۱۹۲۵ء میں کنگ جارج رائل انڈین ملٹری سکول جہلم کے نام سے قائم ہوا تھا تو اس کے پہلے کمانڈانٹ لیفٹیننٹ ڈبلیو ایل کلارک تھے۔۱۹۱۹ء میں رائل ایجوکیشن کور میں کمیشن لینے سے پہلے ایک پبلک سکول میں استاد تھے۔ وردی پہننے کے بعد بھی وہ استاد ہی رہے۔ جہلم سکول پرائمری کی جماعتوں سے شروع ہوا تھا۔ بیشتر بچے نو سے گیارہ برس کی کچی عمر کے تھے اس رعایت سے انہوں نے اپنے رویے، ماحول اور تربیت کو ضروری حد تک نرم رکھا۔ستمبر ۱۹۲۵ء سے اگست ۱۹۳۰ء تک پانچ برس کمانڈانٹ رہے۔ لیکن ریکارڈ ہے کہ اس تمام عرصہ میں انہوں نے کسی لڑکے کو کوئی سخت سزا نہیں دی اور سکول کی ترقی کے لیے خاموشی سے کوشاں رہے۔

جنرل نالج کا ایک پیریڈ ہوتا تھا۔ اس کو دیکھنے اکثر آتے تھے۔ ایک ریپبلکس کاؤنسل بھی تھی جس کے رابرٹس ہاؤس کے ہیڈبوائے (سکول نمبر ۲ بعد کو بریگیڈئر اور پاکستان ملٹری اکیڈیمی کے کمانڈانٹ اور عالمگیرینز ایسوسی ایشن کے پہلے صدر) سلطان محمد اور سکول ہیڈبوائے (سکول نمبر ۲۹ بعد کو کیپٹن) محمد زرخان ممبر تھے۔ کبھی کبھی کاؤنسل کی میٹنگ بلاتے تھے۔

ان کا انگریزی کا خط بہت اچھا تھا۔ موٹا لکھتے تھے لیکن ایسا لکھتے جیسے پرنٹ کیا ہوا ہے۔ میں نے ان کے ہینڈ رائٹنگ کو دیکھ کر اپنا خط بھی ٹھیک کرنے کی کوشش کی۔ ان کا سارا انداز استادانہ تھا۔ اسی حوالے سے میں ان کو یاد کر رہا ہوں۔ ان کی ناک کی دائیں طرف ایک مسّہ تھا۔ حیرت کی بات ہے اس وقت جبکہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں ان کی تصویر میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔

---

[1] سینیٹر اور سابق سفیر، ملٹری کالج میں زمانۂ تعلیم ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۲ء، کالج نمبر ۱۹

صوبیدار میجر (کیپٹن) فتح روز خاں

پروفیسر سعید راشد[1] ۔۔۔ لیفٹیننٹ کرنل افتخار کیانی

اگرچہ انگریزوں نے یہ ادارہ اپنے مخصوص مفادات کے تحفظ اور اغراض کی تکمیل کے لیے جنگ عظیم کے بعد قائم کیا تھا، اسی وجہ سے اس کی تعلیم و تربیّت سیکولر نوعیت کی تھی، لیکن اس کے باوجود یہاں مذہبیت اور مسلم قومیّت کا جذبہ نہ صرف زندہ رہا بلکہ مستقل طور پر فروغ پاتا رہا اور ایسا بڑی حد تک چند اساتذہ کی شعوری کاوشوں سے ممکن ہوا۔ ان میں صوبیدار میجر (بعد کو کیپٹن) فتح روز خاں کا نام سرِفہرست ہے۔ شروع کے سات آٹھ سال جب سکول کی ہر قسم کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں، بحیثیت اسسٹنٹ کمانڈانٹ اور ہیڈ ماسٹر سکول کے کرتا دھرتا فتح روز خاں ہی تھے۔ سکول کے تنہا غیر مسلم آفیسر کمانڈانٹ کیپٹن ڈبلیو ایل کلارک (اور پھر کیپٹن ایچ ایچ کلارک) اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی، اور منصب کے لحاظ سے بھی بڑی حد تک انتظامی سربراہ (Executive Head) تھے۔ سکّہ ان کا ہی چلتا تھا لیکن عملاً انتظام و انصرام فتح روز خاں کا تھا۔ اور وہ خود شعائرِ اسلام کے پابند تھے (داڑھی رکھے ہوئے تھے نماز اور روزے کے پابند بھی) اور قومی جذبہ رکھتے تھے۔ سکول کے ضابطے کے لحاظ سے مسجد میں باجماعت نماز صرف طلبہ کے لیے لازمی تھی۔ وہ بھی صرف مغرب اور جمعے کو، فتح روز خاں نے ان نمازوں کو آل رینکس کے لیے لازمی کیا ہوا تھا۔ یہی حال رمضان میں روزوں اور تراویح کا تھا۔ فتح روز خاں صاحب کی قدروں اور روایتوں کا جو بہت ہی خوشگوار اور دور رس اثر خاص طور پر ابتدا کے چند سالوں میں اس ادارہ کی فضا پر پڑا اس کا تقاضا تھا کہ جناب فتح روز خان کی شخصیّت کا پس منظری مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ان کے صاحبزادے

---

[1] استاد ملٹری کالج از ۱۹۵۰ تا ۱۹۸۸ء

[2] کالج نمبر ۱۳۶۷ کالج میں زمانہ تعلیم۔

لیفٹیننٹ کرنل افتخار کیانی سے رجوع کیا تو ان سے یہ گفتگو ہوئی۔

سعید راشد ملٹری کالج جہلم کے چراغوں کی قطار میں ایک درخشاں نام فتح روز خاں کا ہے۔ ان کی غیر معمولی شخصیت کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس امر کا کھوج لگایا جائے کہ ان کے مذہبی اور قومی رویّوں کی جڑیں کہاں تھیں۔ آپ توان کے صاحبزادے ہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کی پیدائش بھی ملٹری کالج ہی کی ہے اور آپ عالمگیرین بھی ہیں۔

کرنل کیانی جی ہاں، یہ شرف مجھے حاصل ہے۔

سعید راشد تو آپ سے بڑھ کر اس سوال کا جواب کون دے سکتا ہے۔

کرنل کیانی جیساکہ آپ کو معلوم ہے ہمارا آبائی تعلق ضلع جہلم میں گکھڑوں کی مشہور بستی ڈھمیلی سے ہے۔ ڈھمیلی میں ایک پہاڑی کے دامن میں ایک بزرگ شیخ مسعود غازی کا مزار ہے۔ ہمارے جدِ اعلیٰ بابا سیدا خان انہی بزرگ کے ساتھ یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ ان کا تعلق پیر مرید کا تھا بابا صاحب کا بھی بزرگی میں اپنا مقام تھا۔ بابا صاحب حضرت مسعود غازی کے مزار کے ساتھ دفن ہیں۔ چار پشتوں سے ہمارے خاندان کے لوگوں کا روحانی تعلق حضرت مسعود غازی سے چلا آرہا ہے اور اس حوالہ سے مذہبیت کی روایت ہمارے خاندان میں مستحکم رہی ہے۔ قبلہ والد صاحب نے اس روایت کو قائم رکھا۔ تصوّف کی روایت، محنت، خدمت اور انسان دوستی کی روایت ہے، والد صاحب نے اس روایت کو جدید زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ حضرت مسعود غازی کے مزار کے قریب کنواں کھدوایا حالانکہ سنگلاخ علاقہ میں کنواں کھدوانا آسان کام نہ تھا۔ آنریری مجسٹریٹی ہو یا نمبرداری، ہر جگہ خدمت اور دیانت کو ملحوظ رکھا اور خوشی وغم میں اسلامی شعائر کا احترام ملحوظ رکھا۔ میری شادی کے موقع پر انہوں نے ڈھمیلی کے راجگان کے دستور کے برخلاف مجرا کرانے کی بجائے قوالی کرائی۔ اسی ایک مثال سے ان کے ذہن

کے رُخ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سعید راشد فتح روز خاں کی قوم پرستی کا پس منظر کیا ہے؟

کرنل کیانی ملٹری کالج یعنی سکول کو انہوں نے قومی ادارہ کے طور پر آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ پہلے پہل سکول علاقہ میں مقبول نہ تھا۔ انہوں نے گاؤں گاؤں پھر کر مسلمان فوجیوں کو آمادہ کیا کہ اپنے بچوں کو سکول بھیجیں۔ چونکہ انہیں ملٹری سکول قائم کرنے کا تجربہ تھا چنانچہ جب ۱۹۳۷ء میں قائداعظم کے ایماء پر علی گڑھ میں ایک ملٹری کالج قائم کرنے کے لیے منصوبہ بندی شروع ہوئی تو سر ضیاءالدین نے والد کو اس منصوبہ سے منسلک کیا اور مجوزہ ملٹری کالج کے منصوبہ کی ایک نقل بھی علی گڑھ سے انہیں بھیجی۔ دوسری جنگ عظیم میں انہوں نے کمیشن لے لیا تھا۔ وہ سرکاری نوکری میں تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے تحریک پاکستان کی حمایت کی ضلع جہلم کے مسلم لیگی گروپ (راجہ غضنفر علی خان، نواب مہر علی شاہ آف جلال پور۔ راجہ محمد اکرم آف اکرہ موڑہ کا ساتھ دیا) اور یونینسٹ گروپ کرنل سر شیر محمد اور نواب طالع مہدی خاں آف دارا پور وغیرہ کا سیاسی میدان میں مقابلہ کیا حالانکہ کرنل سر شیر محمد نہ صرف ہماری برادری کے تھے بلکہ ان سے قریبی رشتہ داری بھی تھی۔ مزید برآں وہ علاقہ کے سب سے زیادہ بارسوخ آدمی تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے قومی مفاد کو مقدم سمجھا اور سر شیر محمد کے خلاف مسلم لیگ یعنی تحریک پاکستان کا ساتھ دیا۔ وہ ۱۹۵۱ء میں فوج سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ۱۹۶۵ء میں اپنے انتقال کے وقت تک اپنے علاقہ کے مختلف فلاحی اور رفاہی کاموں میں مصروف رہے۔ گویا تحریک پاکستان سے مسلسل وابستہ رہے اور خاندان کی مذہبی روایتوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔

صوبیدار غلام احمد مرزا

—— صوبیدار میجر محمد حسین[1]

۱۵ ستمبر ۱۹۲۵ء کو جب میں سکول میں داخل ہوا اور برڈووڈ ہاؤس میں آیا تو سب سے پہلے جس انسٹرکٹر پر نظر پڑی وہ غلام احمد صاحب تھے۔ اس دن کل ۲۱ لڑکے سکول میں داخل ہوئے تھے۔ ان میں سے چند جیسے سکول نمبر ۶ نوبہار تو شاید دس برس سے بھی کم عمر کے تھے۔ ان سب کو غلام احمد صاحب نے ماں باپ کی طرح سنبھالا۔ پہلے دن سے غلام احمد صاحب مغرب کی نماز ہمارے ساتھ سکول کی مسجد میں جا کر پڑھتے تھے حالانکہ ایسا کرنا ان کی سرکاری ڈیوٹی میں شامل نہ تھا۔ شروع کے سالوں میں ہم لوگ اپنے اپنے پرائیویٹ کپڑوں میں مغرب اور جمعے کی نماز پڑھنے جاتے تھے (نماز کی یونیفارم سفید شلوار قمیض اور سبز پگڑی بعد کو آئی) لیکن غلام احمد صاحب کو شروع سے سفید شلوار قمیض اور خاکی پگڑی میں دیکھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر روز نیا جوڑا پہن کر آتے ہیں۔ اردلی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ جمعدار صاحب کی نماز کی یونیفارم ڈیوٹی کی خاکی یونیفارم کی طرح ہر روز تیار کی جاتی ہے جو وہ مسجد سے آکر اتار کے رکھ دیتے ہیں۔

—— بریگیڈئر محمد عباس بیگ[2]

مرزا صاحب سے میں نے ۳۲-۱۹۳۱ء میں نویں دسویں میں حساب پڑھا تھا۔ پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہفتے کے پانچ دن پڑھاتے، چھٹے دن (جمعہ کو) رویژن کا ٹیسٹ لیتے۔ اگر ٹیسٹ میں کوئی سوال حل کرنے میں غلطی کرتے تو بلیک بورڈ پر چاک کا نشان لگا کر بتاتے۔ ظالمو بھول گئے۔ یہ سوال فلاں دن میں نے اس جگہ نکالا تھا۔ اس

---

[1] زمانہ تعلیم ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۰ء۔ سکول نمبر ۸

[2] سابق ڈائریکٹر آرٹلری۔ زمانہ تعلیم ۱۹۲۷ تا ۱۹۳۳ء کالج نمبر ۱۹۱۔ نائب صدر عالمگیرینز ایسوسی ایشن ۱۹۶۸ء تا ۱۹۸۶ء۔

کا جواب یہ آیا تھا، بلکہ ہندسہ تک کی نشاندہی کر دیتے۔
پڑھاتے وقت تو نہیں لیکن ریویژن کے وقت لڑکوں کی اچھی خاصی تواضع بھی کرتے تھے۔ سکول کے مین بلاک کے بائیں طرف گنڈیرہ کی جھاڑیاں تھیں۔ اس کی لچکدار ٹہنیوں سے "نوازتے" تھے۔ جب ٹیسٹ شروع ہوتا تو مجھے اشارہ سے بلاتے "۱۹۱" اس کا مطلب تھا کہ گنڈیرہ کی تازہ چھڑی توڑ کر لے آؤ۔ ایک آدھ بار میں بھی ان کی توجہ کا نشانہ بنا۔ بہر حال پڑھایا ایسا کہ کندن کر دیا۔ ۱۹۵۱ء میں جب رائل ملٹری کالج آف سائنس (یو۔کے) میں لانگ گنری سٹاف کورس کر رہا تھا تو غلام احمد صاحب مجھے بار بار یاد آئے۔ انہوں نے چونکہ ریاضی کے بنیادی Concepts واضح کر دیئے تھے، اس کی وجہ سے ہندسوں کے کام میں پھر میں کہیں رُکا نہیں۔ مجھے ۱۹۲۷ء میں ان کی شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ نومبر ۱۹۸۳ء میں ان کے انتقال تک کم و بیش پچاس سال ان کی خدمت میں نیازمندانہ حاضر ہوتا رہا میرے لیے محض استاد نہیں بہت کچھ تھے۔

—— میجر گل حیدر خان[۱]

میرے سامنے وہ چار سال ہاؤس ماسٹر رہے۔ ہاؤس کے میس کے انچارج بھی وہی تھے لیکن کیا مجال کہ ایک دن بھی کھانا چیک کرنے نہ آئے ہوں اور کھانا چیک کرتے وقت ایک سے دوسرا لقمہ کبھی توڑا ہو یا کبھی روٹی بھی ہاؤس کے کچن میں لگوائی ہو حالانکہ بعض دوسرے اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

—— لیفٹیننٹ کرنل شیر محمد ستارۂ جرأت[۲]

غلام احمد کو ۱۹۲۵ء سے تقریباً تمام طلبہ کے نام نمبر، تاریخ پیدائش، ان کے والدین

---

[۱] کالج نمبر ۳۰۷ زمانہ تعلیم ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۷ء
[۲] کالج نمبر ۳۸۰ زمانہ تعلیم ۱۹۳۲ تا ۱۹۳۷ء

کے کوائف، ذات نسل، جائے سکونت، رجمنٹ غرض ہر ایک کے بارے میں ہر ممکن معلومات ان کے غیر معمولی حافظے میں محفوظ تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ سکول چھوڑنے کے بعد کون کہاں گیا، کس رینک میں، کہاں پوسٹ ہے کیا کر رہا ہے۔ دوسرے احوال کیا ہیں وغیرہ وغیرہ وہ سب باتوں کی خبر رکھتے تھے۔ حافظہ بھی اللہ تعالیٰ کی دوسری نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ انہوں نے اس نعمت کو سکول کی خدمت کا ذریعہ بنایا۔ میں یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ انہیں سینکڑوں شاگردوں اور سٹاف کے صرف کوائف ہی یاد نہ تھے وہ ان سے مسلسل قریبی رابطہ رکھے ہوئے تھے ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔ ان کی حیثیت ایک ایسے شجر سایہ دار کی تھی جس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں غلام احمد صاحب نے سکول کو ایک خاندان کی طرح Integrate کیا۔ عالمگیری برادری کے رشتوں کو استوار کر کے رکھنا ان ہی کا کام تھا۔ میں ان کے حافظہ سے زیادہ ان کے اس عشق کو سلام کرتا ہوں جس نے انہیں زندگی بھر اس ادارہ کی خدمت میں سرگرداں رکھا۔

—— کرنل حضور احمد خان۔ ایم سی[1]

اس زمانے میں لاہور کے خواجہ دل محمد ریاضی کے مانے ہوئے ماہر تھے۔ غلام احمد صاحب ہمارے دل محمد تھے۔ ریاضی پڑھانے میں حرف آخر، وہ ان غیر معمولی استادوں میں سے تھے جو خود کسی مضمون کی جڑوں کو سمجھتے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ شاگردوں کو بھی سمجھا سکتے ہیں۔

—— میجر جنرل محمد بشیر خان[2]

۱۹۳۵ء میں جب سکول میں داخل ہوا تو میں گیارہ برس کی عمر تھی۔ گھر سے پہلی بار نکلا تھا۔ سخت دل گھبرایا۔ برڈووڈ ہاؤس کے گیٹ پر کھڑا تھا کہ سامنے سے ریل گزری

---

[1] کالج نمبر ۴۰۲ زمانہ تعلیم ۱۹۲۷ تا ۱۹۳۳ء صدر عالمگیرینز ایسوسی ایشن کراچی زون ۱۹۶۸ تا ۱۹۸۸ء

[2] سابق دفاقی وزیر پیداوار کالج نمبر ۵۶۶ زمانہ تعلیم ۱۹۳۵ تا ۱۹۴۰ء

اسے دیکھ کر میں ایک دم سرائے عالمگیر کے ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ سٹیشن پر پہنچ کر جو ڈبہ سامنے پڑا اس میں جا کر بیٹھ گیا۔ اتفاق سے یہ ڈبہ مال گاڑی کا تھا۔ ڈبہ میں بیٹھے ابھی کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ صوبیدار غلام احمد صاحب مجھے ڈھونڈتے ہوئے آگئے۔ صرف اتنا کہا یہاں کیا کر رہے ہو اور مجھے لے کر ہاؤس میں آگئے۔ راستہ میں گنڈیریاں خرید کر کھلائیں لیکن سکول سے بھاگنے کے سلسلہ میں کوئی بات نہیں کی۔ صرف مجھ پر توجہ زیادہ کرنے لگے۔ وہ ہر طالب علم کی طرح میرے بارے میں بھی پوری معلومات رکھتے تھے۔ مجھے گورنمنٹ سے وظیفہ ملتا تھا۔ وہ بھی میرے لیے جہلم کے سرکاری خزانے سے اپنے خرچ پر جا کر لاتے تھے۔

جب میں کھاریاں میں ایک بکتر بند ڈویژن کمان کر رہا تھا تو مجھے مبارکباد دینے آئے۔ وہ اپنے چھوٹے بڑے سب شاگردوں کی خبر رکھتے تھے اور ان کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے تھے۔ مجھے ۶۸۵ غنی نے بتایا کہ غلام احمد صاحب بنجیڑی جا کر لیفٹیننٹ جنرل اکبر کے جنازے میں شریک ہوئے حالانکہ اس وقت وہ خود بچھتر سے اوپر ہو چکے تھے اور ان کی عمر دور دراز کا مشکل سفر کرنے کی نہیں تھی۔

یہ غلام احمد صاحب اور لطیف صاحب ایسے استادوں کی تربیت کا فیض ہے کہ آج ہم زندگی میں کچھ کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔ ان کا Devotion آج بھی میرے لیے ایک مثال بنا ہوا ہے۔

—— پروفیسر سعید راشد

میجر غلام احمد صاحب نے مجھے اپنا جو بائیوڈیٹا دیا تھا اس کے مطابق وہ ۱۹۰۰ء عیسوی میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں ایف ایف آر میں سپاہی بھرتی ہوئے ۱۹۲۲ء میں آرمی سکول آف ایجوکیشن بلگام سے تدریس کی تربیت حاصل کی۔ جنوری ۱۹۲۵ء سے کے جی آر آئی ایس جہلم کے سٹاف میں شامل ہوئے۔ میجر ریڈ فورڈ سپرنٹنڈنٹ کے جی سکولس کے زیر نگرانی دوسرے سٹاف کے ساتھ کے جی آر سکول جہلم کے لیے خصوصی

کورس کیا۔ ستمبر ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۷ء تک یہاں پڑھایا۔ ۱۹۵۳ء میں اے ای سے میجر کے رینک میں ریٹائرڈ ہوئے۔

۱۹۷۵ء میں جب ان کا بیٹا عطاء اللہ (اب کیپٹن) میرے شیر شاہ ہاؤس میں داخل ہوا تو مرزا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بہتر تہتر برس کے تھے لیکن ہاتھوں میں ہلکے سے رعشہ کے سوا بڑھاپے کی کوئی اور علامت نمایاں نہیں تھی۔ انہوں نے جو باتیں کالج کے ابتدائی سالوں کے بارے میں بتائیں ان کی تفصیلات نے مجھے حیران کر دیا۔ انہیں کالج کا انسائیکلوپیڈیا کہنا بالکل بجا تھا۔ ۱۹۷۵ء کی گولڈن جوبلی کے بعد میں نے کالج کی ہسٹری لکھنے کا ارادہ کیا تو اس کی انسپریشن وہی تھے۔ میری فرمائش پر انہوں نے جنوری ۱۹۲۵ سے ۱۹۴۷ء میں اپنے کالج سے جانے تک کے عرصہ پر محیط کالج کی تاریخ کے اہم واقعات اور حالات اور سٹاف کے کوائف پر جو چالیس صفحے لکھوا کر دیئے وہ تاریخ کا Nucleus تھا۔ اس کے بغیر میرے لیے تاریخ کا پہلا باب لکھنا ممکن نہ ہوتا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں تاریخ ان ہی کے نام معنون کروں۔ وہ کالج کے عاشق تھے۔ کالج کے سٹاف میں یہ اعزاز انہی کو حاصل تھا کہ انہوں نے ۱۹۵۰ء کی کالج کی سلور جوبلی اور ۱۹۷۵ء کی گولڈن جوبلی اور اکتوبر ۱۹۶۸ء سے ۱۹۸۲ء تک کی تمام ری یونینوں اور سالانہ تقریبات میں شرکت کی۔ ان کی اور بہت سی خوبیوں کا ذکر تو ان کے شاگردوں نے کیا ہے اور خوب کیا ہے لیکن ان کی سب سے بڑی اور سب سے اہم خوبی جو ایک راز کی حیثیت رکھتی تھی کا تذکرہ رہ گیا ہے۔ ۱۹۸۳ء میں، میں اور اس وقت کالج کے چیف انسٹرکٹر لیفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈئر) حامد رضا صدیقی ان کی مزاج پرسی کے لیے جہلم میں ان کے گھر گئے تو انہوں نے برسبیل تذکرہ بتایا کہ ۱۹۱۷ء میں نوکر ہو کر جب پہلی تنخواہ کے اٹھارہ روپے اپنی والدہ مکرمہ کی خدمت میں پیش کیے تو وہ خوش ہوئیں اور مجھے کہا غلام احمد مجھے ان روپوں کا کیا کرنا ہے۔ البتہ چاہتی ہوں کہ تو اپنی تنخواہ میں سے ہر ماہ کچھ صدقہ کیا کرے۔ میں نے وعدہ کیا کہ انشاء اللہ تنخواہ کے ہر روپے میں سے ایک آنہ آپ کے نام سے صدقہ کیا کروں گا۔

پھر مرزا غلام احمد صاحب نے ہمیں ایک پرانی موٹی سی کاپی دکھائی جس میں ۱۹۱۷ء

سے ستمبر ۱۹۸۳ء تک ۶۶ سال کے ماہانہ صدقے کا حساب درج تھا۔ فرمایا اس میں زکوٰۃ کا حساب شامل نہیں۔ ۱۹۵۲ء تک تنخواہ سے دیتا رہا۔ اب پنشن کے ہر روپے سے دس پیسے نکالتا ہوں۔ اللہ اکبر۔ میں نے عرض کیا سر یہ بہت قیمتی ڈاکومنٹ ہے آپ اسے کالج میوزیم میں رکھنے کے لیے عطیے کے طور پر دے دیجئے۔ کہنے لگے ابھی تو میں زندہ ہوں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ دوسرے میں نہیں چاہتا کہ اس کی تشہیر ہو میں نے اپنی والدہ سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ یہ صدقہ میرے اور خدا کے درمیان راز رہے گا۔ نہ جانے آج کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔ غالباً اس لیے کہ اب چل چلاؤ کا وقت ہے۔ یہ تھے مرزا غلام احمد جنہوں نے اس کالج کی شروع کے دس بارہ سالوں میں روحانی آبیاری کی۔

مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ ۴۷ سے پہلے یہاں کی سیکولر (Secular) تعلیم کے باوجود یہاں کے اولڈ بوائز میں اتنا دینی جذبہ اور قومی عصبیت کیوں ہے۔ اس واقعہ میں اس سوال کا جواب موجود ہے مشیت ایزدی تو دیکھئے کہ وہ ادارہ جو انگریزوں نے سیکولر دل و دماغ کے وفادار فوجی پیدا کرنے کے لیے قائم کیا تھا وہاں سے دین کے شیدائی اور پاکستان کے جیالے پاسبان ابھرے۔

اللہ اکبر۔ جس استاد نے ۶۶ برس تک اپنے عہد کو خاموشی اور دیانت داری سے نبھایا اور اس کے سوز دروں سے اس ادارہ کے بام و در کتنے روشن رہے ہوں گے اور اس کے شاگردوں نے شعوری لاشعوری طور پر کتنا انسپریشن حاصل کیا ہو گا۔

ڈرائینگ ماسٹر احمد دین صاحب

——— سید شہزادہ عالم[۱]

وہ تنہا سویلین استاد تھے جو کالج کی ابتدا کے دن سے یہاں موجود تھے اور ۱۹۵۰ء میں کالج کی سلور جوبلی دیکھ کر ریٹائر ہوئے۔ لباس کی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ شروع دن سے سفید شلوار، سیاہ شیروانی، سفید پگڑی اور کلاہ اور نوکری کے آخری روز بھی وہی رہا۔

[۱] آنریری کیپٹن کالج نمبر ۱۲، زمانہ تعلیم ۱۹۴۲ تا ۱۹۵۱ء

سائیکل پر اپنے گاؤں کریالے سے منٹوں کی پابندی کے ساتھ آتے جاتے تھے۔ کلاس میں لڑکوں کے ساتھ بہت نرم تھے لیکن جب ڈیوٹی ماسٹر آف دی ڈے ہوتے تو لڑکوں کی سختی آتی رہتی۔ صبح سے شام تک ہر جگہ چیک کرنے کے لیے موجود ہوتے۔ اس روز گھر نہیں جاتے تھے۔ غالباً تمام رات کالج میں اور سرائے میں چیکنگ کیلئے گھومتے رہتے تھے آرٹسٹ بھی بہت اچھے تھے۔ اکثر ڈرائینگ کے مقابلے کراتے تھے۔ فوجی افسروں کی دھوم دھام کے اس زمانہ میں ایک بہت جونیئر سویلین ماسٹرز کو کون پوچھتا لیکن انھوں نے اپنے کام اور کردار سے بڑوں اور چھوٹوں کے دل میں اپنی جگہ بنا لی تھی۔ لڑکوں کے علاوہ ان کو سیلوٹ شاید کوئی اور نہیں کرتا تھا لیکن ان کی عزت سب کرتے تھے جو سرکاری سیلوٹ سے بہت آگے کی چیز ہے۔

دیکھنے میں ٹھیٹھ دیہاتی لگتے تھے لیکن خدا نے جس طرح ہاتھ کو آرٹ کا حسن عطا کیا تھا اس طرح ان کے دل کو گداز بنایا تھا۔ نعت رسول رحمت بے خود ہو کر سنتے تھے۔ شاعری کا کچھ ذوق بھی تھا۔ کبھی کبھی پنجابی اور اردو کے برجستہ شعر سناتے تھے۔

—— حسن اختر کیانی[1]

اگست ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے کہ ایک روز ہم آٹھویں کے اردو کے پیریڈ میں وی ٹی صاحب (مسٹر عبدالرحیم) کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک ڈرائینگ ماسٹر احمد دین صاحب کلاس میں تشریف لے آئے۔ ہمیں حیران دیکھ کر انھوں نے خود ہی وضاحت کی کہ آپ لوگ حیران نہ ہوں میں ڈرائینگ نہیں اردو پڑھانے آیا ہوں آپ کے وی ٹی صاحب آج سک لیو پر ہیں، کتاب کھولیئے کہاں سے پڑھنا ہے۔ اس سے پہلے کہ کلاس کمانڈر سبق کی نشاندہی کرتا میں نے کہا" سر باہر تو دیکھئے کس غضب کا موسم ہے۔ کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ ہوا میں خوشگوار خنکی ہے۔ بارش ہوا چاہتی ہے جب آپ اردو پڑھانے آئے ہیں تو پہلے کوئی شعر ہی سنا دیجیے"۔ احمد دین صاحب کی ڈرائینگ اور پینٹنگ مشہور تھی۔ کسی کر ان کے

---

[1] حال مقیم مغربی جرمنی کالج نمبر ۱۰۶۳ زمانہ تعلیم ۱۹۴۲ تا ۱۹۵۰ء مجموعہ کلام تذبذب اختر مصنف جرمن زبان کی کتاب "انسانی حقوق کے سائے میں"

شعر و شاعری کے ذوق کے بارے میں علم نہ تھا۔ بہر حال میری فرمائش کی تائید چند دوسرے لڑکوں نے بھی کی "ہاں سر کوئی شعر ہو جائے" تو احمد دین صاحب نے سر جھکا کر باہر کی طرف دیکھا اور یہ شعر سنایا۔

میں توبہ کر چکا تھا مگر کیا کروں جلیل — کالی گھٹا کو دیکھ کر طبیعت مچل گئی

شعر برجستہ ہی نہیں برمحل بھی تھا۔ لطف آ گیا۔ اس کے بعد انہوں نے پنجابی کے چند شعر سنائے جن میں سے ایک یہ تھا۔

ٹنگ پٹوسی گنگی کرو کرو کیا — کھیس دی بکل مار کے چک وچوں لنگ جا

اس کے بعد انہوں نے اُردو کا یہ شعر؛

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا — کہ ناحق خون پروانے کا ہو گا

سُنایا اور کہا جو لڑکا اس شعر کا مطلب بتا دے گا اسے انعام دوں گا۔ ہمیں شعر کا مطلب تو کیا مگس کے معنی بھی معلوم نہیں تھے۔ ہم نے کہا۔ سر آپ ہی سمجھائیں ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ پھر انہوں نے مگس (شہد کی مکھی) کے باغ میں جا کر پھولوں کے رس کو شہد بنانے پھر چھتے سے موم نکلنے اور موم سے موم بتی بننے اور موم بتی جلنے پر پروانوں کے آنے اور ان کے جلنے کا سلسلہ ملایا۔ ہم حیران ہوئے کہ یہ شعر تو گورکھ دھندا ہے مدتوں بعد یہ شعر آب حیات میں پڑھا لیکن پہلے پہل انہی نے سنایا تھا۔ ہم میں سے کسی کو علم نہ تھا کہ ڈرائنگ ماسٹر صاحب کو شعر و شاعری کا ذوق بھی ہے۔ بہر حال جب انہوں نے شعر سنائے تو ۱۳۲۶ نے ہمت کر کے پوچھ لیا سر، کیا آپ خود بھی شعر کہتے ہیں؟ فرمایا "نہیں میں کہاں اور شعر کہاں، برسوں پہلے کبھی پڑھا ہو گا آج تم لوگوں نے اصرار کیا تو سنا دیا"

— چوھدری خادم حسین[1]

احمد دین صاحب محض آرٹسٹ ہی نہ تھے کہ صرف حسن کاری میں دلچسپی رکھتے ہوں، اس کے موضوع سے کوئی سروکار نہ ہو۔ کالج کا سنٹرل ہال ہی کالج کی آرٹ گیلری تھا۔ اس

[1] کالج نمبر ۱۵۵۱، مینیجر سٹیٹ لائف زمانہ تعلیم ۵۴-۱۹۴۹۔

کی دیواروں پر ان کی بنائی ہوئی تصویریں آویزاں تھیں جن میں دلی کی جامع مسجد لاہور کے شاہی قلعہ اور شاہی مسجد کی تصاویر بہت نمایاں تھیں۔

۴۷-۱۹۴۶ء میں تحریک پاکستان اپنے عروج پر تھی ہر چند کہ کالج میں ہندو اور سکھ لڑکوں کی تعداد سو کے قریب تھی اور آفیسرز، ماسوائے ایک دو کے سب غیر مسلم تھے، انہوں نے قائداعظم، لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر کی تصویریں بنا کر سنٹرل ہال میں لگائی تھیں اور کلاس میں سکیچ ڈرائینگ کے ذریعہ ہمیں بھی ان کی تصاویر بنانے کی مشق کراتے۔ پاکستان بننے سے پہلے ایک انگریز کمانڈانٹ کے دور میں جبکہ مسلم قوم پرستی کے جذبے کی ترویج کی کوئی گنجائش نہ تھی ان کا ایسا کرنا ہمارے اندر پاکستانیت کا شعور ابھارنے میں محرک ثابت ہوا۔

اواخر اگست ۴۷ء سے احمد دین صاحب نے ہمیں تاریخ پڑھانی شروع کی مغل بادشاہوں سے زیادہ انہوں نے محمود غزنوی اور محمد بن قاسم کو اور شیر شاہ سوری کو اہمیت دی چونکہ پاکستان کی قدیم تاریخ محمد بن قاسم سے شروع ہوتی تھی اس لیے انہوں نے محمد بن قاسم کی فتوحات کا ذکر بھی کیا اور اس کے کردار کا بھی جس کی بناء پر ہندوؤں نے اس کی مورتیاں بنا کر مندروں میں رکھ لی تھیں۔ لیکن جب اس کی معزولی، گرفتاری اور واپسی کا ذکر آیا تو وہ رو پڑے۔ بہت افسوس کے ساتھ کہا اگر خلیفہ ولید ایسا نہ کرتا تو آج برصغیر کی تاریخ مختلف ہوتی۔

وہ ہر روز کربالے سے سائیکل پر اپر جہلم کینال کے پل کو پار کر کے آتے تھے۔ ایک روز آئے (غالباً نومبر دسمبر ۴۷ء کا واقعہ ہے کشمیر کا جہاد شروع ہو چکا تھا) تو بہت اداس تھے۔ بہت جذباتی انداز میں بتایا کہ "آج میں نے کٹے ہوئے کئی انسانی سر نہر میں بہہ کر آتے دیکھے ہیں۔ ڈوگرے پونچھ کے علاقے میں مسلمانوں پر بہت ظلم کر رہے ہیں۔ یہ تو چند سر تھے میں نے سنا ہے کہ وہاں قتل عام ہو رہا ہے۔" اسی زمانہ میں مشرقی پنجاب سے بھی لٹے پٹے قافلے کالج کے سامنے کی جی ٹی روڈ سے گزرا کرتے تھے میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس طرح کے واقعات اور ڈرائینگ ماسٹر احمد دین کی خاموش تحریک کا نتیجہ تھا کہ کالج کے کئی لڑکے ۱۶۶ کیڈٹ ایڈجوٹنیٹ محمد اسلم، ۹۰۳ کیڈٹ آفیسر رحیم اللہ اور ۱۶۶۸ گل بادشاہ کالج سے بھاگ کر اپنے طور پر

جہاد کشمیر میں شریک ہوئے۔

صوبیدار فیض محمد خان

کیپٹن محمد زرؔ[1]

فیض محمد خاں صاحب میانوالی کے موسیٰ خیل قبیلے کے تھے۔ کھلتا ہوا رنگ، چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا قد، اکہرا ورزشی بدن، چہرے پر فرنچ کٹ سیاہ داڑھی، سونے پر سہاگہ ان کی خوش لباسی تھی۔ ان سب چیزوں نے جسمانی اعتبار سے بھی انہیں انتہائی Impressive اور پُر وقار بنا دیا تھا۔

——— میجر محمد نواز[2]

اکتوبر ۱۹۳۱ء میں صوبیدار فیض محمد خاں صاحب ہاؤس ماسٹر برڈووڈ ہاؤس کا ۴۱ سال کی عمر میں ایک طرح سے حادثاتی انتقال ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ جب دوسرے تیسرے دن ان کی لاش ملٹری اسپتال جہلم سے آئی تو آہ و بکا کا وہ منظر دیکھا نہیں جاتا تھا۔ لڑکے اس طرح دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے کہ کوئی اپنے عزیزوں کے مرنے پر بھی کیا روتا ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا جتنا بھی غم کیا جاتا کم تھا۔ سکول کو ویسا سردار پھر نصیب نہیں ہوا۔ بہت اچھے استاد ہونے کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے لیکن ان کی جو صفت بہت نمایاں اور امتیازی تھی، وہ ان کی روحانیت تھی۔ تہجد گزار تھے۔ قلب کے نور سے چہرہ دمکتا رہتا تھا۔

——— بریگیڈئر محمد عباس بیگ[3]

دوسرے اولڈ بوائز نے اس امپیکٹ کا ذکر کیا ہو گا جو ان کی تربیت کا لڑکوں پر ہوا۔ ان کے اس امپیکٹ کی بات کروں گا جو ان کی شخصیت کا دوسرے اساتذہ پر ہوا۔

---

[1] کالج نمبر ۲۹ زمانہ تعلیم ۳۰-۱۹۲۵ء

[2] کالج نمبر ۵، زمانہ تعلیم ۳۱-۱۹۲۵ء [3] کالج نمبر ۱۹۱، زمانہ تعلیم ۳۳-۱۹۲۷ء

صوبیدار (بعد کو میجر) غلام احمد مرحوم ان سے اتنے متاثر تھے کہ ان کے انتقال کے تقریباً ۴ سال کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بیٹا دیا تو اس کا نام انہوں نے فیض محمد رکھا۔ ۱۹۰۳ء کا ذکر ہے کہ میں ایک بار مظفر گڑھ اپنی زمینوں پر جا رہا تھا تو غلام احمد صاحب نے میرے ساتھ وہاں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میرے پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ مرحوم کے بیٹے سے جو ڈی۔ ایف۔ او تھے ملنا چاہتے تھے۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۰۳ء کے اس طویل عرصے میں انہوں نے فیض محمد صاحب کے اہل خاندان سے اپنا رابطہ ہی نہیں تعلق برقرار رکھا تھا۔ اسی کو کہتے ہیں شخصیت، میں دونوں کی تعریف کروں گا۔ وہ جسے یاد رکھا گیا اور اس کی بھی جس نے یاد رکھا۔ یہ تھے وہ استاد جن کے ہاتھوں ہماری ذہنی اور کرداری تربیت ہوئی۔

رسالدار میجر (کیپٹن) ایم۔ اے لطیف ایم۔ اے

میجر محمد نواز[1]

لطیف صاحب کی مٹی مشہور تاریخی قصبہ ہڑالی کی تھی۔ یہیں کے ایک معزز زمیندار گھرانے میں وہ ۱۸۹۴ء کو پیدا ہوئے۔ پرائمری تک پڑھ کر رسالے میں بھرتی ہوئے تھے۔ تحصیل علم کا شوق تھا۔ ملٹری کالج میں پوسٹ ہوتے ہوئے وہ مڈل کر چکے تھے۔ یہاں آکر انہوں نے منشی فاضل کیا۔ پھر انگریزی میں ایم اے بھی پاس کیا۔ اور ایم اے لطیف کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس زمانہ میں کمانڈانٹ سیلی کے سوا وہ تنہا استاد تھے جو ایم اے تھے کلاس میں اور کلاس سے باہر بے تکلف انگریزی بولتے اور لکھتے تھے۔ مطالعہ کا بھی شوق تھا۔ انڈیا کا مشہور مصور ہفتہ وار رسالہ السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا ان کے پاس آتا تھا۔ اکثر کلاس میں اس کا ذکر کرتے اور حوالے دیتے۔ اس زمانہ میں فوجی اخبار میں اکثر لکھتے رہتے تھے۔

۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک تین سال تک سکول کے رسالدار میجر اور اسسٹنٹ کمانڈانٹ رہے، ۱۹۴۲ء میں کمیشن لے کر آئی ایم اے میں اردو کے انسٹرکٹر مقرر ہوئے۔

---

[1] کالج نمبر ۷۵، زمانہ تعلیم ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۰ء

۱۹۴۶ء میں لفٹیننی اور او بی آئی اور آئی ایس ایم کے اعزازات کے ساتھ ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں دوبارہ سروس کے بلانے پر گئے اور کپتانی کے عہدہ سے دوسری بار ریٹائر ہوئے

—— بریگیڈئر محمد حیات[ا]

لطیف صاحب اصل میں ایک سپاہی سے زیادہ ایک سکالر تھے۔ ظاہری لحاظ سے نہیں، اپنی باطنی صفات میں، ظاہری اعتبار سے تو وہ فوجی کے اونچے سے اونچے معیار پر پورے اترتے تھے۔ وہ اکثر ملکی اور بین الاقوامی امور و مسائل پر مختصر لیکچر دیا کرتے تھے۔ ان کے لیکچروں نے ہمیں نصاب کی تنگ دنیا سے باہر نکالا اور ہمارے ذہنی افق کو وسیع کیا۔

—— بریگیڈئر رب نواز[۲]

لطیف صاحب دوران ملازمت میں بھی قومی اور مذہبی عصبیت رکھتے تھے۔ ۱۹۴۰ء کے بعد سے یہ رنگ اور گہرا ہوا تحریک پاکستان کے لیے تندہی سے کام کیا۔ دوبار حج بیت اللہ سے باریاب ہوئے۔ ایک بزرگ سے بیعت کرنے کے بعد بالکل صوفی صافی ہو گئے تھے اور خود رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ان کے تصنیف کردہ رسالوں کے نام ہیں۔ رحمت خدا، خوف خدا، توشہ آخرت، عرفان حق، دین کی خدمت، موت کا فکر، مراقبہ حضور، فلسفۂ روزہ، زخمی دل اور اسلام ان انڈیا۔ انگریزیت کے سخت خلاف تھے، زخمی دل، میں عبرت کے عنوان سے لکھا۔

"کافر کی حکومت میں نہ دین سلامت رہتا ہے اور نہ دنیا"

۲۴ دسمبر ۱۹۶۰ء کو لطیف صاحب نے مجھے ایک کرسمس کارڈ بھیجا تھا۔ اس کے اوپر لکھا تھا:

میرے انگریز آقا کی یادگار

اور کارڈ کے اندر دو صفحے جوڑ کر نہایت خوشخطی یہ عبارت لکھی "میں کتنا کم فہم اور سادہ ہوں

[ا] سابق سفیر اور سینیٹر کالج نمبر ۱۹

[۲] کالج نمبر ۱۷۳ زمانہ تعلیم ۱۹۲۷ تا ۱۹۳۳ء

کہ اُس تاریک دور کی ہر چیز کو اپنی عزت سمجھتا ہوں۔
پاکستان کی حدود سے دور میدان جنگ میں جہاں کچنر کے ساتھ میرے بزرگوں نے مہدی سوڈانی اور اس کے درویشوں سے جنگیں لڑیں، انگریز آقا کے لیے ہزار ہا گھر برباد کئے۔ نہتے عرب اور بہادر ترکوں کو اپنے سفید فام آقاؤں کی خاطر گولی کا نشانہ بنایا۔ جنرل رابرٹ کے ساتھ میرے ہی بزرگوں نے کابل اور قندھار پر یلغار کی ۔ انگریز آقا کے لیے میرے بزرگوں نے ہزار ہا پٹھانوں کا خون بہا دیا۔ ہندوستان کے تمام مسلمان، پٹھان، سندھی، بلوچی، بنگالی، پنجابی وفادار غلام تھے۔ غلامی میں سبقت کی دوڑ ہم دوڑ رہے تھے۔ عرب کی مقدس زمین، ہمارے آقاؤں نے ہماری سنگینوں کے زور سے عربوں سے چھین لی۔ اسلام کے پرانے دشمن یہودی عربوں کے گھروں اور باغوں میں بسائے، ہماری وفاداریوں کا یہ صلہ ملا۔ میں یہ سب کچھ دیکھتا تھا۔ پھر بھی سرفروشی کرتا رہا میں خود اپنے آباؤ اجداد سے کم وفادار نہ تھا۔ میرے آقا نے جس کی طرف اشارہ کیا اسی مسلمان کو میں نے آقا کی دی ہوئی گولی کا نشانہ بنایا میں نے اور میرے بزرگوں نے ہمیشہ فرنگستان کی خوش بختی کے راگ گائے۔ لاالہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پڑھنے والے مسلمانوں کی لاشوں پر ہم نے برٹش امپائر کھڑی کی۔
پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کے بجائے میں نے فرنگی اسوۂ ملعون کو اپنایا۔ لنچ ڈنر، پتلون، ٹائی، ہیٹ کوٹ، ٹائیلٹ پیپر باتھ ٹب مکسڈ بار پارٹیز بے دوپٹہ، عریاں جسم بے حیائی، بددیانتی، دورنگی افرنگی کی ہر چیز کو بلا کی سرعت کے ساتھ میں نے نقل کیا۔ کتنی عجیب زندگی ہے میری۔ تمہارے لیے میں نے اے انگریز، خدا سے بغاوت کی۔ اس کے آخری رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بغاوت کی۔ انسانیت، شرافت، مروت سب کو جلا کر خاک کر دیا۔ میرے ہونٹ مسلمانوں کے خون سے رنگیں۔ تمہارے دیئے تمغے میرے بزرگوں کے اور میرے پاس عزت سے محفوظ۔ مسلم کشی کے یہ تحفے نفس پرستی کا یہ سرمایہ۔ سمندر سے پار آئی ہوئی یہ تہذیب اور لعنتی زندگی کے نشانات، کیا خود فریبی ہے۔ کرسمس کارڈ بھیج کر دوستوں سے بھی غلامی کی یاد منواتا ہوں، پلید اور خبیث زندگی کی یادگاریں میں اپنی اولاد کے سپرد کرتا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ میں آزاد

ہوں۔ جب تک میں اور میرے بچے غلامی کے ملعون نشانوں کو چن چن کر نہ مٹا لیں، میں قوموں کی مجلس میں کب پرواز کر سکتا ہوں۔ میرا ملکی پرچم فضا کی بلندی پر کب پہنچ سکتا ہے۔ آہ غلامی کی یادگاریں۔ آزاد ہونے دو۔ پاکستان سے ان غلامی کے نشانوں کو مٹنے دو۔ یہ ایک جلے ہوئے دل کی آہ ہے۔ ایک ان سنی ہوئی آواز کی صدائے بازگشت ہے۔ شرمندہ آنکھوں کے آنسو ہیں جن کی شاید کوئی قیمت نہیں۔

لطیف صاحب میرے نام کے ۲۵ مئی ۶۲ء کے خط میں لکھتے ہیں "اب سوکھا درخت ہوں جس کے برگ و بار عمر کی خزاں نے خشک کر دیئے اب نہ کوئی پرندہ بسیرا کرتا ہے نہ کوئی عندلیب آکر چہچہاتا ہے۔ کسی دن مالی اکھاڑ کر پھینک دے گا" اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے کے ۱۲ فروری کے خط میں لکھتے ہیں "دنیا گزری جا رہی ہے۔ نہ ہمارے باپ دادا کے پاس رہی نہ اب یہ ہمارے پاس رہے گی۔ دانشمندی یہ ہے کہ اس کام میں مصروف رہیں اور اس کام کو پورا کریں جس کا شریعت نے مطالبہ کیا ہے اور جس کا حساب خداوند کریم لیں گے"۔

لطیف صاحب کی شخصیت کے اس پہلو کے جائزہ سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ اس ادارہ کے بالکل ابتدائی سالوں میں بھی اگر سب نہیں تو دو استاد کس کردار اور ذہن کے تھے۔ اس ابتدائی دور کے طلبہ آگے چل کر دل و جان سے پاکستان کے کام آئے تو کیوں آئے۔

لیفٹیننٹ کرنل محمد گلشیر[1]

لطیف صاحب کو ہم آئیڈیل استاد سمجھتے تھے۔ سب سے پہلے تو ان کا سراپا ہی مسحور کن تھا۔ چھریرا بدن، درازقد، فرنچ کٹ سیاہ داڑھی رسالے کی برجیس، فل بوٹ اور طرہ دار پگڑی میں بہت شاندار لگتے تھے۔ اس وقت سٹاف میں ان سے زیادہ سمارٹ کوئی اور نہ تھا۔ یہ تو ظاہری پہلو تھا لیکن شخصیت کے لحاظ سے بھی کم منفرد نہیں تھے شفقت

[1] کالج نمبر ۲۵۰ زمانہ تعلیم ۱۹۲۹ تا ۱۹۳۶ء کالج ہیڈ بوائے اور گارڈز میڈل ونر

کے ساتھ ساتھ سخت بھی بہت تھے۔ اس زمانے میں جتنے لڑکوں کو سزائیں ملی ہیں ان میں سے کم از کم ایک تہائی ان کی رپورٹ کی ہوئی ہوں گی۔ ڈسپلن کے معاملے میں وہ کسی رعایت کے قائل نہ تھے۔ بہت اچھا پڑھاتے لیکن ذرا سی غلطی پر بھی سخت سزا دیتے۔ ایک دن ٹرانسلیشن کرا رہے تھے۔ مجھ سے کوئی فاش غلطی ہوئی، سخت غصے میں آ گئے۔ میز پر پتہ نہیں کس وجہ سے ایک سریا کا ٹکڑا پڑا تھا وہی بائیں ہاتھ پر اتنی زور سے مارا کہ خون نکل آیا۔ دوسرے ہفتے پھر مجھ سے ٹرانسلیشن کرایا جو صحیح نکلا۔ بہت خوش ہوئے فرمایا گلشیر تو میرا حقیقی بیٹا ہوتا تو میں تیرا منہ چوم لیتا۔ وہ میرے لیے ایک فرشتہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

لطیف صاحب نے مجھے سات سال پڑھایا لیکن ہمیشہ شیر کی نگاہ رکھی۔ ان کی توجہ سے دل ان کی طرف کھنچتا تھا لیکن ان کی سختی سے ڈر بھی لگتا رہتا تھا۔ ۱۲ جون ۱۹۳۶ء کی رات پکچز کالج کے لیے سکول کو چھوڑنے سے پہلے ڈرتے ڈرتے رابرٹس ہاؤس کے دائیں کوارٹر پر گیا۔ دروازہ کھلا تھا ابھی میں نے دستک نہیں دی تھی کہ اندر سے دعا کی آواز آئی۔ جھانک کر دیکھا تو لطیف صاحب مصلے پر نظر آئے عشا کی نماز کے بعد دعا مانگ رہے تھے۔ اور دعا کیا تھی؟ جو الفاظ میں نے اپنے کانوں سے سنے اور جو میرے دل پہ نقش ہو گئے ہیں، یہ تھے۔ بار الٰہ، آج گل شیر یہاں سے جا رہا ہے اس نے سات برس میری جھڑکیں صبر سے سہی ہیں، یا اللہ اس کو اپنی رحمت میں رکھ۔ اسے کامیابی عطا کر، اور وہ بار بار یہ الفاظ دہرا رہے تھے "گلشیر کو کامیابی عطا کر" میں یہ سن کر حیرت اور خوشی سے پتھر کا سا ہو گیا نہ دستک کے لیے ہاتھ اٹھا اور نہ پاؤں۔ ایک آدھ منٹ مجھ پر یہ کیفیت طاری رہی۔ جب وہ مصلے سے اٹھے تو میں بڑی پھرتی سے پلٹا۔ لیکن شاید انہیں میری موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ پوچھا کون اور باہر نکل آئے۔ مجھے دیکھ کر بولے "اچھا گلشیر ہے" پھر فرمایا "گلشیر تو نے سات برس تک بغیر اُف کیے میری جھڑکیں سہی ہیں، آج میرا جی چاہتا ہے کہ سرائے کے سٹیشن تک تیرے ساتھ ننگے پاؤں چلوں" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں سر جھکا کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا "گلشیر، تو ہر

امتحان میں پورا اترا، جا اللہ کا نام لے کر آگے بڑھ۔" اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے، وہ صرف استاد نہیں میرے پیر و مرشد بھی تھے۔

—— لیفٹیننٹ کرنل خوشی محمد[1]

اکثر پریپ میں دسویں کے لڑکوں کو کوئی نہ کوئی مشکل سوال دے دیتے کہ اس کا حل سوچیں۔ ایک بار کلاس سے ایک نیا سوال پوچھا کہ واقعی شیکسپیئر کبھی تھا؟ کلاس نے اس کے حقیقی انسان ہونے کی جتنی دلیلیں دیں انھوں نے ان کا کاٹ کیا۔ مشکل سوال دے کر وہ قوت تفکر اور قوت استدلال کو بڑھاتے تھے۔ وہ ڈیوٹی کے سوا دوسرے اوقات میں خس کا عطر استعمال کرتے تھے۔ رات پریپ میں ان کے آنے سے پہلے ان کے عطر کی تیز خوشبو پہنچ جاتی اور لڑکے چوکنے ہو جاتے۔

—— لیفٹیننٹ جنرل رحمان گل ایم سی

مشہور تھا کہ کبھی کلاس میں لیٹ نہیں ہوئے اور کبھی چھٹی نہیں لی۔ اسی طرح کبھی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ شعائر اسلام کے سختی سے پابند تھے۔

—— میجر گل حیدر خان

لطیف صاحب کو ہاؤس ماسٹر اور ڈیوٹی آفیسر کی حیثیت سے کبھی کبھی کھانا چیک کرنا ہوتا تھا۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی شوربے میں ڈبو کر چکھتے تھے۔ پھر اسے بھی باہر جا کر تھوک دیتے تھے۔

—— لیفٹیننٹ کرنل شیر محمد ستارۂ جرأت[2]

تاریخ پڑھاتے ہوئے اسلامی اور قومی عصبیت کے تقاضوں کو بھی خاص طور سے ملحوظ

---

[1] کالج نمبر ۲۵۳ زمانہ تعلیم ۱۹۲۹-۳۷ء [2] زمانہ تعلیم ۱۹۳۲-۳۷ء

رکھتے تھے۔ قومی احساس سب سے پہلے انہی نے ہمارے دلوں میں جگایا۔ شروع شروع میں قدرے تند خو ضرور تھے لیکن آخر آخر میں قلب میں گداز آگیا تھا۔ ہمارے لیے ان کی حیثیت چراغ راہ گذر کی سی تھی۔

صوبیدار ولایت شاہ

—— لیفٹیننٹ کرنل خداداد خان[1]

کچھ وقفہ سے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۶ء تک سکول میں استاد رہے۔ پانچویں چھٹی جماعتوں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ بظاہر علمی قابلیت واجبی ہی سی تھی لیکن پڑھاتے بڑی تندہی اور محنت سے تھے۔ انگریزی الفاظ کا صحیح تلفظ بتانے کے لیے منہ سے مختلف شکلیں بناتے اور آوازیں نکالتے۔ زبان کو یوں گھماؤ ہونٹوں کو یوں بند کرو اس طرح گول کر کے کھولو۔ غرض اپنی سی بہت کوشش کرتے۔ وہ ڈائریکٹ میتھڈ سے پڑھاتے تھے۔ کلاس میں چھوٹے چھوٹے ڈرامے بھی کراتے مجھے یاد ہے کہ بھیڑیئے اور میمنے کی مشہور کہانی انہوں نے ڈرامائی انداز سے پڑھائی تھی۔ ساؤتھ وزیرستان کا ایک مضبوط اور قدآور لڑکا تھا ۵۳۳ محمد اشرف اسے وولف بنایا تھا اور ۱۹۳۵ء کی انٹری کا سب سے سینئر لیکن سب سے چھوٹا لڑکا ۵۵۸ فتح یار خان لیمب بنا تھا۔ عملی تعلیم کے لیے اکثر کلاس کو کلاس روم سے باہر لے جاتے تھے۔ پڑھانے سے ان کی لگن آج انکو بھی یاد آتی ہے جو اس وقت ان کی سادگی پر ہنستے تھے۔ ان کے کردار کی ایک مثال دیتا ہوں کہ انہوں نے خود اپنے بیٹے عبدالرحمان کو ہاؤس میں سگریٹ پینے پر کمانڈانٹ سیلی کے سامنے پلش کروایا اور بید لگوائے۔

۱۹۳۵ء میں شاہ صاحب انڈین دستے کے ساتھ جارج پنجم کی سلور جوبلی کی تقریب میں شرکت کرنے انگلستان گئے تھے۔ واپسی میں سنٹرل ہال میں ان کا لیکچر ہوا جس کے شروع میں انہوں نے اپنی ایک طویل نظم بھی سنائی۔ (اتنے کم سواد بھی نہیں تھے جتنے نظر آتے تھے) جس کے دو شعر مجھے آج پچاس برس کے بعد بھی یاد آرہے ہیں۔

---

[1] کالج نمبر ۵۸۴ زمانہ تعلیم ۱۹۳۵ تا ۱۹۴۱ء

خیال آیا کہ ہند سے بھی جائے ایک کنٹجنٹ
زمانے کے بہادر ہوں اور وفاداری میں ہوں یکتا
عجب منظر نظر آیا چڑھے جب ہم "نزولا" پر
کہیں مچھلی تڑپتی تھی کہیں بگلا جھپٹتا تھا

جنگ عظیم دوم میں کمیشن ہوکر ناردرن کمانڈ ہیڈکوارٹرز میں پوسٹ ہوگئے تھے۔ میجر ہوکر ریٹائر ہوئے۔ سیاہ داڑھی تھی۔

صوبیدار جعفر شاہ

لیفٹیننٹ جنرل رحمان گل [1]

جعفر شاہ صاحب نجیب الطرفین سید تھے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ سید علی ہمدانی تھے جن کی تعریف میں اقبال نے جاوید نامہ میں کہا ہے:

سید السادات سالار عجم   دست او معمار تقدیر امم

اس حوالے سے انہیں دینی شغف اور علمی ذوق ورثے میں ملا تھا۔ اپنے نسبی شرف کی بناء پر صوبیدار صاحب شاہ جی کے لقب سے معروف تھے اور بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ شاہ جی غیر معمولی طور پر وجیہہ و شکیل ہونے کے علاوہ چاک و چوبند بھی بہت تھے اور ہاکی کے نامور کھلاڑی بھی۔ سنٹر فارورڈ کھیلتے تھے۔ چھریرے بدن کی وجہ سے فیلڈ میں بجلی کی طرح کوندتے پھرتے تھے۔ گھٹنے کی نی کیپ ان کی پہچان تھی۔

ـــــــ لیفٹیننٹ کرنل محمد گلشیر

رومن اردو کے مانے ہوئے استاد تھے۔ بڑے خوش مزاج تھے۔ لڑکوں سے "میرا بچہ" کہہ کر بات کرتے تھے۔

---

[1] زمانہ تعلیم ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۸ء

ـــــــبریگیڈیر محمد امیر خانؒ

شاہ صاحب میرے علاقے چکوال کے تھے، میرے والد سے بڑے مراسم تھے، میرے داخلے کے وقت زمینداری کی مصروفیتوں کی وجہ سے وہ میرے ساتھ نہ آ سکتے تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب سے تذکرہ کیا۔ انہوں نے کہا کوئی بات نہیں، آپ امیر کو بروقت سکول بھیج دیں۔ باقی کام میں سنبھال لوں گا۔ چنانچہ سکول کے گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی میری نظر ان پر پڑی، انہیں ڈھونڈنے لگیں سنٹرل ہال کے قریب کھڑے وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ چونکہ دوسرے لڑکے اپنے والدین کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ میں نے بھی ان کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو بولے "امیر خان تم یہاں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے آئے ہو۔ میرا ہاتھ نہ پکڑو۔ حوصلہ رکھو۔ آج کے بارے میں یہ کاغذات اپنے ساتھ رکھو۔ جہاں دوسرے لڑکے اپنے بزرگوں کے ساتھ جائیں تم بھی ادھر ہی چلے جاؤ۔ آخر کار تم ہاؤس میں میرے پاس آ جاؤ گے۔ وہاں میں تمہارا انتظار کروں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس وقت تو مجھے کچھ مایوسی سی ہوئی تھی اچھا چچا بنے ہیں کہ ساتھ لے کر داخلہ بھی پورا نہیں کراتے لیکن آج میں یہ سطور لکھتے وقت ان کی روح کو دعائیں دے رہا ہوں۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا جو پہلا سبق انہوں نے مجھے پڑھایا، وہ زندگی بھر میرے کام آیا۔

شاہ صاحب نے میرے گھر والوں کو منع کر رکھا تھا کہ پہلے دو چار ہفتے مجھ سے ملنے کوئی نہ آئے۔ جب کچھ دن گزر گئے تو انہوں نے میرے سب گھر والوں کو بلایا اور مجھے پی ٹی پریڈ کرتے بھاگتے دوڑتے دکھایا۔ میری بہن اب بھی کبھی کبھی اس وزٹ کا تذکرہ کرتی ہیں۔ میری عادت ہے کہ جب کبھی شاہ صاحب کا ذکر آئے ہیں ان کے لیے دعا ضرور کرتا ہوں۔ علم تو بہت بڑھ گیا ہے۔ تعلیم کی سہولتیں بھی بدرجہا زیادہ ہیں خدا کرے ہماری اور آئندہ نسلوں کو استاد بھی بہتر ملیں۔

ـــــــپروفیسر سعید راشد

شاہ صاحب کا جواں بیٹا افتخار جعفر جب ستمبر ۱۹۶۵ء میں لاہور کے محاذ پر مردانہ وار لڑتا ہوا شہید ہوا تو میرا دل کٹ کے رہ گیا۔ اس کی اٹھان میں نے دیکھی تھی۔ جیتا رہتا تو چاند سورج بنتا۔

ـــــــــــــــــــــــ

لہ زمانہ تعلیم ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۷ء

اس وقت تک شاہ صاحب سے میرا براہِ راست تعارف نہ تھا۔ بہرحال میں نے شاہ صاحب کو تعزیت کا خط لکھا اور ذرا قلم روک کے لکھا کہ وہ باپ ہیں کہیں ان کے صبر کا پیمانہ چھلک نہ جائے۔ تیسرے دن شاہ صاحب کا جواب آیا "جو حکم مولا سر تسلیم خم ہے، خوش ہوں کہ افتخار نے سیدزادگی کی لاج رکھی اور بڑی شان سے رکھی میجر امیر افضل نے ہلال میں لکھا ہے کہ میرا لال افتخار کس شان سے شہید ہوا الحمدللہ! الحمدللہ!

میں چاہتا تھا کہ افتخار کی شہادت پر کچھ تربیت میں لکھوں۔ اس سلسلہ میں افتخار کی ابتدائی زندگی کے کوائف کے لیے شاہ صاحب سے کچھ خط وکتابت رہی۔ ۱۹۶۷ء کے کالج کے سالانہ جلسہ کی تقریب کے موقع پر ملاقات ہوئی۔ مجھ سے گلے لگ کے روئے۔ آپ استاد ہیں، میں باپ، ہمارا حق بنتا ہے کہ ایک دوسرے کا غم ہلکا کریں۔ کچھ دیر ملاقات رہی۔ میں نے بچوں کے بارے میں پوچھا تو فرمایا ایک بیٹا پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔ دو الحمدللہ فوج میں افسر ہو گئے ہیں۔ چوتھا آپ کا افتخار اس سبز ہلالی پرچم پر قربان ہوا۔ ایک ابھی بہت چھوٹا ہے۔ جب میں نے پوچھا کہ آپ ابھی لاہور ہی میں ہیں فرمایا، جی ہاں۔ ریلوے کے واچ اینڈ وارڈ میں انسپکٹری کی نوکری کر رہا ہوں۔

"گھر کہاں بنایا ہے؟"

ہنس کر کہا، "گھر بنانے والوں کو بنا رہا ہوں،" مولیٰ علی کا کرم ہے کہ عزت سے جیتا ہوں لیکن افتخار کے زخم کو کیا کروں۔ اس کی تصویر صبح شام آنکھوں میں پھرتی رہتی ہے۔" وہ پھر خاموشی سے اشکبار ہوئے۔ میں نے اسی وقت ارادہ کیا تھا کہ افتخار کی یاد میں کچھ لکھوں گا۔ یہی یاد (تذکرہ شہداء کی بنیاد بنی (جس میں افتخار جعفر اور کالج کے دوسرے پندرہ شہداء کا تذکرہ ہے) اگر یہ کوئی خدمت ہے تو اس کا ثواب سید جعفر شاہ کو جاتا ہے۔ بڑی نسبت تھی۔ بڑا ظرف اور بڑی فراست بھی۔

محمد بخش کمپاؤنڈر

—— بریگیڈئر محمد حیات[1]

ایک مہربان روح، بیمار بچوں کی دیکھ بھال اس طرح کرتا کہ گھر بھول جاتا۔ کہنے کو نونرسنگ

[1] زمانہ تعلیم ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۲ء کالج نمبر ۱۹

اسسٹنٹ تھا۔ لیکن بچوں کے لیے ڈاکٹر سے بڑھ کر تھا۔

کریم بخش مالی

—— صوبیدار میجر حق نواز[1]

ادھیڑ عمر، بھاری بدن کا تھا۔ داڑھی کھچڑی تھی، آدھے بال سفید، کنٹین کے پیچھے اور اس جگہ کہ جہاں اب نئی لائبریری ہے سفیدے کے درختوں کا جھنڈ تھا یہ اسی نے لگایا تھا۔ رابرٹس ہاؤس سے برڈوڈ ہاؤس تک سرکلر روڈ کے ساتھ پھولوں کی بہار اسی کے دم سے تھی۔

—— بریگیڈئر رب نواز[2]

جالندھر کا بوڑھا ہیڈ مالی کریم بھی ایک کردار تھا۔ دوہرے بدن کا، ذرا جھک کر چلتا تھا۔ لڑکوں میں گپ تھی بابا کریم افیون کھاتا ہے۔ کھاتا ہو یا نہ کھاتا ہو اپنے کام میں مگن رہتا تھا۔ وار میموریل کے علاقے کو گل و گلزار بنا رکھا تھا۔ ۱۱ نومبر کی آرمسٹس ڈے پریڈ کے لیے خاص طور سے پھول اگاتا تھا۔ میموریل پر چڑھانے کے لیے بڑے شاندار گجرے بناتا تھا۔ گو منصب چھوٹا لیکن آدمی بڑا تھا۔

چوکیدار غزن

—— میجر مولا بخش[3]

پنشنر سپاہی بابا غزن خان رابرٹس ہاؤس میں چوکیدار کی ڈیوٹی کرتے تھے، ہاؤس کے لیمپ جلانا بجھانا، چمنی صاف کرنا اور مٹی کا تیل ڈالنا ان کے ذمے تھا۔ دراز قد تھے۔ داڑھی کو مہندی لگاتے تھے۔ اپنی ڈیوٹی میں بہت پکے تھے۔ کبھی موڈ میں ہوتے تو جنگ کے قصے اور پشتو کے ٹپے سناتے تھے۔ چھوٹے لڑکے خان بابا سے بہت مانوس تھے۔ رات کو فرش پر لاٹھی کو مارتے

---

[1] کالج نمبر ۵۶ تعلیم ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۰ء [2] کالج نمبر ۱۷۳ زمانہ تعلیم ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۳ء

[3] سکول نمبر ۳۵ زمانہ تعلیم ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۰ء

تو چنگاریاں نکل آتی تھیں۔

کیپٹن ایچ ایچ کلارک

—— بریگیڈئر عباس بیگ[1]

۱۹۳۰ء میں سکول کی کمانڈانٹی کا چارج لیا۔ ۱۹۳۳ء میں پوسٹ آؤٹ ہوئے۔ رائل ملٹری اکیڈمی سنیڈ ہرسٹ میں انسٹرکٹر رہے تھے۔ ماہر تعلیم تھے۔ ریاضی سے خاصی دلچسپی تھی۔ انہوں نے آتے ہی سکول کے تعلیمی معیار کو اونچا کرنے کی کوشش کی۔ سکول آٹھویں تک منظور شدہ تھا۔ انہوں نے اپنے طور پر جی۔ ایچ۔ کیو سے اجازت لے کر ۱۹۳۰ء میں نویں شروع کرائی۔ اگلے سال دسویں کی کلاسیں شروع کرائیں جس سے لڑکوں کو آرمی کے امتحانات پاس کرنے میں بہت آسانی ہوئی اور کمیشن کا راستہ کھلا۔

انہوں نے سکول کو فوجی رچ دیا۔ بہت ایکٹو تھے۔ صبح سے رات گئے تک وردی میں نظر آتے تھے۔ مزاج میں سختی تھی آواز بھی بلند تھی۔ چلتے بھی تھے پاؤں دبا کر، دور سے پتہ چل جاتا کہ کہ کمانڈانٹ آرہے ہیں۔

نویں دسویں کی کلاسیں شروع ہوئیں تو کبھی کبھی حساب اور انگریزی کا پیریڈ لیتے تھے۔ انہیں نے انگریزی پڑھانے کے لیے ایک وارنٹ آفیسر کو پوسٹ کروایا۔

۱۹۴۷ء کے اوائل میں جب میں میجر کے رینک میں سینئر افسروں کے کورس پر انگلینڈ گیا تو کلارک صاحب نے مجھے ایسٹر کی چھٹیوں میں اپنے گھر کیمبرلے بلایا۔ اس وقت تک وہ لیفٹیننٹ کرنل ہوکر ریٹائر ہو چکے تھے۔ وہ دیر تک فرداً فرداً اپنے دور کے لڑکوں کے بارے میں پوچھتے رہے ۱۹ محمد حیات، ۱۱۳ محمد نواز، ۱۷۳ رب نواز، ۲۵۰ گلشیر اور ۲۶۱ رحمان گل وغیرہ کے کمیشن لینے اور ترقی کرنے کی خبر سے بہت خوش ہوئے تھے۔

---

[1] سابق ڈائریکٹر آرٹلری زمانہ ۱۹۳۳ء

مسز کلارک

——— صوبیدار میجر خداداد خان[1]

کالج کے دوسرے کمانڈانٹ کیپٹن ایچ ایچ کلارک کی بیوی مسز کلارک پانچویں چھٹی کلاسوں میں باری باری ہفتہ میں ایک بار ہاؤس وائف کا پیریڈ لیتی تھیں۔ (ہاؤس وائف ایک مضمون تھا جس میں لڑکوں کو سینا پرونا، بٹن ٹانکنا۔ موزوں کی مرمت وغیرہ سکھانا ہوتا تھا۔) خود ان کو شاید نٹنگ کا زیادہ شوق تھا۔ کلاس میں آتیں تو ہاتھ میں ایک چھوٹی سی باسکٹ ہوتی جس میں اون کے گولے اور سلائیاں ہوتیں۔ اپنی انگریزی کے بیچ بیچ میں لڑکوں کی سہولت کے لیے ایک آدھ لفظ اردو پنجابی کا استعمال کرتی جاتی تھیں جس کی وجہ سے لڑکے ان سے مانوس ہو گئے تھے۔ چند نے تو ان سے سوئیٹر بننا بھی سیکھ لیا تھا۔

دراز قد اور ہنس مکھ تھیں۔ ان کے چھوٹے لڑکوں سے گھل مل کر انگریزی بولنے سے ان کی انگریزی بولنے کی جھجک دور ہوئی۔ وہ مسلمان سرداروں کے گھروں کا بھی چکر لگاتی تھیں اور ٹوٹی پھوٹی پنجابی سے کام چلاتی تھیں۔

ایچ ایچ کلارک ذرا سخت طبیعت تھے یہ نرم مزاج تھیں۔ لڑکوں کے لیے یہ اچھا امتزاج تھا مسز کلارک کے اپنے میاں کے کام میں ہاتھ بٹانے سے ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کم از کم تعلیم وتربیت کا کام ایسا ہے جس میں میاں بیوی دونوں مل جل کر کام کریں تو اس کا اچھا نتیجہ نکلتا ہے۔

وارنٹ آفیسر ایٹن

——— بریگیڈئر عباس بیگ

درمیانہ قد، بھاری بدن، لمبوترا چہرہ، بال کھچڑی کالے، کچھ سفید، مسٹر ایٹن ۱۹۳۲ء میں سکول میں آئے۔ نویں دسویں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ تلفظ پر بہت زور دیتے تھے۔ کلاس میں کم گو اور قدرے خشک۔ کلاس سے باہر سافٹ تھے۔ ان کے آنے سے لڑکوں کو آرمی کے امتحانات

---

[1] زمانہ تعلیم ۱۹۲۵ تا ۱۹۳۰ء، اسکول نمبر ۶۸۔

پاس کرنے میں بہت مدد ملی۔ ان کی مسز خاصی دراز قد تھیں اور اپنے سنہری بالوں کو سر کے جھٹکے سے پیچھے کرتی تھیں۔ کھیلوں پر دونوں میاں بیوی آتے تھے۔ عموماً ہفتے اتوار کی شام کو دونوں اسکول کی ٹھنڈی سڑک پر چہل قدمی کرتے نظر آتے اور گزرتے ہوئے لڑکوں سے ہیلو کرتے جاتے تھے۔

——لیفٹیننٹ کرنل محمد گلبشیر

ایٹن صاحب کی خشک مزاجی مشہور تھی گو آرمی سپیشل کلاس میں ہمارا تجربہ مختلف تھا۔ ایک روز کہنے لگے میرا نام کچھ غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔ میرا تعلق مشہور پبلک سکول ایٹن سے قطعاً کچھ نہیں۔ لیکن مسٹر ایٹن پبلک سکول ٹائپ نیچر ضرور تھے۔ ان کی خوش مزاجی کی ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک بار لڑکوں نے پوچھ لیا "سر آپ کی عمر کیا ہے"؟ انہوں نے اس سوال کا جواب بڑے دلچسپ انداز میں دیا۔ کہا تم لوگوں نے صرف عمر پوچھی ہے لیکن میں یہ بھی بتاتا ہوں کہ میں پیدا کیسے ہوا۔ ایک دن رات ہوتے ہوئے ایک دم توپیں چلنے لگیں، پھر گرجوں میں گھنٹیاں بجیں، پھر آتش بازی چھوٹنے لگی۔ میری ماں یہ تماشا دیکھنے مکان کی اوپر کی منزل پر گئیں۔ شور و غل اور ہنگامہ دیکھ کر گھبرا گئیں اور جب نیچے آئیں میں پیدا ہو گیا۔ یہ ہنگامہ کنگ ایڈورڈ ہشتم کی پیدائش پر برپا ہوا تھا اب آپ حساب لگالیں کہ میری عمر کتنی ہے۔

مولوی محمد یوسف صاحب

——لیفٹیننٹ کرنل فضل الرحمٰن ایم سی[1]

یوسف صاحب کا تذکرہ اس سکول کے بڑے بڑے استادوں کے ساتھ آنا چاہیے۔ لڑکوں نے ان سے بڑا گہرا اثر قبول کیا۔ ان سے پہلے اور بعد یہاں ریٹائرڈ صوبیدار اس منصب

---

[1] کالج نمبر ۲۷۰ زمانہ تعلیم ۱۹۳۱ تا ۱۹۳۷ء

پر رہے۔ یوسف صاحب پہلے باقاعدہ مولوی تھے جو امام اور دینیات کے استاد مقرر ہوئے۔ وہ سکہ بند عالم تھے۔ ظاہری شخصیت بھی غیر معمولی تھی۔ درمیانہ قد، سلیقے سے ترشی ہوئی چھوٹی داڑھی، شیروانی پر شعلے کی پگڑی، یہ تھے مولوی محمد یوسف بہت خوش لباس اور خوددار، قرأت بھی بہت اچھی تھی لیکن اصل چیز ان کی تفہیم دین تھی۔ طلباء کے لیے بہت کچھ تھے۔ انہوں نے مذہب اور مذہبی معلومات کو جس طرح پیش کیا اس سے لڑکے بہت متاثر ہوئے۔

ایک سکول خصوصاً ملٹری کالج قسم کے ادارے میں کوئی کارکن کسی درجے کا بھی ہو تو بات نہیں بنتی۔ امام اور دینیات کے استاد کو اونچے سے اونچے درجے کا ہونا چاہیے۔ مولوی محمد یوسف کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

رسالدار میجر احمد علی خان

ـــــ میجر گل حیدر خان[1]

رسالدار میجر احمد علی خان تھے رہتک کلانور کے علاقے کے لیکن زیادہ عرصے دہلی میں رہنے کی وجہ سے وہاں کا تہذیبی رنگ بھی چڑھا ہوا تھا۔ طرز زندگی شاہانہ تھی اور مزاج شاعرانہ سینئر کلاسز کو اردو پڑھاتے تھے۔ ان کے پڑھانے سے اردو پڑھنے کا وہ مزہ آیا اور پتہ چلا کہ ادب بھی کوئی چیز ہے۔ اکثر کلاس میں شعر سناتے تھے۔ غالباً خود بھی شاعر تھے اور والہانہ انداز سے شعر سناتے تھے۔ انہوں نے ہماری ادبی تربیت کی اور ادب کے حوالے سے کچھ قومی جذبے کی جوت بھی جگائی۔

ان کا اردو اور عربی کا خط تصویر تھا۔ کبھی خوش ہوتے تو اپنے ہاتھ سے کوئی قطعہ یا آیت لکھ کر دیتے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی سکول سے رابطہ رکھا اور جمعہ کی نماز کے بعد مسجد میں کسی اسلامی یا تاریخی موضوع پر تقریر کیا کرتے تھے۔ تقسیم کے وقت پٹیالہ میں مجسٹریٹ لگے ہوئے تھے جب ہجرت کرکے پاکستان آرہے تھے تو ان کو ان کے بیٹے شمشاد علی خان کو بلکہ سارے کنبے کو سکھوں نے شہید کر دیا۔ احمد علی خان ان چند ممتاز استادوں میں سے ایک تھے جنہوں نے

---

[1] زمانہ تعلیم ۱۹۳۰ تا ۱۹۳۶ء

سکول میں اسلامی جذبے کو فروغ دیا۔

کیپٹن (لیفٹیننٹ کرنل) ولیم فلپ سیلبی، ایم اے، ایم سی، ایم بی ای

——بریگیڈئر محمد حیات

کرنل سیلبی کرائسٹ کالج ابرڈین (سکاٹ لینڈ) میں عبرانی کے پروفیسر ریورنڈ جان اے سیلبی ڈی ڈی (ڈاکٹر آف ڈیوینٹی) کے بڑے بیٹے تھے۔ ڈاکٹر جان سیلبی اپنے دور کے ایک بہت ہی ممتاز سکالر تھے۔ بیٹے نے باپ کی علمیت اور مذہبیت ورثے میں پائی تھی۔ کرنل سیلبی گرامر سکول ابرڈین کے پروردہ تھے۔ کنگس کالج ابرڈین سے کلاسکس میں فرسٹ کلاس میں گریجوایشن کیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے مشہور پیمبروک کالج سے کلاسکس ہی میں ایک اور ڈگری لی۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں فوج میں کمیشن لیا۔ مغربی محاذ کے ایک معرکہ میں ملٹری کراس بھی حاصل کیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں ایجوکیشن کور سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں آرمی کے سکول آف ایجوکیشن ویلنگٹن میں انسٹرکٹر بھی رہے تھے۔ مئی ۱۹۳۳ء میں انہوں نے کیپٹن کے رینک میں ملٹری سکول جہلم کی کمان سنبھالی۔ جناب سیلبی کی بلند قامت، بدن اکہرا اور چہرہ کتابی تھا اور سر کے بال چاندی کی طرح سفید۔ گول شیشوں اور باریک سنہرے فریم کی عینک لگاتے تھے وہ نرم خو اور نرم رو تھے۔ کم گو اور آہستہ گو بھی۔ ان کی پوری شخصیت کا تاثر کچھ ایسا تھا جیسے کوئی دانشور صوفی کسی خانقاہ سے اٹھ کر کارزار حیات میں درس زندگی دینے آیا ہو۔ ان کے چہرہ پر علم و آگہی کی دمک اور آنکھوں میں روحانیت کی روشنی تھی۔ صاف نظر آتا تھا یہ ایم سی معلم و منظم مرد خود آگاہ و خدامست ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ سکول کی زندگی کے اس موڑ پر کیپٹن سیلبی کا یہاں پرنسپل ہو کر آنا سکول کے لیے اور اس دور کے طلباء کے لیے جب ان کے لیے مستقبل کی ترقیوں کے دروازے کھلنے شروع ہو رہے تھے اور کردار کی تشکیل ہو رہی تھی، ایک رحمت خداوندی کی حیثیت رکھتا تھا۔ سیلبی کے عہد میں سکول نے ہمہ جہتی ترقی کی۔ آرمی کے امتحانات شروع ہوئے جن سے

کمیشن کا راستہ کھلا۔ سکول نے باقاعدہ ہائی سکول کا درجہ حاصل کیا۔ پہلی بار گریجویٹ انسٹرکٹرز پوسٹ ہوئے Working conditions اور Living conditions میں بے انتہا اضافہ ہوا۔ بجلی پانی، میس، فرنیچر سب اس دور میں آئے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ جناب سیلبی کی ہی وجہ سے سکول کا انفرادی تشخص ابھرا۔ منجملہ اور باتوں کے ۱۹۳۶ء میں سیلبی ہی نے سکول کی پہلی ری یونین کی تھی یعنی پچھلے سالوں کے لڑکوں کو بلا کر یکجا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لڑکوں کے سکول چھوڑنے کے بعد کے کیریئر کا ریکارڈ رکھنا انہی نے شروع کیا۔

ـــــ بریگیڈئر محمد عباس بیگ[1]

میں نے سکول میں سیلبی صاحب کے چند ماہ ہی دیکھے۔ اس عرصے کی ایک بات بہت واضح طور پر یاد ہے کہ جب کبھی روٹ مارچ پر نہر کے کنارے جاتے تو واپسی میں سائفن کے قریب پہنچ کر وہ کھلا چھوڑ دیتے اور کہتے سکول تک جتنا چاہے دل کھول کر شور مچاؤ۔ لڑکوں کو ایسی چھٹی ملے۔ وہ شور ہوتا کہ الاماں۔

ان کی لڑکوں کے کیریئر سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں سکول سے فارغ ہو کر ۱۹ حیات اور ۳، رب نواز، ایم اے ٹی سی انبالہ میں پہنچے بھی نہیں تھے کہ انہوں نے ہمارے پلاٹون کمانڈر کیپٹن فلپ کو خط لکھ دیا تھا کہ میرے سکول کے یہ تین ہونہار لڑکے آرٹلری سنٹر آ رہے ہیں۔ ان کو وائی کیڈٹ بنا کر کمیشن کے لیے تیار کرو۔ ہمارے سنٹر کمانڈانٹ سے بھی جناب سیلبی نے ہماری ٹریننگ کے زمانہ میں مسلسل رابطہ رکھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کیپٹن فلپ نے ہمیں پڑھنے کے لیے بہت وقت دیا اور وہ خود بھی پڑھ لیا کرتا تھا۔ سنٹر ہی سے ہم تینوں ۱۹۳۶ء میں کیڈٹ کالج نوگانگ گئے۔ اتفاق سے تینوں بریگیڈیئر ہوئے۔ ۱۹ حیات تو ماشاءاللہ سفیر بھی ہوئے اور اب سینیٹر بھی ہیں۔

---

[1] کالج نمبر ۱۹۱

ـــــ صوبیدار میجر جمروز خان[1]

میرے دل سے تو سیلی صاحب کے لیے صبح شام دعا ہی نکلتی ہے۔ میرے حق میں تو وہ فرشتۂ رحمت ہی تھے۔ میرے والد پہلی جنگ عظیم میں مصر کے محاذ پر کام آئے تھے۔ ۴۶ پنجاب میں سپاہی تھے۔ بارغ علی خاں نام تھا۔ بن باپ کے بچے کی تعلیم کیا ہوتی۔ جیسے تیسے کرکے ۱۹۳۰ء میں کے۔ جی۔ آر جہلم میں داخل ہوا تھا۔ ۲۳۶ سکول نمبر تھا۔ ۱۹۳۳ء کے اواخر میں رکا وٹیں پھلانگتے گھٹنے میں بری طرح چوٹ لگی۔ آئی ایم ایچ جہلم میں تقریباً سال بھر پلاسٹر میں پڑا رہا اس تمام عرصے میں مہینے میں کم از کم دو بار سیلی مجھے دیکھنے اسپتال آتے رہے۔ سال بھر کے بعد جب میں سکول میں واپس آیا آرمی سروس کے لیے فٹ نہ تھا۔ چنانچہ مجھے سکول سے میڈیکل گراؤنڈ پر ڈسچارج کر دیا گیا یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے سیلی صاحب نے مجھے دفتر میں بلا کر کہا۔ جمروز تمہارا باپ بارغ علی بہادر آدمی تھا۔ تم نے بھی بڑی بہادری سے تکلیف برداشت کی ہے۔ اب حوصلے سے آگے بڑھو۔ تعلیم جاری رکھو۔ میں نے سولجر بورڈ کے سیکرٹری سے بات کر لی ہے وہ تمہارے لیے وظیفے کا انتظام کریں گے۔ جب میں ٹھٹی مغلا کے سیکرٹری سولجر بورڈ صوبیدار فضل احمد صاحب سے ملا تو وہ بولے تمہارے کمانڈانٹ صاحب کے لکھنے پر تمہارا وظیفہ ہو گیا ہے۔

مختصر یہ کہ ۱۹۳۹ء میں، میں نے گورنمنٹ ہائی سکول سے میٹرک کیا۔ اب میں پھر صحراء میں کھڑا تھا۔ جاؤں تو کدھر جاؤں۔ ایسے میں پھر سیلی یاد آئے۔ کسی نے بتایا کہ وہ ناردرن کمانڈ راولپنڈی میں ایجوکیشن آفیسر ہیں۔ میں ڈھونڈتا ڈھونڈتا ان کے دفتر پہنچ گیا۔ دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ہیلو جمروز کیسے ہو؟ میں نے صورت حال سے آگاہ کیا۔ میٹرک کر لیا ہے۔ نوکری کی تلاش ہے۔ اس وقت وہ ٹوپی پہن چکے تھے اور کہیں جا رہے تھے میری فریاد سنی تو کہا چلو کار میں بیٹھو، کچھ کرتے ہیں۔ وہ پہلے مجھے سی ایم ای ایس کے پاس لے گئے۔ اسے بھرتی کر دو یہ فوجی کا بیٹا ہے۔ کمانڈر ایم ای ایس نے سکھ ہیڈ کلرک کو بلایا۔ اس نے بڑے غور سے لسٹ دیکھی لیکن خبر یہ سنائی کہ کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں نے سیلی صاحب کی طرف دیکھا کہ اب کیا ہو لیکن وہ

---

[1] کالج نمبر ۲۳۶ زمانہ تعلیم ۳۴-۱۹۲۹ء

مایوس نہیں ہوئے۔ وہ پھر مجھے پنڈی اے آر او پنجاب رجمنٹ کے آتما سنگھ کے پاس لے گئے۔ اس سے انہوں نے اس طرح بات کی کہ اسے مجھے بحیثیت سویلین کلرک بھرتی کیے ہی بنی بعد کو جنگ کے زمانہ میں فوج میں بھرتی ہونے کا موقع بھی مل گیا۔ اب اگر میرے منہ سے ان کے لیے دعا نکلتی ہے تو غلط نہیں نکلتی۔

ــــــ لیفٹیننٹ کرنل محمد گلشیر

جونہی میں نے ۱۹۳۵ء میں فرسٹ کلاس انگلش اور آئی اے فرسٹ کلاس سرٹیفکیٹ آف ایجوکیشن کا امتحان پاس کیا۔ کرنل سیلبی (اس وقت کیپٹن) نے آرمی ہیڈکوارٹرز دہلی سے رابطہ قائم کیا اور سکول کے لیے انڈین ملٹری اکیڈیمی کی ایک سیٹ مانگی۔ یہ درخواست تو منظور نہ ہوئی لیکن انہوں نے اپنی کاوش جاری رکھی۔ آخر کار سکول کے لیے کالج کے ہر ٹرم میں ایک سیٹ لینے میں کامیاب ہو گئے یہ سیٹ سب سے پہلے مجھے ملی۔ اسی طرح جون ۱۹۳۶ء میں، میں کچز کالج پہنچ گیا۔ کچز کالج ایک طرح کا پری کیڈٹ کالج تھا۔ وہاں پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد جناب سیلبی نے مجھے ایک خط لکھا، "تم اس سکول کے پہلے پھل دار درخت کی حیثیت رکھتے ہو جو میں نے لگایا ہے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اس میں پھل لگے اور سکول کی آئندہ نسلیں یہ پھل کھائیں"۔ یہ خط پاکر مجھے خوشی تو بہت ہوئی لیکن اس چیلنج کا اندازہ بھی ہوا جو میرے محسن نے میرے سامنے رکھ دیا تھا۔

جب ۱۹۳۸ء میں آئی ایم اے کے لیے منتخب ہوا تو اس وقت تک کیپٹن سیلبی میجر ہو کر ناردرن کمانڈ کے ہیڈکوارٹرز میں جا چکے تھے۔ جب انہیں میرے منتخب ہونے کی خبر ہوئی تو وہ مجھے مبارکباد دینے بہ نفس نفیس ڈیرہ دون آئے۔ کہنے کو تو سب ہی کمانڈانٹ اور استاد شاگردوں کو بیٹا کہہ دیتے ہیں لیکن سیلبی اور ان کی بیگم اس کو نبھانا بھی جانتے تھے۔

۱۹۴۶ء میں جب مجھے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ملی اور کرنل سیلبی کو پتہ چلا تھا تو ایک بار خود مجھ سے ملنے نوشہرہ آئے اور مجھے لیفٹیننٹ کرنل کی وردی میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس وقت میں ۹/۱۵ جاٹ رجمنٹ کو کمان کر رہا تھا۔ اس ملاقات میں انہوں نے اس خط کا

حوالہ بھی دیا جو انہوں نے مجھے کیڈٹ کالج لکھا تھا۔ کہنے لگے تم نے اچھی ابتداء کی۔ اب کالج خوب پھل پھول رہا ہے۔ وہ اپنے دور کے سب شاگردوں کا سراغ رکھے ہوئے تھے۔ سبلبی نہ رہے لیکن ان کے شاگردان کے احسانات کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ گاڈ بلیس ہز سول۔

ـــــــ لیفٹیننٹ جنرل رحمان گل

۱۹۲۹ء میں جب میں چھٹے درجے میں داخل ہوا تو سکول میں پرائمری کلاسیں بھی چل رہی تھیں اور بیشتر استادوں کا اپنا تعلیمی معیار اونچا نہ تھا۔ ۱۹۳۲ء سے ہائی کلاسز شروع ہوئیں تو اساتذہ کا علمی معیار بتدریج اونچا ہوتا گیا تا آنکہ جب ۱۹۳۸ء میں آرمی سپیشل کا امتحان پاس کر کے کیڈٹ کالج کے لیے میں نے سکول کو خیرباد کہا تو اس وقت دو انگریز وارنٹ آفیسر کے علاوہ دوسرے اساتذہ بھی پہلے کے مقابلے میں بہتر تعلیم یافتہ تھے جن میں سے بیشتر بعد کو کمیشن ہوئے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس دور کے تمام اساتذہ بغیر کسی استثنٰی کے بے حد محنتی تھے اور غیر معمولی لگن سے پڑھاتے تھے۔ ان میں سے چند جیسے لطیف صاحب، غلام احمد صاحب، سکندر صاحب، احمد علی خان صاحب اپنے اپنے مضامین پر مکمل عبور رکھتے تھے اور بڑے سے بڑے یونیورسٹی گریجوئیٹس سے کم نہیں تھے۔ اس دور کے تمام اساتذہ میں ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ہر لڑکے پر ذاتی توجہ دیتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے تمام ہمعصر مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ہم نے اپنی سروس کے دوران ملک میں یا بیرونِ ملک جس تعلیمی و تربیتی ادارہ (بشمول آئی ایم اے، سٹاف کالج) میں کورس کیا وہاں ملک یا بیرون ملک کے کسی معروف اور مستند ادارہ کے فارغ التحصیل طلباء سے اپنے آپ کو کسی طرح کمتر نہیں پایا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ اس ادارے میں تعلیمی بنیادیں بہت صحیح طریقے سے اور بہت مستحکم رکھی گئی تھیں۔ اس حقیقت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اساتذہ کی کاغذی قابلیت سے زیادہ ان کی لگن اور شخصیت کارگر ہوتی ہے۔

میرے زمانے میں آرمی سپیشل کے طلباء پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ یہ امتحان پاس کرنے کے بعد چیدہ چیدہ لڑکے آرمی کلاس میں ڈال دیئے جاتے تھے تاکہ انہیں کیڈٹ کالج کے راستے کمیشن کے لیے تیار کیا جا سکے۔ دوسرے لڑکے دسویں پاس کرنے کے بعد یا اس سے پہلے آرمی فرسٹ کلاس

انگلش کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے آبائی یونٹوں میں جاکر آرمی کی وائی کیڈٹ سکیم کے تحت کچنر کالج کے لیے کوشش کرتے تھے اور خاصے کامیاب بھی ہوتے تھے۔

۱۹۳۷ء کی آرمی کلاس میں جتنے لڑکے تھے اور فرسٹ کلاس انکو پڑھانے کیلئے اتنے ہی اساتذہ تھے۔ خود کمانڈانٹ کیپٹن (بعد کو کرنل) سیلبی ہفتے میں ایک آدھ پیریڈ لیتے تھے اور ان کی بیگم مسز سیلبی بھی ہفتے میں ایک دو بار شام ہمیں چاء پر اپنے ہاں بلاتی تھیں۔ یہ بھی انگریزی کی تعلیم اور کرداری تربیت کا غیر رسمی طریقہ تھا۔

اس ادارہ کی تعلیمی ترقی کی بنیادیں صحیح معنوں میں سیلبی نے رکھیں۔ انہی نے اس کے تربیتی معیار کو استوار کیا اور اس کو پبلک سکول کا رخ دیا۔ لیکن سب سے بڑا کام ان کی شخصیت نے کیا۔ انہوں نے آکر اس سکول کو اور لڑکوں کو اپنایا اور ایسا اپنایا کہ زندگی بھر تعلق قائم کر رکھا۔ دوسری بات جس کا شاید زیادہ لوگوں کو علم نہ ہو کہ وہ بڑے پرو مسلم اور پرو پاکستان تھے۔ ۳۸-۱۹۳۷ء ہی میں قرار داد پاکستان سے کئی سال پہلے انہوں نے آرمی کلاس کے سینیئر لڑکوں سے تصور پاکستان پر مضامین لکھوانے شروع کر دیئے تھے۔ ان مضامین کے لیے ہم قائداعظم محمد علی جناح، اے کے فضل الحق اور دوسرے مسلم لیگی لیڈروں کی تقریروں کا مطالعہ کرتے تھے اور ان سے نوٹس لیتے تھے۔

کرنل سیلبی ۱۹۴۷ء میں ریٹائر ہونے کے بعد برطانیہ کی پاکستان سوسائٹی کے ممبر ہو گئے تھے۔ اور ۱۹۶۷ء میں اپنے انتقال کے وقت تک پاکستان کے مفاد میں جو کچھ وہ کر سکتے رہے کرتے رہے سیلبی کا کردار کسی ادارے اور اس کے طلباء سے وابستگی کی حیرت انگیز مثال ہے۔

۱۹۴۳ء میں سکول میں اپنے آنے کے وقت سے اوائل ۱۹۶۷ء میں اپنے انتقال تک وہ (اور بہتوں کی طرح) مجھ پر بھی مسلسل کرم فرماتے رہے۔ اس کرم فرمائی کی آخری نشانی وہ خط ہے جو اس لیے میرے پاس محفوظ رہ گیا ہے کہ اس سے پہلے کہ میں جواب دے کر اسے عادتاً تلف کرتا۔ ان کے انتقال کی خبر آ گئی۔ اس ذاتی خط کو میں یہاں بغیر تبصرہ کے نقل کرتا ہوں۔

ونزلے

بریڈفورڈ ان ایوان

۵ر دسمبر ۱۹۶۶ء

میرے عزیز رحمان گل

تمہارے ۲۱ مئی کے خط سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے اس کا جواب بہت پہلے دے دینا چاہئے تھا لیکن ان دنوں میرے شب و روز زندگی کے مسائل سے خالی نہیں ہیں۔ ذرا فرصت سے لکھنا چاہتا تھا۔ میری خواہش رہتی ہے کہ پاکستان میں جن تھوڑے بہت لوگوں سے رسم و راہ ہے ان سے برابر تعلق رہے۔

سب سے پہلے تو میجر جنرل کے عہدے پر ترقی پانے پر پُرخلوص مبارک باد۔ اس سے سکول کی ہی عزت افزائی ہوئی ہے اور مجھے اس کی ذاتی طور پر بھی خوشی ہے چونکہ ۱۹۳۳ء سے تمہارے کیریئر سے وابستہ رہا ہوں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت کس طرح میں اور بریگیڈیئر اینڈرسن بڑے پریشان تھے کہ تمہارے قد کو ضروری حد تک کس طرح بڑھایا جائے۔ یہ تجویز کہ تمہیں کچھ عرصے کے لیے سکول کے روزمرّہ سے ہٹا کر گھر بھیج دیا جائے تاکہ گھر کی کھلی آزاد فضا میں تمہیں کچھ قد نکالنے کا موقعہ ملے۔ یہ تجویز خدا بھلا کرے میڈیکل آفیسر بخشی کی تھی۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی تم نے سال بھر میں خاصا قد نکال لیا اور اس طرح کمیشن کا راستہ ہموار ہو گیا تا آنکہ آج تمہیں ایک ڈویژن کی کمان ملی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تمہارے کمیشن لینے کے فوراً بعد تم سے ایبٹ آباد میں ملاقات ہوئی تھی اور تمہارے والدین سے ملنے تمہارے گھر کرک گیا تھا۔ ہماری آخری ملاقات رانچی میں ہوئی تھی۔ جب تم ۲/۱۳ کے ایڈجوٹینٹ تھے۔ اس دن میں بریگیڈیئر کرٹس کے ساتھ آیا تھا جنہوں نے بعد کو اسکول آف جنگ وارفیئر کمان کیا۔ یہ ۲۴ سال پرانی بات ہے۔ میں آئندہ فروری میں اسّی سال کا ہو جاؤں گا۔ بڑھاپے میں انسان زیادہ تر پرانی یادوں پر زندہ رہتا ہے۔ تاہم میری دلچسپی ان کے کیریئر میں باقی ہے جو کبھی "لڑکے" تھے اور آج بھرپور جوان ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ انڈیا کے ساتھ جنگ کی مجھے براہ راست اطلاع نہیں۔ ۱۷/ صاحب زاد گل کے بارے میں ضرور معلوم ہوا تھا۔ بہت دکھ ہوا۔ گل جب ایک کورس پر یہاں آیا تھا تو مجھ سے ملنے آیا تھا۔ لیکن یہ بھی کوئی دس سال پرانی بات ہے یہاں آکر ملنے والوں میں تم سب سے پہلے تھے

لیکن اس وقت کی بات ہے جب ۱۹۴۷ء میں ۔ میں ابھی تک خود انڈیا سے نہیں آیا تھا میری مسز اکثر تمہارے آنے کا تذکرہ کرتی ہیں۔

یہاں انگلستان میں بائیں بازو کی طرف سے ہندوستان کے حق میں بڑا یک طرفہ اور جانبدارانہ پروپیگنڈہ ہوتا رہتا ہے کہ ہندوستان بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر ایک بڑی شاندار جمہوریت ہے۔ ماؤنٹ بیٹن کے اثر سے نہرو کو اوپر چڑھایا جاتا رہا ہے یا ہمیشہ چڑھایا جاتا ہے۔ یہی لوگ افریقہ کی نئی ریاستوں کی بدترین خبروں سے بے وقوف بن جاتے ہیں۔ صحیح یا غلط نام کی تو کوئی چیز باقی ہی نہیں اگر کسی پر صحیح کا لیبل لگا ہوا ہے تو وہ جو بھی کرے صحیح ہے۔ مثال کے طور پر جونا گڑھ، حیدر آباد، اور گوا اور کشمیر میں انڈیا کے کرتوتوں کو ر کھا جا سکتا ہے۔

جب سے پاکستان سوسائٹی قائم ہوئی ہے میں اس کا ممبر ہوں گو مجھے اس امر کا ملال ہے کہ لنڈن میں اس کے اجلاسوں میں کبھی شرکت نہیں کر سکا ہوں تاہم اس کا لٹریچر مجھے پابندی سے ملتا رہتا ہے جس میں سے بیشتر بہت دلچسپ ہوتا ہے۔

صدر ایوب کے حالیہ دورہ کو یہاں کے اخبارات میں خاصی جگہ دی گئی۔ پاکستان کے لیے اپنے طور پر میں تھوڑا بہت پروپیگنڈا کرتا رہتا ہوں۔ پچھلے سالوں میں جہلم کے بہت سے لڑکے مجھ سے ملنے آتے رہے ہیں۔ آنے والوں میں آخری نام ۲۸۸ محمد مظفر کا ہے جو گذشتہ گرمیوں میں یہاں آیا تھا۔

تم نے جہلم میں میری کاوشوں کو سراہنے میں بڑی فراخدلی سے کام لیا ہے۔ جب میں پیچھے مڑ کے دیکھتا ہوں تو ہر طرح کی ناکامیاں یاد آتی ہیں لیکن یہ سوچ کر مجھے اطمینان ہوتا ہے۔ جو اقدام میں نے کیا تھا نیک نیتی سے کیا اور تم لوگوں کی بہتری کے لیے کیا تھا۔

اس زمانے میں مستقبل کی صورت حال کو تو نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن جہلم میں اپنے زمانے میں میں نے تم لوگوں سے پاکستان کے تصور پر مضامین لکھوانے شروع کر دیئے تھے۔ وہ دن جو جہلم میں گزرے وہ میری زندگی کے بہترین دن تھے۔ یہ امر میرے لیے لازوال مسرت اور اطمینان کا باعث ہے کہ تمہاری آرمی کے لیے میں نے تمہارا اور بہت سوں کا کیریئر بناتے میں کچھ کیا۔

جہلم ملٹری کالج کیسا ہے۔ آج کے جہلم کے بارے میں میری معلومات بہت کم ہیں۔ اس میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ سب سے برا یہ ہوا تھا کہ اس پر ایک ایسا برٹش کمانڈانٹ

مسلط کر دیا گیا تھا جو اپنا زیادہ وقت انگلینڈ اور پاکستان کے درمیان پروازیں صرف کرتا رہتا تھا۔ شکر ہے کہ وہ دور زیادہ عرصے نہیں رہا۔

کرنل سٹیبنگ سے تین سال پہلے ان کے انتقال تک قریبی رابطہ تھا۔ وہ یہاں سے بہت زیادہ فاصلے پر نہیں رہتے تھے۔ لیکن میں ان سے ۱۹۵۸ء سے نہیں ملا تھا۔ جہلم میں میرے پیش رو، ایچ ایچ کلارک کیمبرلے میں رہتے ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں ان کی بیوی کے انتقال کے فوراً بعد میں ان سے ملا تھا۔ تمہیں ۱۹۳۸ء میں جنرل ڈیش ووڈ سے پشاور کے فلیگ سٹاف ہاؤس میں ملنا یاد ہو گا۔ چند سال پہلے ان کے انتقال تک ان سے بھی میرا قریبی رابطہ رہا تھا۔ تمہارا اور دوسرے پانچ لڑکوں کا ان کے ساتھ پشاور میں گروپ فوٹو ہوا تھا۔ اس کے بعد ہم خیبر پاس تک گئے تھے اور مجھے یاد ہے طور خم پر افغان سنتریوں سے تم نے پشتو میں باتیں کی تھیں۔

میری بیوی ۱۹۶۲ء سے بری طرح سے معذور ہو گئی ہیں۔ میں اکیلا گھر کا کام چلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ جیسے تیسے میں گھر چلا رہا ہوں۔

ہر اچھی دعا تمہارے لیے۔ تمہارے گھر والوں کے لیے ہر اس بندہ کے لیے جس سے تم ملو جو مجھے یاد رکھتا ہو۔

تمہارا ہمیشہ

ڈبلیو پی سیلبی

تو یہ تھے وہ سیلبی جو اس ادارہ کے اس کے تشکیلی دور میں معمارِ اعظم تھے۔ گاڈ بلیس ہم۔

میجر حبیب خان

سیلبی صاحب کو کبھی اتوار کی بھی چھٹی کرتے نہیں دیکھا۔ سکول سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۳۵ء میں انہیں پروموشن پر پوسٹ آؤٹ کر دیا گیا تھا لیکن انہوں نے کیپٹن کے رینک میں یہاں رہنا پسند کیا۔ ۱۹۳۷ء میں دوبارہ انہیں پوسٹ آؤٹ کیا گیا۔ لیکن پشاور جا کر بھی جہلم سے تعلق برقرار رکھا۔ جو لڑکا انہیں خط لکھتا وہ فوراً اس کا جواب دیتے اور اس کی فائل کھول لیتے۔

سیلبی نے ڈسپلن اور شفقت کو ساتھ ساتھ چلایا ہوا تھا۔ اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک لڑکا

جب سکول سے پہلی بار بھاگا تو اسے سات بیدوں کی سزا دی۔ دوسری بار چودہ کی جب وہ تیسری بار بھاگا اور اس کا باپ اسے تیسری بار پکڑ کر لایا تو خلاف معمول وہ بہت غصہ ہوئے اس بار ۲۸ بیدوں کی سزا سنائی۔ وہ ۱۵ بید کھانے کے بعد بے ہوش ہو گیا تھا لیکن انہوں نے باقی بید معاف نہیں کیے۔ لیکن اسے سکول سے پھر بھی نہیں نکالا تاکہ اسکی زندگی خراب نہ ہو۔ کوئی لڑکا بیمار ہو جاتا تو اس کی دیکھ بھال کا خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ نہ صرف اسے ہسپتال میں دیکھنے جاتے بلکہ کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ اخبار، میگزین وغیرہ بھی لے جاتے اگر ان کی وزٹ کے وقت وہ لڑکا سویا ہوتا تو وہ اسے ہرگز نہ اٹھاتے بلکہ وہ، وہ چیزیں اس کے سرہانے کی میز پر رکھ کر واپس آجاتے جب وہ سو کر اٹھتا تو اسے پتہ چلتا کہ سیلی اسے دیکھنے آئے تھے۔ میرے ساتھ بھی ایک بار ایسا ہی ہوا۔ جب سو کر اٹھا اور میز پر چیزیں پڑی دیکھیں تو اس لمحہ کی خوشی اور فخر کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

——— میجر جنرل محمد جمشید، ستارۂ جرأت، ایم سی (دو بار)[1]

سیلی کی کام سے لگن مجھے اب بھی یاد آتی ہے۔ ان کی پوری پوری توجہ سکول پر مرکوز تھی۔ جفاکشی اور کام سے محبت کرنا میں نے ان سے سیکھا۔ طلبا ہی سے نہیں۔ طلبا کے والدین سے بھی ان کا قریبی تعلق تھا۔ چھٹیوں میں وہ اکثر لڑکوں کے گاؤں ان کے والدین سے ملنے جایا کرتے تھے انگریز میں لاکھ برائیاں ہوں لیکن حکومت کرنا یا قیادت کرنا اس کو آتا تھا۔ ہندوستان میں ملٹری سکولوں کو سلطنت برطانیہ کی آؤٹ پوسٹس کی حیثیت حاصل تھی۔ انگریز کو یہ بات خوب معلوم تھی کہ سلطنتیں کہاں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں۔

——— کرنل حضور احمد خان ایم سی

مجھ سے ایک انٹری سینئر ایک لڑکا تھا جعفر وہ ۱۹۳۳ء کی سردیوں میں کچھ بیمار ہو گیا چنانچہ

---

[1] کالج نمبر ۳۹۷۔ زمانہ تعلیم ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۸ء

معمول کے مطابق اسے کالج اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ دوسرے روز اس کی حالت کچھ بگڑی تو سیلبی صاحب جہلم کے ملٹری اسپتال سے ڈاکٹر کو اپنی کار میں لائے اور پھر چھوڑنے گئے۔ ایک دو دن اس طرح گزرے تو اسے بادل نخواستہ جہلم میں داخل کروا دیا۔ پھر وہ ہر روز اسے دیکھنے جہلم جانے لگے۔ ایک روز بعد سہ پہر ملٹری اسپتال سے فون آیا کہ جعفر کی حالت ایک دم خراب ہو گئی ہے۔ اور اسے ڈی آئی لسٹ پر رکھ دیا گیا ہے یہ سنتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ وہیں دفتر میں دعائیہ انداز میں جھک گئے اور جعفر کے لیے دعا کرنے لگے۔ آہستہ تو وہ ویسے بھی بولتے تھے شدت جذبات سے اس وقت ان کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ہونٹ ہل رہے تھے اور آنکھیں پرنم تھیں۔

چند لمحوں کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور رسالدار میجر احمد علی خان اور مسز سیلبی کو لے کر کار میں جہلم روانہ ہو گئے اور وہاں اس وقت تک اس کے پاس بیٹھے رہے جب تک اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہوئی۔ اس عرصے سے بار بار پدرانہ شفقت سے اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے اور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے۔ اللہ اکبر۔

۱۹۳۵ء کے اوائل میں خود میں بیمار ہو کر سکول اسپتال میں داخل ہوا تو تیسرے دن آئی ایم او نے تھرما میٹر دیکھتے ہی کہا تمہیں جہلم بھیجنا پڑے گا۔ میں بہت گھبرایا بیماری کی وجہ سے نہیں، آرمی فرسٹ کلاس کے لیے جو اگلے ہفتے شروع ہونے والا تھا۔ اتنے میں حسب معمول سیلبی مجھے دیکھنے آئے تو میں نے ان سے بہت اصرار سے کہا کہ مجھے ایم ایچ جہلم نہ بھیجا جائے۔ میں امتحان نہیں چھوڑنا چاہتا۔ میرے اصرار پر جناب سیلبی نے میرے لیے اسپتال ہی میں امتحان دینے کا انتظام کیا اور آر۔ ایم۔ او صوبیدار ڈاکٹر نصیر الدین کو میرا امتحانی نگران مقرر کیا تاکہ وہ نگرانی بھی کریں اور میری صحت پر بھی نظر رکھیں۔ سیلبی کا اپنے طلباء سے تعلق ان کے گھروں تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ اپنے بیشتر طلباء کے والدین کو ذاتی طور پر جانتے تھے اور ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔ میرے والد نے ۱۹ مئی ۱۹۳۵ء کو یکایک انتقال کر گئے۔ آفریں ہے میری عظیم ماں پر کہ محض اس خیال سے کہ میری تعلیم متاثر نہ ہو انہوں نے مجھے سکول میں اطلاع نہ دی۔ جب ۱۵ جون کو گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے پر میں پنڈدادن خان میں اپنے گھر پہنچا تو ماں نے بڑھ کر گلے لگا لیا اور بے اختیار رونے لگیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہ موقع تو خوشی کا ہے یہ انہیں ہوا کیا ہے۔ میری آنکھیں ابا کے کمرہ کی طرف لگی تھیں۔

میرے منہ سے "ابا" نکلا ہی تھا کہ انھوں نے مجھے بھینچ کے پیار کیا اور کہا۔ بیٹا اب ابا کہاں۔ اور پھر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔ بعد کو انھوں نے مجھے بتایا کہ تم اتنی دور تھے کہ جنازے پر بروقت آ نہیں سکتے تھے۔ محض اطلاع دینے سے تم پریشان ہوتے اور تعلیم کا حرج ہوتا۔ تم بہادر باپ کے بہادر بیٹے ہو صبر کرو اور باپ کی جگہ لو۔ میں نے یہ واقعہ یہ بتانے کے لیے لکھا ہے کہ اس طرح کی ایک میری ماں نہیں تھیں اس طرح کی مائیں ان تمام گھروں میں تھیں جن کے سپوتوں نے ایم سی اور ستارہ جرأت لیے اور اپنے اجداد کا اور ملک وقوم کا نام روشن کیا۔ اب میں سیلبی کی طرف آتا ہوں۔ چند دنوں کے بعد میں نے کمانڈانٹ سیلبی کو اس حادثے کی اطلاع دی تو فوراً ان کی اور ان کی بیگم کی طرف سے میری والدہ کے نام تعزیت کا ایک خط آیا جو محض رسمی تعزیت کا خط نہیں تھا۔ اس میں جس گہری ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس کی گرمی کو جس نے پڑھا محسوس کیا ان کے تعزیت نامے کے ساتھ خاکی لفافے میں ایک سرکاری خط بھی تھا جس میں میرے والد کی وفات کے دن سے میری فیس معاف ہو جانے اور ساتویں کے سالانہ امتحان کے نتیجے کی بنیاد پر دو میرٹ سکالرشپ ملنے کی اطلاع تھی۔ چند دنوں کے بعد ان کا میرے نام ایک اور خط آیا جس میں مجھے لکھا کہ میں دہلی آ رہا ہوں۔ تم دونوں (میں ۴۰۲ اور میرے بھائی ۴۰۴ اقبال احمد خان) آکر مجھ سے ملو۔ جب ہم ان سے ملنے دہلی گئے تو انھوں نے بڑی معذرت کی کہ اس وقت تمہارے گھر جا کر تعزیت نہیں کر سکتا۔ کوئی مسئلہ ہو تو بتاؤ۔ میں نے فیس کی معافی اور وظیفوں کا شکریہ ادا کیا۔ تو بولے یہ تمہارا حق تھا۔ شکریئے کی کیا بات ہے۔ تم میرے بیٹے ہو۔ ویسے تو سب ہی استاد شاگردوں کو بیٹا کہہ دیتے ہیں لیکن سیلبی نے جو کہا تھا اس سے بڑھ کر کیا۔

سیلبی کی یہ تصویر نامکمل رہے گی اگر میں یہ نہ بتاؤں کہ ڈسپلن کے معاملے میں اگر وہ سخت نہیں تو نرم بھی غیر ضروری طور پر نہیں۔ نظم وضبط کے حوالے سے ہر روز وہ کسی نہ کسی کی کیننگ بھی ضرور کرتے۔ ای۔ڈی کا کھاتہ بھی کھلا ہوا تھا۔ چونکہ ۱۹۳۲ء میں ان کے آنے کے وقت سے آرمی کے امتحانات شروع ہو گئے تھے اور پہلے وائی کیڈٹ سکیم کے ذریعے سے اور بعد کو کچنر کالج کے توسط سے کمیشن کا دروازہ کھل گیا تھا۔ اس لیے وہ اپنے ہونہار دس سینئر پریفکٹوں، ایک سکول ہیڈ بوائے، تین ہاؤس ہیڈ بوائے اور چھ پلاٹون کمانڈرز کی تربیت خاص طور پر کرتے تھے۔ قیادتی صلاحیتوں جیسے احساس

ذمہ داری، خود اقدامی، انتظامی مہارت، خود اعتمادی کی نشوونما پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔
صلاحیتیں پیدا کرنے کا ایک ذریعہ نو پریفکٹوریبل سسٹم تھا اس کے علاوہ افسرانہ رکھ رکھاؤ اور لائف سٹائل کی تربیت کے لیے وہ سینئر پریفکٹوں کو دو دو چار چار کے گروپ میں اپنے گھر بلاتے تھے اور آداب مہمانی و میزبانی سے روشناس کراتے تھے۔ اس طریقے سے نہ صرف ان کی انگریزی ٹھیک ہوتی بلکہ وہ ضروری خود اعتمادی بھی پیدا ہوتی جس کی ضرورت آگے چل کر آتی تھی۔ پبلک سکولوں کی روایت کے عین مطابق سینئر پریفکٹس خاص سکول ہیڈ بوائے کا ایک خاص سٹیٹس تھا۔ سکول کے وی آئی پی مہمانوں کا خیر مقدم سکول ہیڈ بوائے ہی کرتا تھا۔ تینوں ہاؤس ہیڈ بوائز اور سکول ہیڈ بوائے انکو سکول دکھاتے تھے اور معزز مہمانوں کے اعزاز میں دی جانے والی ضیافتوں میں سینئر پریفکٹس بھی شریک ہوتے۔ جتنا بڑا مہمان ہوتا سیلبی کی اتنی زیادہ کوشش ہوتی کہ سینئر پریفکٹس کو زیادہ سے زیادہ اس سے گفتگو کا موقع ملے اس کے علاوہ سینئر پریفکٹس کو خاص طور سے دوسری چھاؤنیوں، تعلیمی اداروں اور تاریخی مقامات پر ایک منصوبے کے تحت بھیجا جاتا۔ چھٹیوں میں کمانڈانٹ اور برٹش وارنٹ آفیسر سے خط و کتابت کی ترغیب دی جاتی۔ ان تمام کارروائیوں کا مقصد ایک ہی تھا کہ انہیں مستقبل کی ذمہ داریوں کے لیے تیار کیا جائے۔

مئی ۱۹۳۷ء میں وہ سکول سے راولپنڈی میں ناردرن کمانڈ ہیڈکوارٹرز میں ایجوکیشن افسر ہو کر چلے گئے تھے۔ لیکن ہم سے ان کا تعلق قائم تھا۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں جب ہم پانچ سات لڑکے ۲۶۱ رحمان گل، ۳۰۵ عنایت، ۳۹۱ نذیر، ۳۹۸ خورشید، ۴۰۲ حضور، ۴۹۶ بشیر، آرمی سپیشل کا امتحان دینے گئے تو نہ صرف پنڈی میں ہمارے زمانہ قیام کے دوران انہوں نے ہماری دیکھ بھال کی بلکہ امتحان ختم ہونے کے بعد اپنے ساتھ مری کی سیر کرائی پھر درہ کوہاٹ، لنڈی کوتل تک لے گئے۔ مجھے یاد ہے کہ درہ کوہاٹ میں ہمیں رائفل سازی کا کارخانہ دکھایا تھا۔ اس سیر و سفر کا مقصد (جو میں اب سمجھتا ہوں) یہ تھا کہ ہم سینئر لڑکے جو کچز کالج کے لیے اور کمیشن کے لیے پر تول رہے تھے ان کے پرِ پرواز کی قوت میں اضافہ ہو۔ ۱۹۳۳ء ہی سے ان کا طریقہ تھا کہ وہ چھٹیوں میں سینئر کیڈٹس سے خط و کتابت جاری رکھتے تھے بلکہ دوسرے استادوں اور وارنٹ آفیسروں (ایٹن ٹیز اور لیوس) سے خط و کتابت کی بھی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں، میں کچز کالج چلا گیا۔ پھر کمیشن لے کر اپنی یونٹ

سکنر ز ہارس کے ساتھ افریقہ میں شریک جنگ رہا۔ وہاں سے اور اٹلی میں معرکہ آرائی کی پانچ سات سال کے اس عرصے میں کرنل سیلبی سے رابطہ قائم رکھا اور جنگ کے دوران مجھے ان کے حوصلہ افزائی کے خط ملتے رہے۔

اٹلی کے آپریشن کے آخر میں، ایک دو ماہ کی چھٹی پر میں گھر آیا ہوا تھا کہ مجھے ملٹری کراس ملنے کا مراسلہ مع ربن ملا۔ جب میں نے اس اعزاز کی کرنل سیلبی کو اطلاع دی تو انہوں نے فوراً اجمیر آنے کی دعوت دی اور تاکید سے لکھا کہ ایم سی کا ربن بھی ساتھ لانا۔ میں جب اجمیر پہنچا تو ازرہ کرم وہ خود سٹیشن پر میری پذیرائی کے لیے موجود تھے انہوں نے مجھے اپنے بنگلے پر پہنچایا اور ایک خاص نشست میں انہوں نے اپنے ہاتھ سے میرے سینہ پر ایم سی کا ربن لگایا۔ ان کی بوڑھی آنکھوں کی اس چمک کو جو ربن لگاتے میں نے دیکھی اور ان کے ہاتھ کی اس نرمی کو جو میں نے اس کے بعد ان سے ہاتھ ملاتے وقت محسوس کی اس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اجمیر سے لکھے ہوئے وہ اپنے خطوں میں "درگاہ" (درگاہ خواجہ معین الدین اجمیری) کا ذکر بھی کرتے تھے۔

میری وزٹ کے دوسرے دن انہوں نے کہا تمہیں فاتحہ کے لیے "درگاہ" بھی جانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ مجھے اپنے ساتھ "درگاہ" لے گئے۔ اتفاق سے اس وقت وہاں درگاہ کے متولی صاحب بھی موجود تھے۔ ان سے انہوں نے میرا تعارف کرایا۔ جس انداز سے تعارف کرایا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی ان سے خاصی یاد اللہ ہے۔ راستے میں انہوں نے مجھے بتایا کہ میں کبھی کبھی یہاں حاضری دیتا ہوں۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ وہ جمعے کی نماز کے لیے مسلم طلباء کو باقاعدگی سے درگاہ پر بھیجتے تھے۔

۱۹۴۵ء کی اس ملاقات کے بعد ان سے خط و کتابت تو رہی لیکن روبرو شرف نیاز حاصل نہ ہوسکا تھا تاآنکہ ۶۴-۱۹۶۳ء میں مجھے جوائنٹ سروسز سٹاف کالج یو۔ کے انگلینڈ میں ایک کورس میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ چالیس ہفتے کے اس کورس کے دوران تقریباً ہر دوسرا ویک اینڈ باتھ کے مضافات میں کرنل سیلبی کے گھر گزارتا تھا۔ ان کے کردار کی عظمت اپنے صحیح پس منظر میں واضح نہیں ہوگی اگر میں یہ نہ بتاؤں کہ ان دنوں ان کی بیگم فالج کے اثر سے معذوری کی زندگی گزار رہی تھیں۔ سیلبی ہی ان کو نرس کر رہے تھے جس میں ان کو کھلانا پلانا، باتھ روم

لے جانا سب کچھ شامل تھا اور وہ یہ سب کچھ بڑی خوش دلی بلکہ خندہ پیشانی سے کر رہے تھے۔ میری حیثیت ان کے گھر میں ایک مہمان کی سی نہیں گھر کے ایک فرد کی سی تھی میں جب بھی وہاں ہوتا تو گھر کی صفائی ستھرائی اور ڈش واشنگ میں بھی ان کی مدد کرتا۔ سیلبی کے اولاد نہیں تھی ہم ان کے شاگرد ہی ان کے بچے تھے۔ یوں تو وہ جالندھر، جہلم/اجمیر تینوں کالجوں میں کمانڈانٹ رہے تھے لیکن ان کے دل کے قریب کے جی۔ آر جہلم ہی تھا۔ ان کے چھوٹے سے ڈرائینگ روم کی دیوار پر جہلم کے اولڈ بوائز کے پاسپورٹ سائز کے فوٹو بمع نام نمبر کے لگے تھے۔ ان کے پاس براؤن رنگ کے لیدر کا ایک بڑا سا بیگ تھا جس میں اولڈ بوائز کے فائل، خطوط اور پتے درج تھے اس تھیلے کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس میں ان کی آدھی جان تھی۔ جب بھی رات کو آتشدان کے کنارے بیٹھنا ہوتا وہ پرانی باتیں (خصوصاً جہلم کی) چھیڑ دیتے تھے۔ وہ رحمان گل وغیرہ ایک نہیں بہت سے اولڈ بوائز سے رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ ان پاکستانی طلباء کے حوالے سے وہ پاکستان کے حالات و واقعات سے اپنے آپ کو باخبر رکھتے تھے۔ پاکستان سوسائٹی کے باقاعدہ ممبر تھے اور سیاسی معاملات میں انڈیا کے مقابلے میں پاکستان کے مؤقف کی حمایت میں سرگرم رہتے تھے۔

میں اکثر جمعہ کی شام کو ان کے یہاں پہنچتا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ اتوار کی صبح سویرے سویرے ناشتہ کے فوراً بعد گاؤں کے چرچ کی طرف چلے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ہفتے کی شام کو بھی جاتے۔ پتہ چلا کہ چونکہ گاؤں کے چرچ کی دیکھ بھال کے لیے کوئی باقاعدہ عملہ نہیں ہے انہوں نے خود ہی یہ ڈیوٹی اپنے ذمہ لگا رکھی ہے۔ ہفتہ کی شام یا اتوار کی صبح کو جا کر گرجے کی جھاڑ پونچھ کر آتے ہیں۔ ۱۹۶۴ء کے اوائل میں، میں کورس سے فارغ ہو کر پاکستان واپس آ گیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد سیلبی ہی نے سٹیننگ کے انتقال کی اطلاع دی۔

۱۹۶۶ء میں، میں نے کھاریاں سے کرنل سیلبی کو پے در پے یہ خطوط لکھے۔ خلاف معمول جواب نہ آیا۔ میں فکر مند ہوا کچھ عرصے کے بعد مسز سیلبی کے وکیل نے لکھا کہ مسز سیلبی کی طرف سے میں آپ کو اطلاع دے رہا ہوں کہ آپ کے کرنل سیلبی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اِنا للّٰہ وانا الیہ راجعون بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

بریگیڈیئر امیر خان[1]

ایک روز میں سکین ہاؤس کی نمبر تین ڈارمیٹری میں بیٹھا تھا کہ کمانڈانٹ کیپٹن سیلی اوران کی بیگم ہاؤس میں آئے اور مجھے بلاکر کہا۔ امیر خان تیار ہوجاؤ۔ جہلم اسپتال جانا ہے تمہارا بھائی ۵۰۳ سلطان سکندر اسپتال میں داخل ہے نا اسے دیکھنے جانا ہے۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ سلطان سکندر کے پچھلے روز ہاکی کھیلتے ہوئے ٹخنے میں چوٹ لگ گئی ہے لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ سیلی کو سکندر سے میرے رشتے کا علم بھی ہے۔ یہ ان کا عام طریقہ تھا کہ وہ لڑکوں کو ان کی جڑوں تک جانتے تھے اوران کی تربیت ایک مذہبی جذبے سے کرتے تھے۔ راستے میں انہوں نے چوراسی بازار سے کچھ مٹھائی خریدی اور کہا۔ یہ تم اپنے بھائی کو دے دینا بلکہ اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا وہ مجھے اسپتال میں چھوڑ کر چلے گئے کوئی گھنٹہ بعد مجھے لینے آئے۔

۱۹۳۷ء میں سیلی صاحب کا سکول سے تبادلہ ہوگیا تھا لیکن دوسرے اور بہت سے لڑکوں کی طرح میری بھی ان سے خط وکتابت تھی۔ ۱۹۴۰ء میں جب میں ۸ ایم ٹی سنٹر جہلم میں جمعدار ایجوٹینٹ تھا تو میں نے انہیں اپنی شادی میں شرکت کی دعوت دی تو وہ چکوال کے دور دراز گاؤں میں اپنی گاڑی پر آئے۔ (اس زمانے میں اس علاقے میں سڑکوں کی جو حالت ہوگی اس کا تصور کیا جا سکتا ہے) ان کے کردار سے جو سبق میں نے سیکھے وہ تمام زندگی قطب تارے کی طرح میرے ساتھ رہے ہیں۔ ایک اچھے استاد سے بڑھ کر کوئی اور خوش قسمتی نہیں۔

صوبیدار سردار بیگ[2]

ان کی نرم دلی کا یہ عالم تھا کہ جن لڑکوں کو کیننگ کی سزا کے لیے بلاتے ایک آدھ بید زور سے میز پر مارتے تاکہ باہر پتہ چلے کہ بڑی پٹائی ہو رہی ہے۔

---

[1] کالج نمبر ۱۴۱۴۔ زمانہ تعلیم ۳۷-۱۹۳۳ء

[2] کالج نمبر ۴۰۰ زمانہ تعلیم ۳۸-۱۹۳۳ء

ـــــ بریگیڈئر امیر جان [1]

سیلبی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ کسی نے لاعلمی میں پوچھ لیا کہ آپ کے کتنے بچے ہیں۔ انہوں نے بے تکلف کہا ۳۰۸، (اس وقت سکول میں ۳۰۸ لڑکے تھے) لیکن یہ صرف کہنے کی بات نہیں تھی۔ وہ واقعی باپ کا دل اور رویہ رکھتے تھے۔ اس کی دو مثالیں دیتا ہوں۔

یہ واقعہ ۱۹۴۵ء کا ہے۔ میں لیفٹیننٹ کی حیثیت سے انڈین گرنیڈئرز نصیر آباد چھاؤنی میں پوسٹ ہوا تھا۔ نصیر آباد سے ہم اجمیر جاتے رہتے تھے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ سیلبی کے جی آر اجمیر کے کمانڈانٹ ہو کر آئے ہیں تو ان کے گھر سلام کے لیے حاضر ہوا۔ پانچ برس کے بعد ان سے میری یہ ملاقات توقع سے حیرت انگیز حد تک مختلف اور خوشگوار تھی کہ ان لمحات کو میں اپنی زندگی کے عزیز ترین لمحات میں شمار کرتا ہوں۔ ہوا یوں کہ سہ پہر کے وقت میں ان سے ملنے گیا تو میں نے ان کے اردلی سے صرف یہ کہا۔ مجھے کرنل صاحب سے ملنا ہے وہ اردلی آدمی ہوشیار تھا میں پورچ میں کھڑا تھا کہ میں نے اردلی کو کہتے سن لیا کہ ایک لفٹین صاحب ملنے آیا ہے۔ وہ دونوں باہر آئے تو آگے میں کھڑا تھا۔ "ہیلو امیر جان تم یہاں" سیلبی نے مجھے گلے لگایا۔ مسز سیلبی خوشی کے مارے میرے اردگرد چکر کاٹنے لگیں اور تقریباً چیخ کر کہنے لگیں۔ "امیر جان تم اتنے بڑے ہو گئے ہو۔ ہا ونڈرفل۔ ہا ونڈرفل! مائی گاڈ!" اس طرح تو میرے اپنے ماں باپ نے بھی میرے کمیشن ہونے پر خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اگر میں کہوں کہ وہ خوشی سے تقریباً پاگل ہو گئے تھے تو غلط نہ ہو گا۔ سیلبی بار بار پوچھتے تھے۔ نصیر آباد کب پوسٹ ہوئے؟ یہاں پہلے کیوں نہیں آئے؟ جب میں چلنے لگا تو میں نے کہا، سر میرے لیے کوئی خدمت؟ تو مسز سیلبی جھٹ بول اٹھیں خدمت یہ ہے کہ ہر ویک اینڈ ہمارے ساتھ گزارا کرو گے۔ اس پر سیلبی نے مسکرا کر کہا "خدمت نہیں یہ میرا حکم ہے۔"

دوسرا واقعہ بھی اسی نصیر آباد چھاؤنی کا ہے۔ ہمارے گرنیڈئرز سنٹر میں کھیلوں کا ہفتہ منایا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں ہمارے سنٹر کمانڈانٹ کرنل کنگ نے سیلبی صاحب کو دو

---

[1] کالج نمبر ۹۸۴ زمانہ تعلیم ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۸ء

دن کے لیے نصیر آباد آنے کی باقاعدہ دعوت دی اور قیام کا اہتمام آفیسرز میس میں کیا۔ کرنل سیلبی نے دعوت تو قبول کر لی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں آفیسرز میس میں نہیں اپنے بیٹے کے ہاں ٹھہروں گا۔ کرنل کنگ کو یہ سن کر بڑا تعجب ہوا۔ بولے مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کا بیٹا گرینڈیئرز میں ہے۔ سیلبی نے جواب دیا جی ہاں میرا بیٹا لیفٹیننٹ امیر جان آپ کے سنٹر میں ہے۔ چنانچہ دو دن انھوں نے میرے کمرہ میں قیام کیا۔ بعد کو یہ باتیں خود کرنل کنگ نے مجھے بتائیں۔

ایک غیر ملک غیر مذہب کا استاد یہ انمٹ نقوش میرے دل پر چھوڑ گیا ہے۔ میں اس کے بچوں میں سے ایک ہوں میں تمام زندگی ان مہربان انسان دوست میاں بیوی کے لیے نہایت ادب اور احترام سے دعائے خیر مانگتا رہوں گا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو ان شفقتوں، ہمدردیوں اور بھلائیوں کی جزا دے جو انھوں نے ہمارے ساتھ کیں۔

لے[1]

بریگیڈئر محمد صادق خان

چھٹیوں میں دور دراز علاقوں میں لڑکوں کے گھر جانا اور ان کے والدین سے ملنا کرنل سیلبی کی ہابی تھی۔ وہ میرے گاؤں سیدو تحصیل نوشہرہ کئی بار آئے۔ دو دفعہ کچھ لڑکوں کو بھی ساتھ لائے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ ہمارے مقامی لباس شلوار قمیص میں ملبوس ہوتے اور سر پر پٹھانی پگڑی ہوتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے مجھے اور میرے ماموں کو جو میرے گارڈین تھے راولپنڈی میں آنے کی دعوت دی تھی۔ غالباً اوائل ۱۹۳۸ء کی بات ہے جب وہ سکول سے جانے کے بعد ناردرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر میں ایجوکیشن آفیسر تھے۔ بہت اچھی طرح ملے۔ دوپہر کا کھانا کھلایا۔ بڑی خاطر تواضع کی چلتے وقت اپنی مسز کے ساتھ ہماری تصویریں کھینچیں جو بعد کو ہمیں بھیجیں۔

۱۹۳۸ء ہی کے کرسمس کے موقع پر کرنل سیلبی نے سکول کو ایک کارڈ بھیجا جس پر ان کا ایک پاسپورٹ سائز کا فوٹو بھی چسپاں تھا۔ دستور کے مطابق وہ کارڈ دوسرے اس طرح کے کارڈ

لہ[1] کالج نمبر ۷۶۵ زمانہ تعلیم ۴۰-۱۹۳۵ء

کے ساتھ سنٹرل ہال میں ایک نوٹس بورڈ پر لگا دیا گیا۔ میں تو سیلبی کا فین تھا۔ میں نے اپنے محسن اور ہیرو کا وہ فوٹو غائب کر دیا لیکن جلد ہی دھر لیا گیا۔ کیننگ ہوئی اور فوٹو واپس کرنا پڑا سیلبی کو خبر ہوئی تو انہوں نے مجھے ایک خط لکھا فوٹو اڑانے پر شفقت سے سرزنش کی اور خط کے ساتھ ایک نہیں دو وہ بھی کیبنیٹ سائز کے فوٹو بھیجے جن میں سے ایک آج بھی تقریباً پچاس سال کے بعد یہ سامنے میری میز پر فریم میں لگا رکھا ہے سیلبی میری زندگی میں ایک روشن لکیر کی طرح مسلسل میرے ساتھ رہے ہیں۔ جنوری ۱۹۳۶ء میں جارج پنجم کے انتقال پہ سکول میں جو تعزیتی تقریبات منعقد ہوئی تھیں ان میں میں نے ان کے اردلی کے طور پر حصہ لیا تھا۔ مثلاً شاہ کے لیے جو پھول چڑھائے گئے وہ ہار میں نے ہی پکڑا ہوا تھا۔ سیلبی نے باکمال کرم اس کا تذکرہ بھی اس فوٹو کی عبارت میں کیا۔ وہ ہم طلبا کو مائی چلڈرن کہتے ہی نہیں تھے واقعی ایسا سمجھتے بھی تھے۔

۱۹۳۹ء میں سٹیبنگ چھ ماہ کی طویل چھٹی پر انگلینڈ گئے تو ان کی جگہ عارضی طور پر سیلبی آئے ان کے دوبارہ آنے سے مجھے خصوصیت سے خوشی تھی لیکن ہوا یہ کہ ایک روز میں بحیثیت جونیئر پریفکٹ کے راشن پریفکٹ کی ڈیوٹی کر رہا تھا کہ سیلبی ہاؤس کے کچن میں آگئے میں اس وقت راشن بک تیار کر رہا تھا۔ ایک جگہ ایک ہندسے کے اوپر دوسرا ہندسہ لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے نوٹ کیا اور دوسرے روز دفتر میں آنے کو کہا۔ دوسرے دن کام میں لاپرواہی کی پاداش میں مجھے چارج شیٹ کیا گیا اور خود سیلبی نے کیننگ کی۔ اس سزا کو میں نے بہت محسوس کیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مجھ پر اس سزا کا غیر معمولی اثر ہوا ہے تو انہوں نے کہا "صادق! تمہیں سزا دے کر مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ لیکن تمہاری تربیت کے لیے یہ تادیبی کارروائی ضروری تھی" برسہا برس کے بعد جب وہ سوم سیٹ میں تھے تو انہوں نے اپنے خط میں اس سزا کا ذکر بھی کیا۔

ان سے میری آخری روبرو ملاقات ۱۹۵۲ء میں ہوئی تھی جب ایک کورس کے سلسلے میں میں انگلینڈ گیا تھا۔ ایسٹر کی چھٹی کے دوران ان کے اصرار پر میں تین چار دن ان کے ہاں ٹھہرا۔

ان کے پاس ۱۹۳۷ء کی سینئر کلاس کے طلبا کے مضامین کی کاپی بھی تھی۔ یہ مضامین انہوں نے سپیشل کی کلاس میں لکھوائے تھے۔ ان مضامین کے علاوہ ان کے پاس فوٹوؤں کے چھ سات البم بھی تھے جن میں بیشتر تصویریں جہلم کے لڑکوں اور تقریبات کی تھیں کہنے لگے اب یہ فوٹو اور خطوط ہی جہلم

بوائز سے رابطے کا ذریعہ رہ گئے ہیں۔

ـــــ میجر جنرل محمد بشیر خان

۱۹۴۰ء کے اوائل میں ۵۶۵ صادق میں (بشیر خان)، ۶۲۳ شاہ محمد، ۱۷ء صاحب زادگل وغیرہ آرمی سپیشل کا امتحان دینے پنڈی گئے تو سیلبی جو اس زمانے میں پنڈی میں پوسٹ تھے ہم سب کو اپنی کار میں خیبر پاس ڈیورنڈ لائن تک لے گئے تھے۔ راستے میں ۵۶۵ صادق کے ماموں کے ہاں سیدو میں ٹھہرے تھے جن سے سیلبی کے ذاتی تعلقات تھے۔

سیلبی پہلی جنگ عظیم میں جرمنوں کے قیدی رہے تھے۔ جرمنوں نے کسی محاذ پر زہریلی گیس استعمال کی تھی۔ اس کی وجہ سے ان کے پھیپھڑے متاثر ہو گئے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے بہت آہستہ بولتے تھے۔ جہلم سکول سے سیلبی ۱۹۳۷ء میں چلے گئے تھے لیکن اور بہت سے لڑکوں کی طرح میری بھی ان سے خط و کتابت تھی۔ ۱۹۵۰ء میں جب میں آرمر کا ایک کورس کرنے انگلینڈ گیا تو ۲۴۷ لیاقت کے ساتھ باتھ میں ان کے ہاں حاضر ہوا۔ بہت خوش ہوئے باتوں باتوں میں کہنے لگے ۶۶ ۵ جب تم ۱۹۲۵ء میں سکول میں داخلے کے لیے آئے تو تم بوائے سکاوٹس کی یونیفارم پہنے ہوئے تھے، یہ سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی چونکہ اس واقعہ کو پندرہ برس گزر چکے تھے۔ اور خود مجھے قطعاً یاد نہ تھا کہ میں کیا پہنے ہوئے تھا۔ اسی کورس کے دوران میں ایک بار اور ان سے ملنے گیا تو کہنے لگے چلو میں آکسفورڈ میں تمہیں اپنا پرانا کالج دکھاتا ہوں۔ وہ آکسفورڈ میں ایک ہوسٹل کی کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو گئے اور بڑے جذباتی انداز میں کہنے لگے " بشیر! روشنی کا یہ وہ دریچہ ہے وہ جگہ ہے جہاں میں نے نوجوانی کے کچھ دن تلاش حق میں گزارے۔

کیپٹن سیلبی اپنے کام میں کامل تھے۔ ہر لڑکے کو مع اس کے خاندان کے جانتے تھے چند لڑکوں کے کفیل بھی تھے اور ان کے تعلیمی اخراجات اٹھاتے تھے۔ ان کے زمانے میں کالج کا تعلیمی اعتبار سے ترقی کا دائرہ کار بھی وسیع ہوا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کی شخصیت کی وجہ سے سکول میں ایک اجالا سا ہوا جس سے شعوری اور لاشعوری طور پر پورا سکول متاثر ہوا بلکہ جس

کے اثرات آج بھی اس دور کے طلبار کی زندگی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

—— بریگیڈئر سید اکابر حسین شاہ ستارۂ جرأت

سیلبی کا شمار بھی اس ادارے کے اوّلین معماروں میں ہے۔ ان کا انتقال ہو چکا۔ حق مغفرت کرے لیکن کام باقی ہے۔ انسان خواہ کچھ بھی ہو آخر کار اس کا اچھا یا بُرا کام ہی باقی رہ جاتا ہے۔ افسوس یہ بات بہت دیر سے سمجھ میں آتی ہے۔

—— لیفٹیننٹ کرنل اورنگ زیب خان[۱]

میں نے کرنل سیلبی کو یہاں داخل ہونے سے بھی پہلے ۱۹۳۵ء کی گرمیوں میں اپنے گاؤں کلری میں دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ وارنٹ آفیسر مسٹر ایٹن بھی تھے۔ (کلری اپر جہلم کینال سے ستر میل اوپر ضلع پونچھ آزاد کشمیر میں واقع ہے) وہ وہاں ہمارے گاؤں کے ایک بزرگ سردار صوبیدار جلال خاں کی دعوت پر گئے تھے جن کے دو بیٹے ۳۲۳ محمد اشرف اور ۴۰۶ محمد اکبر (لیفٹیننٹ جنرل) یہاں پڑھتے تھے۔ سیلبی گرمیوں کی چھٹیوں میں اکثر اپنے شاگردوں کے گھروں کا چکر لگا لیتے تھے اور ان کے والدین سے ذاتی طور پر رابطہ قائم رکھتے تھے۔

سیلبی سینئر کلاسوں کو ہفتہ میں ایک دو پیریڈ پڑھاتے بھی تھے۔ مغرب کی نماز کے وقت اکثر مسجد میں آجاتے ایک دفعہ مسجد میں آئے تو مسجد کے صحن میں کچھ پتے پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا یہ کون صاف کرے گا تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ وہ جگہ ہے جس کو تمہارے بزرگ اپنی داڑھیوں سے بھی صاف کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔"

—— بریگیڈئر عطاء محمد خان[۲]

میں جہلم سکول میں اگست ۱۹۳۷ء میں داخل ہوا تھا۔ وہاں داخل ہونے سے چند ماہ

۱۔ کالج نمبر ۵۹۴۔ زمانہ تعلیم ۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۱ء
۲۔ کالج نمبر ۶۸۸ زمانہ تعلیم ۴۲-۱۹۳۷ء

پہلے سیلبی کا تبادلہ ناردرن کمانڈ میں ہو چکا تھا۔ ان سے تعارف اور لجد کو طویل وابستگی و عقیدت کی صورت اس وقت پیدا ہوئی جب ۱۹۳۹ء کے اوائل میں سکول کے کمانڈانٹ کیپٹن سٹیبنگ تقریباً چھ ماہ کی چھٹی پر انگلستان گئے اور ان کی جگہ عارضی طور پر کام کرنے کے لیے کیپٹن سیلبی ناردرن کمانڈ سے آئے۔ اس دوران جونیئر پریفیکٹس کی دو جگہیں خالی ہوئیں۔ سیلبی نے سٹیبنگ سے مشورہ کے لیے بحری تار دیا۔ ادھر سے فوری جواب آیا۔ ۵۸۸ رب نواز اور ۶۸۸ میں عطا محمد (ذرا طریق کار کی نزاکت بھی ملاحظہ ہو کہ دو جونیئر پریفیکٹس کے لیے کیبل دیئے گئے) سیلبی نے ۵۸۸ رب نواز کو اور ۶۸۸ مجھے بلایا اور اپنے ہاتھ سے جے پی کی ڈارک گرین پٹی میرے کندھے پر لگائی۔ اس لمحہ کو جو کیریئر کی ترقی کی طرف میرا پہلا قدم تھا میں کبھی نہیں بھول سکتا اور میرے لیے فخر کی بات ہے کہ انہوں نے بھی اس پہلی سبز پٹی کو یاد رکھا اس کے بعد ان کے انتقال تک تقریباً تیس سال تک ان سے رابطہ بلکہ تعلق رہا۔ وہ اکثر کہا کرتے عطا محمد تم وہ آخری جے پی ہو جسے میں نے جہلم میں ترقی دی تھی۔

وہ چھ مہینے ڈیوٹی دے کر واپس راولپنڈی اپنی پوسٹ پر چلے گئے۔ لیکن بہت سے دوسرے لڑکوں کی طرح میرا بھی ان سے تعلق برقرار رہا۔ ان کے ہینڈ رائیٹنگ کو پڑھنا مشکل تو ہوتا لیکن وہ ہر خط کا جواب پابندی سے دیتے۔ چھٹی سے آتے جاتے میں پنڈی میں ان کے گھر ضرور ٹھہرتا تھا ۱۹۴۶-۴۵ء میں جب وہ کے۔جی۔آر اجمیر میں کمانڈانٹ تھے اور میں بمبئی میں رائل انڈین آرمی میں آفیسر تھا تو مجھے یاد نہیں کہ میں کبھی اجمیر سے گزرا ہوں اور ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوا ہوں۔

۵۱-۱۹۵۰ء میں، میں لارک ہل میں لانگ گنری سٹاف کورس کر رہا تھا تو ان کے اصرار پر میرے اکثر ویک اینڈز سمرسٹ شائر میں ان کے گھر گزرتے۔ دونوں میاں بیوی میری خاطر داری کا بے حد اہتمام کرتے۔ کرنل صاحب کھانے میں پلاؤ اور سالن بھی پکاتے۔ میں نے حیرت کا اظہار کیا تو کہنے لگے۔ میں نے تم بچوں کے لیے پلاؤ اور کری کے مسالے لندن سے منگوا کر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں گھر کا سامزہ آئے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ بیڈ ٹی لے کر خود میرے کمرہ میں آتے۔ "میرے بچے، بڑی ٹھنڈ ہے چائے پیو اور پھر سو جاؤ۔ میں چرچ جا رہا ہوں۔ واپسی پر ناشتہ کریں گے۔ پھر وہ تین میل سائیکل کر کے چرچ جاتے مجھے یاد ہے کہ اسی کورس کے دوران جب میں اور میرے کورس کے چند پاکستانی ساتھی ان سے ملنے گئے تھے تو وہ ہمیں آکسفورڈ میں

اپنے پرانے کالج کو دکھانے بھی لے گئے تھے۔

وہ ٹی ٹوٹلر (Teatotaller) سمپل لونگ اور ہائی تھنکنگ

(Simple living and high thinking) کی زندہ تصویر

اور دل دریا تھا۔ (عقیدۃً) رومن کیتھولک تھے لیکن سب مذاہب خاص طور پہ اسلام کے لیے ان کے دل میں بڑی جگہ تھی۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ ان کی اپنی اولاد نہیں تھی لیکن انہیں اپنے تین سو بچے کم پیارے نہیں تھے۔ مائی چلڈرن کوئی رسمی فقرہ نہیں تھا جو وہ ہمارے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ یوں کمانڈ تو انہوں نے کے۔جی۔آر اجمیر کو بھی کیا تھا لیکن ان کے بیشتر روابط جہلم سکول ہی سے تھے۔ مسز سیلبی بھی بہت مہربان خاتون تھیں۔ جب میں ولایت گیا ہوا تھا وہ بالکل معذور تو نہیں ہوئی تھیں لیکن ان کی صحت اچھی نہیں تھی۔ کوکنگ، واشنگ، گارڈنینگ اور نرسنگ وہ خود ہی کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی مسز کی جانفشانی لیکن خوشدلی سے بڑی خدمت کی۔ آخر آخر میں جب وہ بالکل ہی معذور ہوگئیں اور بیماریوں نے شدت اختیار کی تو انہیں بادل ناخواستہ ایک نرسنگ ہوم میں داخل کیا وہ تو کچھ عرصہ وہاں حیات رہیں لیکن وہ خود ان کے نرسنگ ہوم جانے کے بعد زیادہ دن نہ جیئے۔ گویا بیوی کی رفاقت کا بھی حق ادا کر دیا۔ اللہ اکبر کیا انسان تھا۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان کے قتل کے بعد کرنل سیلبی نے اس وقت کے کمانڈانٹ ملٹری کالج کرنل زیدی کے نام اپنے ۱۶ نومبر ۱۹۵۱ء کے خط میں لکھا:

پاکستان کے بہت بڑے مدبر اور سیاست دان جناب لیاقت علی خاں کی ناگہانی موت پر میں نے آپ سے تعزیت کی تھی اور دُکھ کے اس لمحہ میں میں نے آپ لوگوں کو قلبی ہمدردی کا ایک تحری تار دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ پہلے سے زیادہ تندہی اور جوش سے پاکستان کی خدمت کیلئے تیار رہیں گے۔ اس خط کے یہ فقرے قابل غور ہیں:

With you all I mourn deeply for the untimely death of Pakistan's great statesman Liaquat Ali Khan and I cabled a message at once for you in that time of grief. I know that all will render service to Pakistan with even greater loyalty and ardour now.

یہ خط کسی تبصرہ کا محتاج نہیں۔ اس سے سیلبی کی کالج سے گہری وابستگی اور ان کی شائستگی کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آداب یہاں باقی کیا ہیں۔ یہ کالج کی خوش قسمتی تھی کہ اس تشکیلی دور میں اسے ایسا استاد ملا جو انسانیت اور فراست کے اس بلند مرتبہ پر فائز تھا۔

اسی خط میں انہوں نے ۱۹۵۱ء کے اوائل میں ان سے ۴۶۰ (لیفٹیننٹ جنرل) محمد اکبر اور میرے ملنے کا ذکر بھی بڑی گہری خوشی کے ساتھ کیا ہے اور ۴۳۷ (بریگیڈیئر محمد اقبال) سے ملاقات کی توقع ظاہر کی ہے۔ ان یادوں کو تازہ کرتے ہوئے ایک سوال جو مجھے بار بار پریشان کر رہا ہے یہ ہے کہ آیا ہمارے اپنے لوگ طلباء اور کالج سے تعلق کا ثبوت دے رہے ہیں یا نہیں ؟ اور کیا ہمیں اس توجہ کی پہلے سے زیادہ ضرورت نہیں ؟

ـــــ بریگیڈیئر محمد اقبال[1]

۱۹۵۱ء میں جب میں ایک گنری کورس پر انگلینڈ جانے لگا تو میں نے روانہ ہونے سے پہلے کرنل سیلبی کو لکھا کہ فرمائیں کہ میں آپ کے لیے پاکستان سے کیا لاؤں تو انہوں نے جواب میں بے تکلفی سے لکھا۔ پاکستان کا ایک جھنڈا اور اورنج پیکوٹی کے دو ٹن۔ خط پڑھ کر میں سوچنے لگا۔ سیلون کی اورنج پیکوٹی کی فرمائش تو خیر ٹھیک ہے لیکن پاکستان کے جھنڈے کا وہ کیا کریں گے۔ بہر حال جب انگلستان گیا تو ان کی خواہش کے احترام میں دونوں چیزیں میں نے ان کی خدمت میں پیش کر دیں۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ مسز سیلبی پاس بیٹھی تھیں۔ پیکو چائے کے کارٹن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ فرمائش تمہاری تھی۔ ان کو تم سنبھالو، پھر پاکستانی فلیگ کو اٹھا کر دیکھنے لگے اور مجھ سے کہا یہ تحفہ میرے لیے ہے۔ شکریہ اقبال۔ مجھے بعد کو پتہ چلا کہ جب کبھی کوئی اولڈ بوائے ان سے ملنے جاتا تو وہ یہ پاکستانی جھنڈا اپنے گھر پر لہراتے تھے۔ لارک ہل میں میں پندرہ مہینے کے اس کورس پر فیملی میرے ساتھ تھی۔ ہم اکثر ویک اینڈ پر سیلبی کے ہاں جایا کرتے۔ اس وقت میرا بیٹا (جاوید) چھوٹا سا تھا وہ بھی مسز سیلبی سے مانوس ہو گیا تھا۔ وہ اسے ڈیر گرانڈسن کہا کرتی تھیں۔ جوں

---

[1] کالج نمبر ۴۳۷، زمانہ تعلیم ۴۳-۱۹۳۸ء کالج ہیڈ بوائے اور کیڈٹ بٹالین کمانڈر اور گارڈنر میڈل ونر ۴۳-۱۹۴۲ء۔

ہی ہم کار سے اترتے وہ جاوید پر قبضہ کر لیتیں۔ ان کے کچن گارڈن میں رس بھری کے چند درخت تھے۔ وہ ان کی رس بھریاں اپنے ہاتھ سے توڑ کر اور چھیل کر جاوید کو کھلاتی تھیں۔ رس بھری جام میری بیوی کے حصے میں آتا اور رس بھری کیک کی پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہتیں۔ اقبال یہ میں تمہارے لیے بناتی ہوں۔ سیلبی ہمیں اپنے دوستوں سے اس طرح ملواتے تھے جیسے ہم ان کے قریبی عزیز ہوں بریڈ فورڈ آن آوان کے قریب ان کے ایک دوست کیپٹن رہوڈز کلو کا ایک بہت بڑا فارم تھا ایک آدھ بار وہ سیر کے لیے ہمیں وہاں بھی لے گئے۔ ایک بار کہنے لگے۔ چلو، میں تمہیں اپنا کالج دکھاتا ہوں۔ چنانچہ ہم ڈرائیو کر کے آکسفورڈ گئے۔ اپنا کالج کرائسٹ چرچ دکھایا۔ چرچ کے لفظ پہ یاد آیا کہ سیلبی رومن کیتھولک تھے اور کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ ان کا تعلق پادری خاندان سے تھا۔ سیلبی کی ملٹری کالج کے بیشمار اولڈ بوائز سے خط و کتابت تھی۔ ہر ایک کا فائل کھول رکھا تھا۔ انہوں نے مجھے میرے خطوں کا فائل بھی دکھایا تھا۔ بعض خطوں کے سرناموں پر اپنے قلم سے کچھ نوٹ بھی کر رکھا تھا۔ ان کی باتیں زیادہ تر جہلم کے اولڈ بوائز ہی کے بارے میں ہوتی تھیں۔ ۱۹۴۲ء میں پنڈی میں میرے بھائی خوشی محمد کی شادی میں شریک ہوئے تھے۔ ان کے بیوی بچوں کے بارے میں بھی پوچھتے رہتے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے بوائز کے بارے میں ان کی معلومات حیرت انگیز طور پر اپ ٹو ڈیٹ تھیں۔ انگلستان سے آنے کے بعد ان سے دوبارہ ملاقات تو نہ ہو سکی لیکن خط و کتابت ۱۹۶۷ء میں ان کے انتقال تک مسلسل رہی۔ ان کے انتقال کی خبر ان کے اٹارنی نے مجھے دی۔

ـــــ میجر محمد حسین[1]

جب ۱۹۴۴ء میں سیلبی اجمیر کالج کی پرنسپلی کا چارج لینے ریل پر جہلم سے گزرے تو کالج کے سامنے ریل کی پٹڑی کے دائیں طرف سارا کالج تھانہ سے نہر تک لائن اپ ہو گیا تھا۔ سب سے آگے سٹیبنگ اور ان کے پیچھے سارا سٹاف اور پھر لڑکے۔ گاڑی بہت ہی آہستہ رینگ رہی تھی اور سیلبی اور ان کی بیگم اپنے کمپارٹمنٹ کے دروازہ پر کھڑے ہاتھ ہلا ہلا کر لڑکوں کے نعروں کا

[1] کالج نمبر ۸۰۴ زمانہ تعلیم ۱۹۳۹ تا ۱۹۴۵ء

جواب دے رہے تھے اور ان کے چہرے سے مسرت پھوٹی پڑتی تھی۔ قلبی تعظیم و تکریم کا یہ نظارہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ سابق اساتذہ اور پرنسپلوں کی تعظیم و تکریم کی یہ عظیم روایت معلوم نہیں بعد میں بھی قائم رہ سکی یا نہیں۔

اگست ۱۹۴۵ء میں سات لڑکے یہاں سے تبادلے میں اجمیر کالج بھیجے گئے تھے ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ میں اس وقت تک یہاں ایف ایس سی فرسٹ ائیر پاس کر چکا تھا اور وہاں جانا نہ چاہتا تھا مگر مجھے بتایا گیا کہ چونکہ میرا تعلق رہتک سے ہے مجھے اپنے علاقہ کے کے۔ جی۔ آر کالج میں جانا چاہیے وہاں اس وقت تک ایف ایس سی کلاسز نہیں تھیں۔ کمانڈانٹ میجر سیلبی کا رویہ بہت ہمدردانہ تھا۔ انہوں نے کہا محمد حسین! اگر تم چاہتے ہو تمہیں دہلی کے کسی کالج میں داخل کرائے دیتا ہوں۔ وہ لمبا قصہ تھا۔ بہر حال میں نے آئی ایم اے کے لیے مطلوبہ عمر تک پہنچنے تک وہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں کچھ دخل جناب سیلبی کی مشفقانہ شخصیت کا بھی تھا۔ چنانچہ میں وہاں سال بھر تک سیلبی صاحب کی زیر نگرانی جونیئر کلاسوں کو پڑھتا رہا۔ اور سیلبی اور بیگم سیلبی کی شفقتوں سے مستفیض ہوتا رہا۔ بیگم سیلبی شام کو اپنے پالتو پلیس کے ساتھ نکلتی تھیں اور راستے میں ملتے لڑکوں سے ہیلو کرتی جاتی تھیں۔ ان کی شخصیت بھی مادرانہ تھی۔ یہ میں انگریزوں کی پالیسی کا کمال کہوں گا کہ انہوں نے ان اہم فوجی اداروں میں ہر اعتبار سے اپنے بہترین آدمی بھیجے تھے۔

آخر میں، میں ان کے بارے میں ایک چھوٹا سا واقعہ لکھتا ہوں۔ وہ اپنے اولڈ لوائز کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔ ایک بار انہوں نے مجھے لکھا۔ محمد حسین میں ممنون ہوں گا کہ تم وہاں سے دارجیلنگ کی گرین لیبل چائے کے دو کارٹن مجھے بھیج دو لیکن شرط یہ ہے کہ تم بھی یہاں سے کسی چیز کی فرمائش کرو۔ میرے بچے! برا نہ ماننا۔ میں تمہیں زیر بار نہیں کرنا چاہتا۔ اس طرح چیزوں کے تبادلہ سے مجھے تم سے اپنی ضرورت کی کوئی چیز منگوانے میں جھجک نہیں ہوگی۔ بالآخر ان کے اصرار پر میں نے ان سے اپنے فلپس کے ریڈیو کے لیے دو ٹیوب منگوائے۔ جو ان دنوں یہاں دستیاب نہیں تھے۔

ـــــــ بریگیڈئر اکرم ظفرؔ

۱۹۵۷ء میں انگلینڈ میں ایک کورس کر رہا تھا تو میں پہلی بار کرنل سیلبی سے باتھ میں ملا۔ مختصر ملاقات تھی انہوں نے باتھ کے مضافات کی سیر کرائی۔ ایک ریستوران میں کھانا کھلایا اور اصرار کیا اگلی بار بیوی بچوں کے ساتھ آؤں۔ دوسری بار ۱۹۶۱ء میں ونزلے گاؤں میں ان کے اپنے گھر میں ملا۔ اس وقت تک ان کی بیگم معذور ہو چکی تھیں۔ ان کی تیمارداری بھی وہ خود کر رہے تھے۔ زیادہ دیر کالج کی باتیں ہوتی رہیں پرانے البم دکھائے۔ جو تصویر سامنے آتی اس میں جو لڑکے ہوتے ان کے نام ہی نہیں ان کے والد اور گاؤں کے نام بھی بتلاتے جاتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ حال سے زیادہ ماضی میں زندگی بسر کر رہے تھے جب لنچ کا وقت آیا تو انہوں نے پرانے برٹش سٹائل میں "کوئی ہائے" پکارا میں سمجھا بیرے یا خانساماں کو بلا رہے ہیں پھر خود ہی مسکرائے اور کہا میں ہی خانساماں، بیرا، مالی، اس گھر کا سب کچھ ہوں۔ پھر انہوں نے بڑے اہتمام سے اپنے ہاتھ سے پکایا ہوا پاکستانی کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد پبلک کال آفس سے لیفٹیننٹ کرنل سٹیبنگ کو ہنری کہہ کر فون کیا اور مجھ سے بات کروائی۔ اس وقت سیلبی صاحب کی عمر کوئی ۷۵ برس کے قریب ہوگی۔ ٹھیک ٹھاک تھے۔ چلتے وقت اپنا فوٹوگراف عطا کیا جسکے نیچے اپنے قلم سے لکھا:

To Muhammad Akram Zafar, who has so pleasantly revived Jhelum memories. W.P. Selbie May '51.

یہ فوٹوگراف میں نے کالج میوزیم کی نذر کر دیا ہے۔

صوبیدار صالح محمدؒ [۲]

سیلبی نماز کے وقت ہاؤسوں کا چکر لگاتے تھے۔ کبھی کبھی مسجد میں پادریوں کا چغہ پہن کر آتے تھے اور چپکے سے پچھلی صفوں میں بیٹھ جاتے تھے۔ میں مسجد میں مغرب کی اذان دیا کرتا تھا۔ برسہا برس کے بعد انگلینڈ سے انہوں نے میرے ایک خط کے جواب میں لکھا "میرے بچے مجھے اب بھی یاد ہے جب تم بڑے جوش سے (اذان دیتے وقت) اللہ اکبر پکارا کرتے تھے۔"

---

[۱] کالج نمبر ۱۲۲۳ زمانہ تعلیم ۱۹۴۳ تا ۱۹۵۰ء [۲] زمانہ تعلیم ۱۹۳۴ تا ۱۹۴۰ء

مسز سیلبی

ـــــــ بریگیڈئر رب نواز[1]

کرنل سیلبی کا کوئی تذکرہ قطعاً نامکمل رہے گا اگر ان کی مسز کا ذکر نہ کیا جائے۔ وہ دونوں یک جان دو قالب تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کا بہت ساتھ دیا اتنا کہ عام میاں بیوی کم ہی ایسا کر پاتے ہیں۔ اور دونوں نے مل کر سکول کے بچوں کو سنبھالا اور بہت سنبھالا۔ بڑے سے بڑا آدمی بھی اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب اس کی رفیق زندگی اس کی رفیق سفر بھی ہو اور دل سے ہو۔ آخر آخر میں جناب سیلبی نے ان کی رفاقت کا حق خوب ادا کیا۔ دونوں پر اللہ کی رحمتیں ہوں ملٹری کالج کے بچے خوش قسمت تھے کہ وہ ایسے غیر معمولی انسانوں کے ہاتھوں پروان چڑھے۔

ـــــــ لیفٹیننٹ جنرل رحمان گل ایم سی ستارۂ پاکستان

سیلبی کا ذکر آئے تو ان کی بیگم ضرور شکر گزاری اور عزت و احترام کے جذبے کے ساتھ یاد آتی ہیں۔ وہ سینئر لڑکوں کو باری باری گھر پر بلاتی تھیں اور انگریزی میں گفتگو کرنے کی مشق شفقت سے کراتی تھیں۔ غلطی پر ہمدردی سے مسکرا دیتیں۔ اس طرح کھانے کے آداب بھی سکھاتیں سیلبی اور مسز سیلبی کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ہمیں بلندیوں کی طرف دیکھنا سکھایا اور خوابوں کو حقیقت میں بدلنا سکھایا۔

مسز سیلبی شام کو سکول میں اکثر گھومتی پھرتی تھیں۔ سیاہ رنگ کا گھونگھریالے بالوں والا چھوٹا سا پوڈل رے فٹن پیپ ان کے ساتھ ہوتا تھا جس کی زنجیر ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ مسز سیلبی میچوں پر بھی اکثر آتی تھیں۔ ایک بات تو میں نے یہ نوٹ کی کہ ہاؤس میں تو وہ اکثر آتی تھیں لیکن ڈارمیٹری میں کبھی قدم نہیں رکھا۔ اپنے آنے کو انہوں نے کبھی رسمی نہیں بنایا اور کبھی ایڈمنسٹریشن میں دخل نہیں دیا۔ مجھے امید ہے کہ پرانے اساتذہ کا یہ تذکرہ کبھی ریسرچ کا موضوع بنے گا کہ کامیاب سربراہی کس کردار کے لوگ کرتے ہیں اور کیسے کرتے ہیں۔

---

[1] کالج نمبر ۱۷۳

مسز سیلبی بہت ہی کریم النفس خاتون تھیں "مائی چلڈرن"، "مائی چلڈرن" کہہ کر لڑکوں کو بلاتی تھیں اور یہ محض کہنے کی بات نہیں تھی۔ مائی چلڈرن کہتے ہوئے ان کے چہرے پر روشنی کی جو جذباتی لہر آتی اسے کوئی لڑکا مس نہیں کر سکتا تھا۔ اتوار کے اتوار وہ چار چار پانچ پانچ لڑکوں کو اپنے بنگلے پر بلاتی تھیں۔ اس طرح جونیئرز کی بھی باری آجاتی تھی۔ مسز سیلبی اپنے مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھاتی تھیں اور ان کے سامنے چائے بنا کر انہیں پیش کرتی تھیں۔ بیچ بیچ میں انگریزی بھی چلتی رہتی تھی۔ مسز سیلبی کی اس مہربان تربیت کا نتیجہ تھا کہ ان کے بچوں نے انگریزی میں یا سوشل لائف میں کبھی مار نہیں کھائی۔ سال کے دوران کی مختصر چھٹیوں میں دور دراز کے دس بارہ لڑکے جو اپنے گھروں کو نہیں جا سکتے تھے ان کو بھی مسز سیلبی اپنے گھر بلاتی رہتی تھیں۔ اس زمانے میں بیڈمنٹن کھیل نیا نیا چلا تھا۔ وہ ان لڑکوں کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتی تھیں اور ان کے آپس میں بیڈمنٹن کے مقابلے کراتی تھیں اور جیتنے والوں کو انعام بھی دیتی تھیں۔

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد گلشیر

میں ان خوش نصیبوں میں سے تھا جنہیں مسز سیلبی نے اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا۔ وہ مجھے گلشیر مائی سن کہہ کر پکارتی تھیں۔ دوسرے سینئر لڑکوں کی طرح وہ مجھے اپنے بنگلہ پر بلا کر منیر کے ادب و آداب سکھاتی تھیں۔ انگریزی بولنے میں میری جھجک کو انہوں نے ہی دور کیا۔ وہ بالکل ماں کی طرح تھیں حالانکہ میں کافی بڑا ہو چکا تھا۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ میں شام کے کھیلوں سے واپس آتا تو کوئی کھانے کی چیز پھل، مٹھائی ٹافی وغیرہ میرے بستر پر یا میرے تکئے کے نیچے رکھی ملتی۔ شروع شروع میں ہاؤس کا چوکیدار بابل مجھے دیکھتے ہی پکارتا گل شیر صاحب میم صاحب آپ کے کمرہ میں گیا تھا۔ میں سمجھ جاتا کہ مسز سیلبی میرے لیے کھانے پینے کی کوئی چیز لائی ہوں گی۔

——— شہزادہ ہارون اسمٰعیل

میں ۱۹۴۱ء میں کرنل سٹیبنگ کے زمانے میں کالج میں داخل ہوا اور اپنی انٹری کا سب سے

چھوٹا لڑکا تھا۔ کرنل سیلبی ۱۹۳۷ء میں یہاں سے پنڈی نادرن کمانڈ کے ایجوکیشن افسر ہو کر جا چکے تھے۔ میرا ۱۹۴۱ء میں پنڈی میں ان کے گھر ٹھہرنا اور مسز سیلبی سے تعارف محض ایک اتفاق تھا جو ایک حادثے کے نتیجے میں رونما ہوا۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ داخلے کے دوسرے سال ہاؤس میں روشندان کی صفائی کرتے ہوئے سیڑھی سے ایسا گرا کہ سامنے کے دو دانت آدھے ٹوٹ گئے جن کو نکلوانے کے لیے کرنل سٹیبنگ نے مجھے تاج بگلر کے ساتھ پنڈی بھیجا۔ پنڈی میرے لیے بالکل اجنبی جگہ تھی۔ مجھے صرف یہ بتایا گیا تھا کہ سکول کے ایک پرانے کمانڈانٹ کے ہاں میرے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ میں ہزار اندیشے لیے راولپنڈی کے سٹیشن پر گاڑی سے اترا تو سٹیشن پر کرنل (اس وقت میجر) سیلبی اور ان کی بیگم مسز سیلبی کو موجود پایا۔ ہیلو تم ہارون ہو؟ سیلبی صاحب نے پوچھا۔ میں نے حیرت سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گئے کہ ہارون میں ہوں۔ اتنے میں تاج بگلر جو ان کو پہلے سے جانتا تھا ان کو اپنا زبردست سیلوٹ مار رہا تھا۔ جب تک سیلبی تاج بگلر سے دو چار باتیں کریں مسز سیلبی نے مجھے اپنی تحویل میں لے لیا اور ہاتھ پکڑ کر چلنے لگیں۔ اس مادر مہربان جسے دنیا مسز سیلبی کے نام سے جانتی ہے میرا یہ پہلا تعارف تھا۔ بنگلے پر پہنچ کر تاج کو تو سرونٹ کوارٹرز میں جگہ ملی لیکن مسز سیلبی نے مجھے اپنے کمرہ کے ساتھ کے کمرہ میں ٹھہرایا۔ ڈرائینگ روم میں مجھے اپنے دائیں ہاتھ بٹھاتی تھیں اور اپنے ہاتھ سے سرو کرتی تھیں۔ صبح کو بیڈ ٹی اور رات کو سونے سے پہلے دودھ کا ایک گلاس ان کا بیرہ مجھے کمرہ میں دے جاتا۔ ان دنوں سردی بہت تھی۔ غالباً جنوری کا مہینہ تھا ان کی نظر میرے عام سے سوتی موزوں پر پڑی تو کہنے لگیں چلو، ہارون میں تمہیں گرم اونی موزے دلاتی ہوں۔ چنانچہ مجھے لے کر صدر کی دکانوں پر میرے لیے ہم رنگ اونی موزے تلاش کرتی رہیں۔ موزے تو بہت تھے لیکن ہم رنگ نہیں تھے جو وردی کے ساتھ پہنے جا سکتے۔ اس لیے موزے تو نہیں لیے لیکن واپسی میں انہوں نے میرے لیے ٹافیوں اور چاکلیٹ، کا ایک ایک پیکٹ خریدا۔ جس دن مجھے جہلم لوٹنا تھا وہ مجھے سٹیشن تک چھوڑنے آئیں۔ مادرانہ شفقت سے خدا حافظ کہا۔ ماہ و سال کا سفر جاری رہا۔ برسہا برس کے بعد جب کسی نے برسبیل تذکرہ بتایا کہ سیلبی کے بعد مسز سیلبی بھی چل بسیں تو میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی یا اللہ یہ میاں بیوی عیسائی تھے جو کچھ تھے میرے محسن تھے ان کو بخش دے۔

تاج بگلر

—— لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد ستارۂ جرأت[۱]

تاج بگلر کو لڑکے اپنا دشمن نمبر ون سمجھتے تھے۔ آندھی ہو، مینہ، گرمیاں ہوں یا کڑکڑاتے جاڑے وہ ظالم ہمیشہ بروقت بگل بجاتا تھا اور اتنی زور سے کہ مردے قبر سے نکل پڑیں اس غریب کو سب سے زیادہ بددعائیں صبح ریوالی پر دی جاتی تھیں ظالم ایک منٹ کا فرق بھی نہیں ہونے دیتا تھا اور کیڈٹس کی تمام بددعاؤں کے باوجود نہ وہ بیمار پڑا اور نہ ہی چھٹی لی۔ تاج بگلر دیکھنے میں بھی پی ٹی حوالدار کرم داد کی طرح بڑا شاندار آدمی تھا۔ اور بڑی بات یہ کہ رینک چھوٹا تھا لیکن آدمی چھوٹا نہیں تھا۔ کبھی کوئی ہلکی بات نہیں کی جس کا لڑکوں پر برا اثر پڑے بلکہ خود لڑکوں پر ملٹری پولیس کی سی نظر رکھتا تھا۔ جس طرح وہ سیکریٹ سروس ۰۰۷ کی طرح غلط کاروں پر نظر ڈالتا تھا وہ ان کی جان آدھی کر دینے کے لیے کافی تھا۔ مختصر یہ کہ ثابت یہ ہوا کہ ملٹری کالج ایسے اداروں میں بگلر ہو یا چپراسی جو بھی ہو ایک شخصیت رکھتا ہو۔ نتھو پھتو نہ ہو کہ جو سامنے آیا کھڑا کر دیا۔ اس لیے کہ ایک طالب علم اپنے ماحول کے ہر جز سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے یا اثر قبول کرتا ہے۔ لاشعوری طور پر ہی سہی، یہ حقیقت ہے کہ اس دور کا کوئی لڑکا ایسا نہ ہوگا جسے تاج بگلر کا نام یاد نہ ہو۔ اور ہو سکتا ہے وہ اپنے آفیسرز کے نام بھی بھول چکا ہو۔ انسان کو کھرے کھوٹے کی پہچان فطری طور پر ہوتی ہے۔

—— بریگیڈئر محمد اسلم جنجوعہ ستارۂ جرأت[۲]

تاج بگلر میرے زمانے یعنی سٹیبنگ کے دور کے آخری دنوں میں کیڈٹ آفیسرز کا ویٹر ہو گیا تھا۔ تاج نے میس میں بھی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہوا تھا۔ صاف ستھرا لباس اونچے شملے کے ساتھ سفید پگڑی۔ تاج بگلر کی صحت اور توانائی اس ادھیڑ عمر میں بھی قابل رشک تھی۔ تاج صاحب

---

[۱] کالج نمبر ۵۲، زمانہ تعلیم ۱۹۳۷ تا ۱۹۴۳ء

[۲] کالج نمبر ۱۲۲۱ زمانہ تعلیم ۱۹۴۸ تا ۱۹۵۰ء

کو یہ بھی Privilege حاصل تھی کہ وہ نوجوان کیڈٹ آفیسرز کو بڑے وقار سے سمجھاتے بھی تھے" صاحب یوں نہیں۔ اتنی جلدی گرم نہیں ہوا کرتے۔ وغیرہ وغیرہ" اور سب کیڈٹ آفیسرز تاج کے سپیشل سٹیٹس کا احترام کرتے تھے۔ تاج کو یہ مرتبہ اپنے وقار کی وجہ سے حاصل تھا۔

صوبیدار سیّد عالم شاہ

ـــــ کرنل حضور احمد خان، ایم سی

۱۹۳۵ء میں پوسٹ ہوئے تھے سکین ہاؤس میں صوبیدار غلام احمد صاحب کے ساتھ اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر مقرر ہوئے۔ سید زادے تھے۔ آل رسول سے جو اونچی نسبت تھی اس کی شایان شان کردار تھا۔ سبحان اللہ!

ـــــ بریگیڈئر امین خان

شاہ صاحب میپ ریڈنگ اور حساب پڑھاتے تھے۔ سکین ہاؤس میں ان کی جو بات مجھے یاد ہے وہ یہ ہے کہ خاص خاص موقعوں پر وہ مجھے اور چند دوسرے پریفیکٹس کو کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھیجتے تھے۔ حق مغفرت کرے۔ آخر آخر میں دل میں لوگوں کی مہربانیاں ہی رہ جاتی ہیں اور زندگی کی راہوں میں اجالا کرتی ہیں۔

صوبیدار ڈاکٹر نصیر الدین

ـــــ لیفٹیننٹ کرنل اورنگزیب خان[1]

میڈیکل کور کے یہ صوبیدار صاحب سیلبی کے زمانہ میں سکول اسپتال کے انچارج تھے۔ اپنے کام کو جانتے تھے اور اسے ذمہ داری سے کرتے تھے۔ معائنہ اتنی تفصیل سے کرتے کہ الجھن ہونے لگتی سیتھسکوپ وغیرہ اتنی احتیاط سے استعمال کرتے جیسے یہ چیزیں شیشے کی بنی ہوئی ہیں۔ بیماری کے

---

[1] زمانہ تعلیم ۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۱ء

علاج کے علاوہ تیمارداری بھی کرتے۔ بڑے بھلے اور سیدھے آدمی تھے۔ سیدھے پن کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ مدراسی ہونے کی وجہ سے انگریزی کے بعض حروف کے تلفظ بڑے عجیب طریقے سے کرتے۔ مثلاً ہائجین اور فزیالوجی کی کلاس لیتے ہوئے ایک لفظ مسل آیا اس کو انہوں نے بلیک بورڈ پر لکھنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ ہر حرف کو پڑھتے بھی جاتے وہ اس لفظ کو لکھ تو ٹھیک رہے تھے لیکن ہر حرف کے ساتھ "ای" کی آواز شامل کرتے جاتے تھے۔ مثلاً مسل کی سپیلنگ انہوں نے یوں کی یم، یو، یس، سی، یل، ای لڑکوں کو بڑی ہنسی آئی جو انہوں نے بمشکل ضبط کی۔ دو لڑکوں کو شرارت سوجھی انہوں نے بہانے سے مسل کی سپیلنگ بار بار پوچھی اور وہ ہر بار بڑی سادگی سے کہتے کہ یک بار بول دیا سو بار نہیں بولتا اور پھر یم، یو، یس، سی، یل، ای کی گردان کی۔ ان کا نک نیم، ای یم، یل پڑ گیا تھا۔

ڈاکٹر نصیر الدین کب کے مٹی ہو چکے لیکن ان کی باتیں زندہ ہیں۔ پبلک سکول کا مزا یہی ہے کہ بچپن ہی میں تقریباً ہر رنگ ہر مزاج کے آدمیوں سے واسطہ پڑ جاتا ہے اور ہر پہلو سے زندگی کا تجربہ ہو جاتا ہے۔

نصیر صاحب اتنے بھولے بھی نہیں تھے کہ انہیں ہماری شرارت کا علم نہ ہو لیکن وہ بچوں کے لیے بھولے بنے ہوئے تھے تاکہ وہ کچھ دیر خوش ہو لیں بیشک ان کے Expression پر لیکن سیکھتے رہیں۔ اللہ اکبر کتنے بڑے انسان تھے۔

جمعدار منگا خان

——— کرنل حضور احمد خان ایم سی

۱۹۳۵ء میں جمعدار ایڈ جوٹینٹ اور کوارٹر ماسٹر کی نئی پوسٹ پر پوسٹ ہو کر آئے تھے منگا خان آرمی کی زبان میں بے حد چٹک تھے۔ بات چیت میں، چال ڈھال میں اور کام میں بھی آتے ہی انہوں نے سکول میں اپنی جگہ بنائی۔ اب تک ہمارا واسطہ پرانے وقتوں کے لوگوں سے تھا۔ منگا خان نئے دور کی پہلی آواز تھے۔ ڈرل اور ڈسپلن دونوں کو انہوں نے نئے معیاروں سے آشنا کیا۔

جتنے کام کرنے میں انتھک تھے اتنے ہی کام لینے میں سخت تھے۔ انہیں اپنے مقام اور عہدے کا بھی بڑا پاس تھا۔ سکول کے انتظامی معاملات پر ان کی گرفت بہت سخت تھی۔ وہ ہر وقت ہر جگہ موجود ہوتے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ ان کا ٹرن آؤٹ بھی مثالی تھا، وردی، بیٹی، جوتے ہر چیز چمکتی۔ ان کی وردی پر کبھی کوئی سلوٹ نہیں دیکھی گئی۔ سنا تھا کہ وردی پر ڈبل سٹارچ لگاتے اور وہ آخری استری وردی پہننے کے بعد کرلتے ہیں۔

منگا خان اپنے لباس کے بارے میں اتنے محتاط تھے کہ ایک بار وردی پہن کر کہیں بیٹھتے نہیں تھے۔ سارے کام کھڑے کھڑے کرتے تھے۔ یہ بات کچھ غیر فطری سی تھی لیکن ان کے احساس فرض کے، ان کی سخت کوشی کے سب ہی معترف تھے۔ ان کے حوالے سے بھی لڑکوں نے بہت کچھ سیکھا۔ ۱۹۴۴ء میں کمیشن لے کر اورنگ آباد چلے گئے تھے۔ میجر ہو کر ریٹائر ہوئے۔

ـــــ صوبیدار مسعود اللہ بیگ

منگا خان بہت کھردرے تھے لیکن اپنے کام کے پکے تھے۔ اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ یہ واقعہ ۱۹۳۷ء کا ہے۔ ایک روز جادہ کا بشیر کہنے لگا یار کچھ دل گھبرا رہا ہے میں دو تین دن کی چھٹی جا رہا ہوں۔ چھٹی، میں نے حیرت سے پوچھا کیوں کہ اس زمانے سوائے کسی حادثے کے چھٹی جانے کا تصور نہیں تھا۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ بشیر چھٹی چلا گیا گھر سے تار آیا تھا کہ کوئی موت ہو گئی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ بشیر نے کوئی چکر چلایا ہے۔ اسی دن شام کو میں مسجد سے نکل رہا تھا کہ پلاٹون کمانڈر نے بتایا کہ جلدی سے جمعدار منگا خاں کے دفتر جاؤ تمہارا تار آیا ہے۔ یہ دادی کے انتقال کا تار تھا (جن کا دو برس پہلے انتقال ہو چکا تھا) میں کھٹک گیا کہ کہیں یہ بشیر کی مہربانی نہ ہو۔ بہر حال اس وقت میں چپ رہا اور خاموشی سے دو دن کی چھٹی پہ گھر چلا گیا۔ اس طرح دونوں کے تار پہ چھٹی جانے سے منگا خاں کی چھٹی حس بیدار ہو گئی کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ تار لے کر جہلم کے جی۔ پی۔ او چلے گئے۔ وہاں سے پتہ چلا کہ بشیر کی تار کالج کے موچی نے دی ہے اور میرے نام کی تار جادہ کے بشیر نے۔ پھر دونوں کا جو حشر ہونا تھا وہ تو ہوا ہی دیکھنا یہ ہے کہ منگا خاں کا احساس فرض کس درجہ کا تھا۔

---

[1] زمانہ تعلیم ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۸ء

——— لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد ستارۂ جرأت

کرنل سٹیٹنگ ایسے کمانڈانٹ کے ساتھ چلنا جو ڈرل کا ماہر اور ایڈمنسٹریشن کا سپرمین تھا آسان کام نہ تھا۔ منگا خاں سکول کے جی اے انڈیکیوایم کے طور پہ سٹیٹنگ کے ساتھ چلے اور بہت دھڑلے سے چلے۔ یہ کوئی کم کارنامہ نہیں یہ امتیاز وہی حاصل کر سکتا ہے جو اپنے کام پہ پوری طرح حاوی ہو اور جان مار کر کام کرتا ہو۔ ڈسپلن کے معاملہ میں سٹیٹنگ سے زیادہ سخت گیر تھے۔ اس سے پہلے کہ میں ان کی سخت گیری کی بات کروں یہ بتاتا چلوں جو شاید زیادہ لوگوں کو معلوم نہ ہو کہ وہ بالکل پتھر کے نہیں تھے۔ جانوروں سے انہیں پیار تھا گھر پہ ہرن اور مور رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے پرندے بھی تھے۔ (جو بے زبانوں سے پیار کرے وہ بے حس نہیں ہوتا)

جب ۴۳ء میں ہم کالج سے رخصت ہونے لگے تو ان سے پوچھا سر آپ اتنی سختی کیوں کرتے تھے؟ زندگی میں شاید وہ پہلی بار تھوڑا سا مسکرائے اور کہا مجھے معلوم ہے کہ تم لوگوں نے میرا نام ہلاکو رکھا ہوا ہے۔ تم بڑے ہو جاؤ گے تو اس وقت خود فیصلہ کر لو گے کہ میں ہلاکو تھا یا نہیں۔ اصل میں اس سٹیج پر تم لوگوں کو تجربہ نہیں کہ نوکری کا مسئلہ کیا ہوتا ہے۔ "کیا ہوتا ہے" میرے منہ سے برجستہ نکلا۔ بتاتا ہوں مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ یا تم سینئر کو مطمئن کرو، اسکے احکامات کی مکمل تعمیل کر کے یا جونیئرز کو خوش کرو رعایتیں دے کر انہیں ڈھیل دے کر، ان کی غلطیوں کی چشم پوشی کر کے۔ سینئر کو کام چاہیے جونیئرز کو آرام چاہیے۔ دونوں کے مطالبات متضاد ہوتے ہیں اب یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے کہ تمہیں کس آقا کو خوش کرنا ہے اور یہ کہ تمہارا اصل فرض کیا ہے؟ اس مسئلہ پر میرا ذہن صاف ہے کہ سینئر کو مطمئن کرنا ہے۔ اسی میں آخر کار جونیئرز کی بھی بھلائی ہوتی ہے۔ آخر سینئر یا قانون بھی تو تمہاری بہتری کے لیے ہوتا ہے۔ ٹریننگ میں رعایت کرنا کسی کے ساتھ بدترین دشمنی ہے۔ میں اس پر یقین رکھتا ہوں مجھے معلوم ہے تم لوگ مجھے بددعائیں دیتے رہے ہو مجھے یقین ہے کہ ایک روز تم سٹیٹنگ کو اور شاید مجھے بھی دعائیں دو گے اور کہو گے "ہی واز رائٹ"، آج ہمارے دلوں سے ان دونوں کے لیے دعائیں ہی نکلتی ہیں۔ اتنے Committed لوگ ہر روز کہاں ملتے ہیں۔

حوالدار اولیاء خان

صوبیدار سردار بیگ

راشد سردار بیگ صاحب حوالدار اولیاء خان کی بڑی تعریف سننے میں آئی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

سردار بیگ کہنے کو حوالدار تھے لیکن آن بان بہت تھی۔

راشد مثلاً کس طرح؟

سردار بیگ مثلاً چلتے ہیں، پڑھاتے ہیں، بات کرتے ہیں، آدمی کا چلنا بھی اس کی شخصیت کا غماز ہوتا ہے اولیاء خاں اس طرح قدم جما کے سیدھے تیر کی طرح چلتے تھے کہ دور سے اندازہ ہو جاتا کہ اولیاء خان آرہے ہیں یہ خود اعتمادی ان کے پڑھانے سے بھی عیاں تھی۔ ہم نے ان سے یہ سیکھا کہ رینک بیشک کم ہو لیکن اگر علم زیادہ ہے (وہ بی اے تھے جو اس زمانے میں بہت بڑی بات تھی) تو بندے میں خود اعتمادی آجاتی ہے۔

راشد اس کی ایک کوئی مثال؟

سردار بیگ اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ ایک بار تاریخ کے پرچے کے نمبر بتا رہے تھے تو سکول نمبر ۴۴ سردار علی کے نام پر ذرا رُکے اور کہا ویری گڈ ایک سو دس کچھ لڑکے بے اختیار بول پڑے۔ سر وہ کیسے، کل نمبر تو سو ہیں؟ بولے ہاں مجھے معلوم ہے کل نمبر ۱۰۰ ہیں لیکن اولیاء خاں نے اسے ایک سو دس دیئے ہیں۔ (اولیا خاں جلال میں آتے تو اسی طرح تھرڈ پرسن غائب میں اپنا نام لیتے۔ ساتھ ہی چہرہ سُرخ ہو جاتا۔ نتیجتاً کلاس میں سناٹا چھا جاتا۔ لیکن اس بار چہرہ سُرخ نہیں ہوا اور کچھ مسکرا کر بولے) سردار علی نے سب کچھ صحیح لکھا ہے۔ سو نمبر اس کو وہ ملے جو سرکار کے تھے۔ دس نمبر اولیاء خان نے اپنے پاس سے دیئے۔ اب کس کی مجال کہ پوچھے کہ حضور، اس دریا دلی کی وجہ؟ پھر خود ہی گویا ہوئے۔ دیکھو اس نے لکھا ہے کہ بابر باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ واہ۔ واہ سرکوبی باغیوں کی سرکوبی۔ کیا لفظ چنا ہے،

ہے کوئی جواب اس کا۔ تو اولیا خاں نے خوش ہو کر اسے دس نمبر اپنے پاس سے دے دیئے۔ جس کا جی چاہے کمانڈانٹ کو رپورٹ کر دے لیکن اولیا ء خاں ایک سو دس سے ایک نمبر کم نہیں کرے گا۔

راشد بہت خوب۔

سردار بیگ سر، اس طالب علمی کے زمانے میں تو ہم اس طرح کی باتوں کو کیا سمجھتے اب سوچتا ہوں کہ اولیا خاں نے جو ہسٹری پڑھائی سو پڑھائی لاشعوری طور پر خود اعتمادی کا سبق جو پڑھایا وہ بہت قیمتی ہے اولیا خاں سکین ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر بھی تھے۔ اب اس کا نام بابر ہاؤس ہے۔ ابھی آپ کے ہاں آتے ہوئے سکین کے سامنے سے گزرا تو وہاں سامنے کریج اینڈ کنوکشن (Courage and conviction) کے الفاظ لکھے نظر پڑے۔

راشد کریج اینڈ کنوکشن سکین ہاؤس کے نئے نام بابر ہاؤس کا ماٹو ہے۔

سردار بیگ تو سر، بابر ہاؤس کے پرانے ہاؤس ماسٹر اولیا خاں کریج اور کنوکشن کی زندہ تصویر تھے۔

ـــــ لیفٹیننٹ کرنل اورنگزیب خان

جناب اولیا خان ہسٹری اس طرح پڑھاتے جیسے کوئی داستان سنا رہے ہوں واقعات کا الفاظ میں نقشہ کھینچتے جاتے۔ تاریخی کہانیوں سے سبق کو دلچسپ بنا دیتے اور پھر کہانی سنانے کا بھی ان کا اپنا انداز تھا۔ نور جہاں کا ذکر آتا تو بنگال میں شیر افگن کے قتل اور باغ میں جہانگیر کے کبوتر اڑانے کا قصہ ضرور سناتے۔ ساتھ ہی نور جہاں کے سراپا کی تصویر کشی بھی ہوتی جاتی۔ تھے تو میانوالی کے نیازی پٹھان لیکن اُردو خوب بولتے تھے۔ کبھی کبھی میانوالی رگ بھی پھڑک اٹھتی تھی۔ ایک بار پانی پت کی تیسری لڑائی کا نقشہ کھینچ رہے تھے کہ کلاس میں کسی طرف سے سرگوشی کی آواز آئی۔ فوراً جلال میں آ گئے۔ اولیا خاں بول رہا ہے۔ تمہاری گلی کا کتا نہیں بول رہا ہے اور کلاس میں سناٹا چھا گیا۔ بعد کو خود لڑکوں نے اس لڑکے کی خبر لی۔ ان کے پیریڈ کا لڑکوں کو انتظار رہتا تھا۔ اولیا خان جنگ عظیم کے دوران کمیشن ہو گئے تھے۔ ان کی اپنی شخصیت تھی۔ میں یہ بات ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ کم از کم میرے زمانے ۱۹۳۵۔۴۰ میں

کے۔جی۔آر سکول جہلم میں (سوائے دو ایک کے) استاد جس رینک کے بھی تھے پڑھانے تو بہت اچھا تھے ہی اپنی شخصیت میں بھی ایک انفرادیت رکھتے تھے۔ رینک تو اجنبی لوگوں کے لیے ہوتا ہے لڑکے تو روزانہ ہی دیکھتے ہیں کہ یہ بندہ اندر سے کیا ہے اور اسی حساب سے اس سے لاشعوری و شعوری طور پر اثر قبول کرتے ہیں۔ آج بھی اس زمانے کا جو اولڈ بوائے ملتا ہے یہی کہتا ہے کہ اولیا خاں کی کیا بات ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اولیا خاں کی یاد آج بھی زندہ ہے۔ یہ مقام شخصیت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

مسٹر بشیر احمد

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد گلشیر

اس دور کے اساتذہ میں بشیر احمد صاحب کا ذکر کم آتا ہے لیکن یہ بھی قابل ذکر آدمی تھے اور کئی لحاظ سے منفرد۔ مثلاً سٹاف میں اولیا خاں کے بعد یہ دوسرے استاد تھے جنہوں نے اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا ہوا تھا لیکن ان کا اصل امتیاز سپورٹس میں تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور کی فٹ بال ٹیم کے کپتان اور پنجاب یونیورسٹی کی فٹ بال ٹیم کے ممبر رہ چکے تھے۔ انہوں نے ہمارے سکول سپورٹس میں جان ڈال دی تھی۔ کوچ بھی بہت اچھے تھے۔ ان کی کوچنگ سے ہی ہم اس قابل ہو سکا کہ فٹ بال میں سکول ٹیم کی کپتانی کی اور جالندھر سے فٹ بال جیتی۔ بشیر صاحب فنافی لاسپورٹس تھے۔

——— میجر حبیب خان

یہ سویلین تھے۔ ۱۹۳۵ء میں سکول میں آئے، پنجاب یونیورسٹی کے بی اے تھے۔ کلاسیں بھی لیتے تھے کچھ شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ ان کی کوچنگ سے سکول میں ایتھلیٹکس اور فٹ بال کا معیار بہت بلند ہوا۔ گجراتی ہونے کی وجہ سے گجرات کی جوڑی والی کبڈی کھیلنے میں کمال حاصل تھا۔ کوئی حریف کھلاڑی انہیں ہاتھ لگا کر بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ ان کی جسمانی طاقت کے بارے میں مشہور تھا کہ فٹ بال تو فٹ بال ہے اگر ان کی کک بھینس کو بھی لگ جائے تو اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔

قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ ایسا مضبوط اور توانا اینھلیٹک کا جوان ٹی بی کا شکار ہوا۔ سال بھر علاج ہوتا رہا۔ آخر میں سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ میں انہیں دیکھنے اسپتال گیا تو دیر تک سکول کے کھیلوں اور کھلاڑیوں کا تذکرہ کرتے رہے۔ پھر یکایک چپ ہو گئے۔ ایک لمحہ کے بعد اپنا بازو اٹھا کر کہا۔ حبیب! یہ وہ مسلز ہیں جن میں کبھی دانت بھی نہیں گڑتے تھے۔ مولا کریم کی مرضی! میں بے اختیار رو پڑا۔

انتقال کے وقت ۳۵-۳۶ سے زیادہ عمر نہیں تھی۔ مٹی مٹی میں مل چکی۔ لیکن ایک بہت اچھے کھلاڑی کی یاد باقی ہے۔ جو بہت اچھا استاد بھی تھا۔

— بریگیڈئیر امیر خان

مسٹر شبیر جسمانی توانائی میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ ہم لڑکے جن کی اٹھتی جوانی تھی ان کی صحت و قوت کو رشک سے دیکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک میچ کھیلتے ہوئے انہوں نے سنٹر ہاف سے ایسا کک لگایا کہ فٹ بال گولی کی طرح گول پوسٹ سے ٹکرائی اور گول پوسٹ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

حوالدار سرفراز حسین شاہ

— بریگیڈئیر عطاء محمد خان

۱۹۳۶ء میں آرمی سپیشل کلاس کا امتحان شروع ہونے پر جو گرہ بجویٹ این سی او زآئے ان میں سے ایک محمدی پور (معین الدین پور) مدینہ گجرات کے ایک سید زادے حوالدار سید سرفراز حسین شاہ بھی تھے۔ یہیں ترقی پا کر جمعدار ہوئے اور بعد کو جنگ کے زمانے میں آرٹلری میں کمیشن ہوئے اور میجر ہو کر ریٹائر ہوئے۔ تاریخ اور جنرل نالج پڑھاتے تھے۔ بیدار ذہن تھا۔ سیاسی شعور رکھتے تھے انہی نے ہمارا تعارف مسلم لیگ اور قائداعظم سے کرایا۔ ۱۹۴۰ء کے پاکستان ریزولیوشن کی وضاحت انہی نے کی اور اس ذوق شوق سے کی کہ اس دن سے میں پاکستانی ہو گیا۔ اس روشنی کے لیے میں آج بھی میجر سرفراز حسین شاہ کو شکر گزاری کے گہرے جذبے کے ساتھ یاد کرتا ہوں۔

دفعدار آغا علی احمد شاہ

—— لیفٹیننٹ کرنل اورنگزیب خان

لڑکوں کو ہر طرح کے آئیڈیل انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ خوش لباسی اور ظاہری وجاہت دفعدار آغا اپنی نظیر آپ تھے۔ لیکن سارے سکول کی نظریں ان کے لباس پر رہتی تھیں۔ جب پہلی بار وہ آئی۔ ایم اے انڈین ملٹری اکیڈیمی دہرہ دون کا بلیزر پہن کر سپورٹس پر آئے تو لڑکے حیرت سے چونکے یہ کیا؟ پتہ چلا کہ آئی۔ ایم۔ اے میں سال ڈیڑھ سال جی۔ سی رہے ہیں۔ کسی وجہ سے کمیشن نہ ملا۔ اسی طرح ایک رات سالانہ ورائٹی شو پر وہ ونٹر ڈنر جیکٹ پہن کر آئے تو ہر طرف دھوم مچ گئی۔ سب لڑکوں کی نظریں انہی کی طرف تھیں۔ ان کے گورے چٹے رنگ اور اٹھتے ہوئے قد پر سوٹ بہت سج رہا تھا۔

—— لیفٹیننٹ کرنل خداداد خان

آغا صاحب علی گڑھ کے بی اے تھے۔ اور انگریزی پڑھاتے تھے۔ ڈسپلن کے معاملے میں سخت تھے۔ ہر روز رات کو پریپ میں ایک انسٹرکٹر ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔ جس روز آغا علی احمد شاہ ڈیوٹی پر ہوتے لڑکے چوکنے ہو جاتے۔ جس نے جہاں ذرا سا بھی شور کیا آغا صاحب فوراً اس کو جا لیتے۔

صوبیدار سکندر خان

—— لیفٹیننٹ کرنل شیر محمد ستارۂ جرأت

صوبیدار (بعد کو لیفٹیننٹ کرنل) سکندر خان معلّم بھی تھے اور مرشد بھی میں ان کا یہ احسان تا زندگی نہیں بھول سکتا کہ جب میں ۱۹۳۷ء کے اوائل میں آرمی سپیشل کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا وہ مجھے سوکس پڑھاتے تھے وہ بھی میرے کمرہ میں آکر اپنے فرائض منصبی سے فارغ ہو کر اپنے آرام کے وقت میں، بورڈ ہاؤس میں میرا کمرہ ان کے گھر سے بالکل ملا ہوا تھا۔ اگر کبھی رات کے پچھلے پہر

میری آنکھ کھلتی تو ان کے کمرہ سے ہُو حق کی آواز آتی سنائی دیتی۔ وہ تہجد کے بعد تواتر سے ذکر جلی کیا کرتے تھے۔ ان کی آہِ سحرگاہی نے میرے قلب کو بھی گداز کر دیا گو اس کے اثرات دس بارہ سال کے بعد نمودار ہوئے۔ جب میں نے جہاد کشمیر میں فی الواقع جہاد کیا اور اللہ کے کرم سے ستارہ جرأت سے سُرخ رو ہوا۔ احمد علی خان، لطیف صاحب، اور سکندر خان ایسے اساتذہ کے دم قدم سے ملٹری کالج کا اسلامی تشخص قائم رہا اور طلبا کی وہ ضروری مذہبی اور اخلاقی تربیت ہو سکی جس کی انگریز کے سیکولر نظام میں کوئی جگہ نہیں تھی۔

ــــــ کیپٹن محمد فیروز ملک

اکتوبر ۱۹۳۶ء میں سکول میں آئے۔ انگریزی، انڈین ہسٹری اور جغرافیہ، شہریت اور جنرل نالج پڑھاتے تھے۔

یکم دسمبر ۱۹۴۱ء کو کمیشن ہوئے اور اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر ڈسٹرکٹ راولپنڈی مقرر ہو کر گئے۔ ۱۹۵۳ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے اور سکول آف آرمی ایجوکیشن کی کمانڈ کے منصب سے ریٹائر ہوئے۔

ــــــ لیفٹیننٹ کرنل اورنگ زیب خان[1]

سکندر خان صاحب سپیشل کلاس کو جغرافیہ پڑھاتے ہوئے ساتھ ساتھ معلومات عامہ کو بھی کور کرتے جاتے۔ لڑائی کے دن تھے۔ لڑکے گپ شپ کے موڈ میں ہوتے تو کہتے سر آج خبریں ہو جائیں۔ سکندر خان فرماتے ہاں سناتا ہوں اور چاک کا ٹکڑا اٹھا کر چشم زدن میں بلیک بورڈ پر دنیا کا نقشہ بنا ڈالتے اور کہتے جاتے یہ میڈان جاپان ہے۔ (اس زمانے میں جاپان سستی اور کمزور چیزوں کے لیے مشہور تھا) پھر اس میں اس دن کی خبروں کے لحاظ سے رنگ بھرتے اور فرماتے یہ میڈ ان انگلینڈ ہے (یعنی بہتر) نقشہ کی مدد سے خبروں پر تبصرہ کرتے۔ یہ سارا کام پانچ منٹ میں ہو جاتا۔ پھر فرماتے اب روٹی حلال کریں گے وہ بہت تیاری کر کے آتے تھے۔ اور بہت جان مار کر

---

[1] زمانہ تعلیم ۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۱ء

پڑھاتے تھے۔ ان کا پڑھایا دل میں اتر جاتا تھا۔ خود کوئی لڑکا خواہ کتنا ہی کام چور ہو وہ پسند محنتی اساتذہ ہی کو کرتا ہے۔ سکندر خاں صاحب محنتی کھلنڈرے سب ہی طرح کے لڑکوں کے محبوب استاد تھے۔

ــــــ میجر جنرل محمد بشیر خان

سکندر خاں صاحب نے بھی اس دور کے طلبا کے کردار پر لازوال اچھے اثرات چھوڑے۔ کلاس میں قدم رکھتے ہی پڑھانا شروع کر دیتے۔ ایک منٹ ادھر ادھر کی بات نہیں کرتے تھے۔ جغرافیہ اور جنرل نالج پڑھاتے تھے۔ انھوں نے امتحان کی تیاری کرنے اور امتحان دینے کی تکنیک سکھائی ان کا انگریزی کا خط بہت ہی خوبصورت تھا گویا پرنٹ کرتے تھے۔ بلیک بورڈ پر اپنے ہاتھ سے نوٹس لکھتے اور بتاتے کہ جواب اس طرح لکھتے ہیں جب کوئی امتحان ہوتا تو اپنے ہاؤس کے لڑکوں کو جمع کرتے اور امتحان سے متعلق چھوٹی موٹی باتیں بتاتے مثلاً یہ کہ جلد سو جاؤ صبح جلد اٹھنا ناشتہ ہلکا کرنا پھر خود رات کو ایک بلیک بورڈ پر امکانی سوالوں کے جوابات اشاروں کی شکل میں لکھ کر سکھ چین کے پیڑوں کے نیچے وہ بورڈ ایزل پر رکھ دیتے تاکہ لڑکے امتحان دینے جانے سے پہلے اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ سکندر خاں صاحب کو اپنے طلبا کو آگے بڑھانے کا جنون سا تھا۔ انھوں نے ہماری آنکھیں کھولیں۔ کام کا، کارکردگی کا انسٹرکشن کا، اور فرض شناسی کا ایک ایسا معیار دیا جو میرے لیے تمام زندگی ایک معیار رہا ہے۔ اس دور کے اتنے بہت سے طلباء نے زندگی میں اتنا اچھا امتیاز حاصل کیا اس کا ایک سبب اس دور میں سکندر خاں ایسے کئی استادوں کا وجود بھی تھا میں انہیں اپنے اور سکول کے محسنوں میں شمار کرتا ہوں۔ کوئی ایسی صورت ہو کہ کالج کے ایسے استادوں کا نام ان کے کام کے حوالے سے محفوظ ہو جائے تاکہ آئندہ نسلوں کو یاد رہے کہ یہاں کس کردار کے لوگ کس معیار کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔

ــــــ لیفٹیننٹ کرنل خدا داد خان

ہر فوجی کو کبھی نہ کبھی انسٹرکشن بھی کرنی پڑتی ہے۔ اس کا معیار ہمارے لیے سکندر خاں صاحب

نے متعین کیا۔ آرمی تیرتے سپیشل کو ہسٹری، جغرافیہ، شہریت اور جنرل نالج پڑھاتے تھے۔ ان کی پہلی بات تو ہم نے یہ نوٹ کی ہر روز اپنے نوٹس ضرور بنا کر لاتے تھے اور اس فائنل ایر کلاس کو ہر باب پر بہت اچھے نوٹس دیتے تھے۔ ہر عنوان کو لازمی طور پر نقشوں اور ڈائیاگرام سے واضح کرتے تھے۔ سکندر کے حملے کے پورے روٹ کو انہوں نے اس طرح بار بار بلیک بورڈ پر نقشہ بنا کر واضح کیا تھا۔ کہ آج بھی ان کے شاگردوں کو یاد ہو گا معلومات کو وہ نکات کی شکل میں لکھتے اور لکھواتے تھے اس وقت تو ہم ان سے اس لیے خوش ہوتے تھے کہ امتحان کے لیے ہمارا کام آسان کر دیتے ہیں بعد کو احساس ہوا کہ اصل چیز ان کی محنت اور لگن تھی۔ انہوں نے شہریت پر میجر ولیٹ کی کتاب کے لفظ اور سطر سطر کے نیچے لکیر کھینچ رکھی تھی۔ ان کے معنی الگ نوٹ کرواتے تھے۔ اس طرح ہماری انگریزی بھی بہتر ہوئی۔

ــــــ مسٹر عبد الغنی انجنیئر

سکندر خاں صاحب کی جو چیز یاد ہے بلکہ دل پر نقش ہے وہ ان کا سلیوٹ کا جواب دینے کا انداز ہے۔ یوں سلیوٹ تو فوجی ماحول میں ہر سینئر کو مشینی طریقے سے کیا جاتا ہے۔ جواب بھی اسی لاتعلق سے مشینی انداز میں بغیر دیکھے بغیر توجہ دیئے دیا جاتا ہے۔ لیکن سکندر خاں صاحب کی بات ہی اور تھی۔ وہ سیلوٹ کا جواب اتنی گرم جوشی سے اتنی توجہ سے دیتے تھے کہ میں بھی ان بہت سے طلباء میں سے تھا جو خاں صاحب کو سلیوٹ کرنے کے موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔

ــــــ لیفٹیننٹ کرنل احمد خان ستارۂ جرأت [1]

برڈوڈ ہاؤس میرا ہاؤس تھا اور صوبیدار سکندر خاں صاحب ہاؤس ماسٹر تھے۔ ان کو میں خاص طور سے نہیں بھول سکتا۔ چونکہ انہوں نے میرے ساتھ ایک خاص احسان کیا۔ ایک سخت سزا تھی۔ جو انہوں نے مجھے دلوائی اور جو جرم کیا تھا وہ بھی سن لیجئے۔ اس زمانے میں پیسہ اپنے پاس رکھنا سخت ممنوع تھا۔ میں نے چھپا کے چار آنے رکھے ہوئے تھے۔ سکندر خاں صاحب کو پتہ چل گیا انہوں نے رپورٹ کر دی اور پھر کمانڈانٹ سٹیبنگ کو رپورٹ کرنے کا جو انجام ہو سکتا تھا وہ ہوا سکندر خاں

---

[1] زمانہ تعلیم ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۶ء

مجھ پر بہت مہربان تھے۔ لیکن قانون شکنی کرنے پر میری رعایت نہیں کی۔ اس رعایت نہ کرنے کو میں ان کا احسان کہتا ہوں۔ اس زمانے کا یہ دستور تھا کہ باپ ہو یا استاد خطا سے چشم پوشی نہیں کرتا تھا بلکہ جس سے تعلق زیادہ ہو اس سے زیادہ بازپرس کی جاتی تھی۔

——— مسٹر محمد افضل کیانی[1]

یہ واقعہ ستمبر ۱۹۴۱ء کا ہے مجھے کے جی آر سکول میں داخل ہوئے چند ہفتے ہی ہوئے تھے کہ میں سکول کے مین بلاک کے سامنے نارنگی کے چھلکے پر پھسل کر اس بری طرح گرا کہ چپل پیر سے نکل کر دور جا پڑی اور بے ہوش سا ہوا۔ میرے ہاؤس ماسٹر صوبیدار سکندر خاں پاس سے سائیکل پر گزرے وہ مجھے اٹھا کر برڈووڈ ہاؤس میں اپنے گھر لے گئے۔ وہاں ان کی بیگم نے مجھے پانی وانی پلایا اور اس طرح پیار کیا جس طرح مائیں اپنے بچوں کو کرتی ہیں۔ اس وقت ہم سکول میں نئے نئے داخل ہوئے تھے اور ان سب میں سے غالباً میں چھوٹا تھا۔ شاید اس وجہ سے میری خاطر تواضع اور بھی زیادہ ہوئی۔ سکندر خاں صاحب کی بیگم کو پنجابی نہیں آتی تھی۔ بہر حال وہ نیم پشتو اور نیم پنجابی میں مجھ سے باتیں کرتی تھیں۔ پھر میں ان کے گھر اکثر جاتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کی بیگم مجھے اکثر بلوا لیتی تھیں اور عموماً نان کباب کھلاتی تھیں۔ پھر ۴۲ء میں سکندر خاں صاحب کمیشن لے کر سکول سے چلے گئے لیکن ان کی اور ان کی بیگم کی چاہت کی یاد اب بھی تازہ ہے۔ بعد میں سکندر خاں صاحب کی ایبٹ آباد میں جا کر زیارت کی تھی وہ اس وقت لیفٹیننٹ کرنل ہو کر سکول آف آرمی ایجوکیشن کو کمان کر رہے تھے۔

رسالدار میجر کامیاب خان

——— کرنل حضور احمد خان

کامیاب خاں صاحب ۱۹۳۵ء سے ۳۸ ۱۹ء تک دو ڈھائی سال سکول کے رسالدار میجر رہے کبھی کبھی کسی استاد کا ریلیف پیریڈ بھی لیتے تھے۔ لڑکے اکثر ان سے اصرار کرتے کہ سر آج جمعہ کا خطبہ آپ دیں اور نماز بھی آپ ہی پڑھائیں۔ خطبہ میں وہ اسلامی تاریخ کے واقعات کے ساتھ شاہنامہ اسلام

[1] کالج نمبر ۹۶۳ زمانہ تعلیم ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۷ء

مسدس حالی یا اقبال کے شکوہ جواب شکوہ کے اشعار ضرور سناتے تھے اور وہ بھی ترنم سے
ان کا جمعہ کا خطبہ بہت مقبول تھا۔ ان کی قرأت میں سوز تھا۔ جمعہ کی نمازیں سورہ رحمان اور مغرب
کی نمازیں سورۂ العصر ان کی پسندیدہ سورتیں تھیں۔ چونکہ ان کی داڑھی کا رنگ سیاہ تھا وہ بلیک
بابا کہلاتے تھے۔ ان کے بعد سراج الدین صاحب آئے تھے۔ وہ داڑھی کو خضاب لگاتے تو وہ ریڈ بابا کہلائے۔
کامیاب خاں سے پہلے احمد علی خاں صاحب رسالدار میجر تھے۔ وہ بھی سکول میں اکثر آتے رہتے تھے۔
ایک آدھ بار جمعہ کی نماز بھی پڑھائی ان کی ڈاڑھی سفید تھی۔ وہ وائٹ بابا کہلاتے تھے۔

انٹر ہاؤس سپورٹس چیمپئن شپ کی کامیاب شیلڈ انہی کے نام پر تھی اور انہی نے دی تھی۔

کامیاب خان دیکھنے میں بھی بڑے شاندار آدمی تھے۔ اونچا قد، اکہرا بدن اور چاق و چوبند، چہرے پہ
سلیقے سے ترشی ہوئی سیاہ داڑھی سے وقار میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ یہاں میں ایک اور بات ریکارڈ
پر لانا چاہتا ہوں کہ سکول میں جو سینئر انڈین آفیسرز پوسٹ رہے تھے جیسے رسالدار لطیف، رسالدار
میجر احمد علی خاں، غلام احمد، ولایت شاہ صاحب، سکندر خاں صاحب، انور شاہ صاحب، کامیاب
خان صاحب یہ سب حضرات نہ صرف ظاہری اعتبار سے بلکہ اپنے کردار کے لحاظ سے بے حد ممتاز تھے
اور ان میں قدر مشترک یہ تھی کہ بڑا مذہبی دل و دماغ رکھتے تھے۔ شعائر اسلام کے خود پابند تھے اور ان کی
نجی زندگی بھی نمونہ تھی۔ لطیف صاحب، انور شاہ صاحب، کامیاب خاں صاحب تو باقاعدہ داڑھی رکھتے
تھے۔ ایک ادارہ کے لیے یہ بات بھی بہت اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے بیشتر اساتذہ طلبا کے ذہن بلکہ
قلب پر کس قسم کا تاثر چھوڑتے ہیں۔ تو کامیاب خاں نہ صرف بہت کامیاب منتظم تھے بلکہ بہت اچھے
کامیاب استاد بھی تھے۔ ایس۔ ایم اور کمانڈانٹ کے نائب ہونے کی وجہ سے انہیں انتظامی امور سے کم ہی
وقت ملتا لیکن وہ پڑھانے کا شوق رکھتے تھے۔ وہ کسی کلاس کو کوئی مضمون مسلسل نہیں پڑھاتے تھے۔
ان کا طریق کار یہ تھا کہ جو استاد کسی وجہ سے حاضر نہ ہوتا وہ اس کا ایک آدھ پیریڈ لیتے۔ اس طرح
تقریباً ہر کلاس میں جاتے رہتے ان کا پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ متعلقہ مضمون پڑھانا شروع کرنے
سے پہلے چند منٹ مذہبی اور دینی تعلیمات پر گفتگو ضرور کرتے اور ساتھ ساتھ سوال بھی کرتے جاتے۔
سب لڑکے چوکس رہتے۔ عموماً سب لڑکوں کو معلوم ہوتا کہ وہ کیا پوچھیں گے۔ اس لیے لڑکے وہ
بنیادی باتیں ذہن میں رکھتے۔

ـــــــ میجر جنرل محمد بشیر خان

وجیہہ اور پُر وقار، کامیاب خاں نظام خانی راجپوتوں کی روایت کے عین مطابق، جرأت مندی اور سادگی کے ساتھ ساتھ مذہبی دل و دماغ رکھتے تھے۔ اکثر جمعہ کی نماز پڑھاتے اور اسلامی تاریخ کے حوالے سے خطبہ دیتے۔ ان کی وجہ سے سکول کے دینی ماحول کو فروغ ملا۔ زیادہ سختی نہیں کرتے تھے ان کا رعب ان کی شخصیت کی وجہ سے تھا۔

ـــــــ مسٹر عبد الغنی

ان کی شخصیت و کردار سے لڑکے اتنے متاثر تھے کہ کبھی لڑکے شرارتیں کر رہے ہوتے تو کامیاب خاں اتنا کہتے اگر تم لوگ باز نہ آئے تو میں اگلے جمعے کو نماز نہیں پڑھاؤں گا تو کلاس میں سناٹا چھا جاتا۔ ان کی قرأت میں سحر تھا۔ واعظ بھی بہت اچھے تھے۔ ان کا جمعے کا خطبہ بھی سننے کی چیز ہوتا تھا۔

ـــــــ صوبیدار صالح محمد

کامیاب خاں صاحب کو ایک امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ انھوں نے پہلی بار سکول کے پڑھے ہوئے لڑکوں کو بلایا۔ کچھ لڑکے آئے بھی اور سکول سے جانے کے بعد سروس کیریئر پر سکول کے فائل میں ایک پروفارمے کا اضافہ ہوا۔ سکول اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف پہلا قدم کہا جا سکتا ہے۔

وارنٹ آفیسر ٹرنر

بریگیڈیئر امیر خان

ٹرنر سکول میں میرے انگریزی کے استاد تھے۔ ۱۹۳۸ء میں جب میں آٹھ ایم۔ٹی سنٹر جہلم میں بھرتی ہوا تو کم و بیش اسی زمانے میں ٹرنر کمیشن لے کر اسی سنٹر میں کمپنی کمانڈر پوسٹ ہوئے تھے۔ ادھر میں

ان کا پہلا کمپنی حوالدار میجر تھا۔ ایک آدھ سال بعد جب میں سنئر کا جے۔ اے۔ پروموٹ ہوا تو ٹرنر صاحب سنٹر کے سپورٹس آفیسر تھے۔ سکول کے رشتے سے ایک آدھ بار وہ میرے بنکر پر آئے۔ ایک بار انہوں نے مجھے اپنے بنگلہ پہ چائے کی دعوت بھی دی۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ واقعات ضرور ریکارڈ پر آئیں تاکہ نئی نسل کو معلوم ہو کہ اس حاکم قوم کا طریق جہانبانی کیا تھا۔

صوبیدار انور شاہ صاحب

بریگیڈیئر محمد صادق

انور شاہ صاحب جنوری ۱۹۳۷ء میں یہاں آئے تو جمعدار تھے۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء تک سکول میں رہے۔ یہیں صوبیدار ہوئے۔ ۷ اپریل ۱۹۴۲ء کو کمیشن لیا اور ۱۹ ستمبر ۱۹۵۳ء کو لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

انور شاہ صاحب کی حیثیت ستارہ صبح کی تھی۔ ان کی ذات میں ٹھنڈک اور روشنی جمع ہو گئی تھی۔

لیفٹیننٹ کرنل شاہ محمد

شاہ صاحب بڑے مذہبی دل و دماغ کے استاد تھے۔ اسلامی تاریخ کے واقعات اکثر سناتے۔ خصوصاً محرم پر ان کا بیان مشہور تھا۔

مسٹر عبدالغنی

سکول میں میرا پہلا سال تھا اور میں اپنی باری پر رابرٹس ہاؤس میں کچن ڈیوٹی پر تھا اور کچن کا جالی کا دروازہ کھول کر ایک لڑکے سے باتیں کر رہا تھا کہ سامنے سے کمانڈانٹ میجر سٹیبنگ گزرے میں نے ان کو دیکھتے ہی کھٹاک سے دروازہ بند کیا۔ وہ لڑکا بھی وہاں سے بھاگا (واضح رہے کہ کچن ڈیوٹی پر ہوتے ہوئے معمول کے مطابق کچن کو خالی چھوڑنا سخت منع تھا) کمانڈانٹ نے اس کا نوٹس نہیں لیا اور آگے چلے گئے۔ انہوں نے دفتر جا کر ضرور چیک کیا ہو گا کہ رابرٹس ہاؤس میں کچن ڈیوٹی پہ کون ہے؟ کمانڈانٹ کا اصول تھا کہ وہ پہلے سال کے نئے لڑکوں کو دفتر میں بلا کر خود کیننگ نہیں کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے مجھے دفتر میں تو نہیں بلایا لیکن دوسرے روز ہاؤس ہیڈ بوائے شیخ اسمٰعیل نے مجھے ہاؤس ماسٹر صوبیدار

انور شاہ کے سامنے پیش کر دیا اور کہا کہ کچن ڈیوٹی پر غفلت کرنے کے لیے اس کے پانچ کین لگنے ہیں۔ انور صاحب بڑے اللہ لوگ تھے۔ مجھ سے بڑے پیار بلکہ معذرت سے کہنے لگے میں نے آج تک کسی بچے کو نہیں مارا لیکن آج سی او کا حکم ہے اس کی تعمیل بھی ضروری ہے لیکن تمہیں تکلیف بھی نہیں پہنچانا چاہتا یہ کہہ کر انہوں نے کین سنبھالا اور پانچ کین مارے، بلکہ یہ کہنا چاہیے پانچ بار کین اٹھایا ہر بار بسم اللہ پڑھتے پھر آہستہ سے کین چھواتے۔ اللہ اکبر۔ ایسا شفیق اور کریم النفس انسان میں نے نہیں دیکھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی ایک سے ایک بہتر استاد اس وقت وہاں موجود تھا جنکی قدروں اور رویوں سے اس دور کے سب طلباء متاثر ہوئے۔ انور شاہ صاحب بھی ان میں سے ایک تھے۔

بریگیڈیئر عطا محمد خان (ستارہ امتیاز)

بڑے لائق فائق اور باوقار تھے: تلہ گنگ کے سید زادہ انور شاہ صاحب کا تعلق اساتذوں کی اس نادر قسم سے تھا جو اپنے طلباء پر ایک ایسا اثر چھوڑ جاتے ہیں جس کی بازگشت ان کی تمام زندگی میں سنائی دیتی رہتی ہے۔ میپ ریڈنگ پر انور شاہ صاحب کی کتاب ایک عرصے تک میپ ریڈنگ کے امتحان میں بطور ٹیکسٹ بک شامل رہی۔ جو نام تھا وہی شخصیت تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کی ذات گرامی سے سرچشمہ فیض جاری رہا۔

لیفٹیننٹ کرنل ٹی۔ ایچ۔ ایل سٹیبنگ

ایم اے۔ ایم سی۔ او۔ بی۔ ای

کمانڈانٹ ملٹری کالج ۱۹۳۷ تا ۱۹۴۷ء

رفقاء کار

کرنل محمد وزیر خاں ملک

صوبیدار میجر فتح خاں

مسٹر فضل حق حیدری

مسٹر نواب دین انصاری

شاگرد

کرنل حضور احمد خاں

صوبیدار سردار بیگ

کیپٹن محمد فیروز ملک

بریگیڈئر محمد صادق

میجر جنرل محمد بشیر خان

لیفٹیننٹ کرنل اورنگ زیب خاں

لیفٹیننٹ کرنل خدا داد خان

لیفٹیننٹ کرنل شاہ محمد

کیپٹن عبدالرحمان

مسٹر عبدالغنی انجینئر

بریگیڈئر عطا محمد خان

بریگیڈئر بشیر احمد

بریگیڈئر محمد اقبال

لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین ملک

بریگیڈئر محمد حیات

لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد کیانی

میجر محمد حسین

میجر محمد اسلم

لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید

لیفٹیننٹ کرنل احمد خان

میجر جنرل ممتاز علی

لیفٹیننٹ کرنل اصغر علی راجہ

میجر جنرل غلام محمد

لیفٹیننٹ کرنل محمد فرید ملک

لیفٹیننٹ کرنل رحیم اللہ

لیفٹیننٹ کرنل محمد یعقوب ملک

شہزادہ ہارون اسمٰعیل

بریگیڈئر محمد صادق خان

بریگیڈئر محمد خان

جنرل محمد اقبال خان

بریگیڈئر محمد اسلم جنجوعہ

بریگیڈئر محمد اکرم ظفر | لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال
کیپٹن سید شہزادہ عالم | لیفٹیننٹ جنرل محمد صفدر
ائیر چیف مارشل ذوالفقار علی خان

کرنل محمد ونیرخان ملک[1]

کرنل سٹیبنگ سپارٹا کے طریق تربیت کے قائل تھے۔ ذمہ داری، جفاکشی اور ان کی تربیتی قدریں تھیں۔ اس کے لیے جو سسٹم تھا اس کی تعمیل میں وہ قطعاً بے رحم تھے۔ اس سسٹم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہر قدم پر احتساب اور کاؤنٹر چیک تھا اور ہر فروگذاشت کی یقینی سزا تھی۔ پبلک سکول سسٹم اور رجمنٹل سسٹم نیا نہیں تھا۔ جیران کی اپنی شخصیت، ان کا پرسنل ٹچ اور ہر معاملے میں ان کی اپنی ذاتی مثال تھی۔ اپنے مشن سے ان کی وابستگی کی کوئی حد و انتہا نہیں تھی۔ میں ۱۹۵۲ء میں، پاکستان آرمی کے سکول آف ایجوکیشن ایبٹ آباد کی کمان سے پہلے بیکس فیلڈ (یو۔کے) میں برٹش ایجوکیشن کور کے سکول آف ایجوکیشن میں نو ماہ کے کورس پر گیا تو وہاں ایک موقع پر رائل اے ای سی کے ڈائریکٹر میجر جنرل بیڈال تشریف لائے۔ میں کچھ دنوں کے جی آر جالندھر میں تعینات رہا تھا۔ وہ ان دنوں جالندھر کالج کے کمانڈانٹ تھے اس طرح کچھ ملاقات تھی۔ وہ مجھے وہاں دیکھ کر بہت حیران ہوئے اور دیر تک کے جی کالجوں کی باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر بھی مدعو کیا۔ اس واقعہ کا تذکرہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ بیڈال سٹیبنگ سے جونیئر تھے۔ جب کرنل سٹیبنگ کو پروموشن کی آفر ہوئی تھی اگر وہ بھی بیڈال کی طرح یہاں کی کمانڈانٹی چھوڑ کر چلے جاتے تو یقیناً جنرل ہوتے۔ لیکن انہوں نے کالج کی پرنسپلی کو نہیں چھوڑا۔ ایسا کرنا نہ صرف کالج کے طلباء کے مفاد میں تھا بلکہ ان کے اپنے ملک کے مفاد میں بھی تھا۔ یہی ایک چیز ان کو بڑا بنانے کے لیے کافی ہے۔ ۱۹۵۲ء میں، میں رڑکی میں ان کے گھر ان سے ملا تھا۔ دو دن ان کا مہمان رہا۔ جہلم ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ بے شمار اولڈ بوائز کو انہوں نے نام نمبر سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہے، کیا رینک ہے وغیرہ۔ وہ خاص طور سے جہلم کے اولڈ بوائز سے مراسلت اور ملاقات کے ذریعے رابطہ

---

[1] سابق چیف انسٹرکٹر ملٹری کالج زمانہ ۱۹۴۰ تا ۱۹۴۸ء

قائم رکھے ہوئے تھے۔ یہ ان کا ظرف تھا کہ ان دو دلوں میں انہوں نے ایک بار اشارتاً بھی ۱۴ اگست کی پریڈ کے موقع پر ناگوار واقعے کا ذکر نہیں کیا جہلم کو یوں یاد کر رہے تھے جیسے کوئی اپنے گھر کو یاد کرتا ہے۔ ان کے طریق کار سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کے Devotion اور Dedication کے سب معترف ہیں۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اپنے سٹیبنگ پیدا کریں۔ پبلک سکول سسٹم کیریر افسروں کے بس کی بات نہیں۔ کرنل سٹیبنگ کو سرائے عالمگیر کالج سے اس وقت بھی پیار تھا کہ مجھے یقین ہے کہ اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت بھی ان کی زبان پر اس کالج کا نام ہوگا۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اگر کرنل سٹیبنگ نہ ہوتے تو یہ درس گاہ اس مقام تک نہ پہنچتی جس پر ہے۔

صوبیدار میجر فتح خان[1]

یہ ۴۲ ۱۹ء کے اواخر کا واقعہ ہے۔ میں جمعدار کے رینک میں رابرٹس ہاؤس کا ہاؤس ماسٹر تھا اور ہاؤس کے بائیں طرف کے کوارٹر میں رہتا تھا۔ ایک روز میں رات کو ٹارچ لے کر ہاؤس کو چیک کرنے نکلا کوئی ڈیڑھ بجے کا وقت ہوگا۔ جب تیسری ڈارمیٹری میں قدم رکھا اور ٹارچ ماری تو دیکھا کہ دائیں طرف کی انگیٹھی کے قریب کوئی بیٹھا ہے پیٹھ میری طرف تھی۔ کچھ مجھے اندازہ تو ہوا یہ کمانڈانٹ سٹیبنگ ہیں۔ بہر حال مجھے تجسس ہوا جب قریب گیا تو دیکھا کہ واقعی سٹیبنگ ہیں۔ کہنیوں تک آستین چڑھائی ہوئی ہیں اور دونوں ہاتھ انگیٹھی میں دیئے بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا سر خیریت تو ہے کیا مسئلہ ہے؟ بولے۔ سردی آگئی ہے۔ مچھر دانی کا استعمال روک دینے کا آرڈر کرنا ہے۔ میں بہت دیر سے بیٹھا چیک کر رہا ہوں کہ کہیں یہاں مچھر تو نہیں اگر ہوتے تو یہیں ہوتے میں نے کہا "سر آپ حکم دیتے ہم چیک کر لیتے۔" وہ تو ٹھیک ہے لیکن چونکہ ہاؤسز کی چیکنگ کے لیے نکلا ہوں میں نے سوچا یہ بھی چیک کر لوں۔ یہ اہم معاملہ ہے پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میرے ساتھ باہر آگئے۔ اور کہا "کوئی اہم آرڈر نکالنے سے پہلے اس کی Feasibility امکانیت خود چیک کر لینا اچھا ہوتا ہے کسی آرڈر کے نتائج پر غور نہ کرنا یا اس میں ترمیم کرنا یا پھر اسے منسوخ کرنا ناقص قیادت کی علامت ہے۔"

---

[1] استاد ملٹری کالج، زمانہ ۱۹۴۰ تا ۱۹۴۸ء

دوسرا واقعہ بھی رابرٹس ہاؤس کا ہے۔ اس زمانے میں گرمیاں تھیں اور لڑکے باہر صحن میں سوتے تھے۔ ایک روز صبح صبح چٹ آگئی۔ رات فلاں نمبر بری طرح کھانس رہا تھا۔ ایک منٹ میں پانچ بار کھانسا۔ اسے سی ایم ایچ پہنچایا جائے۔

سکول کے مستقل احکامات ہر ماہ پڑھ کر سنائے جاتے تھے اور ہر ہاؤس ماسٹر کو باقاعدہ تحریر دینی پڑتی تھی کہ احکامات دہرائے گئے ہیں۔ کرنل سٹیبنگ کے ایڈمنسٹریشن کا اصل اصول یہ تھا کہ جو ضابطے ہیں ان کے بارے میں کسی کو شبہ نہ ہو اور ان کی سختی سے پابندی کرائی جائے۔ کوئی ڈھیل تو وہ بندہ برداشت ہی نہیں کرتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سسٹم ایسا تھا کہ کوئی ڈھیل کر ہی نہیں سکتا تھا کہ گرفت ہونا یقینی بات تھی۔ ایک مثال دیتا ہوں ایک پکا حکم تھا کہ جو لڑکا اسپتال سے ڈسچارج ہو کر آئے اسے اس ہفتے واکنگ آؤٹ نہ بھیجا جائے تاکہ بازار میں الابلا کھا پی کر پھر بیمار نہ ہو جائے۔ اب ہوا یہ کہ ایک لڑکا ہڑالی اسپتال سے آیا تو سی ایس ایم عبداللہ خان نے لاپرواہی سے واکنگ آؤٹ کی کتاب میں اس کا نام بھی لکھ دیا میں نے بھی غلطی سے لڑکوں کے نام نمبر دیکھے بغیر ہاؤس ماسٹر کے دستخط کر دیئے بہر حال ہوا یہ کہ ان نئے شہر میں خوب دل بھر کے بد پرہیزی کی گھوما پھرا بھی خوب، نتیجہ یہ ہوا کہ آتے آتے اسے تیز بخار ہو گیا اور وہ اسپتال میں داخل ہو گیا۔ رات کو حسب دستور ڈاکٹر نے (اس وقت آئی ایم ڈی کا ایک بنگالی ڈاکٹر جمعدار منڈل آر ایم او تھا) اسپتالی لڑکوں کی رپورٹ کمانڈانٹ کو دی۔ اختر کا نام پڑھ کے وہ کھٹکا اور اسی وقت اسے چٹ بھی کہ اختر کی کیس ہسٹری کیا ہے، اس نے لکھ دیا دو دن ہوئے اسپتال سے ڈسچارج ہوا تھا اور آج شام کو ۱۰۲ بخار کے ساتھ پھر داخل ہوا ہے۔ سٹیبنگ نے مجھ سے باقاعدہ تحریری وضاحت طلب کی اور سخت ناراض ہوئے۔

کوارٹر ماسٹر سٹورز سٹیبنگ کے بنگلہ سے نظر آتا تھا۔ وہ وہاں سے اکثر راشن ایشو کو دیکھتا رہتا۔ جو لانگری فروٹ وغیرہ سٹور سے لے جا رہے ہوتے انہیں کبھی کبھی راستے میں روک لیتا۔ پوچھتا ہاؤس نفری کتنی ہے گنتی۔ اگر کوئی دانہ خراب ہوتا بازپرس کرتا خراب کیوں لیا۔ واپس کرو۔ اس بازپرس کی وجہ سے سب کو محتاط رہنا پڑتا تھا۔

حق نواز کیانی کے والد صوبیدار اللہ دتہ بنوں کے قریب قبائلیوں سے کسی جھڑپ میں کام آئے تھے۔ ان کے سی او کرنل میکے کے ایما پر سٹیبنگ نے صوبیدار صاحب کے خاندان کی سرپرستی

کی ذمہ داریاں قبول کر لی تھیں ان کے گھر اور زمینوں کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے۔ ایک بار صوبیدار صاحب کی کسی بیٹی کی شادی تھی۔ سٹیبنگ نے مجھے اور راؤ وہاب کو بلا کر جہیز کی کچھ چیزوں کی فہرست دی اور کہا اس سامان کو خرید کر مونہ پنڈ پہنچاؤ۔ رسیدیں لا کر مجھے دے دینا۔ جب حق نواز عمر کو پہنچے تو انہوں نے ان کے ماموں اور ہم لوگوں کی موجودگی میں پیسے اور زمین سارا حساب حق نواز کو سمجھایا اور بینک اکاؤنٹ ان کے حوالے کیا اپنی طرف سے جو کچھ دیا تھا وہ علیحدہ درج تھا۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ حق نواز کو سٹیبنگ نے بیٹا بنایا ہوا تھا جس سے وہ کبھی کبھی ناجائز فائدہ بھی اٹھا جاتا۔ ۱۹۴۲ء کے شروع میں ایک بار میں نے رپورٹ کر دی۔ سٹیبنگ نے باقاعدہ تفتیش کی اور اس کے چار کرارے بید رسید کیے۔

ایک بار بڑے دن کے موقع پر کالج کے سردار صاحبان کرنل سٹیبنگ کے بنگلہ پر انہیں مبارکباد دینے گئے۔ اس وقت بھی سٹیبنگ کالج گئے ہوئے تھے۔ مسز سٹیبنگ نے ہماری خاطر تواضع کی۔ باتوں باتوں میں کہنے لگی ہمیں انڈیا میں انیس برس ہو گئے مجھے یاد نہیں کہ کبھی ہیری نے دوپہر کو کھانا پورا کھایا ہو۔

جنہوں نے کرنل کے ساتھ کام کیا ہے وہ اس بیان کی تصدیق کریں گے۔ کرنل سٹیبنگ نے اپنا ڈائننگ روم بنگلے کے اس آخری کمرہ کو بنایا ہوا تھا جہاں سے گیٹ نظر آتا تھا۔ جوں ہی کوئی گیٹ پر نظر آتا وہ اٹھ کھڑے ہوتے اس سے پہلے کہ وہ پورچ تک آ کر برآمدہ کی گھنٹی بجائے وہ خود آ کر اس سے پورچ پر ملتے تھے۔ اس میں آنے والے بچے سٹیٹس کی قید نہیں تھی۔ آنے والے زیادہ لڑکوں کے والدین یا ان کے اعزاء ہوتے تھے لیکن خواہ آنے والا سپاہی ہوتا یا صوبیدار میجر وہ اس سے لڑکے کے حوالے سے یکساں تپاک سے ملتے تھے۔ پہلے گھر کی خیر خیریت پوچھتے پھر لڑکے کے بارے میں خود اسے بتاتے کہ وہ ایسا ہے ایسا ہے یہ خوبی یہ خامی ہے اور پھر اسے اپنے ہاتھ سے چٹ لکھ کر دیتے کہ آپ کا لڑکا فلاں ہاؤس میں ہے۔ اس کے ہاؤس ماسٹر کو یہ چٹ دے دیجئے اکثر اپنے ملازم فرانسس کو ساتھ کر دیتے تاکہ مہمان کو دقت نہ ہو۔

سٹیبنگ لڑکوں کو چھٹی بہت کم وہ بھی صرف والدین کی درخواست پر دیتے تھے۔ ایک بار رابرٹس ہاؤس کے ایک اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر نے ایک لڑکے کو اس کے کسی قریبی عزیز کے بے حد

اصرار پر چھٹی بھیج دیا۔ وہ خاندان کی مخالف پارٹی کا آدمی تھا۔ اتفاق سے اس کے گھر والوں نے اس کو آتے دیکھ لیا اور اسے مخالف پارٹی سے چھڑایا۔ بعد کو انھوں نے سٹیبنگ سے شکایت کی کہ لڑکے کو والدین کی درخواست کے بغیر چھٹی کیوں بھیجا گیا۔ سٹیبنگ نے اس حوالدار انسٹرکٹر کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی۔

اس زمانے میں راشن ڈیوٹی لڑکے بروالی سے بھی دو گھنٹے پہلے یعنی رات کے پچھلے پہر دودھ لینے اور چیک کرنے ملک ردم آتے تھے۔ سردی تھی اس لیے دو لڑکے گریٹ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے۔ سٹیبنگ نے ان کو وہیں ای ڈی سنادی اور حکم دے دیا کہ سب گریٹ کوٹوں کی بڑی جیبیں سی دی جائیں۔

آخر میں، میں ایک اور دلچسپ لیکن فکر انگیز واقعہ لکھتا ہوں کہ اگست ۱۹۴۲ء کی بات ہے میں ان دنوں صوبیدار میجر کی عارضی ڈیوٹی کر رہا تھا۔ سکول کو کھلے پہلا یا دوسرا دن تھا کہ صبح صبح کمانڈانٹ سٹیبنگ کی چٹ آ گئی۔ دفتر گیا تو پوچھا صوبیدار صاحب آج کوئی نیا انسٹرکٹر ساتویں سی میں پڑھا رہا ہے۔ میں نے کہا۔ سر، نیا کہاں سے آئے گا۔ جو ہیں وہ آپ ہی کے بھرتی کیے ہوئے ہیں۔ بولے نہیں، میں کلاس کے سامنے سڑک پر سے گزر رہا تھا تو لڑکے کچھ مذاق سا کر رہے تھے۔ انسٹرکٹر کوئی نیا نظر آ رہا تھا۔ میں نے ٹھیک طریقے سے دیکھا نہیں آپ جائیں اور دیکھیں کہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے سیلوٹ کر کے باہر آ گیا۔ کلاس کی طرف جا کے دیکھا تو میں بھی حیران کہ الٰہی کیا معاملہ ہے۔ صورت شکل تو اپنے سنیئر ماسٹر خواجہ الف دین سے ملتی جلتی ہے لیکن حلیہ بالکل بدلا ہوا ہے۔ ان کی فرنچ کٹ سیاہ داڑھی تھی شیروانی پر سرخ ترکی ٹوپی پہنتے تھے یہ صاحب کوٹ پتلون ڈالے ہوئے ہیں اور کلین شیو ہیں داڑھی کا نام نشان نہیں۔ میں برآمدہ میں کھڑے ہو کر ان کو غور سے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ تو وہ مجھے دیکھ کر خود کلاس سے باہر آ گئے۔ کیوں صوبیدار صاحب کیا بات ہے؟ میں نے پہچان کر کہا خواجہ صاحب یہ کیا؟ وہ سن کر مسکرائے۔ کلاس میں ان کے نکلتے ہی بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔ میں یہ کہہ کر کہ خواجہ صاحب آپ کلاس لیجیے۔ میں پھر دفتر گیا اور کمانڈانٹ کو رپورٹ کی سر، یہ خواجہ الف دین ہی ہیں۔ کسی وجہ سے داڑھی منڈا دی ہے اور شیروانی اتار دی ہے سٹیبنگ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بولے۔ دو باتیں ہیں یا تو اس شخص نے کمیشن کے لیے درخواست دینی ہے یا دوسری شادی کرنی ہے آپ خواجہ صاحب

کو میرے پاس بھیجئے گا۔ چنانچہ کلاسز کے بعد میں نے خواجہ صاحب کو کمانڈانٹ کے سامنے پیش کر دیا۔ سٹیبنگ نے ان پر جرح شروع کر دی جس کا خلاصہ تھا کہ کیبنٹ کے لیے تو نہیں جانا لیکن چھٹیوں میں شادی ضرور کی ہے۔ سٹیبنگ ظالم نے یہ راز بھی اگلوا لیا کہ نئی نویلی دلہن اکیس برس کی ہے اور آپ خود ماشاء اللہ چوالیس کے ہیں۔ اس انٹرویو کے بعد خواجہ صاحب تو باہر چلے گئے۔ سٹیبنگ نے مجھ سے کہا صوبیدار صاحب آپ آج ہی مسٹر خواجہ کو فارغ کر دیجئے۔ "فارغ کر دیجئے"۔ میں نے حیرت سے پوچھا" سر آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ شادی کرنا کوئی جرم نہیں اور داڑھی رکھنا نہ رکھنا بھی ان کا ذاتی معاملہ ہے"۔ خلاف معمول وہ میری بات خاموشی سے سنتے رہے۔ جب میں نے اپنی آخری اور زا پنے خیال میں خواجہ صاحب کے حق میں سب سے وزنی دلیل پیش کی۔ سر یہ بندہ انسٹرکٹر بہت اچھا ہے۔ تو سٹیبنگ نے زور دے کر کہا۔ "انسٹرکٹر بے شک بہت اچھا ہوگا لیکن انسان اچھا نہیں ہے۔ جو مذہبی شعائر کے بارے میں سنجیدہ نہ ہو وہ تعلیم وتربیت کے بارے میں کہاں سنجیدہ ہوگا۔ جس پر لڑکے ہنستے ہوں گے۔ وہ اس سے سیکھیں گے کیا"۔ اس طرح خواجہ صاحب غریب کی اسی دن چھٹی ہو گئی۔

ـــــ مسٹر فضل حق حیدری[1]

سٹیبنگ اپنی شخصیت، صلاحیت اور قوت کار کے لحاظ سے روایتی پبلک سکولوں کے بڑے سے بڑے ہیڈ ماسٹر سے کم نہیں تھے۔ کسی سسٹم کے تمام امکانات کو بروئے کار لے آنا آسان کام نہیں ہوتا سٹیبنگ نے یہ معجزہ کر دکھایا۔ پھر ان کا اپنا سٹائل تھا انھوں نے رجمنٹیشن کے فریم ورک میں پبلک سکول کے طرز تربیت کو فٹ ان کیا تھا۔ ان کا مضمون ہسٹری تھا۔ مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوا کہ سپارٹا اور رومن ہسٹری کے مطالعہ نے ان کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا تھا اور پبلک سکول کے تجربے نے یقیناً انہیں گہرائی میں جا کر متاثر کیا تھا۔ وہ سپورٹس اور کھیلوں سے وہی کام لے رہے تھے جو آرنلڈ آف رگبی نے لیا تھا۔

پبلک سکول سسٹم کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سسٹم ذمہ داری سکھاتا ہے خود اعتمادی و خود اقدامی (Initiative) کو ایک نظام کے ذریعے ابھارتا اور آگے بڑھاتا ہے۔

---

[1] استاد ملٹری کالج ۱۹۴۲ء تا ۱۹۶۹ء

سٹیبنگ ہاؤس ہیڈ بوائز (کمپنی کمانڈرز) اور سکول ہیڈ بوائے (بٹالین کمانڈر) کو خاص طور سے کیجز کالج کے توسط سے کمیشن کے لیے تیار کرتے تھے۔ اس ... سپارٹا کے طریقے سے ان کی سخت ترین تربیت ہوتی تھی۔ ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کا اتنا اہتمام تھا کہ جونیئرز کی غلطیوں کی سزا بھی ان کے کمانڈرز کو ملتی تھی۔

سینئر کیڈٹس (کیڈٹ آفیسرز) کی تربیت کے لیے ایک روز کرنل سٹیبنگ نے ایک انوکھا تجربہ کیا۔ ایک شام کو انہوں نے یکایک سٹاف میٹنگ بلائی۔ جب سب آگئے تو انہوں نے جے اے کو اشارہ کیا کہ دروازہ بند کر دیا جائے۔ یہ سن کر سب چونکے کہ کیا بات ہے لیکن جو بات انہوں نے کی وہ بہت مختصر تھی۔ انہوں نے کہا "کل ریوالی سے ری ٹریٹ تک اپنی ڈیوٹیوں کے حوالے سے جو جو کام بھی آپ کے سپرد ہے وہ کام آپ لوگ سرانجام نہ دیں۔ سکول کے وقت یہاں سٹاف روم میں آکر بیٹھ جائیں لیکن کلاسز میں نہ جائیں میں ایک تجربہ کر رہا ہوں۔ اور ہاں یہ اعلان ٹاپ سیکریٹ ہے اس کا تذکرہ آپ کسی سے حتیٰ کہ اپنے گھر میں بھی نہ کریں۔ شکریہ۔ حضرات، اب آپ جا سکتے ہیں۔"

جب ہم لوگ وہاں سے اٹھ کر اپنے کوارٹرز کو گئے تو حیرت کی تصویر بنے ہوئے تھے حسب حکم ریوالی سے ریٹریٹ تک کسی نے کوئی سرکاری کام نہیں کیا۔ میں خود اتفاق سے اس روز ڈیوٹی ماسٹر آف دی ڈے تھا۔ میں نے قطعاً کوئی چیکنگ نہیں کی۔ کہیں نہیں گیا۔ صبح سویرے ڈیوٹی کیڈٹ این سی او مجھے ملک کی چیکنگ کے لیے بلانے بھی آیا لیکن میں نے باہر نکلنے سے انکار کر دیا۔

مختصر یہ کہ اس دن ریوالی سے ری ٹریٹ تک سارا کالج ہیڈ بوائے کیانی نے اپنے کیڈٹ آفیسرز اور کیڈٹ این سی اوز کی مدد سے چلایا۔ کلاسز لڑکوں نے لیں۔ کمانڈانٹ کی کرسی کیانی نے سنبھالی۔ ہیڈ کلرک نے۔ جو اس زمانے میں سپرنٹنڈنٹ کہلاتا تھا فائیلیں پیش کیں تو کیانی نے لکھ دیا کہ کل پیش کیا جائے۔

کوئی دس بجے کے قریب جہلم بریگیڈ کے کمانڈر آئے تاج نے حسب دستور ادب سے کمانڈانٹ کے دفتر کا پٹ کھول دیا۔ جب انہوں نے اندر قدم رکھا تو دیکھا کہ سٹیبنگ کے بجائے ان کی کرسی پر ایک سمارٹ کیڈٹ بیٹھا ہے اور کیڈٹ ایجوٹینٹ کو کچھ آرڈرز دے رہا ہے اس نے اٹھ کر

سلیوٹ کیا اور رسمی مزاج پرسی کی، انہوں نے کہا مجھے کمانڈانٹ سے ملنا ہے۔ جواب ملا آج کمانڈانٹ ہیں ہوں۔ اگر آپ کرنل سٹیبنگ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں تو ان کے بنگلہ پر جانے کی زحمت کریں۔

مختصر یہ کہ اسی طرح ری ٹریٹ تک سارا کالج کیانی کی نگرانی میں لڑکوں نے چلایا۔ ری ٹریٹ کے بعد آرڈر آگیا کہ سارے کیڈٹس اور سٹاف ہال میں جمع ہوں۔ سارے لڑکے اس تجربے سے ایکسائیٹیڈ تھے۔ بروقت سٹیبنگ ہال میں داخل ہوئے ان کے ساتھ وہ صبح کے بریگیڈ کمانڈر بھی تھے۔ سٹیبنگ نے لڑکوں کو مبارک دی بار بار کہتے تھے میں تم پہ فخر کرتا ہوں میں تم پر فخر کرتا ہوں۔ (آئی فیل پراؤڈ آف یو) سٹیبنگ کے بعد بریگیڈ کمانڈر نے تو لڑکوں اور خاص طور پہ کیانی کی کارکر گی کو بہت ہی سراہا ہے۔ ان کا آخری فقرہ یہ تھا کہ میرا بس چلے تو تمہارے تمام کیڈٹ آفیسرز کو آج ہی پکا آفیسر بنا دوں۔ (دسمبر ۴۲ میں سات لڑکے کچز کالج کمیشن کے لیے گئے بھی) اس طرح یہ انوکھا دلچسپ اور نہایت مفید تجربہ ختم ہوا۔ اس سے سب لڑکوں کو جو نفسیاتی بوسٹ ملا اس کا کیا کہنا۔

اس سخت رجمنٹیشن کے ماحول میں سٹیبنگ نے میرہ کلچرل سرگرمیوں میں بہت دلچسپی لی۔ ڈیبیٹس اور ڈرامے جو میں نے کیے وہ ان ہی کے ایماء اور سرپرستی سے کیے۔ ابن کے ڈراموں میں ایک ڈرامے کا نام ماسٹر بلڈر ہے۔ میں سٹیبنگ کو کالج کا ماسٹر بلڈر سمجھتا ہوں۔

آخر میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ ۱۹۵۸ء میں جب میں انگلینڈ میں کرنل سٹیبنگ اور ان کی بیگم سے ملا تو منجملہ اور باتوں کے انہوں نے اس تجربے کا ذکر بھی کیا۔ وہ اپنے وطن میں تھے لیکن ان کا دل جہلم ہی میں اٹکا ہوا تھا۔ ان کے اولڈ بوائز نے بھی انہیں نہیں بھلایا تھا۔ ٹورکی میں ان کے بیشتر ملاقاتی کورسسٹر پر آئے ہوئے انکے پرانے شاگرد ہی ہوتے تھے۔

——— مسٹر نواب دین انصاری[1]

میں ملٹری کالج میں اواخر ۱۹۴۲ء سے اوائل ۱۹۴۷ء تک تقریباً پانچ سال رہا۔ اس زمانے میں وہاں ایک نہیں کئی گورے انسٹرکٹرز (سارجنٹ، وارنٹ آفیسر، کیپٹن میجر) آئے تھے۔ ان

[1] استاد ملٹری کالج ۱۹۴۲ تا ۱۹۴۷ء

میں سے بعض گھٹیا بھی تھے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ سٹیبنگ سا انگریز میں نے نہیں دیکھا۔ اپنے کام میں ڈوبا ہوا تھا اور اس پر پورے طور پر حاوی تھا۔ یہ دو صفتیں بیک وقت کسی میں مشکل سے جمع ہوتی ہیں۔ سٹیبنگ کی مار پیٹ مشہور ہے لیکن یہ بھی قاعدے سے تھی اور ایک اصول کے تحت تھی۔ مثلاً میرے ہوتے ہوئے پانچ سال میں کسی کی پبلک کیننگ نہیں کی۔ جو لڑکے اس کی سزا کو حوصلے سے برداشت کر لیتے تھے وہ ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اگر کسی کو زیادہ کیننگ کی وجہ سے اسپتال بھیجنے کی ضرورت پیش آجاتی وہ ڈاکٹر سے کہہ کر اس کی سپیشل ڈائٹ لگوا دیتا۔ دوسرے یہ کہ سزا کے بعد بات ختم ہو جاتی۔ زیر سزا لڑکے کے عہدہ یا سلیکشن پر کچھ اثر نہ پڑتا۔ ایک دلچسپ بات یہ کہ اس کی کیننگ کے بعد میں نے کسی لڑکے کو روتے نہیں دیکھا۔ اس کی انتہائی سختی کے باوجود لڑکے اس کے Devotion اور لگن کی وجہ سے اسے پسند کرتے تھے۔

سٹیبنگ گرمیوں میں صرف شارٹس پہن کر ننگے بدن سائیکل پر گھوما کرتا تھا۔ غالباً اتوار کا دن تھا کہ وہ کنٹین کے پیچھے کے سفیدے کے درختوں کے پاس سے گزر رہا تھا کہ شہد کی مکھیوں نے اسے آلیا۔ (کسی نے چھتہ چھیڑ رکھا تھا جس کی سٹیبنگ کو خبر نہ تھی) رابرٹس ہاؤس کے ایک لڑکے نے جب یہ دیکھا کہ کمانڈانٹ کے مکھیاں کاٹ رہی ہیں تو وہ بھاگ کر کمبل لے آیا اور سٹیبنگ پر ڈال دیا۔ اب مکھیوں نے اس لڑکے کو کاٹنا شروع کر دیا۔ سٹیبنگ نے فوراً کمبل اس لڑکے پر ڈال دیا۔ یہ واقعہ میرے سامنے کا ہے۔

سٹیبنگ کی بعض سزائیں بڑی عجیب ہوتی تھیں۔ کسی لڑکے نے کچن سے چینی چرا کر کھائی تھی اس کی دفتر میں پیشی ہوئی تو اس کے سامنے پلیٹ بھر کر چینی رکھ دی کہ اب کھاؤ۔ اسی طرح ایک لڑکے کو جو سگریٹ پینے سے باز نہیں آتا تھا۔ اپنے سامنے بٹھا کر مسلسل سگریٹ پینے کی سزا دی۔

ماتحتوں سے کام لینے میں کوئی رعایت نہیں کرتا تھا لیکن ان کے کام بھی بہت آتا تھا۔ غالباً ۱۹۴۵ء کی بات ہے میجر شمسی آر۔ ایم۔ او تھے کہ ایک بھنگی کی بیوی زچگی میں مر گئی۔ مسز سٹیبنگ نے اس کے بچے کو اپنے بنگلہ میں پالنا شروع کر دیا۔ اس کا سارا کام ماں کی طرح خود کرتی تھی۔ پریم میں اس کو سیر کرانے باہر بھی لے جاتی تھی۔ ڈاکٹر شمسی اس کو ہر شام دیکھتے تھے۔ اس نے اس کا نام دھرمپال رکھا تھا جب وہ بچہ چھ ماہ کا ہو گیا تو پورے بھنگی اسے اپنے گھر لے گئے۔ وہ رہتک حصار کے علاقے

کے تھے۔

جنگ کے زمانے میں کپڑے کی بڑی قلت ہو گئی تھی۔ سٹاف نے سٹیبنگ سے فریاد کی کہ کپڑے کی بڑی تکلیف ہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ تیسرے دن ڈپٹی کمشنر گجرات ایک گاڑی کپڑا لے کر آیا۔ بعد کو ہیڈ کلرک سے پتہ چلا کہ سٹیبنگ نے گورنر پنجاب گلینسی کو خود فون کیا تھا کہ میرے سٹاف کو کپڑے کی تکلیف ہے۔ گلینسی نے ڈپٹی کمشنر سے کہا کہ ملٹری کالج میں کپڑا پہنچاؤ۔

سٹیبنگ کو لڑکوں کا خیال سٹاف سے زیادہ تھا۔ ۱۹۴۵ء کی عید کا واقعہ ہے کہ کسی وجہ سے لڑکے عید کی چھٹی پر نہیں جا رہے تھے۔ جب سٹاف کے کچھ لوگوں نے چھٹی کی درخواست کی تو کہا میرے بچے چھٹی نہیں جا رہے ہیں تو آپ لوگوں کو کیسے جانے دوں۔ بعد کو جب لڑکوں کو چھٹی دے دی تو سٹاف کو بھی جانے دیا۔

لڑائی کے دنوں میں گرمیوں میں گورے انسٹرکٹر صرف شارٹس پہنتے تھے۔ خود سٹیبنگ کی یہ حالت تھی کہ پوری وردی بہت کم پہنتے تھے۔ جو پہنتے تھے اس میں بے شمار پیوند لگے ہوتے تھے تاکہ پیسہ اور کپڑا بچے۔ بچنے پر مجھے یاد آیا کہ لڑائی کے زمانے میں ایک روز شام کو سٹیبنگ نے سارے انسٹرکٹرز کو سٹاف روم میں بلایا اور بہت ناراض ہوا کہ آپ لوگوں کو ذرا خیال نہیں سٹیشنری ضائع ہو رہی ہے۔ لڑکے اتنا چوڑا چوڑا حاشیہ چھوڑ کر لکھتے ہیں۔ ایک کاپی بچانے سے ایک گولی خریدی جا سکتی ہے اور ایک گولی کا مطلب ہے ایک دشمن۔

۱۹۴۴ء میں جغرافیے کے ایم اے ایک استاد سعد اختر سٹاف پر آئے تھے۔ کٹر قادیانی تھے۔ آتے ہی قادیانیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ ایک آفیسر کیپٹن فیروز تھے۔ ان سے پوچھے بغیر ان کے انھوں نے قادیانی رسالہ الفضل لگوا دیا۔ انھوں نے سٹیبنگ سے شکایت کی۔ سٹیبنگ نے تحقیق کے بعد چوبیس گھنٹے کے اندر اندر انہیں کالج سے چلتا کیا۔

——— کرنل حضور احمد خان ایم سی[1]

۱۹۴۵ء میں جب مجھے ملٹری کراس ملا تو سٹیبنگ نے بھی مجھے مبارکباد کا خط لکھا اور تاکید کی

---

[1] ۴۰۲ کرنل (ریٹائرڈ)

کہ لڑائی کے زمانے میں جتنے رن بھی مجھے ملے ہیں ان سب کے ساتھ میں اپنا فوٹو کالج کے سنٹرل ہال کے لیے بھیجوں۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ میں اپنے ایم سی کے ایکشن کی تفصیلات بھی لکھوں تاکہ فوٹو کے نیچے مختصراً اس ایکشن کا ذکر آجائے۔ کالج میں انہوں نے اس سلسلے میں ایک تقریب بھی کی تھی ان کی دعوت کے باوجود میں اس تقریب میں شریک تو نہیں ہو سکا لیکن ان کی پذیرائی پر مجھے فخر بہت ہوا۔ سنٹرل ہال میں آویزاں میرے فوٹو کا تذکرہ Leaders of Tomorrow کالج کی فلم میں بھی ہے۔ اس فلم کا نام ہی ظاہر کرتا ہے کہ ۱۹۴۰ء کے بعد کے زمانے میں کالج کا مشن کیا ہو گیا تھا۔

سٹیبنگ سے میری آخری ملاقات ۱۹۶۴ء کے اوائل میں ہوئی۔ میں لندن میں جوائنٹ سروسز سٹاف کالج کر رہا تھا۔ کورس ختم کر کے پاکستان واپس آنے سے پہلے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا وہ لندن سے اڑھائی تین سو میل کے فاصلے پر یو۔کے کے جنوب مغربی ساحل پر ٹورکی کے مقام پر رہتے تھے۔ چھوٹا سا دومنزلہ گھر تھا لیکن رہتے نیچے تھے۔ سٹیبنگ کو ہلکا سا فالج ہوا تھا۔ بغیر سہارے کے چل نہیں سکتے تھے۔ مسز سٹیبنگ ٹھیک ٹھاک تھیں۔ بلکہ اپنی عمر کے لحاظ سے ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ وہی ان کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ سٹیبنگ نے ٹورکی میں میرے ٹھہرنے کا انتظام وہاں کے سب سے پاش ہوٹل میں کیا تھا۔ جب ہوٹل میں میں اپنا سامان رکھ کر کچھ کھا پی کر سہ پہر کو ان کے گھر گیا تو دونوں میاں بیوی بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ پہلے تو انہوں نے مجھے ہوٹل میں ٹھہرانے پر معذرت کی اور کہا کہ میرا خیال تھا کہ وہاں تم زیادہ آرام سے رہو گے۔ اس موقع پر میں نے انہیں کالج کے بارے میں سیلبی سے زیادہ جذباتی پایا۔ پرانی باتیں، اور اولڈ بوائز اور ان کے کارناموں کو یاد کر کے ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے (خدا کسی جسمانی طور پر مضبوط اور مزاجی طور پر سخت آدمی کو معذوری سے دوچار نہ کرے) دوسرے یہ کہ وہ بھی سیلبی کی طرح تنہا تھے۔ سیلبی کے تو اپنی اولاد نہیں تھی۔ ان کا ایک بیٹا تھا مائیکل لیکن وہ ایک یوگوسلاوی لڑکی سے شادی کر کے غالباً لندن میں رہتا تھا اور ان کے پاس آتا جاتا نہ تھا اور نہ خط لکھتا تھا۔ مسز سٹیبنگ کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مائیکل کی لاتعلقی کا ذمہ دار اس کی یوگوسلاوی بیوی کو سمجھتی تھیں۔ (ہر ماں اپنے بیٹے کی غلطیوں کو اپنی بہو کے کھاتے میں ڈالتی ہے۔ مامتا کی مجبوریاں!) میرے ٹورکی سے واپس آنے کے کچھ دنوں بعد ہی مسز سٹیبنگ کا سیڑھیوں سے گر کر انتقال ہو گیا۔ پھر سٹیبنگ بھی زیادہ نہ جیئے۔

اس آخری وزٹ میں تین دن وہاں رہا۔ دوسرے دن مسز سٹیبنگ نے مجھ سے کہا:
"ہیری کو ساحل کی سیر کروا لائیں" چنانچہ میں ان کو ساحل کی طرف ڈرائیو کے لیے لے گیا۔ سٹیبنگ اپنے اولڈ بوائز کے تذکرے میں اتنے محو رہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے مائیکل کا تذکرہ ضمناً بھی نہیں کیا۔ (اکثر استادوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے) یوں کمانڈانٹ نووہ کے۔جی۔آر جالندھر کے بھی رہے تھے لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ جہلم ان کے گوشہ دل سے زیادہ قریب ہے۔ ان کی باتوں سے میں نے نتیجہ نکالا کہ جہلم کے اولڈ بوائز اکثر ان سے ملنے آتے رہتے تھے۔

سٹیبنگ نے مجھے لڑکوں کے فائل اور ان کے خطوط دکھائے۔ حیرت ہوئی کہ وہ اتنے بہت سے اولڈ بوائز سے کس طرح مسلسل رابطہ قائم رکھے ہوئے تھے۔ دوسری بات میں نے یہ نوٹ کی، وہ کالج میں اپنے کنٹری بیوشن سے زیادہ اپنے پیش روؤں، دونوں کلارک، خاص طور پر کرنل سیلی کی خدمات کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کرتے رہے بار بار کہتے تھے کہ سیلی ملٹری کالج کے سب سے بڑے محسن ہیں۔
یہ ان کی عالی ظرفی تھی کہ وہ دوسروں کے کام کو اپنے آگے زیادہ اہمیت دے رہے تھے۔ ورنہ حقیقت ہے کہ سٹیبنگ کا کنٹری بیوشن بھی کم نہیں ہے بلکہ کئی اعتبار سے زیادہ ہے۔

—— صوبیدار سردار بیگ[1]

یہ اواخر ۱۹۳۷ء کی بات ہے۔ سٹیبنگ کو سکول میں زیادہ سے زیادہ چھ سات ماہ ہوئے تھے۔ وہ حسب عادت لائٹس آؤٹ کے بعد ایک ہاؤس رابرٹس ہاؤس کا چکر لگا رہے تھے کہ انہیں نمبر ون سیکشن (ڈارمیٹری) سے گانے کی آواز آئی۔ جاڑوں کی رات اندھیرا گھپ اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ فیروز کو کیا سوجھی کہ ماہیا گانے لگا۔ میں نے منع بھی کیا لیکن فیروز ایسے موڈ میں تھا کہ اس نے سنی ان سنی کر دی کہ ماہیئے کی تانیں اڑانے لگا۔ ٹھیک اس وقت برآمدہ میں چلنے کی آواز آئی۔ آواز آتے ہی فیروز کی آواز جیسے گلے میں پھنس کے رہ گئی لیکن جیسا کہ ہمارا خیال تھا کہ سٹیبنگ کے کانوں میں ماہیئے کی آواز پہنچ چکی تھی۔ وہ سیدھے ہماری سیکشن کی طرف آئے دروازہ تو کھلا ہوا تھا آتے ہی انہوں نے لائٹ آن کی اور پوچھا کون گا رہا تھا۔ اب کون بتائے۔ فیروز نے تو جلدی جلدی خراٹے بھی لینے

[1] صوبیدار (ریٹائرڈ)

شروع کر دیئے ۔لیکن یہ ڈرامہ فیروز کے کام نہ آیا۔ انہوں نے فیروز کا نام لے کر پکارا۔کم آن یُو فیروز پھر دوسرے دن فیروز پر جو بیتی سو بیتی۔

ـــــــکیپٹن محمد فیروز ملک[1]

سٹیبنگ ان لڑکوں کی بھی جو بے سہارا ہوں بہت مدد کیا کرتے تھے ۔ایک سینئر پریفکٹ کے والد کا جب انتقال ہو گیا تو اس کی انہوں نے خصوصی سرپرستی کی۔ اس کو ۱۹۴۱ء میں سری نگر لے گئے۔ آخر کار اسے کمیشن دلا کر چین سے بیٹھے۔ وہ لیفٹیننٹ کرنل ہو کر ریٹائر ہوا۔ میں وارنٹ آفیسر لیوس صاحب کے سلسلہ میں لکھ چکا ہوں کہ کس طرح لیوس اور مسز لیوس نے ۱۹۴۰ء کی گرمیوں میں مجھے مری میں اپنی کاٹیج میں رکھ کر پڑھایا تھا۔ یہ بھی سٹیبنگ کے ایما پر ممکن ہوا تھا۔ اس کا کریڈٹ بھی انہی کو جاتا ہے۔

ـــــــبریگیڈئر محمد صادق خان[2]

سٹیبنگ کی پہلی جنگ عظیم میں دائیں ٹانگ زخمی ہو گئی تھی۔ بظاہر چلنے میں نظر نہیں آتا تھا لیکن تکلیف تھی۔ وردی کے بغیر نکلتے تو اکثر ہاتھ میں ایک چھڑی لے کر نکلتے تھے۔ (جیسی کرکٹ کے ایمپائروں کے پاس ہوتی ہے) دیر تک کھڑا ہونا ہوتا تو اسے کھول کر اس کے سہارے سے کھڑے ہوتے۔ دوپہر کے بعد مفتی میں سائیکل پر گھومتے رہتے رات کو اکثر شلوار قمیض میں نکلتے تھے۔

سٹیبنگ کی شخصیت بہت متحرک (Dynamic) تھی۔ اور رفتار (Tempo) بہت تیز علاوہ ازیں ان میں جیتنے کی امنگ (Will to win) بھی بہت زیادہ تھی۔ جتنے سال وہ جالندھر سکول کے کمانڈانٹ رہے جالندھر سکول انٹر سکول ٹورنامنٹ میں جہلم اور اجمیر سے جیتتا رہا۔ ۱۹۳۷ء میں جب وہ یہاں آئے تو آتے ہی وہ جہلم کو ٹاپ پر لے آئے۔ انکے ٹاپ پر لانے کا طریقہ بہت سائینٹفک تھا۔ بے انتہا ذاتی توجہ، بے انتہا ٹریننگ اور سپیشل ڈائیٹ

---

[1] کیپٹن ریٹائرڈ

[2] بریگیڈیئر ریٹائرڈ، اسلام آباد

سٹیبنگ کا بیشتر زمانہ دوسری جنگ عظیم کا تھا۔ اس بیک گراؤنڈ میں انھوں نے لڑکوں کی تربیت کی اور آرمی لیڈر شپ کے لیے تیار کیا۔

سٹیبنگ کا طریق کار یہ تھا کہ وہ لڑکوں کو ہر جگہ بہت غور سے دیکھتے رہتے۔ پھر جو انہیں ہونہار نظر آتے وہ خاص طور پر آگے بڑھانے کے لیے چن لیتے۔ اس چناؤ کا کوئی اعلان نہیں ہوتا تھا لیکن جلد جے پی بنایا جاتا۔ اس کا اشارہ ہوتا کہ اس لڑکے پر کمانڈانٹ کی توجہ ہے۔ پھر اس کی سختی آئی رہتی۔ سٹیبنگ جن لڑکوں کو براہِ راست کمیشن کے لیے کچز کالج بھیجنا چاہتے ان کے دن سکول میں بڑے کڑے گزرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک روشن مستقبل ان کا انتظار کر رہا ہوتا۔

اب میں اپنے تجربے سے دو ایک واقعات لکھتا ہوں۔ میں سینئر پریفکٹ تھا۔ بچپن سے جوانی کی طرف قدم رکھ رہا تھا۔ ذرا فیشن کرنے کا شوق ہوا اور ایک دو ہفتے بال نہیں کٹوائے۔ سٹیبنگ کی عقابی نظروں سے بچنا محال تھا۔ (یوں بھی وہ جن تھے۔ ہر وقت ہر جگہ ہونے کی ان کی شہرت تھی) چنانچہ پکڑا گیا اور شام کو بنگلے پر بلانے کا پروانہ مل گیا جس کا مطلب کم از کم پانچ کین تھے جو ملے۔ کیننگ کے بعد میں باہر نکلا تو برآمدہ میں حجام کو کھڑا پایا۔ کمانڈانٹ نے اسے اشارہ کیا اور اس نے میرے بال کاٹنے شروع کیے۔ چونکہ کمانڈانٹ سامنے کھڑے تھے اس لیے باربر نے وقت بھی خاصا لگایا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اپنے فن کا پورا مظاہرہ کیا۔ کمانڈانٹ اس تمام وقت وہیں کھڑے رہے۔ جب بال کٹ چکے تو ان کے اردلی نے مجھے ٹرے میں ایک چائے کی پیالی پیش کی۔ پھر مجھے حکم ہوا بھاگ کر جاؤ اور نہا دھو کر نئی وردی پہن کر آؤ۔ حکم کی تعمیل کے بعد میں حاضر ہوا تو مسز سٹیبنگ کے ساتھ میری کئی تصویریں لیں۔ بعد کو ایک کاپی مجھے بھی دی۔ یہ تصویر بھی آج تک میرے پاس ہے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ سٹیبنگ کی نظر ہمارے مستقبل پر رہتی تھی۔ نومبر ۱۹۴۰ء میں سٹیبنگ نے مجھے دفتر میں بلایا اور کہا "صادق! میں تمہارا نام کچز کالج کے لیے بھیج رہا ہوں"۔ یہ سن کر میں چپ رہا۔ وجہ یہ تھی کہ میں سینئر پریفکٹ تھا اور اگلے سال میرے ہیڈ بوائے بننے کا نمبر تھا جو بہت بڑا اعزاز تھا۔ وہ کچھ لکھتے رہے میں سیلوٹ کر کے وہیں کھڑا تھا "کیوں کیا بات ہے؟" انھوں نے پوچھا تو میں نے وضاحت کی کہ سر میں ابھی اپنے آپ کو کچز کالج کے لیے فٹ نہیں سمجھتا۔ اگر ایک

سال اور مجھے سکول میں رہنے کا موقع دیا جائے تو میں سمجھتا ہوں یہ میرے حق میں بہتر ہوگا۔
یہ سن کر انھوں نے قلم پن ٹرے میں رکھا۔ کرسی کو پیچھے کیا اور کہا "تمہارے حق میں کیا بہتر ہے صادق! میرا خیال ہے کہ میں بہتر سمجھتا ہوں"۔ ایک لمحہ ٹھہرنے کے بعد کہا "دس بارہ برس کے بعد تمہیں خود احساس ہو جائے گا کہ تمہارے کمانڈانٹ کا فیصلہ ٹھیک تھا"۔

میں بادل ناخواستہ کیمبرج کالج گیا لیکن دس برس کے بعد ۱۹۵۰ء میں واقعی میں نے محسوس کیا کہ اس کا فیصلہ صحیح تھا۔

——— میجر جنرل محمد بشیر خان

سٹیبنگ نے جزئیات میں جانے (Meticulousness) اور انتہائی درجے کی درستی (Precision) کے تصور کو سکول کی تربیت کا بنیادی اصول بنایا۔ اس اصول اور رویے کا اطلاق صبح سے لے کر شام تک ہر کام پر ہوتا تھا اور خود سٹیبنگ اس پر کاربند تھے کہ صبح صبح منہ اندھیرے ریوالی پر جھنڈا چڑھانا ہوتا تھا۔ اس کا ایک طریق کار مقرر تھا۔ اس کی پوری تفصیلات کی پابندی کی نگرانی وہ خود کرتے تھے۔ ٹھٹھری ہوئی سردی میں ہفتہ میں ایک دو بارہ ضرور اس پریڈ کو چیک کرتے تھے جس میں ڈیوٹی پریفیکٹس کے ٹرن آؤٹ کا انسپکشن بھی شامل تھا۔ لڑکوں کی وردی کی فٹنگ اپنے سامنے کرانے اور کٹ کنڈیشننگ کی پریڈ پر خود موجود ہوتے۔
سٹیبنگ زیادہ سے زیادہ ذمہ داری لڑکوں کو دو اس کی انتہائی باریک بینی سے جانچ پڑتال کروا اور پھر ہر فروگذاشت پر سخت ترین سزا دو کے اصول پر کام کر رہے تھے۔ سٹیبنگ ہی نے کیڈٹ میس میں راشن کا تفصیلی حساب رکھنے کا نظام رائج کیا۔ راشن رجسٹر کو اپ ٹو ڈیٹ بلکہ اپ ٹو منٹ رکھنا اور تمام اندراجات کو صحیح طور پر پُر کر کے رکھنا بڑا مشکل کام تھا جو ہاؤس کے سی کیو ایم کو کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت تو ہم اسے فضول کارروائی بھی سمجھتے تھے (بعض کا تو خیال تھا کہ یہ سلسلہ کیڈٹس کو محض اذیت دینے کے لیے ایجاد کیا گیا ہے۔ آخر اس سے پہلے میس کا انتظام چل ہی رہا تھا) لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ تکلیف دہ ایکسر سائز اور اس کے ساتھ کی کچن ڈیوٹی

جس میں صبح سے شام تک کچن کو سپروائز کرنا پڑتا تھا اور اگر دودھ بھی پھٹ جائے تو اس جرم کی سزا کہ برتنوں کی صفائی کی نگرانی ٹھیک طور پر نہیں کی گئی ڈیوٹی پریفکٹ کو ملتی تھی۔ ذمہ داری کے اسی اصول کے اطلاق کے طور پر جونیئر پریفیکٹس کو اپنی سیکشن کی خامیوں کی سزا بھگتنی پڑتی خود سٹیبنگ لڑکوں کو کس حد تک جانتے تھے اس کی ایک مثال دیتا ہوں سٹیبنگ پریفکٹس کے ٹرن آؤٹ کی انسپکشن ہر روز کرتے اور سیکشن کی بغیر نوٹس کے ایک بار پریفکٹس کی انسپکشن پر جانے سے پہلے میں نے اپنے کزن ۶۸۴ غنی کی بیلٹ مانگ لی۔ سٹیبنگ نے فوراً نوٹ کیا کہ میری بیلٹ خلاف معمول چمک رہی ہے انہوں نے اپنے بیٹن سے بیلٹ کو ٹھوکا دیا اور پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ مجھے بتانا پڑا کہ یہ بیلٹ غنی کی ہے۔ پھر دونوں کے چھ چھ بید لگے۔ آج کے دور میں یہ بات شاید عجیب لگے لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ کس گہرائی میں جاکر اور کتنے Involve ہوکر تربیت کر رہے تھے۔

۱۹۵۰ء میں، میں ٹور کی یو کے میں کرنل سٹیبنگ اور مسز سٹیبنگ سے ملا تھا۔ دونوں میاں بیوی مجھے دیکھ کر پھولے نہیں سماتے تھے۔ دیر تک جہلم کی باتیں کرتے رہے ان کے بہت سے شاگرد فوج میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر سے ان کی خط وکتابت تھی۔ کمانڈانٹ تو وہ جالندھر سکول کے بھی رہے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل کے قریب جہلم ہی ہے۔ مسز سٹیبنگ نے کہا۔ بشیر مائی سن! کھانے پر میں تمہیں سرپرائز دوں گی۔ میں سمجھا شاید کوئی نئی ڈش کھلائیں گی۔ لیکن واقعی انہوں نے سرپرائز دیا اور بہت بڑا سرپرائز کہ کھانے پر مسالے دار چکن کری موجود تھی۔ پبلک سکول سسٹم اس لحاظ سے بہت مشکل سسٹم ہے کہ جب تک بڑے Calibre اور کیریکٹر کے غیر معمولی طور پر Dedicated اساتذہ کے ساتھ ان کی بیگمات بھی برابر کی Involve نہ ہوں تو بات نہیں بنتی۔

ـــــ لیفٹیننٹ کرنل اورنگزیب خان[1]

۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے دو لڑکے آپس میں جھگڑ پڑے تھے۔ مارپٹائی کا کیس تھا اور کمانڈانٹ کے پاس گیا تو انہوں نے آفس کے سامنے سفیدے کے پیڑوں کے جھنڈ میں جو باکسنگ رنگ نیا نیا بنا تھا وہاں

---

[1] لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ)

سارے سکول کو جمع کیا۔ باکسنگ کے دستانوں کے دو جوڑے منگوائے اور ان دو لڑکوں کو رنگ میں کھڑا کر کے کہا۔ یہ دستانے پہنو اور باکس آن۔ دونوں برابر کے تھے۔ تھوڑی دیر خوب دھاں دھاں ہوئی پھر سٹاپ کی آواز آئی۔ آخر میں شیک ہینڈز کا حکم ہوا۔

ایک لڑکا تھا ۶۰۸ اعظم علی، وہ کسی طور پر سموکنگ نہیں چھوڑتا تھا۔ اس کو سٹیبنگ نے ایک سگار دیا اور حکم دیا۔ اتنے عرصے میں اس کو پی کر ختم کرو۔ ایک ایس پی اس پر نگران مقرر ہوا۔ وہ اعظم علی بھی بڑا شیر تھا۔ وہ مقررہ وقت میں سگار کو ختم کر گیا۔

۱۹۴۳ء کے اواخر میں، میں اور رشید ۵۲، کیڈٹ کالج سے چھٹی آئے تو سٹاف سے ملنے کے لیے کالج بھی گئے۔ آخر میں کرنل سٹیبنگ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ وہ کیڈٹ کالج میں جہلم بوائز کی امتیازی کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ انہیں حسب توقع معلوم تھا کہ ۱۲۰۱ اسلم میرا چھوٹا بھائی ہے۔ مجھ سے گلہ کیا۔ اورنگ زیب تمہارا بھائی تمہاری طرح محنت نہیں کر رہا۔ پھر یکایک پوچھا۔ یہاں کالج میں تمہاری کتنی بار کیننگ ہوئی تھی۔ میں نے کہا سر، اتفاق سے میں اس نعمت سے محروم رہا۔" واقعی" انہیں بڑا تعجب ہوا، پھر پوچھا" ای ڈی کا سکور کتنا رہا ؟" "یہی کوئی پانچ سات بار" کیننگ بالکل نہیں اور پانچ سات ای ڈیز، اورنگ زیب پھر تمہیں کالج کیا یاد آئے گا۔ وہ اپنی گھنی مونچھوں کے پیچھے تھوڑا سا مسکرائے۔ میں نے بڑے ادب سے عرض کیا۔ "سر کچھ بھی سہی، کالج یاد بہت آتا ہے۔" ابھی کہاں یاد آتا ہے ابھی تو تمہیں یہاں سے گئے ہوئے دو تین سال ہی ہوئے ہیں جتنا عرصہ زیادہ گزرے گا کالج اتنا ہی زیادہ یاد آئے گا۔"

—— لیفٹیننٹ کرنل خداداد خان[1]

کرنل سٹیبنگ کی کمانڈ بہت ہی موثر تھی اور ان کی گرفت سخت تر، چھوٹا یا بڑا لڑکا یا کوئی اور کارپرداز تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کوئی غلط کام کرے گا اور اس کی گرفت نہیں ہو گی۔ ان کا طریق کار یہ تھا کہ وہ پی ٹی، پریڈ، کلاسز، کھیل، پریپ ہر وقت ہر جگہ خود موجود ہوتے تھے حتیٰ کہ رات کو سوتے میں بھی ہاؤسوں کا چکر لگاتے تھے۔ کوئی لڑکا کوئی چیز ان کی نظروں سے بچی نہیں رہتی تھی۔ سال دو سال ہر جگہ موجود ہونے اور ہر چیز کو چیک کرنے سے ایسی امیج بن گئی تھی اور رعب و دبدبے

[1] کالج نمبر ۵۹۴

کی ایک ایسی نفسیاتی فضا قائم ہو گئی تھی کہ ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ وہ سٹیبنگ کی نظر میں
ہے ایک بار ایک گپ یہ بھی چلی تھی کہ کہیں سٹیبنگ خود اور کہیں ان کا گھوسٹ ہوتا ہے۔
اس سلسلے میں آئے دن نت نئی اور حیرت انگیز خبریں سننے میں آتی رہتی تھیں۔ ایک واقعہ چونکہ
میرے سامنے کا ہے وہ بیان کرتا ہوں۔ جاڑوں کے دن تھے۔ رات کے بریپ سے بیشتر لڑکے
اپنے اپنے ہاؤسوں کو واپس چلے جا چکے تھے۔ کسی وجہ سے میں پیچھے رہ گیا تھا اور مجھ سے کچھ فاصلے
پر دو لڑکے اور تھے۔ جب وہ سکین ہاؤس کو جاتے ہوئے کمانڈانٹ کے دفتر کے سامنے سے گزرے
تو ان میں ایک نے ایک ہاتھ گریٹ کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ دوسرے نے ٹوکا یار کیا کر رہا ہے۔
سٹیبنگ دیکھ لے گا۔ دوسرے نے ترنگ میں آ کر کہا۔ جانے دو بہت دیکھے ہیں دیکھنے والے اور دوسرا
ہاتھ بھی جیب میں ڈال لیا۔ ابھی اس غریب نے اپنا جملہ بھی ختم نہیں کیا تھا کہ نارنگی کی جھاڑیوں میں
سے سٹیبنگ کی آواز گونجی۔ ہولڈ آن یو بوائز اور مزے کی بات یہ کہ اس نے اس لڑکے کا نام لے کر
اسے پکارا۔ اس کے تو ہوش اڑ گئے۔ یہ واقعہ بھی بہت مشہور ہوا اور لڑکوں کو ہر دیوار، ہر پیڑ، ہر ستون کے
پیچھے سٹیبنگ کا گھوسٹ نظر آنے لگا۔ گھوسٹ دوسٹ تھا یہ اس کے ڈیڈیکیشن کے کرشمے تھے۔
پبلک سکول ایسے جنونیوں سے ہی چلتے ہیں۔

صبح کی پی ٹی منہ اندھیرے ہی ہوتی تھی۔ لڑکے شدید سردیوں میں بھی صرف شارٹس میں بنیان
کے بغیر اور ننگے پاؤں پی ٹی گراؤنڈ میں ڈرل کرتے جاتے اور پی ٹی کرتے جاتے ہاتھ پیر سن ہو جاتے تھے۔ ہمارے پریڈ گراؤنڈ
پہنچنے سے پہلے خود سٹیبنگ بغیر بنیان صرف شارٹس اور شوز میں موجود ہوتے۔ کوئی جگہ سٹیبنگ کی
پہنچ سے باہر نہیں تھی۔ رمضان میں صبح چار بجے اس سے پہلے کہ لڑکے سحری کے لیے اٹھیں وہ کک
ہاؤسز میں ککوں کی چیکنگ کے لیے موجود ہوتے۔ باورچیوں اور برتنوں کی صفائی کا معیار امکانی حد
تک بلند تھا۔ اتنا کہ اس پر اضافہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے فوج میں ۳۲ برس نوکری کی ہے میس
کی صفائی کا یہ معیار میں نے کسی یونٹ یا کسی فوجی ادارے بشمول آئی ایم اے، پی ایم اے، او ٹی ایس
نہیں دیکھا۔ میس کی صفائی کا انہیں جنون سا تھا۔ ڈیوٹی کیڈٹ کو سخت سزا ملتی اگر اس ضمن میں اس
سے کوئی کوتاہی ہوتی۔

سٹیبنگ خود مغرب کی نماز چیک کرتے لیکن جمعے کی نماز پر سب لڑکوں کے ٹرن آؤٹ کی

چیکنگ بڑے تواتر سے اور اہتمام سے کرتے تھے۔

رات کو سٹیبنگ شلوار، پنجابی ٹائپ کلاہ پگڑی میں چیکنگ کے لیے نکلتے تھے۔ ہر ہاؤس کے بیرونی گیٹ کی ایک چابی ان کے پاس ہوتی اور ٹارچ ہاتھ میں۔ رات کو سیکشن کا درمیانی دروازہ کھلا ہوتا۔ مچھر دانی کہیں سے پھٹی ہوئی ہو یا کہیں سے کھلی ہوئی ہو یا چارپائیوں میں کسی لڑکے کا منہ کمبل میں ڈھکا ہوا ہو ان سب باتوں کو وہ نوٹ کرتے۔ اور لطف کی بات یہ کہ صبح کو غریب سیکشن کمانڈر کی پیشی ہو جاتی جبکہ خود اسے لائٹس آؤٹ کے بعد سیکشن میں گھوم پھر کر چیک کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

ـــــ لیفٹیننٹ کرنل شاہ محمدؒ[1]

سٹیبنگ (Perfectionist) کمال پسند تھے۔ نئے لڑکوں کے کپڑے اور ان کی چپلیں اپنے سامنے فٹ کرواتے تھے۔ نئے لڑکوں کو چپلیں پہنوا کر اور چلوا کر دیکھتے تھے۔ اسی طرح جب ۱۹۳۸ء میں رومال کی جگہ نیلے رنگ کی سائڈ کیپ نے لی تو اس بندہ خدا نے سائڈ کیپ کی فٹنگ بھی اپنے سامنے کروائی۔ وہ کوارٹر ماسٹر سٹور کے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ جاتے کوارٹر ماسٹر صوبیدار مغنی صاحب ٹوپی ایک ایک لڑکے کو دیتے۔ لڑکا ٹوپی پہن کر سٹیبنگ کے سامنے جاتا۔ وہ دائیں مڑو، بائیں مڑو، پیچھے مڑو کہہ کر ہر طرف سے ٹوپی کو دیکھتے۔ تب کہیں جا کر ٹوپی پاس ہوتی۔

ـــــ کیپٹن عبدالرحمانؒ[2]

برڈووڈ ہاؤس کی نمبر دو سیکشن میں ایک میں، ۶۸۸ اور دوسرا ۶۲۲ عبدالکریم دو جونیئر پریفکٹ تھے۔ رات کو سٹیبنگ آئے۔ پانچ چھ لڑکے کمبل میں منہ ڈھانک کے سو رہے تھے۔ وہ چیک کر کے چلے گئے۔ صبح کو کریم کے چھ بید لگے۔

ہر روز کچن ڈیوٹی پر دو لڑکے ہوتے تھے۔ ایک روز سکین ہاؤس میں ۴۲۷ بشیر رہا کی کالفٹ ان کھلاڑی) ایک طرف ڈیوٹی پر تھا اور دوسری طرف ۵۹۲ صادق تھا۔ دوپہر کے قریب سٹیبنگ نے چیک کیا۔ بشیر کو غائب پایا۔ جب بشیر واپس آیا تو باز پرس کی تو اس نے پیشاب... کرنے جانے

---

[1] لیفٹیننٹ کرنل امتیازی سند

[2] کیپٹن ریٹائرڈ

کا عذر پیش کیا۔ انھوں نے یہ عذر قبول نہ کیا اور دفتر میں بلالیا۔ دفتر میں اس کی متوقع تواضع ہوئی جب صادق کو خبر ہوئی تو وہ بھاگ کر سکیبن ہاؤس کے سامنے پہنچا تاکہ بشیر سے حق دوستی نبھائے۔ پوچھنے لگا کہیں زیادہ تکلیف تو نہیں؟ بشیر ابھی نغمہ درد سنا ہی رہا تھا کہ سٹیبنگ نے صادق کو دیکھ لیا وہ بھاگ کر اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔ پیچھے سے چونی لال سوئیپر پہنچا کہ صاحب بلاتا ہے پھر صادق کے بھی چھے بید لگے کہ تم نے بھی اپنی پوسٹ کیوں چھوڑی۔ کرنل سٹیبنگ کو صفائی کا اور حفظان صحت کے اصولوں کا جنون تھا۔ رات کو سونے سے پہلے باتھ روم کی پیتل کی ٹونٹیوں کی براسو سے صفائی بھی ڈیوٹی میں شامل تھی۔ پیتل کے سوئچ کی صفائی بھی ہوتی تھی۔ انگیٹھی جلتی تھی لیکن پاس کھڑے نہ ہو سکتے تھے۔ دروازوں کھڑکیوں کا ایک پٹ کھلا ایک بند ہوتا تھا۔

صوبیدار بقا محمد نویں درجے کو جغرافیہ پڑھا رہے تھے۔ پڑھاتے پڑھاتے ایک سوال پوچھ لیا۔ بڑے بڑے صوبوں کے نام بتاؤ۔ ۲۴۸ حیات نے ہاتھ اٹھا دیا۔ انھوں نے کہا بتاؤ۔ اب حیات شروع ہوا کبھی تھوں، ہے، پیچھے کھڑکی کے پاس کھڑے سٹیبنگ سن رہے تھے۔ بقا صاحب نے بائیں ہاتھ سے لاکھ اشارہ کیا کہ باز آجا لیکن وہ شیر نہ سمجھا۔ تنگ آکر کسی اور کو بتانے کا اشارہ کیا۔ سٹیبنگ نے بعد میں بقا صاحب سے پوچھا کہ کیا قصہ تھا۔ انھوں نے اصل بات بتادی۔ سر حیات شرارت کر رہا تھا۔ اور بات آئی گئی ہوئی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ سٹیبنگ شرارت اور آفینس میں فرق کرتے تھے۔

مسٹر عبد الغنی انجینئر

سٹیبنگ کا ایک بہت واضح اصول تربیت اور اصول تنظیم یہ تھا کہ صاحب اقتدار طلبا یعنی پریفیکٹس کی باز پرس سب سے زیادہ کرتے تھے۔ حد یہ کہ جونیئرز کی غلطیوں کی سزا بھی انہی کو دی جاتی۔ سینئر پریفیکٹس کا ڈریس انسپکشن وہ ریوالی کے وقت فلیگ سٹاف کے سامنے خود کرتے تھے اور جونیئر پریفیکٹس کا ڈریس انسپکشن ہر دن لنچ کے انٹرول کے دوران لنچ کے بعد ہوتا تھا (جس کی تیاری میں غریب جونیئر پریفیکٹس کا لنچ کا وقفہ صرف ہو جاتا) اسی انسپکشن پر یکایک اعلان ہو جاتا کہ آج فلاں پلاٹون کے فلاں سیکشن کا انسپکشن ہو گا۔ اس انسپکشن کے انٹر پلاٹون مقابلے میں باقاعدہ نمبر ملتے تھے یا پھر متعلقہ پریفیکٹ کو سزا ملتی تھی۔

وہ سارا نظام ہی فوری اور یقینی سزا یا جزا کے اصول پر چل رہا تھا۔ یہ اصول یا یہ طریق کار صحیح تھا یا غلط۔ میں اس پر بحث نہیں کر رہا ہوں۔ میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ وہ سسٹم تھا کیا اور کس طرح اور کتنی Consistency کے ساتھ اور کتنی غیر جانبداری کے ساتھ (Operate) آپریٹ ہوتا تھا۔ ذمہ داری (Responsibility) پر زور سب سے زیادہ تھا۔ بہر حال اب اصل واقعہ پر آتا ہوں۔ میرے کزن ۵۶۶ محمد بشیر خاں جب جونیئر پریفکٹ مقرر ہوئے تو وہ بھی اس انسپکشن کی زد میں آ گئے۔ سٹیبنگ تو انسپکشن پر ایک ایک چیز کو دیکھتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے بشیر خاں کی بیلٹ کو ایک آدھ بار چیک کیا ہوگا۔ تبھی تو ایک روز انہوں نے میری بیلٹ مجھ سے مانگی اور انسپکشن پر حاضر ہو گئے۔ سٹیبنگ کی نظر تو عقابی تھی۔ وہ ان کا معائنہ کرنے لگے تو بیلٹ کو چمکتا دیکھ کر رک گئے۔ تمہاری بیلٹ آج غیر معمولی طور پر کیوں چمک رہی ہے۔ ذرا اتار کے دکھاؤ۔ بیلٹ پر تو میرا نمبر تھا۔ اور بشیر خاں ان رکٹ کا ایک آیٹم لون لینے اور اپنی بیلٹ کو صاف نہ رکھنے کی پاداش میں دھر لیے گئے۔ اور کمانڈانٹ کے دفتر میں ان کی چھ کینوں سے تواضع ہوئی۔ اور مجھے سوغات کے طور پر جمعدار منگا خان کے ہاتھوں چھ دن کی ای۔ڈی ملی۔ منگا خان اپنی جگہ کام کرنے اور کرانے کے معاملے میں جن تھے اور ڈرل اور ایکسٹرا ڈرل کے بارے میں قطعاً جلاد۔ چھ دن کی ای، ڈی نے میرا جو حشر کیا ہوگا اسکی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں۔

بریگیڈیئر عطا محمد خان[1]

سٹیبنگ کو رسمی ڈرل کرانے پر جو خاصی پیچیدہ ہوتی ہے بڑا عبور حاصل تھا۔ کمانڈانٹ کی پریڈ پر وہ سکول کو خود ڈرل کراتے تھے۔

اکتوبر ۱۹۴۱ء میں وائسرائے لارڈ لنلتھگو کی آمد پر سکول کو مارچ پاسٹ کرنی تھی۔ اس ڈرل کی مشق جمعدار ایجوٹینٹ منگا خان کے علاوہ کمانڈانٹ خود بھی کراتے تھے۔ سٹیبنگ کو ہر چیز میں انتہا کو چھونے کا جنون تھا۔ رمضان میں اس ڈرل پر اتنی محنت کی گئی جس کا اب تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وائسرائے نے پریڈ کی سلامی لے کر کہا تھا میں نے

---

[1] کالج نمبر ۶۸۸، ستارۂ امتیاز (ملٹری)

پریڈ بہت دیکھی ہیں لیکن ایسی پریڈ کبھی نہیں دیکھی۔

اس کے باوجود کہ کمانڈانٹ کی ایک ٹانگ جنگ عظیم اوّل میں زخمی ہونے کے باعث کمزور تھی پھر بھی انہیں چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر دیکھا۔ گو کسی کلاس میں کوئی مستقل پیریڈ نہیں لیتے تھے لیکن پریپ میں سپیشل کلاس میں اکثر آتے اور ڈسکشن کو آگے بڑھاتے۔ سٹیبنگ کو صلاحیتیں چننے اور پھر انہیں ابھارنے کا بڑا ملکہ تھا۔ پہلے انٹرویو سے وہ ابھر سکنے والے لڑکے پر نظر رکھتے تھے۔

سٹیبنگ نے سوئمنگ پول بھی بنوایا (وہ خود انگلش چینل کے تیراک رہ چکے تھے) سینئر پریفیکٹس کو جاڑوں میں پول میں ڈپ لینا یاد ہوگا۔ اس ڈپ کو اور سرینگر میں لڑکوں کے کیمپ اور لڑکوں کو بنگلے پر مہمان رکھنے کو ایک ہی تربیتی سلسلے کی کڑیاں سمجھنا چاہیے۔

ڈسپلن اور ٹریننگ میں سخت ہونے کے علاوہ بھی وہ بہت کچھ تھے۔ جن لڑکوں کے والد سرکار برطانیہ کے لیے کام آئے تھے وہ ان کی دیکھ بھال ایک سخت گیر گارجین کی طرح کرتے تھے ۸۳۵ ہیڈ بوائے حق نواز کیانی (لیفٹیننٹ کرنل شہید ستارہ جرأت دوبار) پر ساری سختیاں اور کرم نوازیاں اسی سلسلہ میں تھیں۔ انگلستان میں پبلک سکولوں کو برٹش ایمپائر کے ستونوں کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ انڈیا میں کے جی آر کالج اور پرنس آف ویلز ملٹری کالج کو ایمپائر کی آؤٹ پوسٹ کی حیثیت حاصل تھی۔ (ہر مملکت کے ستون اس کے ادارے ہی ہوتے ہیں)

اگر ان اداروں میں مستقبل کے ذمہ دار افراد تیار کیے جا رہے تھے تو ان کی تربیت کا رُخ (Orientation) بھی ذمہ داری اور جرأت کی طرف تھا۔ اس بات کو میں ایک مثال سے واضح کروں گا۔

ہوا یوں کہ رابرٹس ہاؤس میں میرے سیکشن کے ایک لڑکے کے سر میں چوٹ لگی تو اس کا دیسی علاج کیا گیا یعنی روئی جلا کر زخم میں بھری گئی اور اوپر سے پٹی باندھ دی گئی۔ یہ کارروائی میری غیر حاضری میں اور پلاٹون کمانڈر کی موجودگی میں کی گئی۔ (واضح رہے کہ ایسا کرنا سکول کے ضابطے کے خلاف تھا) دوسرے دن سب اسسٹنٹ سرجن نے یہ علاج ملاحظہ کیا تو انہوں نے وہ لڑکا کمانڈانٹ کے سامنے پیش کر دیا۔ انہیں تاب کہاں حکم ہوا کہ سیکشن کمانڈر کو چارج شیٹ کیا جائے۔

(اس سسٹم کا اصل اصول یہ تھا کہ جس دائرہ میں کوئی غلطی یا کوتاہی ہو اس کی باز پرس اُس کے کمانڈر سے کی جائے۔ مقصد یہ تھا کہ ذمہ داری کے احساس کو انتہائی حد تک بڑھایا جائے)
چنانچہ مجھ پر فردِ جرم عائد کر دی گئی۔ جب میں اندر جا رہا تھا تو میرے پلاٹون کمانڈر نے عاجزانہ لہجے میں مجھ سے کہا "عطا میرا نام نہ لینا"
میں نے کہا "ڈونٹ وری"
اور میں مقتل میں حاضر ہو گیا۔ اور جاتے ہی کہا۔
"آئی ایم ساری سر، اٹ از مائی فالٹ"
حسبِ توقع میری پانچ کرارے بیدوں سے تواضع ہوئی۔ پھر پوچھا "جانتے ہو صرف پانچ بید کیوں لگے؟" "نہیں سر مجھے معلوم نہیں" "اس لیے کہ تم نے غلطی کو مانا۔ سچ بولا"
یہ واقعہ میری زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے یقین تھا اور ہے کہ جرأت عزتِ نفس ہی کا تقاضا نہیں فراست کا تقاضا بھی ہے۔

یہاں ایک اور بات کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں کہ سٹیبنگ گو اس وقت رینک میں میجر ہی تھے لیکن انہیں سول اور آرمی میں سینئر سے سینئر آفیسر کا اعتماد بلکہ احترام حاصل تھا۔ اس فہرست میں جنرل کولرج جی او سی ناردرن کمانڈ بعد کو کمانڈر انچیف، فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک اور وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو شامل تھے۔ اس طرح کے لوگوں سے وہ براہِ راست گفتگو کر سکتے تھے۔ اس ربط ضبط سے سکول کو بہت فائدہ پہنچا۔ پھر ان بڑے لوگوں کی فراست کی بھی داد دینی چاہیے کہ وہ اپنے جوہر قابل کی قدر کرتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ ان کا اصل کام کون کر رہا ہے اور کہاں کر رہا ہے۔

۱۹۵۰-۵۱ء میں سٹیبنگ سے ٹورکی میں ان کے گھر دوبارہ ملا۔ ان کا اکلوتا بیٹا مائیکل گو انگلینڈ میں ہی تھا۔ لیکن ان کے پاس نہ تھا۔ دونوں میاں بیوی اکیلے رہ رہے تھے۔ اولڈ مین کو دو ہارٹ اٹیک ہو چکے تھے اور ان کی مسز ان کی بڑی تندہی سے خبر گیری کر رہی تھیں۔
پہلی وزٹ (ایک سال لوکل) شام کو ہوئی۔ کچھ سال لوکی رعایت سے اور کچھ میرے اعزاز میں انہوں نے اپنے بعض دوستوں کو بھی اپنے گھر پر بلایا ہوا تھا۔ میرا تعارف انہوں نے بڑے فخر سے

کرایا۔ چونکہ میں ان کے دور کا پہلا کے جی لوائے تھا جسے رائل انڈین نیوی میں کمیشن ملا تھا انھوں نے اس کا بھی بطورِ خاص ذکر کیا۔ ڈنر کے بعد وہ مجھے ٹوری کی سیر کو لے گئے۔ ٹوری ایک خوبصورت پہاڑی شہر ہے ادھر ادھر گھومنے کے بعد ایک پب میں رُکے اور ایک چھوٹا آرڈر کیا۔ مسٹر سٹیبنگ نے ان کی طرف دیکھا۔ ہارٹ اٹیک کی وجہ سے ڈاکٹرز نے ہارڈ ڈرنکس سے منع کر رکھا تھا بولے آج خاص موقع ہے مجھے اسے منانے دو۔ وہ آہستہ آہستہ سپ کر رہے تھے اور نظریں چھت کے ایک گوشے پر جمی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کن خیالوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔ پھر یکایک آنسو ان کے تمتمائے ہوئے رخساروں پر بہنے لگے۔ "عطا تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں سزا دی تھی۔ اس دن کے لیے۔ اس دن کے لیے۔" میں نے صرف اتنا کہا "سر، میں آپ کا ہزار بار ممنون ہوں آپ ہی نے ہمیں بنایا ہے۔"

یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے لیکن آج بھی مجھے اس امر میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں لڑکوں کی کئی نسلوں کو بنانے میں اس اجنبی کے جذبے، کاوشوں اور انتھک محنت کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی کاوش اور توانائی اور لگن دیو مالائی کہانیوں کی سی تھی۔

سیلبی کی طرح اپنے اولڈ بوائز سے برابر رابطہ رکھتے تھے۔ نیوی میں کمیشن لینے کے بعد دسمبر ۱۹۴۵ء میں، میں گھر جاتے ہوئے ان کے بنگلے پر تین دن ٹھہرا اس کے بعد بمبئی میں میرے نیوی کے کیریر پر نظر رکھی۔ پھر انھوں نے سکول ہیڈ بوائے کو میرے پاس بمبئی بھیجا تاکہ وہ نیوی کے بارے میں اپنی معلومات میں اضافہ کرے اور دنیا دیکھے۔

—— بریگیڈئر بشیر احمد[۱]

سٹیبنگ اپنی چھٹیاں سری نگر گزارتے تھے۔ ۱۹۴۱ء کی گرما کی چھٹیوں میں سٹیبنگ چار سینئر پریفیکٹس ۴۲۰ محمد اکبر، ۵۸۴ خداداد، ۱۷ صاحب زاد گل اور ۶۹۰ بشیر احمد کو سری نگر لے گئے تھے۔ جھیل ڈل کے قریب مرزا گارڈنز میں ہمارا کیمپ لگا تھا وہ اکثر ہمیں چار چپہ اپنی ہاؤس بوٹ میں ہلاتے تھے۔ جھیل میں تیرنے کی اجازت تھی اس عرصہ میں ہم شالیمار گارڈنز مٹن سکول اور

---

[۱] کالج نمبر ۶۹۰ زمانہ تعلیم ۱۹۳۶ تا ۱۹۴۱ء

کشمیر کی ریاستی فوج کے او-ٹی-ایس میں بھی گئے جو سری نگر سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ سٹیبنگ ہمیں بڑے فخر سے وہاں کے سینئر افسروں سے ملواتے تھے۔ او-ٹی-ایس میں ہمارے لیے خصوصی نمائشی ایکسر سائز کا اہتمام کیا گیا تھا اور ایک آفیسر نے ہمیں وی-آئی پی کے طور پر سکول دکھایا۔ یہ وہ لڑکے تھے جنہیں سٹیبنگ نے کیڈٹ کالج بھیجنے کیلئے چنا ہوا تھا۔

بریگیڈیئر محمد اقبال[61]

۱۹۴۰ء میں سکول میں میرا تیسرا سال تھا کہ ٹائیفائیڈ سے بیمار ہوا۔ خاصے عرصے اسپتال میں داخل رہا۔ سٹیبنگ اور ان کی بیگم الگ الگ وقت میں ہر روز دیکھنے آتے تھے۔ مسز سٹیبنگ اپنے ساتھ کھانے پینے کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور لاتی تھیں۔ اسپتال میں اکیلے لیٹے لیٹے میرا دل گھبرانے لگا۔ میں سمجھتا تھا کہ میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔ لیکن آر-ایم-او ڈاکٹر اسحاق کہتے تھے نہیں ابھی اور آرام کرو۔ ایک دن شام کو مسز سٹیبنگ آئیں تو میں بڑا اداس تھا۔ پوچھنے لگیں کیا حال ہے۔ میں پھٹ پڑا۔ "حال بہت برا ہے۔ میں بہت بور ہو گیا ہوں"، بات آئی گئی ہوئی۔ چند روز بعد سٹیبنگ اپنے معمول کے وقت سے پہلے صبح صبح آئے اور بولے۔ میں ایک سرکاری کام سے لاہور جا رہا ہوں۔ چلو تمہیں لاہور کی سیر کرا لاؤں۔ (میرا خیال تھا کہ ان کی مسز نے ان کو میرے بور ہوتے کے بارے میں بتایا ہوگا) لاہور میں انہوں نے مجھے تمام تاریخی مقامات کی سیر کرائی۔ شاہی مسجد بھی دکھائی۔ سینڈوچ میں نے پہلی بار اسی ٹرپ پر کھائے تھے۔

سٹیبنگ سینئر پریفکٹس پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ ان کی ذرا سی بھی فروگذاشت معاف نہیں کرتے تھے۔ ایک بار میرے سر کے بال عام معیار سے ذرا زیادہ بڑھے ہوئے تھے۔ دفتر میں باربر کو بلا کر میرے سر پر استرا پھروا دیا۔ پھر میں سر پر رومال باندھے ہوا پھرا۔ اس وقت میں سینئر پریفکٹ (پلاٹون کمانڈر) تھا۔ جن لڑکوں کو انہیں آگے بڑھانا ہوتا وہ ان کی چیکنگ دوسروں سے زیادہ کرتے تھے۔ یہ ان کا اصول تربیت تھا۔ وہ لڑکوں کے کیریئر میں اتنے Involve تھے کہ ان کی سختیاں بھی گوارا ہوتی تھیں۔ ۱۹۴۲ء کے اواخر میں جب سکول کو ایک بٹالین کے طور پر منظم کیا گیا

٦١۔ کالج نمبر ۴۳، زمانہ ۱۹۳۷ تا ۱۹۴۳ء سابق ڈائریکٹر آرٹلری

تو سکول ہیڈ بوائے کی حیثیت سے مجھے سکول کا پہلا بٹالین کمانڈر ہونے کا موقع ملا۔ اس منصب کی وجہ سے میں نے کرنل سٹیبنگ کو بہت قریب سے دیکھا۔ ایک جملہ میں، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ شخص کام کے لحاظ سے جن تھا۔ نہ معلوم اس عمر میں ان میں اتنی توانائی کہاں سے آ گئی تھی۔ سونے کس وقت تھے آرام کس وقت کرتے تھے۔

کمیشن کی تربیت کے دوران میں کرنل سٹیبنگ سے ملنے آیا تو انہوں نے اصرار کیا کہ میں ایک رات ان کے ہاں ٹھہروں۔ رات کے کھانے پر جب گوشت کا ڈونگا سامنے آیا تو نہ جانے میرے دل میں کیسے آ گیا کہ کہیں یہ پورک نہ ہو۔ میرا ہاتھ رک گیا اور میں غور سے ایک بوٹی کو دیکھنے لگا۔ مسز سٹیبنگ میرے دائیں طرف بیٹھی تھیں۔ انہوں نے پوچھا میرے بچے کیا بات ہے اس وقت میرے منہ سے نکل گیا۔ It's stinking مسز سٹیبنگ نے کمال تحمل سے دوسرا سبزی کا ڈونگا میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ یہ لے لو۔ یہ واقعہ جب بھی مجھے یاد آتا ہے تو مجھے ندامت ہوتی ہے۔ کھانے کے دوران یا اس کے بعد انہوں نے قطعاً یہ تاثر نہیں دیا کہ میں نے زیادتی کی ہے۔

وہ مائی چائلڈ کہہ کر بات کرتی تھیں۔ انہوں نے اسی مادرانہ انداز سے میری بات کو نظر انداز کیا۔ اگست، ۱۹۴۷ء کے اواخر میں، میں اپنی یونٹ سے پنڈی آیا تو بھائی خوشی محمد نے مجھے بتایا کہ کرنل سٹیبنگ فلیش مین ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مجھے پریڈ کے موقع کی بدمزگی کا علم نہ تھا میں ان کا نام سنتے ہی فوراً فلیش مین پہنچا۔ وہ بڑے دل شکستہ اور افسردہ تھے بلکہ شاک کی حالت سے باہر نہیں آئے تھے۔

میں آخری بار ان سے ۱۹۵۱ء میں ٹورکی میں ملا تھا۔ ٹورکی انگلستان کے ساؤتھ ویسٹ میں ڈیون شائر کاؤنٹی میں ایک ساحلی قصبہ ہے سٹیبنگ کا اپنا گھر سمندر کے رخ پر تھا۔ میں نے انہیں اپنی فیملی کے ساتھ آنے کی خبر دے دی تھی۔ دونوں نے ہمارا گھر کے باہر بڑے شوق سے خیر مقدم کیا (۲۹۳۹) میجر جاوید اس وقت چھوٹا سا تھا۔ مسز سٹیبنگ اسے دیکھ کر بہت اکسائٹ ہوئیں یوں جیسے بوڑھے والدین پوتے سے مل کر اکسائٹ ہوتے ہیں۔ دوپہر کے کھانے پر مسز سٹیبنگ نے پراٹھے بنائے ہوئے تھے اور سالن میں کری تھی۔ دونوں چیزیں جیسی بھی تھیں، تھیں لیکن جس شوق اور محبت سے یہ پاکستانی کھانا بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے پیش نظر میں نے اور میری بیگم

نے کھانے کی بڑی تعریف کی تو سٹیبنگ نے کہا خدا کا شکر ہے کہ تمہیں کھانا پسند آیا۔ اب یہ چین کی نیند سو سکیں گی۔

آخر میں دو ایک باتیں سٹیبنگ کی ذاتی عادات کے بارے میں مثلاً یہ کہ سٹیبنگ کبھی کبھی سگار پیا کرتے تھے اور ان کے قلم پکڑنے کا طریقہ بھی انوکھا تھا۔ عام طور پر لوگ انگشت شہادت اور سیدھے انگوٹھے سے قلم پکڑ کر لکھتے ہیں۔ سٹیبنگ تیسری اور چوتھی انگلی کے درمیان میں قلم دبا کر لکھتے تھے اور لکھائی دائروں کی شکل میں ہوتی جس کو پڑھنا آسان نہ تھا۔

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین ملک ۔ ستارہ جرأت

میں تقریباً چار ہفتے آئی ایم ایچ جہلم رہا اس عرصے میں وہ تقریباً ہر روز مجھے دیکھنے ہسپتال آتے تھے۔ آئی۔ایم۔ایچ سے آنے کے بعد ایک ہفتہ میں نے کالج ہسپتال میں بھی لگایا۔ اس دوران مسز سٹیبنگ اپنے بنگلے سے میرے لیے کھانا بھجواتی رہیں۔ خود بھی شام کو ضرور دیکھنے آتی تھیں۔

آخر میں ایک اور واقعہ کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ کرنل سٹیبنگ کی ایڈمنسٹریشن کا ٹیمپو کیا تھا اور یہ کہ انھوں نے ہمیں ذمہ داری سکھانے کے لیے (جو لیڈرشپ کی جان ہے) کتنی جدوجہد کی۔

اس دور میں راشن کا پورا پورا حساب رکھا جاتا تھا۔ کوئی چیز کم ہو یا زیادہ بہرصورت بازپرس ہوتی تھی۔ راشن رجسٹر میں بڑی تفصیل سے ہر چیز کا اندراج ہوتا تھا اور رسید سے بہت صاف لکھے ہوتے تھے۔ سٹیبنگ رجسٹر کی اچانک چیکنگ خود کرتے تھے۔ کچن میں ایک جونیئر پریفکٹ ڈیوٹی پر ہوتا تھا جو صفائی کا خاص خیال رکھتا تھا۔ ایک روز میں برڈووڈ ہاؤس میں کچن ڈیوٹی پر تھا کہ شام کا دودھ گرم کرتے ہوئے پھٹ گیا۔ ایک اور ہاؤس کا بھی دودھ اسی طرح خراب ہوگیا۔ دوسرے روز ہم دونوں پریفکٹوں کی کمانڈانٹ کے سامنے پیشی ہوئی چھ چھ بید لگے۔ کمانڈانٹ نے کہا دودھ برتن گندے ہونے کی وجہ سے خراب ہوا ہے برتنوں کو صاف رکھوانا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اگر دودھ میں کچھ خرابی ہوتی تو باقی دو ہاؤسوں کا دودھ بھی خراب ہو جاتا۔

---

[1] کالج نمبر ۲۱، زمانہ تعلیم ۴۳-۱۹۳۸ء

—— بریگیڈئر محمد حیات ستارہ جرأت[1]

میں اپنی ایک شرارت کا قصہ سناتا ہوں۔ اس پر کرنل سٹیبنگ نے جو ایکشن لیا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے طلبا کو کتنا جانتے تھے۔ ایک بار میں کالج اسپتال میں داخل تھا۔ لیٹے لیٹے بور ہو گیا تھا۔ کوئی ایسا بیمار نہیں تھا۔ ایک دم خیال آیا کچھ کرنا چاہیے۔ کالج اسپتال کے قریب کے بنگلہ میں سارجنٹ میجر میرس رہتے تھے۔ ان حضرت کا قد چھ فٹ اور دو انچ تھا۔ یہ ہمیں باکسنگ سکھاتے تھے۔ (باکسنگ اس زمانے میں سب کے لیے لازمی تھی اور اس پر بڑا زور دیا جاتا تھا) اور ٹائپ بھی باکسر ہی کا تھا۔ بہر حال میں نے ان کے کچن گارڈن، پر دو اور ہسپتالی لڑکوں کے ساتھ حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس زمانے میں گاجروں کا موسم تھا۔ چنانچہ غریب گاجریں ہی ہماری چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بنیں۔ جب گاجریں رات میں اکھاڑی جائیں تو آپ کھیت کی حالت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ صبح جب میرس صاحب اپنی پیاری سبزیوں سے ملاقات کے لیے گئے تو دیکھا کہ ساری جگہ کا ستیاناس ہو چکا ہے۔ بہر حال تفتیش شروع ہوئی جو زیادہ مشکل نہ تھی۔ اس لیے کہ پیروں کے نشان ہسپتال کے برآمدے تک موجود تھے۔ بہر حال معاملہ کمانڈانٹ تک پہنچا۔ انہوں نے ہم تینوں کو بلا لیا۔ ہم اس طرح بلانے کا مطلب سمجھتے تھے اور اس کے انجام سے بھی واقف تھے۔ بہر حال حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب کرنل سٹیبنگ نے باقی دو لڑکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر چھوڑ دیا اور مجھے دس کرارے بید عطا کیے۔ یہ عطیہ میرے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ لیکن حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ سٹیبنگ تو بڑے انصاف پسند ہیں کبھی کسی کی رعایت نہیں کرتے حتیٰ کہ حق نواز کیانی کی بھی نہیں تو پھر آج یہ کھلی ناانصافی کیوں ہوئی۔ آخر میں وہ بھی تو میرے ساتھ باغ اجاڑنے میں برابر کے شریک تھے ان کی خلاصی تو باتوں سے ہو گئی اور اپنے حصے میں ایک دو نہیں پورے دس کین آئے۔ چنانچہ میں نے دفتر سے باہر نکلنے سے پہلے پوچھ لیا۔ سر سزا تو خیر ٹھیک ہے لیکن یہ بے انصافی کیوں؟ سٹیبنگ نے اپنے مخصوص لہجہ میں کہا۔" حیات، میں تمہیں جانتا ہوں تمہارے اندر لوگوں کو متاثر کرنے اور اپنے پیچھے لگانے کی صلاحیت ہے تم ہی نے انہیں ورغلایا ہو گا اور یہ بیچارے پھنس گئے۔ تمہیں میں نے اس لیے سزا

---

[1] کالج نمبر ۴۸۷، زمانہ تعلیم ۴۳-۱۹۳۸ء

دی کہ تم اپنی صلاحیت کو غلط استعمال نہ کرو۔ دوسروں کی صحیح سمت میں رہنمائی کرو۔ پھر میں تمہیں پریفیکٹ بنادوں گا۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد کرنل سٹیبنگ نے مجھے پریفیکٹ بنا دیا۔ سٹیبنگ کی یہی تو خوبی تھی کہ ہر لڑکے کو جانتا تھا اور خوب جانتا تھا۔ اس کی سزا غصے کا نہیں سوچ کا نتیجہ ہوتی تھی۔ اب غور کرتا ہوں تو مجھے کرنل سٹیبنگ کے تربیتی مقاصد بہت محدود نظر آتے ہیں۔ لیکن جو مقاصد بھی اس کے سامنے تھے ان میں وہ شخص بلاشبہ مخلص تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے معیار کے مطابق ہمیں ایک اچھا افسر بنانے میں کرنل نے انتھک محنت کی سختی کے ساتھ ساتھ اسکی ہمدردی اور شفقت بھی بے انتہا تھی۔

لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد کیانی ستارہ جرأت

سٹیبنگ کا میرا پہلا امپریشن اچھا نہیں تھا۔ انہوں نے میری ایک انجانی غلطی کی پاداش میں میری چھٹی بند کردی تھی اور میرے چچا کے انتقال پر بھی مجھے گھر جانے نہیں دیا تھا بلکہ میرے اوپر گارڈ بٹھادی تھی کہ میں بھاگ نہ جاؤں میں انہیں شروع میں ظالم وجابر ہی سمجھتا تھا۔ اور اگر کالج کو چھوڑ کر نہیں بھاگا تو محض اپنے خاندان کی عزت کے خیال سے ورنہ چھٹی نہ ملنے کے واقعہ سے مجھے سٹیبنگ سے نفرت ہوگئی تھی میں ان اولڈ بوائز میں سے ہوں جو کبھی سٹیبنگ کے زیادہ قریب نہیں رہے کبھی خط و کتابت نہیں کی۔ کالج سے جانے کے بعد کبھی ان سے ملاقات نہیں کی۔ مجھے ان کے ہاتھوں ڈائریکٹ کمیشن بھی نہیں ملا۔ انہوں نے مجھے کچز کالج ضرور بھیجا تھا لیکن کچز کالج سے خالی ہاتھ واپس آیا تھا۔ اور برسوں تپتی دھوپ میں صحرا کی خاک چھاننے کے بعد اپنے زور سے سپاہی سے ڈائریکٹ کمیشن لیا تھا۔ اور ان کے منظورِ نظر نہ ہونے کا ایک اور ثبوت میرے پاس یہ ہے کہ اور سزائیں تو ملیں لیکن میں ان کے بیسٹ آف دی سکس سے بھی محروم رہا۔ ورنہ ان کے سٹار بوائز اس نعمت سے محروم نہیں رہتے تھے۔ اس وضاحت کے بعد کہ میں سرکاری گواہ نہیں ہوں۔ اب میں اس نکتے پر آتا ہوں کہ میں سٹیبنگ کو ملٹری کالج کا ماسٹر بلڈر کیوں کہتا ہوں۔

پہلے تو سٹیبنگ کے سربراہی کے زمانے کو دیکھنا چاہیے سٹیبنگ مئی ۱۹۳۰ء سے

اگست ۱۹۴۷ء تک پورے دس برس اس ادارے کے سربراہ رہے اور اپنی رینک کی ترقیوں کو قربان کر کے یہاں رہے۔ اگر وہ Imperialist تھا تو بہت ہی پکا اور سچا امپیریلسٹ تھا جس نے اپنے ذاتی مفادات کو قربان کر کے اپنے ملکی اور قومی مفادات کو آگے بڑھایا یہ زمانہ جنگ عظیم دوم کا یا اس سے پہلے یا بعد کا ہے۔ یہی زمانہ برصغیر میں آزادی کی تحریکوں کا بھی ہے جن کی وجہ سے یہاں کا نظم و نسق آسان نہ رہا تھا۔

سٹیبنگ کا میں سب سے بڑا Contribution یہ سمجھتا ہوں کہ اس نے جنگ کی تمام لہروں کو سکول کے مفاد میں استعمال لیا۔ ۱۹۴۰ء میں سٹیبنگ نے یہاں سائنس کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز کیا۔ وزیر خاں ملک پہلے سویلین بی ایس سی بی ٹی ٹیچر تھے جو یہاں آئے اور انہوں نے باقاعدہ سائنس لیبارٹری کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح یہاں کے تعلیمی معیار کو اونچا کیا۔ ۱۹۴۱ء میں سٹیبنگ نے میجر ہوتے ہوئے وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو کی پذیرائی کی اور اس طرح سکول کو گورنمنٹ آف انڈیا سے براہِ راست متعارف کرایا۔ ناردرن کمانڈ کے جنرل کو برج تو یہاں آتے ہی رہتے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں جب بیشتر فوجی انسٹرکٹرز محاذ پر چلے گئے تو سٹیبنگ نے جو سویلین انسٹرکٹرز بھرتی کیے ان میں، مسٹر حیدری، مسٹر مدن لال، مسٹر کمار ایسے استاد شامل تھے۔ ۱۹۴۳ء میں تو بجلی انٹری آئی۔ آکنلک ہاؤس بنا اور پھر اس کے افتتاح کے لیے کمانڈر انچیف جنرل آکنلک آئے ان سب چیزوں نے سکول کے رتبہ کو بڑھانے میں مدد دی اور ۱۹۴۴ء سے سکول کو کمیشن کے لیے لڑکے براہِ راست سلیکشن بورڈ کے سامنے بھیجنے کا اعزاز ملا۔ اس عرصے میں سٹیبنگ سکول کی ٹی او ای بھی مسلسل بہتر کرواتے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں یہاں کمانڈانٹ کے بعد دوسرے افسر کی آسامی منظور ہوئی۔ کیپٹن لیوس کو اسسٹنٹ کمانڈانٹ اور چیف انسٹرکٹر بنایا گیا اور ہیڈ ماسٹر کی جگہ وزیر خاں ملک نے سنبھالی، ۱۹۴۵ء میں ٹی او کی پوسٹ منظور ہوئی۔

اب میں ان اقدامات کا تذکرہ کروں گا جو انہوں نے خاص طور پر لڑکوں کو افسری کے قابل بنانے کے لیے کیے۔

آرڈرلی روم:

افسر کا ایک کام یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ بحیثیت ذمہ دار افسر آرڈرلی روم کرتا ہے۔

کمانڈانٹ نے اس کام کی تربیت سینئر کیڈٹس کو دی۔ میں نے خود کمانڈانٹ کی کرسی پہ بیٹھ کر یہ تجربہ حاصل کیا۔

کمانڈانٹ کے بنگلہ پر مہمانی: جو سینئر لڑکے کچز کالج کے لیے نامزد کیے جاتے ان کو کمانڈانٹ اپنے بنگلے کے مہمان خانے میں چند روز رکھتے تھے اور مسز سٹیبنگ ان کو آداب میزبانی اور مہمانی سکھاتی تھیں۔ اس طرح جو اعتماد پیدا ہوتا وہ علیحدہ تھا۔

وی آئی پی مہمانوں کی پذیرائی: سکول میں وائسرائے، کمانڈر انچیف جی او سی ناردرن کمانڈ جو بھی وی آئی پی مہمان آتے تھے ان کی پذیرائی میں سینئر پریفکٹس پیش پیش ہوتے تھے، وہی ان کو سکول دکھاتے تھے۔ چائے پر ان کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔

پنڈی کی تربیت: کچز کالج کے لیے نامزد شدہ لڑکوں کو سٹیبنگ سکول کے سابق کمانڈانٹ سیلبی کے پاس پنڈی بھیجتے تھے جو لڑکوں کو اپنے ہاں مہمان رکھتے ان کی ضروری تربیت کرتے اور خاص طور پر رائڈنگ سکھانے کے لیے ٹوپی پارک (ایوب پارک) بھیجتے۔ میں خود سیلبی صاحب کے یہاں ۱۹۴۳ء میں کچز کالج جانے سے پہلے چند دن رہا اور ٹوپی پارک میں رائڈنگ سیکھی۔ یہاں یہ پہلو بھی مدنظر رہے کہ دونوں میں کتنا تعلق تھا۔ اس سے سیلبی کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ سکول سے چلے جانے کے بعد بھی سکول کی خدمت کر رہے تھے۔

سٹیبنگ کے طریق کار کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۳ء کے اوائل میں سگنلنگ سکھانے کی ڈمی چابی کلاس روم سے کھو گئی۔ وارنٹ آفیسر مسٹر ریڈ سگنلنگ سکھاتے تھے انہوں نے رپورٹ کر دی چابی ایک آنے سے زیادہ کی نہ ہو گی لیکن اس کی تلاش اس پیمانے پر شروع ہوئی جیسے گھاس کے ڈھیر میں سوئی تلاش کی جاتی ہے۔ سارا سکول چکر میں تھا۔ سوال چابی کی قیمت کا نہیں اس امر کا تھا کہ چابی کھوئی کیوں۔ یہ مسئلہ کیریکٹر اور ایڈمنسٹریشن کا تھا۔ میں ۱۹۴۳ء کا پہلا آل انڈیا بوائز کمپنی باکسنگ کا مقابلہ جیت کر کچز جانے سے پہلے کی چھٹی پر تھا۔

واپسی پر باکسنگ کی جیت منانے کا فنکشن ابھی ختم ہی ہوا تھا کہ ہیڈ بوائے نے پیغام دیا کہ کمانڈانٹ کہہ رہے ہیں کہ رشید سے کہو میری ایک بات سنکر جائے۔ اور وہ بات یہ تھی کہ میں چابی ڈھونڈنے میں مسٹر ریڈ کی مدد کروں اور رپورٹ دے جاؤں میں نے دل میں کہا مارے گئے۔ مجھے جلد واپس جانا تھا۔ چھٹی ختم ہو رہی تھی لیکن کمانڈانٹ کا حکم تھا ٹالا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ ایک بار پھر سارے کیڈٹ این سی اوز اور کیڈٹ آفیسرز نے چابی تلاش کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ آخر کار چابی مل گئی اور رات کے ڈیڑھ بجے مسٹر ریڈ اور میں ان کے بنگلہ پر مہم کی کامیابی کی اطلاع دینے گئے۔ وہ سوئے نہیں تھے اور ہماری رپورٹ کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا اس تگ و دو کا مقصد یہ تھا کہ لڑکوں کو معلوم ہو کہ یونٹ میں کسی چیز کا کھو جانا کتنا سنگین واقعہ ہے۔

سٹیبنگ کی عادت تھی سینئر کیڈٹس کی ہر فروگذاشت پر گہری نظر رکھتے تھے۔ کیڈٹ بٹالین قائم ہونے کے بعد کیڈٹ آفیسرز کی پی ٹی دوسرے لڑکوں سے پہلے ہوتی تھی۔ ایک روز پی ٹی پر میں سیکنڈ ان کمانڈ ۳۵ ٨ حق نواز (کیڈٹ ایڈجوٹینٹ) بمشکل ایک منٹ لیٹ ہوئے حسب دستور سٹیبنگ پی ٹی گراؤنڈ میں (موجودہ موتی ہال لان) موجود تھے۔ اس وقت تو انہوں نے صرف غور سے دیکھا اور خاموش رہے۔ (سٹیبنگ کسی غلطی پر فوراً تشادٹ نہیں کرتے تھے۔ خاموشی سے احتساب کرتے تھے) اس ایک منٹ لیٹ ہونے پر ہم دو کی غلطی پر سب کیڈٹ آفیسرز کو (سٹیبنگ اجتماعی ذمہ داری اور اجتماعی سزائیں دینے پر یقین رکھتے تھے) تین سزائیں ملیں۔ پہلی یہ کہ ایک ہفتے کیلئے صبح صبح ٨ وسنگ ہیل تک ڈبل کرنا پڑی۔ ایک ہی ہفتے صبح سویرے سنٹرل ہال میں ریوالی سے پہلے کٹ انسپکشن کرائی۔ اس سزا کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ ساری کٹ خود سر پر اٹھا کر کیڈٹ آفیسرز میس سے سنٹرل ہال تک صبح سویرے لے جانا پڑتی تھی اور اس کو ایک ترتیب سے لگانا پڑتا تھا چونکہ کیڈٹ اردلی بھی ایک ہفتے کے لیے واپس لے لیے گئے تھے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر یہی قصور دوسرے جونیئر انڈر آفیسرز سے سرزد ہوتا تو تینوں سزائیں ایک ساتھ نہ ملتیں۔۔۔ چونکہ کیڈٹ بٹالین کا نمبر ٹو تھا اور حق نواز نمبر تھری اس لیے ہم سب پر یہ افتاد پڑی۔ کسی ہاؤس میں کوئی بات غلط ہو جائے کوئی کرے لیکن باز پرس ہاؤس ہیڈ بوائے سے ہوتی تھی۔ میں کیڈٹ بٹالین کا سیکنڈ ان کمانڈ تھا اور سکین ہاؤس کا ہیڈ بوائے بھی۔ اس زمانے میں ہر ہاؤس کو ایک ایک ریڈیو ملا جو ایک میز پر ایک جالی کے ڈبے میں بند ہوتا تھا جس کی چابی

سی ایس ایم کے پاس ہوتی تھی۔ ریڈیو پر چند مخصوص اوقات میں چند مخصوص سٹیشن سننے کی اجازت تھی۔ پر لڑکے کہاں باز آتے ہیں۔ ایک شاطر پر کار کی نوک جالی کے اندر ڈال کر ریڈیو لگا لیتے تھے۔ جس جگہ سے بار بار پرکار ڈالا جاتا وہاں جالی میں چھوٹا سا سوراخ ہو گیا تھا۔ ہاؤس انسپکشن پر سٹیبنگ کی عقابی نظر اس سوراخ پر ٹھہر گئی اور اپنے بیٹن سے سوراخ کی طرف اشارہ کر کے کہا "واٹ از دس رشید ؟ دوسرے روز مجھے دفتر میں بلا لیا اور صرف اتنا کہا رشید مجھے تمہاری کمپنی سے یہ توقع نہیں تھی۔ جاؤ کوئی ان کے دفتر میں جائے اور خالی واپس آجائے۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ بہرحال میں ان چند خوش قسمت کیڈٹس میں سے ہوں جو حسن اتفاق سے سٹیبنگ کی خصوصی "عطا" سے محروم یا محفوظ رہے۔ آخر میں، میں اپنی کمپنی کو ملی ہوئی ایک مضحکہ خیز لیکن فکر انگیز سزا کا ذکر بھی چاہتا ہوں۔

ایک دفعہ ہماری کمپنی کے ایک سکھ کیڈٹ کے گندے بال اور گندی فنٹی (وہ کپڑا جو وہ پگڑی کے نیچے بالوں کے گرد باندھتے ہیں) چیک ہو گئی۔ پوری کمپنی کو سزا لگ گئی کہ ہر دو گھنٹے کے بعد لڑکے برشوں سے نہائیں گے اور ان کی انسپکشن کی جائے گی۔ دن میں تقریباً چھ سات بار برشوں سے نہانے کی بدولت میل اور طبیعت بالکل صاف ہو گئی۔ کمانڈانٹ سٹیبنگ کبھی ادھار نہیں رکھا کرتے تھے۔ جو غلطی کرے اسے سزا کے لیے تیار رہنا ہوتا تھا۔ ان کے اصول ایسے تھے کہ کالج ان کی زیر نگرانی تعلیم کے علاوہ ہر شعبے میں دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہا۔ وہ اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ سٹیبنگ کو میں ایک لحاظ سے سپرمین (Super-man) سمجھتا ہوں میری یہ رائے اب ۱۹۸۸ء میں ہے جبکہ فوج کی کرنیلی سے ریٹائر ہوئے بھی بارہ تیرہ برس ہو گئے ہیں اور ساٹھ برس سے اوپر عمر ہو گئی ہے۔ گویا یہ جذباتی یا نوجوانی کی ہیرو ورشپ والی رائے نہیں ہے۔ سینکڑوں اپنے اور بیگانے بڑے بڑے افسروں اور کارپردازوں کو دیکھ کر اور ان کے ساتھ کام کر کے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ بہت بڑا آدمی تھا۔ ہمیں اس کی خوبیوں (اور خامیوں کا بھی) مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس کی شخصیت سے اور طریق کار سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔

—— میجر محمد حسین

۱۹۴۷ء میں میں نے آئی ایم سے کمیشن لیا تھا۔ فوج میں ۳۰ برس نوکری کی۔ پھر چھ برس واپڈا میں ڈپٹی سیکرٹری رہا۔ فوج اور سول کی اس طویل ملازمت میں مجھے کرنل سٹیبنگ ایسا آدمی نہیں ملا۔ ایڈمنسٹریشن ہی میں نہیں ٹریننگ میں بھی وہ انتہا پر پہنچا ہوا تھا کہ اس سے آگے جانے کا تصور کرنا محال ہے۔ اگر صفائی چیک کرنی ہے تو وہ اللہ کا بندہ یہ بھی دیکھتا تھا کہ کیڈٹ کے تکلے میں جس دھاگے سے چابی بندھی ہے وہ بھی صاف ہے یا نہیں۔ بنیان انڈرویر موزوں کی صفائی تو عام بات ہے۔ اسی طرح گریٹ کوٹ صرف جاڑوں میں پہنا جاتا تھا۔ لیکن لاکر میں اس کے بٹنوں کی چمک ہر بار چیک ہوتی تھی۔ یہ بات تو بہتوں نے لکھی ہوگی کہ راتوں کو گھوم پھر کے وہ چیک کرتے تھے کہ لڑکے منہ کھول کے صحیح طریقے سے سو رہے ہیں یا نہیں جو چیک ہوتا اس کا نمبر نوٹ کر کے لے جاتا اور صبح کو پیشی ہو جاتی۔ جن میں بار بار کی بیدی سزا کے بعد سر کو منڈوا دینا بھی شامل تھا۔ میں آئی ایم اے میں بھی رہا ہوں۔ کھانے کی صفائی کا جو اہتمام یہاں تھا وہ وہاں بھی نہیں دیکھا۔ سٹیبنگ کے حکم سے ڈیری کا دودھ میٹر سے ہر روز چیک کیا جاتا۔ دودھ کے اتنے برتن صاف ہوتے کہ اس سے زیادہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح مجھے یاد نہیں کہ کبھی ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک کے چھ سال کے عرصہ میں کھانے کے بعد کا پھل کبھی گلا سڑا ہو۔ کچن کے لک اتنے صاف رہتے تھے کہ حد نہیں۔ ان کے ملیشیا کے کپڑوں یا سفید ٹوپی پر کبھی کوئی داغ نہیں دیکھا۔ جو لوگ آئی ایم اے میں رہے ہیں وہ بھی تصدیق کریں گے کہ صفائی اور ٹرن آؤٹ کا جو معیار یہاں تھا وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ ٹرن آؤٹ صفائی اور ایس ڈی کا یہ جنون فوج میں میں نے صرف جنرل عتیق الرحمان میں دیکھا جو میرے پہلے کمپنی کمانڈر تھے۔

کرنل سٹیبنگ کی عادت تھی کہ کلاس روم کے دائیں برآمدہ کی درمیانی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر وہ خاصی دیر تک کلاس روم کو واچ کیا کرتے تھے۔ ایک روز وہ اسی طرح کھڑکی سے ٹکے کھڑے تھے اور ایک انگلینڈ کے تعلیم یافتہ استاد غالباً جغرافیہ پڑھا رہے تھے۔ لڑکوں کے سامنے اٹلس کھلے رکھے تھے۔ انھوں نے کرنل سٹیبنگ کو کھڑے دیکھا تو بولے This is useless

ل کالج نمبر ۸۰۴ زمانہ تعلیم ۱۹۳۹ تا ۱۹۴۵ء

سٹیبنگ ۔ نے جواب دیا Talk to the C.I. سی آئی سے بات کریں۔
ہم نے فوراً نوٹ کیا تھا کہ جس طرح انہوں نے کمانڈانٹ کو براہِ راست مخاطب کیا تھا یہ غالباً
ایک آزاد اور حاکم ملک میں تعلیم حاصل کرنے کا نتیجہ تھا۔
اس دور میں فٹیگ پر بھی بڑا زور تھا۔ چھٹی کے دن بھی کچھ نہ کچھ فٹیگ کرنا پڑتی تھی۔ اس
وقت تو یہ عذاب ہی لگی۔ اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ ہمکو زیادہ سے زیادہ مصروف
رکھا جائے اور کام کی نوعیت کی تبدیلی سے روٹین کی یکسانیت کے تناؤ کو کچھ کم کیا جائے۔ عہدیدار
کیڈٹس کی تربیت کا معیار بہت اونچا اور طریق کار سخت تھا۔ کرنل سٹیبنگ
Survival of the fittest کے کلاسیکی اصول کے قائل
تھے اور تربیت میں اسی پر کاربند تھے۔ وہ سینئر کیڈٹ آفیسرز کو آرمی کی ٹاپ براس سے روشناس
کرانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ جنرل آکنلک پنجاب سنٹر کی وجہ سے جہلم اکثر آتے
رہتے تھے۔ سٹیبنگ کے ان سے ذاتی مراسم تھے۔ وہ ان کو اکثر کالج میں لاتے تھے اور سینئر کیڈٹس
سے ملواتے تھے یا پھر ان سے ملنے جہلم وغیرہ پہنچتے تھے۔ مجھے یاد ہے ۱۹۴۴ میں آکنلک چکوال کے فوجی میلہ
میں آئے تھے۔ سٹیبنگ نے اپنے ایس سی اوز کو وہاں بھیجا۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ آکنلک ہمیں
دیکھ کر خود ہمارے پاس آئے اور ہم سے باتیں کیں۔ کمانڈر انچیف انڈیا سے رو برو گفتگو کرنے کا جو
Impact شخصیت پر ہو سکتا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں مجھے یاد ہے اس میلے میں
جنرل آکنلک نے پنجابی میں تقریر کی تھی جو "جوانو گل سنو" کے الفاظ سے شروع ہوئی تھی۔

—— میجر محمد اسلم[1]

یہ کہنا کہ سٹیبنگ کی دنیا میں عفو و درگزر کی گنجائش نہیں تھی صحیح نہیں۔ سچ بولنے اور غلطی
کا جرأت سے اعتراف کرنے پر معاف بھی کر دیا جاتا۔ یہ واقعہ ۱۹۴۱ کا ہے۔ میں جونیئر پریفکٹ تھا۔
ایک لڑکا جو کئی بار بھاگ چکا تھا رابرٹس ہاؤس کے سائڈ روم میں انڈر اریسٹ تھا۔ اس دن میں
جونیئر پریفکٹ آف دی ڈے تھا۔ اس حیثیت سے مجھے اسے کمانڈانٹ کے انسپکشن کے لیے لنچ
بریک میں کمانڈانٹ کے دفتر کے سامنے دو لڑکوں کی نگرانی میں لے جانا تھا۔ ان دو لڑکوں کا کمانڈر

---

[1] کالج نمبر ۸۰۶ زمانہ تعلیم ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء

میں تھا۔ اب یہ میری بدقسمتی یا سوئے اتفاق کہ ان دو لڑکوں میں سے ایک کی جرسی پر ایک داغ تھا۔ جو لڑکا انڈر اریسٹ تھا اسے تو سٹیبنگ نے بعد کو دیکھا پہلے ان کی نظر اس داغ پر پڑی اور میری طرف دیکھ کر کہا یہ کیا ہے؟ (ان کے اصول تربیت کے مطابق جونیئر کی غلطی کی باز پرس اس کے سینیئر سے کی جاتی تھی اور اسے ہی سزا سے نوازا جاتا تھا) میں نے جرأت سے اعتراف کرنا بہتر سمجھا اور جواباً کہا "سر یہ میری غلطی ہے مجھے افسوس ہے"۔ انہوں نے تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔ ورنہ چھ بید پڑنا یقینی تھے۔

۱۹۵۰ء میں جب پی ٹی کورس پر انگلینڈ گیا تو ۸۳۵ کیانی سے سٹیبنگ کا پتہ لیتا گیا کہ موقع ملتے ہی سٹیبنگ سے ملوں گا۔ چنانچہ میں نے پہلی فرصت میں انہیں خط لکھا کہ آپ سے ملنے آنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے فوراً جواب دیا اور لکھا کہ فلاں وقت کی گاڑی سے آنا "میں ٹارکی سٹیشن پر تمہارا انتظار کروں گا"۔ میں نے تصدیق کر دی لیکن ہوا یہ کہ بجائے اس گاڑی کے جس کی میں نے تصدیق کی تھی میں اس کے بعد کی گاڑی پر ٹارکی پہنچا۔ میں راستے میں پریشان ہو رہا تھا کہ اب کیا ہوگا وہ تو اس گاڑی پر آکر واپس چلے گئے ہوں گے۔ لیکن جب میں وہاں پہنچا تو دونوں میاں بیوی کو اپنا منتظر پایا۔ اس سے پہلے کہ میں معذرت کروں وہ کہنے لگے نہیں کوئی خاص تکلیف تو نہیں ہوئی ہم یہیں ویٹنگ روم میں انتظار کرتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ضرور تم وہ گاڑی نہ پکڑ سکے ہو گے۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ ٹارکی ٹاؤن لے گئے۔ پہلے ایک ریسٹوران میں چائے پلائی پھر ایک سٹیج شو دکھایا۔ اس کے بعد کھانا کھلایا۔ رات گئے گھر پہنچے تو بولے یہ تمہارا کمرہ ہے اب سو جاؤ صبح ملاقات ہوگی۔ میں صبح ذرا دیر سے اٹھا سٹیبنگ باہر جا چکے تھے۔ ان کی مسز نے بتایا کہ وہ کسی کام کی تلاش میں باہر گئے ہیں، دوپہر تک آئیں گے۔ یہ گھر بالکل سمندر کے کنارے واقع تھا۔ جب گھر کو ذرا دیکھا بھالا تو پتہ چلا کہ یہ تو سنگل بیڈ روم مکان ہے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ جسے میں گیسٹ روم سمجھ رہا تھا وہ ان کا اپنا بیڈ روم ہے۔ وہ رات دونوں میاں بیوی نے ڈرائینگ روم میں فرش پر سو کر گذاری تھی۔

—— لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی ستارہ جرأت

(اکتوبر ۱۹۶۸ء کے عالمگیرین کے ری یونین نمبر میں حق نواز کیانی نے کرنل ٹی ایچ ایل سٹیبنگ

لہ کالج نمبر ۸۳۵۔ زمانہ تعلیم ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۴ء کالج ہیڈ بوائے اور گارڈ ز مینڈل ونر ۴۴-۱۹۴۳ء

او۔ بی۔ ای۔ ایم۔ سی۔ کے بارے میں لکھا،

کمانڈانٹ ہر روز دوپہر کے کھانے کے وقت کے آخر میں کیڈٹ آفیسرز کے ٹرن آؤٹ کا انسپکشن کرتے تھے۔ ایک روز جب انسپکشن ختم ہوا اور کیڈٹ آفیسرز نے اپنے اپنے کلاسوں کا رُخ کیا تو کرنل سٹیننگ نے مجھے ہیڈ بوائے کی حیثیت سے اشارہ کیا کہ میں آرڈرز لینے کے لیے رُک جاؤں۔ چنانچہ احکامات لینے کے لیے میں ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی جب انھوں نے کرسی کو تھوڑا سا ایک طرف کو کھینچا اور ان کی گھنی مونچھیں تھوڑی سی پھڑکیں تو میں کھٹکا کہ کہیں کوئی طوفان نہ آرہا ہو اور وہی ہوا۔ انھوں نے ہر لفظ پہ زور دے کر کہا، کیانی کیڈٹ آفیسرز ڈھیلے پڑ رہے ہیں۔ یوں کام نہیں چلے گا۔ صبح شام دو اضافی انسپکشن ہوں گے اور ان کے بعد ای ڈی، تا احکامات ثانی میں نے خاموشی سے انسپکشن کے اوقات لیے اور سیلوٹ کر کے باہر نکل آیا۔

دوسرے روز مقررہ وقت پر تاج بگلر نے روایتی شاندار انداز میں بگل کال دی (تاج بگلر بھی ایک کردار تھا۔ اس کے بگل کی اپنی ایک شان تھی) اور کیڈٹ آفیسرز وار میموریل کی طرف بھاگے۔ خدا خدا کر کے وہ لفظ سننے کو ملا جس کا شدت سے انتظار تھا یعنی "ڈسمس"، لیکن اس سے پہلے کہ ہم ڈسمس ہوتے پھر وہی آواز گونجی،

Put that cane drill right پھر اپنی جگہ کین ڈرل کو ٹھیک کرو

(بدقسمتی سے ہم کیڈٹ آفیسرز میں سے کسی نے ڈسمس ہوتے وقت اپنے کین کو اپنی بغل میں ۹۰ ڈگری کے زاویئے سے نہیں رکھا تھا۔ اور یہ فروگذاشت سٹیننگ کی عقابی آنکھوں کی گرفت سے نہ بچ سکی تھی) چنانچہ کین ڈرل کو سیٹ کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن وہ معیار حاصل نہ ہو سکا جب کمانڈانٹ سر کو جنبش دے کر کہتے یس دیٹس آل رائٹ۔

نتیجتہً صبح کی انسپکشن کے بعد کین ڈرل کی سزا کا اضافہ ہوا اور یہ بھی تا حکم ثانی۔ اب صورت یہ تھی کہ صبح پی ٹی کے وقت میموریل کے سامنے انسپکشن کے لیے حاضر ہوتے۔ پھر ای ڈی کرنے، اس کے بعد ڈرل سکوائر (موجودہ موسٹی ہال لائنز) میں کین ڈرل کے لیے فالن ہوتے۔ فرض یہ کیا جاتا جیسے سب پلاٹون کمانڈرز اور کمپنی کمانڈرز اپنی اپنی پلاٹونوں اور کمپنیوں کے آگے

رسمی پریڈ کے لیے کھڑے ہیں اور کین ڈرل کر رہے ہیں۔ اور میں ہیڈ بوائے کی حیثیت سے ان کی ڈرل کنڈکٹ کرتا اور یہ سلسلہ دیر تک چلتا۔

جیسے تیسے ایک ہفتہ اس طرح "کین ڈرل" کرتے گزرا تھا کہ ایک اور دھماکہ ہوا۔ اس دن ایک کیڈٹ، آفیسر ڈرل اسکوائر پہنچنے میں کوئی دس سیکنڈ لیٹ تھا۔ اسے آخری دس بیس قدم بھاگنا پڑا۔ سٹیبنگ نے جو اس موقع پر بھی حسب عادت ہم سے پہلے گراؤنڈ میں موجود تھے اس دس قدم بھاگنے کو نوٹ کیا اور دھاڑے "آفیسرز پریڈ پر جانے کے لیے بھاگا نہیں کرتے۔" پھر میری طرف رُخ کر کے کہا تم لوگ سست ہو گئے ہو۔ ٹھیک ہے۔ ۹۸ سنگ میل تک بھاگ کر جاؤ دونوں طرف سے، سکول شروع ہونے سے پہلے، مسٹر ریڈ سپروائز کریں گے۔ وار میموریل سے ۹۸ سنگ میل تک یہ کوئی چار میل کا فاصلہ بنتا ہے (جو چالیس منٹ میں طے کرنا ہوتا تھا) انسپکشن ڈرل اور اب یہ ۹۸ سنگ میل اس خیال سے کہ ہونہار افسر کہیں بیٹھ ہی نہ جائیں میں نے مودبانہ انداز سے فریاد کی "سر یہ ۹۸ سنگ" اس سے پہلے کہ میں جملہ پورا کروں انہوں نے کہا "بس ۹۶ ٹھیک رہے گا" میں پھر شروع ہوا۔ سر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ "۹۴ کافی ہو گا" انہوں نے میرا جملہ پورا کیا۔ ہر بار کی فریاد پر چار میل کا اضافہ ہو رہا تھا مختصر یہ کہ ان کی پدرانہ شفقت غالب آئی اور انہوں نے ۹۸ سنگ میل کی منزل کو قائم رکھا۔ ایک ہفتہ تک یہ سلسلہ چلا ان ایک حضرت کی وجہ سے جنہوں نے دس سیکنڈ لیٹ ہونے پر آخری دس پندرہ قدم بھاگ کر پریڈ میں شامل ہونے کی غیر افسرانہ حرکت کی تھی۔ ایک ہفتے تک ۹۸ سنگ میل تک کی اس بھاگ دوڑ میں سارجنٹ ریڈ کا کردار بھی مثالی رہا۔ اس تمام عرصے وہ بائک پر ہمارے ساتھ رہا لیکن ۴۰ گز پیچھے رہنے کا جو فاصلہ اس نے پہلے دن سے رکھا تھا وہ آخری دن تک قائم رہا۔ لیور پول (یوکے) کے اس این سی او نے پُر وقار سنجیدگی کا معیار قائم رکھا۔ کبھی کبھی ان کا نچلا ہونٹ پھڑکتا تھا جو ان کی عادت تھی۔

تربیت کا یہ سلسلہ دو ہفتہ چلا۔ اس وقت اور اس عمر میں، اس صبر آزما کڑی آزمائش کی افادیت کا احساس کیا ہوتا۔ اس کا ادراک تو آہستہ آہستہ زندگی کے گہرے اور وسیع تر تجربے کے بعد ہوا کہ سخت کوشی، جفا کشی، وقت کی پابندی، نظم و ضبط، ہنر رسی اور ذمہ داری کی صفات کردار اور کیریئر دونوں کے لیے از حد

ضروری ہوتی ہیں اور اس امر کا بھی شعور ہوا کہ کسی گروپ کو بہتر و برتر بنانے کے لیے لازمی ہے کہ پہلے اس کی لیڈر شپ کو بلند تر معیار پر لایا جائے۔ سٹیبنگ جو قدم اٹھاتے تھے اس کے پیچھے ایک واضح مقصد ہوتا تھا۔ کیڈٹ آفیسرز کی تربیت کے لیے یہ ایکسر سائز جو اس وقت ہمیں نہر لگی تھی ۴۴-۱۹۴۳ء میں ٹھیک اس وقت دی جا رہی تھی جب ملٹری سکول کا رول واضح طور پہ بدل رہا تھا۔ کرنل سٹیبنگ کے طریق تربیت کی بدولت، قابل فخر تھی۔ میرے تو وہ محسن، مربی سب کچھ تھے۔ ۱۹۳۹ء میں والد کی وفات[1] کے بعد انہوں نے مجھے بیٹا بنا لیا تھا۔ یوں تو کالج میں سب ہی ان کے بیٹے تھے۔

—— لیفٹیننٹ کرنل احمد خان ستارہ جرأت[1]

کمانڈانٹ کرنل سٹیبنگ کی نظر جزئیات پر رہتی تھی۔ وہ کسی کی چھوٹی سے چھوٹی فروگذاشت کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے میلی بنیان پہننے پر سزا دی۔ سٹیبنگ رات کو ڈارمز کا چکر لگاتے تھے اور چپلوں کا پالش تک چیک کرتے تھے۔ ایک بار وہ رات کو آئے اور میری غیر پالش شدہ چپل اٹھا کر لے گئے۔ صبح کو دفتر میں پیشی ہوئی اور حسب توقع مجھے میرے حصے کا انعام مل گیا۔ ایک بار انگریزی نہ بولنے پر میری چارج شیٹ بنائی گئی۔

—— میجر جنرل ممتاز علی ستارہ جرأت (دو بار)[2]

ڈسپلن سے جو ذرا بھی روگردانی کرتا یا چوں وچرا کرتا وہ گھر کا راستہ دیکھتا۔ ایک مرتبہ ذرا سی سرکشی پر چند لڑکے کالج سے خارج کر دیئے گئے اور انہیں ان کی یونٹوں میں سپاہیوں کی حیثیت سے بھرتی کرا دیا گیا۔ بعض اوقات سزائیں دلچسپ حد تک عبرت ناک ہوتی تھیں مثلاً یہ کہ ایک مرتبہ ایک لڑکے نے شارٹ کٹ کیا۔ ایک جھاڑی کو پھلانگتے ہوئے ایک اینٹ اکھڑ گئی شامت اعمال کمانڈانٹ نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ جب اسے دفتر میں پیش کیا گیا تو سامنے وہ اینٹ موجود تھی۔ کمانڈانٹ نے سزا یہ سنائی کہ تین دن تک تم یہ اینٹ ہر وقت اپنے ساتھ رکھو گے۔ اب بیچارہ جہاں جاتا اینٹ ساتھ لے جاتا۔ مسجد میں، کلاس میں، میس میں، ہاؤس میں، سوتے، آتے

---

[1] کالج نمبر ۸۴۲ زمانہ تعلیم ۴۳-۱۹۳۹ء [2] کالج نمبر ۸۵۶ زمانہ تعلیم ۴۵-۱۹۳۹ء

جاتے وہ اینٹ اس کے ساتھ ہوتی۔ عجیب مضحکہ خیز صورت تھی۔ بے چارہ اس اینٹ سے عاجز آگیا تھا۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس سختی کے پیچھے بھی ایک فلسفہ تربیت تھا۔ یہ ذاتی مزاجی تلخی یا برہمی کا نتیجہ نہیں تھی اور یہ سزا بے لاگ تھی۔ اس میں رعایت نہیں ہوتی تھی بلکہ سینئر کیڈٹس پر زیادہ سختی تھی۔ اتفاقاً یا بدقسمتی سے ایک بار میں نے بے حساب بید کھائے گویا لکل بے قصور تھا۔ جب ہم کیڈٹ آفیسرز میس میں رہتے تھے وہاں ایک کیپٹن کوارٹر ماسٹر ہماری کٹ چیک کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب کٹ چیک ہونے لگی تو مجھے پتہ چلا کہ میرے پاس تو ایک موزے کا جوڑا کم ہے۔ کٹ کی کسی چیز کو کھو دینا اور گم شدگی کی رپورٹ نہ کرنا قابل سزا جرم تھا میں اسی پریشانی میں تھا کہ اب کیا کیا جائے کہ میرے ساتھی خالد نے پوچھا کیا بات ہے میں نے اسے بتایا کہ موزے کا ایک جوڑا نہیں مل رہا ہے۔ اس نے کہا میرے پاس ایک فالتو جوڑا ہے تم اس سے کام چلاؤ۔ پھر مجھے واپس کر دینا۔ لیکن یہ نہ بتانا کہ یہ جوڑا میرا ہے میں نے کہا ٹھیک ہے تم مجھے لون دے دو میں تمہارا نام نہ لوں گا۔ جب کوارٹر ماسٹر ہیڈ بوائے کے ساتھ کٹ چیک کرنے آئے تو حسن اتفاق سے ان کی نظر تو نہ پڑی لیکن ہیڈ بوائے نے دیکھ لیا کہ موزے پر خالد کا نمبر ہے۔ اور کمانڈانٹ کو رپورٹ ہو گئی۔ خالد نے مجھ سے کہا میرا نام نہ لینا۔ میں نے کہا میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ صبح پیشی ہوئی کرنل سٹیبنگ بہت غصے میں تھے بار بار کہتے تھے ممتاز تم نے ایسا کیوں کیا بغیر اجازت کسی کی چیز کیوں اٹھائی وغیرہ وغیرہ۔ کافی جھاڑ پڑی اور حکم ہوا شام کو چار بجے بنگلہ پر رپورٹ کرنا۔ اس رپورٹ کے معنی سب کو معلوم تھے کہ سٹیبنگ کا طریقہ کار تھا کہ جونیئرز کو دفتر میں سزا دیتے تھے اور کیڈٹ آفیسرز کو بنگلہ پر بلاتے تھے اور اس کا وقت بھی مقرر تھا۔ جب میں بنگلہ پر پہنچا بیگم کرنل سٹیبنگ سے ملاقات ہوئی۔ بیگم سٹیبنگ بڑی شفیق خاتون تھیں۔ کیڈٹ آفیسرز کی بڑی خاطر تواضع کرتی تھیں اور بہت محبت سے پیش آتی تھیں۔ بہر حال اس وقت تو موقعہ دوسرا تھا۔ جوں ہی میں نے ڈرائینگ روم میں قدم رکھا کرنل سٹیبنگ نے دو ایک سوالات پوچھے میں کیا جواب دیتا۔ چپ رہا۔ انہوں نے کہا بینڈ ڈاؤن۔ میں جھک گیا پھر تو اللہ دے اور بندہ لے کتنے بید پڑے ان کا شمار مجھے یاد نہیں جب میرے اوسان بحال ہوئے تو بیگم سٹیبنگ نے مجھے جوس کا ایک گلاس پلایا۔ اس کے بعد کرنل سٹیبنگ نے مجھے سمجھایا اگر تمہیں افسر بننا ہے تو اس قسم کی

خامیوں سے اپنے آپ کو پاک کرنا ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب سٹیبنگ کا دوسرا رخ دیکھئے۔ جب میں سلیکشن بورڈ کے سامنے جانے سے پہلے ڈاکٹری کے لیے آئی ایم ایچ جہلم گیا تو ایک انتہائی متعصب ہندو ڈاکٹر نے گلے کی خرابی کا بہانہ بنا کر مجھے فیل کر دیا۔ میں بہت مایوس ہوا اور واپس آکر خاموشی سے اپنے کمرہ میں لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک دوست نے جھنجوڑ کے اٹھایا۔ تم یہاں منہ لپیٹے لیٹے ہو اور کمانڈانٹ کرنل سٹیبنگ تمہیں سائیکل پر سارے کالج میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ دوسرے روز سٹیبنگ نے مجھے ایک میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش کر دیا اور بورڈ نے خوب تفصیلی معائنہ کر کے فٹ قرار دے دیا۔ ورنہ ہندو نے تو ڈنڈی مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

——— لیفٹیننٹ کرنل اصغر علی راجہ، ستارہ جرأت

۱۹۴۶ء کی بات ہے میں ایف ایس سی سیکنڈ ائیر میں تھا۔ سائنس کا پیریڈ تھا۔ مسٹر نندلال فزکس پڑھا رہے تھے کہ کالے خاں اردلی نے ایک چٹ لاکر ان کو دی کہ ۸۷۸ کو کرنل صاحب بلا رہے ہیں۔ مسٹر نندلال نے مجھے اشارہ کیا کہ جاؤ۔ میں دفتر میں گیا تو کرنل سٹیبنگ نے کہا تمہیں آئی ایم اے کے لیے درخواست دینی ہے، آئی ایس ایس بی کے سامنے جانا ہے۔ میں چپ ہو گیا تو وہ بولے کیوں کیا بات ہے؟ میں نے کہا سر، چند ماہ میں ایف ایس سی کا امتحان۔ ابھی میں نے جملہ پورا نہیں کیا تھا کہ وہ کرسی سے کھڑے ہو گئے ہر لفظ پر زور دے کر کہا۔

Here we are producing officers not Baboos

کرنل سٹیبنگ صبح سویرے ہر موسم میں ہفتہ میں ایک بار کیڈٹ آفیسرز کی سوئمنگ کراتے تھے گرمیوں میں تین اور جاڑوں میں ایک، کرنی پڑتی تھی۔ جاڑوں میں خود بھی سوئمنگ پول میں چھلانگ لگاتے تھے۔ سٹیبنگ نے کالج کا بیج بائیں کندھے پر کھدوا رکھا تھا۔ گرمیوں میں صرف نیکرس میں سبز رنگ کی ریلے سائیکل پر گھومتے رہتے تھے۔ دو السیشین کتے ساتھ ہوتے تھے۔ مہینہ میں ایک بار آئی ایم ایچ جہلم کا بڑا ڈاکٹر آتا تھا۔ سٹیبنگ ہر لڑکے کا معائنہ اپنے سامنے

سلہ کالج نمبر ۱۰۱۸ زمانہ تعلیم ۴۶-۱۹۴۲ء۔

کرواتے تھے۔ جو لڑکے کمزور ہوتے ان کے لیے سپیشل ڈائٹ لگواتے تھے۔ ایک اور بات،
یاد آئی۔ انوار کو سٹیبنگ جہلم چرچ میں جاتے تھے اور لڑکوں کو آنے جانے میں لفٹ دیتے
تھے۔ کرنل سٹیبنگ کو ٹوٹی پھوٹی اُردو بھی آتی تھی۔

——— میجر جنرل غلام محمد[1]

اس پورے نظام کا بنیادی مقصد لیڈر شپ کی تربیت تھا ——— کرنل سٹیبنگ
Perfectionist تھے۔ وہ ہر چیز کو انتہا تک لے جاتے تھے۔ ان کے طریق
انتظام میں ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کوئی چیز اتفاق Chance پر نہیں چھوڑتے تھے انباٹ
وہ تفصیل (Details) کی تفصیل میں جاتے تھے۔ یہی چیز میں نے ان سے سیکھی۔
ان کی کمانڈ کے آخری ہفتے میں ۱۴ اگست کی پریڈ کے سلسلہ میں جو قابل افسوس واقعہ ہوا
تھا وہ ان کے لیے ذاتی طور پر ایک ٹریجڈی سے کم نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے پریڈ
کی سلامی بڑے ذوق و شوق سے لی اور کالج کی لاگ بک میں اس کا تذکرہ بڑے فخر و انبساط سے
کیا۔ اس واقعہ کے تین سال بعد کالج کے میگزین تربیت کے سلور جوبلی کے لیے اپنے مضمون جہلم
کی یادوں Jhelum Memories میں نہ صرف انہوں نے اس حادثہ کا ذکر
تک نہیں کیا بلکہ ۱۴ اگست کی پریڈ کو ان الفاظ میں یاد کیا:

It was my privilege to be present and take the salute at the final ceremonial parade of my command on August 15, 1947, in honour of the creation of Pakistan, I can honestly say it was one of the most moving moments of my life. Though carried out at the short notice, and with comparatively little rehearsal, the parade was one of the smartest I can remember, and even more, three years after the event, I can see the pride and enthusiasm

---

[1] کالج نمبر ۸۸۵۔ زمانہ تعلیم ۴۶-۱۹۳۱ء۔ کالج ہیڈ بوائے اور گارڈنر میڈل ونر ۴۶-۱۹۴۵ء۔ رہلال امتیاز۔

of the youth of a new born nation as the cadets marched past the saluting base, and their newly unfurled flag with a step and precision which it would be hard to beat, while I watched, hopes of the future crowded in my mind.........

The cadets of King Georges' Royal Pakistan Military College should remember that the noblest use to which they can turn the education received here is to the upholding of the great traditions of loyalty, partiotism and service, which was passed down to them by their fathers. They carry with them the idea of service to their new and great country of Pakistan coupled with an obligation to pass on those less fortunate than themselves, the benefits of education they receive at Sarai Alamgir.

یہاں میں یہ بھی ریکارڈ پر لانا چلوں کہ کالج کی لاگ بک میں انہوں نے پریڈ کا ذکر کرنے سے پہلے تخلیق پاکستان کے ضمن میں قائداعظمؒ کا ذکر مشرق کی بلند قامت شخصیت کہہ کر کیا۔ کالج لاگ بک کا تقریباً تین چوتھائی صفحہ معمارِ پاکستان کی عظمتوں کے ذکر سے ہی بھرا تھا جس انداز اور جن مؤثر الفاظ میں انہوں نے یہ ذکر کیا وہ ان کے قلم کے حسن کا ہی نہیں ان کی منصبی دیانت، وفا شعاری اور ذہنی فراست کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

آخر میں، میں جناب سٹیبنگ کا وہ تعزیتی خط بھی نقل کرنا چاہوں گا جو انہوں نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کی شام راولپنڈی میں وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان کے قتل کی خبر سن کر اس وقت کے کمانڈانٹ کرنل زیدی کو لکھا تھا:

Tel: 7511

From: Lt.Col.T.H.L.Stebbing,
3 Coastguard Cottages,
Daddy Hole Plain,
TORQUAY. U.K.

Oct. 16 '51.

My dear Colonel Zaidi,

I feel I must offer all at the K.G.R.P.M. College my sincere and deep sympathy with you all in the great sorrow which has been thrust upon you by the appalling crime which has caused the death of your beloved and distinguished Prime Minister who has meant so much to your country in its struggle since the death of the Great Leader so soon after the birth of the New State.

We have only just heard the news on the Radio and both I and my memsahib want you and the Cadets of the Royal College to know how very much our thoughts are with you all in the sadness which we know would have come over the College.

Our prayers are with you and the College you have the honour to command, and we only trust that in your grief you may be inspired to the service of others as was your great and beloved Premier, and that the cadets may never forget the duty which they owe to his memory in showing an even greater zeal to devote their lives to the service of their College and Country.

Yours sincerely,

Sd/-
(Lt. Col. (Retd)

To: Lt. Col. S.F.H.Zaidi,
Commandant,
K.G.R.P.M. College (Jhelum)
Sarai Alamgir,W. Punjab.

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد فرید ملک

یہ واقعہ اواخر ۱۹۴۴ء کا ہے۔ میں سکینن ہاؤس میں سی۔ایس۔ایم تھا اور نمبر ۸۱۶ —— محمد یوسف سی۔کیو۔ایم۔ایچ، ایک دن کلاسز کے دوران غسل خانے کا کوئی نلکا کھلا رہ گیا تھا اور پانی بہہ رہا تھا۔ کرنل سٹیبنگ نے چیک کر لیا۔ ہاؤس کے تمام عہدیداروں کو اس کی اجتماعی سزا یہ ملی کہ صبح سویرے ریوالی ہونے سے پہلے سب اپر جہلم کینال کے کنارے راجڑ تک جائیں وہاں پی۔ٹی کٹ اتار کر سومنگ کاسٹیوم میں ٹھنڈے پانی میں پانچ منٹ سومنگ کریں سومنگ کے بعد پھر پی ٹی کٹ پہنیں اور پھر بھاگ کر آئیں۔ اتنی جلدی کہ صبح کی پی ٹی میں بروقت شامل ہو سکیں۔ یہ سزا ایک انگریز سارجنٹ کی نگرانی میں سرانجام پاتی تھی۔ یہاں یہ یاد رہے کہ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ ابھی منگلا ڈیم نہیں بنا تھا اور نہر کا پانی براہِ راست دریائے جہلم سے آتا تھا۔ اور جہلم میں کشمیر کے فلک بوس پہاڑوں کے برفانی چشموں کا پانی بہہ کے آتا تھا۔ یہ سزا صرف ایک بار ایک ہفتے کے لیے دی گئی تھی۔ سزا کے آخری دن کرنل سٹیبنگ نے خود سزا کی نگرانی کی اور نہ صرف نگرانی کی بلکہ سزا یافتوں کے ساتھ خود بھی پانچ منٹ اسی دسمبر کے ٹھنڈے یخ پانی میں سومنگ کی۔ میں اس واقعہ پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

یہ واقعہ اگست ۱۹۴۵ء کا ہے۔ سکینن ہاؤس میں سی ایس ایم تھا۔ اور ڈیوٹی پر لیفٹیننٹ آف دی ویک کہ یکایک بادل گھر کے آئے اور تیز بارش شروع ہو گئی پھر جس تیزی سے بادل آئے تھے چھٹ بھی گئے۔ بارش کے تھمتے ہی کمانڈانٹ میجر سٹیبنگ کا اردلی خلاف معمول ہاؤس میں آیا اس کے ہاتھ میں ایک چٹ تھی جس پر سرخ پنسل سے لکھا تھا۔ ۹۰۱ فرید، چٹ دے کر اس نے یہ بھی کہا صاحب ابھی بلاتا ہے۔ چنانچہ میں اسی طرح ساتھ ہو لیا۔ چٹ دیکھ کر میں کچھ کھٹک تو گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ بنگلہ پر پہنچتے ہی سٹیبنگ نے حکم دیا بینڈ ڈاؤن اور اپنے روایتی چھ بید رسید کر دیئے میں حیران کہ ہوا کیا ہے۔ چھٹے بید کے بعد جب سٹیبنگ نے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو پوچھا ۹۰۱ پتہ ہے بید کیوں لگے ہیں؟ تو میں نے کہا "جی نہیں سر" بولے تم آج فلیگ ڈیوٹی پر تھے۔ کیا تم نے بارش آنے سے پہلے فلیگ اتارا تھا؟ ان کے یہ کہنے پر مجھے یاد آیا کہ

واقعی جھنڈا اتارنا تو میں بھول ہی گیا تھا۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں نے معذرت خواہانہ لہجہ میں آئی ایم ساری، سر کہا اور سر جھکا لیا۔ یہ دیکھ کر وہ کچھ پسیجے اور کہا ”جھنڈے کو بارش میں نہ اتارنا جھنڈے کی توہین ہے۔ آئندہ کبھی ایسا نہ کرنا۔“

——— لیفٹیننٹ کرنل رحیم اللہ[1]

سٹیبنگ سگریٹ بہت پیتے تھے۔ ایک آدھ بار انہیں سگار بھی پیتے دیکھا۔ اکثر ہفتے کی شام کو مسز کے ساتھ کالج کے باہر روڈ پر (اب اکرم شہید روڈ) پر چہل قدمی کے لیے نکلتے تو ایک براؤن رنگ کا السیشن کتا بھی ساتھ ہوتا۔ ان کے پاس دو کتے تھے۔ سٹیبنگ کے بنگلہ پر سرکاری بیٹ مین کے علاوہ ان کے تین ذاتی نوکر تھے ایک باورچی ایک ویٹر جو ہر وقت باقاعدہ ویٹر کی وردی میں ملبوس مہمانوں کی میزبانی کے لیے مستعد رہتا تھا۔ تیسرا ایک بوڑھا مالی تھا جس کی چھوٹی سی خشخشی داڑھی تھی جس نے پورے بنگلہ کو چمن بنا رکھا تھا۔ یہی مالی ان کے کچن گارڈن کا انچارج بھی تھا۔ سٹیبنگ سہ پہر کو سبزی کی کیاریوں کا چکر بھی لگاتے تھے۔ بنگلہ کے پچھواڑے ایک طرف کو مرغی خانہ تھا۔ ٹرکی اور بطخیں بھی پالی ہوئی تھیں۔ ایک گوشہ کبوتروں کے لیے مخصوص تھا۔ مشہور تھا کہ سٹیبنگ نوکر کو چالیس روپے ماہوار دیتے ہیں جو اس زمانے کے لیے خاصی رقم تھی۔ ہر اتوار کو نو دس بجے دونوں میاں بیوی کار میں چرچ کو جاتے تھے۔

کیننگ کے لیے سٹیبنگ نے دفتر کی الماری میں چار پانچ قسم کے بید رکھے ہوئے تھے۔ بید مارنے کا ان کا اپنا خاص Ritual تھا۔ ایک ڈرل تھی۔ بڑے اہتمام سے کیننگ کرتے تھے۔ کیننگ کے وقت کالج ہیڈ بوائے اور کمپنی کمانڈر موجود ہوتے تھے۔ بنگلہ پر بھی کیڈٹ آنرز کی تواضع کے لیے چار پانچ قسم کے بید رکھے ہوئے تھے۔ سٹیبنگ کلاسز کے دوران برآمدہ کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر سنتے کہ کیا اور کیسے پڑھایا جا رہا ہے۔ لیکن کبھی کلاس روم کے اندر نہیں آئے کبھی کبھی انگریزی کی کاپیاں کمانڈانٹ کے دفتر میں منگوائی جاتی تھیں۔

سٹیبنگ کے پاس ڈریس تو تقریباً ہر علاقے کے تھے لیکن رات کو وہ عموماً پشاوری کلاہ لنگی میں نکلتے تھے۔ ایک ہاتھ میں چھڑی ہوتی دوسرے میں ٹارچ۔

[1] کالج نمبر ۹۰۸ زمانہ تعلیم ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۸ء۔

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد یعقوب ملک ستارہ جرأت[۱]

کرنل سٹیبنگ کا ذکر آجائے اور ان کے عہد کا کوئی طالب علم ان کو یاد کیے بغیر آگے بڑھ جائے۔ ناممکن، سوچنے کی بات ہے۔ سٹیبنگ باہر کا آدمی تھا۔ انگریز، غیر ملکی سلطنت برطانیہ کا وفادار اور یہ نہیں کہ فرشتہ ہو، اس میں خامیاں بھی تھیں پھر کیا وجہ تھی کہ اس کا اتنا زبردست اثر پڑا کہ جو ہے سٹیبنگ، سٹیبنگ کرتا ہے۔ اس مسئلہ پر میں نے اپنی کرنیلی کے زمانے میں بہت غور کیا جس نتیجے پر میں پہنچا وہ عرض کرتا ہوں۔

شعوری اور لاشعوری طور پر یقین تھا کہ یہ شخص مخلص ہے۔ ہماری بھلائی چاہتا ہے۔ کوئی اس پر ریاکاری کا شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے مقاصد محدود تھے ذہن کو سوچنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ طلبا کی تخلیقی قوتوں کے پروان چڑھنے اور انفرادیت کے اظہار کی سہولتوں کا فقدان تھا۔ لیکن جفاکشی، ذمہ داری، جرأت، دیانت اور وفاداری کی قدروں کو اس باکمال شخص نے ہمارے کردار کی بنیاد بنا دیا۔ باکمال میں نے اس لیے کہا کہ اس میں لیڈر شپ کی اتنی قوت اور صلاحیت تھی کہ اس نے ان قدروں کی تربیت کے لیے ایک سسٹم یا نظام زندگی وضع کیا اور اس نظام میں جان ڈالی۔ ایک اچھے لیڈر کی طرح سب سے پہلے خود اس کی مثال قائم کی۔ جو کہتا وہ کر کے دکھاتا۔ یہ معمولی بات نہیں۔ سٹیبنگ میں یہ خوبی تھی کبھی کبھی جاڑوں میں سومنگ پول کے ٹھنڈے یخ پانی میں کیڈٹ آفیسرز کو ڈبکی لگانے کی سزا یا مشق کا حکم ملتا تھا تو جناب سٹیبنگ بھی وہاں موجود ہوتا بلکہ خود تیرتا۔ صبح بہت سویرے ریوالی کے فوراً بعد کیڈٹ آفیسرز کا انسپکشن فلیگ سٹاف پر ہوتا تھا۔ مجال ہے کہ کبھی سٹیبنگ کو وہاں ایک منٹ کی بھی دیر ہو جائے۔

یوں تو سارے انسان ہی انصاف اور دیانت داری کو پسند کرتے۔ حضرت علی مرتضیٰؓ کا قول ہے کہ کفر سے تو حکومت قائم رہ سکتی ہے لیکن بے انصافی سے نہیں یہ بات ہر سطح کے صاحب اختیار لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے۔

---

[۱] کالج نمبر ۱۷۱۹ زمانہ تعلیم ۴۹-۱۹۴۱ء

تومختصر یہ کہ سٹیبنگ میں یہ صفات نہیں جن کی وجہ سے وہ اتنا مقبول تھا مقبولیت ذات سے نہیں صفات سے ہوتی ہے۔ سٹیبنگ میں کوئی اور سرخاب کا پر نہیں لگا تھا اگر تھا تو یہی جفاکشی، خلوص، دیانت، ایثار کا پر۔

——— شہزادہ ہارون اسماعیل[1]

۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے کہ برڈ ووڈ ہاؤس کا ایک جے۔ پی گل خان بغیر اجازت رات کو جہلم شہر میں ایک اُردو فلم سکندر اعظم دیکھنے گیا جس میں پرتھوی راج اور جینتی مالا نے کام کیا تھا۔ واپسی کی فکر ہوئی۔ اس وقت تانگے کہاں، ناچار پیدل ہی روانہ ہوا ابھی جہلم کو نصف بھی پار نہیں کیا تھا کہ اوپر سے سٹیبنگ پہنچ گئے وہ جہلم کلب سے واپس آرہے تھے۔ گل خان کو دیکھتے ہی گاڑی روکی اور اسے بٹھا لیا۔ لیکن اس سے کوئی خاص بازپرس نہیں کی۔ جب اُسے برڈ ووڈ ہاؤس کے گیٹ پر اتارا تو اس نے خود ہی بتا دیا سر میں ایک اردو فلم سکندر اعظم دیکھنے جہلم گیا تھا۔ انھوں نے صرف اتنا کہا کہ کل چار بجے اس فلم پر جو تم نے دیکھی ایک ہزار الفاظ پر مشتمل ایک مضمون لکھ کر دکھانا۔ گل خان بھی بڑے حوصلے کا تھا۔ آرام سے جا کے سو گیا۔ صبح کلاس میں تھا۔ ۱۲ بجے کے بریک کے وقت اس نے کلاس ماسٹر سارجنٹ ٹالبٹ سے ریڈنگ روم میں جاکر مضمون لکھنے کی اجازت مانگی۔ اجازت لے کر وہ شیر مضمون لکھنے بیٹھ گیا۔ اور چار بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے وہ مضمون مکمل کرکے کمانڈانٹ کے دفتر کے سامنے پہنچ گیا ٹھیک چار بجے سٹیبنگ آئے تو اس نے ہزار نہیں پندرہ سو الفاظ پر مشتمل سکندر اعظم فلم پر لکھا ہوا مضمون ان کے حوالے کیا، میجر وائیک نے جو اُردو سمجھ سکتے تھے۔ فلم دیکھی اور پھر اس مضمون کو چیک کیا اور ۹ غلطیاں نکلیں۔ سٹیبنگ نے وہ مضمون نوٹس بورڈ پر لگوا دیا اور لکھا کہ ۱۵۰۰ الفاظ کے اس مضمون میں ۹ غلطیاں ہیں۔ شاباش بعد کو یہ مضمون فوجی اخبار دہلی میں چھپا۔ اسی مضمون کی بنیاد پر ۲۶ گل خان کو سینئر پریفکٹ پروموٹ کر دیا گیا بلکہ اسے خصوصی اجازت بھی ملی کہ وہ مہینے میں دو بار رات کو جہلم میں جاکر کوئی فلم دیکھ سکتا ہے۔

---

[1] کالج نمبر ۹۹۲ زمانہ تعلیم ۱۹۴۱ تا ۱۹۵۰ء

۴۲ء کا واقعہ ہے کہ میں برڈووڈ ہاؤس کی سیکشن نمبر ون میں سیڑھی پر چڑھا روشندان کے شیشے صاف کر رہا تھا کہ اوپر سے پھسل پڑا۔ سیڑھی کے ایک ڈنڈے سے منہ ٹکرایا اور نیچے آپڑا جب مجھے ہوش آیا تو میں کالج اسپتال میں تھا اور سٹیبنگ، اور مسز سٹیبنگ، اور کچھ سٹاف کے لوگ کھڑے تھے۔ پہلا فقرہ جو میں نے سنا وہ سٹیبنگ کا کہ "ہارون تم ٹھیک ٹھاک ہو، پریشان نہ ہو" اور مسز سٹیبنگ کا مہربان ہاتھ میرے سر پر تھا۔ میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن محسوس ہوا کہ سامنے کے دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ زبان زخمی ہے۔ ہونٹ بھی کٹ گیا ہے۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر اور عملے نے جو دیکھ بھال کی وہ تو کی ہی مسز سٹیبنگ مجھے دن میں کئی بار آئس کریم اپنے ہاتھوں سے کھلاتی تھیں۔ جب ذرا ٹھیک ہوا تو ایک آدھ بار بنگلے پر بھی یہ کہہ کر لے گئیں "چلو ہارون، تمہیں سیر کراتے ہیں" اور پھر کھلا پلا کر واپس لے آئیں۔ ایسے لوگوں کو کوئی بھولے تو کیسے بھولے۔

یہ تو ایک واقعہ تھا۔ جس طرح اس نے تربیت کی اس کا نقش آج تک دل پر ہے۔ جس وقت میں نے سٹیبنگ کے انتقال کی خبر سنی تو بے اختیار میرے دل سے یہ دعا نکلی وہ غیر تھا عیسائی تھا جو کچھ تھا یا اللہ اسے بخش دے، بخش دے!

آخر میں ایک اور واقعہ بھی لکھتا ہوں تاکہ سٹیبنگ کے کردار کا یہ رخ بھی ریکارڈ پر رہے۔

یہ واقعہ ۱۹۴۶ء کا ہے۔ رسالدار میجر راؤ عبدالوہاب نے شکار پر جانے کا پروگرام بنایا۔ شکار پارٹی میں لڑکوں کے علاوہ ایک سکھ صوبیدار بھی تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے کمانڈانٹ کی رسمی اجازت لینے وہ دونوں کمانڈانٹ کرنل سٹیبنگ کے پاس گئے تو سٹیبنگ نے کہا میرے لیے وہ شکار لانا جو باقاعدہ ذبح کیا گیا ہو۔ (صوبیدار گلاب سنگھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ان کا مارا ہوا مجھے نہ بھجوانا یہ بات ہمیں خود راؤ وہاب صاحب نے بتائی۔

——— بریگیڈیئر محمد صادق خان[۱]

سٹیبنگ کا ذکر آنے پر اکثر لوگ پہلے ان کی سختی اور سزاؤں کا ذکر کرتے ہیں لیکن دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ سزائیں کس چیز کی اور کس گہرائی میں جا کے دیتے تھے اور اس سلسلے میں ان کا طریق کار

[۱] گورنر انسپکشن ٹیم پنجاب کالج نمبر ۹۹۳ زمانہ تعلیم ۴۹-۱۹۴۲ سابق چیئرمین

کیا تھا۔ واضح رہے کہ ان کا مقصد سائنس دان یا ریسرچ سکالر پیدا کرنا نہیں تھا۔ وہ آرمی کے لیے لیڈر پروان چڑھا رہے تھے جو جنگ میں اپنی ذمہ داری کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کر سکیں۔ چونکہ اس مشن کو بروئے کار لانے کے لیے ایک خاص قسم کے لائف سٹائل، ذہنی اور جسمانی تاب و توانائی کی ضرورت تھی اس لیے انہوں نے ایک ایسا نظام (سسٹم) وضع کیا جس سے جفاکشی کی عادت اور سخت کوشی کا رویہ پیدا ہوا۔ اور ایک کیڈٹ کی تربیت کا پورا Orientation ذمہ دار (Responsible) ہونے کی طرف ہو۔ ان کا سزا جزا کا نظام اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔

مجھے یہ تو معلوم ہے کہ انہوں نے کیمبرج سے ہسٹری میں ٹرائی پاس لیا تھا۔ لیکن یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ قدیم یونانی تاریخ اور فلسفہ نے ان کے اپنے ذہنی تصورات کی تشکیل میں کیا کردار ادا کیا تھا۔ لیکن ان کے طریق کار سے اتنا نتیجہ ضرور نکالا جا سکتا ہے کہ وہ افلاطون کے تصور عدل اور سپارٹا کے طریق تربیت پر ضرور ایمان رکھتے تھے۔ وہ Integrity کے ساتھ احساس ذمہ داری کو لیڈر شپ کی سب سے بڑی صفت سمجھتے تھے۔ اس کالج کی ہسٹری میں ان سے پہلے یا ان کے بعد کوئی ایسا پرنسپل نہیں گزرا ہے جس نے راشن رجسٹر میں ایک اندراج کو برش سے مٹا کر اس پر دوبارہ ہندسے لکھنے Overwriting کرنے پر کسی جونیئر پریفکٹ آن ڈیوٹی کی باز پرس کی ہو؟ اور اس کو قابل تعزیر سمجھا ہو۔ یہ میرے ساتھ ہوا اور اس کے لیے میری کیننگ کی جھنڈا ایک منٹ دیر سے چڑھانا ہو یا کچن ڈیوٹی پر باہر کسی دوست سے دو باتیں کرنا، یا اپنی بیلٹ کو چمکا کے نہ رکھنا۔ وہ غیر ذمہ داری کے چھوٹے سے چھوٹے پہلو پر گرفت کرتے تھے اور اسکی سزا دیتے تھے۔ اس میں Erratic بالکل نہیں تھے کہ کبھی بڑی سے بڑی غیر ذمہ داری کو نظر انداز کر دیا اور کبھی چھوٹی بات پر دھر لیا جائے۔ ایسا بالکل نہ تھا۔

مختصر یہ کہ وہ جان مارنے، جزئیات میں جا کر کام کرنے اور انتہا درجے کا معیار حاصل کرنے کی جو کرداری صفات پیدا کرنا چاہتے تھے وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے اور اس کا ثبوت ملٹری کالج کے وہ تمام اولڈ بوائز ہیں جنہوں نے ان کے ہاتھوں تربیت پائی۔ ان کے زمانے میں اگر ایک بگلر بھی تھا تو وہ بھی اپنے کام میں طاق تھا۔ ڈھیلے آدمی کی کالج کے احاطے میں کوئی جگہ نہیں

تھی۔ کالج میں ہر وقت ہر چیز اپنے مقررہ وقت، انداز سے رواں تھی اور اسکی Moving spirit وہ خود تھے۔ سخت گرمیوں میں بغیر قمیض یا بنیان کے صرف شارٹس میں ریلے سائیکل پر اگر صرف ایک بندہ ادھر سے ادھر جاتا نظر آتا تو آپ یقین سے کہہ سکتے تھے یہ سٹیبنگ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر بے حد Demanding تھے تو اپنے لیے بھی کم سخت نہیں تھے۔ ان کا اپنا احساس ذمہ داری (Commitment) اس درجے کا تھا کہ کٹ میں ہر لڑکے کی چپل اور سائڈ کیپ کی فٹنگ تک اپنے سامنے کراتے تھے۔ سہ ماہی کٹ منیلشن پریڈ پر ایک ایک آئٹم کو خود دیکھتے تھے۔ صرف میلی بیلٹ ہی نہیں، مانگی ہوئی بیلٹ پہننے پر بھی گرفت کرتے تھے۔ ریوالی سے بہت پہلے دودھ کے ایشو سے لے کر لائٹس آوٹ کے بعد مچھر دانیوں تک کی چیکنگ خود کرتے۔ ان کا کوئی Vested interest نہ تھا اور نہ وہ کسی دباؤ کو قبول کرتے تھے۔ سٹیبنگ کی شخصیت کا یہ پہلو بہت ہی زیادہ Inspiring تھا۔

لیکن یہ تصویر کا صرف ایک پہلو ہے۔ دوراندیشی کے ساتھ لڑکوں سے ہمدردی بھی بے حد وحساب تھی۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ داخلہ کے وقت انہوں نے میری عمر جو کاغذات میں اندازے سے درج تھی حساب لگا کر ایک دو سال کم لکھ دی۔ اس طرح ایک نہیں بہت سے لڑکوں کی عمر کم کر کے لکھی۔ مقصد یہ تھا کہ یہ بچے دیہات سے آرہے ہیں ان کی ابتدائی تعلیم کچی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مقررہ نصاب مقررہ مدت میں پورا نہ کر سکیں۔ یہ رعایت خصوصاً ان کو ملتی جو قد بت سے چھوٹے نظر آتے لیکن جن کی عمر اس لحاظ سے زیادہ لکھی ہوتی یہ ان کی دوراندیشی اور Personal interest کی ایک مثال ہے۔ ان کی دوراندیش ہمدردی کی ایک مثال یہ ہے کہ وہ ان سینئر پریفکٹس پر جن کو وہ براہِ راست کنگز کالج یا کمیشن کے لیے بھیجنا چاہتے تھے زیادہ سختی کرتے تھے اور ان کی ذرا سی فروگذاشت کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ وہ اس کلاسیکی فارمولے پر عمل پیرا تھے کہ زیادہ ذمہ داری زیادہ اختیار اور بالآخر زیادہ احتساب اب جب کہ ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں Accountability بازپرس اور احتساب کا عملی شدید ترین دباؤ میں ہے۔ اور کہیں کہیں تو بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ سٹیبنگ کا بے خطا نظام احتساب بہت یاد آتا ہے۔ ابھی میں نے کہا ہے کہ وہ اپنے سینئر کیڈٹ آفیسرز کا سختی سے احتساب کرتے تھے۔ یہ ان

کے فلسفۂ تربیت کا ایک بنیادی اصول تھا۔ دوسرا بدیہی اصول یہ تھا کہ طلبار کو زیادہ سے زیادہ ذمہ داری دی جائے اور زیادہ سے زیادہ خود کاری (Initiatives) کا موقع دیا جائے۔ اس کا ایک طریقہ یہ تھا کہ کالج میں جب بھی کوئی دی آئی پی آتا اس کی پذیرائی کالج ہیڈ بوائے ہی کرتا۔ کیڈٹ ٹو آئی سی اور کیڈٹ ایجوٹینٹ کم ازکم یہ تین مہمانوں کے ساتھ رہتے۔ اس وقت میرے سامنے ۱۹۴۳ء میں آکنلک ہاؤس کے افتتاح کے وقت فیلڈ مارشل آکنلک اور دوسرے مہمانوں کی پارٹی کے وقت کا ایک فوٹو ہے۔ آکنلک کے ساتھ کی کرسی پر میزبان خصوصی کے طور پر ہیڈ بوائے کی کرسی ہے۔ پھر کمانڈانٹ کی، ان کے ساتھ لیڈی آکنلک مسز سٹیبنگ کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو آئے تھے۔ ان کے استقبال میں بھی ہیڈ بوائے پیش پیش تھا۔ یہ سب کچھ ایک منصوبے کے ساتھ تھا کہ سینئر کیڈٹس کو زیادہ سے زیادہ ابھارا جائے۔

یہاں جمعے اور مغرب کی نماز روز اوّل سے لازمی چلی آ رہی ہے۔ لیکن اس کو کمانڈانٹ کی کی پریڈ سٹیبنگ ہی نے بنایا۔ وہ ہر جمعے کو سارے لڑکوں کے نماز کے لباس اور صفائی کا انسپکشن خود کرتے تھے میرا خیال ہے کہ ان دنوں تمام ملک میں جمعہ کی نماز کے لیے سب سے صاف ستھرے لڑکے ملٹری کالج ہی کے ہوتے ہوں گے۔

اب ان چند باتوں کا ذکر کروں گا جن کا سٹیبنگ کے سلسلہ میں کم ذکر آتا ہے لیکن جن کا کریڈٹ انہی کو جاتا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ سکول کے نصاب کی توسیع و ترقی کی کوشش سب سے پہلے انہی نے کی۔ یہاں ۱۹۴۰ء سے پہلے سائنس کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ سٹیبنگ ہی نے ۱۹۴۰ء میں ایک مستند سائنس گریجویٹ مسٹر وزیر خان ملک، (بعد میں کرنل اور سکول آف آرمی ایجوکیشن مری کے کمانڈانٹ اور پی ایم اے کے ڈی او ایس) کو سکول میں سائنس کی تعلیم کے لیے مقرر کیا اور سکول میں پہلی سائنس لیب قائم کی۔ ۱۹۴۲ء میں سویلین اساتذہ نے سکول کے تعلیمی معیار کو بہت بلند کیا۔ سکول میں اس وقت تک ہم نصابی کلچرل اور ادبی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ سٹیبنگ ہی کی سرپرستی میں حیدری صاحب نے تقریروں، ڈراموں اور موسیقی وغیرہ جیسی کلچرل سرگرمیوں کو پروان چڑھایا۔ ۱۹۴۴ء میں سٹیبنگ کی کاوشوں سے ہی طلبار براہ راست

سلیکشن بورڈ کے لیے جانے لگے۔

سٹیبنگ کے دور ہی میں ۱۹۴۴ء میں سکول نے باقاعدہ کالج کا درجہ پایا اور پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ ہوا۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں چند لڑکوں نے ایف ایس سی کا امتحان دیا۔ سٹیبنگ کے زمانے میں کالج کے نصاب اور طریق تعلیم کو زیادہ سے زیادہ سول کے قریب لانے کی کوشش شروع کی گئی اور لیڈر شپ بلڈنگ پر زور اپنی جگہ جاری رہا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ سٹیبنگ حرف آخر تھے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ وہ صرف Administrator ہی نہیں بڑے پائے کے Educationist بھی تھے۔

ــــــ بریگیڈیر محمد خان[1]

کرنل سٹیبنگ جس تفصیل میں اور گہرائی میں جاکر کیڈٹس کی تربیت کر رہا تھا اس کا تو شاید بعض کے لیے تصور کرنا بھی مشکل ہو۔ کپڑوں کی فٹنگ ہو یا کنڈیشن پریڈ، باکسنگ کارنگ یا جمعے کی نماز کی انسپکشن، بارات کو مچھر دانی سے لے کر چپل کی صفائی کی چیکنگ وہ یہ سارے کام خود کرتا تھا۔ اتنا وقت اتنی توانائی کوئی اور دے سکتا ہے؟ وہ ایک حاکم قوم کا فرد تھا۔ پورا اعتماد اور بااختیار وہ براہِ راست کمانڈر انچیف سے متعلق تھا۔ نوکری کے تقاضے اس کے پاؤں کی زنجیر نہیں تھے۔ پروموشن کے بدلے اس مرد دانا نے وقار اور عزت لے لی تھی۔ اس کے اپنے ذاتی مفاد صفر تھے۔ ایک میاں بیوی (سنا ہے ایک لڑکا مائیکل تھا لیکن کبھی یہاں دیکھا نہیں گیا) اور وسائل و اختیار بے انتہا کوئی Compulsion نہیں تھا۔ ذاتی اور خاندانی مفادات کا دباؤ افسران بالا کو خوش کرنے اور خوش رکھنے کی ضرورت کا اعصاب شکن دباؤ نہیں تھا۔ شو آف کرنا، نوکری بنانا اس کی کمزوری نہیں تھی۔ بے لاگ انصاف کرنے وقت کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا۔ میں سٹیبنگ کے کام اور کارناموں کو کم نہیں سمجھتا اور نہ ان کی اہمیت کم کر رہا ہوں میں یہ صرف بتانا چاہتا ہوں کہ سٹیبنگ کے سے حوصلے، صلاحیت کردار، اور جذبے کے آدمیوں کی ہمارے ہاں بھی کمی نہیں لیکن وہ غریب اتنا Commitment رکھتے ہوئے بھی عملاً Afford

---

[1] کالج نمبر ۱۰۳۹ زمانہ تعلیم ۱۹۴۲ - ۱۹۴۸ء

نہیں کر سکتے چونکہ عموماً انہیں Exert کرنے ہی نہیں دیا جاتا۔ صورت حال کا یہ پہلو بھی قابل غور ہے۔

ـــــ جنرل محمد اقبال خان[1]

اس زمانے کے بیشتر طلباء سٹیبنگ کے زبردست مداح ہیں۔ لیکن میرا تاثر ان سے مختلف ہے۔ منتظم وہ بہت اچھے تھے نظم ونسق کی انتہائی جزئیات پر ان کی نظر رہتی تھی۔ سپارٹا کے طرز تربیت پر یقین رکھتے تھے اور اس پر سختی اور دیانت داری سے کاربند تھے۔ اپنے مقصد میں وہ یقیناً مخلص تھے لیکن میرے نقطہ نظر سے وہ ضرورت سے زیادہ سخت تھے۔ اتنی بے لچک سختی سے استاد شاگرد کا وہ رشتہ قائم نہیں ہو سکتا جو ہمدردی محبت اور دو طرفہ عزت کی بنا پر استوار ہوتا ہے۔

ـــــ بریگیڈئر محمد اسلم جنجوعہ ستارہ جرأت[2]

کالج میں وہ ایک جان دو قالب تھے کالج کے علاوہ ان کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دن رات وہ تھے اور کالج اور کالج کے لڑکے۔ ہر وقت ہر موقع پر ہر جگہ موجود ان کے معیار بہت سخت تھے اور سختی سے ان کی پابندی کراتے تھے۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی قدر جفاکشی تھی۔ اس لیے کھیلوں، خاص طور پر باکسنگ کو بہت اہمیت دیتے تھے اور اس کی نگرانی خود کرتے تھے۔ ملٹری کالج میں جب بھی میں کسی کام میں مصروف ہوتا تو عام طور پر کرنل سٹیبنگ کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ہوتا۔ لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جب میں کاکول میں زیر تربیت تھا تو بھی میں اکثر یہی محسوس کرتا کہ کرنل سٹیبنگ مجھے کھڑے دیکھ رہے ہیں تو اس وقت بھی یہ شاں شاں کی آواز محسوس ہوتی تھی۔ میں اندھی ہیرو ورشپ کا قائل نہیں ہوں۔ میں خواہ مخواہ ایک غیر ملکی کو آسمان پر نہیں چڑھا رہا ہوں لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ ہمارے نوجوان فائز سوچیں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے سٹیبنگ کو ایک Legend بنا دیا۔ مختصر یہ کہ گو سٹیبنگ کے مقاصد بہت

---

[1] جنرل (ریٹائرڈ) نشان امتیاز، ستارہ بسالت
[2] بریگیڈئر ریٹائرڈ ستارہ جرأت

محدود تھے لیکن کردار بہت بلند تھا۔ سنا ہے کہ بعد کو بریگیڈیئر رفیق نے اپنے افکار و طرزِ کار دونوں کے اعتبار سے کالج میں سٹیبنگ سے بڑھ کر نام پیدا کیا۔ سبحان اللہ۔

ـــــــــــ بریگیڈیر محمد اکرم ظفر

کرنل سٹیبنگ کا اپنا مضمون تاریخ تھا۔ انہوں نے کوئینز کالج (Queen's College) کیمبرج سے قدیم تاریخ میں ایم اے کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے اوائل میں ازراہ کرم انہوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے اپنے ہسٹری کے نوٹس کی دو ضخیم کاپیاں پڑھنے کو دی تھیں جو میں انہیں بروقت واپس نہ کر سکا تھا اور جواب میں نے کالج میوزیم کی نذر کر دی ہیں۔ سٹیبنگ کبھی کبھی آرمی سپیشل کلاس کو پوئٹری پڑھاتے تھے۔ ۱۹۴۶ء کے اوائل میں انہوں نے ہمیں Rupert Brook کی نظم: THE SOLDIER

If I should die, think only this of me;
That there's some corner of a foreign field
That is for over England; There shall be
In that rich earth, a richer dust concealed;
A dust whom England bore, shaped, made aware
Gave, once, her flowers to love, her ways to roam
A body of England's, breathing English air
Washed by the rivers, blest by suns of home.

بہت Involve ہوکر پڑھائی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ اس وقت ان کے دل میں روپرٹ بروک کا دل دھڑک رہا ہے۔ روپرٹ آخر کار لڑائی میں مارا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ سٹیبنگ اس کی موت کے ذکر پر جذباتی ہو گئے تھے He was a true patriot یہ لائنیں باربار دہراتے تھے۔

There shall be
In that rich earth, a richer dust concealed.

لے زمانہ تعلیم ۱۹۴۴ء تا ۱۹۵۰ء

اسی طرح Tennyson کی مشہور نظم

The Charge of the Light Brigade
Theirs not to reason why

بھی پڑھائی تھی۔ آج چالیس سال کے بعد یہ نظمیں یاد کرتے ہوئے مجھے خیال آرہا ہے کہ آیا یہ محض اتفاق تھا کہ انہوں نے یہ دو Patriotic نظمیں خود پڑھائیں؟ یا یہ شعوری کوشش تھی اپنی وطنیت (Patriotism) کے اظہار کی۔ جناب سٹیبنگ نے جس طرح اپنے مشن کو پورا کیا جس طرح اپنے Commitment کے لیے جان لڑا دی۔ اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ شخص بہت ہی Committed آدمی تھا۔ قومیں Rupert Brook اور سٹیبنگ جیسے لوگوں سے بنتی ہیں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس نظم کو پڑھتے ہوئے کسی نے خود ان کے ملٹری کراس کے بارے میں بھی پوچھا تھا جس کا انہوں نے مختصر جواب یہ دیا تھا کہ گیلی پولی کے محاذ پر ایک ایکشن کے لیے مجھے ایم سی دیا گیا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ میں نے وہ کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ اسی ایکشن میں زخمی بھی ہوا تھا۔

جناب سٹیبنگ کی بڑائی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ Egotist بالکل نہیں تھے ایف ایس سی میں بھی ان سے طاس گرے کی معروف نظم

Ode on a distant prospect of Eton College

پڑھنے کا موقع ملا۔ نظم کی بیک گراؤنڈ کے طور پر انہوں نے ایٹن سکول، پبلک سکول سسٹم اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ بات سپارٹا تک پہنچی۔ رومن ہسٹری تو ان کا مضمون ہی تھا۔ اس نظم کے دو مصرعے اس وقت بھی یاد آرہے ہیں۔

Where ignorance is bliss
'Tis folly to be wise

۱۹۴۵ء میں جنگ عظیم ختم ہونے پر پوسٹ وار منصوبے تیار ہوئے ان میں سے ایک منصوبہ بمبئی کے قریب کھڈک واسلہ (Khadak Vasla) کے مقام پر ایک نیشنل ڈیفنس اکیڈمی کے قیام کا تھا۔ اس میں داخلہ ایک مقابلہ کے امتحان کے ذریعہ ہوتا تھا۔ اس کا کام آئی ایم اے،

آئی اے ایف اور آئی این ایف کے لیے موزوں امیدوار تیار کرنا تھا۔ سٹیبنگ آرمی کلاس کیڈٹس کو اس مجوزہ نیشنل ڈیفنس اکیڈمی کے امتحان کے لیے تیار کر رہے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں نئے سیاسی حالات کی وجہ سے یہ مرحلہ طے نہ ہو سکا۔

کیپٹن سید شہزادہ عالم[1]

یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے ۸۹۷ محمد یٰسین کو سگریٹ پینے کی پاداش میں کمانڈانٹ کے سامنے تیسری بار پیشی ہوئی پہلی بار ای ڈی ملی تھی۔ دوسری بار کیننگ ہوئی تھی۔ اب کے بالمثل سزا ملی یعنی سرائے عالمگیر کی طرف جی ٹی روڈ والی گراؤنڈ کے بیچ میں ایک بڑا گجراتی حقہ دے کر بٹھا دیا گیا اور حکم ہوا تا حکم ثانی حقہ پیتے رہو۔ نگرانی کے لیے حوالدار محمد عنایت اور حوالدار لال خان مقرر ہوئے۔

سٹیبنگ نے اپنے طریق تربیت کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ رات کو سونے سے پہلے چپلوں کو پالش سے چمکا کر چارپائی کے سامنے ایک خاص جگہ رکھنا ہوتا تھا۔ کمانڈانٹ سٹیبنگ رات کو ٹارچ کی روشنی میں جہاں یہ چیک کرتے کہ مچھر دانی ٹھیک طرح لگی ہوئی ہے یا نہیں وہاں یہ بھی دیکھتے کہ چپلیں بھی صاف ہیں یا نہیں۔ یہ واقعہ آکنلک ہاؤس کا ہے۔ گرمیوں کے دن تھے لڑکوں کی چارپائیاں صحن میں بچھی ہوئی تھیں۔ دس بجے لائٹس آؤٹ کی سیٹی بجی تو سب مچھر دانیاں اچھی طرح لگا کر سو گئے۔ صبح اٹھے تو ۹۵۴ عبدالخالق زور شور سے اپنی چپلیں ڈھونڈ رہا تھا۔ بھائیو مذاق ختم کرو کسی نے میری چپلیں دیکھی ہوں تو بتاؤ۔ ہار کر غریب نے سیکشن کمانڈر کو رپورٹ کی کہ میری چپلیں غائب ہیں۔ اس نے رپورٹ آگے کمپنی کمانڈر ۱۱٦۷ محمد اسلم (بعد کو بریگیڈئر) کو پہنچا دی۔ لیکن چپلیں نہ ملنا تھیں نہ ملیں۔ کیسے؟ رات کی چیکنگ پر کمانڈانٹ سائیکل پر رکھ کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ صبح سویرے پہلے پیریڈ میں تار کمانڈانٹ کی چٹ لے کر آ گیا کہ ۹۵۴ کو کمانڈانٹ صاحب دفتر بلاتے ہیں اس کا تو رنگ فق ہو گیا۔ جب دفتر میں قدم رکھا تو دیکھا کہ سامنے چپلیں پڑی ہیں۔ پھر جو حشر غریب کا ہوا وہ بتانے کی ضرورت نہیں۔

---

[1] کیپٹن ریٹائرڈ

———ائرچیف مارشل ذوالفقار علی خان[۱]

سعید راشد[۲]: سٹیبنگ کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟

ذوالفقار علی خان: دیکھنا یہ ہے کہ سٹیبنگ کا اپنا Mandate کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ پہلی جنگ عظیم کا ایم سی کیمبرج کا ایم اے اور برطانیہ عظمیٰ کا او بی ای، اس Calibre کا آدمی یہاں یوں ہی نہیں بٹھا دیا گیا تھا ظاہر ہے کہ وہ برٹش ایمپائر کے مفادات کا ایک فعال اور نہایت وفادار محافظ تھا۔ ہر حکومت تعلیم کے مقاصد اپنے سیاسی مقاصد کے تحت متعین کرتی ہے۔ انگریزوں کا مقصد بہت واضح تھا کہ اچھے اور وفادار فیلڈ کمانڈر اور سولجرز پیدا کیے جائیں جو برٹش ایمپائر کے تحفظ اور استحکام کے کام آئیں۔ زور Efficiency پر زیادہ تھا۔ لیڈر شپ پر کم بلکہ بہت کم۔ سٹیبنگ کے طریق تربیت کا آپ تجزیہ کریں اس میں Meticulousness, Accountability اور Toughness, Hardness پر زیادہ زور نظر آئے گا۔ اس زمانہ میں باکسنگ اور پریڈ کو جو مقام دیا جاتا تھا وہ یاد کیجیے میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ Efficiency اور Effectivity اور چیز ہے۔ Leadership بنیادی طور پر اور چیز۔ لیڈر شپ تو بغیر فریڈم Imagination اور Intellectual component کے ممکن ہی نہیں ایک فوجی جرنیل بھی جب تک Intellectual grasp نہ رکھتا ہو اسکی نظر جنگ کے Socio-economic political پس منظر پر نہ ہو وہ کمانڈر ہو تو ہو ملٹری لیڈر نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال میں نپولین سے دوں گا۔ عام طور پر تو وہ ایک کامیاب ملٹری کمانڈر کے طور پر مشہور ہے لیکن اصل میں وہ لیڈر بھی تھا۔ اس کی تربیت اور ذہنی نشوونما ایک آزاد فضا میں

---

[۱] کالج نمبر ۱۴۷۱ زمانہ تعلیم ۱۹۴۴ تا ۱۹۴۸ء [۲] پروفیسر سعید راشد استاد ملٹری کالج ۱۹۵۰ء تا ۱۹۸۸ء

ہوئی تھی۔ وہ مقنن بھی تھا۔ جو قانون اس نے دیا وہ Napoleonic Law کی صورت میں، آج بھی فرانس اور سوئیٹزرلینڈ اور اٹلی میں رائج ہے۔ اس نے ایجوکیشن کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس نے لیڈر شپ کی تربیت کے لیے جو سپیریئر سکول قائم کیے اور آج بھی چل رہے ہیں (فرانس کے بہت سے سربراہ اور لیڈر یا پیڈرو وغیرہ وہیں کے تعلیم یافتہ ہیں) نپولین ہی نے مصر کی پرانی تہذیب پر تحقیق کا آغاز کروایا تھا۔ دیکھا آپ نے؟ جو فوجی لیڈر بھی اپنے نقش قدم چھوڑ جاتا ہے وہ کمانڈر کے علاوہ بھی وہ بہت کچھ ہوتا ہے اور اسکی تربیت کے Dimensions ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ ملٹری کالج جیسے اداروں میں لیڈر شپ کا تصور بھی Broad based ہونا چاہیے جو بغیر بہت اچھی تعلیمی بنیاد کے اور ذہنی آزادی کی فضا کے ممکن نہیں۔ آجکل تو دنیا کے بہت سے ملکوں میں فوجی افسروں کے لیے بھی پوسٹ گریجویٹ ایجوکیشن کو لازمی قرار دیا جا چکا ہے۔ Ph. Ds کی بھرمار ہے۔

سعید راشد بات سٹیبنگ سے چلی تھی۔

ذوالفقار علی خان میں سمجھتا ہوں کہ کرنل سٹیبنگ کا جو بھی Mandate تھا اسے انہوں نے غیر معمولی Dedication اور Devotion سے پایہ تکمیل تک پہنچایا اور ان کے اپنے کردار میں Ruthlessness کا عنصر ضرور تھا۔ لیکن وہ اس میں Erratic نہیں تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ سٹیبنگ کے عہد کے انڈیا کے دوسرے کے جی آر ملٹری کالجوں کے معیارات اور Achievements پر تقابلی ریسرچ کی گئی ہے یا نہیں۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ جناب سٹیبنگ نے جالندھر، اجمیر کے دوسرے ملٹری کالجوں کے مقابلے میں ملٹری کالج جہلم کو نہ صرف سپورٹس، لیڈر شپ بلکہ تعلیم میں بھی آگے رکھا۔ یہ سٹیبنگ ہی تھے جنہوں نے ۱۹۴۰ میں یہاں سائنس کلاسز کا اجرا کیا۔ ۱۹۴۳-۴۴ء میں کالج بننے پر یہاں سائنس لیبارٹریز قائم کیں اور ایف ایس سی کا یونیورسٹی کا امتحان شروع کیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کالج کی لائبریری کو صحیح معنوں میں قائم کیا۔

حیدری صاحب کی کلچرل اور ہم نصابی سرگرمیوں کو بھی آخر سٹیبنگ ہی کی سرپرستی اور تائید حاصل تھی۔ اس وقت، کالج میں جو شدید Regimentation تھا۔ وہ الگ مسئلہ ہے لیکن یہاں یہ بھی یاد رہے کہ اس ریجی منٹیشن سے بھی جتنا Positive کام یہاں لیا گیا اتنا بنگلور، بلگام، جالندھر اور اجمیر میں نہیں لیا گیا۔ یہ سٹیبنگ کا اپنا کارنامہ تھا۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اب ہمارے اپنے آدمیوں کو اس وقت سے بہتر اور بلند تر مقاصد وسیع تر نصاب اور بہتر وسائل کے ساتھ سٹیبنگ سے زیادہ Devotion اور Dedication سے کام لینا ہے تاکہ اس سے بہتر نتائج پیدا ہوں۔

سعید راشد ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ بریگیڈیر رفیق نے ایسا کیا بھی۔

ذوالفقار علی خان میں ان سے واقف تو نہیں لیکن یہ مقصد ناقابل حصول نہیں، آخر میں یہ کہوں گا کہ اب وقت آگیا ہے کہ پورے کری کیولم کو اور طریق تعلیم و تربیت پر نظر ثانی کی جائے۔ Creativity اور تحقیق کو Top priority دی جائے اب قوموں کا Survival ان کے ذہن پر ہوگا۔

——— لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال[1]

کرنل سٹیبنگ کی پابندی وقت کو میری طرح بے شمار ان کے شاگردوں نے نوٹ کیا ہو گا۔ وہ وقت کے اس درجہ پابند تھے کہ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے دس سال کے دور سربراہی میں دس بار کیا ایک بار بھی کسی فنکشن یا پریڈ پر ایک منٹ بھی دیر سے نہ پہنچے ہوں گے۔ ان کی آمد سے گھڑیاں سیٹ کی جا سکتی تھیں۔ میں ان کی اس خصوصیت کو صرف ایک فنکشن کے حوالے سے بیان کرونگا۔

اس زمانے میں کمپنیوں کا ہاؤسوں کا ہر مہینے (Interior Economy) مقابلہ ہوتا تھا جس میں Academic کے سوا ہاؤس کی صفائی لڑکوں کا ٹرن آوٹ ڈسپلن وغیرہ لڑکوں کی ہر سرگرمی شامل تھی اور کمانڈانٹ اس کی جانچ پڑتال خود کرتے تھے۔ اس کے لیے لڑکوں

[1] کالج نمبر ۱۳۳۲ زمانہ تعلیم ۱۹۴۴ تا ۱۹۵۱۔ صدر عالمگیر ینبر ایسوسی ایشن و چیئرمین پنجاب پبلک سروس کمیشن ہلال امتیاز ستارۂ بسالت۔

کو آتے جاتے منفی اور مثبت۔ پوائنٹس بھی دیئے جاتے تھے ۔یہ ایک پراسرار انسپکشن تھا۔جس کے نتیجے کا بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔کمانڈانٹ نتیجے کا اعلان مہینے کے آخری دن رات کے کھانے سے پہلے جیتنے والے ہاؤس میں آکر خود کرتے تھے ۔اس کی بھی ایک پکی ڈرل تھی۔وقت مقررہ سے دس منٹ پہلے کمپنی سکوائر میں فالن ہو جاتی اور عین وقت پر کرنل سٹیپنگ اپنی سائیکل پر ہاؤس کی رہداری پر پہنچ جاتے۔مجھے یاد ہے سائیکل پر آگے لیمپ جلتا ہوتا۔فلیگ آف آنر (جو شیشے کے کیس کے فریم شدہ گرین بلیزر پر کڑھا ہوا کالج کا کریسٹ تھا) ہاؤس ہیڈ بوائے کو دینے سے پہلے وہ ایک مختصر تقریر بھی کرتے۔مبارکباد دینے کے بعد عموماً یہ کہتے: Its' easy to get it but difficult to retain. Keep it as long as you can.

۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک ہاؤس میں ہر مہینے یہ تقریب دیکھی اور کیا مجال ہے کہ ان کے آنے میں ایک منٹ بھی ادھر ادھر ہوا ہو۔پابندی وقت محض ایک عادت کا معاملہ نہیں یہ بہت واضح اظہار ہے اس امر کا کہ شخصیت اندر سے بہت Integrated ہے۔

جناب سٹیپنگ کے تذکرے پر ایک آدھ بار میں نے کسی کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ سخت بلکہ Sadiestic تھے۔میں سمجھتا ہوں کہ یہ تاثر کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ Sadism ایک نفسیاتی اصطلاح ہے۔یعنی کسی کو تکلیف دے کر لاشعوری طور پر خوش ہونا کم ازکم ان کے معاملے میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔اس کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ سٹیپنگ اکثر سینئر کیڈٹس کو سردیوں میں صبح سویرے سوئمنگ پول میں تیرنے کی سزا سنایا کرتے تھے۔ایسے موقعوں پر وہ اس عمر میں بھی پہلے خود ٹھنڈے پانی میں چھلانگ لگاتے تھے اور ایسا بھی کبھی نہیں ہوا کہ وہ کیڈٹس آفیسرز سے بعد سوئمنگ پول پر پہنچے ہوں۔ کیڈٹس کے سوئمنگ پول پہنچنے سے پہلے وہ سوئمنگ کاسٹیوم میں وہاں موجود ہوتے۔اسے تو Sadism نہیں کہتے۔ ۱۰۱ کرنل فرید ملک نے مجھے بتایا کہ جب کرنل سٹیپنگ سکین ہاؤس کے عہدیداروں کو ہاؤس کا نا کا کھلا چھوڑنے پر ربوالی کے بعد اور پی ٹی سے پہلے دسمبر کے آخری مہینہ میں اپر جہلم نہر پر جاکر ایک ہفتہ، پانچ منٹ تک تیرنے کی سزا دی تو آخری روز خود بھی

ان کے ساتھ گئے اور ان کے ساتھ نہر میں سوئمنگ کی اس طرح کا ایک واقعہ صوبیدار فتح خان صاحب نے بھی لکھا ہے کہ کس طرح وہ رات کو رابرٹس ہاؤس چیک کرنے نکلے۔ نمبر ون ڈارمیٹری میں ٹارچ سے لڑکوں کی مچھر دانیاں چیک کر رہے تھے تو دیکھا کہ خود کمانڈانٹ کرنل سٹیبنگ ایک طرف کی انگیٹھی کے قریب بیٹھے ہیں بڑی حیرت ہوئی کہ یہ اس وقت یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔ قریب گئے تو دیکھا کہ انہوں نے دونوں ہاتھوں کی آستین کہنیوں تک چڑھا رکھی ہیں اور دونوں ہاتھ انگیٹھی کے اندر کیے ہوئے ہیں۔ جب انہوں نے پوچھا "سر یہ کیا " ؟ تو سٹیبنگ کا جواب تھا۔ (جو لیڈر شپ کی کتابوں میں سونے کے حروف میں لکھنے کے قابل ہے) "کل سے میں مچھر دانیوں کا استعمال روک دینے کا آرڈر کرنے والا ہوں۔ اس طرح میں یہ چیک کر رہا ہوں کہ یہاں مچھر تو نہیں۔ اگر ہوئے تو یہیں فائر پلیس میں چھپے ہوں گے۔"

ـــ ایسا آدمی Sadistic تو ہوسکتا ہے Possessed نہیں۔ میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت پورے کالج میں سٹیبنگ سے زیادہ جفاکش اور سخت کوش بندہ کوئی اور نہ تھا۔

اگر کوئی واقعی بڑا ہے تو کم از کم ہمارا اتنا ظرف تو ہونا چاہیے کہ کھلے دل سے اسکی بڑائی کا اعتراف کر سکیں۔ کسی کی بڑائی کا اعتراف کرنا بڑائی کی طرف پہلا قدم ہے۔

کرنل سٹیبنگ کی تربیت کا ایک اور بہت واضح اصول تھا کہ سینئر کیڈٹس کی انتہائی سخت معیاروں کے مطابق تربیت کی جائے اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی فروگذاشتوں کو بھی نظرانداز نہ کیا جائے۔ اس کا ایک ثبوت وہ انسپکشن تھا جس سے سینئر پریفیکٹس ہر روز گزرتے تھے جس کی وجہ سے غریبوں کو ہر روز دو بار وردی تبدیل کرنی پڑتی تھی۔ یہ ڈرل بھی بلاوجہ نہ تھی اس کے پیچھے بھی ان کا مخصوص فلسفۂ تربیت تھا۔ آخر یہی وہ کیڈٹس تھے جو جونئر کیڈٹس سے سیلوٹ کے حقدار تھے اور کیڈٹ آفیسرز میں آفیسرز کی طرح رہتے تھے اور جن کے وہاں رہنے کا معیار کسی طرح بھی اکیڈمی کے معیار سے کم نہ تھا۔ پھر یہی وہ سینئر کیڈٹس تھے جنہیں وہ براہ راست کچز کالج کے لیے (اور ۱۹۴۵ء میں کچز ٹوٹنے کے بعد) براہِ راست بورڈ کے سامنے بھیجتے تھے اور گھر پر بلا کر پری انٹرویو ٹریننگ دیتے تھے۔ ان کی سزا کو ان کی تربیت کے فریم ورک میں دیکھنا

چاہیے۔

——— لیفٹیننٹ جنرل محمد صفدر[1]

اگست ۱۹۴۶ء میں چھٹے درجے میں داخل ہوا تھا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں کرنل سٹیبنگ نے کالج کو خیر باد کہا۔ گویا ان کی کمان کا ایک سال میں نے دیکھا وہ بھی ایک عام کیڈٹ کی حیثیت سے اور کچھ فاصلے سے۔ کرنل سٹیبنگ کا نام آئے تو میرے ذہن میں جو پہلا تاثر ابھرتا ہے وہ ایک پرہیبت شخصیت کا ہوتا ہے۔ ان میں خوبیاں بھی بہت تھیں جن کا میں تذکرہ بھی کروں گا لیکن ان کی امیج سے میں خوف کے عنصر کو الگ نہیں کر سکتا۔ دوسرے میرا خیال یہ بھی ہے کہ وہ بعض بہت چھوٹی باتوں کو بہت زیادہ اہمیت دے رہے تھے مثلاً یہ کہ پالش شدہ چپلوں کی جگہ اور ان کا رُخ بھی متعین تھا۔ لاکر میں کون سی چیز کہاں کیسے رکھی جائے یہ سب پتھر کی لکیریں تھیں جن سے کوئی بال برابر بھی انحراف نہیں کر سکتا تھا۔ پورے سسٹم کی بنیاد Absolute conformity پر تھی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس پس منظر میں، جس سسٹم کے تحت، جن تعلیمی و تربیتی ترجیحات کے مطابق کالج اس وقت کام کر رہا تھا ان کو بروئے کار لانے کے لیے اس شخص نے جس کا نام سٹیبنگ تھا تن من دھن کی بازی لگا دی تھی ان کے Dedication, devotion, integrity fair play اور Personal touch کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ سب جانتے ہیں کہ کرنل سٹیبنگ نے کالج کی خاطر (یا سلطنت برطانیہ کی خاطر) اپنے پروموشن کی بھی پرواہ نہیں کی تھی بلکہ ۱۴ اگست کے بعد بھی یہاں کام کرتے رہنے کی رضا کارانہ پیش کش کی تھی۔ کرنل سٹیبنگ کی شخصیت و کردار کا یہ پہلو قابل توجہ اور قابل تقلید ہے۔ جب ہم اپنے اور نئے دور کے سٹیبنگ پیدا کریں گے تو بات بنے گی۔

---

[1] کالج نمبر ۲۷۱ زمانہ تعلیم ۱۹۴۶ تا ۱۹۵۱ کمانڈانٹ نیشنل ڈیفینس کالج راولپنڈی ہلال امتیاز

مسز کرنل سٹیبنگ

——کرنل محمد وزیر خان ملک[۵]

سٹیبنگ کو ان کی مسز نے مکمل (Supplement) کیا تھا۔ ان کے بغیر ان کا مشن اور ان کا رول پورا نہ ہوتا انہوں نے سٹیبنگ کی درشتی کے منفی اثرات کو اگر ختم نہیں تو کم ضرور کیا۔ اکثر ہاؤسوں میں جاتی تھیں۔ خاص طور پر بے بی ہاؤس میں اگر کوئی لڑکا بیمار ہوتا تو وہ میٹرن کو لے کر ہاؤس میں جاتی تھیں اور اسپتالی لڑکوں کی بہت دیکھ بھال کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ جے سی اوز اور ادر رینکس کے گھروں میں جاتی تھیں۔ ایک سویپر کے بچہ کو جس کی ماں اس کی پیدائش کے وقت مر گئی تھی انہوں نے ڈاکٹر شمسی کے تعاون سے چھ ماہ تک اپنے گھر میں رکھا بلکہ پالا۔

——مسٹر نواب دین انصاری[۶]

مسز سٹیبنگ نئے سویلین انسٹرکٹرز کے گھروں میں تقریباً ہر روز جاتی تھیں۔ ٹوٹی پھوٹی اردو میں ان کی بیگمات سے بات چیت کرتی تھیں۔ بعض ہندو سکھ انسٹرکٹرز کی بیویاں انگریزی بھی جانتی تھیں لیکن ان سے ان کا کوئی ترجیحی سلوک نہ تھا۔ جنگ کے زمانہ میں کپڑے کی کمیابی کی شکایت بیگمات ہی نے ان سے کی تھی جس کے نتیجے میں ان کی مراد بر آئی۔

——کرنل حضور احمد خان۔ ایم سی

توجہ کی ضرورت سخت سے سخت آدمی کو بھی ہوتی ہے اور معذوری کے زمانہ میں تو وہ بچہ بن جاتا ہے۔ مسز سٹیبنگ نے سٹیبنگ کو بہت سنبھالا۔ جب میں انگلستان ان کے ہاں گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ سٹیبنگ کی دیکھ بھال ماں کی طرح کر رہی تھیں۔ اس میں حیرت کی بات نہیں کہ ان کے مرنے کے بعد سٹیبنگ بھی زیادہ دن نہ جیے۔

——لیفٹیننٹ کرنل خداداد خان

ان کا رویہ قطعاً مادرانہ تھا۔ جن کیڈٹ آفیسرز کو بنگلے پر سزا ملتی ان کی بہت دلجوئی کرتیں۔ کالج

---

[۵] اسناد ۳۰ء تا ۱۹۴۸ء
[۶] اسناد ۳۲ تا ۱۹۶۴ء

کے اسپتال میں تقریباً ہر روز جاتیں اور بیمار لڑکوں کی خاطر داری کرتیں۔ ان سے پہلے مسز سیبلی کا رویہ بھی مادرانہ تھا۔ ان دو مثالوں سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ پبلک سکولوں میں جہاں ہر طرف سختی لاتعلقی اور درشتی ہوتی ہے اساتذہ کی مہربان بیگمات کا بھی ایک رول ہوتا ہے نفسیاتی نقطۂ نظر سے جس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

ـــــــ کیپٹن عبد الرحمٰن

۱۹۳۸ء میں، میرا ۳۶۵ اصغر علی اور کئی لڑکوں کے ٹانسلز کا آپریشن سی ایم ایچ جہلم میں ایک مدراسی ڈاکٹر لیفٹیننٹ کرنل موہن لال نے کیا تھا۔ مسز سٹیبنگ ہر روز دیکھنے آتی تھیں۔ گتے کی ڈبیوں میں ایک ہفتے تک آئس کریم لاتی رہیں۔ انگریزی اور اُردو ملا کر بڑے پیار سے باتیں کرتی تھیں۔

ـــــــ بریگیڈئر بشیر احمد

ایک بار کچنز کالج سے میں سٹیبنگ سے ملنے آیا تو انہوں نے مجھے اپنے بنگلہ میں وی آئی پی مہمان کے طور پر ٹھہرایا۔ سردیوں کے دن تھے۔ ان دنوں ہیٹر کا رواج نہ تھا۔ مجھے یاد ہے رات گئے مسز سٹیبنگ نے گیسٹ روم کے دروازہ پر آہستہ سے دستک دی۔ میں بستر سے اٹھا تو دیکھا وہ گرم پانی کی بوتل لیے کھڑی ہیں۔

ـــــــ شہزادہ ہارون اسمٰعیل

میں ہاؤس کے روشندانوں کی صفائی کرتے ہوئے سیڑھی سے گرتے ہی بے ہوش ہو گیا تھا جب اسپتال میں ہوش آیا تو کرنل سٹیبنگ، اور دوسرے افسروں کے علاوہ مسز سٹیبنگ کو بھی وہاں موجود پایا۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر سٹیبنگ نے صرف اتنا کہا "۹۹۲ تم ٹھیک ہو۔ کوئی فکر کی بات نہیں"۔ اس کے بعد ڈاکٹر کو کچھ ہدایات دیں اور چلے گئے۔ مسز سٹیبنگ میرے سرہانے کرسی ڈالے بیٹھی رہیں۔ بار بار میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر محسوس کرتی تھیں کہ بخار تو نہیں۔ میں ان کے مہربان ہاتھ کی گرمی کو نہیں بھول سکتا۔ ان کے بار بار پوچھنے اور سر پہ ہاتھ رکھنے سے مجھ پر شاک کی سی جو کیفیت

طاری تھی وہ بہت جلد دور ہو گئی۔ پھر ڈاکٹر سے کچھ پوچھا اور بنگلے سے آئس کریم لا کر مجھے چمچہ سے آہستہ آہستہ کھلائی۔ دو دن میں ان کی آئس کریم کے مزے لیتا رہا۔ تیسرے دن سے انہوں نے مجھے سوپ اور بسکٹ دینے شروع کیے۔ راولپنڈی جانے سے پہلے پانچ چھ دن جو میں کالج اسپتال میں رہا تو گویا مسز سٹیبنگ کا مہمان رہا۔ دن میں تین چار دفعہ وہ مجھے دیکھنے آتی تھیں اور میرے لیے سوپ بسکٹ وغیرہ اپنے بنگلے سے لاتی تھیں۔

ـــــــ بریگیڈئر محمد اقبال

سٹیبنگ کے سلسلہ میں لکھ چکا ہوں کہ وہ سینئر لڑکوں کو کچز کالج بھیجنے سے پہلے اپنے گھر مہمان رکھ کر افسرانہ انداز سے رہنے سہنے کی علمی تربیت دیتے تھے۔ اس تربیت کا سارا بوجھ مسز سٹیبنگ کے سر تھا جسے وہ بوجھ سمجھ کر نہیں راحت سمجھ کر بڑے ذوق شوق سے اٹھا رہی تھیں۔ میں خود چند دن ان کا مہمان رہا۔ مسز سٹیبنگ ہی نے مجھے آداب مہمانی سکھائے جس میں کھانے کی میز کے آداب بھی شامل تھے۔ سب سے بڑھ کر اپنائیت کا وہ احساس جو ان کے مادرانہ رویّوں سے پیدا ہوتا تھا جس کی خوشبو اور روشنی میرے بلکہ میرے پورے خاندان کے دل میں تازہ ہے۔ اسی تعلق کی وجہ سے ۱۹۵۲ء میں، میں اپنے سارے خاندان کے ساتھ ان سے ملنے ٹورکی گیا تھا۔ جاوید ماشاءاللہ ان دنوں چند ماہ کا تھا۔ اس کو دیکھ کر مسز سٹیبنگ بہت خوش ہوئیں اور اس موقع پر انہوں نے ہمارے لیے خاص طور پر پاکستانی لنچ بنانے کی کوشش کی تھی۔ مسز سٹیبنگ کبھی کی مٹی میں مل چکیں۔ آج ہم انہیں یاد کر رہے ہیں۔ اس چراغ کی ہمیں ضرورت ہے اپنے لوگوں کو یہ بتانے کے لیے کہ ان راہوں سے کیسے کیسے لوگ گزر رہے ہیں اور یہ یاد دلانے کے لیے کہ آداب جہانبانی کیا ہیں اور یہ بھی کہ طلباء کن ہاتھوں سے پروان چڑھتے ہیں۔

ـــــــ مسز وزیر سلطانہ ملک[1]

لڑائی کے زمانے ۴۵-۱۹۳۹ء میں مسز سٹیبنگ نے فوجیوں کے ویلفیئر کے لیے بہت تگ و دو کی۔ بے شمار اونی موزے اور مفلر بنوا کر انہوں نے فوجیوں کے لیے بھیجے اور وہ مجھ پر اور میرے بچوں پر اتنی

[1] مسز وزیر، بیگم کرنل ملک

مہربان تھیں کہ اس سلسلہ میں جتنا تعاون مجھ سے بھی ہو سکا وہ کیا۔ صرف یہی نہیں کہ دور کے فوجیوں کا خیال ہو۔ اپنے سٹاف کے ویلفیئر کے لیے بہت کچھ کرتی رہتی تھیں۔ پہلے تو یہی کہ سارے سٹاف کے گھر جاتی رہتی تھیں اور ان سے اور بغیر کسی احساس کے کھلے دل سے ملتی تھیں۔

مسز سٹیبنگ کرنل سٹیبنگ کو ہیری کہہ کر پکارتی تھیں وہ انہیں ڈوروتھی کہتے تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا مائیکل ان دنوں لندن میں تھا۔ وہ ہر ماں کی طرح مائیکل کی بچپن کی باتیں مجھ سے کرتی تھیں۔ اگر کبھی خط آنے میں دیر ہو جاتی تو اس دن کی ملاقات میں وہ بار بار کہتیں مسز وزیر! کیا بات ہے مائیکل کا خط نہیں آیا۔ وہ بچوں خاص طور پر لڑکیوں سے بہت محبت کرتی تھیں۔ میری بیٹی پروین سے وہ بہت لاڈ کرتی تھیں۔ کرنل سٹیبنگ بھی بچوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جب ۴۶ء کے اواخر میں ہم تیسری بار کالج میں پوسٹ ہوئے تو میری بیٹی پروین اپنے چھوٹے بھائی وقار کو لے کر ان کے بنگلے چلی گئی۔ اتفاق سے کرنل سٹیبنگ سامنے کھڑے تھے انہوں نے وقار کو پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے وہیں سے پکارا ڈوروتھی بڑا پیارا بچہ ہے اس کو آئندہ بے بی شو میں لے جانا۔ چنانچہ اگلی بار جہلم چھاؤنی کے بے بی شو میں وقار کو انعام ملا۔ مسز سٹیبنگ بہت گھریلو قسم کی خاتون تھیں۔ فراخ دل ضرور تھیں لیکن پیسے بہت احتیاط سے خرچ کرتی تھیں۔ بنگلے میں ایک مرغی خانہ تھا جس میں کئی قسم کی سو دو سو مرغیاں تھیں۔ ان کے انڈے جہلم چھاؤنی بھیج دیا کرتی تھیں۔ بنگلے پر سبزیاں بھی لگائی ہوتی تھیں۔ ایک ملازم بوٹا اسی کام پر تھا سبزی ہمارے گھر اور دوسرے سٹاف کوارٹرز پر بھی اکثر بھیجا کرتی تھیں۔

گھر کے پھٹے پرانے کپڑے ہوں یا فرنیچر ہر چیز کی مرمت بڑے اہتمام سے کرواتیں سلیقہ مندی میں وہ ہماری بڑی بوڑھیوں سے کم نہیں تھیں۔

میاں بیوی کو کتوں کا بہت شوق تھا۔ ایک کتے کا نام ہیرو تھا۔ جب وہ یکایک مر گیا تو انہوں نے بڑا افسوس کیا۔ لان میں ایک طرف کو اس کی قبر بنوائی اور اس پر کتبہ لگوایا "یہاں پیارا ہیرو آرام کی نیند سو رہا ہے"

آخر آخر میں جن حالات میں انہیں یہاں سے یکایک جانا پڑا اس کا آج تک مجھے افسوس ہے اس کے باوجود یو کے سے اکثر ہمیں لکھتی رہتی تھیں اور ان لوگوں کو بھی پوچھتی رہتی تھیں جنہیں

ہم بھول گئے تھے۔ اچھے لوگوں سے ملنا زندگی کا سب سے اچھا تجربہ ہوتا ہے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں ان کے لیے دعا کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔

ـــــــمسز پروین ملک

پہلے تو میں اپنا تعارف کرا دوں، میں محمد وزیر خاں ملک کی بیٹی اور کالج کے ایک اولڈ بوائے لیفٹیننٹ کرنل منصب دار خاں صاحب کی بیگم ہوں۔ جب ۱۹۴۰ء میں ابا جی یہاں سائنس کے پہلے سویلین ٹیچر ہو کر آئے تو میری عمر چار پانچ برس کی تھی۔ اس وقت مسز سٹیبنگ سے میری جان پہچان شروع ہوئی، مسز سٹیبنگ ہفتے میں ایک دو بار سارے سٹاف کے گھروں کا چکر لگاتی تھی۔ تو ہمارے ہاں بھی آتی تھیں۔ گو اس وقت مجھے انگریزی بالکل نہیں آتی تھی۔ پھر بھی وہ مجھ سے اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو ہی میں دو چار باتیں کرتی تھیں۔ کچھ انگریزی بھی بولتیں جو میں سمجھ تو نہ پاتی لیکن ان کے لہجے میں جو اپنائیت اور رویے میں جو شفقت تھی اسے میں ضرور سمجھتی تھی۔ اسی وجہ سے میں ان سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں جب ابا جی کمیشن ہو کر کالج سے چلے گئے تو ہمیں بھی پنڈی گھیب آنا پڑا۔ اس وقت کالج چھوڑنے کا اگر کوئی افسوس تھا تو بڑی اماں کو چھوڑنے کا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے بھی مجھے بہت پیار کر کے خدا حافظ کہا تھا۔ چار سال بعد ۱۹۴۵-۴۶ء میں ابا جی دوبارہ کالج کے چیف انسٹرکٹر کی حیثیت سے پوسٹ ہوئے تو مسز سٹیبنگ سے پھر ایک بار نیاز حاصل ہوا، ہمارا بنگلہ بھی تقریباً ان کے بنگلہ کے ساتھ تھا۔

مسز سٹیبنگ کے ہاں چار ذاتی ملازم تھے۔ فرانسس نام کا ایک اینگلو انڈین جو ہمیشہ بٹلر کی وردی میں ملبوس رہتا تھا۔ باورچی خانے کی ذمہ داری بوٹا خاں کے سپرد تھی۔ بنگلہ کا مالی نظام دین تھا۔ ان کے نام کا ایک لڑکا بھی ملازم تھا۔ جو خاص طور پر مسز سٹیبنگ کے تین پالتو کتوں کی دیکھ بھال کرتا تھا ایک سفید رنگ کا جھبرے بالوں والا چھوٹا پپ تھا اس کا نام شارٹی تھا۔ دوسرا درمیانے قد کا اور براؤن رنگ کا تھا۔ وہ براؤنی کہلاتا۔ تیسرا سیاہ رنگ قد آور کتا تھا۔ نام جیف تھا۔ مسز سٹیبنگ ان کتوں کا بہت خیال رکھتی تھیں۔

مسز سٹیبنگ نے مجھے اپنی بیٹی بنایا ہوا تھا۔ تقریباً ہر روز مجھے بلا بھیجتی تھیں۔ ہر بار ان

کا خاص ملازم فرانسس مجھے لینے آتا تھا۔ گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی اس کا بندھا ٹکا جملہ ہوتا۔ "بیگم صاحب بے بی کو میم صاحب بلاتا ہے" وہ میرے بال بناتی تھیں۔ اور ایک خاص انداز سے پونی ٹیل بنا کر ربن باندھتی تھیں۔ انہوں نے مجھے بننا اور کاڑھنا سکھایا۔ مہمان داری کے آداب بھی سکھاتی تھیں۔ میں جو دو ایک گھنٹے ان کے پاس رہتی وہ مجھے خوب کھلاتی پلاتی رہتی تھیں۔ جس طرح نانی اور دادی کرتی ہیں۔ واپسی میں وہ اکثر وبیشتر میرے ساتھ ایک چھوٹی سی باسکٹ میں کچھ پھل، اپنے کچن گارڈن کی سبزی اور باغیچے کے پھول رکھ کے میرے ساتھ بھیجتی تھیں۔ واپسی پر ہر بار گیٹ تک وہ میرے ساتھ آتیں اور گیٹ سے آگے فرانسس میرے ساتھ ہوتا۔

اس دوران جہلم چھاؤنی میں ایک دو بار ریڈ کراس ویک منایا گیا تو وہ مجھے اپنے ساتھ وہاں لے گئیں اور تحفے خرید کر دیئے۔

وارنٹ آفیسر لیوس ـــــ کیپٹن محمد فیروز ملک

مسٹر ایل ٹی لیوس مسٹر ٹرنر کے جانے کے بعد ۱۹۳۷ء میں یہاں پوسٹ ہوئے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں کالج ہی سے کمیشن لیا۔ پھر کچھ عرصہ چیف انسٹرکٹر رہے۔ وہ کالج کے پہلے باقاعدہ چیف انسٹرکٹر تھے۔ اس سے پہلے یہاں سی آئی کی کوئی علیحدہ پوسٹ نہیں تھی۔

ـــــ میجر جنرل محمد بشیر خان

مسٹر لیوس کا تعلق انگلستان کے علاقہ ویلز سے تھا وہ ویلز کی طرف سے ہاکی کھیل چکے تھے۔ ان کے آنے سے کالج کی ہاکی کا معیار بلند ہوا۔ کالج کی ٹیم کے ساتھ کھیلتے تھے اور کوچ بھی کرتے تھے۔

ـــــ بریگیڈیئر عطاء محمد خان

لیوس کئی اعتبار سے ممتاز تھے۔ خوش مزاج بلند قامت اور خوش لباس۔ ان صفات میں ان کی بیوی ان سے بڑھ کر تھیں اور تعلیم و تعلم سے دلچسپی رکھتی تھیں۔ ان کی اپنی اولاد نہیں تھی۔ غالباً اس لیے بھی ان کا رویہ بہت مشفقانہ تھا۔ وہ اکثر پریفکٹس کو باری باری اپنے بنگلہ پر چائے

پر بلاتے تھے۔ یہ غیر رسمی تعلیم رسمی تعلیم سے زیادہ موثر ثابت ہوئی۔

۱۹۵۱ء میں جب میں لیوس سے انگلستان میں ملا تو وہ میجر کے رینک میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر تھے۔ میں یہاں ایک بات خاص طور پر ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ جب میں لیوس سے ان کے دفتر میں ملا تو ان کے آفس میں صرف دو تصویریں لگی تھیں۔ ایک شاہ وقت جارج ششم کی اور دوسری ملٹری کالج جہلم کی اور بات یہیں تک ختم نہیں ہوجاتی۔ ناٹنگھم میں اس کے ہاں چند دن ٹھہرا۔ انہوں نے اپنے گھر کا نام بھی سرائے رکھا ہوا تھا۔

ــــــ لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد کیانی ستارہ جرأت

بہت اچھے استاد اور کھلاڑی، گھنگریلے بال تھے ان پر وردی بہت سجتی تھی۔ اپنی خوبصورتی اور سمارٹنس کے اعتبار سے منفرد تھے۔ مسز لیوس کی اپنی شان تھی۔ ان دو کی حیثیت ہنس کے جوڑے کی سی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ دونوں یک جان اور دو قالب ہیں۔ ان کے حسن دلکشی، شائستگی اور خوش مزاجی کا اپنا ایک مقام تھا۔ بزرگوں کی بزرگی اور دانشوروں کی دانشوری اپنی جگہ۔ ایک پبلک سکول میں ایسے نوجوان انسٹرکٹروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو نوجوان طلبا کی ترجمانی کر سکیں اور جوانوں اور بزرگوں کے درمیان ایک پل کا کام دے سکیں۔ یہ رول لیوس اور مسز لیوس نے ادا کیا۔

ــــــ کرنل محمد وزیر خان ملک۔ سی آئی

۱۹۵۲ء میں، مجھے ایلتھم پیلس (لندن) میں واقع اے۔ای۔سی کے انسٹی ٹیوٹ کو وزٹ کرنے کا موقع ملا۔ وہاں بالکل غیر متوقع طور پر ملٹری کالج جہلم سرائے عالمگیر کے دو پرانے رفقا کار وارنٹ آفیسر لیوس اور وارنٹ آفیسر مورس سے ملاقات ہوئی۔ دونوں اسی انسٹی ٹیوٹ میں کام کر رہے تھے اور میجر تھے۔ گیا تو ایک دن کے لیے تھا لیکن ان دونوں خصوصًا میجر لیوس کے اصرار پر وہاں چار دن رہا۔ زیادہ تر باتیں ملٹری کالج ہی کی ہوتی تھیں۔

چوتھے دن لیوس نے کہا۔ ملک، چلو، آج سرائے چلتے ہیں۔

"سرائے"، میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں سرائے۔ چلو گاڑی میں بیٹھو Let me drive you to Sarai

میں کچھ نہ سمجھا۔ بہرحال اس خیال سے کسی تفریحی یا تاریخی مقام پر جانا ہے۔ میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ راستہ میں اس نے بتایا کہ اس وقت ہم پارک شائر سے گزر رہے ہیں۔ سرائے زیادہ دور نہیں کوئی آدھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ایک خوبصورت قصبہ کے کنارے گاڑی ایک مکان کے سامنے رکی جس کے گیٹ پر ایک تختی پر لکھا تھا سرائے اور دوسری طرف میجر لیوس اے ای سی۔ لیوس نے ہنستے ہوئے کہا۔ لو سرائے پہنچ گئے! گیٹ پر موٹر کے ہارن کی آواز سن کر مسز لیوس باہر آئیں تو لیوس نے کہا "سرائے کے دروازہ پر سرائے کے ایک مہمان سے ملو" مسز لیوس بھی بڑی خندہ پیشانی سے ملیں۔ اور باتیں پھر وہی سرائے کی۔ لیوس کچھ عرصے اسسٹنٹ کمانڈنٹ کی حیثیت سے چیف انسٹرکٹر کے بنگلے میں رہے تھے۔ ان کی مسز صحن کے پیڑوں کا حال بھی پوچھتی رہیں۔ جن لڑکوں کو وہ نرسری ٹائم سکھاتی رہی تھیں۔ ان میں سے بعض کو پوچھتی رہیں فلاں کہاں ہے۔ فلاں کو کمیشن مل گیا تھا۔ پھر لیوس نے مجھے بتایا کہ ہم نے ان اچھے دنوں کی یاد میں اپنے گھر کا نام سرائے رکھا ہے۔

مسز لیوس

—— کیپٹن محمد فیروز ملک

مسز لیوس (وارنٹ آفیسر مسٹر ایل ڈی لیوس استاد ملٹری کالج از ۱۹۳۷ تا ۱۹۴۲ء کی بیگم) کا مجھ پر ذاتی طور پر بڑا احسان ہے۔ اس مہربان خاتون کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔ میں کافی سینئر ہو چکا تھا۔ (سکول ہیڈ بوائے بن گیا تھا) لیکن انگریزی میں بات نہیں بن رہی تھی۔ ۱۹۴۰ء کی گرمیوں میں مسٹر لیوس نے مجھے مری میں اپنی کاٹیج میں بلایا اور تقریباً دو مہینے اپنے پاس رکھا اور اس عرصے میں مسز لیوس نے مجھے انگریزی پڑھائی اور مجھے امتحان کے لیے تیار کیا۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں میں نے آرمی سپیشل کا امتحان کر ہی لیا۔ یہ مسز لیوس کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ مگر نہ جانے یہ میری ماں کہاں ہوگی، کس حال میں ہوگی پتہ نہیں جیتی بھی ہے یا نہیں میں اپنی بہترین دعائیں اس کی نذر کرتا ہوں۔

—— لیفٹیننٹ کرنل خداداد خان[1]

مسز لیوس بہت ہنس مکھ اور مہربان تھیں۔ ہماری چھٹی جماعت کا نرسری رائم کا پیریڈ کبھی کبھی وہ اپنے گھر پر لیتی تھیں۔ پہلی بار جب ہم ان کے گھر گئے (ان کا بنگلہ کمانڈانٹ کے بنگلہ کے بالکل ساتھ تھا) تو پہلے تو انہوں نے پورا کمپاؤنڈ دکھایا پھر گھر کا کونا کونا دکھایا۔ اور ساتھ ساتھ بتاتی جاتیں .... This is گویا ڈائریکٹ میتھڈ سے پڑھا رہی تھیں۔ نرسری رائم کے لیے ہم جامن کے ایک گھنے درخت کے نیچے جمع ہوئے ہم لوگ دائرہ میں بیٹھ گئے اور

Here we grow round the mulberry bush

شروع ہو گئے پہلے وہ سناتیں پھر ہم ان کے ساتھ دہراتے۔ بعد کو انہوں نے ہمارے ساتھ دو ایک کھیل بھی کھیلے۔ اس وقت ان کے گھر میں کوئی بچہ نہ تھا ہمیں اپنے بچوں کی طرح ٹریٹ کر رہی تھیں۔

وہ باقاعدہ استانی تھیں سائیکل پر غالباً جہلم کینٹ کے کسی سکول میں پڑھانے بھی جاتی تھیں۔ میں نے مسز لیوس کے ہاں یہ کلاسیں چند بار ہی اٹنڈ کیں اور ان کی مادرانہ میزبانی سے فیض یاب ہوا لیکن اس کی یاد آج بھی باقی ہے۔

محبت کی خوشبو بہت دیرپا ہوتی ہے

کرنل محمد وزیر خاں ملک

—— لیفٹیننٹ کرنل منصب دار خان

کرنل وزیر خاں ملک ملٹری کالج میں تین بار پوسٹ ہوئے یکم اگست ۱۹۴۰ء کو بحیثیت سویلین ماسٹر کے آئے بی۔ ایس۔ سی آنرز بی ٹی۔ یہ سائنس کے پہلے باقاعدہ استاد تھے۔ یکم مئی ۱۹۴۲ء کو ایمرجنسی کمیشن کور میں کمیشن ہو کر پوسٹ آؤٹ ہو گئے۔ مارچ ۱۹۴۴ء میں لیفٹیننٹ کی حیثیت سے ملٹری کالج واپس آ گئے اور بطور ہیڈ ماسٹر کام شروع کیا۔ لیفٹیننٹ لیوس ایڈمنسٹریشن کے انچارج تھے۔ اپریل ۱۹۴۴ء میں وزیر خاں ملک دوسری بار پوسٹ آؤٹ ہو گئے۔ اور برما، ملایا انڈونیشیا میں جنگی خدمات ادا کرنے کے بعد نومبر ۱۹۴۶ء میں تیسری بار ملٹری کالج جہلم میں تدریسی

---

[1] کالج نمبر ۹۳۰ زمانہ تعلیم ۱۹۴۲ - ۴۹ء

ذمہ داریاں سنبھالیں۔ کچھ عرصے کیپٹن رہے، فروری ۱۹۴۷ء میں میجر وائٹ سے چیف انسٹرکٹری کا چارج لیا۔ اور ستمبر ۴۸ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ بعد کو آرمی سکول آف ایجوکیشن کے کمانڈانٹ رہے اور ۱۹۶۴ء میں کرنل کے رینک میں پاکستان ملٹری اکیڈیمی کاکول کے ڈائریکٹر آف سٹڈیز کے منصب پر ریٹائر ہوئے۔

کرنل وزیر ملک کو اس کالج کے حوالے سے تین امتیاز حاصل ہیں پہلا یہ کہ ملک وزیر صاحب کالج کے پہلے سویلین سائنس ماسٹر تھے۔ انہوں نے سائنس کی تدریس کی بنیاد رکھی اور سائنس کا نصاب مرتب کیا۔ لیبارٹری قائم کی۔ دوسرا امتیاز یہ تھا کہ ۴۳ء میں ملک صاحب لیفٹیننٹ کی حیثیت سے کالج کے پہلے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ یہ توسیعی داخلوں کا زمانہ تھا۔ جب ہندو سکھ انسٹرکٹرز بھی سٹاف میں آنے لگے تھے۔ اس کام کو ملک صاحب نے بہ حسن وخوبی سنبھالا۔ ۴۷ء میں ملک صاحب کالج کے پہلے مسلم چیف انسٹرکٹر مقرر ہوئے اور تقریباً دو برس اس منصب پر فائز رہے۔ اس عرصے میں کالج کئی بحرانوں سے گزرا ملک صاحب نے اس عرصے میں اپنے منصب کا حق ادا کیا۔

صوبیدار فتح خان

—— بریگیڈئر محمد اسلم جنجوعہ ستارہ جرأت

ہم لوگ صوبیدار فتح خان اور رسالدار عبدالوہاب کی وردی کا ہر روز مقابلہ کرتے تھے۔ دونوں کا ٹرن آؤٹ بہت سمارٹ ہوتا تھا۔ فتح خاں صاحب ایک عرصے تک آکنلک ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر رہے۔ یہ ہاؤس ایک مشکل ہاؤس تھا۔ ایک طرف سے سرائے کی آبادی سے قریب کھیت، صوبیدار فتح خاں صاحب نے ہاؤس کو خوب کنٹرول کیا ہوا تھا۔ ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ پکڑ کے چھوڑتے نہیں تھے۔ لیکن خدائی فوجدار بھی نہیں تھے۔ اس نکتہ کو میں ایک مثال سے واضح کروں گا۔ ایک سینئر لڑکا تھا نذیر۔ من مانی کرتا تھا لیکن دلیر تھا اور ہوشیار بھی سگریٹ بہت پیتا تھا۔ شدہ شدہ یہ خبر فتح خاں کے کانوں تک پہنچی۔ انہوں نے پوچھا نذیر سگریٹ پیتے ہو؟ نذیر نے کہا سر، آپ نے پوچھا ہے تو جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ کی اطلاع غلط نہیں۔ صوبیدار فتح خاں نے کہا "بچو! پکڑ لوں گا تو چھوڑوں گا نہیں"۔ "بجا ہے، میں حاضر ہوں! اس کا جواب تھا۔ میں فتح خاں صاحب کے ظرف کی داد دوں گا کہ وہ اس سے الجھے نہیں وہ پیتا رہا۔ یہ گھات لگاتے رہے۔

وہ پکڑا نہیں گیا۔ انہوں نے اسے انتقامی کارروائی کا نشانہ نہیں بنایا۔ استاد کا ظرف بڑا ہونا چاہیے۔

فتح خاں بڑے اچھے منتظم بھی تھے۔ کراس کنٹری کے انچارج تھے۔ ۱۴ اگست کی پریڈ سے پہلے جو احتجاج ہوا اس کو بھی انہی نے Mastermind کیا تھا۔ پریڈ کے بعد جو دھوم دھڑکا ہوا وہ انتظام بھی انہی کا تھا۔

حوالدار میجر نذر حسین

—— لیفٹیننٹ کرنل منصب دار خان

کالج میں میرے ابتدائی زمانے کا قصہ ہے کہ ایک روز رات کے بریپ سے اچھل کود کرتا ہوا واپس جا رہا تھا کہ راستے میں لاکر اور ڈیسک کی چابیاں کہیں گر گئیں۔ لاکر کھولنے لگا تو پتہ چلا کہ یہ حادثہ ہو گیا ہے۔ میں بھاگا بھاگا واپس گیا اور آفس کے سامنے سفیدے کے جھنڈ کے قریب چابیاں ڈھونڈنے لگا۔ اندھیرا اور سردی کا موسم، میں پُراسرار انداز میں چابیاں ڈھونڈھ رہا تھا کہ نہ معلوم کیسے نذر صاحب ادھر آ نکلے۔ مجھے دیکھ کر ٹھہر گئے بولے۔ تم جن ہو یا بھوت یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں تو پہلے سے ڈرا ہوا اور پریشان تھا میں نے کہا سر میں ۹۳۰ ہوں۔ اپنی چابیاں ڈھونڈھ رہا ہوں۔ ورنہ صبح کو کمانڈانٹ سے چھ بید لگیں گے۔ اچھا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے میں کچھ دیر تو چابیاں ڈھونڈتا رہا پھر اس خوف سے کہ کہیں دودھ پریڈ کے لیے لیٹ نہ ہو جاؤں اور یک نہ شد دو شد ہو جائے میں اپنے ہاؤس (بوڈوڈ ہاؤس) چلا گیا اور دودھ پریڈ سے لیٹ ہوتے ہوئے بمشکل بچا کچھ دیر کے بعد لاسٹ پوسٹ کا بگل ہو گیا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کروں لاکر کا تالا توڑنے کی اجازت لینے کے لیے چابیاں کھو جانے کی رپورٹ کرنی ہی پڑے گی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ نذر صاحب میرے سی کیو ایم ایس کے ساتھ میری سیکشن میں آ رہے ہیں۔ میں سمجھا کہ رپورٹ کرنے نہ آ رہے ہوں لیکن ہوا یہ کہ بالکل خلاف توقع دھاگے سے بندھی دونوں چابیاں "لے پتر" کہہ کر میرے حوالے کیں اور چلے گئے۔

ان کا یہ کرم کیسے بھولوں۔ غالباً وہ اچھا کہہ کر اپنے کوارٹر پر گئے تھے اور لالٹین لا کر چابیاں ڈھونڈتے رہے تھے۔

بے شک وہ یونیورسٹی کے ڈگری یافتہ نہ ہوں رینک میں کم ہوں لیکن یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے کالج میں ہمیں پڑھایا تھا۔

وارنٹ آفیسر ھرسٹ

——— میجر محمد حسین

وارنٹ آفیسر ہرسٹ بھی بہت کام کرتا تھا۔حیدری صاحب کے آنے سے پہلے ہرسٹ نے ریڈکراس ویک کے موقع پر کالج میں ایک ڈرامہ کیا تھا۔

رسالدار عبدالوھاب خاں

——— مسٹر عبدالغنی

راؤ صاحب کی اپنی شان تھی۔جب پہلے پہل آئے تو دفعدار تھے۔اکہرا اکٹھا ہوا جسم سانولا رنگ پر وقار مسکراہٹ رسالے کی برجس بڑے اہتمام سے پہنتے تھے۔ان میں توانائی کی بجلی بھری ہوئی تھی۔ان کی پاٹ دار آواز الگ پہچانی جاتی تھی۔بچوں سے ہنس کر بات کرتے ہماری کلاس کو حساب پڑھاتے تھے بعد میں رابرٹس ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر ہوئے۔کالج ہی میں ترقی کرتے کرتے رسالدار میجر ہوئے۔آخر میں کمیشن ہو گئے تھے۔راؤ صاحب لڑکوں میں بہت مقبول تھے اور اپنے دور کے تقریباً سب ہی لڑکوں کے نام نمبر جانتے تھے۔ان کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ میں تقریباً تیس برس کے بعد ان سے ملا۔بہت بوڑھے ہو گئے تھے لیکن مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔"۶۸۴ غنی ہو"

——— بریگیڈئر عطاء محمد خاں

راؤ صاحب اپنے کام پر پورے طور پر حاوی تھے اور پوری لگن سے کام کرتے تھے۔پرجوش طبیعت تھی اور پرشور مزاج لیکن حد درجہ ہمدرد اور فراخ دل، ہاؤس ماسٹر اور پھر ایک عرصے تک رسالدار میجر رہے۔کیولری جب مشینی ہوئی تو راؤ وہاب ان اولیں لوگوں میں سے تھے جنہوں نے نئی بکتر بند گاڑیاں استعمال کیں۔مجھے فوجی اخبار میں چھپی ہوئی ان کی تصویر اب بھی یاد ہے جس میں انہیں ایک نئی آئی ہوئی بکتر بند گاڑی کو چلاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔راؤ وہاب ان انسٹرکٹروں میں سے تھے جن کی کارکردگی طریق کار اور شخصیت سے لڑکوں کی کئی نسلوں نے بہت کچھ سیکھا۔ میں آج بھی ان کا نام عزت سے لیتا ہوں۔

ـــــ میجر محمد حسین

بعض استادوں کی قدر، وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ راؤ صاحب بھی ایسے ہی استاد تھے۔ ان کا تعلق کلانور رہتک سے تھا۔ میری مٹی بھی وہیں کی ہے۔ ان سے رشتہ داری بھی تھی۔ لیکن ہمارے اور ان کے خاندانی تعلقات اچھے نہ تھے۔ اب بھی مقدمہ بازی جاری ہے۔ لیکن یہ راؤ صاحب کا کمال تھا کہ انھوں نے خاندانی رنجشوں کا اثر مجھ پر نہ پڑنے دیا اور میرے ساتھ نارمل رہے اور اس وقت مجھے محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ ہمارے خاندانی تعلقات خراب ہیں بڑے ہو کر مجھے اندازہ ہوا کہ خاندانی رنجشوں سے بلند ہونا کتنی مشکل بات ہے اور راؤ صاحب کی قدر دل میں اور بڑھی۔

راؤ صاحب ہمیں میپ ریڈنگ پڑھاتے تھے ان کا پڑھانے کا خاص انداز تھا۔ بڑے نفیس تھے۔ پڑھاتے وقت بیچ بیچ میں شگوفے چھوڑتے رہتے۔ ان کی زبان پر اردو اور پنجابی کے بعض خاص فقرے چڑھے ہوئے تھے جنہیں وہ بڑی بے تکلفی سے استعمال کرتے رہتے جن کی وجہ سے کلاس کی فضا خوشگوار رہتی۔ موقع موقع سے کلاس میں تواضع بھی کرتے رہتے لیکن اس کا کوئی برا نہیں مانتا تھا چونکہ ہر ایک کو یقین تھا کہ راؤ صاحب اس کو اپنا سمجھتے ہیں۔

ـــــ سید شہزادہ عالم

اس زمانے میں خاکروب کالج میں صفائی فجر کی نماز سے بھی پہلے تاروں کی چھاؤں میں شروع کرتے تھے میں نے اکثر راؤ صاحب کو اس وقت ان کو چیک کرتے اور مخصوص سٹائل میں ڈانٹتے دیکھا۔ ان کا ایک تکیہ کلام بہت دلچسپ تھا جسے وہ بے تکلف استعمال کرتے تھے۔ لڑکے بہت محظوظ ہوتے تھے ہاکی خوب کھیلتے تھے اور ریفری بہت اچھے تھے۔ ہاکی گراؤنڈ میں بجلی کی طرح کوندتے کبھی یہاں کبھی وہاں۔

ـــــ خادم حسین چوہدری

راؤ صاحب شکاری بھی بہت اچھے تھے۔ راؤ صاحب کے ساتھ میں تین بار شکار پر گیا۔ دو بار

پنجاب گورنمنٹ اور میرے والد کی یونٹ سے میرے نام آگئے اور مجھے پتہ اس وقت چلا جب ایک دن یکایک میری اکاونٹ بک مجھ سے طلب کی گئی اور جب واپس آئی اس میں کریڈٹ کے خلنے میں ۸۶ روپے لکھے ہوئے تھے۔ اس زمانہ کی قیمتوں کے لحاظ سے یہ خاصی بڑی رقم تھی۔ مجھ کنگال کو اس غیر متوقع خزانے نے نفسیاتی طور پر کتنا سنبھالا دیا ہوگا اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس پر اس طرح کی واردات بیتی ہو۔ یہ تو ان کی انسان دوستی اور ہمدردی کی ایک مثال ہے۔ کسی شجر ثمر دار میں پھل آتے ہیں تو ایک پھل نہیں آتا ہر شاخ پھلوں سے لد جاتی ہے راؤ صاحب ہمدرد اور خدمت گزار انسان تھے بے شمار اللہ کے بندوں نے ان سے فیض پایا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مٹی کو ٹھنڈا رکھے۔

شاید کسی اور نے بھی لکھا ہو کہ راؤ صاحب بڑے زندہ دل اور پُر جوش بلکہ پُرشور مزاج کے آدمی تھے۔ ہمارے زمانہ میں تو ایڈم آفیسر تھے لیکن انسٹرکٹر کے طور پر ان کی مقبولیت کی داستانیں سینہ بسینہ چلی آرہی تھیں۔ راؤ صاحب کا دفتر ہماری کلاسوں کی کچی بیرکوں کے بازو میں واقع تھا۔ یہ واقعہ ۱۹۵۱ء یا ۱۹۵۲ء کا ہے ہم دسویں میں تھے گویا کمیشن کے لیے پر تول رہے تھے۔ اتفاق سے گھنٹہ خالی تھا۔ راؤ صاحب سامنے سے گزرے۔ کسی نے کہا راؤ صاحب کو بلاتے ہیں۔ کچھ گپ شپ رہے گی۔ چنانچہ راؤ سے مؤدبانہ درخواست کر کے انہیں کلاس میں بلا لیا گیا۔

"سر، آپ اتنے تجربہ کار افسر ہیں۔ کچھ آئی ایس ایس بی کے بارے میں بتائیں۔" "کیا" "سر، سنا ہے انٹرویو میں بڑی ایسی ویسی باتیں پوچھتے ہیں۔" ہاں پوچھتے تو ہیں۔ "سر جب آپ کمیشن کے لیے گئے تھے تو آپ سے بھی پوچھی ہوں گی۔" ہاں پوچھی تو تھیں۔ یہاں تک تو یہ مکالمہ سنجیدگی سے ہوتا رہا۔ پھر راؤ صاحب ہنس پڑے۔ "شیطانو میں سمجھ گیا تم کیا پوچھنا چاہتے ہو۔"

The President asked me, "Well, have you ever loved a girl ?"

"Yes Sir, I have and her children, too". "Yes Sir." Children too, who is she ?" "She is my wife."

اس پر زوردار قہقہہ پڑا۔ کہنے لگے میں نے بتایا قائم خانی راجپوت ہوں۔ گرل فرینڈ کا چکر ہمارے ہاں نہیں چلتا۔ میں لانس دفعدار تھا کہ میری شادی ہو گئی تھی۔

راؤ صاحب دس بارہ سال سے کالج میں تھے یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ انہیں کالج کی انسائیکلوپیڈیا کہا جاتا تھا۔ بے شمار لڑکوں کے نام نمبر اور ان کے والدین کے پتے یاد تھے۔ کالج کی پرانی باتیں ان ہی سے پوچھی جاتی تھیں۔ کالج میں ۱۹۴۸ء میں جو اولڈ بوائز کی پہلی ری یونین ہوئی تھی اس کے سیکرٹری بھی وہی تھے۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں ریٹائر ہو کر فوجی ٹیکسٹائل مل میں لیبر ویلفیئر آفیسر ہو گئے تھے۔ میں وہاں سپر وائزر لگ گیا تھا۔ دوسرے بے شمار لوگوں کے علاوہ میرے دکھ سکھ میں بھی شریک رہے۔ بڑی بھرپور زندگی گزاری۔ بڑی اچھی یادیں چھوڑ گئے۔

اللہ باقی من کُلِّ فانی۔

صوفی عزیز احمد

——— بریگیڈ محمد اقبال

صوفی عزیز احمد ۱۹۴۰ء میں امام مسجد اور آر آئی ریلیجیس انسٹرکٹر ہو کر آئے یہ پہلے انگریزی دان امام اور دینیات کے استاد تھے۔ ۱۹۴۲ء میں، میں ہیڈ بوائے ہونے کے بعد مغرب اور جمعے کی لازمی نمازوں کے علاوہ دوسری نمازوں پر پہلے سے کم نظر آنے لگا تو ایک دن مولوی صاحب کہنے لگے:

"Iqbal, your visits to the mosque are few and far between."

——— لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد کیانی ستارہ جرأت

جمعہ کی نماز کے بعد مسجد میں نعت خوانی ہوتی تھی۔ میں مولوی صاحب کی فرمائش پر یہ نعت اکثر پڑھا کرتا۔ شتر سوار یہ پیغام میرا لیتا جا

——— بریگیڈئر محمد اکرم ظفر

کالج کی پُر مشقت زندگی میں پُر سکون لمحے وہ ہوتے تھے جو ہم کالج کی مسجد میں گزارتے تھے۔ یہاں بھی آنا جانا گو سخت ڈسپلن کے تحت ہی تھا لیکن مسجد کے صحن میں قدم رکھتے ہی ذہنی کیفیت بدل جاتی تھی کچھ تو ایسے بھی تھے جیسے ۹۴۷ یوسف جو مغرب کی نماز کے علاوہ بھی اکثر عشاء اور فجر کی نمازیں وہاں پڑھتے تھے بلکہ اذان بھی دیا کرتے۔ شاید کچھ ذکر اور اذکار کا سلسلہ

بھی تھا۔ مسجد کی درمیانی محراب کے عین اوپر افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ لکھا تھا (افضل الذکر کے معنی بہت دیر میں سمجھ میں آئے تھے) اسی مسجد میں ایک اگر یجوایٹ امام مسجد پہلی بار دیکھا۔ یہ مولوی عزیز احمد صاحب تھے ان کے خطبات سن کر حیران رہ گئے۔ تقریر میں عام نام نہاد علماء کی سی جذباتیت نہیں تھی نہ وہ فروعی دور از کار فقہی مسائل میں الجھاتے تھے اسلام کی تعلیمات کے بنیادی موضوعات پر وہ نہایت فصیح و بلیغ اور مدلل تقریر کرتے تھے جس سے کیڈٹس متاثر ہوتے تھے۔ مولوی عزیز احمد نے ہمیں عالم اور امام مسجد کا ایک ایسا معیار دیا جو زندگی بھر کام آیا۔ تاریخ اسلام اور دین اسلام کا صحیح شعور ہمیں مولوی عزیز احمد صاحب سے ملا۔ عید میلاد النبیؐ عاشورہ محرم، اور عیدین پر ان کا خطبہ سننے کے قابل ہوتا تھا۔

۱۹۴۳ء سے کالج میں ہندو لڑکوں کی اچھی خاصی تعداد آگئی تھی۔ دھوبی گھاٹ کے قریب اسپتال کے سامنے مندر تھا۔ سینئرز کی کچی بیرک کے ایک کلاس روم میں اپنے مذہبی تہواروں کے موقع پر وہ کچھ پوجا پاٹ کرتے تھے۔ عید میلاد النبی کی تقریب کے موقع پر مسجد میں کمانڈانٹ کرنل سٹیبنگ اور دوسرے ہندو سکھ اساتذہ کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ ایک بار ۱۹۴۶ء میں مولوی عزیز احمد صاحب کو ہندوؤں نے مندر میں کسی مذہبی تہوار کے موقع پر تقریر کے لیے مدعو کیا مولوی صاحب نے ایسی زبردست تقریر کی کہ ہندو بھی عش عش کر اٹھے۔ بہت کم لوگوں کو علم ہو گا کہ مولوی صاحب اہل طریقت میں سے تھے اور سائیں کرمانوالے سے بیعت تھے۔ مولوی صاحب بڑے خوش لباس اور وجیہہ آدمی تھے۔ ان کی موٹی آنکھیں اکثر سرخ رہتیں۔ کبھی جلال میں آتے تو آنکھوں کے ڈورے اور لال ہو جاتے۔ کسی نے بتایا کہ مولوی صاحب چلہ کشی کرتے ہیں۔ بہر حال ہمارے لیے یہ بات اہم تھی کہ وہ ہر قسم کے فرقہ وارانہ تعصب سے پاک باوقار امام اور باشعور خطیب تھے۔

ـــــ مسٹر محمد اعظم خانؒ

شروع شروع میں کلاس میں دینیات پڑھاتے تھے۔ باقاعدہ ٹائی سوٹ میں آتے تھے۔ ان کا ڈارک بلیو دھاری دار سوٹ مجھے یاد ہے۔

ؒ کالج نمبر ۱۵۲۰ منیجر پی ٹی سی زمانہ ۵۵-۱۹۴۶ء

ــــــــــ کرنل امتیاز احمد ستارہ جرأت[1]

مولوی عزیز صاحب کی میری پہلی یاد جمعہ کے دن صبح کی اسمبلی کی ہے جو ہالو سکوائر کی شکل میں کمانڈانٹ کے دفتر کے پیچھے ہوتی تھی۔ مولوی صاحب سیاہ چوغہ میں ملبوس چند آیات کی تلاوت کے بعد ان کا ترجمہ وتفسیر پیش کرتے تھے۔ بلند وبالا فدا سیاہ داڑھی، دیکھنے میں بھی وجیہہ وشکیل تھے۔ سیاہ چوغے میں اور بھی شاندار نظر آتے تھے۔

دوسری بات میرے ذہن میں ہے کہ وہ مسجد کے مولوی عزیز صاحب کلاس کے مولوی عزیز صاحب سے بالکل مختلف ہوتے تھے۔ کلاس میں وہ بہت نرمی برتتے تھے۔ لیکن مغرب کی نماز کے وقت یا جمعہ کی نماز کے وقت مجال ہے کہ کسی سرگوشی کی آواز آجائے۔ وہ فوراً اس کا نوٹس لیتے اور انگریزی میں جھاڑ پلاتے۔

ــــــــــ کرنل محمد یامین[2]

اس وقت تو یہ عجیب سا لگتا تھا کہ مولوی صاحب دینیات میں نمبر پرچہ پڑھ کر نہیں لڑکے کو دیکھ کر دیتے تھے یعنی اس کے نماز اور مسجد کے ڈسپلن کو دیکھ کر۔ اب سوچتا ہوں تو ان کی یہ سوچ نظر آتی ہے آخر دینیات (اسلامیات) پڑھنے پڑھانے کا اصل مقصد تو یہی تھا۔

ــــــــــ مسٹر شربت خان محسود[3]

مسجد میں ایک چھوٹی سی لائبریری بھی تھی۔ مولوی صاحب نے مجھے اس کا انچارج بنا دیا تھا۔ جب سینئر ہوگیا تو انہوں نے مسجد کمانڈر بنا دیا تھا۔ مسجد کے ڈسپلن کے بارے میں بہت سخت تھے

---

[1] کالج نمبر ۲۱۲۴ زمانہ تعلیم ۵۸-۱۹۵۲ء

[2] کالج نمبر ۲۰۵۳ زمانہ تعلیم ۶۱-۱۹۵۴ء

[3] وائس پریزیڈنٹ ایل بی ایل

فضل حق حیدری (استاد از ۱۹۴۲ تا ۱۹۶۹ء)

قلم کار شاگرد:

لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد کیانی ستارۂ جرأت
میجر عاقل داد ستارۂ جرأت
شہزادہ ہارون اسماعیل
بریگیڈیئر محمد صادق خان
بریگیڈیئر محمد اکرم ظفر
سید عشرت حسین
لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال
ائیر چیف مارشل ذوالفقار علی خان
میجر محمد رفیق
تنویر احمد سید
بشیر احمد مرزا
لیفٹیننٹ جنرل محمد صفدر
خادم حسین چودھری
محمد زمان بھٹی
محمد یونس کیانی
بریگیڈیئر سلطان احمد
کیپٹن (نیوی) محمد جمیل خان
واجد علی
شربت خان محسود
کرنل امتیاز احمد ستارۂ جرأت

میجر اختر حسین
لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر
لیفٹیننٹ کرنل سردار محمد
لیفٹیننٹ کرنل خالد محمود کیانی
سلیم اختر کیانی
نثار کیانی
لیفٹیننٹ کرنل اقبال شاہین
لیفٹیننٹ کرنل اعجاز رفیع
بریگیڈیئر مقصود الحسن
ڈاکٹر مقصود الحسن نوری
میجر وجاہت حسین
میجر شاہد وہاب
میجر ساجد مجید بھٹی
میجر جاوید اقبال ملک
میجر خالد سعید

رفقاء کار:

میجر عبدالرشید
پروفیسر سعید راشد

ـــــــ لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد کیانی ستارہ جرأت

حیدری صاحب ۱۹۴۲ء میں کالج میں آئے تھے۔ تھے تو یہ پنجاب ہی کے لیکن شاید ایک عرصے تک بمبئی کے ایک پارسی سکول میں استاد رہنے کی وجہ سے دوسرے سویلین ٹیچرز سے بھی زیادہ سول تھے۔ انگریزی انگریزوں سے زیادہ روانی اور خوبصورتی سے بولتے۔ ناک نقشہ اور لباس بھی بہت فائن تھا۔ حیدری صاحب پہلے برڈوڈ ہاؤس کے اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر مقرر ہوئے تھے۔ ان سے تھوڑا سا وائلن بجانا میں نے بھی سیکھا۔ ۱۹۴۲ء کے اواخر میں جو پہلا ڈرامہ چھوٹا بھائی نامی انہوں نے سٹیج کیا تھا اس میں میں نے چھوٹے بھائی کا کردار ادا کیا تھا۔ ہم اس وقت تک انسٹرکٹروں سے واقف تھے ان کے آنے سے پتہ چلا کہ استاد اور انسٹرکٹر میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اب شکر کرتا ہوں کہ زندگی میں اس پائے کے استاد کو دیکھا اور اس سے فیض پایا۔ یہ کالج کی خوش بختی ہے کہ اتنے طویل عرصے تک حیدری صاحب نے کالج کو روشن کیے رکھا۔

ـــــــ میجر عاقل داد ستارہ جرأت

فضل غنی حیدری صاحب جو ایف ایچ حیدری کے نام سے مشہور تھے بے نظیر استاد تھے۔ انگریزی پڑھانے میں کمال حاصل تھا۔ لب و لہجہ اور تلفظ انگریزوں سے بڑھ کر تھا اور بولنے کا انداز اتنا خوبصورت تھا کہ تقریر اور ڈرامے کا لطف آ جاتا۔ دوسروں کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن میں انکی انگریزی سحر زدہ سا ہو کر سنتا تھا۔ ان کا لباس اتنا صاف اور نفیس اور بات کرنے کا انداز اتنا شائستہ تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ان کی کلاس میں اکثر مکالمے اور ڈرامے ہوتے رہتے تھے۔ باہر سے جو مہمان آتا وہ ان کی کلاس میں ضرور لایا جاتا۔ حیدری صاحب کا انگریزی ہینڈ رائٹنگ بھی اتنا اچھا تھا کہ ان کا لکھا چھپا ہوا نظر آتا۔ اس زمانے کی وہ کاپیاں جن پر حیدری صاحب نے اصلاح دی ہوئی ہے میں نے یادگار کے طور پر رکھی ہوئی ہیں کبھی اپنے بچوں کو دکھاتا ہوں اور کہتا ہوں دیکھو ہم نے کیسے کیسے استادوں سے پڑھا ہے۔ افسوس ہے

---

[1] کالج نمبر ۹۱۴ زمانہ تعلیم ۴۲-۱۹۴۰ء

اس زمانے میں آواز کو ٹیپ کرنے کی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ ورنہ اگر ان کی کلاسوں کو ویڈیو ٹیپ کر لیا جاتا تو ایک یادگار چیز ہوتی۔

ــــــــ شہزادہ ہارون اسماعیل

حیدری صاحب کے آنے کے بعد کالج میں باقاعدہ ڈرامے سٹیج کرنے کی ابتدا ہوئی۔ اس سے پہلے سال کے سال چھٹیاں ہونے سے پہلے ایک طرح کا ورائٹی پروگرام ہوتا تھا جس میں لڑکے دو چار گانے والے گا کے کچھ اچھل کود کر لیا کرتے تھے۔ حیدری صاحب نے جب اپنا لکھا ہوا مزاحیہ ڈرامہ "شیطان کی نانی" سٹیج کیا تو ہمیں پتہ چلا کہ ڈرامہ تو یہ ہوتا ہے مائی گاڈ، ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ڈرامہ اسے کہتے ہیں۔ اور ایسے سٹیج کیا جاتا ہے۔ اس میں میرا رول نواب صاحب کے بیٹے کا تھا جو پاگل ہونے کا ڈرامہ کر رہا تھا۔

اس ڈرامے میں ۹۹۳ محمد صادق، خالق داد، ۸۴۴ محمد اقبال، ۱۶۶ اسلم جنجوعہ، ۹۵۱ محمد نذیر ۸۷۵ محمد نور، ۹۶۶ سعد اللہ نے حصہ لیا تھا۔ یہ ڈرامہ کالج کے سنٹرل ہال میں (حال میوزیم) میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ اتنا مقبول ہوا تھا کہ اس ڈرامے کو جہلم چھاؤنی میں فرسٹ پنجاب سنٹر میں بھی پیش کیا گیا۔ ۱۹۴۵ء میں حیدری صاحب نے انگریزی ڈرامہ Virginian Mummy سٹیج کیا تھا۔ اس میں میں نے ممی کا پارٹ ادا کیا تھا۔ بعد کو زندگی میں ڈرامے فلم بہت کچھ دیکھا لیکن حیدری صاحب کی بات ہی اور تھی۔ وہ انٹرنیشنل سطح کے ڈائریکٹر تھے۔

۱۹۴۳ء ہی کے اواخر میں حیدری صاحب کی نگرانی میں کالج کی لائف پر ایک فلم بنی تھی Leaders of Tomorrow اس میں پہلا منظر ریوالی کی آواز سنتے ہی ایک لڑکے کے ہڑبڑا کر اٹھنے کا ہے۔ حیدری صاحب کے کہنے پر اور ان کی ہدایات کے مطابق وہ سین مجھ ہی پر فلمایا گیا تھا۔ ڈراموں کی ریہرسل میں اکثر رات کو دیر ہو جاتی تھی۔ حیدری صاحب اکثر پوری کاسٹ کو گھر لے جاکر کافی پلاتے اور بسکٹ کھلاتے۔ مجھے یاد ہے کہ کافی میں نے سب سے پہلے ان ہی کے ہاں پی اور بڑی حیرت سے انہیں کافی بناتے دیکھا۔

انگریزی کے تو وہ باکمال استاد تھے ہی شاید بعد کے لوگوں کو معلوم نہ ہو کہ ۱۹۴۵ ر ۱۹۴۶ء

میں وہ اردو کی ایک کلاس بھی لیتے تھے۔ ایک بار ایک شعر:

شاخ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی
پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا

کے محاسن پر انھوں نے پورا گھنٹہ گزار دیا تھا اور جب پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بجی تھی تو ہم چونکے تھے اچھا گھنٹہ ختم ہو گیا۔ وہ صرف ایک استاد نہیں جینئس تھے۔

بریگیڈ محمد صادق خان

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ اپنی طالب علمانہ زندگی کے دور میں جب اس کی اپنی شخصیت تشکیل پا رہی ہوتی ہے ایسی شخصیتوں سے دوچار ہو جو اپنے اپنے دائرہ کار میں آئیڈیل ہوں۔ اور آئیڈیل بھی ایسے کہ زندگی کے سفر کے ساتھ ساتھ ان کے کمالات کے رموز مزید کھلتے جائیں اور ان کی شخصیت کا Impact ان کی امکانی بشری کمزوریوں کے شعور کے باوجود بڑھتا جائے۔ کالج میں اس وقت ایسی شخصیتیں سٹیبنگ اور مسٹر حیدری کی تھیں۔ (ابھی ابھی ایک لمحہ پہلے جب میں یہ الفاظ "مسٹر حیدری" لکھ رہا تھا تو مسٹر کے لفظ سے پہلے جو لفظ میرے ذہن میں فلیش ہوا وہ گریٹ کا تھا۔ چونکہ میں اُردو میں لکھ رہا ہوں اس لیے گریٹ کا ترجمہ عظیم لکھے دیتا ہوں) تو عظیم مسٹر حیدری کئی اعتبار سے میرے پہلے آئیڈیل تھے (اور آخری بھی) سب سے پہلے جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ ان کا شاندار سراپا تھا۔ اس وقت تک ہم وردی کے ٹرن آوٹ کی شان اور معیار سے واقف تھے۔ (اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹرن آوٹ کی دنیا میں ایک سے ایک بڑھ کر آل رینکس موجود تھے۔ جو اپنی جگہ ایک قابل قدر بات ہے) لیکن حیدری صاحب نے ڈریس کے حسن سے آگاہ کیا۔ لباس کی خوبصورتی ان پر ختم تھی (خوبصورتی کے لفظ سے میرا پورا مفہوم واضح نہیں ہوتا اس میں نفاست اور وقار کی ایج کا اضافہ کیا جائے) لباس سے بھی پہلے ان کی صورت شکل قدبت اور رنگ روپ کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔ (جسے عرف عام میں پرسنیلٹی کہا جاتا ہے۔ گو اصل پرسنیلٹی تو آدمی کے اندر رہتی ہے)

حیدری صاحب کی ظاہری شخصیت بھی کم پرکشش نہیں تھی۔ بلند و بالاقد، کتابی چہرہ، کھلتا

ھوا رنگ، روشن آنکھیں، ستواں ناک پر بہت ہی نازک فریم کا چشمہ، بیداغ بے شکن نتھری بلیس سوٹ اور ہم رنگ ٹائی اور چال میں بھی ایک خاص تمکنت اور وقار۔ یہ تھے مسٹر حیدری جن کے ظاہر کو دیکھ کر بھی کوئی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن باطنی اعتبار سے حیدری صاحب کلچر اور ذہن کی Sophistication کی جس سطح پر تھے اس کی کوئی مثال کم از کم میری نظر سے نہیں گزری۔ یہ ملٹری کالج کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ایسا بین الاقوامی معیار کا یکتا و یگانہ استاد ملا جو دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے تعلیمی ادارے کے لیے باعث فخر ہوتا۔ انگریزی بولنے اور پڑھانے میں یہاں کے انگریز اساتذہ ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے تھے، آرٹ، موسیقی، شاعری، ڈرامہ اور لٹریچر پر وہ حاوی تھے۔ اور انہیں پڑھانے اور سکھانے کا بے حد شوق تھا جس کو وہ پوری دیانتداری اور لگن سے پورا کرتے تھے۔

وہ جس وقت یہاں آئے اگر اس پس منظر کو ملحوظ رکھا جائے تو ان کی خدمات کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ۱۹۴۲ء کے اوائل میں وہ بمبئی کے ایک پارسی سکول سے جہلم آئے۔ یہی وہ وقت تھا جب جنگی ضروریات کے تحت جی۔ ایچ۔ کیو انڈیا کے احکامات کے مطابق اس وقت کے۔ جی۔ آر۔ آئی۔ ایم سکول کو ایک بٹالین کے طور پر منظم کیا جا رہا تھا اس وقت حیدری صاحب نے کالج کے نصاب میں کلچر۔ آرٹ، لٹریچر اور ڈرامہ کی نئی Dimension کا اضافہ کیا اور بہت اونچی سطح پر کیا۔ بڑھتے ہوئے ریجی منٹیشن کی وجہ سے طلبا کی شخصیت کے ارتقاء میں جو عدم توازن پیدا ہوسکتا تھا اس کا سدباب ان کی شخصیت اور کاوشوں نے کیا۔ پہلے یہاں بوائز کمپنی کی سطح کے ورائٹی پروگرام ہوتے تھے۔ تحریری و تقریری مقابلوں کا کوئی تصور نہ تھا۔ حیدری صاحب نے طلباء کو آغا حشر اور شیکسپیئر کے ڈراموں اور اعلیٰ درجے کی موسیقی سے روشناس کرایا۔ وائلن کی بیشتر لڑکوں نے پہلے شکل بھی نہیں دیکھی تھی انہوں نے اسے مہارت سے بجا کر دکھایا اور سکھایا۔ ہارمونیم اور ستار پر وہ جادو جگاتے تھے جسے طلباء سحر زدہ ہو کر سنتے تھے۔ سُر کا احساس اور موسیقی کا ذوق انہوں نے ہمیں دیا۔ غیر نصابی سرگرمیوں کے علاوہ مطالعہ کا شوق بھی انہی کی وجہ سے عام ہوا۔ بہتوں کی طرح میں نے بھی مطالعہ کرنا انہی سے سیکھا۔ تعلیم و تربیت میں نئے دریچے کھولنے کے علاوہ انہوں نے کلاس روم کی تعلیم کو بھی نئی سمتوں سے آشنا کیا۔ پہلے یہاں بیسک انگلش Basic English

کی بے کیف ڈرل کرانے کا رواج تھا۔حیدری صاحب نے کلاس روم کے در و دیوار کو پہلی بار زندہ و تابندہ ڈائیلاگوں اور ڈراموں سے آشنا کیا۔ یہ ان کے انگریزی تلفظ اور لہجہ کا فیض تھا کہ برسہا برس کے بعد جب میں ۱۹۷۰ء میں CENTO انقرہ (ترکی) میں متعین تھا تو اکثر پارٹیوں میں انگریز اور امریکن مجھ سے پوچھتے تھے کہ آپ نے یہ کنگس انگلش کہاں سے سیکھی۔حرف انگریزی لب و لہجہ تلفظ اور ڈرامے کی بات نہیں حیدری صاحب نے طلباء کے پورے لائف سٹائل کو متاثر کیا۔

آخر میں، میں حیدری صاحب کی ذاتی زندگی کے حوالے سے بھی کچھ باتیں ریکارڈ پر لانا چاہوں گا (ہر اچھے آدمی کی زندگی، اچھائی کا ایک حوالہ بھی ہوتی ہے جو اس کی زندگی کے بعد بھی دوسروں کی زندگیوں کو اچھا بنانے کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے اور اس طرح لازوال ہو جاتی ہے)

مجھے یہ فخر بھی حاصل ہے کہ کالج میں کئی سال متواتر ان سے فیض حاصل کرنے کے بعد بھی ان کی زندگی کے آخری دنوں تک مجھے ان سے نیاز حاصل رہا بلکہ ان سے اس طرح نیاز مندانہ تعلقات رہے کہ ان کی نجی زندگی کی جھلکیاں بھی وقتاً فوقتاً دیکھتا رہا۔

جیسا کہ عام طور پر سب کو معلوم ہے کہ حیدری صاحب ۱۹۴۸-۱۹۴۶ء میں ایک آدھ سال کے وقفے کے سوا اگست ۴۲ سے دسمبر ۶۹ء تک ایک درخشندہ ستارہ کی طرح ملٹری کالج کے افق پر تابندہ رہے۔ اس عرصہ میں اپنی منصبی ذمہ داریوں کے بعد انہوں نے اپنی توجہ اور وقت کا خاصا حصہ اپنے بوڑھے والدین کی خدمت میں صرف کیا۔ مجھے یہ جان کر پہلے حیرت پھر خوشی ہوئی کہ وہ اپنے والد کی آخری علالت کے زمانے میں جب بستر سے اٹھنا بھی ان کے لیے ممکن نہ رہا تھا ان کی خدمت کے بہت سے ایسے کام جو عموماً اجرت پر کروالیے جاتے ہیں وہ خود کرنے میں عزت محسوس کرتے تھے۔ یہی وہ مسٹر حیدری تھے جن کی نفاست اور نازک مزاجی کبھی ضرب المثل تھی لیکن جب فرض نے پکارا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ کام نفاست سے بھی اونچے ہوتے ہیں۔یہ سبق بھی انہوں نے ہمیں اور اپنے بچوں کو سکھایا۔اسی طرح ان کی زندگی میں خودداری کا پہلو تھا۔یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو کالج سے ریٹائر ہو کر وہ ہفتہ عشرہ کے اندر ہی آرمی ایجوکیشن پریس سے وابستہ ہو گئے تھے۔اس کام کو بھی جس تندہی اور جانفشانی سے انہوں نے انجام دیا اس کی الگ داستان ہے۔ ان کے نوجوان رفقار کار کے لیے کام میں ان کے ہم قدم رہنا مشکل تھا۔میں ان کی خودداری کی بات کر رہا تھا۔جی۔ایچ۔کیو ان

کے شاگردوں سے بھرا پڑا تھا لیکن انہوں نے کبھی کسی سے آتے جاتے کار پر لفٹ تک لینا گوارا نہ کیا۔ سائیکل پر آتے جاتے۔ آخر آخر میں ایک موٹر بائیک خرید لی تھی۔

آدمی کی شخصیت کے جوہر چھاؤں سے زیادہ دھوپ میں کھلتے ہیں۔ حیدری صاحب کی زندگی کا سفر جب دھوپ میں شروع ہوا (میرا اشارہ زندگی کے آخری سالوں میں ان کی شفیق والدہ کی رحلت اور پھر رفیق حیات کے انتقال کی طرف ہے) اور حیدری صاحب بالکل اکیلے رہ گئے، تو شاید یہ ان کا کٹھن ترین امتحان تھا۔ آفرین ان پر کہ وہ اس مرحلے میں بھی ثابت قدم رہے اور بڑے وقار سے ثابت قدم رہے۔ جن ہاتھوں نے کبھی چائے بھی نہیں بنائی تھی اور سوئی سے ایک ٹانکا تک نہیں نکالا تھا۔ ان ہی ہاتھوں نے گھر کے سارے کام کو سنبھالا حتیٰ کہ ڈرائینگ روم کے پردے بھی اپنے ہاتھ سے سی کر لٹکائے۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ ستر برس کی عمر کو پہنچ کر بھی اپنے لائف سٹائل کے حسن میں کمی نہیں آنے دی۔ یہاں میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ خدانخواستہ کوئی کسمپرسی کی صورت نہیں تھی۔ دو آرمی آفیسر بیٹے، شادی شدہ خوشحال بیٹیاں، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ ایک بیٹی راولپنڈی میں موجود تھی۔ اس نے کئی بار اصرار کیا آپ ہمارے ساتھ آ کر رہیں بڑا گھر ہے آپ کا کمرہ علیحدہ ہو گا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن انہوں نے اپنے گھر میں رہنا پسند کیا۔ اصل میں وہ کسی پر کسی طرح بوجھ بننا نہیں چاہتے تھے اور نہ زندگی سے ہار ماننا چاہتے تھے۔ (یہ دوسری بات پہلی سے زیادہ اہم ہے۔ بوجھ تو وہ کسی پر نہ تھے اور اپنے بچوں پر کون بوجھ ہوتا ہے؟)

زندگی کے آخر سالوں میں ان کی خواہش تھی کہ وہ پنڈی کو خیرباد کہہ کر لاہور میں اپنے بچوں اور عزیزوں سے قریب آ کر رہیں لاہور میں ایک مکان کا حصول آسان کام نہ تھا۔ پنڈی کے پرانے مکان کی قیمت اتنی نہیں بنتی تھی کہ اس سے لاہور میں ایک ڈھنگ کا مکان خریدا جا سکے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ آرمی ویلفیئر فنڈ سے رجوع کیا جا سکتا ہے چنانچہ ایک عزیز کو ساتھ لے کر جی۔ ایچ۔ کیو میں اپنے کئی شاگردوں کے دفتروں کا چکر لگایا کہ ان کی وساطت سے اس امکان کا جائزہ لیں۔ اتفاق سے اس دن کوئی سیٹ پر نہ ملا۔ جب دو نہ ملے تو وہ تیسرے کے دفتر سے آدھے راستے سے لوٹ آئے اور کہا شکر ہے کہ عزت رہ گئی ہے اپنے کام کو اپنے بچوں سے کس طرح کہتا۔

آخری سالوں میں ان کی بڑی خواہش تھی کہ حج پر جائیں۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ۱۹۸۲ء میں انہیں

آمی کے رج دستے میں جگہ مل گئی۔ رج کی سعادت حاصل ہونے سے وہ بہت خوش ہوئے۔ یہ رج دستہ جب ایران سے گزرا تو حیدری صاحب کی پرانی فارسی دانی نے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔

جولائی ۱۹۸۳ء کی اکیسویں صبح تھی کوئی سوا آٹھ بجے کا وقت حیدری صاحب نے ایجوکیشن پریس میں اپنے دفتر میں اپنی کرسی پر بیٹھ کر اپنا پارکر پن اٹھایا ہی تھا کہ یکایک سر ڈھلک گیا۔ حرکت قلب بند ہو جانے سے، اس عظیم استاد کی موت میں بھی ایک سبق تھا۔ آخری سبق کہ اس طرح مرتے ہیں عظیم لوگ، خدا جنت میں ان کی روح کو آسودہ رکھے۔

——— بریگیڈئر محمد اکرم ظفر

اگست ۱۹۴۳ء میں، میں کالج میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت تک کالج میں پانچ چھ سویلین انسٹرکٹر آچکے تھے۔ مسٹر حیدری ان اساتذہ میں سب سے زیادہ سمارٹ اور خوش لباس تھے ہفتہ کے ہر دن ہم رنگ ٹائی کے ساتھ نیا تھری پیس سوٹ، سرخ سفید کتابی چہرے پر باریک سنہرے فریم کی عینک، پروقار اور پرتمکنت چال، انگریزوں سے بڑھ کر انگریزی اور اس کا پرکشش لب و لہجہ، یہ سب خصوصیتیں ایسی تھیں جنہوں نے ابتدا میں انہیں ہمارے لیے ایک پراسرار ڈرامائی کردار بنا دیا تھا۔ جب برڈوڈ ہاؤس میں ہمارے ہاؤس ماسٹر کی حیثیت سے حیدری صاحب کبھی کبھی انگریزی میں لیکچر دیا کرتے تھے، اس وقت تو ہمیں انگریزی کی شدبد ہی تھی۔ ان کا لیکچر ہم میں سے بیشتر کے سروں کے اوپر سے گزر جاتا لیکن ان کا لب و لہجہ الفاظ کی بے پناہ روانی آواز کا اتار چڑھاؤ اور تھوڑا سا ڈرامائی یا Elocution کا سا انداز، ایسی چیزیں تھیں جن کا تاثر آج بھی میرے ذہن میں باقی ہے۔ اب چشم تصور سے پیچھے مڑ کے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی منجھا ہوا برطانوی Parliamentarian دارالعوام سے خطاب کر رہا ہے باوجود ہمارے انگریزی نہ سمجھنے کے وہ ہمیشہ انگریزی بولتے اور انگریزی ہی میں لیکچر دیتے۔ بنیادی طور پر وہ فنکار تھے۔ ان کی ہر تقریر فنکاری بلکہ سحرکاری کا نمونہ ہوتی تھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ذہن میں ہمیشہ کے لیے ایک Image قائم ہو گئی کہ انگریزی تقریر اس طرح کی جاتی ہے۔ اس کا اسلوب یہ ہوتا ہے۔

ان دنوں حیدری صاحب آٹھویں جماعت کو Basic English پڑھاتے تھے روزمرہ کے استعمال یعنی بول چال کی انگریزی سکھانے کا یہ ایک موثر طریقہ تھا۔ چند سو انگریزی الفاظ اور ان کے Combinations) سے بول چال کی انگریزی سکھانے کا سلسلہ وار نصاب تیار کیا گیا تھا۔ بیسک انگلش کو ڈائریکٹ میتھڈ سے یعنی متذکرہ صورتحال پیدا کر کے حرکات، اشاروں سے اور مکالموں کے ذریعہ پڑھایا جاتا تھا۔ چونکہ حیدری صاحب ڈرامہ کے یکتا و یگانہ ماہر تھے۔ وہ بیسک انگلش کے ہر سبق کو ایک ڈرامائی ٹکڑے کے طور پر ایکٹنگ اور ڈائیلاگ کے ذریعہ سے زندہ کر دیتے تھے۔ لطف یہ کہ سبق کے دوران اُردو کا ایک لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔

بیسک انگلش کی کتابیں مکمل طور پر انگریزی معاشرت اور انگریزی ماحول کی عکاسی کرتی تھیں، ان میں ایک کردار مسٹر انگلش اور ان کے خاندان کو بنیادی بنا کر مختلف واقعات و حالات، حادثات کے حوالے سے انگریزی بول چال سکھائی جاتی تھی۔ بیسک انگلش کا نصاب جنگ کے زمانہ میں جنگی ضروریات کے پیش نظر جلد سے جلد انگریزی سکھانے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ مسٹر حیدری کی شخصیت اس انگریز جنٹلمین سے اتنی ملتی جلتی تھی کہ لڑکوں میں ان کا نک نیم ہی مسٹر انگلش پڑ گیا تھا۔ وہ ہمیں پکے انگریز نظر آتے تھے۔ وہی خدوخال، لباس، لب و لہجہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انگریز کی طرح قریب ہوتے ہوئے دور، اسی طرح بے رحمی سے ضابطے اور اصولوں کے پابند اور ہم کالوں کے معاملہ میں اسی طرح سخت گیر۔

شروع شروع میں ہم نے انہیں کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مگر چند سال بعد جب انہوں نے ہمیں دسویں میں انگریزی پڑھانی شروع کی تو انکشاف ہوا کہ وہ مسکراتے بھی ہیں۔ اور مزاج شگفتگی کے عنصر سے خالی نہیں۔ ان کی حس مزاح کو پہلی بار بروئے کار دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی۔ اس زمانے میں آرمی سپیشل کے انگریزی کے نصاب میں اچھی خاصی ادبی چاشنی تھی۔ حیدری صاحب نے اسے پڑھایا اور خوب پڑھایا۔ ان کا اپنا ادبی ذوق بہت نفیس و حسین اور مطالعہ وسیع و عمیق تھا۔ ایک ڈرامہ آرٹسٹ کے طور پر الفاظ کی ادائیگی کے فن پر تو انہیں پورا عبور تھا ہی وہ الفاظ کے صوتی اور معنوی حسن کے رمز شناس بھی تھے۔ اس لیے ان کی

تحریر اور تقریر دونوں میں اظہار وبیان کا حسن ہوتا تھا اور اس حسن کا کچھ احساس وادراک انہوں نے اپنے شاگردوں کو بھی دیا۔ ان سے انگریزی پڑھنے کا جو لطف آیا اس کا مزا آج بھی باقی ہے۔ انہوں نے جو انگلش پوئٹری پڑھائی اس سے قدم قدم پر نئے احساسات کی قندیلیں روشن ہوتی گئیں۔ نظموں کے لفظی حسن کے علاوہ ان کی معنوی گہرائیوں میں غوطہ زن ہونا سکھایا۔ اس عرصے میں وہ خود بھی خاصے بدل گئے تھے۔ وہ چند سال پہلے کے مسٹر انگلش نہ تھے۔ ہاؤس میں وہ پبلک سکول کے روایتی سخت گیر ہاؤس ماسٹر کے روپ میں سامنے آتے تھے۔ کلاس روم میں ان کی شخصیت کا جمالی پہلو نظر آتا تھا۔ وہ ایک آرٹسٹ معلم تھے یا معلم آرٹسٹ، پڑھاتے تھے وہ انگریزی لیکن موقع موقع سے اردو کے شعر بھی برجستہ سناتے تھے۔ ایک روز مغل بادشاہ بابر کی مہم جوئی اور عیش کوشی زیر بحث تھی کہ یہ شعر پڑھا:

گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ وبیاباں سے گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

پھر کہا فوج کی زندگی بھی کبھی سیل تند رو اور کبھی جوئے نغمہ خواں ہوتی ہے۔

حیدری صاحب نے ہمارے ادبی ذوق کی بڑی آبیاری کی۔ میں خود فوجی زندگی میں مستغرق ہو کر ادیب یا شاعر تو نہیں بن سکا مگر ایک ذوق تھا جو اس وقت پروان چڑھا اور آج بھی ساتھ ہے۔ شروع شروع میں ان کا سراپا اور لب ولہجہ دیکھ کر ہم نے ان کا نک نیم بلیک انگلش کے بنیادی کردار کے نام پر مسٹر انگلش رکھ دیا تھا۔ لیکن جب ان کی اندرونی شخصیت سامنے آئی تو پتہ چلا کہ وہ اندر سے پکے قوم پرست پاکستانی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اکثر انگریزی پڑھاتے ہوئے اُردو اور فارسی شاعری کی نزاکتوں اور گہرائیوں کا تذکرہ بھی کرتے اور کہتے کہ ہر زبان کا اپنا مزاج اور اپنا کلچر ہوتا ہے۔ اُردو شاعری کے بارے میں ہمیں کسی احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔

اُردو انگریزی شاعری کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے ایک بار سکاٹش شاعر "تھامس گرے" کی بڑی دلکش اور دلگداز نظم سنائی:

Of in the stilly night,
Ere slumber's chain has bound me

Fond memory brings the light
of other days around me:
The smiles, the tears
Of boyhood's years
The words of love then spoken;
The eyes that shone
Now dimmed and gone
The cheerful hearts now broken;
Thus in the stilly nights
Ere slumber's chain has bound me
Sad memory brings the light
Of other days around me
When I remember all
The friends so linked together
I've seen round me fall
Like leaves in wintry weather
Then I feel like one
Who treads alone
Some banquet hall deserted
Whose lights are fled
Whose garlands dead
And all but he departed;
Thus in the stilly night
Ere slumbers' chain has bound me
Sad memory brings the light
Of other days around me

Recitation کے تو وہ بادشاہ تھے۔نظم کو اس طرح سنایا کہ ایک ایک لفظ میں جان پڑ گئی۔ ہم مسحور بیٹھے تھے لو کہ اب اُردو ترجمہ سنو:

اکثر شبِ تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے گزری ہوئی دلچسپیاں بنتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی اور ڈالتے ہیں روشنی

میرے دل صد چاک پر۔ وہ بچپن اور وہ سادگی۔ وہ رونا اور ہنسنا کبھی۔ پھر وہ جوانی کے مزے۔ وہ دل لگی وہ قہقہے۔ وہ لذت بزم طرب۔ یاد آتی ہے ایک ایک سب۔ دل کا کنول جو روز و شب۔ رہتا شگفتہ تھا سو اب۔ اس کا یہ ابتر حال ہے، اک سبزۂ پامال ہے۔ اک پھول مرجھایا ہوا۔ روندا پڑا ہے خاک پر۔ جب آہ ان احباب کو۔ میں یاد کر اٹھتا ہوں جو۔ یوں مجھ سے پہلے اٹھ گئے۔ جس طرح طائر باغ کے۔ یا جیسے پھول اور پتیاں۔ گر جائیں سب قبل از خزاں۔ اور خشک رہ جائے شجر۔ اس وقت تنہائی مری۔ بن کر مجسّم بے کسی۔ کر دیتی ہے پیش نظر۔ ہو حق سا اک ویران گھر۔ برباد جس کو چھوڑ کر سب رہنے والے چل بسے۔ ٹوٹے کواڑ اور کھڑکیاں۔ چھت سے ٹپکنے کے نشان۔ پرنالے ہیں روزن نہیں۔ یہ حال ہے آنگن نہیں۔ پردے نہیں چلمن نہیں۔ اک شمع تک روشن نہیں۔ میرے سوا جس میں کوئی۔ جھانکے نہ کوئی دیو بھی اکثر شبِ تنہائی میں ۔ ۔ ۔

اس کو بھی تحت اللفظ Recite کیا۔ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کونسی (Recitation) بہتر تھی۔ انہوں نے خود ہی تبصرہ کیا کہ اردو نظم گو ترجمہ ہے لیکن نزاکت اظہار اور حسن تخیل میں اصل سے کم نہیں۔ چالیس سال پہلے پڑھی ہوئی یہ دونوں نظمیں میں نے محض اپنے حافظہ سے لکھی ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کتنا ڈوب کر پڑھایا ہوگا کہ ایک ایک لفظ دل پر نقش ہو گیا ہے۔ ایک دن Fatalism پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے عمر خیام کی ایک رباعی سنائی۔ پھر فٹز جیرالڈ کا کیا ہوا اس کا منظوم انگریزی ترجمہ بلیک بورڈ میں اپنے ہاتھ سے انگریزی کے بڑے حروف میں لکھا۔

Awake, for the morning in the bowl of night
Has flung the stone that puts the stars to flight
And lo, the hunter of the east has caught,
The Sultan's turret in a noose of light.

ابھی ہم فٹنز جیرالڈ ہی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ انھوں نے ڈاکٹر تاثیر کا کیا ہوا اردو ترجمہ سنایا!

اٹھ جاگ کہ شب کے ساغر میں سورج نے وہ پتھر مارا ہے
جو مے تھی وہ سب بہ نکلی ہے جو جام تھا پارہ پارہ ہے
مشرق کا شکاری اٹھا ہے مغرب کو کمندیں پھینکی ہیں
اک پیچ میں قصرِ سکندر، ایک پیچ میں قصرِ دارا ہے

ساری کلاس پھڑک اٹھی۔ ہمارے اصرار پر انھوں نے اس ترجمہ کو بھی بورڈ پر لکھا اور ہم نے فوراً کاپیوں میں نقل کر لیا۔

۱۹۴۶ء میں کچھ عرصے حیدری صاحب نے ہمیں اُردو بھی پڑھائی اُردو کے نصاب میں مشہور ریاضی دان خواجہ دل محمد کی نظم علم و فن بھی شامل تھی جس کے چند بند نقل کرتا ہوں۔

سعادت، سیادت، عبادت ہے علم، حکومت ہے دولت ہے طاقت ہے علم۔ یہ پوچھو کسی مردِ مختار سے۔ قلم تیز چلتا ہے تلوار سے۔ نہ پھولوں کی سیجوں سے آتا ہے علم۔ نہ ورثے میں انسان پاتا ہے علم۔ تجسس سے کھلتے ہیں فطرت کے باب۔ جو ذرّے میں جھانکو ملے آفتاب۔ اگر رازِ قدرت کا ہے دل میں چاؤ۔ تو فطرت کی رگ رگ پہ نشتر چلاؤ۔ جو قدرت کے ہو راز دانوں میں تم۔ تو تارے لگو آسمانوں میں تم۔ نہیں علم و دانش تجارت کا مال۔ یہ عرفاں کی ہے دولت لازوال۔ بڑھے علم انسان کا تعلیم سے۔ کہ دولت یہ دوگنی ہو تقسیم سے۔ ترا علم و فن گنج الماس ہے۔ جہالت بڑا سب سے افلاس ہے۔ جو سیکھو کسی سے سکھاتے چلو۔ دیئے سے دیئے کو جلاتے چلو۔

حیدری صاحب نے اس نظم کو پڑھاتے ہوئے پوچھا اس نظم کا سب سے زیادہ قیمتی مصرعہ کون سا ہے؟ اس کچی عمر میں ہمارا شعور اتنا کہاں تھا کہ حقیقت کی تہہ کو پہنچتے۔ کسی نے کہا:

حکومت ہے، دولت ہے طاقت ہے علم

میرا اپنا خیال تھا کہ؛ قلم تیز چلتا ہے تلوار سے

بہتر ہے۔

بہرحال حیدری صاحب ایک ایک مصرعے کی تشریح کرتے رہے۔ پھر خود کہا انڈر لائن کر لو۔ اس نظم کے سب سے قیمتی مصرعے دو ہیں، ذہنی لحاظ سے:

جو ذرّے میں جھانکو ملے آفتاب

اور اخلاقی لحاظ سے:

دیئے سے دیئے کو جلاتے چلو

میرا خیال ہے کہ انہوں نے اس مصرعہ:

جو ذرّے میں جھانکو ملے آفتاب

کو ذہنی لحاظ سے جب اچھا کہا اُن کے ذہن میں Nuclear Fission ہو گا مجھے یقین ہے کہ خواجہ دل محمد جو اپنے عہد کے بہت بڑے ریاضی دان تھے۔ وہ ایٹم کی تھیوری سے ضرور واقف ہوں گے۔

حیدری صاحب نے نظم کے آخری مصرع:

دیئے سے دیئے کو جلاتے چلو

پر بہت زور دیا اور اس مصرعہ کو بار بار دہرایا۔ اس میں جو درس زندگی ہے، جو فنی اور معنوی حسن ہے۔ اس پہ دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ آخر میں مشہور چینی فلسفی اور معلم اخلاق کنفوشیس کا یہ قول سنایا:

It's better to light a small candle
Than to curse darkness all the time.

مجھے خیال پڑتا ہے کہ کنفوشیس کا یہ قول ایف اے سی سی میں بھی ایک بلیک بورڈ پر لکھا تھا اور جہاں Candle کا لفظ آیا تھا، اس کی جگہ ایک موم بتی بنی تھی۔ جس سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

آج جبکہ میں چراغوں کی قطار کے لیے حیدری صاحب پر یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو بار بار حیدری صاحب کی وہ امیج میرے تحت الشعور پر ابھر رہی ہے جب وہ کلاس میں اس مصرعہ

دیئے سے دیئے کو جلاتے چلو

کی بڑے انہماک سے اور جوش خطابت سے بڑی خوبصورت اور مؤثر انگریزی میں تشریح کر رہے تھے تو انہوں نے اپنے دیئے سے بہت سے دیئے جلائے۔

حیدری صاحب ایک اور حوالے سے بھی مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے

اور طلباء کی طرح مجھے بھی لائبریری سے روشناس کرایا بلکہ ذوق مطالعہ کی باقاعدہ آبیاری کی۔ ۱۹۴۵ء میں کالج لائبریری کو کیجز کالج نوگانگ سے کتابیں آنے پر باقاعدہ طور پر منظم کیا گیا تھا اور اس میں مختلف موضوعات پر مزید نئی کتابوں کا اضافہ کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے کالج لائبریری تھوڑی سی فرسودہ کتابوں پر مشتمل ایک بہت محدود سی چیز تھی۔ حیدری صاحب نے اس تشکیل نو میں حصہ لیا اور سب سے بڑی خدمت یہ کی کہ اکثر سینئر لڑکوں کو لائبریری لے جانے اور ان کی اپنی پسند کی کتابیں لینے میں رہنمائی کرتے۔ اس زمانہ میں غیر نصابی کتابیں پڑھنے کا زیادہ رواج نہ تھا۔ بہر حال کچھ کیڈٹس جیسے محمد صادق (بریگیڈیر ریٹائرڈ) ذوالفقار علی خاں (ریٹائرڈ ائر چیف مارشل پی اے ایف) اور یہ خاکسار (اکرم ظفر) کو کتابوں کا ایسا چسکا لگا تھا کہ اکثر و بیشتر ہم لوگ لائبریری میں نظر آتے اور خالی وقت میں کالج کے مختلف گوشوں میں روپوش کتابیں پڑھتے نظر آتے۔ یہ حیدری صاحب کی تحریک و ترغیب کا نتیجہ تھا۔ میں نے چونکہ اپریل ۱۹۴۶ء میں ساڑھے چودہ سال کی عمر میں آرمی سپیشل کر لیا تھا اور چونکہ ایف ایس سی کے لیے موزوں سٹاف کا (خصوصاً ۱۹۴۷ - ۴۹ء کے عرصہ میں کوئی خاص انتظام نہ تھا) اس لیے سیلف سٹڈی کے لیے میرا بیشتر وقت لائبریری ہی میں گزرتا تھا۔ مزید براں اردو انگریزی میں عام ادبی مطالعہ کا بھی بہت موقع ملا۔ بنیادی طور پر حیدری صاحب کی ترغیب سے کالج لائبریری میری زندگی کا اس طرح حصہ بن گئی تھی کہ ۱۹۵۰ء میں کالج چھوڑنے کے کئی سال بعد بھی اکثر خواب میں اپنے آپ کو لائبریری میں پاتا۔ میتھیو آرنلڈ نے کلچر کی تعریف Sweetness and light سے کی ہے۔ میں اپنے حصے کی Sweetness اور Light کے لیے بالواسطہ طور پر حیدری صاحب کا مرہون منت ہوں۔

کالج ڈرامیٹک کلب حیدری صاحب کا محبوب ترین ادارہ تھا۔ وہ ڈراموں کی پروڈکشن اور ڈائریکشن اس انہماک اور اس طرح جان مار کر کرتے تھے جیسے وہی ان کی اصل زندگی ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کوئی دوسرے حیدری صاحب ہیں۔ ہاؤس ماسٹر مسٹر حیدری اور استاد مسٹر حیدری سے بالکل مختلف، آرٹسٹ، ایکٹر، ڈائریکٹر اور موسیقار مسٹر حیدری! سچا فنکار تو وہی ہوتا ہے جو اپنے فن سے دیوانہ وار وابستہ ہو۔ ڈرامہ اور موسیقی سے حیدری صاحب کی وابستگی اسی نوعیت

کی تھی۔ وہ ایک Perfectionist تھے۔ جب پڑھانے تھے تو مضمون میں ڈوب جاتے اس طرح کہ اپنے ذہنی ادراک اور جذباتی تجربے میں بڑی حد تک اپنی کلاس کو بھی شریک کر لیتے تھے۔ ان کی ہر کلاس ایک ایسی فکر انگیز اور دلکش سٹیج پرفارمنس ہوتی تھی، جس کا ہر لڑکے کو انتظار رہتا تھا۔

ڈرامہ کی تیاری کے دوران ان کی وارفتگی اور بھی زیادہ شدید ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک عظیم آرٹسٹ اپنے خونِ جگر سے کسی شاہکار کی تخلیق میں محو بلکہ مستغرق ہے۔ سیٹ کی تیاری کاسٹیوم کی ڈیزائننگ، گانوں کی دھنوں کی کمپوزیشن، غرضیکہ ڈرامہ کی پروڈکشن کے ہر شعبہ میں ان کی مہارت کارفرما ہوتی تھی۔ ڈرامہ کی پروڈکشن اور ڈائریکشن سے بڑھ کر ان کا کمال یہ تھا کہ وہ دورافتادہ علاقوں کے ان لڑکوں کو بھی جنہوں نے یہاں آنے سے پہلے کبھی ڈرامہ یا سٹیج کا نام تک نہ سنا ہوتا ایسی خوبصورت ایکٹنگ سکھا دیتے کہ جو دیکھتا عش عش کر اٹھتا۔ میں نے بعد کو ڈرامے دیکھے یہاں بھی اور بیرونِ ملک بھی لیکن حیدری صاحب کے معیار سے آگے کسی کو نہ پایا۔ وہ خود بھی ایک منجھے ہوئے ایکٹر تھے۔ ۱۹۴۶ء میں انہوں نے شیکسپیئر کے ڈرامہ مرچنٹ آف وینس کا کورٹ سین پیش کیا تھا۔ اس میں سود خور یہودی، شائیلاک کا کردار انہوں نے خود ادا کیا تھا اور کمال کر دیا تھا۔ انہوں نے شائیلاک کی تقریر کے الفاظ:

The pound of flesh, which I demand of him
Is dearly bought, its mine, and I will have it
If you deny me, fie upon your law;
There is no force in the decrees of Venice
I stand here for judgement: Answer - Shall
I have it

اتنے موثر انداز میں پیش کیے کہ ہال میں سناٹا چھا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کورٹ سین میں پورشیا (Portia) کا کردار صادق خاں نے ادا کیا تھا اور مرسی سپیچ (Mercy speech)

The quality of mercy is not strained
It droppeth as the gentle rain from the heaven
Upon the place beneath; it is twice blest
It blesseth him that gives, and him that takes
'Tis mightiest in the mightiest

بہت خوبصورتی سے ادا کرنے پر بڑی داد ملی تھی۔ پونچھ کشمیر کے ایک دور افتادہ گاؤں کے ایک لڑکے کو اتنا اونچا کر دینا کہ وہ شیکسپیئر کے ڈرامہ میں ایک مشکل کردار اتنی کامیابی سے ادا کر سکے۔ اس کی صلاحیت اپنی جگہ لیکن اصل میں یہ حیدری صاحب کا کمال فن تھا۔
کالج چھوڑنے کے بعد جب میں نے شیکسپیئر کا مطالعہ کیا اور انگلستان کی معروف تھیٹریکل کمپنیوں کے پیش کردہ شیکسپیئر کے ڈرامے دیکھے تو ڈائریکشن اور پروڈکشن کے اعتبار سے حیدری صاحب یاد آئے۔ اس دائرہ میں وہ یقیناً ایک جینئس تھے۔

ان کی دوسری محبت موسیقی تھی۔ وہ نہ صرف سُر میں گا سکتے تھے بلکہ چند سازوں کے بجانے میں جیسے وائلن، پیانو، ہارمونیم میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ لیکن ان کا پسندیدہ ساز دلربا تھا جو سارنگی اور وائلن کے درمیان کی چیز ہے۔ دل ربا وہ بڑے شوق سے اور خوبصورتی سے بجایا کرتے تھے۔
پاکستان بننے کے بعد جب ہم نصابی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہوا اور ان سرگرمیوں کو فائن آرٹس اینڈ کلچرل سنٹر کے ادارہ کی صورت میں منظم اور متحرک کیا گیا اور ان میں فوٹو گرافی کا اضافہ ہوا تو اس کے ڈائریکٹر بھی مسٹر حیدری ہی بنائے گئے۔ کرنل سٹیبنگ کے زمانہ سے کالج البم کی تیاری حیدری صاحب کے ذمہ تھی۔ وہ البم بھی فائن آرٹ کا ایک مرقع تھا۔ ہر تصویر بڑی نفاست سے البم میں لگی ہوئی اور ان کے اپنے خوبصورت خط میں ہر تصویر کا اور تصویروں کے سبجیکٹ کا عنوان درج ہوتا۔ حیدری صاحب نے ایف اے سی سی میں دنیا کی بعض شاہکار تصاویر آویزاں کر رکھی تھیں اور ایف اے سی سی کی لائبریری میں تصاویر کے بعض نادر مجموعے بھی تھے۔

آزادی کے بعد کالج کی فضا میں وہ گھٹن نہ رہی جو برطانوی امپیریلزم (Imperialism) کے دور میں تھی۔ کرنل سٹیبنگ اپنی تمام ذاتی خوبیوں کے باوجود بہرحال سلطنت برطانیہ کے جاہ و جلال

کا نمائندہ تھا اور اس کا مشن واضح طور پر سلطنت برطانیہ کے بقاو دوام کے لیے مؤثر اور وفادار جانباز مہیا کرنا تھا جس میں قومی امنگوں یا تعلیم کے وسیع تر مقاصد کی لازمًا زیادہ گنجائش نہ تھی۔

۴۸-۱۹۴۷ء میں بھی حیدری صاحب وہ نہیں تھے جو وہ ۴۶-۱۹۴۲ء میں تھے۔ آزادی کی سحر طلوع ہوتے ہی ہم نے دیکھا کہ حیدری صاحب کا مسٹر انگلش بھی رخصت ہو چکا ہے عظیم استاد اور فنکار تو وہ پہلے بھی تھے اب ان کی شخصیت کا جمالی اور قومی پہلو اور نکھر کر سامنے آیا۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کے کئی ہیرو ان کے عظیم ہاتھوں کے تراشے ہوئے تھے۔ اس یادنامہ کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک Quotation کو بھی تاریخ کے سپرد کرنا چاہوں گا جو انہوں نے ہماری کلاس کو ۱۹۴۶ء میں لکھوائی تھی۔ اس Quotation کے دریچہ سے ان کے تعلیمی و تربیتی نظریات کے پس منظر میں جھانکا جا سکتا ہے۔ وہ عبارت یوں تھی۔

"All Fords are exactly alike, their Maker used to say. But no two persons are exactly alike. Every new born soul is a new thing under the sun, you should therefore look for that spark in yourself that makes you different from others. Society and School (more so a public school) tend to iron out these differences but my advice to you is, never let that spark be lost. For that is your only claim to individuality."

حیدری صاحب ہی نے ہملٹ ڈرامہ میں (Ophelia) اوفیلیا کی قبر پر پھول پھینکتے ہوئے ڈرامہ کے ہیرو ہیملیٹ کا فقرہ (Sweets to the sweet) سنانے کے بعد غالب کا ایک شعر سنایا تھا۔ آج ان کی یاد کی نظر کرتا ہوں:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

——— سید عترت حسنین[۱]

آصف[۲] آپ کے لیے پہلا چراغ کون ہے؟

عترت مسٹر حیدری، ۱۹۴۹ء میں دیال سنگھ کالج لاہور میں ایک انٹر کالج انگلش ڈیبیٹ ہوئی تھی جس میں لاہور کے معروف کالجوں نے حصہ لیا تھا۔ ڈیبیٹ کا موضوع تھا۔

Women are born diplomats. Hence they can prove better administrators than men.

اس میں کالج کے چار مقرروں کی ٹیم نے کالج کی تاریخ میں پہلی بار اس طرح اور اس معیار کے انٹر کالج مقابلہ میں حصّہ لیا اور سرخ رو ہوئے۔ اس مباحثہ پر پاکستان ٹائمز نے یہ تبصرہ کیا (جو میں ۱۹۴۹ء کے میگزین ترببیت سے نقل کر رہا ہوں)

The All Pakistan Debates proved a success and were remarkable for the fact that the Military College Jhelum, appears on the plat-form for the first time, with determined young speakers in uniforms.

یہ امتیازی کامیابی محض اتفاق نہیں تھی۔ چونکہ میں بھی ان چار مقرروں میں سے ایک تھا اس لیے مجھے معلوم ہے کہ حیدری صاحب نے ہمارے لب و لہجہ (Accent, Expression) پر کتنی محنت کی تھی۔ اس ضمن میں یہاں یہ بتانا خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ اسی سال کالج یونین بنی تھی اور ۱۲۲۳ (بریگیڈیئر ریٹائرڈ) اکرم ظفر اس کے پہلے صدر تھے لیکن حیدری صاحب کا اصل

---

۱ کالج نمبر ۱۳۰۹ زمانہ تعلیم ۴۹-۱۹۴۴ء

۲ آصف سعید راشد زمانہ تعلیم ۸۸-۱۹۸۳ء

میدان ڈرامہ تھا۔ ۱۹۴۹ء کی سالانہ تقریب تقسیم انعامات کے فنکشن پر حیدری صاحب نے دن رات ایک کرکے ایک ڈرامہ Virginian Mummy سٹیج کرایا تھا۔ اس میں امریکی کیپٹن رائفل کا کردار میں نے ادا کیا تھا۔ اس کا ہیرو ڈاکٹر گیلین (Galen) ایک کیمیا دان ہے جو ایک ایسا (Elixer) آب حیات ایجاد کرنا چاہتا ہے جس سے وہ مردوں کو زندہ کر سکے۔ وہ اسی دھن میں لگا دن رات تجربات کرتا رہتا ہے اس کی ایک لڑکی لوسی ہے۔ جس سے کیپٹن رائفل کا Affair ہو جاتا ہے اور یوں پلاٹ میں رومانٹک ٹچ آجانے سے ڈرامہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔

آصف آپ کو اپنے پارٹ کا کوئی ٹکڑا یاد ہے؟

عترت یاد تو تقریباً سارا پارٹ ہی ہے لیکن وہ خاص ٹکڑا سناتا ہوں جس پر حیدری صاحب نے غیر معمولی محنت کی تھی:

Well, here I am once again, once more amid the balmy atmosphere that gives me life, the joy and the animation to all my retrospection. I am afraid Lucy will scarcely recognize me, for two years campaign, on the battle field changes a man's complexion as a chameleon does its colour.

اس میں دو تین لفظ ایسے بھی تھے جیسے Atmosphere اور Scarcely جن کا امریکی لہجہ انہوں نے بار بار درست کرایا تھا۔ وہ Perfectionist تھے۔ جب تک صحیح معیار حاصل نہ ہو جائے وہ پریکٹس جاری رکھتے تھے۔ پلاٹ میں آگے چل کر مجھے لوسی کی خاطر ایک مصری کا بھیس بدلنا پڑتا ہے۔ جو ایک ممی کا سودا ڈاکٹر گیلین سے کرنا چاہتا ہے۔ اب

بحیثیت ایک مصری کے مجھے انگریزی فرانسیسی لب ولہجہ میں بولنا تھا۔ وہ فقرہ آج بھی یاد ہے۔

Before we depart, we shall, better be acquainted. If not, I bow my submission to genuis. It's a great honour to meet you, Sir:

اس فقرہ میں ٹی کی آوازوں کو "تے" میں بدلا اور فرانسیسی لہجہ میں انگریزی بولنے کی باربار مشق کرائی۔ اس ڈرامہ میں ڈاکٹر گیلین کا پارٹ ۱۹۵۱ فیض نے کیا تھا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ اتنی بار ریہرسل کیا تھا کہ اس کا پارٹ بھی مجھے زبانی یاد ہوگیا تھا۔ کچھ فقرے تو اس وقت بھی میری زبان پر آرہے ہیں۔

آصف کون سے؟

عشرت

If I can only make the dead rise again and call back to life which has been extended for the three thousand years. Why vanish you all quaks and diabolical monsters. The world shall all begin a new. The famous battles of Gen Ceasar, the dauntless the brave adventurers of Alladin, the wonderful, will be enacted like an opera at the theatre, while I --- I stand at the top of mount Qutab Minar and pour down the elixer of my newly invented, compound extract of "Live for ever - Live for ever."

ڈرامہ کی رات حیدری صاحب نے فیض کا میک اپ اس غضب کا کیا تھا کہ

وہ سچ مچ کا ایک بوڑھا خبطی کیمیادان نظر آتا تھا۔ اس کے بولنے کا سٹائل بھی اتنا حقیقی تھا کہ سامعین اور ناظرین کو یقین نہیں آتا تھا کہ ایک لڑکا بول رہا ہے۔ اس شو کے لیے حیدری صاحب نے اتنا اہتمام کیا تھا کہ کشمیر میں یو۔ این۔ او کے آبزرورز کو بھی بلایا گیا تھا۔ میری یعنی کیپٹن رائفل کی وردی بھی ان ہی سے لون لی تھی۔ یہ ڈرامہ دیکھ کر وہ بھی عش عش کرا ٹھے تھے۔ اس ڈرامہ میں ایک حبشی ویٹر لڑکے جنجر بلیو کا کردار ۱۴۴۰ رفیق نے ادا کیا تھا۔ حیدری صاحب کو داد دیں کہ اس کا کیپٹن رائفل سے ایک مکالمہ بھی مجھے اب تک یاد ہے۔

آصف پلیز، وہ بھی ریکارڈ کرائیے۔

عترت

Capt Rifle: Ah; Waiter.

Ginger: Did you call me, Masa ?

Capt Rifle: Yes, I called the waiter. Are you here ?

Ginger: Yes, Masa; I are one of them.

Capt. Rifle: You are one of them. And how many does it take to make one of them.

Ginger: It takes a right smart chap like me self to make one Ginger Blue.

Capt Rifle: Ginger Blue ? Oh; that's your name, I believe.

Ginger: Yes, Masa, and there is only one Ginger Blue in the whole world.

جنجر بلیو (رفیق) کا میک اپ اور اداکاری بھی کمال کی تھی۔ حیدری صاحب چھوٹے سے چھوٹے کردار کو بھی ابھارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اتنا بڑا آرٹسٹ ملٹری کالج میں موجود تھا جس سے بالواسطہ اور بلاواسطہ اتنے عرصے تک سارے کالج نے فائدہ اٹھایا۔ میں یہ باتیں نومبر ۱۹۴۹ کی کر رہا ہوں۔ تقریباً بیس بائیس برس کے بعد ۱۹۷۲ء میں حیدری صاحب مجھے یکایک جی پی او راولپنڈی میں مل گئے اور فوراً پکارا "ہیلو کیپٹن

رائفل ہاؤ آر یو؟

اس زمانہ میں ڈسپلن کے نام سے صلاحیتوں کو دبایا جاتا تھا۔ ایف اے سی سی نے اور حیدری صاحب نے اس دم گھٹنے والے ماحول میں کچھ آزادی سے سانس لینے اور صلاحیتوں کو ابھارنے کا سامان پیدا کیا تھا۔

—— لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال[1]

اس دور کے کسی بھی کیڈٹ سے اگر یہ پوچھا جائے کہ بتاؤ تمہارے اوپر کس ایک سنگل استاد کا اثر سب سے زیادہ ہوا تو وہ بلا تامل مسٹر فضل حق حیدری کا نام لے گا۔ وہ سارے سٹاف میں سب سے منفرد تھے۔ اپنی شخصیت کے اعتبار سے بھی اور اپنے Intellect کے اعتبار سے بھی۔ ڈراموں کی طرح انہوں نے کالج میں پہلے پہل انگریزی مباحثے بھی شروع کیے یہ ہمارے لیے بالکل نئی چیز تھی۔ صبح کو موضوع ملتا اور شام کو سنٹرل ہال میں مباحثہ ہو جاتا۔ جس میں آٹھویں سے اوپر کے لڑکے حصہ لیتے تھے۔ ایک مباحثے کا عنوان جس میں میں نے خود بھی حصہ لیا تھا مجھے یاد رہ گیا ہے۔ عنوان تھا۔ "لیڈرز پیدا ہوتے ہیں بنائے نہیں جاتے"۔ یہ مباحثے مہینے دو مہینے میں ایک بار ہوتے تھے۔ نصاب سے ہٹ کر مطالعہ کرنے کی ضرورت کا احساس بھی انہی نے ہمیں دلایا۔ ان کے پاس ہر کلاس کے لیے موزوں کتابوں کا ایک ذخیرہ تھا۔ اس میں سے چیدہ چیدہ لڑکوں کو کتابیں دیتے رہتے تھے اور پھر پوچھتے بھی تھے کہ پڑھا۔ کتاب پسند آئی۔ شاید یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں کہ مسٹر حیدری شوقیہ ہاکی بھی کھیلتے تھے۔ کبھی کبھی سینئر کیڈٹس اور سٹاف کے درمیان دوستانہ ہاکی میچ ہوتا تھا تو مسٹر حیدری سٹاف کی طرف سے کھیلتے تھے۔

—— ائر چیف مارشل ذوالفقار علی خاں[2]

مسٹر حیدری نے مجھے کلاس میں تو نہیں پڑھایا تھا لیکن انہوں نے مرچنٹ آف وینس کے کورٹ سین میں مجھے بھی کاسٹ کیا تھا۔ پرنس کے ایک درباری کی حیثیت سے مجھے بولنا

---

[1] کالج نمبر ۱۴۴۰ زمانہ تعلیم ۱۹۴۵ تا ۱۹۵۵ء ہلال امتیاز

ایک ہی جملہ تھا۔ Stop, rest over here سٹیج کے اس Exposure سے فائدہ مجھے بہت ہوا۔ اس زمانہ میں کالج میں وہ سرگرمیاں جنہیں غیر نصابی سرگرمیاں کہا جاتا ہے زیادہ نہ تھیں لیکن جو بھی تھیں وہ مسٹر حیدری کے دم سے تھیں۔ اور بہت اعلیٰ معیار کی تھیں۔ ہم نصابی سرگرمیوں کے تجربہ سے میرا خیال ہے کہ ملٹری کالج ایسے ادارہ میں ایک تناسب سے گوناگوں ہم نصابی سرگرمیاں ہونی چاہئیں تاکہ لڑکوں کا زیادہ سے زیادہ Exposure ہو اور انہیں اپنے آپ کو دریافت کرنے اور Develop کرنے کے مواقع ملیں۔

———— میجر محمد رفیق

۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۵ء تک میں نے حیدری صاحب کی ڈائریکشن میں انگریزی کے تین ڈراموں Virginian Mummy ، Invisible Duke اور Clean Sweep میں حصہ لیا۔ Virginian Mummy میں، میں جنجر بلیو بنا تھا۔ Invisible Duke میں نیکو بنا تھا۔ کردار خود اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتا تھا اور ڈائریکشن اتنی باریکی سے دینے کہ حیرت ہوتی۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء تک سالانہ کنسرٹ کے موقع پر انگریزی ڈرامہ اور اردو ڈرامہ کے درمیانی عرصے میں سٹیج کی سیٹنگ کے دوران ہاتھ پاؤں کے اشاروں اور مکالموں سے ایک مزاحیہ پروگرام لوسی شو (Lucy Show) کے نام سے ہوتا تھا۔ عموماً اسے ۱۲۶۵ اور ۱۶۱۴ سعید کرتے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں میں نے بھی یہ شو کیا۔ لوسی شو اس لیے کہتے تھے کہ اس میں Virginian Mummy اور Invisible Duke کی ہیروئین لوسی ایک میز پر براجمان ہو کر سے دلچسپ گفتگو کرتی تھی اور جو کر ہاتھ پاؤں کے اشاروں سے مضحکہ خیز حرکتیں کرتا تھا۔ کھیل دلچسپ اس لیے ہو جاتا تھا کہ سٹیج کے پردہ سے ملا کر ایک میز رکھی جاتی۔ پردہ کے پیچھے جو لڑکا ہوتا اس کے ہاتھوں کے علاوہ میز پر جو لڑکا ہوتا اس کے ہاتھ، پاؤں کا کام کرتے تھے۔ ہاتھ پاؤں کی بازی گری سے حاضرین لطف اندوز ہوتے۔ حاضرین حیران ہوتے کہ پاؤں ہاتھ کا کام کیسے کر رہے ہیں اس شو کا ایک مکالمہ یہاں نقل کرتا ہوں

Joe: Hellow, Ginger, where have you been ?

Ginger: I have been in the hospital.

Joe: That's bad.

Ginger: Not so bad, I married the nurse.

Joe: That's good.

Ginger: Not so good, She's got nine children.

Joe: That's bad.

Ginger: Not so bad. She has got a big house.

Joe: That's good.

Ginger: Not so good, the house burnt down.

Joe: That's bad.

Ginger: Not so bad, she burned up with the house.

Joe: That's good

Ginger: Well, you win.

کنسرٹ کے دوران منظروں کے درمیان Solo پرفارمنس ہوتے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں میں نے شیکسپیئر کے ڈرامہ ہیملٹ میں ہیملٹ کی مشہور خود کلامی To be or not to be پیش کی تھی۔ سلور جوبلی کنسرٹ پر ۱۷۵۱ نے وائلن کا سولو پرفارمنس دیا تھا۔ اس موقع پر انگریزی ڈرامہ Invisible Duke میں ڈیوک کا کردار گلزار نے کمال مہارت سے ادا کیا۔ اس میں دو کردار کم سن خادموں (Pages) نیکو (Necko) اور ڈیکو (Decko) کے تھے۔ یہ حیدری صاحب کی اپنی تخلیق تھے۔ اصل ڈرامہ میں نہ تھے۔ نیکو میں بنا تھا اور Decko موجود تھا۔ اس ڈرامہ کو محفل کے مہمان خصوصی جنرل گریسی نے اتنا پسند کیا تھا کہ وہ کھیل ختم ہونے کے فوراً بعد خود

گرین روم میں آئے۔ گلزار اور موجود کو بے انتہا مبارک باد دی اور ان کو اسی لباس میں اپنے ساتھ ڈنر پر لے گئے (جس کا انتظام اس ہال میں ہوا تھا جہاں آجکل میوزیم ہے) اور انہیں اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ وہ بار بار کمانڈانٹ سے کہتے تھے میں حیران ہوں اس معیار کا کھیل آپ کے لڑکوں نے کیسے کر لیا۔

۱۹۵۳ء میں ایک آل پاکستان ونٹر یوتھ ہاسٹلنگ کیمپ گھوڑا گلی کالج مری میں ہوا تھا۔ اس مقابلہ میں پاکستان یوتھ ہاسٹلنگ پنجاب کے ۱۸ یا ۲۰ کالجوں کے طلبا نے حصّہ لیا تھا۔ کالج سے جو ٹیم گئی تھی اس میں میں ۱۴۴۰ رفیق، ۱۵۵۱ خادم اور ۱۶۹۰ ریاض شامل تھے۔ مسٹر حیدری ہمارے ٹیم انچارج تھے۔ اس کیمپ کے دوران کیمپ کے لئے آوٹ، کنگ فرسٹ ایڈ کے مقابلوں سے لے کر کوہ پیمائی (Trekking) اور برفانی دوڑ کے مقابلے ہوئے اور تقریباً سب مقابلوں میں ملٹری کالج کی ٹیم مسلسل پوزیشن لیتی رہی اور مقابلہ کا فلیگ جیتا۔ ان سب مقابلوں میں مسٹر حیدری ہمارے ساتھ ہی نہیں بلکہ ٹیم لیڈر کی حیثیت سے ہم نوجوانوں کے ساتھ بلکہ ہم سے آگے ہوتے تھے۔ رات کو کیمپ فائر کا پروگرام ہوتا تھا اس کے انگریزی اردو گانے اور سکٹ مسٹر حیدری تیار کرواتے تھے۔ خادم اور ریاض گانوں میں اور میں ان کے ساتھ سکٹس میں حصّہ لیتا تھا۔ یہ مقابلہ جیتنے کا سہرا مسٹر حیدری کے سر تھا۔

—— تنویر احمد سید[1]

نومبر ۵۰ء کی سلور جوبلی کے موقع پر حیدری صاحب نے جو اُردو ڈرامہ کامران پلیش کیا تھا اس میں ہیرو کا کردار میں ادا کر رہا تھا پرانے سائنس ہال کے سٹیج پر رات گئے تک ریہرسل کراتے رہتے تھے۔

ڈریس ریہرسل سے ایک روز پہلے حیدری صاحب نے بہت باریکی سے ریہرسل لیا۔ یہاں تک کہ رات کا ڈیڑھ بج گیا۔ اس وقت میس میں کھانا کہاں ملتا۔ حیدری صاحب ہم چند لڑکوں کو (سکین ہاؤس میں) اپنے گھر لے گئے، بیگم کو سوتے سے جگایا اور ہمیں گرم گرم کھانا کھلوایا۔ ظاہر ہے کہ خود اس کے بعد کھایا ہوگا۔ یہ تھے وہ لوگ جنھوں نے ملٹری کالج کی آبیاری کی۔

---

[1] کالج نمبر ۱۵۰۵ زمانہ تعلیم ۵۲-۱۹۴۶ء

بشیر احمد مرزا[۱] ——————

۱۹۵۰-۵۱ء میں، میں سکین ہاؤس کی سیکشن نمبر دن میں تھا اور مسٹر حیدری سکین ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر تھے۔ ایک روز خود ہی مجھے بلایا اور کہا ایف اے سی سی بھی کبھی کبھی اٹنڈ کیا کرو میں نے جواب دیا سر مجھے ڈرامہ یا سنگنگ کا شوق نہیں۔ بولے تو نہ سہی۔ فوٹو گرافی ہی سیکھ لو۔ اچھی ہابی ہے اور شاید کبھی کام بھی آجائے۔ اس طرح ان کے اصرار پر میں نے ان کے زیر نگرانی فوٹو گرافی سیکھی اور ان کا خیال صحیح تھا کہ یہ میرے کام بھی بہت آئی۔ میرا گھر جہلم میں تھا میں ان سے والنگ آؤٹ بہت لیا کرتا تھا۔ وقت نا وقت ان کے دروازہ پر دستک دیتا اور وہ باہر نکلتے تو خواہ لاؤنج سوٹ پہنے ہوں یا سلیپنگ سوٹ کبھی ان کے کسی کپڑے پر داغ تو بڑی بات ہے شکن بھی نہیں دیکھی۔ مجھے سب سے زیادہ ان کی نفاست نے متاثر کیا۔

لیفٹیننٹ جنرل محمد صفدر[۲] ——————

۱۹۴۷ء سے پہلے کے دور میں سب سے ممتاز اور نمایاں نام فضل حق حیدری صاحب کا ہے جو کالج میں مسٹر ایف ایچ حیدری یا اس سے بھی مختصر مسٹر حیدری کے نام سے مشہور تھے۔ ہر اچھا استاد کسی نہ کسی قدر (Value) کو Symbolise کرتا ہے مسٹر حیدری اس چیز کی چلتی پھرتی تصویر تھے جس کو Sophistication کہا جاتا ہے۔ ان کو دیکھ کر میری طرح بہتوں کو اندازہ ہو گا کہ کلچرڈ آدمی کیسا ہوتا ہے۔ اس سخت یرجی ملٹیشن کے زمانے میں حیدری صاحب نے تعلیم و تربیت کو ایک نئی Dimension دی۔ میرا مطلب ڈراموں، میوزیکل کنسرٹ، تقریری مقابلوں وغیرہ سے ہے۔ گو میں خود ان سرگرمیوں سے براہِ راست استفادہ نہیں کر سکا لیکن ایجوکیشن کے اس پہلو کی اہمیت و ضرورت کا احساس ضرور ہوا۔

آج بھی مسٹر حیدری کا فائن آرٹس اینڈ کلچرل سنٹر مجھے حسرت سے یاد آتا ہے۔ مسٹر حیدری اور مسٹر اقبال ایسے استاد کسی ادارے کے آبرو ہوتے ہیں۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ محض Working conditions اور Living conditions

---

[۱] کالج نمبر ۱۵۱۸ ایریا مینجر سٹیٹ لائف زمانہ ۵۱-۱۹۴۷ء [۲] کالج نمبر ۲۷ دا زمانہ ۵۱-۱۹۴۶ء

کو بہتر کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر کوالٹی (Quality) کو واقعی بہتر کرنا ہے تو کوالٹی ٹیچرز لائیے اور وہ سسٹم لائیے جو ایسے Quality teachers کو Attract کرے اور پھر ان کی قدر کرے۔

—— خادم حسین چودھری

۱۹۴۶ء میں، پانچویں میں داخل ہوا تو حیدری صاحب نے پڑھانا شروع کیا۔ کلاس میں آئے تو چھری کانٹا، فورٹ، پلیٹ ساتھ لائے۔ ڈائریکٹ میتھڈ سے پڑھائی شروع ہوئی۔ لڑکے اسے اوربی دو گروپوں میں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ پہلے حیدری صاحب سوال جواب کرتے پھر لڑکے دہراتے۔ ادھر سے سوال ادھر سے جواب گھنٹہ ختم ہوا تو سب سامان لڑکوں نے کھا پی لیا۔ مزہ آگیا۔ پڑھائی ہو تو ایسی ہو۔

کچھ دنوں کے بعد کورل سنگنگ بھی کرانے لگے۔ کلاس میں اتنی چہل پہل ہوتی کہ حد نہیں۔ ۱۹۴۹ء میں ایف اے سی سی کے زیر اہتمام لڑکوں نے ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے ایک پروگرام کیا جس کا ترانہ : تن من دھن تجھ پر قربان پیارے پاکستان

بہت ہٹ ہوا اور ریڈیو سے بار بار نشر ہوا۔ یہ بھی حیدری صاحب کا کارنامہ تھا۔ اس ترانے میں میرے علاوہ ۱۳۷۴ گل، ۱۷۱۰ یونس اور ۱۸۰۵ فضل الرحمان بھی تھے۔

۱۹۵۰ء میں لندن کی مشہور شیکسپیئر یئن تھیٹریکل کمپنی ریگل سینما لاہور میں شیکسپیئر کے ڈرامے پرفارم کر رہی تھی۔ حیدری صاحب ڈرامہ گروپ (۱۳۳۲ گلزار، ۱۴۴۷ سجاد، ۱۵۲۳ کاظم، ۱۵۲۴ منظور، ۱۵۵۱ میں، ۱۶۱۴ سعید، ۱۷۶۵ موجود، ۱۸۰۵ فضل الرحمان) کو لاہور لے گئے تاکہ ہم معیاری پرفارمنس دیکھیں، پھر اسی گروپ نے سلور جوبلی کے موقع پر مہمان خصوصی جنرل گریسی سے اپنی پرفارمنس پر بے پناہ داد وصول کی۔

فائن آرٹس اینڈ کلچرل سنٹر کے روح رواں مسٹر حیدری حیرت انگیز طور پر کوہ پیمائی میں بھی یکتا تھے۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں پاکستان یوتھ ہاسٹلنگ ایسوسی ایشن کی طرف سے لارنس کالج گھوڑا گلی

لے مینیجر سٹیٹ لائف کالج نمبر ۱۵۵۱ زمانہ ۵۴-۱۹۴۶ء

میں ونٹر ہائکنگ کیمپ ہوا تھا جس میں گورنمنٹ کالج ایف سی کالج گورڈن کالج وغیرہ بہت سے کالجوں نے حصہ لیا تھا۔ ملٹری کالج کی ٹیم کی سربراہی مسٹر حیدری نے کی۔ اس میں حیدری صاحب نے ۴۰۴۴ رفیق، ۱۵۵۱ مجھے اور ۱۶۹۰ ریاض کو شامل کیا (یہ تینوں ایف اے سی سی کے ستارے بھی تھے) خاص مقابلہ برف میں ہائکنگ کا تھا۔ روٹ لارنس کالج مری سے بھوربن اور واپسی چھینگا گلی سنی بنک کے راستے ہوئی۔ یہ کوئی ۴۵ میل کا فاصلہ بنتا ہے۔ حیدری صاحب صرف نام کے لیڈر نہ تھے۔ وہ اس مقابلہ میں ہمارے آگے آگے رہے اور ملٹری کالج کی ٹیم کو اوّل آنے کا اعزاز دلوایا۔ راک کلائمنگ میں بھی انھوں نے کامیاب رہنمائی کی۔ رات کو جو کیمپ کا پروگرام ہوتا تھا اسمیں حیدری صاحب کی ٹیم نے کیا قیامت ڈھائی ہوگی اسکا اندازہ کیا جا سکتا ہے: تن من دھن تجھ پہ قربان پیارے پاکستان نے پھر دھوم مچائی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ نہ صرف ہم نے اس سال کی ٹرافی لی بلکہ ہر شعبہ میں آؤٹ سٹینڈنگ پرفارمنس سے ہم ملٹری کالج کے جھنڈے گاڑ کر آئے۔

—— مسٹر محمد نعمان بھٹی[1]

یہ واقعہ ۱۹۵۰ء کا ہے۔ میں کمانڈانٹ کے دفتر میں بحیثیت کارپورل ٹیلیفون ڈیوٹی پر تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا اتنے میں یکایک گھٹا اٹھی اور دیکھتے دیکھتے آسمان پر چھا گئی اور پھر بارش شروع ہوئی۔ کمانڈانٹ لیفٹیننٹ کرنل سید فیاض حسین زیدی جو اندر بیٹھے کچھ کام کر رہے تھے۔ برسات کے خوبصورت موسم اور بارش کا نظارہ دیکھنے باہر برآمدہ میں آگئے جہاں میں ٹیلیفون کے سامنے بیٹھا تھا۔

اتنے میں کالج کے مین بلاک کی طرف سے حیدری صاحب آتے دکھائی دیئے۔ بارش ایک دم تیز ہو گئی۔ مگر حیدری صاحب کی پروقار چال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اسی طرح چلتے رہے جیسے بارش نہیں ہو رہی۔ ان کی نظر بدستور سامنے سڑک پر تھی۔ اور انہیں قطعاً علم نہیں کہ کمانڈانٹ انہیں دیکھ رہے ہیں۔ جب وہ عین دفتر کے سامنے پہنچے تو کمانڈانٹ نے انگریزی میں پکارا مسٹر حیدری! بارش بہت تیز ہو گئی ہے۔ حیدری صاحب نے اپنی رفتار میں فرق کیے بغیر چلتے چلتے جواب دیا۔ سر اب بھاگنے سے کیا فائدہ، کپڑے تو پہلے ہی بھیگ چکے ہیں۔ بارش ہی سے لطف اندوز ہو لیں۔ میرا خیال ہے کہ ہر چند کہ بارش ہو رہی تھی وہ کیڈٹس کے سامنے بھاگنے کو Graceful

---

[1] ایڈووکیٹ سپریم کورٹ کالج نمبر ۱۵۵۹ زمانہ تعلیم ۵۱-۱۹۴۶ء

نہیں سمجھ رہے تھے۔ دوسرے شاید علمی احتیاط کا تقاضا بھی تھا۔ بہرحال یہ ان کی شخصیت کا ایک اظہار تھا۔

محمد یونس کیانی[1]

جب کبھی مسٹر حیدری کا بحیثیت انگریزی کے ایک استاد کے خیال آتا ہے تو ان کی امیج کے ساتھ ہی ایک اور امیج بھی آ کھڑی ہوتی ہے۔ یہ امیج میرے بیلگام کے استاد مسٹر پارکنس کی ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ چراغوں کی قطار کے سلسلہ میں پہلے اس کا ذکر کروں۔

میں پہلے پہل ۱۹۴۶ء میں کنگ جارج رائل انڈین ملٹری کالج بیلگام (جنوبی ہند) میں داخل ہوا تھا۔ ۸۳ رول نمبر تھا۔ بیلگام کالج، کے جی آر آئی ایم سی جہلم کی طرز کا یہ کالج ۱۹۴۶ء ہی میں قائم ہوا تھا۔ جس میں ۵ مسلمان، ۵ سکھ اور باقی مرہٹے تھے کل سولڑکے تھے۔ مسلمان لڑکوں میں، منور (ملٹری کالج نمبر ۱۹۰۹) عبداللہ (۱۳۹۵ امیر خاں کا بھائی) مجید (۱۰۱۱ جبار کا بھائی) اور ارشد پرتاب گڑھ ہاؤس کے ڈارم نمبر تین میں رہتے تھے۔ میں پانچویں میں داخل ہوا تھا۔ وہاں پانچویں سے سارے مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے تھے۔ وہاں ایک روایت یہ تھی کہ سٹرڈے نائٹ کے ڈنر کے بعد اساتذہ دس دس پندرہ پندرہ کے گروپ میں لڑکوں کو اپنے گھر بلاتے تھے یہ ایک طرح کی سوشل ایوننگ ہوتی تھی جس میں لڑکے اور ٹیچرز کے خاندان کے افراد گھل مل جاتے تھے۔ دوسرے گھرانوں کا پروگرام کیا ہوتا تھا اس کے بارے میں، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہمیں ہمارے فارم ماسٹر پارکنس اپنے گھر بلاتے تھے۔ ان کے گھر کا لان بہت بڑا تھا۔ آس پاس درخت بھی تھے وہاں ہم آنکھ مچولی Hide and Seek کھیلتے تھے۔ خزانہ کی تلاش (Treasure Hunt) میوزیکل چیئرز کے مقابلے ہوتے تھے۔ مسز پارکنس سویٹس یا کلیٹ بار انعام میں دیتی تھیں۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ گراموفون ریکارڈز پر کچھ نرسری رائمز وغیرہ سنتے بھی تھے۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جو ہم مسٹر پارکنس کے ہاں سٹرڈے کی شام گزارتے تھے اس کا انتظار ہمیں ہفتہ کے باقی چھ دنوں بڑی شدت سے رہتا تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ گھر سے ہزاروں میل دور یہی موقع ہوتا تھا جہاں گھر کا سا کھلا ماحول اور گھر کی سی کچھ محبت مل جاتی تھی۔

---

[1] کالج نمبر ۱۰۱۱، زمانہ تعلیم ۵۵-۱۹۴۷ء

مسٹر پارکنس استاد بھی بہت اچھے تھے۔ ہمیں سائنس پڑھاتے تھے اور اکثر کلاس کو باہر لے جاتے تھے بلکہ زیادہ تر کالج کے کوہستانی مضافات ہی میں نیچر سٹڈی کراتے تھے۔ سائنس کی بنیاد ہی مشاہدہ اور مطالعہ ہے۔ اس کی بنیادی تربیت انہوں نے ہمیں دی۔ مسٹر پارکنس بالواسطہ طور پر ہمارے انگریزی کے استاد بھی تھے اور وہ بھی مسٹر حیدری کی طرح ڈائریکٹ میتھڈ سے پڑھاتے تھے۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں بلگام کالج سے آیا تھا۔ یہاں انگریزی کا معیار وہاں سے بہتر تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے حیدری صاحب کا معیار بہتر تھا۔ ان کی کلاس میں Language games مکالمے اور چھوٹے چھوٹے پلے ہوتے رہتے تھے۔ Singing بھی کراتے تھے۔

یہاں سکین ہاؤس کی نمبر چار ڈارمیٹری میں میرے سیکشن کمانڈر ۴۵۶ اعثمان خان (اب بریگیڈیر ریٹائرڈ) تھے۔ میں ڈارمیٹری میں خالی وقت میں اکثر گنگنایا کرتا تھا۔ عثمان خاں نے میرا نام ہاؤس کے سٹرڈے فنکشن میں دے دیا۔ میں نے وہی گیت سنایا جو میں اکثر بلگام میں سنایا کرتا تھا۔

دھیرے دھیرے بادل آ

اتفاق سے اس فنکشن میں مسٹر حیدری بھی موجود تھے۔ انھوں نے میری آواز سنی تو میری حوصلہ افزائی کی اور ایف اے سی سی قائم ہونے پر انہوں نے مجھے وہاں گلوکاری کا موقع دیا۔ ایف اے سی سی میں میرا پہلا گانا مکیش کا یہ گیت تھا۔ کبھی دل سے دل ٹکراتا تو ہوگا

نومبر ۱۹۵۰ء کا سلور جوبلی کنسرٹ مسٹر حیدری کی کاوشوں کا پہلا شاندار مظاہرہ تھا۔ اس میں انگلش کا ڈرامہ Invisible Duke بہت ہٹ گیا تھا۔ اس میں نیکو (۲۰۴۰ رفیق) اور ڈیکو (موجود) دو کردار حیدری صاحب نے خود شامل کیے تھے۔ جب ڈیکو نے سٹیج کے ایک گوشہ سے نکل کر سلور جوبلی کنسرٹ کے مہمان خصوصی جنرل سر ڈگلس گریسی سی این سی کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا: There's jolly good fellow

تو جنرل کے سواہر گوشہ سے آواز آئی: There's a jolly good fellow
ڈرامہ کے بعد جنرل گریسی نے حیدری صاحب کو بہ نفس نفیس مبارک باد دی۔ اور نیکو و ڈیکو کو سٹیج کا سٹیوم میں ہی اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔

سلور جوبلی کنسرٹ پر ۱۳۷۴ گل نے جگ موہن کا مشہور گیت ......

کروں کیا آس نراس بھئی

۱۸۹ا واجد علی نے چندارے، جارے جارے پیا سے سندیسہ مورا کہیو جا

۱۸۰۵ فضل الرحمان فارسی کی غزل

اور میں نے ملکیش کا "کبھی دل سے دل ٹکرایا تو ہوگا" گایا تھا۔

حیدری صاحب نے سلور جوبلی کی تقریب کے لیے خاص طور پر ایک سلور جوبلی سانگ لکھا تھا۔ Let cheers ring out and joyful songs be heard

اپریل ۵۲ء میں یوم اقبال کے موقع پر حیدری صاحب نے میرے لیے:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں!

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

کی دھن بنائی اور برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی

کی بھی۔

۱۹۵۲ء میں کرنل رفیق نے کالج کا چارج لے کر جو بے پناہ تعلیمی سرگرمیاں شروع کی تھیں، ان میں سے ایک Elocution contest کا انعقاد بھی تھا۔ اس تقریب میں حیدری صاحب نے مارک انٹونی کی مشہور Funeral speech پیش کی تھی۔ جب حیدری صاحب نے سٹیج کے ایک گوشہ کی طرف رُخ کرکے Look کہا، جیسے وہاں سیزر کا جنازہ پڑا ہو، تو سارا ہال اچک کر اس طرف دیکھنے لگا تھا۔

اس Elocution کے لیے حیدری صاحب نے مجھے جان رسکن کی وہ سپیچ دی تھی جو اس نے رائل نیول اکیڈمی وولوچ میں کی تھی۔

Remember,

You soldier youths, who are thus in all ways the hope of our country; or must be, if she has any hope, remember that your fitness for all future trust depends upon what you are. No good soldier in his old age was ever careless and indolent in his youth.

انہوں نے اس جملے کو خاص طور سے بار بار Express کروایا تھا انہوں نے بتایا کہ تقریر کے Key نقروں کو خاص طور سے وضاحت کر کے ادا (Express) کرنا چاہیے وہ اپنے فن میں کمال کی انتہائی بلندیوں پر فائز تھے۔

——— بریگیڈیئر سلطان احمد ستارہ جرأت

حیدری صاحب انگریزی ڈائریکٹ میتھڈ سے پڑھاتے تھے۔ اگر چائے پینے کا تذکرہ ہے تو چائے کا سارا سامان میز پر سجا ہوتا۔ کلاس روم میں مکالمے اور زبان کے کھیل Language games کراتے۔ سال کے آخر میں جو کتاب انہوں نے پڑھنے کو دی وہ شارلاٹ برانٹے کی جین ائر (Jane Eyre) تھی۔ یہ فکشن کی پہلی کتاب تھی جو میں نے پڑھی۔ اس زمانہ میں سکین ہاؤس میں تھا۔ میرا بستر برآمدہ کے بلب کے قریب تھا۔ اس کی روشنی میں سے رات کو یہ کتاب پڑھی جب پڑھ چکا تو پوچھا کچھ سمجھے ؟ میں نے کہا جی ہاں۔ بولے ابھی تم نے صرف پڑھی ہے ایک دن آئے گا جب تم اس کو سمجھو گے : Appreciate بھی کرو گے۔ انہوں نے کتنی بڑی بات مجھے کتنی کم عمر میں بتا دی کہ پڑھنا اور بات ہے اور سمجھنا (Appreciate) کرنا اور بات۔

——— کیپٹن (نیوی) محمد جمیل خان[1]

حیدری صاحب نے کالج سانگ :

Boy-hood days are best

Care free and blest

۱۹۴۹ء میں لکھا تھا اور اسی سال سالانہ کنسرٹ کے موقع پر ان کی نگرانی میں کالج کی کورل سوسائٹی نے بڑے اہتمام سے پیش کیا تھا۔ اس کا میوزک بھی انہی کا ترتیب دیا ہوا تھا۔ اس کو پہلی بار سن کر ہر ایک نے ایک Thrill محسوس کیا تھا۔ وہ طلباء جو زیادہ تر پنجاب اور سرحد کے مضافات اور دیہات سے آئے تھے ان کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا کہ وہ راولپنڈی کے علاقے کے ایک جنجوعہ استاد کو انگریزی میں شاعری کرتے اور میوزک کمپوز کرتے دیکھیں۔ اور پھر اس کی کورل سنگنگ میں حصہ لیں اس تجربہ سے سب ہی کی تخلیقی امنگیں جاگی ہوں گی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے یہ جنون ہو گیا کہ میں بھی انگریزی میں شاعری کروں۔ چنانچہ میں نے حیدری صاحب

---

[1] کالج نمبر ۱۷۳۸ زمانہ تعلیم ۵۳-۱۹۴۷ء

سے کہا سر، مجھے بھی شاعری سکھا دیں انہوں نے فرمایا۔ شاعری سکھانے کی چیز نہیں یہ اندر سے پھوٹتی ہے۔ بہر حال کوشش کرو کچھ نظم کاری (Versification) تو کرنے ہی لگو گے۔ (مجھے اس وقت اس لفظ کے معنی بھی معلوم نہیں تھے) مختصر یہ کہ انکی حوصلہ افزائی سے میں نے پاکستان کے موضوع پر کچھ لکھنے کی کوشش کی جسے نظم یا Verse تو کسی طور بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بہر حال ہوا یہ کہ جب مئی ۱۹۵۰ء کا میگزین شائع ہوا تو اس میں میرے نام سے Sons of Pakistan کے عنوان سے ایک بڑی شاندار نظم چھپی ہوئی دیکھی۔

SONS OF PAKISTAN

If you want to know who we are
We are sons of Pakistan.
In times of peace or war
You'll find us marching on –
Undaunted, unrestrained
Our spirits always unchained
And Honour e'er unstained
All for one and one for all
Do we stand up to the last
Always up on Duty's call
Never shrinking never lost
Our pride's to live and die
To see our flag
E'er high
And Freedom far and high
We are sons of Pakistan
Zindabad our Pakistan

جن لوگوں نے کالج سانگ بغور سے پڑھا ہے انہیں یہ سانگ پڑھ کر فوراً احساس ہو جائے گا کہ اس کا Diction اور Style اور آہنگ وہی ہے جو کالج سانگ کا ہے۔ اس میں

کوئی شک نہیں کہ یہ سانگ حیدری صاحب ہی کی تخلیق ہے۔

اوراب میں چراغوں کی قطار کے ذریعہ یہ ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ اس سانگ کو بھی حیدری صاحب کی تخلیقات میں شمار کیا جائے اور آئندہ انہی کے نام سے شائع کیا جائے۔

مئی ۱۹۵۰ء کے میگزین میں: Humorous Snapshots

There's a happy soul called Malik
So did I
It was a bleak and chilly day

بھی جہاں تک مجھے معلوم ہے انہی کی لکھی ہوئی ہیں۔

———— واحد علی واحد[1]

یوں تو ۱۹۴۲ء میں کالج میں آتے ہی مسٹر حیدری نے یہاں ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ تقریری مقابلے، ڈرامے، کنسرٹ وغیرہ شروع کردیئے تھے لیکن ان لٹریری اور کلچرل سرگرمیوں کو باقاعدہ ایک مرکزی ادارہ کی شکل میں فائن آرٹس اینڈ کلچرل سنٹر کے نام سے منظم ۱۹۴۹ء میں کرنل زیدی کے زمانہ میں کیا گیا اور مسٹر حیدری ہی اس کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔

ایف اے سی سی کالج کے ہیں اکیڈیمک بلاک کے سامنے کے تین کمروں کے بلاک کے جہاں آجکل انتظامی دفاتر ہیں درمیانی کمرہ میں قائم کیا گیا تھا۔ ۱۸×۲۲ فٹ کا یہ کمرہ جو کہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے دوران کلاس روم رہا تھا اور جس کی ایک دیوار پر اس وقت بھی بلیک بورڈ بنا ہوا تھا۔ ان دنوں کالج کے دوشمت ماحول میں قطعًا ایک طلسماتی چیز تھا۔ جیسے داستان طلسم ہوشربا کے کسی ساحر نے دشت عالمگیر میں اپنے طلسم کے زور سے رنگ ونور اور ساز و آہنگ کا ایک چھوٹا سا طلسم کدہ کھڑا کر دیا ہو۔

اس طلسم کدہ کی سادہ سی باہر کی دیوار پر دائیں طرف ایک سادہ سی مستطیل لکڑی کی تختی پر پیتل کے انگریزی حروف میں ایف اے سی سی لکھا تھا اور دروازہ کے بائیں طرف ۲×۳ فٹ کے شیشے کے فریم میں فوٹو گرافی کلب کی تصاویر لگی ہوئی تھیں لیکن اندر سے یہ بیک وقت کسی سنگیت اکیڈیمی کا کلاس روم، کسی مصور کا نگارخانہ اور کسی تمثیل کار یا کسی ڈراما پروڈیوسر

---

[1] کالج نمبر ۱۸۹۱، زمانہ ۱۹۴۶ تا ۱۹۵۵ء

کا گوشۂ تمثیل نظر آتا تھا۔ اس کا ماحول باہر کی بے رنگ اور کھردری دنیا سے بالکل مختلف تھا دیوار پر ہلکا فیروزی رنگ کیا ہوا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر سرخ بانات کے دبیز پردے پڑے تھے۔ فانوسوں میں بجلی کے بلب اتنی پاور کے رکھے گئے تھے کہ اندھیرا بھی نہ ہو اور تیز لائٹ کی چکا چوند بھی محسوس نہ ہو۔ اس طرح کی دودھیا روشنی سے کمرہ میں ایک طرح کی پر اسراریت آگئی تھی۔ دروازے کے عین سامنے کرسی کے ساتھ ایک پیڈسٹل ہارمونیم رکھا تھا۔ دائیں کونے میں دیوار کے ساتھ ایک بڑے سائز کا وائلن بانسری، طبلہ جیسے آلات موسیقی آراستہ تھے۔ پیڈسٹل ہارمونیم کے بائیں طرف ایک سرخ کشن طبلہ باز ہیڈ جمعدار فیروز کے لیے پڑا تھا۔ کمرہ کے بائیں طرف دیوار کے ساتھ ایک بڑے سائز کا پیانو رکھا ہوا تھا جس پر اکثر رات گئے حیدری صاحب تنہائی میں اپنی آواز کا جادو جگایا کرتے تھے۔

سازوں اور پیانو کے درمیان دیوار کے ساتھ شیشے کی الماری تھی جس میں آرٹ، ڈرامہ فوٹو گرافی کی نادر کتابیں انگلش، پوئٹری، اقبال اور حفیظ کی مجموعے، آغا حشر کے ڈرامے، انارکلی، رباعیات خیام کا مصور ایڈیشن، دیوان حافظ، مرقع چغتائی، بیدی، غلام عباس، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے مجموعے تھے۔ ایک شیلف میں سہگل، ہمنت کمار، طلعت محمود مکیش، رفیع، کانن بالا اوما دیوی، خورشید، خان مستانہ، پنکج ملک، جگموہن کے گراموفون ریکارڈ تھے۔ عقبی دیوار کے بیچ میں ایزل پر ایک بلیک بورڈ رکھا ہوا تھا جس پر حیدری صاحب نے چاک سے خیام کی یہ رباعی؛ خورشید کمند صبح بربام افگند

کیخسرو روز بادہ درجام افگند
مے خور کہ مندی وسحر گہ خیزاں
آوازہ "اشربو" درایام افگند

فٹز جیرالڈ کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ رکھی تھی۔

Awake ! for Morning in the bowl of Night
Has flung the stone that puts the stars to Flight
And, lo, the hunter of the East has caught
The Sultan's Turret in a Noose of light

اس کے نیچے تاثیر کا یہ اردو ترجمہ بھی تھا۔

اٹھ جاگ کہ شب کے ساغر میں سورج نے وہ پتھر مارا ہے
جو مے تھی وہ سب بہہ نکلی ہے جو جام تھا پارہ پارہ ہے
مشرق کا شکاری اٹھا ہے مغرب میں کمندیں پھینکی ہیں
اک پیچ میں قصرِ سکندر ایک پیچ میں قصرِ دارا ہے

اسی بلیک بورڈ پر ایک طرف کو لکھا تھا۔

جھاڑیاں کالی ردائیں اوڑھ کر چپ ہو گئیں
بند کلیاں اپنی خوشبو سے لپٹ کر سو گئیں

اور اس کے نیچے لکھا ہوا ایک شعر یہ تھا۔

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں جا ڈوبا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

اسی بلیک بورڈ پر بائیں طرف سرخ چاک سے ایک شمع بنی تھی۔ اور اس کے نیچے یہ زرد کنفیوشیس کا یہ قول درج تھا۔

It's better to light a small candle
than to curse darkness

ایف اے سی سی کی مخصوص الف لیلوی فضا پیدا کرتے ہیں ان تصویروں کا بھی بڑا دخل تھا جو بڑے سلیقے سے دیواروں پر آویزاں تھیں۔ لیونارڈو ڈا ونچی (Leonardo da Vinci) کی شہرۂ آفاق Mona Lisa، مائیکل اینجیلو (Michael Angelo) کی مشہور Madonna، رینالڈز (Reynolds) کی The Age of innocence، لارنس کی Pinkie وغیرہ فن پارے تھے۔ لیکن ایف اے سی سی کا اصل سحر چغتائی کے شاہکاروں کی وجہ سے تھا جن کی فسوں خیزی کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اس آرٹ گیلری میں پنجاب کی دیہاتی زندگی کی عکاسی مشہور مصوّر استاد اللہ بخش کی بنائی

ہوئی ایک پینٹنگ بھی آویزاں تھی۔ پنجاب کے مخصوص دیہاتی لباس میں ایک ملنگ عالمِ کیف و مستی میں چمٹا بجاتے ہوئے رقص کر رہا تھا۔ چمٹے کے دونوں سروں کو اس نے سر کے اوپر پکڑا ہوا تھا اور کوئی تان اُڑا رہا تھا۔ تاثر یہ ہوتا تھا کہ جیسے سلطان باہو یا خواجہ فرید کی کوئی عارفانہ کافی ہے جس نے اسے بے خود کیا ہوا ہے۔ استاد اللہ بخش کا یہ شاہکار ایف اے سی سی کی تصویروں میں اپنا الگ ایک مقام رکھتا تھا اور شاید حیدری صاحب کے ذوق و ذہن کی غمازی بھی کرتا تھا۔

ایف اے سی سی کے چار شعبے تھے، ڈرامہ، موسیقی، مصوری اور فوٹو گرافی مسٹر حیدری کی ماہرانہ نگرانی اور رہنمائی میں ان چاروں شعبوں نے حیرت انگیز اور قابل رشک ترقی کی۔ گو ابتدائی سالوں میں انہیں موسیقی کے شعبہ میں کرنل زیدی اور کیپٹن رحمان کا تعاون بھی حاصل رہا۔ ایف اے سی سی میں ہابیز (Hobbies) کے اوقات میں موسیقی اور مصوری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ڈرامہ کی سرگرمیاں سالانہ کنسرٹ کے موقع پر اپنے عروج پر ہوتی تھیں۔ فوٹو گرافی کا سلسلہ سارے سال چلتا رہتا تھا۔ ایف اے سی سی کی حیثیت ایک Exclusive Club کی سی تھی۔ جس میں براہِ راست حصہ تو کالج کے معدودے چند باصلاحیت (Talented) طلباء ہی لیتے تھے لیکن کالج کی مخصوص ریجمنٹل تنظیم (Regimental organization) کے تناظر میں ایف اے سی سی کی حیثیت صحرا کے پھول یا ایک ایسے دریچہ کی سی تھی جس سے فنون کی تازہ ہوا بھی آتی تھی اور کلچر کی روشنی بھی، جو سب کے لیے تھی چنانچہ کالج کی تعلیمی و تربیتی فضا پر ایف اے سی سی کا خاموشی سے بہت خوشگوار اور دور رس اثر پڑا۔ اوائل ۱۹۵۰ء میں کیپٹن رحمان کا تبادلہ ہوا۔ اسی سال مسٹر ماجد صدیقی اور مسٹر سعید راشد ایف اے سی سی سے مسٹر حیدری کے معاون کی حیثیت سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں کرنل زیدی اور مسٹر ماجد صدیقی نے کالج کو خیرباد کہا ۱۹۵۳ء کے اواخر میں مسٹر عین الدین علوی نے اُردو ڈرامہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ۱۹۵۴ء سے مسٹر شفیق نے موسیقی کے شعبہ میں دلچسپی لینی شروع کی تاہم بحیثیت مجموعی ۱۹۴۹ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء کو اپنی ریٹائرمنٹ تک مسٹر حیدری ہی ایف اے سی سی کے روحِ رواں

رہے اور یہی عرصہ ایف اے سی سی کے عروج کا دور تھا۔ جنوری ۱۹۷۰ء سے فروری ۱۹۸۱ء میں اپنے انتقال تک مسٹر علوی نے بھی ایف اے سی سی کو خوب سنبھالا۔ انگریزی اور اُردو کے ڈرامے تن تنہا پروڈیوس کرتے رہے۔ گو سالانہ کنسرٹوں میں بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے وہ تواتر نہیں رہ سکا تھا جو پہلے تھا۔ مجنوں جو مر گیا ہے جنگل اداس ہے۔

ایف اے سی سی کی ایک شام :

یہ تعارف تو فائن آرٹس اینڈ کلچرل سنٹر کے در و دیوار کا تھا جن کی فسوں انگیزی اپنی جگہ لیکن ایف اے سی سی کا اصل طلسم موسیقی، مصوری اور تمثیل کاری کی ان محفلوں میں تھا جو یہاں خاص طور سے سالانہ کنسرٹ کے زمانہ میں آراستہ ہوتی تھیں۔

۲۷ر نومبر ۱۹۵۰ء سے سلور جوبلی کی تقریبات شروع ہو رہی تھیں۔ ۲۹ر کو سلور جوبلی کنسرٹ تھا جس کے متوقع مہمان خصوصی پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل سر ڈگلس گریسی تھے اس پس منظر میں سلور جوبلی کنسرٹ کے میوزک کا فائنل ریہرسل ۲۵ر نومبر کو ایف اے سی سی میں ہوا۔ ۲۶ر کو کنسرٹ کا ڈریس ریہرسل تھا۔ یہ ریہرسل ایک یادگار شام موسیقی تھی اسکی روداد لکھتا ہوں۔ شام چھ بجے سے کچھ دیر پہلے تک ایف اے سی سی میں ۱۳۷۴ محمد گل، ۱۵۵۱ خادم ۱۵۷۸ ممتاز، ۱۶۶۸ گل بادشاہ، ۱۰۰۱ یونس کیانی، ۱۸۰۵ فضل الرحمان، میں ۱۸۹۱ واجد علی، ۱۹۰۹ شاہ جہاں، مجید، سارے اہم اردو گلوکار آچکے تھے۔ ہیڈ سویپر سائیں فیروز اپنے مخصوص سرخ کشن پر بیٹھا اپنی طبلوں کی جوڑی کے تسمے کسنے میں مصروف تھا۔ ایف اے سی سی کا خاص ہارمونیم نواز ۱۷۶۱ نور محمد بیڈسٹل ہارمونیم پر بیٹھا۔ کنسرٹ کے پہلے ترانے "ہم نوجوان" کی دھن چھیڑ رہا تھا کہ ٹھیک چھ بجے حیدری صاحب نے ایف اے سی سی کا پردہ ہٹا کر اندر قدم رکھا۔ ہم رنگ ٹائی اور نیوی بلیو سوٹ میں ملبوس نازک سنہرے فریم کا چشمہ لگائے وہ بہت شاندار نظر آ رہے تھے۔ آج ان کے ہاتھ میں کیپسٹن سگریٹوں کا گہرے سبز رنگ کا کارٹن تھا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ آج کی محفل دیر تک چلے گی۔ آتے ہی انہوں نے حسب عادت کہا گڈ ایوننگ ایوری باڈی Good evening every body جس کے جواب میں "گڈ ایوننگ سر" کا غلغلہ ہوا۔ یہ ہمیشہ کی طرح انہوں نے خوش دلی سے پوچھا۔

Feeling fit ? - جواب ملا More than fit, sir -

یہ شوخ جواب ۱۶۶۸ گل بادشاہ کا تھا جس کی بذلہ سنجی ایف اے سی سی میں گل کھلاتی رہتی تھی۔ پھر حیدری صاحب سائیں فیروز کی طرف متوجہ ہوئے" سائیں تہاڈی جوڑی تے کسی ہوئی نا"بادشاہو، تسی شروع توکرو چھت پھاڑ کے نہ رکھ دے آں" سائیں فیروز کا یہ جواب سن کر لڑکوں نے قہقہہ لگایا۔ Let's start then حیدری صاحب نے کہا اور کیپسٹن کا کارٹن کھولا اور سگریٹ نکالا۔ لیکن اس سے پہلے کہ لائٹر سے اسے سلگاتے نور محمد سے پوچھا "سائیں کی ڈبیہ کہاں ہے"؟ نور محمد نے ساری سر" کہا اور الماری سے نار مارکہ سگریٹ کی ڈبیہ اور اینٹ مارکہ دیا سلائی سائیں فیروز کے سامنے رکھ دی۔ اس کے بعد حیدری صاحب نے سگریٹ سلگایا اور نور محمد کو اشارہ کیا کہ ترانے کی سرگم شروع کرو۔ اس عرصے میں ترانے کے سنگرز گل، تحادم گل بادشاہ، فضل الرحمان، ممتاز، شاہجہان مجید اور یونس (واجد) لائن اپ ہو گئے۔ (حیدری صاحب نے سنگرز کو ان کی آواز کی Volume, depth and range کے لحاظ سے تین قسموں میں بانٹا ہوا تھا اور اسی ترتیب سے وہ کھڑے تھے۔ اور سلور جوبلی کنسرٹ کے افتتاحی کورس:

ہم نوجوان، اسلام کا جھنڈا دنیا پر لہرائیں گے
ہم اللہ کی شمشیریں بن کر ہر میدان میں چھائیں گے
ہم ۔۔۔۔۔۔۔

کا ریہرسل شروع ہوا۔ حیدری صاحب نے دو ایک جگہ اصلاح کی۔ ایک بار خود ہارمونیم پر بیٹھ کر ریہرسل کرایا۔ کچھ دیر بعد کمانڈانٹ کرنل زیدی بھی کیپٹن رحمان کو ساتھ لیے آگئے۔ (کیپٹن رحمان کا کچھ عرصہ پہلے کالج سے تبادلہ ہو گیا تھا۔ وہ محض سلور جوبلی کنسرٹ میں مدد دینے آئے ہوئے تھے) ان کے سامنے ایک بار ترانے کا ریہرسل ہوا اور انہوں نے انترہ اور استھائی کو مزید نکھارا۔ کورس گانے کا طریقہ یہ تھا کہ انترہ واجد اور یونس کیانی اٹھاتے تھے۔ استھائی میں باقی سنگرز شامل ہو جاتے تھے۔ اس کورس کے بعد دوسرے ترانے:

تن من دھن قربان تجھ پر پاکستان عظمت انساں قائم تجھ سے رونق بزم جہاں
زندہ رہے پائندہ رہے تو، اونچا تیرا نشان

کا ریہرسل شروع ہوا تو کیپٹن رحمان نے ہارمونیم سنبھالا۔ (۲۹ نومبر کو عین شو کے دن بھی انہیں نے ہارمونیم بجایا) رحمان صاحب ہر وقت رنگدار شیشوں کا چشمہ لگائے رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی آنکھیں تو نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن ان کی محویت قابل دید تھی۔ ان کی عادت تھی۔ ہارمونیم پر بیٹھتے ہی ایک آدھ بار سرگم بجاتے تھے اور بہت آہستہ سروں میں شروع ہوتے تھے۔

ریہرسل کا تیسرا آئیٹم سلور جوبلی قوالی تھی۔

اب جشن مسرت آ پہنچا پھر گیت خوشی کے گانے دو
سب بچھڑے آ کر مل بیٹھے اب قصہ دل دہرانے دو
معصوم فضائیں ماضی کی اس دور میں پھر کھو جانے دو
سب غنچے کھل کر پھول بنے ہر گوشہ میں خوشبو پھیل گئی
اب پاکستان کے گلشن کو ان پھولوں سے مہکانے دو
اب جشن مسرت آ پہنچا پھر گیت خوشی کے گانے دو

یہ قوالی زیدی صاحب نے خاص اس موقع کے لیے لکھی تھی اور اس کی دھن بھی انہی نے بنائی تھی۔ جس انداز سے واجد اور یونس کیانی نے اس کا انترہ اٹھایا اس نے محفل کا رنگ ہی بدل دیا۔ سنگرز، اور سامعین بھی سلور جوبلی موڈ میں ڈوب گئے۔ پھر اس ٹیمپو پہ قوالی ہوئی کہ اصل سلور جوبلی کنسرٹ میں بھی اس پر اضافہ نہ ہو سکا۔ اس قوالی کے آخری بولوں کے دوران انگریزی کے سلور جوبلی سانگ کے سنگرز کاظم کمال، موجود کیانی، اور عزت بھی ایف اے سی سی میں آ چکے تھے۔ سلور جوبلی سانگ ا

Let cheers sing out and joyful songs be heard
Peal happy bells and ring the cares away
Let fun and frolic ring; the merry word
And banter light declare their genial sway
Hurrah for the K.G.C.
Hurrah for her proudest day
With voice both loud and free,
And hearts all happy and gay
Let young and old be all,

I? tune and perfect glee
And the rafters ring, the while we sing
Of our silver jubilee
The K.G.C. the College on earth

مسٹر حیدری نے لکھا تھا اور اس کی موسیقی بھی انہی نے ترتیب دی تھی۔ چنانچہ وہ پیانو پر بیٹھے اور پہلے ایک بار خود سنایا جس کو سنگرز نے فالو کیا۔ اس کے بعد لڑکوں نے خود گایا۔ اس کا انترہ کاظم کمال نے اٹھایا تھا اور کورس میں باقی سارے سنگرز شامل ہو جاتے تھے سلور جوبلی سانگ کے بعد بریک ہوا۔

نو بجے پھر محفل جمی نور محمد نے ہارمونیم سنبھالا۔ سائیں فیروز نے طبلہ کی جوڑی پر تھاپ دی۔ حیدری صاحب نے اپنے مخصوص فنکارانہ سٹائل میں سگریٹ سلگایا اور آتشدان کے قریب اپنی کرسی کو کھینچا۔ سب سے پہلے حیدری صاحب نے مجھے اشارہ کیا کہ ہاں واجد شروع کرو۔ میں نے وہ غزل شروع کی جس سے میں نے سال بھر پہلے کالج میں اپنے Singing Career کا آغاز کیا تھا۔

کبھی تم خواب میں صورت دکھا جاتے تو کیا ہوتا
کسی کے بخت دو تا کو جگا جاتے تو کیا ہوتا
یہ وقت نزع ہے بیمار غم کی آخری شب ہے
ذرا سی دیر کو جو تم بھی آجاتے تو کیا ہوتا
ذرا سی دیر میں بجھنے کو شمع زندگانی ہے
اسے تم اپنے دامن سے بجھا جاتے تو کیا ہوتا
نکلنے کو ہے عاشق کا جنازہ تیرے کوچے سے
جو تم بھی ایک دو آنسو بہا جاتے تو کیا ہوتا!

میرے بعد ۴، ۱۵ محمد گل کی مدبھری آواز گونجی؛

تیرے کوچے میں ارمانوں کی دنیا لے کے آیا ہوں
تجھی پر جان دینے کی تمنا لے کے آیا ہوں

وہ افسانہ محبت کا کبھی جو تم نے چھیڑا تھا
وہی افسانہ ہونٹوں پہ دوبارہ لے کے آیا ہوں
جگر میں درد دل میں ٹیس اور آنکھوں میں دو آنسو
ذرا تو دیکھ لے آ کر میں کیا کیا لے کے آیا ہوں

گل کے نغمہ کی تان اس شعر پر ٹوٹی :

نہیں آتا وفاؤں سے ہمیں دامن چھڑا لینا
تمہی پر جان دے دیں گے کسی دن آزما لینا

گل کے بعد حیدری صاحب نے گل بادشاہ کو اشارہ کیا
Now it's your turn Gul Badshah گل بادشاہ نے بڑی
سنجیدگی سے کہا Sir, I'm no more fit. "کیوں"
ایک واجد جان دے کے ہٹا تھا کہ گل مرنے لگا۔ اب میرے لیے کیا بچا۔ آج تو ایف ایل
سی سی مقتل بنا ہوا ہے۔ اس پر قہقہہ پڑا All right we must have a change.
حیدری صاحب نے ارشاد کیا۔ گل بادشاہ نے فرمائش کی، سر For a change ایک ماہیا
ہو جائے۔ حیدری صاحب نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا I don't mind.
واجد نے مجید سے کہا۔ پھر ہو جائے ساون کے بھرے بادل۔ مجید نے حیدری صاحب کی طرف دیکھا
تو انہوں نے کہا Yes, go ahead. تو مجید اور مختار شروع ہو گئے۔ مجید نے تان اڑائی

اب یاد وہ آتے ہیں
ساون کے بھرے بادل دل میرا جلاتے ہیں

گل بادشاہ نے فقرہ چست کیا۔ یہ بھی دل جلانے کی بات کر رہے ہیں کوئی تو دل کو زندہ کرنے
کا سامان کرے۔ حیدری صاحب سمجھ گئے کہ لڑکے لائٹ موڈ میں ہیں۔ وہ یہ کہہ کر اٹھے۔
Let me go and have a cup of coffee. اور سکین ہاؤس
میں اپنے گھر کی طرف چلے تو گل بادشاہ نے کہا "یار کچھ دل پشاوری کرو۔ وہ ہاؤس والا ماہیا شروع
سے سناؤ"

"کون سا؟"

"رت بارسنگھار دی اے" مجید نے تان اڑائی۔

رت بارسنگھار دی اے

بل میرے پیار والے ڈوری سجناں دے پیار دی اے

اس ماہیے نے تو گویا گرم خون کو آگ لگا دی۔

مختار کی آواز دوسرے گوشے سے آئی۔

رنگ وسدا ای امراں نوں

پھلاں دی بہار آئی دل ڈردا ای سدراں نوں

اس کے جواب میں مجید پھر چہکا۔

بوجے وچ پنج پائیاں - ماں دے آلا ڈلیا نئیں اکھیاں کس لائیاں

سارے سنگر ماہیوں پر مست ہو رہے تھے۔ایک آدھ نے دھمال بھی شروع کر رکھی تھی کہ نور محمد نے باہر سے آکر اطلاع دی کہ حیدری صاحب آرہے ہیں۔ان کے اندر قدم رکھنے سے پہلے جذبوں کی بے قراری کو قرار آچکا تھا۔ گل بادشاہ نے خود ہی پوچھا۔

May I have your permission to start sir ? Please do.

حیدری صاحب نے اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔گل بادشاہ نے اپنا گیت شروع کیا۔

گل بادشاہ کے بعد ۸۰۵ افضل الرحمان نے اقبال کی یہ غزل چھیڑی۔

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری

خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اڑا لی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے

چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

گل کے بعد یونس کیانی کی باری آئی۔

جھوم جھوم کے ناچو گاؤ آج خوشی کے گیت

رات بھیگ چکی تھی۔ سنگر بدل رہے تھے لیکن ہارمونیم نواز نور محمد اور طبلہ نواز سائیں فیروز کی انگلیاں مسلسل حرکت میں تھیں۔ مجال ہے کہ ایک سر یا ایک تال ادھر ادھر ہو جائے تاآنکہ حیدری صاحب نے کہا Let's have the college song. یہ کہہ کر وہ پیانو پر جا بیٹھے۔ سائیں نے ایک زور کی تھاپ کے ساتھ اپنی جوڑی کو ایک طرف کرتے ہوئے کہا:

"پتر واج تساں مار سٹیا ای کل ہلیں انگلاں دی ٹکور کرنے پوے گی"

حیدری صاحب نے مسکرا کر حوصلہ افزائی کی Well done, well done.

کالج سانگ کے لیے ۱۵۲۳ کاظم کمال، ۱۶۱۴/ سعید، ۱۳۰۹ عشرت پیانو کے بائیں طرف اور ۱۳۲۲ راجہ گلزار، ۱۴۰۷ رفیق، ۱۷۶۵ موجود کیانی دائیں طرف کھڑے ہوئے اور سانگ شروع ہوا۔

Boy-hood days are best
Carefree, gay and blest
Cramm'd with a wealth of sweet memories
There's just a name that we stand up for stoutly
There just a name that we sing for merrily
Aye, just a name that we honour devoutly
Tis the name of K.G.R.P.M.C.

اس کا انترہ کاظم کمال اٹھاتا تھا۔ (بعد کو شہید اور ستارۂ جرأت) یہ سانگ حیدری صاحب نے ۱۹۴۹ میں ایف اے سی سی کے افتتاح کے موقع پر لکھا تھا۔ اسکی دھن (Isle of Capri) کے میوزک پر ہے۔ حیدری صاحب نے اس سانگ میں کالج سے اپنی محبت بھر دی۔ چھ بندوں کے اس سانگ میں لڑکے جب اس سانگ پر پہنچتے تھے:

There's just a name that we stand up for stoutly
There's just a name that we sing merrily
Aye just a name that we honour devoutly
'Tis the name of own PMC

تو از تو دان کے سینے تن جاتے اور آواز میں جوش پیدا ہو جاتا۔ کالج سانگ کا ریہرسل تین بار ہوا
آخر میں حیدری صاحب نے کہا Ok, boys ! wish you sweet dreams
اور وہیں بیٹھے بیٹھے ایک اور سگریٹ سلگایا یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ کچھ دیر اور ایف
اے سی سی میں ٹھہریں گے اور تنہائی میں نغمہ سرا ہوں گے۔ باقی سب سنگرز نے تو اپنے اپنے
ہاؤسوں کا رُخ کیا۔ میں اور یونس کیانی باہر برآمدہ میں ٹھہر گئے اور دل میں دعائیں کرنے لگے کہ آج
وہ اپنی محبوب غزل "مستوں پہ انگلیاں نہ اٹھاؤ بہاریں" گائیں تو مزہ آجائے پہلے تو انہوں
نے خان مستانہ، سہگل اور پنکج ملک ــــ کانن بالا کا وہ مشہور ریکارڈ لگایا۔

دنیا رنگ، رنگیلی بابا دنیا رنگ رنگیلی
اس کا رس مصری سے میٹھا
اس کی تان سریلی بابا
دنیا رنگ رنگیلی بابا دنیا رنگ رنگیلی

اس عرصے میں وہ الماری میں کچھ ڈھونڈتے رہے پھر یہ ریکارڈ لگایا:

پریت میں ہے جیون جوکھوں
جیسے کولھو میں سرسوں
بھور سہانی چنچل بالک لڑکا ہی دکھلائے
ہاتھ سے بیٹھا گھڑے کھلونے پاؤں سے توڑت جائے
وہ تو ہے اک مورکھ بالک تو تو نہیں نادان
آپ بنائے آپ بگاڑے یہ نہیں تیری شان
پریت میں ہے ۔ ۔ ۔ ۔

آخر میں وہ ہارمونیم پہ بیٹھے، سرگم بجانے کے بعد وہ شروع ہوئے:

مستوں پہ انگلیاں نہ اٹھاؤ بہاریں
دیکھو تو ہوش بھی ہے کسی ہوشیار میں
جھوٹی تسلیوں سے

جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلاؤ بار بار
جاؤکہ تم
جاؤکہ تم نہیں ہو میرے اختیار میں
وہ سامنے
وہ سامنے دھری ہے صراحی شراب کی
دونوں جہاں
دونوں جہاں ہیں آج میرے اختیار میں
مستوں پہ انگلیاں نہ اٹھاؤ بہار میں
جھوٹی تسلیوں
جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلاؤ بار بار

یہ شعر انہوں نے کئی بار دہرایا۔ کیا درد تھا کیا سوز تھا۔ آواز میں اور کیا عالم بے خودی، ایف اے سی کی اس وقت سنگیت دیوتا کا معبد تھا جس میں معبد کا مہا پجاری نغمہ نیم شب کا آخری چڑھاوا چڑھا رہا تھا۔

ـــــــ شربت خان محسود[1]

اب تو ماشاء اللہ قبائلی علاقے بھی بہت ترقی کر گئے ہیں لیکن جب ۱۹۵۱ء میں، میں وہاں سے ملٹری کالج میں داخل ہونے آیا تو انگریزی کیا مجھے تو اُردو بھی اچھی طرح نہیں آتی تھی لیکن یہ حیدری صاحب کا اعجاز تھا کہ انہوں نے انگریزی زبان میں بھی چند سال میں رواں کر دیا۔ اور ۱۹۵۶ء میں مجھے انگریزی کے ڈرامہ Two heads are better than one. میں کاسٹ کیا۔ میرا رول لارڈ والڈرس کمانڈر انچیف آرمی کا تھا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ مجھے زمین پر پاؤں مار کر کوئن سے کہنا تھا:

Damn Madam,
I'm the leader of the army

یہ ڈرامہ میری زندگی میں ایک طرح سے سنگ میل بلکہ Turning point ہے۔ یہ

---

[1] دی پی الائیڈ بنک کالج نمبر ۲۰۵۳ زمانہ تعلیم ۵۷-۱۹۵۰ء

رول کر کے سٹیج کا خوف ہمیشہ کے لیے میرے دل سے نکل گیا اُردو انگریزی تقریروں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا کالج ہی میں جب ہاؤس پریفکٹ بنا تو حیدری صاحب کی دی ہوئی انگریزی کی مہارت بہت کام آئی: اور پھر بینکنگ کیریئر میں بھی میں نے اس کی افادیت قدم قدم پر محسوس کی۔ اللہ تعالیٰ حیدری صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں اچھے استاد ملیں۔

میں اوپر بھی بتا چکا ہوں کہ جب میں کالج میں آیا تو مجھے اُردو بھی ٹھیک سے نہیں آتی تھی۔ انگلش میوزک تو خواب و خیال میں بھی نہیں سنا تھا۔ پیانو کی شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پر اللہ بھلا کرے مسٹر حیدری کا کہ انہوں نے چند ہی مہینوں میں انگریزی کی Feel دے دی، وہ بھی انگلش میوزک کے ذریعہ سے۔ ہفتہ میں دو تین بار وہ ہمیں ایف اے سی سی میں لے جا کر میوزک کلاس لیتے تھے۔ وہ پیانو پر بیٹھ کر پہلے خود گاتے پھر ہم بھی شامل ہو جاتے۔ پہلا نرسری رائم The Mulberry Bush تھا جس کی چند لائنیں مجھے ابھی تک یاد ہیں۔

Here we go round the mulberry
The Mulberry bush, the mulberry
Here we go round the mulberry bush,
On a wild and frosty morning,
Here we ground.........

آگے چل کر اس میں Movement بھی ہے۔

This is the way we clap our hands
Clap our hands, clap our hands
This is the way we wash our hands
Wash our hands, wash our hands.

ہم دائرہ میں چکر لگا لگا کر ہاتھوں کو Clap کرنے اور Wash کرنے کی Movement کرتے یہ سانگ اکثر گاتے اور بڑا مزہ آتا۔ ایک اور سانگ تھا۔

London Bridge is falling down
Falling down, falling down

اس کو گانے میں بھی بڑا مزہ آتا تھا۔ اس کا میوزک بڑا اچھا تھا۔
ان سانگس کے ذریعے انگریزی کی ہمیں جو Feel پیدا ہوگئی تھی۔ وہ حیدری صاحب کا Achievement تھا۔

—کرنل امتیاز احمد ستارہ جرأت[1]

۱۹۸۲ء میں حیدری صاحب آرمی حج قافلہ کے ساتھ حج پر گئے تھے۔ حسن اتفاق سے اسی قافلہ کے ڈپٹی لیڈر ایک عالمگیرین بریگیڈیئر برلاس تھے اور ان کے علاوہ دو اور عالمگیرین لیفٹیننٹ کرنل خالد کیانی اور میں بھی ان کے ہم رکاب تھے یعنی وہ اس قافلہ میں ایک امتیازی استحقاق یافتہ (Privileged) پوزیشن رکھتے تھے لیکن انہوں نے اس سے قطعاً فائدہ نہ اٹھایا۔ بلکہ اہتمام سے دوسرے اراکین کی طرح اپنا سامان خود اٹھاتے کبھی کبھی میں کوشش کرتا کہ ان کا سامان اٹھا لوں چونکہ میرا سامان میری بس کے دوسرے لوگ سنبھال لیتے تھے۔ لیکن وہ اس کے لیے کبھی تیار نہیں ہوئے۔ جب کھانے یا چائے کے لیے رکتے وہ سب کی طرح ایک قطار میں کھڑے ہوتے اپنی باری پر اپنی ٹرے لیتے۔ اگر ہم سے کوئی ان سے آگے کھڑا ہوتا تو ہمیں الجھن ہوتی۔ لیکن وہ کبھی آگے آنے یا پہلے سرو ہونے کے لیے تیار نہیں ہوئے وہ اپنے برتن اور کپڑے خود ہی دھوتے۔ اگر وہ اشارتاً کنایتاً بھی چاہتے تو ہم ان کی مدد کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی انتظام ضرور کر دیتے لیکن انہوں نے استادی کی آن کو برقرار رکھا۔ اس وقت ان کی عمر ستر سے زیادہ تھی لیکن جسمانی توانائی سے زیادہ ان کی قوت ارادی اتنی مضبوط تھی کہ تمام مناسک حج انہوں نے خود کیے اور بخوبی کیے۔ صرف ایک مرحلہ شیطانوں کو کنکریاں مارنے کا ایسا تھا جو بہت کٹھن ثابت ہوا۔ ایک بار تو انسانوں کے سمندر کے ریلے نے ان کو اوپر اٹھا ہی لیا تھا۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ریلے کا رُخ دوسری طرف ہو گیا اور حیدری صاحب جب ریلے کی موج کے اوپر سے نیچے آئے تو حیدری صاحب کی آنکھیں ابل آئی تھیں۔ پسینہ پسینہ تھے۔ لیکن آفرین ہے ان کی ہمت پر، کہا

[1] کالج نمبر ۲۱۲۴ زمانہ تعلیم ۱۹۵۱ - ۱۹۵۷ء

تو یہ کہا: Thank God, Imtiaz, I'm back to life

اسی رات حیدری صاحب نے منیٰ سے مکہ مکرمہ پیدل سفر کیا۔ دونوں طرف کا فاصلہ کافی ہے۔ جوان آدمی بھی نڈھال ہو جاتا ہے۔ لیکن حیدری صاحب دوسروں کے ساتھ قدم ملا کے چلتے رہے۔ میرے پاس سرکاری پیسے تھے۔ مجھ سے کافی لوگوں نے پیسوں کا لین دین کیا لیکن حیدری صاحب نے ایک پیسہ قرض نہیں لیا۔ اپنے پیسوں سے ہی کام چلایا۔

—— میجر اختر حسین[1]

اپالو دیوتا کی سرزمین (یونان) کے ڈیلفی کے مندر کا ایک پجاری جو Muses کا منظور نظر تھا۔ حسن اتفاق سے یہاں پیدا ہو گیا تھا۔ فضل حق حیدری نام تھا۔ اس کو کسی نے پہچانا کسی نے نہیں پہچانا۔ ظرف ظرف اور نظر نظر کی بات ہے کچھ راگ الاپے۔ کچھ ساز بجائے۔ کچھ تصویریں کھینچیں، کچھ تمثیلیں سٹیج کیں یوں سرود نغمہ کا جادو جگا کر وہ صبح کا ستارہ کچھ دیر ملٹری کالج کے افق پر چمک کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

—— لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر[2]

۱۹۶۰ء میں سالانہ تقریب تقسیم انعامات کے موقع پر انگریزی کا ڈرامہ Invisible Duke ہوا تھا۔ اس میں حیدری صاحب نے مجھے Astrologer کا پارٹ دیا تھا۔ ۲۴۴ اسحاق ڈیوک بنا تھا۔ حیدری صاحب کی پیشکش اس پائے کی تھی کہ اس کو ریڈیو پاکستان کی نامور آرٹسٹ موہنی حمید نے جو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے جج نامزد ہو کر آئی تھیں، انٹر کالجیٹ پنجاب یونیورسٹی ڈرامیٹک کمپیٹیشن میں اوّل قرار دیا جب تک یہ مقابلے جاری رہے کالج مسلسل فرسٹ آتا رہا۔

یہ کنسرٹ مجھے اس لیے بھی یاد ہے کہ حیدری صاحب نے سی۔ آئی صاحب کو یقین دلایا تھا کہ بجنوری ڈرامہ بھی کرے گا اور ایف ایس سی بھی پاس کرے گا۔

حیدری صاحب کا ایک اور احسان بھی مجھ پر ہے کہ انہوں نے مجھے فوٹو گرافی بھی سکھائی۔ ایف اے سی سی کا کمرہ وہ تھا جس میں اب اے کیو کا دفتر ہے۔ موجودہ یو۔ اے کا دفتر اس زمانہ میں ڈارک روم ہوتا تھا۔

---

[1] کالج نمبر ۱۶۳م زمانہ تعلیم ۱۹۵۱ تا ۱۹۵۵ء [2] کالج نمبر ۲۱۹۶ زمانہ تعلیم ۶۱-۱۹۵۷ء

لیفٹیننٹ کرنل سردار محمد[1]

میں، اقبال فرید، اعجاز رفیع کے ساتھ انگلش میوزک گروپ میں تھا۔ حیدری صاحب کا میوزک سکھانے کا طریقہ یہ تھا کہ تمام سنگرز کو ایک قطار میں اس طرح کھڑا کرتے کہ بھاری آواز والے سائڈ پر اور باریک آواز والے درمیان میں ہوتے۔ پہلے وہ پیانو پر خود گاتے تھے۔ ہم سنتے رہتے پھر وہ ہمیں اشارہ کرتے، ہم بھی ان کے ساتھ آواز ملاتے۔ تیسرے دور میں وہ صرف پیانو بجاتے اور سنگرز گاتے۔ اقبال فرید اور اعجاز مصرعہ اٹھاتے تھے۔ باقی فالو کرتے۔ کبھی کبھی حیدری صاحب پہ پیانو بجاتے بجاتے وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ایسے میں وہ آنکھیں بند کرکے خود کوئی سانگ شروع کر دیتے۔ ان کا پسندیدہ سانگ آئل آف کیپری (Isle of Capri) تھا۔ اسی کی دھن پر انھوں نے کالج سانگ لکھا تھا۔ کالج سانگ کے کورس کے ساتھ دو ساز بھی بجائے جاتے تھے۔ میں ڈرم بجاتا تھا۔

فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کردار کے لحاظ سے بھی ایک جرأت مند انسان تھے۔ ۱۹۶۰ء میں لیفٹیننٹ (بعد کو کرنل) غفور نے شکوہ جواب شکوہ کو تابلو کی شکل میں پیش کیا تھا جس میں میں خود جلاد بنا تھا۔ یہ بڑا شاندار شو تھا لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر کمانڈانٹ وقت نے اس پر جب اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو انھوں نے برملا اور خاصے سخت لہجہ میں کہا: No, it was a wonderful show لیفٹیننٹ غفور نے یہ شو ان کے ماتحت کے طور پر پیش کیا تھا۔ انھوں نے جرأت سے اپنے جونیئر ساتھی کا دفاع کیا اور ایسا کرنا اپنا فرض سمجھا اور اپنے شو سے زیادہ ان کے شو کی تعریف کی۔ اتنا ظرف کسی کسی میں ہوتا ہے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل خالد محمود کیانی[2]

۱۹۵۵ء میں کالج میں داخل ہونے کے ساتھ ہی ایف اے سی سی کے ڈراموں میں حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ کالج سانگ کے کورس میں شریک ہو جاتا تھا۔ ۱۹۵۷ء کے سالانہ کنسرٹ کے موقع پر حیدری صاحب نے کہا، "خالد اس بار تمھیں ایک خاص انگلش سانگ گانا ہے۔" میں نے کہا "سر، کورس کی اور بات ہے، سولو سنگنگ تو میں نے کبھی کی ہی نہیں اس لیے سر! اگر آپ مجھے

---

[1] کالج نمبر ۲۲۱۴
[2] کالج نمبر ۲۳۱۷ زمانہ ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۲ء

"نہیں، یہ نہیں ہو سکتا" .... excuse)

"لیکن سر ۔ ۔ ۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم گا سکو گے I know you can do it.

ان کے اصرار سے مجبور ہو کر محض ان کو ناراض نہ کرنے کے خیال سے میں نے ہامی بھر لی۔ چنانچہ ایف اے سی سی میں ریہرسل کی تیاری شروع ہوئی۔ یہ سانگ امریکی موسیقار Paul Robson کا مشہور نغمہ The sun shines bright

تھا۔ پہلے انہوں نے مجھے یہ نغمہ سنوایا جو انہوں نے اصل ریکارڈ سے اپنے ٹیپ ریکارڈ پر ٹیپ کیا ہوا تھا۔ پال روبسن کی گمبھیر آواز سے میں بہت متاثر ہوا۔ اس کا Resonance خاص طور سے سمندر کی لہروں کی طرح اٹھتا اور پھیلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ نغمہ کے آخر میں پال روبسن کی پاٹدار آواز کے ساتھ ایک نہایت معصوم اور باریک آواز آئی۔ "آغاجی" (غالباً یہ حیدری صاحب کے چھوٹے بیٹے رضوان کی آواز تھی) میں یہ آواز سن کر چونکا اور حیدری صاحب کی طرف دیکھا کہ شاید وہ کچھ وضاحت کریں لیکن وہ آنکھیں بند کیے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر گانا سنتے رہے (میرا خیال ہے کہ جب حیدری صاحب گانا ریکارڈ کر رہے ہوں گے تو ان کے بیٹے نے اچانک اندر آکر آغاجی پکارا ہوگا جو ریکارڈ ہو گیا پھر حیدری صاحب نے اشارہ سے اسے مزید بولنے سے منع کر دیا ہوگا) پال رابسن کا یہ گانا حیدری صاحب نے مجھے کئی بار سنوایا۔ ایک بار جب گانے کے آخر میں یکایک وہی آغاجی کی آواز آئی تو حیدری صاحب کے منہ سے بے اختیار نکلا:

Oh, how sweet

گانے کی ریہرسل سے پہلے حیدری صاحب نے مجھے گانے کی پوری بیک گراؤنڈ سمجھائی۔ اور اس جذبہ (Emotion) کی وضاحت کی جو پال رابسن نے اتنی خوبصورتی سے ظاہر (Express) کیا ہے۔ گانے کی سپرٹ اور دھن کو تحت الشعور میں جذب کرنے کے لیے میں نے اسے بار بار سنا اور دہرایا۔ لیکن جب میں نے پہلی بار خود گایا تو نتیجہ حیدری صاحب کی توقعات سے بالکل برعکس نکلا۔ آواز میں تھرتھراہٹ اور دھن بھی غلط۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے پسندیدہ گانے کا حلیہ بگڑتے دیکھ کر سر پیٹ لیں گے۔ لیکن انہوں نے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا بلکہ اور باریکی

سے میری اصلاح شروع کردی۔ بار بار کے ریہرسل کے بعد جب کچھ بات بنتی نظر آئی تو بہت خوش ہوئے۔ اب خود مجھے بھی کچھ اعتماد ہوگیا تھا اس شام کو پیانو پر وہ بیٹھے تو میں نے محسوس کیا کہ آج ان کی مخروطی انگلیوں کی مومنٹ ہی کچھ اور ہے۔ جب میں گا چکا تو انہوں نے پُرمسرت مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

Well done - Paul Robson - the second

یہ انتہا تھی ان کی حوصلہ افزائی کی۔

۱۹۸۲ء میں آرمی کے حج قافلہ کے ساتھ ہم حج پر جا رہے تھے تو حیدری صاحب بھی اسی بس میں تھے جس میں بس لیڈر کی حیثیت سے میں سب سے اگلی سیٹ میں بیٹھتا تھا۔ اتفاق سے حیدری صاحب کی سیٹ میری سیٹ کے بالکل پیچھے تھی۔ یہ بات مجھے بہت کھٹکی۔ میں نے حیدری صاحب سے گزارش کی کہ وہ میری سیٹ پر آجائیں میں ان کی جگہ بیٹھنا چاہوں گا۔ لیکن وہ نہ مانے۔ کچھ سفر طے کرنے کے بعد میں نے پھر اس مسئلہ کو چھیڑا۔ سر آپ آگے آجائیں۔ It's all right کہہ کر انھوں نے معاملہ کو پھر ٹال دیا۔ اس طرح کچھ فاصلہ اور طے ہوگیا کچھ سمجھ میں نہ آئے کہ کیا کروں۔ ان کی طرف پشت کر کے بیٹھنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اصرار کیا اور دلیل یہ دی کہ "سر اسی طرح میں اگلی سیٹ پر بیٹھا رہا اور آپ پچھلی سیٹ پر تو ۲۳ ہزار کلومیٹر کا یہ سفر بڑی ذہنی الجھن اور پریشانی میں گزرے گا۔" انہوں نے جواب میں کہا۔ "اگر میں تمہیں تمہاری جائز جگہ سے محروم کر کے وہاں بیٹھ گیا تو یہی حال میرا ہوگا۔ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ اس ذہنی الجھن میں، میں مسلسل مبتلا رہوں۔" لاجواب ہو کر میں نے عرض کیا۔ "سر اگر آج میں اگلی سیٹ پر بیٹھنے کے قابل ہوا ہوں تو یہ آپ ہی کی دی ہوئی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے، انھوں نے مسکرا کر حتمی انداز میں فرمایا۔

I led you to the world, now you lead me to the Heaven.

میں سگریٹ نہیں پیتا لیکن اس بس میں بعض افسران جوان اور ڈرائیور سگریٹ پیتے تھے۔ خود حیدری صاحب چین سموکر تو نہیں لیکن ہیوی سموکر ضرور تھے۔ شروع میں تو خیال آیا کہ سموکرز اور نان سموکرز کو علیحدہ بٹھا دیا جائے لیکن بعض دوسری مصلحتوں کی وجہ سے میں نے یہ مسئلہ نہ

چھیڑا۔ بس میں گولڈلیف، ولز، کیپسٹن، کے ٹو ہر برانڈ کا سگریٹ پیا جا رہا تھا۔ چونکہ بس ائرکنڈیشنڈ تھی اس لیے بعض دفعہ سگریٹ نوشی کی کثرت سے بس میں دھواں بھر جاتا۔ جس سے مجھے بہت کوفت ہوتی۔ لیکن سموکرز رفقاء سفر خاص طور پر حیدری صاحب کی وجہ سے میں خاموش رہا اور بس میں سگریٹ نوشی جاری رہی۔ ایران اور ترکی سے گزر کر جب ہم شام کی حدود میں داخل ہوئے تو مسلسل دھوئیں میں سانس لینے کی وجہ سے مجھے کھانسی اٹھنے لگی۔ چونکہ حیدری صاحب کی نشست میری نشست کے بالکل پیچھے تھی اس لیے ان کے سگریٹ کا دھواں مجھے خاص طور پر پریشان کرتا۔ شروع شروع میں تو انہیں اس کا احساس نہ ہوا لیکن جب میری کھانسی بڑھی تو انھوں نے پوچھا کیا بات ہے تمہاری کھانسی کیوں نہیں جاتی۔ میں نے بات کو ٹالنے کے لیے کہا کوئی بد پرہیزی ہوگئی ہوگی اس پر فوراً بولے:

I hope it's not the smoke.

میں نے کہا۔ No, Sir, I don't think so.

لیکن غالباً حیدری صاحب کو شک پڑ گیا تھا کہ میں براہِ راست ان کے دھوئیں کی زد میں ہوں۔ اس کے بعد میں نے نوٹ کیا وہ دھواں اہتمام سے بس کی چھت کی طرف رُخ کر کے چھوڑتے ہیں اور از خود سگریٹ نوشی میں بھی کمی کر دی ہے۔ یہ احتیاطیں تو انہوں نے محض شک کی بناء پر کیں۔ لیکن اگر انہیں یقین ہو جاتا کہ ان کا دھواں میری کھانسی کا سبب ہے تو وہ یقیناً اپنی سیٹ بدل لیتے۔ دوران سفر میں نے ایک دفعہ بس لیڈر کی حیثیت سے سفر کے دوران ڈسپلن اور دوسرے امور پر بعض ہدایات دیں۔ اگلی منزل پر کھانا کھانے کے لیے جب ہم بس سے اترے تو کھانے کے دوران حیدری صاحب میرے پاس آئے اور میرے احکامات دینے کے انداز کے بارے میں کچھ تعریفی کلمات کہے میں نے عرض کیا۔ Sir, I and many others like me have learnt these things from you.

وہ فوراً بولے۔ But today you have taught me.

یہ ان کی ذرہ نوازی تھی۔ غالباً ان کا اشارہ کسی ٹیکنیکل تفصیل کی طرف تھا۔

ایک دفعہ کھانے کے لیے رُکے۔ کھانے میں دال اور چاول پکے ہوئے تھے جس میں کوئی ایک

چیز کچھ کچی رہ گئی تھی۔ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ ادھر سے حیدری صاحب کا گزر ہوا۔ فرمایا کھانا کیسا ہے؟ میں نے ازراہِ مذاق کہا، سر، اس کھانے سے کالج کی یاد تازہ ہوگئی۔ حیدری صاحب مسکرائے۔ میں نے سلسلہ کلام کو آگے بڑھایا۔ Looking ahead, the next problem would be of digesting it.

حیدری صاحب ہنسے اور فرمایا: A true Alamgirian should have no difficulty in digesting such stuff.

ترکی میں ہمارا رات کا کھانا ایک آرمی کلب میں تھا۔ چاندنی رات تھی۔ بینڈ آرکسٹرا بجا رہا تھا ہم سب نہائے دھوئے کلب میں داخل ہو رہے تھے۔ کھانے کا انتظام کلب کے وسیع سبزہ زار میں تھا ہر کوئی موسم اور ماحول کی پُراسرار خوبصورتی سے متاثر نظر آرہا تھا۔ میں حیدری صاحب سے چند قدم پیچھے تھا۔ حیدری صاحب نے چلتے چلتے یکایک پیچھے مڑ کے دیکھا اور مجھ پر نظر پڑی تو مجھ سے پوچھا۔

Khalid, you know what is the band playing

میں میوزک کی ان باریکیوں سے کہاں واقف تھا۔ میں نے سوال کو ٹالتے ہوئے کہا:

Yes, Sir, I know it is not our College song

انہوں نے میرے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ برسوں پہلے میں نے کہیں یہ میوزک سنا ہے۔ غالباً یہ (Moon light) کی دھن ہے۔ (انہوں نے پورا نام بتایا تھا جو اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا) پھر انہوں نے اس امر کی تصدیق کروائی تو ان کا اندازہ صحیح نکلا۔ وہ میوزک کے بڑے Connoiseur تھے یہ لفظ بھی میں نے پہلے انہی سے سنا تھا۔

اس شب حیدری صاحب بڑی "فارم" میں تھے وہ دنیا کے ہر موضوع پر اپنی شستہ انگریزی میں بات کرنے کے لیے تیار اور آمادہ نظر آتے تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ترک فوج کے بعض سینئر افسروں سے بہت سے تاریخی اور بین الاقوامی موضوعات پر بہت عالمانہ انداز میں گفتگو کی۔ بعد میں ان افسران نے برملا اعتراف کیا آپ کے مسٹر حیدری یقیناً بہت فاضل استاد ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ پاکستان میں بیشتر استاد اس سطح کے ہیں حقیقت کا علم تو ہمیں تھا کہ حیدری صاحب ایسے استاد خال خال ہیں۔ اتفاق سے اس حج قافلہ میں ان کے ایک

نہیں چار شاگرد تھے۔ بریگیڈیر برلاس کمانڈر، کرنل غلام فرید، کرنل امتیاز اور میں، لیکن مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی کسی شاگرد کو کوئی تکلیف دی ہو یا کسی اور سے کوئی رعایت لی ہو۔ اگر ہم میں سے کوئی اپنی خدمات آفر بھی کرتا تو وہ بہت خوشدلی سے شکریہ ادا کرکے اپنے حصے کا کام خود کرنے پر اصرار کرتے تھے۔ وہ عمر کی جس منزل میں تھے ان کا تھکان سے متاثر ہونا فطری بات تھی۔ بعض دفعہ میں نے دیکھا کہ وہ بس پر چڑھتے یا اترتے وقت کچھ لڑکھڑا سے جاتے۔ لیکن فوراً اس طرح سنبھلتے جیسے لڑکھڑائے نہ ہوں۔ جس کی وجہ سے مجھے ان کو سہارا دینے کی جرأت نہیں ہوئی۔ یہی حال مناسک حج کی ادائیگی کے وقت رہا۔ دوران حج میں نے حیدری صاحب کو ڈٹ کر عبادت کرتے نہیں دیکھا۔ شاید تنہائی میں کبھی گڑگڑائے ہوں یا لمبے سجدے کیے ہوں وظیفے پڑھے ہوں لیکن سب کے سامنے نارمل رہے۔ شاید دکھاوے کی عبادت سے بھی انہیں الجھن ہوتی تھی۔ ہاں ایک آدھ فقرہ انہوں نے ضرور ایسا کہا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس مقدس سفر کو اپنی زندگی کے ڈرامہ کا Finale سمجھتے تھے۔ God bless his soul

خدا انہیں جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین مقام پر جگہ دے۔

ـــــ سلیم اختر کیانی[1]

فن کی تربیت دینا اور Cultural awareness کو ابھارنا غالباً خود آرٹسٹ ہونے سے زیادہ مشکل اور اہم تر کام ہے۔ حیدری صاحب اس منصب بلند پر فائز تھے۔ وہ انگریزی کے ڈرامہ گروپ اور سنگرز کے کلچرل Exposure کے لیے مسلسل کوشاں رہتے تھے۔ کوئی اچھی فلم ہو، کنسرٹ ہو، یا موسیقی کا پروگرام ہو وہ ہمیں ضرور اس سے مستفید ہونے کا موقع دیتے۔ پرتجتٹ سینما جہلم میں ایک فلم لگی تھی The king and I اس کو دکھانے ہمیں جہلم لے گئے۔ یہ سانگ

Whenever I feel afraid
I hold my head erect
And whistle a merry tune
So no one may suspect
I'm afraid

---

[1] کالج نمبر ۲۳۱۹ زمانہ تعلیم ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۴ء

انھوں نے ٹیپ کر لیا تھا۔ اس کو ہمیں سنایا۔ پیانو پر خود گایا اور پھر سٹیج پر ہم سے گوایا۔ چونکہ ہم فلم دیکھ چکے تھے اور اس کی Situation سے واقف تھے۔ اس کو اسی طرح گانا ہمارے لیے بڑا Exciting experience تھا۔

برٹش انسٹی ٹیوٹ لاہور میں لندن کا آکسفورڈ پلے ہاؤس کچھ ڈرامے پرفارم کر رہا تھا۔ شیکسپیئر کا Twelfth Night تھا۔ برناڈ شا کا Man of Destiny تھا۔ حیدری صاحب پورے گروپ کو لاہور لے گئے اور یہ دونوں پلے دکھائے اور ایکٹنگ کے فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

اسی طرح ایک بار نہیں کئی بار وہ سنگرز کو انگلش کلاسیکی موسیقی سے متعارف کرانے کے لیے اپنے گھر لے گئے اور اپنے گرنڈنگ ریکارڈ پلیئر پر موزارٹ اور بیتھوون کی Symphonies سنوائیں۔ اس ایکسپوژر Exposure کے دور رس نتائج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فوری طور پر مجھ پر یہ اثر ہوا کہ کچھ مغربی موسیقی سے مس پیدا ہو گیا اور میں پیانو پر بھی انگلیاں مارنے لگا اب یہ مشکل پیش آئی کہ پیانو کیڈٹس کے لیے، اس کے تحفظ کے لیے شجر ممنوعہ تھا۔ بہر حال ایف اے سی سی کے بینڈ ماسٹر جناب عنایت کی نظر میں میرا معتبر ہونا کام آیا اور ایف اے سی سی کی چابی میرے پاس رہنے لگی۔ اس رعایت سے میں نے صرف اتنا فائدہ اٹھایا کہ جو وقت خالی ہوتا میں ایف اے سی سی کے بھاری پردوں کے پیچھے پیانو سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھتا جس نے بہت جلد ایک محبت کی شکل اختیار کر لی۔ ایک روز مجھے خیال آیا کہ دن رات کے ہر حصے میں پیانو کے سروں کا تاثر دیکھنا چاہیے۔ ایک بار رات کے پچھلے پہر کالج کے ڈیری سنٹر پر ملک چیک کرنے کی ڈیوٹی تھی تو اس کے بعد رات کے پچھلے پہر بھی اس ساز کے جادو کا تاثر میں نے آزمایا۔ اب صرف ایک وقت باقی تھا۔ غروب آفتاب کے فوراً بعد کا وقت جس میں یہ تجربہ کرنے کا وقت مجھے نہیں مل رہا تھا چونکہ وہ مغرب کی نماز کا وقت تھا۔ بہر حال ایک روز شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس وقت میں نے ایف اے سی سی کے اندر Sneak کیا اور

یہ رات یہ فضائیں پھر آئیں کہ نہ آئیں

کی دھن بجانے لگا تھا اور اتنا محو ہوا کہ وقت کا خیال ہی نہ رہا۔ جب نہ آئیں کا آخری نوٹ

بجا رہا تھا تو پیچھے سے Clapping کی آواز آئی۔ میں چونکا اور پیچھے مڑ کے دیکھا
میں چونکہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اس لیے خوف کی ایک لہر نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔
خلاف توقع جب انہوں نے Well done کہا، کہا تو میری جان میں جان آئی۔
حیدری صاحب نے میری کوشش کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور اس دن سے وہ مجھے پیانو
کے فنی رموز (Notation) وغیرہ بھی سکھانے لگے۔ Great of him;

میں اور خالد ہم دونوں بھائی انگریزی کے ڈراموں میں مستقل حصہ لیتے تھے اور حیدری صاحب کی فنی نوازشات سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔ ڈرامہ کی ریہرسل کے ابتداء میں وہ انگریزی مکالموں کو اُردو اور کبھی کبھی پنجابی میں بھی کرواتے تھے۔ (غالباً یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم مکالموں کا مفہوم سمجھتے ہیں یا نہیں) اُردو یا پنجابی مکالمے چونکہ برجستہ کیے جاتے تھے اس لیے بڑا مزہ آتا تھا۔ اور مکالموں کی روح دل میں اُتر جاتی تھی۔ آخر میں، میں حیدری صاحب کی فنی بلندی نہیں انسانی بلندی کا ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ۱۹۶۲ء میں، مرچنٹ آف وینس کے کورٹ سین میں ڈیوک کا کردار کر رہا تھا۔ موتی ہال کے سٹیج کے تکنیکی نقائص کے پیش نظر مسئلہ یہ تھا کہ جب کہ عدالت لگی ہوئی ہے ڈیوک شاہانہ طمطراق سے کدھر سے آئے کہ ناظرین اور حاضرین پر اس کا خاطر خواہ اثر ہو۔ کئی تجاویز زیر بحث آئیں۔ آخر کار میں نے عرض کیا سر کیوں نہ ڈیوک حاضرین کے درمیان سے گزر کر عدالت سٹیج پر جائے اور جب اس کے کچھ درباری کھڑے ہوں گے تو باقی حاضرین از خود کھڑے ہو جائیں گے۔ وہ بڑا شاندار منظر ہو گا۔ یہ حیدری صاحب کی بڑائی تھی کہ انہوں نے یہ تجویز فوراً قبول فرما لی اور اسے بہت سراہا۔ یہ ظرف شاید باپ اور استاد کے سوا کسی اور میں نہیں ہوتا) حیدری صاحب کی فنی عظمتیں اپنی جگہ، میں انسانی عظمت کا بھی قائل ہوں۔
—— وہ کیا ادارہ تھا جس کے استاد فنکار بھی بڑے تھے اور انسان بھی بڑے تھے۔

—— نثار کیانی[1]

حیدری صاحب کی انگریزی کے جمال و کمال سے تو سب ہی واقف ہیں لیکن شاید یہ بات زیادہ لوگوں کو معلوم نہ ہو بھیٹھ پنجابی بولنے میں بھی انہیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ایک روز کلاس

---

[1] پی آئی اے کارلج نمبر ۲۳۵۳ زمانہ تعلیم ۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۲ء

ہیں ایک جملہ کہا:

He was bragging a lot but then had to eat a humble pie.

اس کا پنجابی میں ترجمہ تو کرو۔ سب نے بڑا زور لگایا لیکن بات نہ بنی پھر خود ہی بتایا پنجابی میں اسے یوں کہا جائے گا۔

پہلاں تے بڑیاں پھڑاں مارنا سی، پر پچھوں پرک گیا۔

اب میں یہ لکھتا ہوں کہ ۵۰ء میں ڈرامے کہاں اور کیسے ہوتے تھے۔ ۱۹۶۲ء میں موسٰی ہال کی تعمیر تک کالج کے سالانہ ڈرامے، کیمسٹری لیب سے ملحق پرانے کالج ہال میں ہوتے تھے۔ یہیں ۱۶ ایم ایم کی سکرین پر معلوماتی اور فیچر فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ کوئی باقاعدہ سٹیج بھی بنا ہوا نہیں تھا لکڑی کے بڑے بڑے چار چوکے پڑے ہوئے تھے۔ انہیں عارضی سٹیج بنا لیا جاتا تھا۔ (ضرورت پڑنے پر یہی چوکے باکسنگ رنگ کا کام دیتے تھے) سٹیج کے چار بیک ڈراپ پردے جہلم کے مشہور آرٹسٹ اختر نے بنائے تھے جن میں ایک منظر دشت جبل و دریا کا، ایک عالی شان مکان یا محل کے ڈرائینگ روم کا۔ ایک کوچہ و بازار تھا۔ جو پردہ کھلتا ایک نئی دنیا سامنے آجاتی۔ پردوں کے بازوؤں پر لگے منقل پینل علیحدہ تھے۔ پردوں کو اٹھانے گرانے کا انتظام دستی پلی کے ذریعے تھا۔ سامنے کے نیلے پردہ کے بیچ میں سُرخ رنگ کا کالج کا مونوگرام بنا تھا۔ پردوں اور سٹیج کے انچارج لیب اسسٹنٹ مسٹر عمر قریشی تھے۔ ڈرامہ کی تیاری تقریباً دو ماہ پہلے شروع ہو جاتی۔ کردار ڈرامہ کی ضرورت کے مطابق چنے جاتے۔ تیاری تین مرحلوں سے گزرتی۔ پہلے مرحلہ میں حیدری صاحب ڈرامہ کا پلاٹ اور کردار سمجھاتے، دوسرے مرحلہ میں ڈرامہ کی ریڈنگ ہوتی تلفظ ٹھیک کیا جاتا۔ تیسرے مرحلہ میں ادائیگی اور موومنٹ سکھاتے اور ریہرسل شروع ہو جاتا۔ مہینہ بھر ریہرسل ایف اے سی سی میں ہوتا۔ آخری دو ہفتے اصل سٹیج پر اور دو دن پہلے ڈریس ریہرسل کیا جاتا تھا۔ اصل شو کے دن کالج میں عید کا سماں ہوتا تھا۔ ڈرامہ کے لڑکے گراؤنڈ کے فنکشن پریڈ وغیرہ پر نہیں جاتے تھے۔ کیمسٹری لیب گرین روم کی صورت اختیار کر لیتی۔ ڈرامہ کے سارے کیریکٹرز کو لیبارٹری کی ایک ایک میز الاٹ کر دی جاتی جس پر اس کی کاسٹیوم اور میک اپ کی چیزیں رکھ دی جاتیں۔ سارے کردار ٹہل ٹہل کر اور بعض موومنٹ کے ساتھ اپنے اپنے پارٹ دہراتے۔ اس طرح مکھیوں کے چھتے کی بھنبھناہٹ

کا سماں پیدا ہو جاتا۔ اس عرصہ میں حیدری صاحب عمر قریشی کے ساتھ سٹیج کی سیٹنگ کو آخری ٹچ دے رہے ہوتے۔ شام کو چائے آنی شروع ہو جاتی تھی۔ اس شام لڑکوں کا کھانا ڈرامہ کے بعد ہوتا تھا۔ حیدری صاحب چونکہ لڑرہے ہوتے شام سے وہ میک اپ شروع کر دیتے۔ کاسٹیوم پہناتے اگر عمر قریشی آواز دیتے تو بھاگ کر ادھر جاتے۔ سنگرز اور طبلہ ہارمونیم کو بھی انہیں ہی نے دیکھنا ہوتا۔ ۱۹۵۰ء سے راشد صاحب بھی حیدری صاحب کی معاونت کرنے لگے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں علوی صاحب نے اُردو کے ڈراموں کی ڈائریکشن اور پروڈکشن کا چارج سنبھالا تو وہ اپنے کرداروں کا بیشتر میک اپ خود کرتے تھے۔ پھر بھی اوور آل چارج حیدری صاحب کا ہی ہوتا تھا۔ مہمان خصوصی کے آنے پر حیدری صاحب اپنے خاص سیاہ سوٹ میں ملبوس سٹیج پر بے تحاشا تالیوں کی گونج میں خیر مقدمی کلمات کے بعد ڈرامہ کا تعارف کراتے اور پردہ اٹھنے پر ڈرامہ کسی کورس کے مکھڑے سے شروع ہو جاتا۔ ہارمونیم کوئی نہ کوئی کیڈٹ ہی بجاتا۔ سالہا سال نور محمد بجاتا رہا۔ طبلہ البتہ کالج کا ہیڈ سوئیپر فیروز بجاتا۔ عمر قریشی کا بیٹا بھی طبلہ بجاتا تھا۔

——— لیفٹیننٹ کرنل اقبال شاہین[1]

دسمبر ۱۹۵۸ء کی سرمائی چھٹیوں کا ذکر ہے حیدری صاحب پشاور پارٹی کو اپنے سامنے حفاظت سے گاڑی میں سوار کرانے کے لیے اپنے ساتھ جہلم ریلوے سٹیشن لے گئے اس وقت نو بجے تھے پتہ چلا کہ گاڑی گھنٹہ بھر لیٹ ہے۔ حیدری صاحب ہمیں ویٹنگ روم میں لے گئے۔ وہاں چائے پلائی۔ ۱۰ بجے معلوم ہوا کہ گاڑی بارہ بجے آئے گی۔ ۱۲ بجے تک وہ اس سردی میں ہمارے ساتھ رہے۔ گاڑی آئی آدھی رات، وہ بھی دسمبر کی۔ بیشتر کمپارٹمنٹ بند تھے انہوں نے بھاگ دوڑ کے ہمیں جگہ دلوائی اور ہمیں سینئر کیڈٹ وکیل خان آفریدی کے چارج میں دے کر بار بار ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہتے رہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کے اپنے بچے بھی اس گاڑی سے جا رہے ہوتے تو وہ اس سے زیادہ اہتمام نہ کرتے۔ بڑا دل چاہتا ہے کہ اب ہماری اولاد کو بھی ایسے استاد میسر ہوں جو اپنے طالب علموں کے لیے اپنے آرام کو آرام نہ سمجھیں۔

---

[1] لیفٹیننٹ کرنل ریٹائرڈ - ۱۹۵۸ء

——لیفٹیننٹ کرنل اعجاز رفیع[۵]

۱۹۵۸ء میں (جس سال میں کالج میں داخل ہوا) ایف اے سی سی کے انگریزی ڈرامہ اور موسیقی کے گروپ میں اقبال فرید اور خالد کیانی ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ مسٹر حیدری کی نگہ انتخاب کا کرم تھا کہ انہوں نے مجھے بھی اس اختصاصی گروپ میں شامل ہونے کا موقع دیا۔ اور اس سے بقدرِ شوق میں نے استفادہ بھی کیا۔ مسٹر حیدری کی گائیکی اور ڈرامے میں شاگردی کو میں اپنی زندگی کی خصوصی خوش بختی سمجھتا ہوں۔

مسٹر حیدری کا دستور تھا کہ وہ ڈرامہ اور میوزک گروپ کو اچھے فلم، ڈرامے دکھواتے تھے اور میوزیکل کنسرٹ سنواتے رہتے تھے۔ غالباً ۱۹۶۱ء میں انگلینڈ کی ایک تھیٹریکل کمپنی پاکستان کا دورہ کر رہی تھی۔ راولپنڈی کے لیاقت ہال میں اس کا سٹیج کیا ہوا شیکسپیئر کا ڈرامہ Twelfth Night بھی حیدری صاحب کے ساتھ ہم نے دیکھا جس کو دیکھ کر ہم سب کا خیال تھا کہ اس سے بہتر نہیں تو اسی معیار کا شو حیدری صاحب کرا سکتے تھے۔ اس زمانہ میں کالج لاہور بورڈ کے انٹر کالجیٹ ڈرامہ مقابلوں میں حصہ لیتا تھا اور ہر سال فرسٹ آتا تھا۔

۱۹۶۴ء میں ڈرامہ کے لیے ارباب حل وعقد نے سالانہ کنسرٹ کی تیاری کے لیے صرف بیس دن دیئے تھے جو بہت کم تھے۔ حیدری صاحب نے مرچنٹ آف وینس کا مشہور کورٹ سین منتخب کیا اور ریہرسل شروع ہوگئی تو اس پر اعتراض ہوا کہ یہ زیادہ سنجیدہ چیز ہے۔ کوئی ہلکی پھلکی کامیڈی پیش کی جائے۔ حیدری صاحب نے یہ فرمائش پوری کرنے کا بھی اہتمام کیا اور اس طرح دو انگلش ڈراموں کی تیاری شروع ہوئی۔ چونکہ وقت بہت کم تھا اس لیے حیدری صاحب چاہتے تھے کہ کردار جلد سے جلد اپنے پارٹ یاد کرلیں میرا پارٹ دونوں ڈراموں میں تھا۔ میں نے کورٹ سین کا پارٹ یاد کرلیا لیکن دوسرے پارٹ کو سنجیدگی سے نہیں کیا۔ بلکہ مزید زیادتی یہ کی کہ بجائے پارٹ یاد کرنے کے ہنسی مذاق میں مشغول ہوگیا۔ خلاف معمول اور خلاف عادت حیدری صاحب نے مجھے ڈانٹا اور ناراض ہوکر یہ کہتے ہوئے کہ جب پارٹ یاد کرلو تو مجھے بلا لینا موتی ہال سے چلے گئے۔ اب ڈرامہ گروپ خاص طور پر مجھے بڑی فکر ہوئی اور شرمندگی بھی کہ حیدری صاحب ناراض ہوگئے۔

---

[۵] کالج نمبر ۲۴۷۴ زمانہ تعلیم ۱۹۵۸ تا ۱۹۶۴ء

مختصر یہ کہ سلیم کیانی اقبال فرید اور میں تینوں اورنگ زیب ہاؤس میں ان کے گھر گئے۔ اور مسکینوں سے معافی مانگی۔ ازرہ شفقت انہوں نے نہ صرف درگزر کیا بلکہ الٹی ہماری خاطر تواضع بھی کی جس سے ہم نے خوب انصاف کیا۔ اس طرح وہ شام جو ایک غلطی سے شروع ہوئی تھی ان کی فراخدلی سے ایک یادگار محفل میں بدل گئی۔ بات بدلنے کے لیے میں نے پوچھا سر، پورشیا کورٹ سے Godly ہونے کے لیے کہتی ہے کیا یہ صحیح ہے حیدری صاحب نے فرمایا مرسی کے بارے میں شیکسپیئر نے کہا ہے۔

As it droppeth gently from the heaven

پھر انہوں نے شیکسپیئر کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی یہاں تک بات پہنچتے پہنچتے ان کا موڈ قطعاً بدل چکا تھا بلکہ شگفتہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے مجھ سے مشہور سانگ Home, sweet home گانے کو کہا۔ میں نے تعمیل کی وہ خوش ہوئے ان کی حوصلہ افزائی سے شہہ پاکر سلیم کیانی اور میں نے فرمائش کی کہ سر، آپ بھی کچھ سنائیں انہوں نے گلبرٹ اور مرے کا مشہور اوپرا Isle of capri سنایا اور اس طرح سنایا کہ بیخود ہو گئے، اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ یہ نغمہ ان کی روح میں رچا ہوا ہے۔ اسی دھن میں انہوں نے کالج سانگ Boyhood days are best کمپوز کیا ہے۔

اسی محفل میں انہوں نے بتایا کہ جب وہ ۱۹۵۸ء میں انگلینڈ گئے تو وہاں کے مشہور ڈرامہ نگاروں، ایکٹروں اور موسیقاروں سے ملے تھے۔ انہوں نے امریکی موسیقار Paul Robson سے اپنی ملاقات کا ذکر بھی کیا۔ ان کے پاس رابسن کے مشہور سانگ

The sun shines bright on old kentucky home

کا ایل پی بھی تھا۔ انہوں نے ہمیں وہ نغمہ سنوایا بھی، رابسن کی بھاری آواز میں ایک سحر تھا حیدری صاحب نے بھی خوب گایا۔ حیدری صاحب سے ہم نے پوچھا سر، اردو میں آپ کے پسندیدہ گلوکار کون کون سے ہیں؟ فرید نے نورجہاں کا نام لیا بولے ہاں ٹھیک ہے لیکن آواز دے کہاں ہے" کے دور کی۔ انہوں نے سہگل، کانن بالا، خورشید وغیرہ چند پرانی آوازوں کا ذکر بھی کیا تھا۔ وہ نام میرے ذہن سے اتر گئے ہیں۔ میں نے لتا اور رفیع کے بارے میں پوچھا تو فرمایا یہ بھی ٹھیک ہیں۔ فلمی چیزوں کو چھوڑ کر موسیقی میں ہماری دلچسپی دیکھ کر کہا۔ عمر خیام کو کبھی سنا ہے؟ ظاہر ہے کہ ہمارا جواب نفی میں تھا

تو انہوں نے اپنے گرنڈنگ ریکارڈ پلیئر پر ایک ایل پی لگایا۔ جب آواز آئی تو ہم حیران ہوئے بہت بھاری آواز تھی۔ فرمایا یہ ایک جرمن موسیقار ہے۔ عمر خیام کی رباعیوں کے فٹز جیرالڈ کے ترجمے کو گا رہا ہے۔ پہلی لائن تھی۔ Ah! the moon of delight

ایل پی کے کیس پر عمر خیام کی ایک رباعی کو مصور کیا ہوا تھا۔ (ایک دوشیزہ ایک بوڑھے میخوار کو جام پلا رہی تھی) ہم دیر تک اس میوزک اور شاعری سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اسی محفل میں انہوں نے کورٹ سین میں ہماری آوازوں کو ریکارڈ کیا برسبیل تذکرہ یہ بھی بتایا کہ ۱۹۵۹ میں انہوں نے Invisible Duke کی پوری فلم بنائی تھی (ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے چند اولڈ بوائز کو یہ فلم پنڈی میں دکھائی بھی تھی)

حیدری صاحب اور ہاشمی صاحب کے سکھائے ہوئے نغمے میں نے ملک میں اور بیرون ملک ۱۹۶۴ کی ایتھنز کی گیارویں عالمی جمبوری کے موقع پر اور دوسرے ملکوں میں کالج اور پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے گائے اور بے پناہ داد پائی۔

—— بریگیڈئر مقصود الحسن

بڑے سے بڑے سفر کی ابتدا پہلے قدم سے ہوتی ہے۔ اور اگر پہلا قدم حوصلہ سے اٹھ جائے اور صحیح سمت میں اٹھ جائے تو منزل تک پہنچنا آسان ہی نہیں یقینی بھی ہو جاتا ہے۔ یوں پڑھنا تو میں نے نارمل طریقے سے چار پانچ برس کی عمر ہی میں شروع کر دیا تھا لیکن اصل میں میرے تعلیمی، تربیتی اور تیاداتی سفر کا پہلا قدم وہ تھا جو ۱۹۵۷ء میں، میں نے حیدری صاحب کی کلاس میں اٹھایا۔ یہ کلاس ششم سی کالج کی آخری پانچویں کلاس تھی۔ اس کے فارم ماسٹر مسٹر حیدری تھے اور وہی ہمیں انگریزی بھی پڑھاتے تھے۔ ۱۹۵۷ء میں یہ کلاس مین اکیڈیمک بلاک کے بائیں سے پہلے کمرہ میں ہوتی تھی جس کے ساتھ ہی سٹاف روم تھا۔ انگریزی کے کل نو پیریڈ تھے۔ ہر روز پہلا پیریڈ اس کے علاوہ ہفتہ میں تین دن ایک ایک پیریڈ اور ہوتا تھا جو متعین نہ تھا۔ کسی دن تیسرا ہوتا تو کسی دن چوتھا یا پانچواں۔ اس وجہ سے اس دوسرے پیریڈ کے بارے میں کبھی کبھی کنفیوژن ہو جاتا تھا۔ ایک دن انگریزی کا یہ دوسرا پیریڈ تھا کہ کسی نے پیچھے سے پوچھا کہ یہ مسٹر حمید کا پیریڈ ہے؟ میں اگلی رو میں دروازے کے قریب بیٹھا تھا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

No this is not Mr. Hamid's period.
This is Mr. Hydri's period.

ہیں جس وقت جواب دے رہا تھا ٹھیک اسی وقت مسٹر حیدری سٹاف روم سے نکل کر اسی دروازے سے کلاس روم میں داخل ہوئے اور انہوں نے یہ جملہ سن لیا۔ وہ شروع دن سے کہہ رہے تھے کہ آپ انگریزی بولا کریں۔ لیکن اس وقت تک کوئی ازخود کلاس میں انگریزی بولتا نہ تھا۔ میرا پہلا فی البدیہہ جملہ سن کر حیدری صاحب بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اپنی فصیح و بلیغ انگریزی میں بڑی داد دی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ طریقہ ہے انگریزی بولنا سیکھنے کا وغیرہ وغیرہ۔ انکی حوصلہ فزائی سے میرے اندر خود آگہی اور خوداعتمادی کی پہلی کرن پھوٹی۔ اس طلوع سحر میں ظاہر ہے کہ مسٹر حیدری کے طریق تعلیم کا بڑا حصہ تھا۔ ہم میں سے بیشتر یہاں آنے سے پہلے انگریزی کی محض شدبد ہی رکھتے تھے۔ انگریزی کے Accent یا Rhythm کا کوئی تصور نہ تھا۔ حیدری صاحب دوسرے تیسرے دن ایف اے سی سی (فائن آرٹس اینڈ کلچرل سنٹر) میں کلاس لے جاکر کچھ انگریزی موسیقی سے بھی تعارف کراتے۔ وہ خود پیانو بجاتے اور ہم ان کے ساتھ آواز ملاتے۔ مجھے یاد پڑتا ہے اس انگلش سانگ کا انترہ London Bridge is falling down, falling down تھا۔ پھر وہ پیانو پر صرف دھن بجاتے اور ہم ازخود کورس میں گاتے۔ یہ سلسلہ کوئی دس پندرہ منٹ چلتا اور ہم لوگ پھر کلاس میں واپس آکر معمول کا سبق شروع کر دیتے۔ حیدری صاحب ہمیں ڈائریکٹ میتھڈ سے پڑھاتے تھے اور کلاس میں زیادہ وقت انگلش Conversation یا Dialogue میں گزرتا۔ انہوں نے بہت سے Language games تیار کر رکھے تھے۔ وہ بھی کھلاتے رہتے تھے۔ Spelling Bee اور Spelling کا کرکٹ میچ اکثر کھیلا کرتے تھے۔ کھیل کھیل میں پڑھائی ہو جاتی تھی۔ اس لیے حیدری صاحب کے پیریڈ کا انتظار رہتا تھا۔ بچے بچے ہی ہوتے ہیں ایک روز کلاس میں کوئی استاد موجود نہ تھا۔ کلاس میں خاصا شور ہو رہا تھا۔ چونکہ سٹاف روم بالکل ساتھ تھا وہاں سے حیدری صاحب اٹھ کر آئے اور صرف اتنا کہا بے شک شور مچائیں لیکن انگریزی میں۔ کچھ اور بھی کہا جس کا مفہوم یہ تھا کہ اس قسم کے ہنگامہ کی میں چھٹی سی سے توقع نہیں کر سکتا۔ اس دن مجھے ایک دم ایک نیا احساس ہوا۔ کہ ہم بھی اس قابل ہیں کہ ہمارے استاد ہم سے کچھ توقعات رکھیں۔ ایک روز انہوں نے کلاس میں کہا۔ تم کیا بننا چاہتے ہو۔ تمہاری Ambition کیا ہے۔ (اس لفظ کے معنی بھی سمجھائے) انہوں

نے کہا پہلے سوچو۔ کاپی پر لکھو۔ اور پھر کھڑے ہو کر باری باری اپنی امنگ اور آرزو بتاؤ۔
کسی نے کچھ بتایا کسی نے کچھ میں نے ذرا زیادہ اونچی زقند لگائی کلاس میں قہقہہ پڑا۔ یہ منہ اور
مسور کی دال۔ لیکن حیدری صاحب نے میری پیٹھ تھپتھپائی۔ کہا "ٹھیک ہے اتنے اونچے
خواب دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ بس پرواز کے لیے بازو ٹھیک کر و بڑے کام بڑی
Ambitions ہی سے ممکن ہوتے ہیں" یہ ان کی دوسری براہ راست حوصلہ افزائی
تھی جس کی میری زندگی میں میری بڑی اہمیت رہی ہے۔ استاد کا کام صرف سبق پڑھانا ہی نہیں
ذوق پرواز دینا بھی ہے۔ حیدری صاحب کی ذات سے کیڈٹس کی کئی نسلوں کا جو
Cultural exposure ہوا اس کی قدر و قیمت کا پورا اندازہ لگانا مشکل ہے۔
ملحوظ رہے کہ ہم میں سے بیشتر ایک بہت محدود کلچرل ماحول سے آئے تھے۔ ہماری ایک خاص طرح
کی کلچرل Growth حیدری صاحب کے ہاتھوں ہوئی جس میں سوشل گریسز
Social graces کی تربیت بھی شامل تھی۔ آج قومی زندگی کے مختلف میدانوں
اور شعبوں میں ملٹری کالج کے طلباء جو اہم اور قابل فخر خدمات انجام دے رہے ہیں، اس کا
کریڈٹ بڑی حد تک اس دور کے استاد خاص طور پر سے مسٹر حیدری اور ان کی قبیل کے دوسرے
ممتاز اساتذہ کو جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ چراغوں کی یہ قطار ٹوٹنے نہ پائے۔

—— ڈاکٹر مقصود الحسن نوری[1]

حیدری صاحب کی دوسری خصوصیتوں کے پرکشش رنگ و آہنگ میں ان کی شخصیت
کا ایک اور اہم پہلو کچھ دب سا گیا ہے۔ میرا مطلب کردار سازی کے پہلو سے ہے۔ ان کی ذاتی
قدریں کیا تھیں۔ ملٹری کالج میں کیڈٹس کی تعلیم و تربیت سے متعلق ان کا Concept
کیا تھا۔ اس ادارہ کے ساتھ اور ملک کے ساتھ ان کے Commitment کی نوعیت کیا تھی۔
ان سوالوں کا جواب میں ان کی ایڈیٹری کے حوالے سے دینا چاہوں گا۔ یوں تو وہ شروع سے
کالج کے میگزین سے متعلق رہے لیکن ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۹ء تک وہ کالج کے میگزین کے انگریزی
سیکشن کے ایڈیٹر رہے۔ اسی عرصہ میں وہ کالج کے سپیچ رائٹر بھی تھے۔ ان سالانہ تقریروں میں

[1] پی ایچ ڈی کالج نمبر سی زمانہ تعلیم ۱۹۶۰ تا ۱۹۶۴ء

انھوں نے بار بار ایجوکیشن کے سماجی اور خاص طور سے ملکی (Patriotic) عنصر کو ابھارا
طلباء کی کرداری تربیت کے لیے ۶۳-۱۹۶۲ء کے "تربیت" میں ان کا مضمون The Rightway
بہت اہمیت رکھتا ہے۔ صفحہ ۵۱ سے صفحہ ۶۵ تک میگزین کے پندرہ صفحوں پر پھیلا ہوا یہ مضمون
طلباء کی تہذیبی تربیت کا سرچشمہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیدری صاحب تہذیبی تربیت
کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔ کیڈٹس کو انھوں نے بہت لیکچر دیئے ہوں گے لیکن افسوس ہے کہ ان کا
کوئی ویڈیو ٹیپ ریکارڈ موجود نہیں۔ لیکن ہماری خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسی تحریر ضرور موجود ہے
جس سے واشگاف الفاظ میں ظاہر ہوتا ہے کہ ملٹری کالج کے طلباء سے وہ کیا چاہتے تھے۔ اور خود
ان کی تعلیمی سوچ کا رُخ کیا تھا۔ میرا اشارہ ۶۱-۱۹۶۰ء کے تربیت میں ان کے بہت ہی خیال انگیز
اداریئے سے ہے جو ملٹری کالج کے طلباء کے لیے ایک منشور کی حیثیت رکھتا ہے۔

EDITORIAL

Another decade has slipped away and two more generations of Alamgirians have passed out of the gay precincts of their boyhood world. Some have left inspiring footprints behind; many have managed to pull their weight as best as they could; other-just gone with the wind. Another five years, and the present generation will have faded away from the familiar landscape.

How many among this lot will have proved themselves worth sons of their Alma-Mater, and how many will be no more than just another list of names in the College register? How many will be able to look over their

past years with pride and satisfaction, and how many will carry life-long regret for squandering their energies in frivolous pursuits or loitering on in the track of drowsy habit ? How many will have reaped the rich harvest of honest labour, and how many will step out just to rough it out, or to be lost in the crowd ? How many go forth bearing in mind the golden motto over the College gate: 'GO OUT TO SERVE YOUR COUNTRY AND YOUR FELLOW-MEN', and how many will remain shut up within their own light measuring up life in terms of what they can grab from it for their own selfish ends ?

These are the questions which must engage the serious attention of each one of those who are, at this moment, busy in the noble task of shaping their future here; for, whatever their future be, it is, in a great measure, going to be modified, for good or evil, by their choice of the alternatives offered in these questions. The option rests with them whether to take the line of least resistance, the easy way of the cowards to end in failure and disappointment, or to face the challenge of an adventurous journey to life's ever-widening vistas and distant horizons,

with confidence, courage and perseverance.

We believe there is not a single boy here, howsoever callous about his responsibilities, who has not, at some time or other, dreamed of wonderful achievements. But dreaming alone does not carry us beyond the threshold of fantasy. Continuous effort, by an unflaggering determination and sanctified by an implicit faith in the Divine help, is the only alchemy which can transmute one's fondest dreams into golden realities.

Let us hope that every Alamgirian of the present generation has full realisation of this truth and that he will spare no pains to derive the utmost benefit of his stay in the College, which is today one of the few institutions in the country, where all this is desirable for a sound education, is at his disposal. He must not forget that among thousands of students in Pakistan who are denied the privilege of belonging to public schools, he is in the lucky minority who have definite advantage over the rest of the student community in Pakistan.

It would be sadly ridiculous indeed, if being so privileged, he failed to justify his admission to the Military College.

Let him not forget that whatever he makes of himself here, will have a double significance. It will not only affect his own future, but it will also determine the future tone and character of the institution to which he belongs. He is, therefore, responsible for his conduct both to himself and to the College. If he does anything wrong, that wrong will not only defile his own heart, but will leave a stain on the fair name of his Alma Mater. If he desires to belong to a place of which he may be justly proud, if he wishes to hear this College spoken of as one that bears a high name, as a place where knowledge and truth, and a high standard of moral, mental and physical fitness are held in honour, as a place where all that is mean and base is hated and despised then it is up to him to give it that name.

It is a great privilege to be entrusted with such an important responsibility. But every privilege demands not only constant care to prove oneself truly worthy of it, but also a good deal of self denial, willingly giving away of something to achieve something far greater than selfish ends.

We do not expect that every one will

be a Shakespeare or an Einstein or a Hercules. All cannot become distinguished as geniuses. Thus there is one thing which is within the reach of all the greatest thing on earth the only thing by which God will judge us and that is goodness. One's memory may be weak and one's intellect dull and one may find he cannot keep pace with others around him, but there is this one thing in which none need feel inferior to the others. All cannot be scholars or scientists or atheletes, but all can be honest and straightforward, all can be diligent and punctual, all can be patient and forgiving - and these are the highest virtues which can be found in a man.

In this issue of the Tarbiat, we earnestly call upon every Alamgirian to think upon these reflections and ask himself, how far his attitude and conduct is in harmony with his own aspirations and the training, he is receiving here, to grow up as a potential leader, and possibly, play an important role, one day, as an architect of this young state - Pakistan.

Wishing our young readers all success, we hail the new decade to which this number of the Tarbiat is dedicated.

——— میجر محمد خالد سعید[1]

حیدری صاحب کے بارے میں اپنے بھائی اقبال فرید سے جو قصے میں لے سنے تھے، ان کی بنا پر میرے ذہن میں ان کی تصویر ایک بہت بڑے ارسٹوکریٹ کی تھی لیکن جب ان سے واسطہ پڑا تو دیکھا کہ ان کی ارسٹوکریسی پڑھانے اور ڈرامے تک محدود ہے۔ کلاس فور سے بڑی ٹھیٹھ پنجابی میں باتیں کرتے اور اس زمانے کے عوامی سگریٹ سے شوق فرماتے۔ اکثر سگریٹ پیتے ہوئے آتے لیکن کلاس میں داخل ہونے سے پہلے ادھ پیا سگریٹ بہت احتیاط سے بجھا کر سگریٹ کی ڈبی ہی میں رکھ لیتے۔ اگر یہ احتیاط تنگ دستی کی وجہ سے تھی تو ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ اتنا بڑا استاد کوئی معمولی برانڈ کے سگریٹوں میں بھی کفایت شعاری کرنی پڑتی تھی۔ اگر سگریٹ ہی اس عظیم فنکار استاد کا شوق تھا تو ہمیں ——— دنیا کے قیمتی ترین سگریٹ اس کے قدموں میں لا ڈالنے چاہئیں تھے۔

——— میجر ساجد مجید بھٹی[2]

حیدری صاحب کی میری پہلی یاد اکتوبر ۱۹۶۸ء کی ری یونین کے ترانے کی ہے۔

رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو

یہ لہو سرخی ہے آزادی کے افسانہ کی

یہ شفق رنگ لہو - - - - - - -

اس ترانے میں ممتاز چنگیزی اور جاوید اسلم طاہر بھی تھے۔ حیدری صاحب نے اس کا ریہرسل پیانو پر کرایا تھا۔ شوکت نے انگریزی ڈرامہ Dear Departed میں بھی حصہ لیا تھا۔ یہی اردو ڈرامہ جوتشی میں تھا۔ لیکن حیدری صاحب کی جو اصل بات مجھے یاد ہے وہ اور ہے۔ ایک بار انہوں نے بتایا کہ جب میں ایک کورس کے سلسلہ میں انگلینڈ گیا تو میں نے آتے جاتے اور وہاں ہوتے خواہ مختصر ہی سہی۔ زیادہ سے زیادہ ائرلائنوں میں سفر کیا۔ ہر ائرلائن ایک انفرادیت رکھتی تھی۔ اس طرح نئی جگہوں ہی کو نہیں نئے لوگوں اور ان کے کلچر کو دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ دنیا بھی عجب میلا ہے۔ جہاں جاؤ کچھ باتیں مشترک ملتی ہیں اور کچھ مختلف پھر بتایا کہ U.N.O. کی ایک سٹڈی کے مطابق نسلوں کے درمیان اتنے اختلافات نہیں پائے جاتے جتنے ایک نسل کے اندر دیکھے

---

[1] کالج نمبر ۲۷۷۲ زمانہ تعلیم ۲۰-۱۹۶۴ء [2] کالج نمبر ۲۹۰۱ زمانہ تعلیم

گئے۔ Travel is a great education بشرطیکہ آنکھیں کھلی ہوں۔

——— میجر جاوید اقبال ملک تمغۂ بسالت[1]

حیدری صاحب کا پیریڈ تھا۔ وہ اندر آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا سوٹ کیس نما بکس تھا۔ لڑکوں کو تجسس ہوا کہ اس میں کیا ہے جب انہوں نے کھولا تو وہ گرنڈنگ کا ٹیپ ریکارڈر نکلا۔ اس روز انگریزی نظم Sands of Dee پڑھنا تھی۔ انہوں نے ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا اور کہا آپ لوگ اپنے طور پر اس نظم کا ایک ایک بند پڑھیں۔ جب ہم پڑھ چکے تو انھوں نے اس کا ری پلے ہمیں سنوایا۔ پھر انھوں نے خود نظم کی سٹوری سمجھا کر اسے ڈرامائی انداز سے Recite کیا۔ My God ! We were spell-bound آٹھویں میں ان سے انگریزی پڑھتے ہوئے چند ماہ تو ضرور ہو گئے تھے۔ لیکن ہم ان کی Recitation کی جادوگری سے واقف نہ تھے۔ انہوں نے یوں پڑھا بلکہ پیش کیا کہ نظم کی ڈرامائی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی نظم کے الفاظ جاگ اٹھے اور نظم کا Palthos دل میں اتر گیا۔ پھر انہوں نے ہم سے بھی Recite کرایا۔ اپنی آواز سے آواز ملا کر پڑھوایا اور پھر دوبارہ ریکارڈ کیا۔ اور سنوایا ۶۷-۱۹۶۶ء میں کالج کے سالانہ کنسرٹ کے ایک ڈرامہ Invisible Duke کے لیے ہم فائن آرٹس اینڈ کلچرل سنٹر میں جمع ہوئے پہلے روز تو ڈرامہ کی بیک گراؤنڈ پلاٹ اور کردار سمجھاتے رہے۔ دوسرے روز انھوں نے پہلے سین کے سارے کردار خود کر کے دکھائے اس فن میں ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ ہیرو، ہیروئن، ولین ملازم غرض جو کردار کیا اس میں جان ڈال دی۔ پھر انھوں نے ہم میں سے ہر ایک کو اس کا کردار ادا کرنا سکھایا۔ یہ گھنٹوں کا کام تھا۔ جو وہ ہر روز پورے انہماک سے سرانجام دیتے تھے۔ یہ بات شاید زیادہ لوگوں کو معلوم نہ ہو کہ وہ انگریزی پلے کا بھی پلاٹ بتا کر اور کردار Discuss کر کے کہتے کہ اب اپنے اپنے کردار پنجابی میں اپنے طور پر کرو۔ اس طرح کھیل کھیل میں نہ صرف پلاٹ ذہن نشین ہو جاتا بلکہ ہم کرداروں کے اندر بھی اتر جاتے۔

---

[1] کالج نمبر ۲۹۲۹ زمانہ تعلیم ۷۰-۱۹۶۵ء ہیڈ بوائے اورنگ زیب ہاؤس ۷۰-۱۹۶۹ء

وہ ڈرامہ کے ایکٹر، پرامپٹر، پروڈیوسر، ڈائریکٹر، پیانو نواز، طبلچی، ماہر ملبوسات اور میک اپ مین — غرض سب ہی کچھ تھے۔

۴۳-۱۹۴۲ میں انہوں نے میرے والد کو انگریزی پڑھائی تھی۔ ۶۷-۱۹۶۶ میں، میں نے ان سے انگریزی پڑھی۔ زمانہ اور عمر کے اس فرق کے باوجود ان سے گفتگو کرتے ہوئے یا کوئی مشورہ کرتے ہوئے کسی Generation gap کا احساس نہ ہوا۔ یہ بھی ان کی شخصیت کا ایک پہلو تھا۔

—— میجر وجاہت حسین[1]

مسٹر حیدری رشتے میں میرے ماموں تھے۔ پہلے دن ہی انہوں نے مجھے جتا دیا "بیٹے اس رشتہ کی بیساکھی کا سہارا نہ لینا۔ اس سے تمہیں نقصان ہی ہوگا اور فائدہ شاید بالکل ہی نہ ہو اس لیے کہ رعایت مجھے کرنی نہیں۔ اگر تم نے ذرا اشارہ دیا کہ میں تمہارا ماموں ہوں تو لوگوں کی توقعات تم سے بہت زیادہ بڑھ جائیں گی۔ کم رہے تو تمہاری اور میری دونوں کی بدنامی ہوگی۔ اگر کچھ کیا تو وہ میرے کھاتے میں ڈالا جائے گا۔ اس کا کریڈٹ تمہیں کوئی نہ دے گا اس لیے بہتر ہے کہ یہاں تم رشتہ کو بھول ہی جاؤ۔ اپنے زور سے اپنی جگہ پیدا کرو۔ اس سے تمہارے اندر خود اعتمادی بھی بڑھے گی اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی عادت بھی پڑے گی۔"

جو کچھ انہوں نے کہا تھا وہ سختی سے اس پر کاربند رہے۔ ان کی Sophistication کی بہت شہرت ہے۔ لیکن گھر میں خصوصاً وہ اپنی والدہ کے سامنے ٹھیٹھ پنجابی ہوتے تھے۔ گھر کے رہنے سہنے میں نفاست تو تھی لیکن تکلف نہ تھا۔ کھانے میں کدو کا رائتہ شوق سے کھاتے تھے۔

ان کی ریٹائرمنٹ سے کچھ عرصہ پہلے موتی ہال میں یوم دفاع کا فنکشن تھا، میں مشہور نغمہ

اے نگارِ وطن تو سلامت رہے

گا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ یہ نغمہ سن کر ان کی آنکھیں نم ہو گئی ہیں۔ یہ کوئی بیس سال پرانی بات ہے۔ آج یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو ان کا وہ نم آلود چہرہ آنکھوں میں پھر رہا ہے اور کانوں میں وہی آواز آ رہی ہے۔

اے نگارِ وطن تو سلامت رہے

---

[1] زمانہ تعلیم ۷۳-۱۹۶۸ء

ــــــــــ میجر شاہد وہاب[1]

یکم جنوری کو حیدری صاحب کو بڑے شاندار طریقے سے الوداع کیا گیا۔ ان کی جیپ کو کیو ایم سٹورز کے سامنے سے پرانے آفیسرز میس سے کالج گیٹ تک۔ لڑکے خود کھینچ کر لے گئے۔ اور تمام راستے ان پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں۔ انہوں نے تیس برس تک کالج میں کلچر اور آرٹ کے پھول کھلائے تھے ان پر جتنے بھی پھول نچھاور کیے جاتے کم تھے۔

ــــــــــ میجر عبد الرشید۔ اے۔ ای۔ سی[2]

حیدری صاحب ہمہ تن آرٹ تھے۔ صورت سیرت، آواز، انداز، تحریر، تقریر، تمثیل ہر عنوان سے لاجواب۔ مارچ ۱۹۵۹ء میں کالج میں گیا تو چند ہفتے کے بعد میس میں ایک بڑا ڈائن آؤٹ تھا۔ اس میں حیدری صاحب سے کچھ سنانے کی فرمائش ہوئی تو انہوں نے ہارمونیم پر دو چیزیں سنائیں:

باغوں میں پڑے جھولے ساجن تم بھول گئے ہم کو ہم تم کو نہیں بھولے

اور حفیظ کی یہ غزل:

مستوں پر انگلیاں نہ اٹھاؤ بہار میں۔ دیکھو تو ہوش بھی ہے کسی ہوشیار میں

اور سماں باندھ دیا۔ اسی محفل میں اعجاز اکبر صاحب نے ہیر کے چند ٹکڑے سنائے تھے۔

دو پتر اناراں دے۔۔۔۔

سنا کر محفل کو لوٹ لیا تھا۔

ــــــــــ پروفیسر سعید راشد[3]

مسٹر حیدری کی ٹیچنگ ڈگری بمبئی یونیورسٹی کی تھی وہ بمبئی کے ایک پارسی پبلک سکول میں استاد رہے تھے۔ ان کی انگریزی کا لب و لہجہ، میوزک اور ڈرامہ سے دلچسپی اور لائف سٹائل کا سارا Sophistication اسی پس منظر کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ میں جب اگست ۱۹۵۰ء میں کالج میں آیا تو اس کے چند ہفتے بعد ہی حیدری صاحب نے نومبر ۱۹۵۰ء کے سلور جوبلی کنسرٹ کی تیاری شروع کر دی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس سلسلہ میں انہوں نے

---

[1] کالج نمبر زمانہ تعلیم ۶۳ - ۱۹۶۶ء [2] استاد ملٹری کالج ۶۱ - ۵۹ اور ۸۹ - ۱۹۶۷ء
[3] استاد، ۱۹۵۰ء تا ۱۹۸۸ء

مجھے ان سے تعاون کرنے کا موقع دیا۔ سلور جوبلی کنسرٹ سارے کا سارا انہی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ انگریزی کا ڈرامہ Invisible Duke نواں کا ڈائریکٹ اور پروڈیوس کیا ہوا تھا، ہی اردو کا طنزیہ ڈرامہ "کامران" بھی انہی نے لکھا اور پیش کیا تھا میں نواں کا نوآموز اسسٹنٹ ہی تھا۔ حیدری صاحب کا نام انگلش ڈرامہ کے ساتھ ہی اس طرح لازم وملزوم ہوا ہے (اور غلط نہیں ہوا) وہ بے شبہ انٹرنیشنل سطح کے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر تھے۔ نگران کے کمال اور Talent کا ایک اور دائرہ بھی تھا میرا مطلب ساز وآواز سے ہے وہ ہارمونیم وائلن اور پیانو کے علاوہ دلربا فنکارانہ مہارت سے بجاتے تھے۔ گلے میں سُر تھا۔ اردو انگریزی دونوں میں آواز کا جادو جگاتے تھے۔ حفیظ کی غزل "مستوں پر انگلیاں نہ اٹھاؤ بہار میں" اس طرح وجد میں آکر گاتے تھے کہ محفل پر ایک سحر ساطاری ہو جاتا تھا۔ انگریزی کی کلاسیکل موسیقی میں موزارٹ کے نغمے (Symphonies) اور گلبرٹ اینڈ سلیوان (Guilbert & Sullvan) کے اوپیراز (Operas) کا خاص ذوق رکھتے تھے۔

بحیثیت انگریزی کے شاعر اور موسیقار کے حیدری صاحب کا پہلا کارنامہ کالج سانگ تھا جو انہوں نے ۱۹۴۹ء میں فائن آرٹس اینڈ کلچرل سنٹر کے افتتاح کے فوراً بعد لکھا اور ۱۹۴۹ء کے سالانہ کنسرٹ کے موقع پر پہلی بار پیش کیا گیا۔

COLLEGE SONG

Boyhood days are best,
Carefree, gay and blest;
Cramm'd with a wealth of sweet mem'ries;

Wild, prank and fun,
Goodly fights fought and won;

Records proud that show
Deeds of derring-do
And Learning's torch ever burning

Proudly we sing,
Borne on devotion's wing;

There's just a name that we stand up for stoutly;
There's just a name that we sing merrily;
Aye, just a name that we honour devoutly;

'Tis the name of KGR PMC our own PMC
We'll hail the College name for ever,
Hold its banner high above;
Bonds of friendship naught can sever;
Staunch and true we'll be in our love.

And when we are out in the world's field of battle
Face to face with the grim reality,
O, then one name shall stand out 'bove the rattle;

'Tis the name of K.G.R. PMC our own PMC
Grateful thoughts will ever invade us
Of the souls who served us well,
Who with worthy things array'd us,
Taught us how in good ways to dwell.

And at the end of the journey, aweary,
With a serene faith in God, verily,
We'll breathe a name that is welcome and cherry;

'Tis the name of K.G.R. PMC our own PMC

یہ سانگ انہوں نے اپنے پسندیدہ نغمہ Isle of Capri کی دھن پر کمپوز کیا تھا۔ اس سانگ سے کالج کا تشخص ابھرا اور لڑکوں کو اپنی Alma Mater میں وہ Pride محسوس ہونا شروع ہوئی جو اس سے پہلے اگر مفقود نہیں تو Difused ضرور تھی۔ اسی سال انہوں نے کالج کے حوالے سے ایک ملی ترانہ Sons of Pakistan بھی لکھا۔

SONS OF PAKISTAN

If you want to know who we are
We are sons of Pakistan

In times of peace or war
You'll find us marching on
Undaunted unrestrained
Our spirits always unchained
And honour e'er unstained
All for one and one for all
Do we stand up to the last
Always up on Duty's call
Never shrinking; never lost
Our pride's to live and die
To see our flag e'er high
And freedom far and nigh
We are sons of Pakistan;
Zinda bad our Pakistan.

اس ترانے میں جو ولولہ انگیز Patriotic Sentiment ہے جو امنگ جو Pride جو Idealism اور خدمت کا جو عزم اور

تن من دھن تجھ پر قربان پیارے پاکستان

کی جو فضا ہے اس "بانگ درا" کی اس شیروں کی کچھار کو خاص طور سے اس وقت جبکہ پاکستان نیا نیا عالم وجود میں آیا تھا کتنی ضرورت تھی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حیدری صاحب نے Nationalistic orientation کا یہ بہت ہی اہم فریضہ بھی بروقت انجام دیا۔

نومبر ۱۹۵۰ء میں کالج کی سلور جوبلی کے موقع پر جو تاریخی کنسرٹ حیدری صاحب نے پیش کیا اس میں حیدری صاحب کا لکھا ہوا اور کمپوز کیا ہوا سلور جوبلی سانگ بھی شامل تھا۔

SILVER JUBILEE SONG

Let cheers ring out and joyful songs be heard;
Peal happy bells and ring the cares away;
Let fun and frolic reign; the merry word
And banter light declare their genial sway.

CHORUS

Hurrah for the K.G.C;
Hurrah for her proudest day;
With voice both loud and free;
And hearts all happy and gay,
Let young and old be all
In tune and perfect glee,
And the rafters ring, the while we sing
Of our Silver Jubilee
For five and twenty years astriving ever,
Advancing day by day, through weal and woe
Full five and twenty years of high endeavour
Sing of this record proud with hearts aglow;

(CHORUS)

Long may the K.G.C. in work and prayer,
Mould youthful eager lives to purpose high;
Long may Almighty's guiding hand be there
To point the way, and shield, when harm is nigh;

(CHORUS)

Sing, sing glad songs with unabated glee,
Give up this day to jest and romping mirth;
Sing of the K.G.C. - her jubilee;
The K.G.C. the proudest College on earth;

اس سلور جوبلی سانگ میں اس ادارہ کے قطرہ سے گوہر ہونے کی داستان بھی ہے۔ اس کے ماضی پر فخر اور بہتر مستقبل تعمیر کرنے کا عزم بھی ہے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۵۰ء کی شب جب سلور جوبلی کنسرٹ کے اختتام پر یہ سانگ کورس کی شکل میں پیش کیا گیا تھا اس وقت میں سٹیج کے گوشہ میں کھڑا سن رہا تھا۔ میں وہ لمحہ نہیں بھول سکتا جب اس سانگ کے آخری مصرعہ:

The K.G.C. the Proudest College on earth.

سب اولڈ بوائز جوش مسرت سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور از خود کالج سانگ کا یہ ٹکڑا

There's just a name that one stand up for stoutly
There's just a name that we sing merrily
Aye, just a name that we honour devoutly
'Tis the name of KGRPMC

اپنی اپنی نشستوں پر کھڑے کورس کی شکل میں بے اختیار گانے لگے۔ آواز ملے نہ ملے۔ جذبہ ملا ہوا تھا۔ ادارہ کی محبت بھی کیا چیز ہے! (چونکہ ادارہ بھی مربی ہوتا ہے۔ شخصیت بناتا ہے۔ ذات کو آب و رنگ دیتا ہے)

اکتوبر ۱۹۵۵ء میں کالج کی کمان سنبھالنے کے بعد کرنل رفیق نے جو اور بہت سے دوررس اہمیت کے تعلیمی و تربیتی اقدامات کیے ان میں سے ایک اقدام یہ بھی تھا کہ بردوڈ ہاؤس حال محمود غزنوی ہاؤس کو بھی سکین ہاؤس کی طرح جونیئر ہاؤس بنا دیا گیا تو حیدری صاحب اس کے ہاؤس ماسٹر مقرر ہوئے۔ حیدری صاحب نے بردوڈ ہاؤس کی سٹیج سرگرمیوں میں جہاں چار چاند لگائے وہاں اس کا ترانہ بھی لکھا۔

SONGS OF THE "BIRDIES"

Birdies don't tell a lie;
Birdies are never sly –
    Birdies are brave boys;
    Birdies are great boys;

Upward and onward;
Always straightforward –
    Birdies are brave boys;
    Birdies are great boys;

Full of dash, and daring,
Proud of their bearing;
    Foremost to lead –
    Pioneers indeed;

Three cheers for the pioneers
    Hip, hip, hip, hurrah;
    Hip, hip, hip, hurrah;
    Hurrah for the pioneers;

– F.H. HYDRI

۲۳ر مارچ ۱۹۵۶ء کو ملک میں نیا آئین نافذ ہوا اور اس کے اسلامی جمہوریہ پاکستان ہونے کا اعلان ہوا۔ اس تاریخی یوم جمہوریہ کو کالج کے کمانڈانٹ کرنل رفیق نے ایک جشن کے طور پر منایا۔ کالج کے ماہانہ گزٹ نیوز اینڈ ویوز نے آئین نمبر نکالا۔ موتی ہال میں جو بڑی تقریب ہوئی اس میں حیدری صاحب نے یوم جمہوریہ پر اپنی انگریزی نظم خود Recite کی۔

Hail; Republic Day;
Let cheers ringout and joyous sings be heard

Peal happy bellsand sing cares away,
Let fun and frolic rang the merry word
And banter light declare the general sway
Hurrah for Pakistan
Hurrah for her proudest day;
With voice both loud and free
And hearts all happy and gay
Let young and old to all
In tune in every way
And the rafter ring the while we sing
Our Republic Day
Sing Sing glad songs of blissful liberty
Give up this day to jest and romping worth
Sing of This gracious gift from God
This Pakistan, the proudest land on earth

کالج سانگ جو ۱۹۴۹ء میں لکھا گیا تھا اس وقت آئینی طور پر پاکستان ایک Dominion تھا اس لیے اس کا نام کنگ جارج رائل پاکستان ملٹری کالج تھا۔ اور سانگ کے انترہ میں یہ نام یوں آیا تھا۔

'Tis the name of KGRPMC'

۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کے یوم جمہوریہ کے موقع پر حیدری صاحب نے جو کالج سانگ پلش کیا اس میں انترہ یوں بدلا۔

'Tis the name of our own PMC'

پھر یہی Version چلتا رہا۔

۱۹۶۰ء میں حیدری صاحب اورنگ زیب ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر مقرر ہوئے۔ اس کا ماٹو انھوں نے Excelsior چنا اور اورنگ زیب ہاؤس کے لیے یہ ترانہ لکھا۔

SONG OF THE AURANGZEB HOUSE

BY

F.H. HYDRI

(Set to the tune of G. Verdi's "Donna e Mobile")

Ding-dong for the brave boys;
Sing a song for the great boys –
Truthful and straight boys,
The Aurangzeb boys;

Upward and onward;
Firm and straightforward;
"Excel;" their watchword,
Hail, Aurangzeb boys;
Full of dash and daring;
Proud of their bearing;
And e'er God-fearing;
Foremost to lead;
Pioneers, indeed;
Cheers for the Aurangzeb boys;
Hip, hip, hip, hurrah;
Hip, hip, hip, hurrah;
Hurrah; Aurangzeb boys;

گو حیدری صاحب ٹیپو سلطان ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر کبھی نہیں رہے لیکن انہوں نے ٹیپو سلطان ہاؤس کی فرمائش پر ٹیپو ہاؤس کا ترانہ بھی لکھا جس میں ۱۹۵۰ء کے لکھے ہوئے ترانے Sons of Pakistan کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

SONG OF THE TIPU SULTAN HOUSE
BY
F. H. HYDRI

(Set to the tune of "Gentlemen of Japan" in the Mikado by Gilbert and Sullivan)

If you want to know who we are;
We're the House of Tipu Sultan
Brave boys with hearts of gold
And true sons of Pakistan.

Right-thinking, rightly train'd
Free souls, yet self restrain'd;
Our Honour e'er unstain'd.

All for one and one for all
Do we stand upto the last;
Always up on Duty's call
Never flinching, never lost.

Our aims's to grow all round;
In mind and body sound;
In strength of Faith abound

We're the House of Tipu Sultan;
Worthy sons of Pakistan

اگست ۱۹۶۷ء میں حیدری صاحب نے شیر شاہ ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ آٹھویں درجہ کے نئے داخل ہونے والے طلبہ کے لیے پریپ سکول کے طور پر یہ ہاؤس انہی کے ایما پر قائم کیا گیا تھا۔ یہ گویا ان کا اپنا بے بی ہاؤس تھا۔ انہوں نے جو ترانہ لکھا وہ تو شاہکار ہونا ہی تھا۔ لفظ شیر (Sher) کے ابتدائی حروف پر ہاؤس کی چار ڈار میٹریوں کے نام سپارکس (Sparks)، ہیرالڈز (Heralds) ایگلس (Eagles) اور ریڈیئنٹس (Radiants) رکھے گئے تھے۔ یہ بھی حیدری صاحب ہی کی اختراع تھی۔ ان کا دیا ہوا ہاؤس کا ماٹو I can I will بھی فلسفہ تعلیم میں ان کی نظر کی گواہی بھی دیتا ہے۔ شیر شاہ ہاؤس نے کالج میں جو تاریخی کردار ادا کیا اور سال بہ سال جو Sword of Honour winners پروان چڑھائے وہ بھی ان ہی کا فیضان تھا۔

SONGS OF THE SHER SHAH HOUSE

BY

MR. F. H. HYDRI

(Set to the music of 'London Bridge')

We are the boys of Sher Shah House;
Sher Shah House;
Sher Shah House;
We are the boys of Sher Shah House;
Great House; Great boys;
Full of spunk and full of SPARK -
Great House; Great boys;

HERALDS of a brave new world -
Great House; Great boys;

Soaring high like EAGLES all
Great House; Great boys;

Cheerful, bright and RADIANT all
Great House; Great boys;

SHER SHAH, SAYYAD and IQBAL
Are our guiding angles all;
HERALDS, RADIANTS, EAGLES, SPARKS
Great House; Great boys;
Rule of our life's : I CAN .... I WILL
Golden rule - I can ... I will
Think aright
Speak aright
Do the right and do it well;
Great House; Great boys;

یہ ترانہ کالج میں ان کی تخلیقی اور فنکارانہ کاوشوں کا آخری ثمر تھا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ایک دوسرے حیدری کے لیے پتہ نہیں کالج کو کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔

حوالدار کرم داد پی ٹی انسٹرکٹر

_____ لیفٹیننٹ کرنل احمد خان ستارۂ جرأت

پنجاب کے مثالی گبرو جوان چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، چوڑا سینہ اکہرا بدن، بڑی بڑی مونچھیں کرم داد اپنے ٹریڈ کے بھی ماہر تھے۔ بہترین پی ٹی انسٹرکٹر، ہارس ورک اتنا اچھا تھا کہ جواب نہیں۔ سنیئر لڑکے ذرا لبرٹی لے لیتے تو یہ بندہ خدا کہتا "چھوڑوں گا نہیں لگواؤں گا پانچ میل چکر اور جاؤں گا ساتھ" اور واقعی حوالدار کرم داد ہمارے ساتھ ڈبل کرتا آتا تھا۔ بڑے بڑے بھول

گئے لیکن کرم داد کی یاد دل سے نہیں جاتی۔ پبلک سکول کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ چھوٹا بڑا جو جہاں ہو بھاری پتھر ہو۔ سکول میں سٹرپل آدمیوں کی بھی کمی نہیں تھی لیکن کرم داد کی تاج بگلر کی طرح بات ہی اور تھی۔

حوالدار محمد عنایت

—————— بریگیڈیر محمد اسلم جنجوعہ ستارۂ جرأت

ایف ایف آر کے حوالدار میجر محمد عنایت پی ٹی انسٹرکٹر اپنے کام میں ماہر تھے۔ جونیئر لڑکوں کے ڈیل سکواڈ پر بہت محنت کرتے تھے۔ بارس اور بارز کی اکسرسائز کرنے میں خود بھی ماہر تھے۔ اونچا قد، چھریرا بدن ان کی شاندار مونچھیں ان کی پہچان تھیں۔ ان کی ایک اور خصوصیت ان کی مہمان نوازی تھی۔ اتوار کو جو لوگ اپنے بچوں سے ملنے ملاتے تھے وہ بے تکلف ان کے کوارٹر پر ایک گلاس شربت ایک وقت کے کھانے کے لیے جا سکتے تھے۔ آنے والے ان سے کوئی نہ کوئی رشتہ ڈھونڈ ہی لیتے تھے۔ انہوں نے مہمانوں کو کبھی بار نہ سمجھا۔ رزق کو کون اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ جو وہ لے جاتے عنایت نہ رہے ان کی کرم نوازیوں کی یاد باقی ہے۔

بھرتو مہتر

—————— لیفٹیننٹ کرنل رشید کیانی ستارۂ جرأت

سکول کے مہتر پوربیے تھے اپنے کام کے بڑے پکے۔ ان کے ہیڈ مہتر کا نام بھرتو تھا۔ یہ بھی بڑا زوردار بندہ تھا۔ اگر کوئی وقت کے بعد ڈے لیٹر ینز کو کبھی استعمال کرتا تو اپنی پوربی زبان میں بھرتو، نکلیو، نکلیو کا شور ڈالتا۔ وہ اللہ کا بندہ اتنی زور سے چیختا کہ جو اندر ہوتا وہ سہم جاتا۔ کبھی کبھی تو اس کے حکم سے پین نیچے سے کھینچ لیا جاتا۔ اس غریب کا مسئلہ یہ تھا کہ اسے بھی صبح ایک مقررہ وقت تک سب ٹھیک کی رپورٹ دینی ہوتی تھی۔ جہاں ہر کام وقت پر مشینی طریقے سے ہوتا ہو اور اس کی چیکنگ اور کاؤنٹر چیکنگ کا نہایت ہی موثر نظام ہو، وہاں کوئی پرزہ بھی ڈھیلا نہیں رہ سکتا۔ بھرتو مہتر کی فرض شناسی اکثر یاد آتی ہے۔

مسز کمار

——لیفٹیننٹ کرنل محمد فرید ملک[۱]

۱۹۴۴ء میں سکیسن ہاؤس میں سی ایس ایم تھا۔ میرے کمرہ سے ملحق کوارٹر میں ہمارے ہاؤس ماسٹر اور انگریزی کے استاد مسٹر کمار اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے۔ ویسے تو سٹاف کوارٹرز سختی سے آؤٹ آف باؤنڈز تھے لیکن اپنے عہدہ کی وجہ سے مسٹر کمار سے اکثر آن ڈیوٹی اور آف ڈیوٹی واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ ایک روز اتوار کی صبح کو میں نے ان کے دروازہ پر دستک دی تو بجائے باہر آنے کے اندر ہی سے انہوں نے آواز دی "کم ان ۹۰۱" ان دنوں نمبر ہی چلتے تھے۔ دروازے کے پٹ کھلے تو دیکھا کہ قمیض اور دھوتی میں مسٹر کمار ناشتہ کر رہے ہیں اور مسز کمار ساتھ بیٹھی پرچے دیکھ رہی ہیں۔ میں بظاہر باتیں تو کمار صاحب سے کر رہا تھا لیکن چونکہ ان پرچوں میں میرا پرچہ بھی تھا اس لیے میری کچھ توجہ مسز کمار کی طرف بھی تھی۔ ایک پرچہ دیکھتے دیکھتے انہوں نے کہا۔ کمار تیسرا سوال تم نے بہت مشکل دیا ہے اس کو کسی نے Attempt نہیں کیا اور جس نے کیا ہے غلط کیا ہے۔ میرے ذہن میں فوراً اس خیال کی لہر آئی کہ اچھا تو یہ اتنی قابل ہیں کہ ہمارے استاد کو مشورہ دے سکیں۔ جب میں مسٹر کمار سے بات کر کے اپنے کمرہ میں آیا تو میں یہ سوچ رہا تھا اچھا تو بچے پالنے، کھانا پکانے اور کپڑے دھونے کے علاوہ بیوی کا ایک رول یہ بھی ہے کہ وہ اپنے میاں کے کام میں اس کا ہاتھ بٹائے۔

ایک روز اور مجھے اسی طرح ان کے ڈرائینگ روم میں جانا پڑ گیا۔ سامنے کچن کا دروازہ کھلا تھا۔ اس کے ایک پٹ پر ہفتہ بھر کا مینو لکھا تھا۔ نیچے ایک خانے میں مہمانوں کے خصوصی مینو کا ذکر بھی تھا۔ یہ تعلیم کے کرشمے ہیں آج تک وہ مینو کارڈ نہیں بھول سکا ہوں۔

اس دور میں مسز سٹیبنگ، مسز لیوس، مسز ہولڈین، مسز کمار اور مسز انوپ سنگھ کے بالواسطہ کنٹری بیوشن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جب میں نے سنا کہ ہولڈین کی مدراسی بیوی پرچے سیٹ کرتی ہے۔ جب میں نے خود مسز کمار کو پرچے مارک کرتے دیکھا تو بیوی کے رول کی ایک نئی امیج میرے ذہن میں آئی۔

---

[۱] زمانہ تعلیم ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۶ء

کیپٹن جائلز

———— لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال

کیپٹن جائلز (Jiles) کالج کے پہلے ٹی او ٹریننگ آفیسر تھے۔ ۱۹۴۵ء میں جب رابرٹس ہاؤس میں تھا تو چھٹی سیکشن کے دوسرے دروازے کے بالکل متصل میرا لاکر اور بیڈ تھا۔ ہفتے میں کم از کم دو بار رات کے پچھلے پہر وقت بدل بدل کے کیپٹن جائلز ہاؤس کو چیک کرتے تھے۔ اس زمانے میں شدید ترین سردی میں بھی دروازوں اور کھڑکیوں کا کم از کم ایک پٹ کھلا رکھنے کا حکم تھا۔ کبھی کبھی جب غیر معمولی سردی ہوتی تو عموماً ۱۲ بجے کے بعد کوئی کبھی اس خیال سے دروازے بند کر دیتا کہ اب کیا کسی کو آنا ہے تو کرنل سٹیبنگ نہیں تو ٹی او کیپٹن جائلز آن دھمکتے۔ اگر دروازہ بند ہوتا تو دستی چھڑی سے دروازے کے شیشوں پر ٹھک ٹھک کر کے کھٹکھٹاتے۔ چونکہ میرا بیڈ دروازے کے بالکل متصل تھا۔ اس لیے اکثر اٹھ کے کھولنا پڑتا۔ دروازہ بند رکھنے کی کم از کم سزا ایک ای ڈی تھی۔ کیپٹن جائلز کی فرض شناسی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی چیکنگ وقت بدل بدل کے رات کے مختلف اوقات میں کرتے۔ اور یہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی دن یا رات کا کوئی پہر ہو وہ Immaculately Dressed بے داغ لباس میں ہوتے۔ یوں جیسے وہ اپنی شادی میں جا رہے ہوں۔

میرا خیال ہے کہ میری طرح بے شمار کیڈٹس نے کیپٹن جائلز کی فرض شناسی اور نفاست پسندی سے شعوری اور لاشعوری طور پر بہت گہرا اثر قبول کیا ہو گا۔ جس طرح قلب سے خون نکل کر رگوں میں دوڑتا ہے اور توانائی بخشتا ہے۔ اسی طرح ایک صحیح استاد اور معلم کے ولولہ انگیز (Inspiring) کردار کا اثر طالب علم کی زندگی کے رگ و ریشہ میں دوڑتا ہے اور زندگی کے سفر میں توانائی بخشتا ہے۔ برسوں سے میری مسلسل دعا یہی ہے کہ خدا پاکستان کو اچھے معلم عطا کرے۔

کیپٹن جائلز کا یہ تاثر ۱۹۴۵ء کا تھا۔ ٹھیک ۴۲ سال بعد ۱۹۸۷ء میں انگلستان میں جائلز سے پھر ملاقات ہوئی۔ ملٹری کالج کے شب و روز انہیں یاد آتے تھے۔ کالج کے پرانے فوٹوگرافس کا ایک البم کالج میوزیم کے لیے مجھے دیا۔ میں نے کالج کی تاریخ اور ڈائمنڈ جوبلی کی شیلڈ پیش کی تو بہت خوش اور متشکر ہوئے اور خواہش ظاہر کی کہ انہیں ہر سال کالج میگزین بھیجا جائے

تو وہ ممنون ہوں گے۔ وہ میرے انگلستان سے جانے سے پہلے خود پاکستان آکر کالج کو وزٹ کرنا چاہتے تھے۔

احمد صاحب

———— صوبیدار فتح خان

جنگ کا زمانہ تھا۔ ٹروپس کا دل بہلاوا کرنے کے لیے دل خوش سبھا نام کی ایک پارٹی مختلف یونٹوں کا دورہ کرتی رہتی تھی۔ اواخر ۴۴ میں یہ ٹروپ ملٹری کالج بھی آیا۔ کمانڈانٹ کے دفتر کے پیچھے جو میدان ہے وہاں سٹیج بنا۔ بڑی دھوم دھام سے شو شروع ہوا۔ غالباً اس خیال سے کہ یہ یونٹ نہیں کالج ہے۔ پردہ اٹھتے ہی پہلے تو پرانے تھیٹر کے انداز کی کورس میں حمد ہوئی۔

اے داتا تو جگ داتا۔۔۔ر

پھر ایک گہرے پکے رنگ کی ایک لڑکی شلوار قمیض میں ملبوس گلے میں دوپٹہ ڈالے سامنے آئی اور اس نے نعت شروع کی۔ اے یثرب کے والی۔۔۔۔ احمد صاحب جو نئے نئے کالج میں آئے تھے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا۔

"بی بی آپ نعت پڑھ رہی ہیں پہلے سر پر دوپٹہ ڈالیے۔" سب نے بشمول کمانڈانٹ پیچھے مڑ کے دیکھا کہ یہ کون ہے۔ ان کے ٹوکنے پر مغنیہ نعت پڑھتے پڑھتے رکی، سر کو دوپٹے سے اچھی طرح ڈھانپا اس کے بعد نعت دوبارہ شروع کی۔ دوسرے تیسرے دن احمد صاحب کی چھٹی ہو گئی لیکن دلوں میں زندہ ہیں۔

وی۔ ٹی صاحب

———— بریگیڈیر اکرم ظفر

وہ وی ٹی صاحب کے نام سے اس طرح مشہور تھے کہ شروع میں ہمارا خیال تھا شاید ان کا نام ہی وی ٹی صاحب ہے۔ بعد میں معلوم ہوا۔ وی۔ ٹی۔ ورناکیولر ٹیچر کا مخفف ہے۔ وہ رومن اردو کے ماہر تھے اردو کو انگریزی رسم الخط میں لکھنا اور پڑھنا ان ہی نے سکھایا۔ وہ دونوں زبان کی خصوصیات سے واقف تھے۔

میجر نواز ۹۰۷ نے مجھے بتایا کہ ان کا اصل نام عبدالرحیم تھا بڑے زندہ دل انسان تھے۔ خوشگوار

موڈ میں ہوتے تو لطائف سے ہمیں محظوظ کرتے ۔ کبھی کبھی اپنی زندگی کے حقیقی یا افسانوی واقعات بھی سناتے ۔ ایک روز کہنے لگے کہ شاعر جو شعر کہتا ہے، اس کی کوئی نہ کوئی واقعاتی بنیاد ضرور ہوتی ہے۔ ایک شعر ہے : ؎

اب نہ کر پردہ، تجھے اے پردہ نشیں دیکھ لیا
ہم نے در پردہ تجھے اے ماہ جبیں دیکھ لیا

پتہ ہے یہ شعر کب کہا گیا؟ کلاس نے بیک آواز کہا "نو سر" تو فرمایا ہوا یہ کہ شاعر انار کلی بازار میں اس انار کلی کے تصور میں غرق کھڑا تھا جس کی یاد میں انار کلی بازار ہے کہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک مست شباب انار کلی نقاب اٹھائے خراماں خراماں چلی آ رہی ہے ۔ شاعر بیتابانہ اسے دیکھنے لگا کہ یہ حقیقت ہے یا خواب ۔۔۔۔ بہر حال یہ خواب نہ تھا۔ جب وہ غیرت صد ماہتاب شاعر کے پاس سے گزرنے لگی تو اس نے شاعر کی بیتاب نگاہوں کی تاب نہ لا کر منہ پر نقاب ڈال لیا تو شاعر نے فی البدیہہ کہا۔

اب نہ کر پردہ، تجھے اے پردہ نشیں دیکھ لیا
ہم نے در پردہ تجھے اے ماہ جبیں دیکھ لیا

یہ سن کر ایک شوخ لڑکے نے پوچھ لیا، سر گستاخی معاف، کیا وہ شاعر آپ ہی تو نہ تھے، فرمایا، "کاش میں ہوتا"

اس پر کلاس میں زبردست قہقہہ پڑا۔ اصل میں انہیں افسانہ طرازی کا شوق تھا۔ بلکہ یہ فن آتا بھی تھا۔

ایک ادارہ میں جہاں سٹیبنگ جیسے منتظم اور مسٹر حیدری جیسے فنکار معلم کی ضرورت ہوتی ہے وہاں وی ٹی صاحب ایسے اپنے مضمون کے ماہر استاد اور دلچسپ انسان کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ شخصیتوں، مزاجوں اور صلاحیتوں کی رنگا رنگی پبلک سکول قسم کے ادارہ کو بہت راس آتی ہے۔ چونکہ مقصد طلبا کو گوناگوں تجربات سے گزارنا (Expose) کرنا ہوتا ہے۔

صوبیدار عبدالغنی کوارٹر ماسٹر

—— لیفٹیننٹ کرنل محمد اکرم

کوارٹر ماسٹر سٹورز کے انچارج تھے۔ ۱۹۴۴ء میں آئے۔ جس طرح پرانے زمانے کی کہانیوں

میں شہزادہ کی جان طوطے میں ، اور طوطا پنجرہ میں اور پنجرہ باغ میں ہوتا تھا۔ اس طرح غنی صاحب کی جان سٹورز میں تھی ہر روز صبح سے شام تک سٹورز میں گھسے رہتے تھے۔ کبھی انہیں باہر دھوپ میں تو کیا برآمدہ میں بھی نہیں دیکھا۔ ایک ایک کپڑے پر ان کی نظر رہتی تھی جس طرح اس میں جان ہو۔ بڑی مشکل سے نیا کپڑا دیتے تھے۔ اس وقت تو ہمیں وہ بہت کنجوس نظر آتے تھے اور سچی بات یہ ہے کہ کبھی کبھی ان پر بڑا غصہ آتا تھا کہ ان کا کیا جاتا ہے۔ نئی چیزیں کیوں نہیں دیتے۔ جب میں نے خود پہلے پہل بٹالین کو کمان کیا تو غنی صاحب بہت یاد آئے۔ خاص طور پر ان کا احساس ذمہ داری اور اپنے کام سے لگن۔ غنی صاحب داڑھی کو خضاب لگاتے تھے اور اس زمانے کے دوسرے سرداروں کی طرح نماز کے پابند تھے۔ بہت کم گو تھے ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ غنی صاحب پتھر کے ہیں ان کی رقیق القلبی کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ اکبر، امان اللہ اور محمد خان کی کٹ جمع کر رہے تھے اور رو رہے تھے۔ اور سٹور اردلی کالے خان سے کہتے جاتے تھے یہ جو کٹ دیتے ہیں لیتے جاؤ کم زیادہ کی فکر مت کرو۔ غنی صاحب کب کے مٹی ہو گئے لیکن ان کی باتیں زندہ ہیں۔

—— لیفٹیننٹ جنرل محمد صفدر[1]

ملٹری کالج میں میرے زمانہ تعلیم کی ایک خوشگوار یاد صوبیدار عبدالغنی صاحب کی بھی ہے، کوارٹر ماسٹر سٹورز کے انچارج تھے۔ اور سٹورز کی ہر چیز خصوصاً کٹ کے کپڑوں کے بارے میں جو لڑکوں کو ایشو ہوتے تھے، وہ بے حد Possessive تھے۔ جس طرح پرانی کہانیوں میں خزانے پر سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہوتا ہے۔ کٹ کے حوالے سے ان کی یہ حالت تھی۔ اس وقت ہم ان کی اس عادت سے بہت تنگ تھے۔ لیکن اب تقریباً بتالیس برس کے بعد میں ان کے رویے کو اس کے اصل Perspective میں دیکھ سکتا ہوں۔ وہ صحیح معنوں میں "امین" تھے اور ان کا رویہ "امانت داری" کا تھا۔

ایسے لوگ جو اپنے کام کو اتنے Commitment کے ساتھ کرتے ہوں خواہ ان کا رینک کچھ بھی ہو۔ کسی ادارہ کے لیے بلکہ قوم کے لیے بہت اہم اور بہت ضروری ہوتے ہیں۔

---

[1] کالج نمبر ۱۵۲۷، کمانڈانٹ نیشنل ڈیفینس کالج راولپنڈی، زمانہ تعلیم ۱۹۴۶ تا ۱۹۵۰ء

بائبل کی زبان میں They are the salt of the earth.
وہ اس وقت بھی بوڑھے ہو رہے تھے۔ اب تک تو مٹی میں مل چکے ہوں گے۔ بہر حال میں ان کی یاد کو سلام کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ پاکستان کو ہر جگہ ایسے امین ملتے رہیں جو اپنی امانتوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھیں۔

مسٹر شہاب الدین

——لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال

یہ واقعہ اپریل ۱۹۴۵ء کا ہے۔ ہمیں چھٹی جماعت میں پروموٹ ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے۔ جہاں تک مجھے خیال پڑتا ہے کہ جنرل نالج کا پیریڈ تھا۔ اور ہمارے ریگیولر استاد مسٹر کمار کسی وجہ سے چھٹی پر تھے۔ ان کی جگہ مسٹر شہاب الدین آئے۔ بورڈ پر مضمون کی جگہ "جی کے" لکھا دیکھا تو کہا۔ چلو آج "جی کے" ہی کی بات کرتے ہیں۔ پوچھا آج کل کون سا موسم ہے؟ ہم نے جواب دیا سر، سپرنگ بہار کا۔ ان کا دوسرا سوال تھا سپرنگ میں کیا ہوتا ہے؟ ایک نہیں کئی لڑکے ایک ساتھ بول پڑے سر موسم بہار میں بہار آتی ہے۔ پھول کھلتے ہیں ہماری کلاس VI A اس زمانہ کے سنٹرل ہال (موجودہ میوزیم) کے پہلو میں تھی۔ وہاں سے فلیگ وار میموریل (موجودہ یادگار شہداء) کا چمن زار صاف نظر آتا تھا۔ انہوں نے کہا ذرا باہر دیکھو۔ دیکھو بہار پر کیا بہار ہے۔ چلو باہر چل کر دیکھتے ہیں یہ کہا ہاں ایک ایک کاپی پنسل لیتے چلو۔ وار میموریل کے آس پاس کا پورا علاقہ گل و گلزار بنا ہوا تھا۔ گویا رنگ برنگ کے پھولوں کا دریا لہریں مار رہا تھا۔ ہم لوگ بھاگ کر باہر آ گئے۔ انہوں نے کہا میں تم لوگوں کو دس منٹ دیتا ہوں اس عرصے میں تم پھولوں کے نام انگریزی میں نوٹ کرو۔ میں بھی کوشش کرتا ہوں دس منٹ کے بعد انہوں نے اشارہ دیا اور سب لڑکے بھاگ کر پھر کلاس میں آ گئے۔ انہوں نے کہا۔ مجھے خود سب پھولوں کے نام نہیں آتے۔ بہر حال میں نے تو ۱۹ قسموں کے نام نوٹ کیے ہیں۔ تم بتاؤ جس نے ۱۶ کیے ہیں وہ آگے آ جائے۔ جب کوئی نہ آیا تو انہوں نے کہا اچھا پندرہ والا آگے آئے۔ ۱۱ پر دو لڑکے، ۹ پر غالباً تین، ۷ پر چار اور ۵ پر دس لڑکے اٹھے انہوں نے فرمایا چلو پھر باہر چلتے ہیں۔ اب کے تمہارے پندرہ منٹ ہیں۔ اس بار انہوں نے خود بھی کئی پھولوں کا تعارف کرایا۔ اور ان کے نام نوٹ کروائے۔ سامنے ہیڈ مالی کام کر رہا تھا اس

سے کہا۔ باباجی آپ ان بچوں کو بیج سے بہار تک پھولوں کی زندگی کے سفر کے بارے میں بتائیں۔ مختصر یہ کہ وہ گھنٹہ ختم ہونے سے کم ازکم اٹھارہ پھولوں کے نام اور رنگ نوٹ کروا چکے تھے جن میں سے بیشتر مجھے آج بھی یاد ہیں۔ پھولوں سے ایک لائف لانگ تعلق اسی دن سے شروع ہوا۔ ہاں یاد آیا پھولوں کا البم بنانے کی سجیشن بھی انہی نے دی تھی۔ اچھا استاد ملنا زندگی کی کتنی بڑی خوش نصیبی ہے۔

کالا خان سٹور اردلی

——— میجر عبدالجبار[1]

کوارٹر ماسٹر سٹورز کے اردلی کالے خاں کی چستی کٹ کنڈمنیشن کے وقت دیکھنے میں آتی تھی۔ جب وہ بڑی پھرتی سے کپڑوں پر مہریں لگاتے تھے اور قابل استعمال کپڑوں کو بڑی احتیاط سے الگ رکھتے جاتے تھے۔ پھر اس سے زیادہ احتیاط سے پرانے نمبر مٹا کر نئے لگاتے تھے۔ یہ انتظامیہ کے بہت چھوٹے پرزے تھے لیکن ان کی دیانت کی کوئی قیمت نہیں لگائی جا سکتی تھی۔

کالے خاں کے بیٹے پیدا خاں (شہید) نے کالج میں باکسنگ کے میدان میں بڑا نام پیدا کیا اور بعد کو آرمی اور نیشنل لیول کی باکسنگ تک پہنچے۔

مسٹر محفوظ اور مسٹر مدن لال

——— ائر چیف مارشل ذوالفقار علی خان[2]

نومبر ۱۹۴۳ء میں آکنلک ہاؤس کے افتتاح کے وقت کمانڈر انچیف انڈیا آکنلک کے اعزاز میں جو خصوصی پریڈ کالج میں ہوئی تھی اور جن شاندار الفاظ میں آکنلک نے پریڈ کے معیار کی تعریف کی تھی اس کی گونج اگست ۱۹۴۴ء میں کالج میں میرے داخلہ کے وقت بھی سنائی دے رہی تھی کہ کالج کے لیے فخر کی بات اس کی پریڈ تھی۔ پریڈ پر بلا تھ اس امر کا اشارہ تھا۔ کالج کی ترجیحات کیا ہیں انگریز کے مخصوص سامراجی مفادات اور دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں پریڈ اور ریجی منٹیشن پر اتنا زور قابل فہم ہے۔ اکیڈیمک سپرٹ نہیں تھی۔ غالباً اس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی لیکن خاموشی سے تبدیلی کی ہوا (Wind of change) چلنے لگی تھی۔ سکول کو کالج کا درجہ دینا

---

[1] کالج نمبر ۱۰۱، ارمادہ تعلیم ۴۳ء تا ۱۹۴۸ء سے کالج نمبر ۱۳۱، ائر چیف مارشل زمانہ ۴۴-۱۹۴۸ء

بھی اس بات کا اشارہ تھا۔ حکومت کو (خواہ کسی بھی مصلحت سے) اس ادارہ کی ترقی مقصود ہے۔ ۴۵-۱۹۴۴ء سے کچھ لڑکوں نے اپنے طور پر پنجاب یونیورسٹی کے میٹرک اور ایف ایس سی کے لیے تیاری شروع کر دی تھی۔ ایف ایس سی کو پڑھانے کا کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ لیکن چند سویلین انسٹرکٹرز خاص طور سے مسٹر مدن لال اور مسٹر محفوظ حسین کی تعریف کروں گا کہ انھوں نے چار پانچ لڑکوں کو سہ پہر کو اپنے آرام کے وقت میں ڈیوٹی کی وجہ سے نہیں اپنے شوق کی وجہ سے پڑھایا۔ میرے کالج کے زمانہ کی سب سے زیادہ خوشگوار یاد مسٹر مدن لال اور مسٹر محفوظ کی ہے جنہوں نے تعلیم سے لگن اور طالب علموں سے ہمدردی کا لازوال نقش میرے دل پر چھوڑا ہے۔ استاد کی شخصیت اس کے علم سے بھی زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ شاگرد استاد کے علم سے آگے بڑھ سکتا ہے اور اکثر بڑھ جاتا ہے لیکن اس کی شخصیت کا حوالہ کبھی پرانا نہیں ہوتا۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۸۷ء تک میں کن کن منزلوں سے نہ گزرا ہوں گا۔ کیسے کیسے عالم فاضل لوگوں سے واسطہ نہ پڑا ہو گا لیکن مسٹر مدن لال اور مسٹر محفوظ کا Devotion آج بھی میرے لیے Inspiration کا باعث ہے۔ مجھے کچھ لکھنے لکھانے اور بولنے کا شوق بھی تھا۔ اس سلسلہ میں میری حوصلہ افزائی کیپٹن مینن اور کیپٹن ابراہیم نے بھی کی۔ میں ان کا بھی ممنون ہوں۔ ۱۹۴۳ء میں ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسٹر مدن لال اور مسٹر محفوظ وغیرہ کے آنے کا یہی بالواسطہ اثر تھا کہ کالج میں زیادہ نہیں تو کچھ لڑکوں کا رجحان لائبریری میں جانے کا ہو گیا تھا۔ خود میں نے آرمی سپیشل پاس کرتے ہارڈی، ڈیوماز، ڈکنس کے ایک دو ناول پڑھ ڈالے تھے۔ مجھے یاد ہے جو پہلا ناول میں نے پڑھا وہ A tale of two cities اور David Copperfied، Count of Montecress to Treasure Island بھی اسی زمانے میں نظر سے گزرے تھے۔ وہ چند لڑکے جو میرے ساتھ لائبریری آتے جاتے تھے، وہ ۹۲۴ ہیڈ بوائے اکرم، ۹۶۵ (بریگیڈیئر) اکبر اور ۱۲۲۳ (بریگیڈیئر) اکرم ظفر تھے۔ مطالعہ کے شوق کا کوئی بدل نہیں ہے۔

سارجنٹ شا

——— سید شہزادہ عالم

مسٹر شا استاد تو انگریزی کے تھے لیکن شوقیہ آرٹسٹ بھی تھے۔ انہوں نے ۱۹۴۶ء میں سنٹرل ہال (اب میوزیم) کے باہر کے برآمدہ میں آرٹ کی نمائش کروائی تھی جس میں ان کی اپنی ڈرائنگیں اور تصویریں بھی تھیں۔

لڑکوں میں ۱۲۰۵ شریف (بریگیڈیر ریٹائرڈ) کو بیس روپے کا پہلا اور مجھے ۱۰ روپے کا دوسرا انعام ملا تھا۔ ان کی ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ انگریزی کے شاعر بھی تھے۔ کبھی کبھی اپنی نظمیں بھی سنایا کرتے تھے۔

وارنٹ آفیسر ڈینس شا

——— مسٹر عترت حسنین

آصف: آپ چراغوں کی قطار میں کس کس کو جگہ دے رہے ہیں؟

عترت: پہلا نام تو مسٹر حیدری کا ہے ان کے بارے میں اپنے تاثرات ریکارڈ کرا چکا ہوں۔

آصف: دوسرا نام یا دوسرا چراغ؟

عترت: میرے لیے دوسرا نام وارنٹ آفیسر ڈینس شا (Dennis Shaw) کا ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں جو پڑھے لکھے برٹش وارنٹ آفیسرز جبری لام بندی کے سلسلہ میں کالج میں آئے تھے مسٹر شا ان میں سے ایک تھے۔

آصف: مسٹر شا کیوں؟

عترت: برٹش اور رینکس مسٹر کہلاتے تھے۔ مسٹر ڈینس شا نے ہمیں پوئٹری پڑھائی اور پوئٹری نثر کی طرح نہیں پوئٹری کی طرح پڑھائی تھی۔

آصف: کیا مطلب؟

عترت: مطلب یہ کہ پوئٹری میں جو Emotion تھا وہ زندہ کر دیا۔ اور جو Theme تھی اسے دل میں اتار دیا۔

آصف: براہ کرم اس بات کی وضاحت کسی مثال سے کیجئے۔

عترت: مثال یہ کہ ایف ایس کی پوئٹری کی آ آپ Bridges of song میں سکاٹش شاعر الفریڈ نوئس (Alfred Noyes) کی ایک نظم The High way Man تھی۔ یہ رہزن ٹھگ کی طرح کے ایک Highway man راہزن کی داستان ہے جو امیروں کو لوٹتا اور غریبوں کو نوازتا تھا۔ مسٹر شا نے پہلے تو ہمیں سکاٹ لینڈ کی تھوڑی سی ہسٹری بتائی میری آف سکاٹ لینڈ کا ذکر بھی آیا۔ پھر انگلینڈ کے بادشاہوں سے جو ٹکراؤ ہوتا رہا اس کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ بادشاہ وقت کے اقتدار کو چیلنج کرنا عوامی امنگوں کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ایسا ہی ایک ہائی وے مین یا راہزن تھا۔ جو ایک گاؤں کی سرائے کے مالک کی لڑکی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔

آصف: وہاں زلف گرہ گیر ہوتی ہے؟

عترت: (قہقہہ لگا کر) اس زمانے میں ہوتی تھی۔ اس مٹیار کا نام Bess تھا۔ وہ اس سے ملنے کبھی کبھی چاندنی راتوں کو آتا تھا۔ Bess اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر سرائے کے مہمان خانہ کے جھروکے میں آجاتی تھی۔ ایک بار جب پونم کا زرد چاند بادلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ ہائی وے مین آیا۔

The wind was a torrent of darkness among the
gusty trees,

The moon was a ghostly galleon tossed upon
cloudy seas,

The road was a ribbon of moonlight over the
purple moor,

And the high way man came riding

Riding - riding

The highway man came riding up to old inn-door.

اس عاشق جاں باز کی آمد کا نقشہ شاعر نے ان الفاظ میں کھینچا ہے،

Over the cobbles he clattered and clashed in the
dark inn yard

And he tapped with his whip on the shutters,

But all was locked and barred

He whistled a tune to the window, and who should be

Waiting there, but the land lords', black-eyed daughter,

Bees, the land lords' daughter,

Plaiting a dark red love knot into her long black hair.

"ہائے وے یلن" کو اپنی جان جاناں کی جھلک کیا نظر آئی کہ دل کی بپتا بیاں زبان پر آگئیں۔

One kiss my bonny sweet heart, I'm after a prize to night,

But I shall be back with the yellow gold before the morning light,

Then look for me by moon light,

Watch for me by moon light,

I'll come to thee by moonlight, though

Hell should bar the way

One kiss, my bonny sweet-heart, I'm

After a prize tonight,

یہ سن کر بلیس جھروکے میں آکھڑی ہوئی تھی:

He rose up right in the stirrups; he scarce

Could reach her hand

But she loosened her hair, in the casement;

His face burnt like a brand

As the black cascade of perfume

Came tumbling over his breast

And he kissed its waves in the moon light
(Oh, sweet black waves in the moon light)
Then he tugged at his rein in the
Moon light and galloped away to the west

مسٹر شا کے پڑھانے کا کمال یہ تھا کہ جب پوئم میں The highway man came riding, riding کی لائن آتی تو وہ روسٹرم پر انگوٹھے اور درمیانی انگلی سے گھوڑے کی ٹراٹ کی آواز پیدا کرتے تھے۔ اور گھوڑے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ان کا ساؤنڈ Effect کم یا زیادہ ہوتا تھا۔ اور ہم یہ محسوس کرنے لگتے تھے کہ Highway man is coming
مسٹر شا نے جس طرح Bess کی زلفوں کو گرانے اور ہائی وے مین کے گھوڑے سے اچھل کر انہیں Kiss کرنے کا منظر پیش کیا وہ منظر مجھے آج تک نہیں بھولتا۔ استاد ایک فنکار بھی ہوتا ہے۔ جب تک وہ خود ڈوب کر اداکاری نہ کرے کلاس پر پورا اثر نہیں ہوتا۔ مسٹر شا خود Highlander تھا۔ جو وہ پڑھا رہا تھا۔ وہ اس کے دل کی آواز تھی۔

آصف : پھر ہائی وے مین کا کیا ہوا؟

عترت : وہ آیا ضرور آیا لیکن اس کا اپنا Word رکھنا ہی اس کے لیے پیغام اجل بن گیا۔

آصف : وہ کیسے؟

عترت : سرکاری گماشتوں نے Bess کے گھر والوں اور خود Bess کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ ایک پولیس مین اس کے سینے پر ایک مسکٹ رکھ کر کھڑا ہو گیا کہ اگر کوئی آواز نکالی تو گولی سینے کے پار ہو جائے گی۔ گماشتے Bess کے گھر کے گرد گھیرا ڈال کے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ آج Highway man بچ کے نہیں جا سکتا۔ وہ خوشی سے مست ہو کر جام پہ جام لنڈھانے لگے۔ جب چاند رات ڈھلنے لگی
Highway man came riding riding, riding
سب چوکنے ہو گئے۔ جب (Trot) ٹراٹ کی آواز بہت قریب آ گئی تو Bess نے

سخت جدوجہد کرکے اپنا ایک ہاتھ چھڑا لیا اور خود ہی مسکٹ کا ٹریگر دبا دیا گولی اس کے سینے کے پار ہو گئی اور ہائی وے مین سمجھ گیا کہ اس کے لیے گھات لگائی گئی ہے۔ اس نے لگام موڑی اور ہوا ہو گیا۔ جب وہ دور نکل گیا کسی نے اسے بتایا کہ تم نوجوان بچا کے بھلگے جا رہے ہو تمہاری Bess تمہارے لیے جان دے چکی ہے۔ یہ سن کر اس نے گھوڑے کی لگام پھر موڑی اور Bess کے گھر آکر Bess کے قاتلوں سے مردانہ وار لڑتا ہوا مارا گیا۔

——پوئٹری زبان سیکھنے سکھانے کے لیے نہیں پڑھی پڑھائی جاتی۔ یہ احساسات (Emotions) کو جگاتی اور دل کو زیر وزبر کرتی ہے۔ یہ مسٹر شا کے پڑھانے کا کمال تھا کہ آج چالیس بیالیس سال کے بعد بھی میں اس نظم کو لفظ بہ لفظ دہرا سکتا ہوں جس طرح شا نے پڑھایا اس کی تصویر کھینچ سکتا ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ نظم کی Theme محبت، وفا اور جرأت میری روح میں اتر گئی ہے۔ آج میں دنیا کی ہر Bess کی عزت کرتا ہوں۔ وفا اور جرأت میری اپنی زندگی کی Values بن گئی ہیں۔ اور یہ جوت جگانے کا کریڈٹ مسٹر ڈینس شا کو جاتا ہے۔ خدا کرے ملٹری کالج کو اور سارے پاکستان کو ایسے استاد ملتے رہیں۔

شمسی برادران

——بریگیڈیر محمد اکرم ظفر

۱۹۲۵ء سے کالج خالص مسلم ادارہ چلا آرہا تھا۔ سوائے انگریز کمانڈانٹ اور دو ایک انگریز وارنٹ آفیسرز کے سارے طلبار اور سٹاف کے اراکین مسلمان فوجی تھے۔ ۱۹۴۲ء میں کالج میں تین اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مسلمان فوجی سٹاف کے لام پر چلے جانے سے جو خلا پیدا ہوا اسے پُر کرنے کے لیے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ سویلین اساتذہ کالج میں آئے ان میں سے دو ایک (مسٹر حیدری اور مسٹر این ڈی انصاری) کو چھوڑ کر بیشتر ہندو یا سکھ تھے۔ اسی سال سے یہاں غیر مسلم ہندو سکھ طلباء کا داخلہ شروع ہوا۔ اسی سال کالج کو ایک بٹالین کے طور پر منظم کیا گیا واللہ العلم یہ اتفاق تھا یا انگریزی کی سوچی سمجھی پالیسی کہ سٹاف پر بیشتر غیر مسلم اساتذہ اور انسٹرکٹرز تھے۔ اس پس منظر میں کالج میں شمسی خاندان کے ڈاکٹر محمد احمد شمسی، مسٹر سلطان حسین شمسی اور مسٹر اقبال حسین شمسی کا تھوڑے سے وقفہ سے یکے بعد دیگرے آنا مسلم طلبا کی تعلیم وتربیت کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ اس زمانے میں تحریک پاکستان

اپنے عروج پر تھی۔ اور ہندو مسلم قوم کی کشمکش نئے کالج کو بھی محسوس اور لامحسوس طریقے سے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

ڈاکٹر شمسی؛

میجر ڈاکٹر محمد احمد شمسی بہت اچھے ڈاکٹر اور دردمند انسان تھے۔ اس وجہ سے ان کی بہت عزت تھی۔ مسز سٹیبنگ نے چار چھ ماہ تک ایک خاکروب کے نوزائیدہ بچے کو جس کی ماں اس کے پیدا ہوتے ہی مرگئی تھی اپنے بنگلہ میں رکھ کر پرورش کیا تھا۔ وہ ڈاکٹر شمسی ہی کی مسلسل توجہ اور نگہداشت سے بچ سکا۔ ان کی اپنی اولاد نہ تھی۔ وہ کئی مسلمان لڑکوں کے مربّی تھے۔

مسٹر سلطان حسین شمسی

اُستادوں، استادوں میں بھی فرق ہے۔ جن استادوں کی شخصیت میں Glamour یا فنکارانہ جمال و کمال ہو وہ فوراً متاثر کرتے ہیں اور اپنے کمال فن یا قائدانہ صلاحیتوں کے حوالے سے بہت زیادہ یاد کیے جاتے ہیں۔ استادوں کی ایک دوسری قسم بھی ہے جن کے دوررس لامحسوس اثرات طلباء کے کردار پر مرتب ہوتے ہیں۔ سلطان شمسی کا شمار بنیادی طور پر اس دوسرے زمرہ میں کیا جائے گا۔ وہ ۱۹۴۴ء میں یہاں جغرافیہ کے سویلین استاد ہو کر آئے تھے۔ اور ۵۷-۱۹۵۶ء میں اے ای سی میں کمیشن لینے تک یہاں رہے۔ جغرافیہ کے ماہر استاد تھے اس مضمون کو وہ بہت تند جوش و انہماک سے پڑھاتے تھے جیسے یہ غالب یا میر کی غزل ہو۔ صرف ان کی شخصیت، قوت و کشمکش کی وجہ سے یہ مضمون ہمارے لیے دلچسپ اور آسان ہو گیا تھا۔ خود مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انھوں نے دنیا کے جغرافیہ کی کنجی میرے ہاتھ میں دے دی ہے۔ چنانچہ ایف ایس سی کے امتحان میں جغرافیہ کا مشکل پرچہ بھی مجھے بہت آسان لگا۔ تعلیم کے عمل میں کتاب سے زیادہ معلّم کی شخصیت اہمیت رکھتی ہے۔ اس قول کی صداقت کا اندازہ مجھے خاص طور سے مسٹر شمسی کے حوالے سے ہوا۔ انگریز کی تعلیم نے ہمیں فوجی، غیر قومی اور سیکیولر نصاب کے شکنجے میں کس دیا تھا۔ (واضح رہے کہ تاج برطانیہ سے وفاداری اور سلطنت برطانیہ کی برکات پر شکر گزاری کی تلقین اس نصاب کا حصہ تھی) اس پس منظر میں مسلمان طلباء کے اسلامی اور قومی تشخص کو جن چند اساتذہ نے محفوظ اور مستحکم رکھا ان میں شمسی برادران امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔

اس زمانہ میں انگریز کے تعلیمی ادارہ بلکہ فوجی تعلیمی ادارہ میں قومی مسائل پر کھل کر بات کرنے کی کوئی جرأت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ کلاس میں اور کلاس سے باہر ملکی اور غیر ملکی واقعات و حالات کے تذکروں اور تبصروں سے ہمیں اندازہ ہوتا رہتا تھا کہ ان کی سوچ کیا ہے ان حالات میں یہی بہت تھا۔

مسٹر اقبال حسین شمسی

اقبال شمسی غالباً ۱۹۴۵ء میں آئے۔ اور سال سوا سال بہت تھوڑے عرصہ رہے۔ مذہبی اور قومی جذبہ کو بالواسطہ طور پر انہوں نے بھی مضبوط کیا۔ اپنے بڑے بھائی سلطان شمسی کی طرح مضبوط شخصیت اور مضبوط خیالات کے آدمی تھے۔ ۱۹۴۶ء میں چند متعصب ہندو انسٹرکٹروں (کیپٹن نوٹیال اور کیپٹن مینن) کے آنے سے کالج میں جو خاموش لیکن گہری دو قومی کشمکش شروع ہوئی اس میں مسلمان لڑکوں کی نظریاتی رہنمائی شمسی برادران نے خاص طور سے کی۔ گو در پردہ اور بالواسطہ طور پر۔

۱۹۶۴ء میں جب میں خود بحیثیت آرمی انسٹرکٹر پی۔ایم۔اے کاکول میں پوسٹ ہوا تو ایک بار پھر سلطان شمسی صاحب سے ملاقات ہوئی بلکہ نیاز حاصل ہوا۔ اب وہ ایجوکیشن کور کی وردی میں تھے۔ میرے ساتھ اور میرے اہل و عیال کے ساتھ ان کا رویہ وہی بزرگانہ سرپرستی اور پدرانہ شفقت کا تھا۔ میری بیوی اور بچوں کو بیگم شمسی کی مادرانہ محبت آج بھی یاد آتی ہے۔

مجھے خوشگوار حیرت ہے کہ جناب سلطان شمسی کے لیے وقت کے ساتھ ساتھ میری عقیدت بڑھتی جاتی ہے وہ جب بھی ملتے ہیں (سر کے سفید بالوں نے ان کی شخصیت کو اور بھی حسین بنا دیا ہے) تو میرے دل میں احترام اور محبت کی موجیں اٹھنے لگتی ہیں۔ وہ بلاشبہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے قدموں میں "ہدیۂ دل" نثار کرنے کو جی چاہتا ہے۔

شمسی صاحب

——— لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال

طویل القامت اور چھریرے بدن کے شمسی صاحب بڑے خوش لباس تھے۔ لیکن ان کی اصل خصوصیت ان کے پڑھانے میں تھی۔ جغرافیہ بہت خشک مضمون ہے اس کو دلچسپ بنانا آسان کام نہیں لیکن وہ اس کو اتنے دلولے سے اتنا Involve ہو کر پڑھاتے تھے کہ یہ مضمون طلباء کے لیے پانی ہو گیا تھا۔ اگر کوئی ان کے زمانے کے جغرافیے کے رزلٹس پر ریسرچ کر سکے تو اس کو خوشگوار حیرت ہو گی۔ کوئی لڑکا جغرافیے میں آرمی سپیشل کے امتحان میں فیل نہ ہوا۔ نہ صرف

فیل نہ ہوا بلکہ ہر ایک نے بہت اچھے نمبر لیے۔

شمسی صاحب کے حوالے سے میں نوجوان انسٹرکٹرز سے اکثر کہا کرتا ہوں کہ آپ کا اپنا Enthusiasm سب سے بڑی Teaching aid ہے۔ اب یہ نظریہ ماہرین نفسیات نے ثابت کر دیا ہے کہ استاد کے جوش و ولولے سے طلباء کا ذہن چمک اٹھتا ہے۔ وہ زیادہ سیکھتے ہیں اور جلد سیکھتے ہیں۔ سلطان شمسی کی مزاجی سختی کے باوجود لڑکے ان سے محبت کرتے تھے اور عزت بھی۔ یہ دونوں چیزیں مشکل سے یکجا ہوتی ہیں۔

مسٹر شمسی کے بارے میں میرا وہ تاثر جو پہلے دن قائم ہوا تھا اور جو آج تک قائم ہے، یہ ہے: کلاس پر ان کی گرفت۔ کلاس میں داخل ہوتے ہی کلاس کی فضا یکسر بدل جاتی تھی۔ میری دانست میں اس کی دو وجہیں تھیں ایک تو یہ کہ وہ اپنے مضمون جغرافیے پر مکمل طور پر حاوی تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ بڑے جوش سے Involve ہو کر پڑھاتے تھے۔ اکہرا بدن، سانولا رنگ، لمبا قد، خوش لباس، آواز میں تیزی، یہ تھے مسٹر شمسی۔ غصہ کے بھی تیز تھے لیکن اس دل سوزی سے، اس جوش سے، اس انہماک سے پڑھاتے تھے کہ جو کچھ پڑھاتے دل میں اتر جاتا۔ اگر اس زمانے کا ریکارڈ موجود ہو تو اس امر کی تصدیق کی جا سکتی ہے کہ برسہا برس آرمی سپیشل کے امتحان میں جغرافیے جیسے خشک مضمون میں کوئی لڑکا فیل نہیں ہوا۔ شمسی سے میں نے لاشعوری طور پر زندگی کا یہ بنیادی اصول سیکھا کہ کوئی کام ہو یا کیریئر، اس میں کامیابی کی بنیادی شرط جوش و ولولہ ہے۔

——کرنل محمد یونس[1]

۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء کا یہ واقعہ ہے کہ پیریڈ ختم ہوتے ہی شمسی صاحب کلاس سے نکل ہی رہے تھے کہ سیٹی بجانے کی آواز آئی۔ میرا خیال ہے کہ سیٹی گستاخانہ نہیں جوانی کی ترنگ کا نتیجہ تھی۔ بہرحال شمسی صاحب نے بُرا مانا، دروازے سے پلٹے اور پوچھا سیٹی کس نے بجائی۔ وہ لڑکا کھڑا ہو گیا۔ سر میں نے۔ شمسی صاحب نے اسے دھن کے رکھ دیا۔ بات آئی گئی۔ ۱۹۷۸ء میں جب یہی لڑکا بریگیڈیئر پروموٹ ہوا اور میں انہیں مبارکباد دینے گیا تو چائے پیتے ہوئے میں نے انہیں یاد دلایا کہ کس طرح سیٹی بجانے پر شمسی صاحب کے ہاتھوں ان کی تواضع ہوئی تھی۔ وہ ایک دم

---

[1] کالج نمبر ۱۶۰۶ زمانہ تعلیم ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۲ء

ہو گئے۔ یونس جو انھوں نے کیا وہ ٹھیک کیا ہر چند کہ سیٹی بجانے سے ان کی Serious توہین منظور نہ تھی یوں ہی بے خیالی میں بجا دی تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں استاد کے Within hearing سیٹی بجانی گستاخی ضرور تھی۔ اگر انہوں نے سزا دی تو بالکل صحیح دی۔ شاید اس وقت مجھے برا لگا ہو لیکن آج میں ان کو برحق سمجھتا ہوں۔ یہی وہ اساتذہ اور شمسی صاحب ان میں امتیازی حیثیت کے حامل تھے جنہوں نے ہمیں جن کا تعلق تعلیمی طور پر ملک کے پسماندہ ترین علاقوں سے تھا، دن رات ایک کرکے اور جان مار کر اس قابل کر دیا کہ ہم ملک کے اور بیرون ملک کے بہترین اداروں کے طلبا سے آنکھیں ملا کر بات کر سکیں اور کیریئر کی دوڑ میں کامیابی سے ان کا مقابلہ کر سکیں۔ اور پھر کہا "یونس تم نے اچھا یاد دلایا۔ شمسی صاحب کو خدا سلامت رکھے آجکل وہ کہاں ہیں؟ میں خود ان کو مبارکباد دینے جاؤں گا۔ اس لیے کہ ہماری کامیابیوں کا کریڈٹ بڑی حد تک انہی استادوں کو جاتا ہے۔

اس وقت شمسی صاحب غالباً ایبٹ آباد میں کسی سکول کے پرنسپل تھے۔ گذشتہ سال جب مجھے معلوم ہوا کہ سیٹلائٹ ٹاؤن پنڈی میں رہائش پذیر ہیں تو میں بیگم کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو بھتیج کے گلے لگایا۔ میں نے بغیر اطلاع آنے کی معذرت کی تو کہا۔ بیٹے والدین کے گھر اطلاع دے کر نہیں آتے۔

جب میں دو ڈھائی گھنٹے کے بعد ان کے گھر سے نکل کر گاڑی میں بیٹھنے لگا تو میں نے سلمیٰ! (بیگم) سے پوچھا "پرنسپل تو تم بھی ہو میرے پرانے استاد کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ان کا برجستہ جواب تھا! Very sincere and very graceful

—— مسٹر محمد زمان بھٹی

پبلک سکول طرز تعلیم میں چونکہ اساتذہ بھی طلباء کے ہاؤسوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ اس لیے ان کا لائف سٹائل بھی طلباء کو شعوری اور لاشعوری طور پہ متاثر کرتا ہے۔ اگر ان کا کلچرل پیٹرن (Cultural Pattern) تھوڑا بہت مختلف ہے تو یہ اختلاف و امتیاز بھی طلبا کے ذہنی افق کو وسیع کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

۱۔ کالج نمبر ۱۶۵ (۱) وکیل سپریم کورٹ۔ زمانہ تعلیم ۱۹۴۶ تا ۱۹۵۲ء

جب ۱۹۴۵ء میں کالج میں داخل ہوا تو یہاں اس نوعیت کا خوشگوار تنوع موجود تھا اور اس کی سب سے زیادہ دلکش مثال جناب سلطان شمسی تھے۔ ہم میں سے بیشتر کیڈٹس پنجاب اور فرنٹیئر کے دیہات سے آئے تھے اور زبان، لباس، پردہ، میاں بیوی کے باہمی روابط اور تعلقات کے ایک خاص Pattern سے مانوس تھے۔ یہاں آکر مختلف کلچروں اور طرز ہائے زندگی کو قریب سے دیکھا جن میں اینگلو انڈین چیف انسٹرکٹر میجر ہولڈین اور ان کی مدراسی بیوی کا طرز زندگی اور باہمی تعلقات کا Pattern تھا۔ وہ بھی ہمارے لیے ایک فکر انگیز نیا تجربہ تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ انفرادیت مسٹر شمسی اور ان کی بیگم کو حاصل تھی۔ سکین ہاؤس کے دائیں طرف کے کوارٹر میں مسٹر حیدری اور بائیں طرف مسٹر شمسی رہتے تھے۔ مسٹر حیدری کی نجی زندگی ہماری آنکھوں سے بالکل اوجھل تھی۔ مسٹر شمسی اکثر شام کو چوڑی دار پاجامے، ڈھیلے سفید کرتے پہنے ہوئے کرتے اور سلیم شاہی جوتی پہنے ٹہلنے باہر نکلتے تھے۔ ان کے ساتھ غرارے قمیض دوپٹے مغلوں کے مخصوص لباس میں ملبوس ان کی بیگم بھی ہوتیں۔ مسٹر شمسی اور ان کی بیگم عموماً فلیگ سٹاف (موجودہ یادگار شہداء) کے چمن زار میں چہل قدمی کرتے نظر آتے۔ ہمارے لیے یہ قطعاً افسانوی منظر ہوتا۔ ہم میں سے جنہوں نے مغل بادشاہوں کی تاریخ قصص ہند وغیرہ پڑھ رکھی تھی وہ زیر لب کہا کرتے یہ کالج کے جہانگیر اور نور جہاں ہیں۔ مسٹر شمسی کا کوارٹر چونکہ ہاؤس سے بالکل ملحق تھا گرمیوں میں ہم ہاؤس کے کورٹ یارڈ میں سوتے تھے۔ اس لیے اکثر لائٹس آؤٹ کے بعد دونوں میاں بیوی کی باتوں کی آواز بھی کان میں پڑ جایا کرتی تھی۔ وہ عموماً بہت سنجیدہ ملکی اور علمی مسائل پر بحث کیا کرتے تھے۔ بیگم شمسی یقیناً خاصی پڑھی لکھی خاتون تھیں کہ وہ بھی بحث میں برابر کا حصہ لیتی تھیں۔

میاں بیوی کے باہمی روابط کا یہ ایک نیا پہلو تھا جو ہمارے سامنے آیا غالباً یہی وجہ ہے کہ میں اب اس امر کا قائل ہوں کہ جمہوریت گھر میں بھی ہونی چاہیے۔ چونکہ جمہوریت ایک طرز زندگی اور ایک فلسفہ حیات ہے۔

یہ باتیں ۵۱-۱۹۵۰ء کی ہیں تقریباً پچیس برس کے بعد جب میں اپنے بیٹے مسرور زمان کو کالج میں داخل کرانے گیا تو وہاں شیر شاہ ہاؤس میں مسٹر راشد کے ساتھ ان کی بیگم کو بھی سرگرم عمل

دیکھا۔ نئے طلبار کے ساتھ جو خواتین تھیں ان کو وہی خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ بعد کو مسرور زمان نے بتایا کہ آنٹی اکثر ہاؤس میں آتی تھیں میری اہلیہ بھی ان سے کئی بار ملی تھیں اور ہاؤس کے بچوں میں ان کی دلچسپی سے بہت متاثر ہوتی تھیں۔ نئے طلباء خصوصاً کم عمر نئے طلبار کے ساتھ ہاؤس ماسٹر کے اپنے خاندان کا تھوڑا بہت Involve ہونا اور طلباء کے والدین کے ساتھ بھی جس حد تک بھی ممکن ہو رابطہ رکھنا ملٹری کالج کی ایک ایسی قیمتی ٹریڈیشن (Tradition) ہے جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

ــــــ کیپٹن (نیوی) محمود علی ڈوگر

شمسی صاحب پڑھائی اور امتحان کی تیاری میں بہت سختی کرتے تھے لیکن امتحان کے نمبروں میں نرمی۔ کلاس ڈسپلن اور ہوم ورک کے سلسلہ میں کسی کا لحاظ نہ کرتے۔ سزا دینے کا ان کا اپنا سٹائل تھا۔ جس کی تواضع کرنا ہوتی عموماً تین قسطوں میں کرتے۔ پہلا راؤنڈ ہوا کچھ دیر پڑھایا پھر آئے کچھ نواز گئے۔ کچھ دیر پڑھایا۔ پھر تیسرا راؤنڈ کیا۔ خلوص سے اور انصاف سے دی گئی سزا اس وقت بھی بری نہیں لگتی۔ بعد کو تو اس کی قدر بہت بڑھ جاتی ہے۔ اب ایسے استاد کہاں ہیں جو اتنا Involve ہو کر پڑھائیں۔

سارجنٹ برونیرو

ــــــ محمد زمان بھٹی

آٹھویں میں میرے انگریزی کے استاد سارجنٹ برونیرو (Brunero) تھے۔ وہی فارم ماسٹر بھی تھے۔ بحیثیت استاد ان کی خوبی یہ تھی کہ ہمارے لیے اجنبی نہیں رہے تھے۔ کلاس سے باہر بھی ہم سے رابطہ تھا۔ اکثر اتوار کو فوٹو گرافی کرتے اور ہمیں اپنے فوٹوؤں کی کاپیاں دیتے۔ غالباً اپریل ۴۷ء میں یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے ان تین طالب علموں کو جنھوں نے انگریزی میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا انھوں نے انگلینڈ سے درآمد شدہ کاپیوں اور پنسلوں کا ایک سیٹ عطا کیا۔

ــــــ دیکھا آپ نے؟ کون یاد آتا ہے جس نے فرض کی لکیر سے آگے جا کر اپنی خوشی سے اور اپنے شوق سے ذرا سی بھی محبت کی ہو، خدمت کی ہو۔

سارجنٹ کوری

بریگیڈیر محمد اشرف

چراغوں کی قطار کے لیے میں تو اپنے محسن سارجنٹ کوری کا نام دوں گا۔ درمیانہ قد، اکہرا جسم، ستواں ناک، اور گول شیشوں اور باریک کمانی کی عینک، سرخ چہرہ یہ تھے سارجنٹ کوری، کبھی خاکی یونیفارم (خاکی شرٹ، شارٹس اور سٹاکنگز) کے بغیر نہیں دیکھا۔ ۱۹۴۵ء میں، میں توسیعی سکیم کے تحت آٹھویں میں داخل ہوا تھا۔ غریب وال میں تھوڑی سی پڑھی انگریزی یہاں کیا کام آتی۔ یوں سمجھئے کہ یہاں کے معیار سے انگریزی میں بالکل صفر تھا۔ چنانچہ تھرڈ کلاس انگریزی کے امتحان میں فیل بھی ہوا۔ میری طرح ۱۰۲۳ مظفر شاہ وغیرہ دو تین اور بھی تھے۔ خدا بھلا کرے جناب کوری کا، لنچ کے بعد وردی ہی میں کلاس میں پھر واپس آتے تھے۔ ہم چند لڑکوں کے ساتھ مغز کھپانے کے لیے۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
مجھے آج تک حیرت ہے کہ انہیں ہم سے ایسی کیا دلچسپی تھی لیکن سوائے خدمت کے جذبہ کے اپنے آرام کو قربان کر کے ہمیں پڑھانے آتے تھے۔ انہوں نے بڑے مشکل وقت میں میرا ہاتھ پکڑا۔ ان کا بڑا ہاتھ ہے مجھے بنانے میں۔ یہ ان کی توجہ کا ہی نتیجہ تھا کہ سال بھر میں، میں اوپر آ گیا۔ پھر اس قابل بھی ہوا کہ نہ صرف آرمی سپیشل کا امتحان پہلی کوشش میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا بلکہ ۱۹۴۹ء کے انگلش مضمون نگاری کے مقابلہ میں انعام بھی حاصل کیا۔

جناب سارجنٹ کوری جہاں کہیں بھی ہیں میرے دل سے ان کے لیے دعا نکلتی ہے۔

میجر ھولڈین

محمد زمان بھٹی

۴۶-۱۹۴۵ء میں چیف انسٹرکٹر تھے۔ میں اس زمانے میں بہت جونیئر تھا۔ ان سے پڑھا نہیں۔ چند بار بے بی ہاؤس رابرٹس ہاؤس میں آئے۔ ایک بار میں سامنے کھڑا تھا مجھ سے بہت نرمی سے پوچھا کیسے ہو؟ کوئی تکلیف تو نہیں۔ ان کا محبت سے یہ پوچھنا ہی آج تک یاد ہے۔ تھے فوجی مگر چہرہ پر کرختگی نہ تھی نہ ہی لب ولہجہ درشت تھا۔ تعلیم کا مجسمہ نظر آتے تھے۔ یادوں کے تصویر خانہ میں ان کی تصویر علیحدہ نظر آتی ہے۔

——— میجر جنرل غلام محمد

میجر ہولڈین آکسفورڈ یونیورسٹی کے سکالر اور دانشور (Intellectual) تھے۔ دو دو تین تین سینئر کیڈٹس غیر رسمی ڈسکشن کے لیے گھر پر بلاتے تھے۔ اکثر کھانا بھی کھلاتے تھے جس میں، ان کی بیوی کی پکائی ہوئی مدراسی ڈشیں بھی ہوتی تھیں۔

میجر ہولڈین سپیشل کلاس کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ انہی کے زمانے میں لائبریری میں توسیع ہوئی۔ ۱۹۴۵ء میں جب میں ایف ایس سی کلاس میں تھا تو انہوں نے مجھے دوستووسکی کی کتاب "برادرز کرامزو" پڑھنے کو دی۔ اس زمانے میں انگریزی کا معیار ایسا تھا کہ آرمی سپیشل میں شرلاک ہومز اور ڈکنس کی کتابیں پڑھ چکا تھا۔ یہاں میں میجر ہولڈین کے کنٹری بیوشن کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ انہوں نے تعلیم کے معیار کو اونچا کرنے میں خاموش لیکن ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک سکالر یونیورسٹی کی سطح کا آدمی تھے جنہیں جنگ کی طوفانی لہروں نے ملٹری کالج کے ساحل پر لا ڈالا تھا۔

——— شہزادہ ہارون اسمٰعیل

ہولڈین ۱۹۴۵ء میں تھوڑے عرصے کے لیے چیف انسٹرکٹر رہے۔ کوئی ۴۰ کے پیٹے میں تھے۔ سینئر کلاسوں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ ہفتہ میں ان کے تین پیریڈ ہوتے تھے، جو وہ ایک دن میں ایک ساتھ آخر میں لیتے تھے۔ دبلے پتلے، آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ، لب و لہجہ شائستہ، رفتار و گفتار پر وقار، ان کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ پڑھا لکھا آدمی ایسا ہوتا ہے۔ ہولڈین کی امیج مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک ان کی مدراسی بیوی کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ وہ آکسفورڈ کی گریجویٹ تھیں اور سادگی شائستگی کی تصویر۔ ہولڈین کے ساتھ آتی جاتی تھیں۔ ہولڈین خود بتاتے کہ پرچے میری مسز سیٹ کرتی اور مارک کرتی ہیں۔ مسز ہولڈین کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ عورت ایسی بھی ہو سکتی ہے۔

مسز ہولڈین

——— میجر جنرل غلام محمد

سر تا پا ہندو، ستی ساوتری کی تصویر لیکن ذہن اتنا روشن اور کردار اتنا شائستہ کہ بس

کی ٹھنڈی روشنی کالج کے درودیوار کو روشن کر گئی۔ان کی مدراسی بیوی سے پہلے لڑکوں کے ذہن ہیں Creative woman کا کوئی تصور نہ تھا۔ اس خاتون میں تین غیر معمولی خصوصیات جمع ہوگئی تھیں۔علم، کلچر اور سادگی میں پرکاری۔ اس لحاظ سے اس خاتون کا کوئی ثانی نہ تھا۔ کالج کے Premises میں ایسی خاتون کی موجودگی ایک ایجوکیشن تھی۔ اس سے عورت کی ذات، شخصیت، اور رول کی ایک نئی ایمج لاشعوری طور پر سامنے آئی میں اس مدراسی معلمہ خاتون کا تذکرہ اس لیے کر رہا ہوں کہ ایجوکیشن میں وہ ماحول بھی اہمیت رکھتا ہے، جس میں طلباء سانس لیتے ہیں اصل شخصیت اس ماحول سے بنتی ہے۔اس زمانے کے ماحول میں مسز سٹیبنگ، مسز لیوس اور مسز ہولڈین کا پس منظری حصہ تھا جس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد فرید ملک

۴۶-۱۹۴۵ء میں میجر ہولڈین چیف انسٹرکٹر تھے۔ ان کی مدراسی ہندو بیوی اکثر شام کو ان کے ساتھ باہر نکلتی تھیں۔ یہ خاتون عورتوں کی روایتی ایمج (Image) سے بالکل مختلف تھیں۔ بغیر میک اپ کا چہرہ، سفید ساڑھی، سفید بلاؤز، ماتھے پہ بندیا، پیروں میں معمولی سی چپل لیکن پُراعتماد رفتار اور پُروقار انداز، بڑا تجسس ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد ہولڈین صاحب نے ایک پیریڈ انگریزی کا لینا شروع کیا۔ان کے پڑھانے کے انداز نے بھی متاثر کیا۔ اسی سال آرمی سپیشل کا نیا نصاب آیا تھا۔ یہ اس کو وسیع تر تناظر میں پڑھاتے تھے۔ دوسری کتابوں کا تذکرہ بھی کرتے تھے ایک بار نظموں کی کتاب Bridges of Song کی William Blake کی نظم Love's Secret پڑھاتے ہوئے برسبیل تذکرہ بتایا کہ میں، اور میری مسز آکسفورڈ یونیورسٹی میں تاریخ ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ وہیں سے انڈرسٹینڈنگ شروع ہوئی۔ پھر کہا جس محبت کی جڑیں دماغ میں نہ ہوں وہ پائدار نہیں ہوتی۔

یہ بات ہمارے لیے بالکل نئی تھی کہ کوئی استاد وہ بھی چیف انسٹرکٹر ہماری تربیت کے لیے اپنی ذاتی زندگی کا کوئی دریچہ کھولے۔ پھر جب ہم سپیشل کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے تو ہولڈین صاحب نے ہم پانچ سات سینئر لڑکوں کو اپنے بنگلہ پر رات کے کھانے پر بلایا۔ میجر ہولڈین اور

مسز ہولڈین نے پورے اہتمام سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ کھانے پر انگلش اور مدراسی ڈشیز تھیں میجر ہولڈین بہت کم گو اور چین سموکر تھے۔ وہ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد بیشتر وقت سموکنگ ہی کرتے تھے۔ ہماری بیشتر میزبانی مسز ہولڈین ہی نے کی۔ اصرار سے مدراسی ڈشز کھلائیں اور ہم سے ہمارے کلچر کے بارے میں مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتی رہیں۔ ان کا نو دس برس کا بچہ ارجن بھی وہیں بیٹھا تھا۔ مسز ہولڈین کے رویے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ہم چونکہ کمیشن کے متوقع امیدوار تھے وہ ہمیں Socially educate کرنا چاہتی تھیں۔ مسز ہولڈین کا احسان یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں عورت کے مقام اور رول کی ایک نئی امیج سے روشناس کیا۔ استاد شاگرد کے رشتہ میں ایک اور Dimension کا اضافہ ہوا۔

ڈاکٹر میجر شمسی

——— سید شہزادہ عالم

ان کے اولاد نہیں تھی۔ وہ کالج کے لڑکوں ہی کو اولاد سمجھتے تھے۔ مجھے یاد ہے دو ضرورت مند بچوں کو جب وہ آئی ایس ایس بی جا رہے تھے تو انہیں کپڑے بنوا کر دیئے۔ سرور کو تو انہوں نے بیٹا ہی بنا لیا تھا۔ اس کی پڑھائی کے سارے اخراجات برداشت کیے اس نے ۱۹۵۴ء میں کمیشن لیا تھا۔ اس کے بعد اپنی اولاد کی طرح اس کی شادی کروائی۔ وہ بھی بہت سعادت مند ثابت ہوا شمسی صاحب کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے اصرار کیا کہ وہ اس کے ساتھ رہیں اور اسے خدمت کا موقع دیں۔

کیپٹن ڈاکٹر شام لال

——— بریگیڈئر محمد خان[۱]

اواخر ۱۹۴۶ء میں کالج میں میڈیکل آفیسر پوسٹ ہو کر آئے تھے۔ یہ تنہا غیر مسلم آفیسر تھے۔ (میٹرن مس سدھو کے علاوہ) جو کالج میں اگست ۱۹۴۷ء کی پہلی پاکستان ڈے پریڈ پر شریک ہوئے تھے۔ اس کے دوسرے تیسرے دن جو ناخوشگوار واقعات، نوٹیال اور کیپٹن مین کے خلاف پیش آئے تھے اور جن کی تفتیش کے سلسلہ میں چند لڑکوں کو رابرٹس ہاؤس میں حراست میں لے لیا گیا تھا اور ان پر پہرہ بٹھا دیا گیا تھا اس آڑے وقت میں ہندو ہونے ہوئے بھی ڈاکٹر شام لال نے کمال بے تعصبی

---

[۱] زمانہ تعلیم ۱۹۴۴ء تا ۱۹۴۸ء

سے ان چند لڑکوں کی دیکھ بھال کی، کھانے پینے کا انتظام کردایا۔ وہ غالباً خوشاب کے تھے اور پاکستان سے جانا نہیں چاہتے تھے اور اپنی خوشی سے اگست ۱۹۴۷ء کے بعد تک یہاں رہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب وہ یہاں سے گئے تو سب کی آنکھیں نم تھیں یہی حال مس سدھو کا تھا۔
شام لال صاحب اسپتال کو بہت وقت دیتے تھے۔ ڈنر کے اور پھر لائٹس آؤٹ کے بعد اسپتال کا بلاناغہ چکر لگاتے تھے اور مریضوں کی بہت توجہ سے دیکھ بھال کرتے تھے۔ ان کی دردمندی سے دوسروں کی طرح میں بھی فیضیاب ہوا ہوں۔ اسی لیے ان کو اپنے محسن کے طور پر یاد کر رہا ہوں۔ خدا ان کی آتما کو خوش رکھے۔

میٹرن سدھو

——— کرنل وزیر خان ملک

بے بی ہاؤس اور سکھ لڑکوں کے کیبن کی دیکھ بھال کے لیے سدھو نام کی ایک سکھ میٹرن رکھی گئی تھی۔ دوہرے بدن کی گوری چٹی ہنس مکھ عورت تھی۔ چھوٹے بچے اس سے بہت مانوس تھے۔ ماں کی طرح پیش آتی۔ اس کا رول مادر مہربان کا تھا جو ڈسپلن بھی رکھ سکتی ہو۔ وہ اپنی خوشی سے ۱۹۴۷ء کے بعد بھی یہاں رہی۔ ۱۹۴۸ء میں جہلم سٹیشن سے اسے بڑی عزت اور بہت محبت سے رخصت کیا گیا۔ یہ سب کچھ ذاتی شرافت وشفقت کی وجہ سے ہوا۔
ایک پبلک سکول میں بات اسی وقت بنتی ہے کہ اس میں ایک ایک فرد پبلک سکول کی سطح کا ہو۔ پبلک سکول میں اصل چیز تربیت ہوتی ہے اور تربیت بڑی حد تک ایک سماجی عمل ہے۔

کیپٹن عبدالحمید ابراہیم

——— میجر عبدالجبار[1]

پاکستان بنتے وقت اگست ۴۷ء میں اور پھر اوائل ۴۸ء میں کالج میں کچھ ایسے واقعات ہوئے تھے جس سے کالج کے ڈسپلن کا فریم ورک خاصا ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ کیپٹن ابراہیم نے اسے استوار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ سٹاف کی کمی اور آئے دن کی تبدیلی سے جو تعلیمی

---

[1] لیفٹیننٹ کرنل ہو کر لارنس کالج گھوڑا گلی سے ریٹائر ہوئے۔ کالج نمبر ۱۰۱۱، زمانہ تعلیم ۵۰-۱۹۴۱ء

مسائل پیدا ہوئے تھے ان سے عہدہ برآ ہوئے، ساتھ ہی نئے تعلیمی و تربیتی تقاضوں کو پورا کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی۔ وہ صرف Efficient ہی نہیں بلکہ بہت Effective چیف انسٹرکٹر تھے۔

۵۰-۱۹۴۹ء میں کالج ہیڈ بوائے کی حیثیت سے میرا ان سے قریبی رابطہ تھا۔ اس تجربے کے حوالے سے میں ان کی ایک اور خوبی ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں جس کی ملٹری کالج ایسے اداروں میں بطور خاص ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً طلبا میں کسی قسم کا (صلاحیت اور Brightness کی بنا پر زیادہ) Discrimination نہ کیا جائے۔ سب کو کم و بیش برابر کی توجہ ملے اور طلبا کی کوئی Elite کلاس نہ ابھرے۔ کالج میں ۱۹۴۷ء سے پہلے زیادہ تر سپورٹس میں برتری کی بنا پر اور ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد کے دور میں کلچرل سرگرمیوں میں غیر معمولی Talents کی وجہ سے ایک Privileged گروپ ابھر رہا تھا۔ ابراہیم صاحب نے اس Eliticism کے سحر کو توڑا اور بغیر رو رعایت کے ڈسپلن کے تقاضوں کو پورا کیا۔ اور Fairplay اور Firmness کی ایک ایسی مثال قائم کی جس کی جتنی تعریف بھی کی جائے کم ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کالج میں چیف انسٹرکٹر کے دفتر کے سامنے ان کا سنگ خارا کا مجسمہ کھڑا کیا جائے اور نیچے لکھا جائے کہ پتھر میں یہ شبیہ اس شخص کی ہے جس کی نظر کھیلوں، ڈیبیٹیں اور ڈراموں سے بہت آگے اور ان کے اصل مقصد پاکستان کے حوالے سے طلباء کے مستقبل پر تھی۔

—— بریگیڈئر محمد اکرم ظفر

کیپٹن ابراہیم کا نسبی تعلق ایبٹ آباد کے ایک معروف علمی خانوادے سے تھا۔ علم دوستی اور معلمی انہیں ورثے میں ملی تھی۔ اگست ۴۷ء کے تیسرے ہفتے میں کالج میں کے۔ جی۔ آر جالندھر سے دوسرے مسلمان لڑکوں کے قافلے کے ساتھ آئے تھے۔ اواخر ۴۸ء میں انہوں نے یہاں چیف انسٹرکٹری کا منصب سنبھالا۔

مئی ۱۹۵۰ء میں پروموشن پر ان کی پوسٹنگ پی ایم اے کے لیے آ گئی تھی لیکن انہوں نے

---

۱ کالج نمبر ۱۲۲۳ زمانہ تعلیم ۵۰-۱۹۴۲ء

یہاں کی معلمی کو وہاں کی انسٹرکٹری پر ترجیح دی اور ان کی درخواست پر ان کا تبادلہ منسوخ کروایا گیا۔ پھر یہاں کی چیف انسٹرکٹری کی پوسٹ کو اپ گریڈ کراتے کراتے دو سال لگے۔ مارچ ۱۹۵۲ء میں اصولی منظوری آئی۔ ان کو میجری کا پپ لگاتے لگاتے مزید چھ ماہ انتظار کرنا پڑا لیکن انہوں نے کبھی اس کا گلہ نہیں کیا اور اپنے کام میں مگن رہے۔ جس دن سے یہ واقعہ کمانڈانٹ کرنل زیدی کے Memoirs میں پڑھا ہے میرے دل میں ان کی قدر دوچند ہو گئی ہے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ ان کو اتنی عزت اور محبت سے کیوں یاد کیا جاتا ہے۔ استاد کی قابلیت یا Talent اپنی جگہ لیکن تاثیر اس کے Devotion میں ہوتی ہے۔

——— ائر چیف مارشل ذوالفقار علی خان[1]

اپریل ۱۹۴۸ء میں کالج میں جو پہلا باقاعدہ رسالہ کنگ جارجز رائل پاکستان ملٹری کالج میگزین (جہلم) کے نام سے شروع ہوا تھا اس کے اصل ایڈیٹر تو کیپٹن ابراہیم ہی تھے لیکن انہوں نے اپنا نام (Adviser) مشیر کے طور پر لکھا اور تین کیڈٹ ایڈیٹرز کا جو پینل بنایا اس میں مجھے بھی شامل کیا اور اصرار سے اس شمارہ کے لیے ایک مضمون بہ عنوان Encounter with a wild boar لکھوایا۔ اس امر سے کہ انہوں نے اپنا نام مشیر کے طور پر لکھا اور ہم تین کیڈٹس کو ایڈیٹر بنایا اور کچھ ایڈیٹری بھی کروائی --- ان کی تعلیمی و تربیتی اپروچ پر روشنی پڑتی ہے۔ ایف ایس سی سیکنڈ ائر میں میں نے ان سے انگریزی پڑھی تھی۔ وہ توسیعی مطالعہ پر بہت زور دیتے تھے ملٹری سے جو سب سے قیمتی چیز میں نے حاصل کی وہ بھی توسیعی مطالعہ کی عادت تھی۔

——— بشیر احمد مرزا[2]

ایک بار رات کے پریپ میں ابراہیم صاحب نے مجھے خط لکھتے چیک کیا اور نگاہوں سے تنبیہہ کر کے چلے گئے۔ چند روز بعد دوسری بار خط لکھتے دیکھا تو خط لے کر پھاڑ دیا۔ جب

---

[1] سابق چیف آف پاکستان ائرسٹاف، کالج نمبر ۲۷۱، زمانہ تعلیم ۱۹۴۴ تا ۱۹۴۸ء

[2] مینجر سٹیٹ لائف لاہور۔ کالج نمبر ۱۵۱۸ کالج میں زمانہ تعلیم ۱۹۴۵ تا ۱۹۵۴ء

تیسری بار انھوں نے مجھے خط لکھتے پکڑا تو نزلا رخ کے دو تین بہت کرارے تھپڑ لگائے۔ ان کی جزا اور سزا بے لاگ ہوتی تھی۔

ایک بار عید پر میرے بھائی میرے لیے چھٹی لینے آئے۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ عید اپنی جگہ لیکن جب سب لڑکے یہاں عید منا رہے ہیں تو کسی ایک کو محض اس وجہ سے کہ اس کا گھر جہلم میں ہے میں چھٹی پر نہیں بھیج سکتا۔ وہ کام کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ انھوں نے ہمیں سکھایا بھی اور بنایا بھی۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی انھوں نے مجھ پر شفقت کی نظر رکھی کبھی کبھی یہاں الفلاح میں میرے دفتر میں تشریف لاتے تھے۔ ان کی برسی پر ان کے لیے دعا کا خصوصی اہتمام کرنا میں اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہوں۔

——— کرنل محمد یونس[۱]

میں نے کرنل ابراہیم صاحب سے ۴۹-۱۹۴۸ء میں انگریزی پڑھی تھی۔ تقریباً تیس برس کے بعد کی بات ہے کہ میں راولپنڈی صدر کے ایک مصروف چوراہے پر کھڑا تھا کہ سڑک پار سے کسی مانوس آواز نے پکارا۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو یہ اپنے ابراہیم صاحب تھے گرین بتی کا اشارہ کھلنے پر میں ان سے ملا۔ بہت خوش ہوئے۔ حال احوال پوچھا اور God bless you کہہ کر گاڑی سٹارٹ کر دی۔

اس تیس سال کے عرصہ میں، میں صرف ایک بار ان سے لارنس کالج گھوڑا گلی میں ملا تھا لیکن انھوں نے یاد رکھا۔ ابراہیم صاحب روایتی قسم کے بہت سخت استاد تھے لیکن بہت Fair تھے اور بے حد Sincere بھی۔ یہ کلاسیکی استادوں کی صفات ہیں۔

——— لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین[۲]

اگست ۱۹۴۷ء میں، میں کیپٹن ابراہیم کے ہمراہ ہی دوسرے مسلمان لڑکوں کے ساتھ کے۔ جی۔ آر۔ جالندھر سے ملٹری کالج جہلم آیا تھا۔ وہ وہاں ہمیں اردو پڑھاتے تھے۔ دو ایک دفعہ ان سے مار بھی کھائی۔ بہت سخت گیر استاد تھے لیکن اس سے زیادہ مخلص اور ہمدرد جب میں پہلی

---

[۱] کالج نمبر ۱۶۰۶ زمانہ تعلیم ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۲ء

[۲] کالج نمبر ۱۶۲۳ زمانہ تعلیم ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۴ء

کوشش میں آرمی سپیشل کے امتحان کی انگریزی کلیئر نہیں کر سکا تو مجھے دفتر میں بلایا۔ اتفاق سے اس وقت وہاں میرے ہاؤس ماسٹر کیپٹن شفیع صاحب بھی موجود تھے۔ پوچھا کیا بات ہے انگریزی میں کیوں رہ گئے؟ میں نے عرض کیا سر آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ تم مجھے اپنی انگریزی کمپوزیشن کی کاپی دے جاؤ۔ میں تمہارے پرانے پرچے بھی نکلوا کر دیکھتا ہوں کہ کہاں کمی ہے۔ میں تمہارا کیس تمہارے ہاؤس ماسٹر صاحب سے ڈسکس کرتا ہوں۔ مختصر یہ کہ پھر شفیع صاحب نے میری کوچنگ کی اور مجھے پار لگایا۔ لیکن یہ سلسلہ شروع ابراہیم صاحب کے ایما پر ہوا تھا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے تعمیراتی سامان سریا وغیرہ کا کاروبار شروع کیا تھا لیکن ایک روز وہ اتفاق سے ایبٹ آباد کے مین بازار میں مجھے مل گئے۔ پوچھا کیا کر رہے ہیں میں نے بتایا کہ یہ صورتحال ہے تو فرمایا۔ تمہیں تو سیمنٹ کی ایجنسی بھی چاہیے میں نے کہا چاہیے تو سہی لیکن میں جنرل سعید قادر صاحب کے پاس درخواست لے کر جانا نہیں چاہتا۔ ابھی تو ان سے ریٹائرمنٹ لی ہے۔ وہ بولے تم نہ جاؤ میں جاؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے مجھ سے زبردستی درخواست لکھوائی اور منظور کروا کے میرے حوالے کی نہ صرف یہ بلکہ سیکورٹی کی آدھی رقم بھی اپنے پاس سے جمع کروائی اور مجھ سے کہا یہ رقم واپس کرنے کی کوئی جلدی نہیں جب گنجائش نکلے لوٹا دینا۔ تو یہ تھے ابراہیم صاحب!

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد یونس

آصف: سر میرا نام آصف سعید اور کالج نمبر ڈی۔ ایس ۴۳ ہے۔ میں چراغوں کی قطار کے سلسلہ میں آپ سے انٹرویو کرنا چاہتا تھا۔ تو سر، کالج میں آپ کا پہلا چراغ کون تھا؟

کرنل یونس: کیپٹن عبدالحمید ابراہیم صاحب جو بعد کو لیفٹیننٹ کرنل ہو کر ریٹائر ہوئے۔ ان سے میری زیادہ وابستگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ۴۳-۱۹۴۲ء میں، میں نے ان سے گورنمنٹ ہائی سکول پشاور میں بھی پانچویں میں پڑھا تھا۔ جہاں وہ کمیشن لینے سے پہلے استاد ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں، میں کے۔ جی۔ آر ملٹری کالج اجمیر میں داخل ہو گیا اور غالباً اسی سال انہوں نے کمیشن لے لیا۔ دسمبر ۴۷ء میں، میں اور ۳۶ لڑکوں کے ساتھ جن میں ۱۹۶۰ میجر علی عابد شہید ۱۹۶۸ گل بادشاہ وغیرہ شامل تھے، کے ساتھ ملٹری کالج جہلم پہنچا اور ابراہیم صاحب غالباً

---

[1] کالج نمبر ۱۶۹۳، ستارۂ جرأت، تمغۂ امتیاز ملٹری

اسی سال اگست میں کے۔جی۔آر جالندھر سے یہاں آئے تھے۔کیپٹن ابراہیم ہمیں نویں میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں سالانہ امتحان میں انگریزی کا جو مضمون لکھنے کے لیے ملا وہ کشمیر پر تھا غالباً اسی مضمون کی بناء پر انہوں نے مجھے انگریزی مضمون نگاری کے مقابلہ میں شرکت کے لیے کہا مقابلہ کا عنوان تھا The First Independence Day چونکہ میں پہلے یوم آزادی یعنی ۱۴اگست ۱۹۴۷ء کے موقع پر کے۔جی۔آر ملٹری کالج اجمیر میں تھا اس لیے میں نے وہاں کے واقعات لکھے۔

آصف: ہر چند کہ ان واقعات کا تعلق ابراہیم صاحب سے نہیں ہے پھر بھی چونکہ یہاں کالج میں ۱۴اگست ۴۷ء کو خاصا ہنگامہ ہوا تھا۔اس پس منظر میں، میں یہ جاننا چاہوں گا کہ وہاں مسلمان لڑکوں نے یہ دن کیسے منایا؟

کرنل یونس: وہاں ۱۵اگست کو انڈیا کے یوم آزادی کے موقع پر کوئی غیر معمولی Tension یا Excitement نہیں تھا۔سب معاملہ نارمل چل رہا تھا۔کالج میں نہ کوئی پریڈ ہوئی تھی نہ ترنگا جھنڈا لہرایا گیا تھا۔ہمارا کالج فلیگ ہی چلتا رہا۔لاکروں پر اگر ہندو لڑکے مہاتما گاندھی اور نہرو کے فوٹو لگاتے تھے تو ہم قائداعظم اور لیاقت علی خان کے فوٹو لگاتے تھے۔۱۷اگست کو عید تھی۔عید کی نماز کے لیے ہم حسب معمول سرکاری ٹرانسپورٹ میں اجمیر شریف کی درگاہ میں گئے۔آتے جاتے ہم پاکستان زندہ باد اور قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگاتے آئے۔واپسی پر ہمیں کمانڈانٹ میجر سومدت نے چائے کی دعوت دے رکھی تھی۔ان کے بنگلے میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے پھر نعرے لگائے تو صوبیدار ابراہیم نے ہمیں ٹوکا کہ ذرا جوش میں نہ آؤ۔کمانڈانٹ نے خوش دلی سے ہماری خاطر تواضع کی۔واپسی پر ہم نے پھر نعرے لگائے۔میجر سومدت میں کوئی تعصب نہ تھا۔اگست کے چوتھے ہفتہ میں جب یہاں سے ہندو لڑکے اور کیپٹن مینن اجمیر پہنچے تو انہوں نے بڑا پروپیگنڈا کیا کہ ہمارے ساتھ جہلم میں یہ ہوا تھا وہ ہوا تھا۔ان کی اشتعال انگیزی پر وہاں کے حالات بگڑے۔مگر آفرین ہے میجر سومدت پر کہ انہوں نے ہمیں ہماری پرو پاکستان سرگرمیوں پر کبھی سرزنش نہیں کی اور ہمیں تین چار ماہ تک مکمل تحفظ دیا

مشہور تھا کہ وہ رات کو خود پستول لے کر گھومتے تھے اور ہماری سیکورٹی کے انتظامات کو چیک کرتے تھے۔ چند ہندو مرہٹہ لڑکوں کو Misbehave کرنے پر کالج سے خارج بھی کیا۔ انہوں نے آخر آخر میں ہمیں ایک ہاؤس میں جمع کر دیا تھا اور ایک خطرہ کا الارم لگوا دیا تھا جس کا کنکشن ان کے بنگلہ میں تھا۔ ایک روز افضل نے خواب میں شور مچا دیا کہ آ گئے آ گئے۔ گھبراہٹ میں کسی نے الارم کا بٹن دبا دیا۔ چند منٹ میں سومدت صاحب شب خوابی کے کپڑوں میں اپنی سرخ سپورٹس کار میں پہنچ گئے۔ چونکہ جے پور کے ہوائی اڈہ تک پہنچنے کا راستہ محفوظ نہ تھا۔ انہوں نے ریل کے ذریعے پاکستان بھجوانے کا انتظام کیا اور مونا باؤ کے سٹیشن تک خود چھوڑنے آئے اور راستہ میں ہمیں حلوہ پوری کھلواتے رہے۔ جب مونا باؤ سے کھوکھراپار سٹیشن کے لیے ہماری ریل چلی تو انہوں نے ہمیں اس طرح خدا حافظ کہا جس طرح ایک استاد اپنے شاگردوں کو رخصت کرتا ہے۔ میں اس شخص کی عظمت کو سلام کرتا ہوں جس نے استاد شاگرد کے رشتہ کو قائم رکھا اور انسانیت کے رشتہ کو مقدم رکھا۔ اتنے بہت سے مگرمچھوں میں وہ شخص راج ہنس تھا۔ اگر یہ عظیم انسان ہمارے آڑے نہ آتا تو نہ جانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔ اچھے برے ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ میں جناب سومدت کو اپنا پہلا چراغ کہتا ہوں۔ ان کی انسان دوستی، فرض شناسی اور بے تعصبی میرے لیے اس وقت سے اب تک مسلسل انسپریشن کا سرچشمہ رہی ہے۔

آصف: شکریہ، آپ نے بہت قیمتی معلومات سے نوازا۔ اب پھر ابراہیم صاحب کی طرف لوٹتے ہیں۔

کرنل یونس: ایک بار مانسہرہ روڈ پر ایبٹ آباد میں ان کے ہاں ایک رات مجھے قیام کا موقع ملا۔ ابراہیم صاحب نے مجھے اہتمام سے ٹھہرایا اور کھانے کے بعد انہوں نے مجھے پڑھنے کے لیے ہارڈی کا ایک ناول دیا۔ ایک دن ایک رات مجھے بہت عزت سے رکھا۔ ان کی شفقت کا نقش آج بھی میرے دل پر ہے۔ اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں۔ ان کے لیے دعا کرتا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ ان کے بچوں سے ملوں۔

——— شوکت جنجوعہ[1]

خود بہت دبلے پتلے تھے لیکن کیپٹر بہت جاندار تھا جو تھری ناٹ تھری کے نام سے مشہور تھا۔ ان کی فرض شناسی کی ایک مثال دیتا ہوں کہ رات کو کلاسز میں جو پیریڈ ہوتے تھے۔ ان پر کریپ سول شوز پہن کر ٹپ ٹو آتے تھے۔ ادر ہر روز اور پتہ نہیں ہوتا کس وقت آجائیں اور گردن سے پکڑ لیں۔ یہ ضروری سختی بھی ضروری ہوتی ہے۔ ابراہیم صاحب کرنل ریٹائر ہوکر لارنس کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ لیکن زندگی بھر ان کا رابطہ عالمگیر بینر ہی سے رہا۔ کالج کی تاریخ میں ان کا نقش قدم بھی چمکتا رہے گا۔

——— کرنل محمد افضل خان[2]

۱۹۵۴ء میں، میں آئی ایس ایس بی سے Deferred کا لیبل لے کر بہت دل برداشتہ تھا اور بہت تنہا محسوس کر رہا تھا۔ بیشتر ساتھی پی ایم اے جا چکے تھے۔ جو منتخب نہیں ہوئے تھے وہ اپنے اپنے گھروں کو سدھارے تھے۔ ایسی وقت گزاری کے لیے میں انفارمیشن روم کے بورڈ پر لگی ڈرامے کی تصاویر بار بار دیکھ رہا تھا کہ لیفٹیننٹ کرنل ابراہیم (اس وقت میجر) ادھر آنکلے۔ یا غالباً مجھے وہاں دیکھ کر قصداً آئے۔ چونکہ ابراہیم صاحب کی شہرت ایک نہایت سخت گیر اینڈ ماسٹر ہیڈ کی تھی۔ اس سے پہلے میرا ان سے کوئی براہِ راست واسطہ نہیں پڑا تھا اس وجہ سے میں دل میں کچھ ڈر ایک نہ شد دو شد۔ شاید یہاں پر بے مقصد کھڑے ہونے پر ہی باز پرس کرلیں۔ لیکن ہوا یہ کہ انھوں نے مجھ سے پوچھا "افضل تم ڈیفر ہو گئے ہو نا۔" میں نے کہا جی ہاں۔ ڈیفر ہی ہوا ہوں۔ بولے "ڈیفرمنٹ کا مطلب سمجھتے ہو؟" میں نے کہا جی ہاں نہ Selection نہ Rejection۔ بولے یہ بات نہیں۔ ڈیفرمنٹ ہمیشہ پلس سائڈ پر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے بڑی حد تک ہاں لیکن فیصلہ ابھی نہیں۔ صورت حال تمہارے حق میں ہے۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا افضل کی درخواست نہ بھیجو۔ ابھی یہ کچا ہے۔ انشاء اللہ اگلے کورس میں، تم یقینی طور پر سیلیکٹ ہو جاؤ گے۔ زیادہ وقت لائبریری میں گزارا کرو۔ ابراہیم صاحب

---

[1] کالج نمبر ۱۸۲۱ جنرل مینیجر مارکٹنگ پیکو، زمانہ تعلیم ۱۹۴۸ تا ۱۹۵۴ء

[2] کالج نمبر ۱۸۳۲ زمانہ تعلیم ۱۹۴۸ تا ۱۹۵۴ء

کو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ انہوں نے جس طرح مجھے حوصلہ دیا اس سے مایوسی کا جالا کٹ گیا۔ امید کا دریچہ کھلا تو اس میں روشنی بھی آئی اور تازہ ہوا بھی۔

اقبال صاحب

——— لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال[1]

اقبال صاحب اصل میں تو سوکس کے استاد تھے لیکن وہ ہمیں جنرل نالج کا اضافی مضمون بھی پڑھاتے تھے۔ بلکہ اس پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ اس کا احساس بہت بعد کو ہوا کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ کلاس میں آتے ہی گذشتہ روز کی اخباروں کی خبروں کے حوالے سے پہلے دو ایک سوال کرنٹ افیئرز کے بارے میں کرتے تھے جن کے جواب کے لیے ہمیں ہر روز سول اینڈ ملٹری گزٹ یا پاکستان ٹائمز دیکھنا پڑتا تھا۔ یہ واقعہ ۴۹ ۱۹ء کے اوائل کا ہے کہ اقبال صاحب نے کلاس میں آتے ہی خلاف معمول بجائے ہم سے کچھ پوچھنے کے خود ہی بورڈ پر لکھا Pakistan Devalues the Rupee اور کہا یہ کل کے پاکستان ٹائمز کی خبر ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ مجھے یاد ہے پہلے انہوں نے ۱۴۴۷ سجاد سے پوچھا تھا۔ ۱۳۲۶ امین، ۱۳۰۹ عشرت وغیرہ سے پوچھتے پوچھتے میری باری بھی آئی۔ چونکہ یہ لفظ بالکل نیا تھا۔ اس لیے پہلا مسئلہ تو اس کو صحیح طور پر ادا کرنے کا تھا اور سمجھنے کا ہم لوگ اس وقت نویں میں تھے۔ معاشیات کے اس Concept کو کیا سمجھتے۔ بہرحال مختصر یہ کہ پہلے تو انہوں نے اس لفظ کی تشریح کی یہ Value سے خلاف Value سے Valuation اور پھر Devalue کرنے کو Devaluation کہتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے کرنسی، اور کرنسیوں کے بین الاقوامی تبادلے (Foreign Exchange) وغیرہ کے Concepts پر تفصیل سے مثالوں کے ذریعہ بحث کی تاآنکہ گھنٹہ ختم ہوگیا۔ جاتے ہوئے حکم دیتے گئے کہ کلاس آخری پیریڈ کے بعد انتظار کرے۔ میں آؤں گا چنانچہ کلاس کے بعد وہ آئے اور بحث کو جاری رکھا۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے Inflation کے Concept کی بھی وضاحت

---

[1] کالج نمبر ۱۳۲۳، زمانہ تعلیم ۴۴ ۱۹ تا ۱۹۵۱، صدر عالمگیرینز ایسوسی ایشن۔

کی مجھے یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے ۱۹۳۰ء کے عالمی کساد بازاری (Depression) کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ جب یہ ساری بحث ہو چکی تو انہوں نے کہا اب آپ کرنسی کے Devaluation اور Inflation کے موضوع پر ایک مختصر پیپر کلاس کے سامنے پڑھنے اور لڑکوں کے سوالات کا جواب دینے کے لیے تیار رہیں۔ میں جس سے چاہوں پوچھ لوں گا۔ یہ ان کے پڑھانے کی Sweep اور Depth تھی۔

——— بریگیڈیئر محمد اشرف[1]

بہت ہی Pleasant personality تھی مسٹر اقبال کی اور Graceful بھی۔ بظاہر تو شہریت (Civics) اور جنرل نالج پڑھاتے تھے لیکن کتاب سے بہت آگے جا کر پڑھاتے تھے۔ Current Affairs پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ انہوں نے ہمیں بھی مبصّر بنا دیا تھا۔

وہ استاد کی نظر رکھتے تھے۔ جب میں نے کمیشن کے لیے درخواست دی تو خوش نہیں ہوئے کہنے لگے دوسروں کو میں جلد سے جلد درخواست دینے کے لیے کہتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ تم آرمی میں نہ جاؤ، عدلیہ کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں نے عذر پیش کیا۔ میرے گھر کے حالات ایسے نہیں کہ مزید چار یا پانچ برس پڑھوں اور وکیل بننے کے بعد کامیاب ہونے کے لیے پانچ دس برس کا انتظار کروں۔ گھر پر والدین میرے کمیشن ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ فرمایا تمہاری تعلیم کے اخراجات تو میں اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔

یہ واقعہ ۱۹۴۹ء کا ہے۔ بیس برس کے بعد ۱۹۶۹ء میں ایک کورٹ مارشل میں جب ایک آفیسر کو Defend کرنے کا موقع مجھے ملا تو ایک ایسا کیس جس میں سخت ترین سزا سب کو یقینی نظر آ رہی تھی میں سنبھال سکا۔ تو مجھے بیس سال پہلے کی اقبال صاحب کی بات یاد آ گئی۔

۱۹۷۷ء کے بحران (Crisis) سمیت بہت سے مرحلوں سے گزرا ہوں۔ اب کاروبار کر رہا ہوں۔ دنیا جہان میں گھوما پھرا ہوں۔ میرا یہ یقین پختہ سے پختہ تر ہو گیا ہے۔ اچھی تعلیم اور اچھے استاد ملک کی پہلی ضرورت ہیں!

---

[1] کالج نمبر ۱۴۲۷ زمانہ تعلیم ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۹ء

——— بشیر احمد مرزا [1]

ایک بار مسٹر اقبال جنرل نالج پڑھا رہے تھے۔ پوچھا M.E.D.O کیا ہے؟ لطیف بول پڑا۔ سر یہ ایک جنرل کا نام ہے۔ وہ مسکرائے اور اس کی جہالت کو باتوں میں ٹال دیا۔ اقبال صاحب کا طریقہ تھا کہ پہلے کوئی لائٹ موڈ کی بات کرتے تھے پھر سیریس ڈسکشن شروع کرتے تھے۔

——— محمد اعظم خان [2]

اقبال صاحب دہرہ دون کے پبلک سکول پرنس آف ویلز سے یہاں آئے تھے۔ غالباً وہیں کا مخصوص لباس، خاکی شارٹس، خاکی سٹاکنگز، سفید قمیض، سیاہ ٹائی اور خاکی کوٹ اور سولا ہیٹ مستقل طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ لباس ان کی علامت بن چکا تھا۔ ہاں ایک اور نشانی بھی تھی کہ اس زمانہ کا مقبول عام مڈل کلاس سگریٹ پاسنگ شو پیتے تھے۔ کلاس میں آتے ہوئے سگریٹ بجھا کر پھر ڈبیہ میں رکھ لیتے۔

جولائی ۱۹۵۲ء میں مصر میں شاہ فاروق کا تختہ الٹ کر مرحوم صدر ناصر برسر اقتدار آئے تھے۔ اقبال صاحب پرو ناصر تھے اور انقلاب مصر کو مشرق وسطیٰ میں بڑی دور رس سیاسی تبدیلیوں کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔ یہ ان کے پڑھانے کا اعجاز تھا کہ ہم لوگ قومی اور بین الاقوامی معاملات پر کھل کر بحث کر سکتے تھے۔ اوائل ۱۹۵۳ء میں امریکی سفیر نے کالج کو وزٹ کیا تھا۔ ان کے آنے سے پہلے پاکستان ٹائمز میں مظہر علی خان کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں کوریا اور مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسیوں پر تنقید کی گئی تھی۔ جب سفیر صاحب ہماری آرمی کلاس میں آئے تو غالباً قصداً اقبال صاحب نے ایک سوال مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسی پر کیا۔ اب کیا تھا۔ اشرف اور رحیم وغیرہ کئی لڑکوں نے امریکی پالیسی کے خوب پرزے اڑائے۔ امریکی سفیر منہ لٹکائے ہوئے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد اقبال صاحب نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا تم لوگ کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئے۔ معزز مہمان کا کچھ تو خیال رکھنا تھا۔

---

[1] کالج نمبر ۱۵۱۸، زمانہ تعلیم ۵۴-۱۹۴۵ء

[2] کالج نمبر ۱۵۲۰ زمانہ تعلیم ۱۹۴۶ تا ۱۹۵۴ء

——— لیفٹیننٹ جنرل محمد صفدر[1]

مسٹر اقبال نے شروع کے چند ماہ تو سوکس کی کتاب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ ہر روز نیشنل یا انٹرنیشنل اہمیت کی کسی تازہ خبر سے لیکچر شروع کرتے اور بیچ بیچ میں سوالات پوچھتے جاتے۔ شروع میں تو اکثر سب کا Response خاموشی ہوتا۔ پھر وہ خود ہی بتاتے کہ یہ خبر پاکستان ٹائمز کی ہے۔ یہ سی اینڈ ایم جی کی ہے اور یہ ڈان میں چھپی ہے۔ السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں یہ آیا ہے۔ ٹائم یہ کہتا ہے۔ بی بی سی کی خبر یہ ہے۔ اس زمانہ میں لیاقت علی خاں کا دورۂ امریکہ ہوا تھا۔ اس کے مضمرات، کوریا کی جنگ مشرق وسطیٰ ۱۹۴۸ء کی عرب اسرائیل وار کا پس منظر اور متوقع اثرات وغیرہ بے شمار موضوعات تھے جنھوں نے ہمیں باہر کی طرف دیکھنے۔ سوچنے اور تجزیہ کرنے کی لاشعوری طور پر ترغیب دی۔ ان کا پڑھانے کا انداز Intimate اور Personal تھا مثلاً کبھی کسی کیڈٹ آفیسر کی سٹک ہاتھ میں لے کر گھماتے، کبھی میز پر بیٹھ گئے۔ کبھی کوئی مزاحیہ فقرہ چست کر دیا یوں ان کی کلاس کی فضا کبھی بوجھل محسوس نہیں ہوئی۔

ان کی کاوشوں سے آہستہ آہستہ ہم بھی کتاب سے باہر کے افق پر نظر دوڑانے لگے۔ کالج کے موجودہ کیفیٹیریا کے سامنے ایک کچے ہٹ میں ریڈنگ روم تھا۔ اس کے برآمدہ میں دو سٹینڈ تھے ایک پر پاکستان ٹائمز دوسرے پر سی اینڈ ایم جی لگا ہوتا تھا۔ اخباروں کی سرخیاں پڑھتے پڑھتے رسالوں اور لائبریریوں کی کتابوں تک پہنچا۔ ۱۹۵۱ء میں، میں برڈووڈ ہاؤس میں تھا۔ میری عادت تھی کہ میں اتوار کے دن ناشتہ کے فوراً بعد کوئی کتاب لے کر پول کے سہارے ہاؤس کی چھت پر پہنچ جاتا اور جب تک کوئی قیامت نہ آجائے نہ اترتا۔ ایک اتوار کو میں جنرل آئزن ہاور کی کتاب The War As I Knew It لے کر اسی طرح ہاؤس کی چھت پر چلا گیا۔ کوئی دس بجے کے قریب لائبریرین مسٹر سرور مجھے ڈھونڈتے ڈھانڈتے ہاؤس میں پہنچ گئے اور ہاؤس کے کورٹ یارڈ میں کھڑے ہو کر ۱۵۲۷ زور زور سے پکارنے لگے۔ (اس زمانہ میں ناموں سے نہیں نمبروں سے بلایا جاتا تھا) پہلے تو میں نے سنی ان سنی کر دی لیکن

---

[1] کالج نمبر ۱۵۲۷۔ زمانہ تعلیم ۱۹۴۹۔۵۱ء

جب یہ یقین ہوگیا کہ یہ آواز مسٹر سرور ہی کی ہے اور آوازیں کچھ قیامت کے آثار بھی ہیں تو ہیں سامنے آیا۔ تو بولے ۲۷۵، وہاں آسمان پر کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ جلدی سے کتاب واپس کر دیں گھنٹہ بھر سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ کمانڈانٹ صاحب کا ارجنٹ پیغام ہے کہ آئزن ہاور کی کتاب بھیجو۔

یہ کتاب کمانڈانٹ کرنل زیدی کو غالباً سٹاف کالج کے امتحان کے سلسلہ میں درکار تھی۔ یہ مسٹر سرور کی مہربانی تھی کہ انہوں نے کمانڈانٹ کی خاص طور سے منگوائی ہوئی کتابوں میں سے ایک کتاب مجھے دے دی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد جب میں جے ایس پی سی ٹی ایس کوئٹہ میں گیا تو وہاں کی ڈیبیٹنگ سوسائٹی کی سکریٹری شپ کے لیے جو تقریری مقابلہ ہوا اس میں میں نے اسی کتاب کو بنیاد بنا کر تقریر کر ڈالی اور سرخ رو ہوا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس تقریر میں میں نے لیڈر شپ پر وہ باتیں کہیں جن کے مضمرات اس وقت پوری طرح مجھ پر واضح نہیں تھے۔ لیکن ذہن میں وہ باتیں پڑی رہیں اور آگے چل کر کام آئیں۔

مسٹر اقبال کی نظر تعلیم کے دور رس اور حقیقی مقاصد پر تھی انہوں نے ہمارے ذہنوں کے دریچے کھولے۔ مطالعہ کی عادت ہی نہیں ڈلوائی مطالعہ کا ذوق بھی پیدا کیا۔ تفکر اور تدبر کی ضرورت اور اہمیت سے آشنا کیا اور اس کی Exercises بھی کروائیں۔

میرے کیریئر کی بنیادیں ملٹری کالج میں رکھی گئیں اور مسٹر اقبال ان معماروں میں ماسٹر بلڈر تھے۔

تعلیمی اداروں میں Living conditions اور Working conditions کی بہتری کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر طرح کے وسائل اور سہولتوں (Facilities) کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اصل چیز Quality ہے جس کا انحصار بڑی حد تک اساتذہ کے Calibre اور Commitment پر ہوتا ہے۔

——— محمد زمان بھٹی[1]

پہلی انفرادیت تو ان کے لباس میں تھی۔ غالباً وہ تنہا استاد تھے جو گرمیوں میں بھی ٹائی

---

[1] کالج نمبر ۱۵۵۹ وکیل سپریم کورٹ، کالج میں زمانہ تعلیم ۱۹۴۷ تا ۱۹۵۱ء

اور کوٹ میں آتے تھے۔ کبھی کبھی خاکی رنگ کا ہی سولا ہیٹ بھی پہنتے تھے۔ لباس سے وہ پرانے زمانے کے سول سرونٹ نظر آتے تھے۔ پڑھانے کا سٹائل بھی منفرد تھا۔ کلاس میں آکر کسی کیڈٹ آفیسر سے اس کا کیپ لیتے اور اسے دونوں ہاتھوں سے اپنے کندھوں کے متوازی پکڑ کر بڑے فلسفیانہ انداز سے لیکچر شروع کرتے۔ جنرل نالج کے استاد تھے۔ اس لیے حالات حاضرہ اکثر زیر بحث رہتے۔ ایک روز کلاس میں آتے ہی پوچھا آپ لوگوں نے کل کے اخبار میں گاندھی جی کے بارے میں خبر پڑھی اس نے دہلی سے وارد ھا میں اپنے آشرم تک ریل کے تیسرے درجہ میں ہریجنوں یعنی اچھوتوں کے ساتھ سفر کیا۔ ہم گاندھی کو گاندھی جی نہیں مسٹر گاندھی کہتے ہیں لیکن وہ بڑا آدمی ہے اس کی نظر ہندوستان کے مستقبل پر ہے۔ قومیں اپنے لیڈروں سے بنتی ہیں۔ اچھا لیڈر وہی ہوتا ہے جو مستقبل پر نظر رکھتا ہے اور اس کی طرف لیڈ کرتا ہے۔ ہاں مجھے یاد آیا اسی موقع پر انہوں نے گاندھی کی ان سرگرمیوں کا ذکر بھی کیا تھا جو انہوں نے جنوبی افریقہ میں کالوں کے حقوق کے لیے کی تھیں۔ جب ہماری انٹری ایف ایس سی میں یعنی فرسٹ ائیر میں پہنچی اور مسٹر اقبال اسی نئی کلاس میں پہلی بار آئے تو انہوں نے پڑھانے کی نئی تکنیک استعمال کی اور کلاس سے مخاطب ہوکر کہا پاکستان یا اس کے کسی صوبہ کے بارے میں آپ کے ذہن میں کوئی سوال ہے تو پوچھیئے۔ بغیر کسی تردّد کے میں کھڑا ہوگیا اور یہ سوال کیا:

What are the potentialities of NWFP ?

میرا سوال سن کے ساری کلاس تو ہنس پڑی لیکن اقبال صاحب سنجیدہ ہو گئے اور کہا یہ بہت اہم سوال ہے۔ پاکستان کے مستقبل سے اس کا گہرا تعلق ہے اس کے جواب میں انہوں نے دو دن صرف کئے اور صوبہ سرحد کے ہر قسم کے وسائل (Resources) یعنی افرادی قوت، پانی، بجلی، معدنیات، صنعت، تجارت کا تذکرہ کیا اور ان کی امکانی ترقی اور اس کے نتائج پر سیر حاصل بحث کی۔ میں بے خیالی میں Potentialities کا لفظ استعمال کر گیا تھا۔ یہ اس کی وجہ سے ہوا۔ معلومات عامہ اور حالات حاضرہ پر اس طرح مسٹر اقبال کے مسلسل تبصرہ کرتے رہنے سے کیڈٹس کے آؤٹ لک میں بڑی وسعت پیدا ہوئی۔ ورنہ دن رات کی لفٹ رائٹ نے دماغوں کو بالکل ہی کند کر رکھا تھا۔ اب میں دو ایک واقعات بیان

کر کے یہ بتاؤں گا کہ وہ آدمی کیسے تھے - اوائل ۱۹۵۰ء میں بمبئی کے ڈفرن کالج میں داخلہ کے لیے سیلکٹ ہو گیا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ وہاں جاؤں مگر وسائل نہ تھے۔ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کیا کروں کہ مسٹر اقبال سے مشورہ کرنے کا خیال آیا۔ وہ بر ڈووڈ ہاؤس میں میرے ہاؤس ماسٹر تھے۔ عام طور پر سٹاف کوارٹرز پر لڑکے نہیں جاتے تھے۔ بہر حال میں نے ہمت کی اور دروازہ پر دستک دی۔ جمعہ کا دن تھا میرے چہرے پر پریشانی پڑھ کر انہوں نے مجھے اندر بلا لیا ان کی دوسری بیگم سے ان کا اپنا بیٹا آفتاب ابھی بہت چھوٹا تھا۔ ایک اور بچہ جسے انہوں نے میرا تعارف ان سے کرایا اور ان سے کہا حلوہ لے آئیں سرور کے ساتھ کھائیں گے۔ وہ وقت ان کے ناشتہ کا تھا۔ انہوں نے اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ ناشتہ کرایا۔ اور میری پلیٹ میں اتنی بار حلوہ ڈالا کہ بس رج گیا۔ پھر پوچھا کیا مسئلہ ہے؟ میں نے صورت حال سے آگاہ کیا بولے گھبراؤ نہیں۔ پیسہ کا انتظام ہو جائے گا۔ تم اپنا حوصلہ بلند رکھو اور ہوا بھی یہی کہ کمانڈانٹ کرنل زیدی سے انہوں نے ذکر کیا اور انہوں نے بہ کمال مہربانی ڈفرن کالج میں میرے پہلے چھ ماہ کے اخراجات اٹھانے کی حامی بھر لی۔ یہ اور بات ہے کہ ملکی حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ پھر میرا وہاں جانا ممکن نہ رہا۔ لیکن آج تک مسٹر اقبال اور کرنل زیدی کا ممنون ہوں۔

_____ کرنل محمد یونس[1]

مجھے تو اقبال صاحب کی Youthfulness یاد آتی ہے۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں اقبال صاحب Fifties میں ہوں گے بال گرے ہونے لگے تھے۔ لیکن آنکھوں کی چمک یہ چہرہ کی Youthful بلکہ شریر مسکراہٹ بھی ان کی شخصیت کا جزو تھی۔ نوجوانوں کی نفسیات کو خوب سمجھتے تھے اور اس کو ملحوظ رکھ کر بات کرتے تھے۔ ایک روز نامعلوم کیسے کالج کے پیچھے سائفن کی طرف کے کھیتوں کے رومانی ایڈونچرز کا تذکرہ بھی آ گیا ان کی آنکھوں میں ایک بار وہ تیز چمک پیدا ہوئی۔ ہونٹوں کے کنارے تھوڑے سے پھڑکے اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ذرا خیال رکھنا خربوزوں کا شوق اپنی جگہ لیکن ادھر دلدل بھی ہو سکتی ہے" کوئی سمجھا کوئی نہیں سمجھا۔ قہقہہ زوردار پڑا۔ اب سوچتا ہوں تو ایک بار اقبال صاحب کی عظمت کو سلام کرنے کو جی

---

[1] کالج نمبر ۱۶۰۶ زمانہ ۱۹۴۷ء، ۱۹۵۱ء

چاہتا ہے۔ کس خوبصورتی سے گرم خون سے کہنے کی بات کہہ گئے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین[1]

۱۹۵۴ء کے شروع میں جب سی کیو ایم ایس پروموٹ ہو کر میں بریڈوڈ ہاؤس گیا تو آرمی سپیشل کلیئر کر چکا تھا اور مسٹر اقبال کی آرمی کلاس میں آگیا تھا۔ اقبال صاحب ہی بریڈوڈ ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا، اختر! تم ہر روز آٹھ بجے رات کی انگریزی خبریں سنا کرو اور ان کا خلاصہ لکھا کرو پھر لائٹس آؤٹ کے وقت مجھے زبانی سنایا کرو۔ یہ سلسلہ کئی مہینے تک چلا اور اس سے نہ صرف انگریزی اور جنرل نالج بہتر ہوئی بلکہ میرے اندر جو بولنے کی جھجک تھی وہ دور ہو گئی اس کے علاوہ بھی میری حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ دیکھو عمر حیات سیلکٹ ہو گیا، قربان سیلکٹ ہو گیا اب تمہاری بات ہے۔ انہوں نے مجھے میرے سیلکٹ ہو جانے کا اتنی بار یقین دلایا تھا کہ خود مجھے یقین آگیا تھا کہ میں سیلکٹ ہو جاؤں گا اور ہوا بھی۔ یہ بڑی حد تک مسٹر اقبال صاحب کی ذاتی توجہ کا نتیجہ تھا کہ کالج کا باکسر اور "مولوی" اس میدان میں بھی کامیاب رہا۔ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کس طرح ہر روز وہ لائٹس آؤٹ کے وقت اپنے کوارٹر سے باہر آکر مجھ سے خبریں سنتے تھے اور ان پر کبھی کبھی تبصرہ بھی کرتے تھے۔ وقت کی اتنی پابندی سے تو ہمارے لیے نماز پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اپنے بچوں کو بھی ہر روز اتنا وقت دے سکنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

——— محمد لطیف ڈی۔ ایس۔ پی[2]

۲۶ فروری ۱۹۴۸ء کو کالج کی نوزائیدہ ڈیبیٹنگ سوسائٹی کے تحت ایک انگریزی مباحثہ ہوا تھا جس کا عنوان تھا:

Constitution of Pakistan to be based on Shariat Law

موضوع کی موافقت اور مخالفت میں بڑی زوردار تقریریں ہوئیں۔ آخر کار ایوان نے قرارداد کے حق میں ووٹ دیا۔ یہ اس سال کا اس وقت تک سب سے بڑا فنکشن تھا۔ اس موقع پر کمانڈر انچیف جنرل گریسی، ڈی ایم ٹی بریگیڈیئر جیراڈ اور جی ایس او ون ایجوکیشن آرمی

---

[1] کالج نمبر ۱۶۲۳ زمانہ تعلیم ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۴ء [2] کالج نمبر ۱۶۸۶ زمانہ تعلیم ۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۴ء

کرنل جعفری بھی موجود تھے۔ یہ تقریریں مسٹر اقبال ہی کی تیار کرائی ہوئی تھیں۔ داد دیجئے ان کے وژن کی کہ وہ ان خطوط پر سوچ رہے تھے کہ پاکستان آئین ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد اس مباحثہ سے ایک سال بعد (مارچ ۱۹۴۹ء) میں پاس کی تھی۔

——— بریگیڈیئر سلطان احمد ستارۂ جرأت دوبار

اقبال صاحب بہت ہی دوستانہ ماحول میں کرنٹ افیئرز پڑھاتے تھے۔ آرمی کلاس کالج کے مین بلاک کے آخری کمرہ میں ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر ہم لوگ پچھلے لان میں کرسیاں نکال کر بیٹھا کرتے تھے۔ بغیر کسی Inhibition کے Free lancer مبصروں کی طرح بحث ہوتی تھی۔ ۱۹۵۱ء میں وزیر اعظم لیاقت علی کے روس یا امریکہ جانے کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ (ان کو روس نے پہلے دعوت دی تھی) مجھے یاد ہے کہ جب ان سے پوچھا گیا "سر آپ بھی اپنی رائے دیں" تو انہوں نے ایک فقرہ

It's better to deal with the devil you know rather than the one you do not know.

اس سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ امریکہ کی وزٹ کے حق میں ہیں۔ پھر انہوں نے اس کے حق میں اپنے دلائل بھی دیئے۔ ان کی ایک بڑی دلچسپ عادت یہ تھی کہ اگر ہم ان سے فوراً اتفاق کر لیتے تو وہ اپنی پہلی رائے کے خلاف بولنے لگتے۔ ایک بار ہم نے شکایت کی کہ سر یہ کیا قصہ ہے آپ دونوں طرف سے بولتے ہیں۔ فرمایا ہمارے لیے یہ مسائل اکیڈمک ڈسکشن کی حیثیت رکھتے ہیں ہر مسئلہ کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ میں تو اکھاڑے کے بوڑھے پہلوان کی طرح تمہیں زور کراتا ہوں تاکہ تمہاری Wits شارپ ہوں۔

——— علی اختر

آٹھویں انگریزی کی کلاس تھی۔ اقبال صاحب نے ایک روز آتے ہی کہا ترجمہ کرو:
ریں کھا گئی نوجوان کیسے کیسے

آٹھویں کے لڑکے اس کا ترجمہ کیا کرتے۔ ہمیں چکراتے دیکھ کر ہنس کر بولے۔ دیکھو میں ترجمہ کرتا ہوں۔

۱؎ کالج نمبر ۲، ۵، ۱۸، ۱، زمانہ تعلیم ۵۵ - ۱۹۴۸ء

Earth ate up young men how how زمیں کھاگئی نوجوان کیسے کیسے
لڑکوں نے خوب انجوائے کیا تو انہوں نے اپنی اصل بات شروع کی کہ ہر زبان کا اپنا محاورہ (Idiom) ہوتا ہے۔ اس کے مطابق ترجمہ کرتے ہیں۔

اس زمانہ میں ایک پیریڈ اور اگلے پیریڈ کے درمیان پانچ منٹ کا وقفہ ہوتا تھا۔ اقبال صاحب اس وقفے میں اکثر سگریٹ سلگا لیا کرتے تھے جو وہ کلاس میں داخل ہوتے ہوئے بجھا کر اپنے خاکی کوٹ کی جیب میں ڈال لیتے۔ چونکہ وہ خود ہر روز کسی نہ کسی لائٹ بات سے سبق شروع کرتے تھے ایک روز لڑکوں نے لبرٹی لی۔ جوں ہی انہوں نے آدھا سگریٹ بجھا کر اپنی جیب میں ڈالا۔ دو لڑکوں نے شور کر دیا "سر، فائر فائر" اقبال صاحب چونکے :

Where, where is the fire? - لڑکوں نے جواب دیا۔

In your pocket, Sir. - اقبال صاحب نے تھینک یو ویری مچ کہا اور مسکرا دیئے۔ اقبال صاحب غالباً وہ تنہا استاد تھے جن سے لڑکے عام معنوں میں ڈرتے نہیں تھے۔

——— میجر جنرل رحمدل بھٹی[1]

اگست ۱۹۴۹ء میں جب میں ملٹری کالج میں داخل ہوا اور برڈ ووڈ ہاؤس رہنے کو ملا۔ گھر کے آنگن کے پر تحفظ ماحول کو چھوڑنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ جگہ بھی نئی لوگ بھی اجنبی، اس وقت جس ذہنی کیفیت سے میں دوچار ہوا ہوں گا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ انتہائی بے یقینی اور موہوم اندیشوں کی یلغار نے مجھے انتہائی بے چین کر رکھا تھا کہ سیٹی بجی کہ سب نئے لڑکے کورٹ یارڈ میں جمع ہو جائیں۔ جب ہم سب جمع ہو گئے تو ادھیڑ عمر کے سیاہ ٹائی اور خاکی کوٹ پہنے اور خاکی ہیٹ لگائے ایک صاحب نے بیشتر انگریزی میں اور کچھ اردو میں باتیں کیں۔ باتیں تو میں کچھ سمجھا اور کچھ نہیں لیکن ان کا لب و لہجہ اور انداز ایسا تھا جس سے میرا احساس تنہائی اور بے بسی بڑی حد تک کم ہو گیا۔ یہ مسٹر اقبال تھے۔ برڈ ووڈ ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ان پر اعتماد بڑھتا گیا۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اجنبیت کا احساس بالکل ختم ہو گیا اور تعلق کا احساس بڑھنے لگا۔ یہ سب کچھ بڑی حد

---

[1] کالج نمبر ۱۸۶۲، زمانہ تعلیم ۵۵-۱۹۴۹ء

تک مسٹر اقبال کی وجہ سے ہوا۔ ایک پبلک سکول طرز کے ادارہ میں ہاؤس ماسٹر کا کام ہمہ وقتی اور رول ہمہ جہتی ہوتا ہے۔ اقبال صاحب نے اس ذمہ داری کو اس احسن طریقے سے نبھایا کہ آج بھی میں انہیں اپنے ایک معیار کے طور پر یاد کر رہا ہوں۔ کالج میں آنے سے پہلے وہ انڈیا کے ایک چوٹی کے پبلک سکول میں استاد تھے۔ یہ ہماری خوش بختی تھی کہ اس قابلیت اور تجربے کا آدمی ہمیں ملا۔

اقبال صاحب جنرل نالج اور انگریزی پڑھاتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع اور گہرا تھا۔ ان کا اپنے شاگردوں پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں پڑھنے کی عادت ڈلوادی۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ، پاکستان ٹائمز تو ہر روز پڑھتے تھے۔ السٹریٹڈ ویکلی، ریڈرز ڈائجسٹ، ٹائم اینڈ ٹائڈ، ٹائم لائف وغیرہ رسالوں اور میگزینوں کی ورق گردانی کرتے رہتے تھے۔ ان کے علاوہ انگریزی کے کلاسیکی ناول نگاروں ڈکنس، ہارڈی، ڈبلو مائز، ٹالسٹائی کا مطالعہ انھوں نے شروع کرایا۔ اخبار رسالے اور کتابیں پڑھنے کا جو فائدہ تھا وہ تو تھا ہی۔ اصل فائدہ اس تبصرہ اور بحث سے ہوتا تھا جو اقبال صاحب اخبار کے اداریوں، رسالوں کے مضامین اور کتابوں پر کرتے تھے۔

کالج کی تاریخ میں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۷ء تک کا عشرہ اس لحاظ سے یادگار رہے گا کہ اس زمانہ میں برصغیر کی ممتاز یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل بہت سے اعلیٰ دماغ یہاں جمع ہو گئے تھے۔ ان کا علم اور تجربہ بہت ہی وسیع تھا۔ Commitment بھی مثالی تھا مسٹر اقبال ان میں سے ایک تھے اور ایک خاص انفرادیت رکھتے تھے۔

——— واجد علی

اقبال صاحب کی جو تصویر اب اس وقت میری آنکھوں کے سامنے آ رہی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی پتلی سی سیاہ ٹائی ہوا سے اڑ کر ان کے بائیں کندھے پر پڑی ہے۔ ایک ہاتھ شارٹس کی جیب میں ہے اور وہ انگریزی میں رواں ہیں۔ ان کا پڑھایا ہوا شیر مادر تھا جو فوراً حلق سے نیچے اتر جاتا تھا۔ ان کے پڑھانے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہر ایک ٹاپک پر لڑکوں کی اپنی رائے

---

[1] کالج نمبر ۱۸۹۱، زمانہ تعلیم ۵۵-۱۹۴۸ء

بھی پوچھتے تھے۔ کبھی کبھی کلاس میں سخت بحث چھڑ جاتی اور وہ ہمارا امتحان اس طرح لیتے کہ ایک سانس میں موضوع کی حمایت میں بولتے دوسری سانس میں وکیل مخالف کا رول ادا کرتے ایک بار لڑکوں نے پوچھا سر آپ کی اصل رائے کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔ میری اپنی رائے میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں یہاں آپ کو اپنی رائے یا اپنے خیالات دینے نہیں آیا۔ آپ کو رائے قائم کرنے کے قابل بنانے آیا ہوں میں تو ٹینس کا مارکر ہوں۔ آپ کو کھلا رہا ہوں۔ کھیلنا آپ سیکھ رہے ہیں میں نہیں۔ اللہ اکبر کیا استاد تھے کیا وژن (Vision) تھا۔

—— میجر راؤ عبد القادر[۱]

مئی ۵۸ء میں اقبال صاحب ریٹائر ہوئے تھے۔ کالج میں جو سٹینڈ آف ان کو دیا گیا تھا وہ تو دیا ہی گیا تھا جب ان کی گاڑی تیز گام کالج کے سامنے کی پلے گراؤنڈ کے پاس سے گزری تو پٹڑی کے دائیں طرف نکلنے سے کالونی تک سارے لڑکے ان کو Wave کر رہے تھے۔ اور وہ بھی ہاروں میں لدے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑے لڑکوں کو Wave کر رہے تھے۔ بڑا جذباتی منظر تھا وہ سینئر لڑکے جن کو وہ پڑھاتے رہے تھے وہ بہت اداس تھے۔ دیر سویر بچھڑنا تو سب کو ہوتا ہے وہ لوگ کتنے اچھے ہوتے ہیں جو بچھڑنے کے ایک عرصہ بعد بھی بار بار یاد آئیں۔

مسٹر حمید

—— محمد اعظم خان[۲]

پارٹیشن کے وقت کے مسلم کش فسادات کے واقعات اکثر سناتے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ بس کپور تھلہ ان کی کمزوری تھی۔ موڈ میں ہوتے تو کپور تھلے کے مہاراجہ کے بارے میں اکثر بتاتے کہ کس طرح اس نے کپور تھلے کو انڈیا کا پیرس بنا دیا تھا۔ اور کپور تھلے کی مسجد ترکی کی مشہور مسجد کے نمونے پر بنوائی تھی وغیرہ وغیرہ۔ لیکچر دیتے وقت پتلون کی دائیں جیب میں ہاتھ ڈالے رہتے تھے۔ ان کا تعلق ایک علمی خانوادے سے تھا۔ مسٹر تاج محمد خیال وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی ان کے چچا زاد بھائی تھے۔ ہمیں غالباً راشد صاحب نے بتایا تھا کہ کپور تھلہ میں وہ کرنل رفیق کے

---

[۱] کالج نمبر ۲۳۳۰، زمانہ تعلیم ۶۱-۱۹۵۶ء [۲] مینجر پی۔ٹی۔سی کالج میں زمانہ تعلیم ۵۷-۱۹۵۴ء، کالج نمبر ۱۵۲۰

استاد بھی رہے تھے لیکن خود انہوں نے کبھی اس امر کا ذکر نہیں کیا۔

——— خالد اسماعیل قاضی[1]

مسٹر حمید کا تعلق ریاست کپور تھلہ سے تھا۔ اور یہاں آنے سے پہلے کے جی آر ملٹری کالج جالندھر میں پڑھاتے تھے۔ وہیں سے اگست ۴۷ء میں مسلمان طلباء کے قافلے کو لے کر یہاں آئے تھے اور آتے وقت کے جی آر جالندھر کی مسجد کے قالین اور مسجد کی لائبریری کی کتابیں بڑی کوشش کر کے اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ سامان ایک عرصہ تک یہاں کی مسجد میں استعمال ہوتا رہا۔ تاریخ پڑھاتے ہوئے وہ بڑی بڑی مستند شخصیتوں پر بھی تنقید کرنے سے نہیں جھجکتے تھے۔ اس سے کم از کم مجھے یہ احساس ہوا کہ تاریخی مطالعہ میں ذہن کو کھلا رکھنا چاہیے۔

انہوں نے تاریخ اور جغرافیے کی بے شمار درسی کتابیں لکھی تھیں جو غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کی تھیں۔ میں نے ان کی لکھی ہوئی ایک کتاب بعنوان ملکہ ہند، رضیہ سلطانہ شیر شاہ ہاؤس کی لائبریری میں دیکھی تھی۔

——— شاھد احمد بھلہ[2]

عبدالحمید قریشی صاحب شیر شاہ ہاؤس کے پاکٹ منی انچارج تھے۔ ہمیں تو ان کی یہ بات پسند تھی کہ آندھی جائے مینہ جائے۔ ہفتہ کی شام کو (اس زمانہ میں ہفتہ وار چھٹی اتوار کو ہوتی تھی) عبادت کی سی پابندی کے ساتھ پاکٹ منی تقسیم کرنے ضرور آتے تھے۔ اب خود سول سروس میں آکر اندازہ ہوا کہ کام کو عبادت سمجھنا کتنی بڑی بات ہے۔

قدوس صاحب اکاؤنٹنٹ

——— میجر عبدالرشید اے۔ای۔سی[3]

وسطی ہند کی اراولی ہلز میں ایک صحت افزا مقام ہے ماؤنٹ آبو، وہاں ایک پبلک سکول تھا۔ اپنے قبلہ سید عبدالقدوس صاحب وہیں سے پاکستان کے لیے آپٹ کر کے آئے

---

[1] کالج نمبر ۲۸۴۲ [2] پی۔سی ایس زمانہ تعلیم ۷۲-۱۹۶۷ء

[3] سابق استاد ملٹری کالج جہلم

تھے۔ پھر یہیں سے ۱۹۷۴ء میں ریٹائر ہوئے۔ اجمیر کی درگاہ سے روحانی تعلق تھا۔ خود بھی سید زادے تھے۔ اپنے روحانی تصرفات کا کبھی ذکر نہیں کیا لیکن چھپے ولی تھے۔ خلق اللہ کی خدمت ان کا دین، ایمان تھا۔ اسی میں سرگرم رہے۔ گرے پڑوں پر خاص توجہ تھی۔ انہی کو اٹھاتے انہیں کا ہاتھ پکڑتے۔

مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

میں قبلہ قدوس صاحب کو پیر اسی لیے مانتا ہوں کہ زندگی بھر گرتوں کو تھامتے رہے۔ خاموشی سے بلکہ رازداری سے، کالج کے بہت سے کلاس فور ملازمین کو سرائے کے ایک سود خور (شفیع) نے سود در سود کے چکر میں جکڑ رکھا تھا۔ قدوس صاحب نے کرنل رفیق کو صورت حال سے آگاہ کیا اور تجویز پیش کی کہ کالج شفیع کو اصل رقم واپس کر کے قرضے سے ان کی جان چھڑا دے۔ پھر آسان قسطوں میں یہ قرضہ ان سے وصول کر لیا جائے۔ رفیق صاحب نے ان سے اتفاق کیا اور اس طرح بیسیوں کو سودی قرضے کے عذاب سے نجات دلائی۔ انہی کی تجویز پر ملازمین کا اپنا فنڈ شروع کرایا تاکہ وقت ناوقت ضرورت مندوں کے کام آئے۔

قدوس صاحب امرت دھارا تھے۔ بے شمار کلاس فور اپنے گھریلو علاج معالجے اور کاروباری مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے اور وہ سب کی فی سبیل اللہ مدد کرتے تھے۔

توکل باللہ سنا تو بہت ہے لیکن اپنی آنکھوں سے انہی میں دیکھا۔ کہا کرتے تھے شکوہ ایمان کی نفی ہے۔ کثیر العیال تھے۔ وسائل محدود لیکن میں نے کبھی انہیں گلہ کرتے نہیں سنا۔ ان کا واسطہ دو ایک بڑے ٹیڑھے بڑے افسروں سے بھی پڑا۔ ضرور ایسے مرحلے آئے ہوں گے جب وہ گلہ کرنے تو حق بجانب ہوتا لیکن اس بندۂ خدا نے جس کا شیوہ صبر و شکر تھا کبھی اشارتاً کنایتاً بھی اپنی آزمائشوں کا ذکر نہیں کیا۔ مہمان نواز ایسے کہ ایک روز ہم کھانے پر بیٹھے تھے ایک صاحب نے دستک دی۔ انہوں نے کہا آئیے، وہ اندر آئے تو اصرار کر کے انہیں کھانے میں شریک کر لیا۔ میں سمجھا کہ کوئی پرانے شناسا ہیں۔ لیکن بعد کو پتہ چلا قطعاً اجنبی تھے۔ پڑوسی ایس ڈی او صاحب نے ختم قرآن کے لیے بلایا تھا۔ کھانے کے بعد انہوں نے بیٹے کے ساتھ ایس ڈی او صاحب کے ہاں بھجوا دیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ کالج میں ایسے صاحب دل کا موجود ہونا یقیناً باعث برکت تھا۔

——— سعید احمد شاہ[1]

یہ واقعہ ۱۹۶۷ء کا ہے۔ ایک چوکیدار رات کو سویا ہوا پایا گیا۔ صبح کو کمانڈانٹ کرنل مرتضیٰ صاحب کے سامنے اس کی پیشی ہوئی تو انہوں نے کھڑے کھڑے ڈسچارج کر دیا اور ایک نوٹ اکاؤنٹنٹ قدوس صاحب کو بھیج دیا۔ قدوس صاحب وہ فائل لے کر کمانڈانٹ کے پاس چلے گئے اور باقاعدہ ان سے لڑے کہ اتنی سروس ہے اتنے بچے ہیں۔ بیچارہ کہاں جائے گا۔ بالآخر ان سے ڈسچارج کا آرڈر کینسل کروا کے چھوڑا اور جو جرمانہ ہوا اسے آسان قسطوں میں وصول کیا۔ اس کی آئندہ کی کارکردگی کی ضمانت علیحدہ دی۔ اس طرح کے واقعات اکثر پیش آتے رہتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی کلاس فور آ جاتا کہ بہت تنگی ہے بیس روپیہ چاہیے۔ اس زمانہ میں جب تنخواہ ہی سو روپے ہوتی تھی بیس روپیہ بھی بہت تھا۔ وہ کہتے یہ سرکاری کھانہ ہے میں کیسے دوں۔ بہرحال جب اسے مایوس جاتا دیکھتے تو جو کچھ اپنے پاس ہوتا اس کے حوالے کرتے بعض واپس کرتے۔ بعض نہیں بھی کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے ہاتھ کی مٹھی بند نہیں کی، رمضان میں ایک بار چپراسی، مالی، لانگری تقریباً تمام کلاس فورز اور کلاس تھری کو اپنے گھر افطاری پر بلاتے تھے۔ سرائے عالمگیر کے آس پاس کی بستیوں کے لوگ ہر تھے۔ بے شمار لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ خود بزرگ سیرت انسان تھے لیکن بزرگوں سے بے انتہا عقیدت تھی۔ سرائے کے ایک بزرگ سائیں جمعہ تین چار ماہ میں ایک بار ان کے پاس آتے تھے۔ ان کے سامنے مرید کی طرح کھڑے ہو جاتے حالانکہ وہ خود ان کو بزرگ سمجھ کر آتے تھے۔ وہ اکثر ان سے کسی نوٹ پر اللہ، یا محمد لکھوا لیتے اور تبرکاً اسے اپنے پرس میں رکھتے۔ جس دیانت داری سے انہوں نے اکاؤنٹس کا کام کیا اس کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ ان کے جانے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ سید زادے تھے اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے سلسلہ سے روحانی تعلق تھا۔ اللہ اکبر!

——— جعفر علی[2]

قدوس صاحب ہر سال تراویح پڑھانے کا انتظام کالونی میں کرواتے تھے۔ منڈی بہاؤالدین

---

[1] اکاؤنٹنٹ ملٹری کالج [2] ڈرافسمین ملٹری کالج

کے حافظ نور محمد کو رمضان کا چاند نظر آنے کے وقت سے عید کا چاند نظر آنے تک اپنا مہمان رکھتے تھے۔ ان کا اپنا کنبہ بہت بڑا تھا۔ گھر میں جگہ نہ تھی عموماً کسی بیچلر آفیسر سے ایک مہینے بھر کے لیے باہر کی بیٹھک مانگ لیتے۔ حافظ صاحب کو افطار اپنے گھر پر کرواتے تھے۔ رات کا کھانا بھی اپنے ساتھ۔ لیکن سحری ہر رات اپنے ہاتھ سے حافظ صاحب کے کمرہ پر پہنچاتے تھے۔

——— مختار احمد[۱]

پندرہ برس پرانی بات ہے کہ ایک روز میں ان کے ہاں لسّی لینے گیا۔ (وہ کالونی میں اپنے سارے پڑوسیوں کو کسی نہ کسی طرح نوازتے رہتے تھے) ان کی بیگم نے کہا۔ مختار۔ تم دیر سے آئے لسّی تو ختم ہو گئی ہے۔ اندر کمرہ میں یہ جملہ کسی طرح قدوس صاحب کے کان میں پڑ گیا انھوں نے وہیں سے آواز دی، بیگم لسّی ختم ہو گئی ہے دودھ تو ختم نہیں ہو گیا۔ بچہ کو خالی ہاتھ نہ جانے دیں۔

اس میں ان کا کردار بند ہے۔ انھوں نے اپنے در سے اپنا ہو یا غیر کسی کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیا۔ وہ بسلسلہ ایبٹ آباد سے یہاں ایک آدھ بار آئے تو مجھ سے بھی ملے۔ مجھے اپنے پرانے آفس میں کام کرتے دیکھ کر خوش ہوئے، میرا کام چیک کیا۔ رجسٹر دیکھے پھر کہا ایک گر کی بات بتاتا ہوں کہ اکاؤنٹس کا کام کبھی کل پر نہ چھوڑنا۔ دوسرے حافظے پر اعتماد نہ کرنا۔ تیسرے یہ کہ اپنا ہو یا غیر، جونیئر ہو یا سینئر سارا لین دین لکھ کر دستخطوں سے کرنا۔ ایسا کرنے میں شرم کرنے یا جھجکنے کی ضرورت نہیں۔

ایوب خان صاحب

——— شوکت جنجوعہ[۲]

سرخ رنگ کی جلد کی رین (Wren) کی گرامر ایوب خان صاحب کے ساتھ مستقل طور پر رہتی تھی اور کمال یہ کہ جو مشق کرا رہے ہوتے اس کا صفحہ زبانی بتاتے اور بغیر دیکھے جملوں کو پورا کرنے جاتے۔ گرامر خاص طور پر Clause analysis انھوں نے ہمارے

---

[۱] اکاؤنٹس آفیسر۔ ملٹری کالج ملازمت از ۱۹۷۵ء [۲] کالج نمبر ۲۳۶۷ زمانہ ۶۱-۱۹۵۶ء

لیے پانی کردی۔ ان کی پڑھائی ہوئی آرمی سپیشل کی انگریزی کے سہارے ہم نے زندگی میں بڑے بڑے معرکے مارے۔ اس وقت ہمیں حیرت ہوتی تھی کہ گرامر کوانتے ذوق وشوق سے کیسے پڑھالیتے ہیں۔ اب احساس ہوتا ہے کہ وہ کوئی اور محبت تھی جس نے ان کے لیے گرامر کو دلچسپ بنا دیا تھا!

——— لیفٹیننٹ کرنل اقبال شاہین

محمد ایوب خان صاحب کی ڈسپلن پسندی مشہور تھی۔ خاموش طبع تھے۔ لیے دیئے رہتے لڑکوں سے فالتو بات نہیں کرتے تھے۔ لیکن وہ اندر سے کیا تھے اس کی جھلک آپ کو بھی دکھانا ہوں۔

یہ واقعہ ۱۹۵۹ء کا ہے اتوار کا دن، سہ پہر کا وقت، جگہ وہ جہاں اب یادگار شہداء ہے میں یہاں اپنے دوستوں کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا کہ ایک نیولا نظر پڑا شمیم احمد جاوید نے مجھے چیلنج کر دیا۔ شاہین اس کو پکڑ کر دکھاؤ تو پانچ روپے، ایک تو چیلنج اوپر سے پانچ روپے کی شرط میں اس کے پیچھے بھاگ پڑا۔ نیولا سامنے کے سٹاف روم میں گھس گیا۔ (جو اس وقت غالباً صفائی ستھرائی کے لیے کھلا ہوا تھا) میں نے اسے وہاں جالیا دروازہ بند کر دیا اب صحیح معنوں میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ کبھی وہ الماری کے پیچھے کبھی صوفے کے نیچے کبھی میز کے اوپر بھاگ دوڑ میں جو شور ہوا اسے سن کر ایوب صاحب جو ادھر سے گزر رہے تھے اندر آ گئے۔ سارے فرنیچر کو الٹا پلٹا اور مجھے ایک کونے میں شکار کی تلاش میں کھڑا دیکھ کر وہ حیران ہوئے میں نے صورت حال کی وضاحت کی کہ یوں شرط لگی ہوئی ہے۔ نیولے کو پکڑنا ضرور ہے۔ پلیز سر آپ اجازت دیں۔ کچھ جواب دیئے بغیر دروازہ بند کر کے وہ باہر نکل گئے۔ میں نے جلدی سے موزے اتار کر ہاتھوں پر چڑھائے اور پھر دگنے جوش سے شکار کو پکڑنے میں لگ گیا۔ بے انتہا دوڑ بھاگ سے نیولا بھی تھکنے لگا تھا۔ آخر کار کوئی آدھ گھنٹے بعد میں اسے گردن سے دبوچنے میں گویا شرط جیتنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب میں پسینہ میں شرابور نیولے کو پکڑے باہر نکلا تو دیکھا ایوب صاحب دروازے کے سامنے کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں آج تک حیران ہوں کہ کیوں؟ بہر حال مجھ سے صرف اتنا کہا۔ شاہین، جانور آزاد ہی اچھے لگتے ہیں۔ یہ سنتے ہی لاشعوری طور پر میرا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ نیولا ہاتھ سے نکلتے ہی ہوا

ہو گیا۔ میں نے سر جھکا کر کہا، سر۔ یہ دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہوئی۔ تائید میں سر کو ہلکی سی جنبش دی گڈ! کہا اور ٹہلنے چلے گئے۔ یہ تھا طریق تربیت میرے چراغوں کا۔

——— لیفٹیننٹ کرنل شمیم احمد جاوید

ایوب صاحب کے بارے میں یہ بات تو عام مشہور تھی کہ انہیں ساری ڈکشنری زبانی یاد ہے۔ خود مجھے بھی اس کا تجربہ ہے کہ جس مشکل سے مشکل لفظ کے معنی پوچھے انہوں نے فوراً بتائے اور اس لفظ سے مشکل تر لفظوں میں اسی طرح ان کا Reserve رہنا بھی مشہور ہے بے حد Unassuming تھے لیکن دل درد مند رکھتے تھے۔

۱۹۷۸ء میں، میں ہنگو کے پاس سے گزر رہا تھا کہ مجھے خیال آیا کہ ہنگو میں ایوب صاحب رہتے ہیں کیوں نہ ان سے نیاز حاصل کروں۔ ہنگو اچھا خاصا بڑا ٹاؤن ہے۔ اس کو حسن اتفاق کہیئے یا میری خوش قسمتی کہ ہنگو کے اس بازار میں جس جگہ جا کر میں نے جیپ کھڑی کی اور پوچھا یہاں کوئی مسٹر ایوب خان بنگش رہتے ہیں۔ دوکاندار نے پوچھا وہی جس نے پنجاب میں ساری عمر نوکری کیا ہے؟ میں نے خوش ہو کر جواب دیا ہاں وہی۔ اس نے کہا یہ سرائے بازار اسی کا ہے۔ اس شریف آدمی نے مجھے ان کے گھر کا پتہ بتایا جو زیادہ دور نہ تھا۔ جب میں نے دروازہ پہ دستک دی تو اندر سے خود ایوب صاحب نکلے میں نے تعارف کرایا۔ شمیم احمد جاوید آپ کا، انہوں نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "جاوید! مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے ہاؤ آر یو؟" میں بیان نہیں کر سکتا کہ انہیں مجھ سے مل کر کتنی خوشی ہوئی۔ حد یہ کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس روز ان کے گھر کے سب لوگ کہیں شادی پر گئے ہوئے تھے وہ گھر پر تنہا تھے۔ بار بار یہ کہتے ہوئے اٹھتے۔ میں تمہارے لیے چائے بناتا ہوں۔ میں ہر بار ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیتا۔ نہیں سر آپ زحمت نہ کیجئے۔ میں یہ تھوڑا سا وقت چائے کے انتظام میں یا چائے پینے میں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ جب انہوں نے چائے کے لیے بہت اصرار کیا تو میں نے آفر کی کہ میرا ڈرائیور بازار سے چائے بنوا لاتا ہے اس پر انہوں نے کہا۔ اس سے میرا دل کیسے خوش ہو گا۔ بہر حال طے یہ ہوا کہ ہم باتیں کریں اگر اس وقت تک کوئی گھر کا فرد آ جائے تو وہ خاطر تواضع کرے۔ مختصر یہ کہ ہم کوئی ڈیڑھ گھنٹہ باتیں کرتے

لہ کالج نمبر ۲۴۲۱ کالج میں زمانہ تعلیم ۶۲-۱۹۵۷ء

رہے۔ کالج کی باتیں سٹاف کی لڑکوں کی باتیں کہنے لگے شمیم۔ میرا جسم یہاں ہے روح وہیں کالج میں بھٹک رہی ہے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل خالد اسماعیل قاضی[۱]

ایوب صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ ایک بار برسبیل تذکرہ کہا۔ سر عبدالقیوم سرحد کے سرسید تھے۔ انہوں نے اسلامیہ کالج پشاور قائم کر کے وہی کام کیا جو سرسید نے علی گڑھ میں کالج قائم کر کے کیا تھا۔ ان کی Regularity نے مجھے بہت متاثر کیا۔ شام کو منٹس اور سیکنڈز کی پابندی کے ساتھ ٹہلنے جاتے تھے۔ ایک روز بارش ہو رہی تھی اور ایوب صاحب کے ٹہلنے جانے کا وقت قریب آرہا تھا۔ طارق نے مجھ سے شرط لگائی کہ آج ایوب صاحب ناغہ کریں گے لیکن جب ٹھیک پانچ بجے وہ چھتری لے کر دروازہ سے نمودار ہوئے تو وہ میرے ہاتھ میں ہاتھ مار کر چیخا "یار مروا دیا خاں صاحب کی اصول پرستی نے"

——— قمر الٰہی (پٹارو)

لڑکے تو لڑکے ہی ہوتے ہیں۔ ہم لوگ تو اورنگ زیب ہاؤس میں تھے۔ ٹیپو ہاؤس میں ایک استاد صاحب کو مرغیاں پالنے کا شوق تھا وہ بھی اچھی خاصی تعداد میں۔ بعض لڑکوں کا خیال تھا اس دولت میں کچھ حق ہم پڑوسیوں کا بھی ہے جو وقتاً فوقتاً چپکے سے خود وصول کر لیا کرتے۔ جس پر کافی ہنگامہ ہوتا۔ سزا بھی اور ذوق گنہ تو سزا کے بعد اور بڑھتا ہے۔ سزا کا چکر بھی چلتا رہتا چنانچہ یہ آنکھ مچولی ہوتی رہتی۔ بازی بازی باریش بابا ہم بازی کے مصداق ایک روز اس "ٹولی" نے قبلہ ایوب صاحب کی چند مرغیوں میں سے ایک پر ہاتھ صاف کر دیا۔ بہرحال یہ ابھی تک راز ہے کہ انہیں ہمارا پتہ کیسے چلا۔ بہرحال مغرب کے بعد ہمیں اطلاع ملی کہ ایوب صاحب نے گھر پر بلایا ہے چور کی داڑھی میں تنکا۔ ہم کھٹکے کہ بات کچھ بگڑ گئی ہے۔ لیکن گھر پر بلانا کیا معنی۔ بہرحال سخت الجھن کی حالت میں ان کے ملحقہ گھر پر سڑک کی طرف سے دستک دی۔ ان کے بیٹے ذہین نے باہر نکل کر کہا۔ آپ لوگ اندر آجائیں۔ اب الجھن نے پریشانی کی صورت اختیار کر لی۔ یا اللہ خیر۔ ڈرائینگ روم میں کیوں بلا رہے ہیں۔ کیا وہاں الٹا لٹکائیں گے اس خلجان میں ڈرائینگ روم میں جا بیٹھے۔ اتنے میں ذہین ایک بڑا ڈونگا لایا۔ ساتھ پلیٹیں بھی۔ اوپر سے

---

[۱] کالج نمبر ۲۸۴۴ زمانہ تعلیم ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۹ء

ایوب صاحب آگئے اور ہم چاروں کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے اشارہ سے بیٹھنے کو کہا چکن کا ڈونگا آگے کیا پھر انگریزی میں کہا: Please help yourself.

ایوب خاں صاحب کا ایک رُخ یہ بھی تھا۔

مسٹر زیڈ اے صدیقی

——— محمد زمان بھٹی

آفاق صاحب کے بعد آئے۔ انگریزی پڑھاتے تھے۔ زبان سکھانے پر توجہ دیتے تھے اور اس کے لیے بڑی تگ و دو کرتے تھے۔ ایک بار میں اور چند دوسرے ساتھی سٹاف کوارٹر میں ان سے ملنے گئے تو وہ قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف تھے۔ تلاوت کے بعد سکوائش بناکر ہماری تواضع کی۔ اکثر مغرب کی نماز کے بعد لڑکوں کو قرآن مجید کی آخری دس سورتیں یاد کرواتے دیکھے گئے۔ ایک دو بار میں نے بھی ان سے سورتیں سیکھیں۔

——— محمد لطیف ڈی۔ ایس۔ پی

مئی ۱۹۴۹ء کے کالج میگزین میں ضمیر صدیقی صاحب کا ایک مضمون Quaid-e-Azam the light of Asia شائع ہوا تھا۔ میں نے کلاس میں پوچھا کہ سر آپ نے قائداعظم کو پورے ایشیا کا چراغ کیوں کہا؟ فرمایا۔ قائداعظم وہ تنہا واحد لیڈر ہیں جنہوں نے سیاست کاری میں نازک سے نازک موقع پر اخلاقی اصولوں کو ملحوظ رکھا ہے اگر ایشیائی ممالک خاص طور سے وہ ایشیائی جو ابھی حال ہی نو آبادیاتی تسلط سے آزاد ہوئے ہیں جیسے بھارت، سیلون، برما وغیرہ اگر قائداعظم کی سیاست کاری کو رہنما اصول بنائیں تو یہ ان کے اور پورے ایشیا کے حق میں اچھا ہوگا۔ اور پاکستان؟ پیچھے سے آواز آئی "پاکستان کے لیے تو قائداعظم کی پیروی ایک لازمی فرض کی حیثیت رکھتی ہے۔"

مئی ۱۹۴۹ء کے اسی میگزین میں زیڈ اے صدیقی صاحب کا ایک خط بھی شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے اس وقت بھی سر اٹھائے ہوئے صوبائیت اور زر پرستی، معاشی استحصال کے منفی رجحانات پر سخت تنقید کی تھی اور اقبال اور قائداعظم کے پاکستان کو قائم و دائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ صدیقی صاحب Essay بہت لکھواتے تھے اور خود بھی بہت

اونچے Essayist تھے یہاں سے جانے کے بعد انہوں نے برٹش کامن ویلتھ کے ایک انٹرنیشنل ایسے کمپیٹیشن میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔

——— بریگیڈئر سلطان احمد[1]

مسٹر زیڈ اے صدیقی کے Essays مشہور تھے۔ ہفتہ میں ایک تو ضرور ہی لکھواتے تھے جو وہ انتہائی باریک بینی سے چیک کرتے تھے۔ کاماٗ تک کی غلطی نہ چھوڑتے تھے۔ مضمون دے کر دوسرے دن ضرور پوچھتے ? What about the essay جس کے جواب میں باری باری لڑکے پوچھتے ? Sir, which essay یہ "وچ ایسے" کا معصوم جوک ہمیشہ چلتا جس کے بعد وہ ہمیشہ پانچ منٹ کا ایک لمبا لیکچر دیتے۔ آکنلک ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر تھے۔ آکنلک ہاؤس جو کچا ہاؤس خاصا وسیع و عریض تھا وہ نماز کے ڈاجرز کو کونے کھدروں سے بڑی تندہی سے Chase out کرتے تھے۔

مرزا عبدالحمید ایم اے

——— بریگیڈئر محمد مشتاق[2]

مرزا صاحب شاعر بھی تھے۔ ۱۹۴۸ء میں کشمیر کا جہاد جاری تھا۔ اس پس منظر میں ایک روز مجاہد بچہ اور اس کی ماں کے درمیان مکالمے کے یہ شعر سنائے۔

بچہ : اے مادر مہربان میں جاؤں گا — جاؤں نہ تو غازی کیسے کہلاؤں گا !
جو رزم گہہ سکندر و پورس ہے — میں عسکری تربیت وہاں پاؤں گا

ماں : کرتی ہوں تجھے شوق سے بیٹا رخصت — دیتا ہے تجھے میرا ابرا بڑھاپا رخصت
والد نے رہ حق میں اٹھائی شمشیر — تو بھی رہ اسلام میں لڑ، جا رخصت

پھر میگزین میں بھی چھپی۔ اس زمانہ میں بیشتر استاد آزادی کی آگ کے دریا کو پار کر کے آئے تھے۔ ان میں قومی احساس چھلکا پڑتا تھا۔

---

[1] ستارۂ جرأت
[2] کالج نمبر ۱۵۵۲ زمانہ تعلیم ۵۳-۱۹۴۶ء

ایم ڈی ظفر صاحب

——— بریگیڈئر محمد اکرم ظفر

ایم ڈی ظفر صاحب تھے تو سائنس کے استاد لیکن اُردو کے ادیب بھی تھے۔ ۱۹۴۹ء کے کالج کے میگزین کے اُردو سیکشن کی ادارت انہی نے کی۔ سٹوڈنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے مجھے ان کی ماتحتی کا شرف ملا۔ انہوں نے میرے افسانہ "وہ کنواں" کو بہ نظر اصلاح بھی دیکھا اور خود بھی افسانہ نگاری کے موضوع پر ایک مختصر تنقیدی نوٹ لکھا اسی رسالہ میں ان کی اقبال کے ایک شعر :

اے طائرِ لاہوتی، اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

کی بڑی فکر انگیز تشریح بھی چھپی تھی۔ حالات حاضرہ اور معاشی امور پر بھی اچھی نظر تھی۔ مئی ۱۹۵۰ء کے شمارہ میں ان کا مضمون: Bankruptcy of Pound Sterling شائع ہوا تھا۔

——— لیفٹیننٹ کرنل غلام فرید کیانی

ایف ایس سی سیکنڈ ائر کی کلاس چل رہی تھی کہ میں نے ظفر صاحب سے پوچھا سر، آخر میتھمس میں سر کھپانے کا کیا فائدہ ہے۔ پھر وہ شروع ہو گئے اور پورا پیریڈ ریاضی اور سپاہی کے موضوع پر لیکچر دینے میں گزار دیا۔ بعد کو یہ Mathematics for the soldier کے عنوان سے اپریل ۱۹۴۹ء کے کالج میگزین میں چھپا اس کا ایک پیرا نقل کرتا ہوں۔

From the earliest dawn to human civilization mathematics has been closely linked with warfare. As early as 400 B.C. Plato wrote in his Republic "For in camping, occupying positions, in closing up, and deploying troops, and in executing the various manoeuvres of an army, it will make all the difference to a soldier whether he is a good geometrician or not."

ظفر صاحب کا مطالعہ اور Vision بہت وسیع تھا۔ کلاس میں بھی اکثر بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے تھے۔ ۴۹-۱۹۴۸ کی عرب اسرائیل وار کے بارے میں انہوں نے کہا تھا کہ اسرائیل کے پیچھے مغربی دنیا ہے۔ یو این او نے اسرائیل کا وجود تسلیم کر کے عربوں کی تباہی کا دروازہ کھول دیا ہے۔ آگے بہت کچھ ہوگا۔ ایک روز فرمایا آئندہ لڑائیوں کا فیصلہ لیبارٹریوں میں ہوا کریگا۔

مسٹر مظہر علی خان

——— کیپٹن محمد امین

یہ واقعہ اوائل ۱۹۵۱ء کا ہے۔ باکسنگ میں ایکسر سائز کی زیادتی کی وجہ سے مجھے کمیشن کے لیے ان فٹ قرار دیا جا چکا تھا لیکن ازرہ کرم کمانڈانٹ زیدی صاحب نے مجھے کالج میں پرائیویٹ طور پر رہ کر آرمی سپیشل پاس کرنے کی اجازت دے دی تھی اور سٹاف کوارٹرز میں ایک کمرہ رہنے کو الاٹ کر دیا تھا جس کے ایک طرف مسٹر زیڈ اے صدیقی اور دوسری طرف مسٹر مظہر رہتے تھے۔ کھانا کیڈٹس میس سے کھاتا تھا۔

اس نئے انتظام کے تحت جب میں کالج سے واپس آیا تو کچھ دیر کے بعد میں مسٹر مظہر کے کمرہ میں چلا گیا۔ وہ اکیلے رہتے تھے اور اس وقت ان کے ملازم نے ان کا کھانا میز پر لگایا ہی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔ آؤ پہلے کھانا کھا لو (غالباً ان کا خیال تھا کہ کالج سے ایس او۔ ایس ہو کر میں کیڈٹ میس میں کھانا نہیں کھا سکتا) "سر میں ابھی آتا ہوں" کہہ کر چلا آیا کوئی آدھ گھنٹے کے بعد یہ اندازہ کر کے اس عرصہ میں وہ کھانا کھا چکے ہوں گے۔ میں دوبارہ ان کے کمرہ میں گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میز پر کھانا اسی طرح دھرا ہے اور انہوں نے ایک لقمہ بھی نہیں توڑا ہے۔ بولے کہاں چلے گئے تھے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ یہ دیکھ کر انہوں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے میری کیا حالت ہوئی۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اتنا انتظار تو شاید میرے والد بھی نہ کرتے۔ مجھے سناٹے میں دیکھ کر بولے "کیوں کیا بات ہے؟ کہہ کر تو گئے تھے ابھی آتا ہوں پھر کہاں غائب ہو گئے۔ لو آؤ کھانا شروع کرو۔ میں نے عرض کیا" سر میں تو میس میں کھا چکا ہوں۔ آپ کھائیں۔ پھر تم نے اسی وقت کیوں نہ بتایا؟ سر انکار کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

لہ کالج نمبر ۱۳۲۶، زمانہ تعلیم ۵۱-۱۹۴۴ء

مختصر یہ کہ پھر وہ آہستہ آہستہ ٹھنڈا کھانا کھاتے رہے اور میں انہیں عزت و احترام کے نئے جذبے سے دیکھتا رہا۔ کھانے کے بعد میں نے ان سے پڑھنے کا وقت لیا۔ جب چلنے لگا تو انہوں نے خود پوچھا "اب کیا سوچا ہے" "سر کمیشن کے لیے پھر کوشش کروں گا۔ تمہاری کیٹیگری تو بہت لو ہے۔" سر کوشش کرنے میں تو کوئی حرج نہیں"۔ "کمیشن کے لیے اتنے keen کیوں ہو۔" "سر یہ مجھ سے زیادہ میرے والد کی خواہش ہے۔ انہوں نے ۲۵ سال انگریز کی نوکری کی، اب وہ اپنی زندگی میں مجھے کمیشن کی وردی میں دیکھنا چاہتے ہیں"۔ "خدا کرے ان کی یہ خواہش پوری ہو۔ میری دعائیں بھی تمہارے ساتھ ہیں"۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ پاک آرمی میں تو کمیشن نہ لے سکا کمیشن کا ستارہ آگے چمکا تو کہاں ابوظہبی کے ریگ زاروں میں یہ یقیناً مسٹر مظہر کی دعا کا اثر تھا اب میں انہیں حسرت سے یاد کیا کرتا ہوں۔ کاش میں ان کی زندگی میں ان کی کچھ خدمت کر سکتا اب ان کی روح کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے۔

——— خادم حسین[1]

مظہر صاحب سائنس لیب میں کلاس لے رہے تھے اور حسب معمول پڑھانے میں محو تھے۔ میرے ذرا پیچھے ۱۶۹۰ ریاض بیٹھا۔ اس کو شرارت سوجھی اس نے چاک کا ٹکڑا اٹھا کر میری طرف پھینکا جو اتفاق سے مظہر صاحب کے جا لگا۔ اس وقت انہوں نے کچھ نہ کہا جب سبق ختم کر چکا تو پوچھا چاک کس نے پھینکا تھا۔ اب سب خاموش، بتلائے تو کون، کام غلط ہو گیا تھا۔ مظہر صاحب کو غصہ نہیں آتا تھا تو نہیں آتا تھا لیکن جب آتا تھا بہت سخت اس لیے سب ڈر رہے تھے۔ "صحیح صحیح بتاؤ چاک کس نے پھینکا تھا۔ اگر بتاؤ گے تو کچھ نہ کہوں گا"۔ اس پر ریاض کھڑا ہو گیا۔ "آئی ایم ساری سر، دراصل میں نے خادم کے مارا تھا اتفاق سے آپ کو جا لگا۔

"چونکہ تم نے سچ سچ بتا دیا ہے اس لیے Excused۔ آئندہ کبھی کلاس کو ڈسٹرب نہ کرنا"۔ بات آئی گئی ہوئی۔ ساری کلاس پر ان کے تحمل کا بڑا اثر ہوا۔ آئندہ کسی نے چوں نہیں کی۔ اخلاقی مار بہت سخت ہوتی ہے اور کبھی نہیں بھولتی۔ پھر وہ شخص ہمیشہ کے لیے دل میں گھر کر لیتا ہے۔

---

[1] کالج نمبر ا د د زمانہ تعلیم ۱۹۴۶ ز تا ۸ د ۱۹ ار منیجر سٹیٹ لائف

——— کرنل محمد یونس[1]

۱۹۵۲ء کے اوائل کا واقعہ ہے میں ان دنوں آرمی کلاس میں تھا اور آئی ایس ایس بی کی تیاری کر رہا تھا۔ اقبال صاحب نے بحث کے لیے ایک موضوع دیا تھا تعلیم میں استاد کا رول۔ میں نے اس موضوع پر کئی استادوں کا ایک طرح کا انٹرویو سا لیا۔ مظہر صاحب کا اپنا مقام تھا ان کے خیالات معلوم کرنے میں جمعہ کی شام کو مغرب کی نماز سے ذرا پہلے ان کے ہاں حاضر ہوا۔ وہ صحن میں بیٹھے تھے اور سامنے اوولٹین کا ایک گلاس رکھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی پہلے تو انہوں نے ملازم کو ایک اور گلاس بنانے کا آرڈر دیا۔ پھر میرے آنے کا مدعا پوچھا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ مسئلہ ہے۔ ٹھیک اس وقت بلی کا ایک بچہ سامنے کی دیوار پر سے کود کر اندر آیا۔ انہوں نے کہا اس بلونگڑے کی مثال سے میں تمہیں تمہارے سوال کا جواب دیتا ہوں۔ ابھی کچھ دن پہلے یہ بلونگڑہ ایک دن اس دیوار پر چڑھ کر پھلانگنے کی کوشش کر رہا تھا اور ہر بار پھسل کر نیچے آجاتا تھا۔ تیسری یا چوتھی بار جب دیوار کے اوپر پہنچتے پہنچتے پھسلنے ہی والا تھا میں نے منہ سے ہلکی سی ہشت کی آواز نکالی۔ آواز سنتے ہی اس نے زوردار آخری کوشش کی اور قلانچ مار کر دیوار پار کر گیا۔ اس دن سے یہ دیوار پار کرنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ اور اب تو یہ میرا دوست بھی بن گیا ہے۔ اسی طرح کوشش طالب علم کی ہوتی ہے۔ استاد کا کام بروقت Guidance کرنا ہے۔

مظہر صاحب کی اپنی شخصیت تھی۔ اس کی مثال کسی باکمال مصور کے اس پنسل سکیچ کی سی تھی جس میں رنگوں کا نہیں مدھم لکیروں کا حسن ہوتا ہے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین[2]

بقر عید کی چھٹیوں میں جب ہم گھر نہ جا سکے تھے۔ دو بار ایسا ہوا کہ مظہر صاحب نے مجھے اور ۱۶۲۲ محمد احمد کو عید کے دن اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ ہم ہی نے ان کی قربانی ذبح کی اور گوشت وغیرہ بنوانے میں مدد دی اور گوشت بھون کر اسی طرح کھایا جس طرح ہم اپنے گھروں میں کھاتے پیتے ہیں۔

---

[1] کالج نمبر ۱۶۰۶، زمانہ تعلیم ۵۲-۱۹۴۶ء [2] کالج نمبر ۱۶۲۳، زمانہ تعلیم ۵۴-۱۹۴۷ء

――― بریگیڈئر سلطان احمد

ایک بار، صرف ایک لڑکے پر مظہر صاحب نے شاوٹ کیا۔ کلاس کے بعد سب لڑکوں نے اس بدبخت کو خوب مارا کہ تم نے ہمارے سر کو غصہ کیوں دلایا۔ ایک روز سکین ہاؤس میں لاکرز کا انسپکشن کر رہے تھے۔ پیتل کا بھاری لوٹا کسی نے کسی مصلحت سے (اس میں کوئی کھانے کی چیز تھی) سب سے اوپر والے خانے میں رکھ چھوڑا تھا۔ مظہر صاحب نے لڑکوں کو بلایا اور ہنس کر کہا اگر میرے زیادہ چوٹ آجاتی تو تم تو مجھے چھوڑ کر بھاگ ہی گئے تھے۔ مظہر صاحب ہاؤس کی "ماں" تھے۔

――― کرنل محمد افضل خان[1]

یہ ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔ سائنس بلاک (موجودہ کیمسٹری لیبارٹری) کو بنے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ مظہر صاحب اس بلاک کے انچارج تھے اور اس کی دیکھ بھال اس طرح کرتے کہ کوئی اپنے گھر کی بھی کیا کرتا ہوگا۔ بعض لڑکوں کی عادت ہوتی ہے کہ لکھتے ہوئے قلم جھٹکتے جاتے ہیں۔ اس طرح فرش پر اگر سیاہی کی چھینٹے پڑ جاتے۔ مظہر صاحب سوئیپر سے ان کو رگڑ وا رگڑوا کر صاف کرواتے تھے۔ اور اگر کسی کو اس طرح روشنائی چھڑکتے دیکھ لیتے تو اس کو سزا دیتے اور سخت ناراض ہوتے۔ ایک دن جب میں سائنس ہال میں داخل ہو رہا تھا تو کسی نے مجھے پیچھے سے دھکا دیا۔ نتیجتاً روشنائی کی دوات میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر کر ٹوٹی اور ساری روشنائی فرش پر پھیل گئی۔ مظہر صاحب آگے جا رہے تھے۔ انہوں نے پیچھے مڑ کے دیکھا ان کے متوقع غصہ کے خیال سے میں بہت گھبرایا۔ میری گھبراہٹ دیکھ کر بجائے ناراض ہونے کے انہوں نے صرف اتنا کہا "کوئی بات نہیں۔ ذرا بچ کر آنا کہیں پھسل نہ جاؤ۔"

――― واجد علی

میری عادت ہے کہ میں لوگوں کے بارے میں پیڑوں اور پودوں کی امیج کے حوالے سے سوچتا ہوں۔ مظہر صاحب کے تصور کے ساتھ میرے ذہن میں لاجونتی (چھوئی موئی) کے پودے کا خیال آتا ہے۔ ان کی آہستہ گوئی اور آہستہ خرامی کے بارے میں بہتوں نے لکھا ہوگا۔ شاید

---

[1] کالج نمبر ۱۸۲۲ زمانہ تعلیم ۵۵-۱۹۴۸ء

کسی نے یہ نوٹ کیا ہو کہ وہ بلیک بورڈ پر نوٹس لکھنے کے لیے بہت ہی سافٹ چاک استعمال کیا کرتے تھے جو ان کے لیب اسسٹنٹ محمد عمر قریشی علیحدہ ذخیرہ کر رکھتے تھے اور ان کے پیریڈ میں خاص طور سے نکال کر بلیک بورڈ پر رکھ دیتے تھے شاید یہ بھی انرجی بچانے والا فلسفہ تھا۔ بہت سے لڑکوں کا خیال تھا کہ مظہر صاحب کو فزیالوجی کی پوری کتاب زبانی یاد ہے۔ چونکہ کوئی لڑکا کہیں سے ریڈنگ کر رہا ہو وہ کتاب کو بغیر دیکھے صحیح کر دیا کرتے تھے مظہر صاحب نے جو پڑھایا وہ سب لوگ مدتوں کا بھول چکا ہوگا وہ خود بھی کب کے مٹی میں مل چکے لیکن انکی من موہنی شخصیت کی یاد باقی ہے۔ آخر میں یہی کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ اللہ بس باقی ہوس!

——— نثار کیانی[1]

مظہر صاحب نے ہاؤس میں لاسٹ اینڈ فاؤنڈ کی ایک الماری رکھی ہوئی تھی۔ اس میں گم شدہ اور بازیافتہ چیزیں رکھ دی جاتی تھیں۔ پھر رات کو ہاؤس فال ان پر اعلان ہوتا کہ آج فلاں لڑکے نے فلاں چیز پائی اور لاسٹ اینڈ فاؤنڈ کی الماری میں رکھی۔

——— لیفٹیننٹ کرنل اعجاز احمد[2]

اس زمانہ میں پاکستان کے قومی ترانہ کو لڑکوں میں معروف کرانے اور اس کا احترام کرنے کی عادت ڈلوانے میں مظہر صاحب کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ لائٹس آؤٹ سے ذرا پہلے ہاؤس فال ان پر ہر روز قومی ترانہ پڑھواتے تھے۔

——— کیپٹن نیوی محمود علی[3]

کہتے تھے کہ قومی ترانہ خوب جوش سے گایا کرو۔ یہ انرجی کا صحیح استعمال ہے۔

——— ڈاکٹر فاروق احمد[4]

روزوں کا مہینہ تھا۔ ۲۴۹۹ احمد ضیاء نے مظہر صاحب سے پوچھا "سر! آج روزہ ہے؟" مظہر صاحب نے جواباً کہا۔ جی ہاں آج روزہ ہے اور مسکرا کر چل دیئے۔

---

[1] کالج نمبر ۲۳۵۳ زمانہ تعلیم ۶۲ - ۱۹۵۶ء [2] کالج نمبر ۲۳۵۸ زمانہ تعلیم ۶۲-۱۹۵۶ء

[3] کالج نمبر ۲۴۰۲ زمانہ تعلیم ۶۱-۱۹۵۸ء [4] کالج نمبر ۲۴۱۳ زمانہ تعلیم ۵۹-۱۹۵۷ء

—— بریگیڈیر یعسوب علی ڈوگر[1]

پانچویں کے کم عمر بچوں کو گھر کا سا ماحول دینا اور پھر آہستہ آہستہ بہت ہی نرمی سے ان کو پبلک سکول کے طلبا کی صورت میں Mould کرنا انہی کا کام تھا۔ اس عمر میں معمولی معمولی باتوں میں سے بچوں کی خوشی یا ناخوشی وابستہ ہوتی ہے۔ مظہر صاحب کے ہوتے ہوئے بچوں کو لاشعوری طور پر گھر پر ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ بچوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں بچوں کی طرح شریک ہوتے تھے۔ لاکر کے پاس کھڑے ہیں اس کو ٹھیک کرا رہے ہیں۔ چارپائیوں کو سیٹ کرا رہے ہیں۔ میس میں جا کر کھانے کو بار بار چیک کر رہے ہیں مظہر صاحب کی اہمیت اپنی جگہ تھی۔

—— کرنل غلام علی[2]

دس گیارہ سال کی عمر میں جب ۱۹۵۸ء میں کالج میں داخل ہوا تو سکینن ہاؤس میں مظہر صاحب کے ونگ میں مجھے جگہ ملی۔ شروع کے چند ہفتے صبح شام گھر کو یاد کرتے گزرے۔ اس ہوم سک نس (Home sickness) کے جذباتی دباؤ سے کھانا پینا بھی متاثر ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دبلا پتلا تو میں پہلے سے تھا۔ اب اور منہ نکل آیا۔ میری اس حالت کو سب سے پہلے مظہر صاحب نے نوٹ کیا۔ ان کی عادت تھی کہ شام کو نماز سے پہلے صحن میں ترتیب سے لگی چارپائیوں کی مچھر دانیوں کو خود چیک کرتے تھے۔ کسی وجہ سے میں گیمیں پر جانے سے پہلے اپنی مچھر دانی نہیں لگا سکا تھا۔ وہ پان چباتے بہلنے سے چھوٹے چھوٹے قدموں سے آہستہ آہستہ چلتے میرے قریب آئے تو پہلے تو مجھے میری مچھر دانی لگانے میں مدد دی۔ پھر مجھے غور سے دیکھا اور پھر قریب بلا کر میری آنکھوں کے پپوٹوں کو اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا اور کہا "تمہیں Jaundice تو نہیں (مجھے اس وقت اس لفظ کے معنی معلوم نہ تھے، میں چپ رہا) پھر تمہارے چہرے کا رنگ پیلا کیوں ہے؟" مجھے ان کے ہمدردانہ انداز سے حوصلہ ہوا اور میں نے جواب دیا سر، میرا رنگ ہی ایسا ہے۔ بولے، نہیں رنگ کا سانولا ہونا اور بات ہے اس میں پیلاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ صحت مند جلد میں سرخی جھلکتی ہے ضرور Red Corpuscles کی کمی ہے میں اس وقت گیمس سے آیا تھا اور نیکر پہنے ہوئے تھا۔ انہوں نے میرے گھٹنوں کے دونوں

[1] کالج نمبر ۲۴۷۹ زمانہ تعلیم ۶۲-۱۹۵۷ء [2] کالج نمبر ۲۴۷۶، زمانہ تعلیم ۶۲-۱۹۵۸ء

طرف کے گڑھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میرے بچے! تم تو واقعی بہت دبلے ہو۔ مختصر یہ کہ اس روز کوئی دس منٹ وہ میری صحت کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کرتے رہے اور صحت بنانے کی تدبیریں بتاتے رہے۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی میرے اپنے والدین نے بھی میری صحت کے بارے میں اس طرح اتنی تشویش کا اظہار کیا ہو۔ اب میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ میں اپنے بچوں کے بارے میں ان باریکیوں میں جاؤں۔ میرے معبودا! یہ کون لوگ تھے یہ کس دنیا کی مخلوق تھے جو پرائے بچوں پر صرف پاکستان کے حوالے سے اپنی جان چھڑک رہے تھے۔ اللہ اکبر Commitment کی کوئی حد ہے۔ کتنا دکھ ہوتا ہے یہ دیکھ کر اور یہ سوچ کر کہ ہمارے بچوں کو ہمارے بچپن سے بہتر بہت کچھ میسر ہے لیکن استاد؟

ـــــــ میجر طارق حبیب[1]

مظہر صاحب کو فزیالوجی کی کتاب زبانی یاد تھی۔ نوٹس بھی کتاب ہی سے لکھواتے اور اصرار کرتے کہ امتحان میں لفظ بہ لفظ وہی لکھا جائے جو وہ لکھواتے تھے۔ ایک بار میں نے احتجاج کیا تو بولے یہ آرٹ نہیں سائنس ہے۔ فزیالوجی پتھر کی لکیر ہے جو ہے سو ہے، اسے اسی طرح لکھو جس طرح کہ لکھ دیا گیا ہے۔ جب میں نے لاپرواہی نہ چھوڑی تو کہنے لگے یا تو کر نہیں سکتا یا کرنا نہیں چاہتا۔ اگر پہلی بات ہے قابل درگزر ہے اگر دوسری بات ہے تو قابل افسوس ہے۔ میں نے عرض کیا سر آپ کا کیا خیال ہے۔ مسکرا کر بولے میرا تو خیال ہے تُو ہے ہی نالائق۔ بات آئی گئی ہوئی۔ جب سیکنڈ ٹرمینل کے نمبر ملے تو میں پرچہ لے کر ان کے پاس گیا۔ سر آپ کے نالائق نے آپ ہی سے ۹۲ نمبر لیے ہیں۔ مسکرائے میرے شانے تھپتھپائے۔ مجھے معلوم تھا کہ تُو ٹاپ کرلے گا اگر تو چاہے۔ میں تجھے غیرت دلا رہا تھا۔ تو درانی ہے نا۔ میں نے کہا سر میں درانی نہیں ہوں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے ہے باغیرت۔ پھر میرا ہاتھ دیکھ کر کہا "کراس کنٹری"۔ میں نے پوچھا "سر! کیا مطلب"، فرمایا کبھی مطلب خود سمجھ لوگے آج میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے زندگی کی کراس کنٹری ریس کے بارے میں کہا تھا جو میری قسمت میں لکھی ہے۔ ایک روز کلاس میں

---

[1] کالج نمبر ۲۸۱۵ زمانہ تعلیم ۶۷-۱۹۶۳ء حال کوارٹر ماسٹر ملٹری کالج از جون ۱۹۸۸ء

Water Diving کی بات چل پڑی انہوں نے کہا کسی بھی فطری حس کو حد کمال تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ جس کو ہم Extra-sensory perception کہتے ہیں وہ بھی Perception ہی کی ایک صورت ہے جس کو فی الحال explain نہیں کیا جا سکتا۔ جب کوئی طوفان یا زلزلہ آنے والا ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کی خبر پرندوں جانوروں حد یہ کہ چیونٹیوں کو ہوتی ہے۔ جس سال بارش زیادہ ہونے والی ہو اس سے پہلے چیونٹیاں اپنا راشن سٹور کرنے میں تیزی سے مصروف نظر آتی ہیں۔

Observation سائنس کی بنیاد ہے ہر Phenomenon کو غور سے Observe کیا کرو ـــــ یہ مظہر صاحب کا نیا پہلو تھا جو سامنے آیا۔

ـــــ میجر خالد اسماعیل قاضی

مظہر صاحب جب ریٹائر ہوئے تو انہوں نے میری آٹوگراف بک پر یہ فقرہ لکھا تھا۔

Every day and in every way I am getting better

ـــــ میجر ساجد مجید بھٹی

جب میں اپنے پیارے کالج کو خیرباد کہنے لگا تو جہاں دوسرے استادوں کے آٹوگراف لیے، وہاں اپنے خصوصی کرم فرما مظہر صاحب سے بھی درخواست کی کہ وہ بھی میری رہنمائی کے لیے کچھ لکھیں۔ مظہر صاحب انرجی کو محفوظ رکھنے پر بہت زور دیتے تھے۔ اس لیے آہستہ چلنے اور آہستہ بولنے کی تلقین کرتے رہتے لیکن جو آٹوگراف انہوں نے دیا بہت مختلف تھا۔

"A great man is great not because of
his follies but inspite of them."

اس وقت تو آٹوگراف لے کر اور تھینک یو سر کہہ کر آگے بڑھ گیا ہوں گا۔ لیکن بعد کو اکثر اس فقرہ پر سوچا اور اس سے بہت روشنی ملی پہلے تو یہ کہ بڑا آدمی فرشتہ نہیں ہوتا۔ اس میں انسانی کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ یا ہو سکتی ہیں۔ ان کے باوجود وہ بڑا ہوتا ہے یا بڑا رہ سکتا ہے۔

فرشتہ سے بڑھ کر ہے انسان بننا مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

راشد صاحب کا سنایا ہوا شعر یاد آتا اور پھر ان کا آٹوگراف بھی۔

نورد نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول

عجب بات ہے کہ زندگی کے سفر میں کبھی کبھی ایک فکر انگیز فقرہ، حوصلہ افزائی یا حوصلہ شکنی کا ایک جملہ، کسی اجنبی سے روا روی کی ایک ملاقات، بھاگتے دوڑتے کوئی ایک مشاہدہ بھی اہم ہو جاتا ہے اور ایک مسکراہٹ اور ایک آنسو سے دل کی دنیا زیر و زبر ہو جاتی ہے۔

——— میجر عبد الرشید اے ای سی

مظہر صاحب کی آہستہ خرامی تو مشہور ہے ہی وہ شام کو ٹینس کھیلنے یا کبھی کبھی نہر کے کنارے سیر کو جانے کے سوا گھر سے کم ہی نکلتے تھے۔ ایک روز میں سٹاف کالونی سے بی میس میں بریک فاسٹ چیک کرنے آرہا تھا کہ دیکھا مظہر صاحب لپکتے جھپکتے کالج کے مین گیٹ سے برآمد ہو رہے ہیں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میں نے عرض کیا مظہر صاحب خیریت تو ہے کہاں کا قصد ہے؟

"ذرا سرائے جا رہا ہوں۔ ایک مہمان آگیا ہے۔"

"مہمان؟ کیا کوئی کراچی سے آیا ہے۔" "نہیں۔" وہ جلدی جلدی مسکرائے اور کہا "ایک طوطا آیا ہے۔" طوطے کا قصہ یہ تھا کہ صبح صبح ان کے کمرہ کے روشندان سے ایک زخمی طوطا اندر آن گرا تھا۔ اسے فرسٹ ایڈ دے کر اس کی خصوصی خاطر تواضع کے لیے بازار سے جلیبیاں لینے جا رہے تھے۔ یہ واقعہ اوائل ۱۹۵۹ء کا ہے جب وہ سکین ہاؤس سے ٹیپو ہاؤس منتقل ہو چکے تھے۔

اواخر ۶۷ء میں جب میں دوبارہ کالج میں پوسٹ ہوا تو وہ سٹاف کالونی میں شفٹ ہو چکے تھے۔ اتفاق سے مجھے ان کی ہمسائیگی کا شرف ملا۔ ایک روز میں دوپہر کے وقت ان کے ساتھ کالج سے واپس آرہا تھا جوں ہی وہ اپنے کوارٹر کے دروازے کے قریب پہنچے شہد کی مکھیاں غول در غول ان کے سر کے گرد چکر لگانے لگیں۔ میں ڈر کے پیچھے ہٹا کہ کہیں کاٹ ہی نہ لیں۔ مظہر صاحب نے فرمایا۔ رشید صاحب ڈریئے نہیں یہ مکھیاں میری دوست ہیں۔ کاٹیں گی نہیں اور واقعی انہوں نے نہیں کاٹا۔ مختصر یہ کہ انہوں نے دروازے کا تالا کھولا تو مکھیاں ان کے ساتھ ساتھ اندر گئیں۔ انہوں نے باورچی خانے کے باہر کی طرف کے نلکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے شفیع (ملازم) سے ہزار بار کہا ہے کہ کس کے نلکا نہ بند کیا کرو۔ تھوڑا سا کھلا رہے تو مکھیوں کو پانی ملتا رہتا ہے۔ نلکے کے نیچے ایک تسلا رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے نلکا کھولا تو مکھیاں پانی پر پل پڑیں۔

پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور کہا دیکھا آپ نے یہ میری دوست ہیں۔ اتنے میں شفیع بازار سے آگیا تو اس کو انہوں نے نلکا کس کے بند کرنے پر سخت جھاڑ پلائی۔

ان کے صحن کی دیوار کے قریب چنبیلی کی جھاڑیوں میں بلبل کا ایک جوڑا رہتا تھا۔ اس سے بھی ان کی دوستی تھی۔ اس جوڑے کے لیے وہ ایک چھوٹا سا پراٹھا علیحدہ سے پکواتے تھے۔ اور اپنے ہاتھ سے چُوری بنا کر ان کو کھلاتے تھے۔ جانور بھی محبت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ ایک روز مظہر صاحب نے مجھے ناشتہ پر نہاری کی دعوت دی تھی۔ اس دن میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بلبل کا جوڑا ان کے ہاتھ پر آ بیٹھا اور ان کی ہتھیلی پر سے چُوری کھائی۔

مظہر صاحب شکاری بھی رہے تھے۔ ان کی جلد بہت حساس تھی جس سے وہ موسم کی پیشنگوئی کرتے تھے۔ کچھ کشف میں بھی دخل تھا۔ لیکن یہ جو تین واقعات میں نے ان کی پرندوں سے دوستی کے لکھے ہیں وہ ان کے نفسیاتی تجزیئے کے طور پر لکھے ہیں۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ شخص جو پرندوں کا اتنا لاڈ کرتا ہے وہ اپنے شاگردوں کے لیے کیسا ہوگا؟

کیپٹن رحمان

——— سید عنایت حسین[۱]

کیپٹن رحمان (پورا نام منظور الرحمان) جو ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک یہاں رہے اور آخر کار لیفٹیننٹ کرنل ہو کر مشرقی پاکستان میں ۱۹۷۱ء کے بحران کی نذر ہوئے، کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ وہ بڑے مشاق میوزک ڈائریکٹر تھے۔ خود مجھے انہوں نے ہارمونیم پر ملکیش کا یہ گانا سکھایا۔

مجھ کو ہے تم سے پیار کیوں یہ نہ بتا سکوں گا میں

بنگالی ہونے کے ناطے گہرے سانولے رنگ کے تھے۔ ایف اے سی سی کے حلقوں میں ان کا نک نیم سانوری صورت من بھائی رے پیا تھا۔ وجہ تسمیہ یہی تھی کہ ہارمونیم پر یہ گیت اکثر گاتے تھے۔ مشہور تھا کہ سائیکالوجی کے ایم اے ہیں۔ چونکہ نوجوانوں کی نفسیات پر لیکچر دیتے تھے نفسیاتی اور کیریئر رہنمائی میں دلچسپی رکھتے تھے۔ شام کو جو سوٹ پہن کر نکلتے وہ یوڈی کلون میں بسا ہوا ہوتا تھا۔ اس خوشبو سے ہمارا تعارف انہی کے

---

[۱] کالج نمبر ۱۳۰۹، زمانہ تعلیم ۵۰-۱۹۴۵ء

حوالے سے ہوا تھا۔

——— محمد زمان بنی ایڈووکیٹ

کیپٹن رحمان نہ صرف اپنے لائف سٹائل بلکہ اپنی Sensibility میں بھی کالج کے بیشتر استادوں سے قطعاً مختلف تھے۔ ان پر روایتی کلچر کا رنگ غالب تھا۔ رحمان صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی کے چشم و چراغ ہونے کی وجہ سے وہاں کے مخصوص لبرل آؤٹ لک کے حامل تھے۔ ان کے پڑھانے کا سٹائل اور کلچر، تاریخ سیاست وغیرہ پر ان کے خیالات غیر روایتی نوعیت کے تھے (غلط فہمی سے بچنے کے لیے انقلابی کا لفظ میں جان بوجھ کر استعمال نہیں کر رہا ہوں) موسیقی اس طرح توحیدری صاحب کا بھی اوڑھنا بچھونا نہیں تھی جس طرح رحمان صاحب موسیقی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ رابرٹس ہاؤس کے سٹرڈے نائٹ فنکشن میں مستقل طور پر ہارمونیم پر غزلیں سنتے اور سناتے تھے اور کلچرل سنٹر میں ہارمونیم سکھلاتے تھے۔ میں ان کے Liberalism کی بات کر رہا تھا۔ اس کی ایک مثال دیتا ہوں ایک بار انہوں نے ہمیں آرمی کلاس میں فرائڈ کی تخلیقی نفسیات اور فلسفہ Edipus complex پر تفصیلی لیکچر دیا۔ اس طرح کہ بعض سننے والوں کے کانوں کی لوئیں سرخ ہوگئیں۔ لیکن ان کا لیکچر جاری رہا۔ ایجوکیشن Mental exposure کا نام ہے۔ غالب کہہ گئے ہیں چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو۔ یہ خدمت رحمان صاحب نے انجام دی۔

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد یونس ستارۂ جرأت

۵۰-۱۹۴۸ء کالج کی فٹ بال ٹیم کے انچارج تھے۔ ٹی او کیپٹن منین کی طرح ٹیم میں کھیلتے بھی تھے۔ ۱۹۴۹ء میں ہماری فٹ بال ٹیم کو ایبٹ آباد لے گئے تھے برن ہال سے میچ تھا۔ کیپٹن رحمان آئی ایس ایس بی کی تیاری کراتے تھے۔ جب میں کوہاٹ جانے لگا تو انہوں نے خاص طور سے کہا تھا۔ غلط سلط جو چاہو بولو لیکن وہاں اعتماد سے بولنا ضرور۔

——— میجر گل بادشاہ [1]

آصف : سر ملٹری کالج میں آپ کا چراغ کون تھا؟

---

[1] کالج نمبر ۱۹۶۸، زمانہ تعلیم ۵۲-۱۹۴۷ء

گل بادشاہ : چونکہ آپ نے ملٹری کالج کہا ہے ملٹری کالج جہلم نہیں اس لیے میں اپنے پہلے چراغ سے بات شروع کروں گا جن کا نام میجر سومدت تھا جو ۴۷-۱۹۴۶ء میں ملٹری کالج اجمیر کے کمانڈانٹ تھے جن کو صحرا کا گلاب کہنے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں ملٹری کالج جہلم میں یوں تو بہت سے چراغ تھے لیکن میں سب سے پہلے بنگالی کیپٹن رحمان کا نام لینا چاہتا ہوں کچھ اس لیے کہ شاید دوسروں نے ان کا ذکر زیادہ نہ کیا ہو۔ لیکن زیادہ تر اس لیے کہ He was a class by himself ان میں کچھ خصوصیات ایسی تھیں جو کم از کم اس وقت یہاں میرے علم کی حد تک کسی اور استاد میں نہیں تھیں۔

آصف : اجمیر کہاں اور آپ کہاں؟

گل بادشاہ : آپ کی حیرت بھی بجا ہے۔ ہوا یہ کہ میرے والد دفعدار بادشاہ گل کے۔ جی۔ آر آئی۔ ایم سی اجمیر میں ڈرل انسٹرکٹر تھے۔ ۱۹۴۵ء میں جب وہاں مسلمان لڑکوں کا داخلہ کھلا تو ۲۰ جولائی ۱۹۴۵ء کو جو دس مسلمان لڑکے وہاں داخل ہوئے ان میں سے ایک میں (اجمیر کالج نمبر ۶۳۹) تھا۔ ۶۴۰ خالق داد، ۶۴۲ محمد لطیف، ۶۳۷، محمد شریف، ۶۴۳ محمد شاہ وغیرہ بھی میرے ساتھ ہی وہاں داخل ہوئے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں میجر سومدت نے لیفٹیننٹ کرنل سیلبی سے کمانڈانٹ کا چارج لیا اس سے پہلے کہ میجر سومدت صاحب کے اشتثائی کردار کے بارے میں کچھ عرض کروں میں ملٹری کالجوں کی Comparative study کی دلچسپی کے لیے کچھ باتیں ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں۔

پہلے تو یہ کہ کے۔ جی۔ آر اجمیر بنیادی طور پر ہندو کالج تھا۔ اور ہندو کلچر کا سایہ اس پر بہت گہرا تھا۔ اور مسلمان بھی اس ہندو کلچر کے اثرات سے محفوظ نہیں تھے۔ اس زمانے کے حالات کو یاد کر کے اب مجھے خیال آتا ہے کہ اگر پاکستان نہ بنتا اور ہم پاکستان نہ آتے تو ہم آدھے ہندو ہو چکے ہوتے۔

آصف : وہ کیسے؟ ذرا اس امر کی وضاحت کریں۔

گل بادشاہ : میں کہہ چکا ہوں کہ اجمیر کالج سراسر ہندو کالج تھا۔ کالج کے عملے میں صرف تین مسلمان تھے۔ ایک میرے والد رسالدار بادشاہ گل کا تعلق ڈرل سٹاف سے تھا۔ مروت علی فاروقی صاحب، ومن اُردو کے استاد تھے۔ کلرکوں میں اے۔سی۔سی کے ایک مسلمان محمد قطب الدین تھے مدراس کے، ہاں یاد آیا کالج کا بگلر ۲ راجپوتانہ رائفلز کا لانس نائیک فضل داد بھی مسلمان تھا۔ کالج کی فضا سو فیصد ہندوانہ تھی۔ کالج میں ایک مندر تھا جس میں ہر اتوار کو سب لڑکے بھجن اور کیرتن کے لیے جاتے تھے۔

آصف : کیا مسلمان لڑکے مندر جاتے تھے؟

گل بادشاہ : جی ہاں۔

آصف : حکماً لازمی طور پر؟

گل بادشاہ : براہِ راست آرڈر تو نہیں دیا جاتا تھا لیکن یہ کہا جاتا تھا کہ کمانڈانٹ کی یہ خواہش ہے کہ سب لڑکے بھجن اور کیرتن میں شامل ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ فوج میں کمانڈنگ افسر کی خواہش کا مطلب حکم ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم مسلمان لڑکوں کو بھی باقاعدگی سے جانا پڑتا تھا۔ کیرتن سنتے سنتے مجھے بھی آدھی رامائن یاد ہو گئی تھی۔ مختلف دیوی دیوتاؤں گنیش، شیو، کالی، کرشن جی کے بت دیکھ دیکھ کے ہمیں ان کے نام ازبر ہو گئے تھے۔ اور تو اور سونے سے پہلے مسلمان لڑکوں کو بھی پرارتھنا میں شریک ہونا پڑتا تھا۔

آصف : وہ کیا سلسلہ تھا؟

گل بادشاہ : وہ طریق کار یہ تھا کہ رات کو لائٹس آؤٹ سے پہلے ہاؤس کے سب لڑکے ایک قطار میں کھڑے ہو کر ایک پرارتھنا یا دعا پڑھتے تھے۔ اس کے بعد ہی دودھ کا ایک گلاس ملتا تھا۔ جو لڑکا لائن میں کھڑا ہو کر پرارتھنا نہیں کرتا تھا وہ دودھ سے محروم رہتا تھا۔ اس پرارتھنا کے دو چار ٹکڑے مجھے آج بھی یاد ہیں۔

آصف : کیا۔ سنائیے؟

گل بادشاہ : یہ پرارتھنا کچھ یوں تھی۔

داتا اے پربھو۔ آنند و گیان ہم کو دیجئے۔

شنکر سارے درگتوں کو دور ہم سے کیجئے۔
لیجئے ہم کو چرن میں، ہم سدا چاری بنیں۔
برہمچاری، دھرم رکھشک ویر ورتھ دھاری بنیں اے پربھو۔

آصف: تو گویا مسلمان طلبار کلچرل یلغار کی زد میں تھے۔

گل بادشاہ: جی مکمل طور پر۔ مندر کے کیرتن (ہندوانہ وعظ وغیرہ) اور اس پرارتھنا کے علاوہ سال میں وہاں دوبار۔۔۔ نومبر دسمبر اور اپریل میں سالانہ امتحان کے فوراً بعد ڈرامے ہوتے تھے۔ ان کا موضوع بھی ہندو تاریخ و تہذیب سے لیا جاتا تھا۔

آصف: مثلاً؟

گل بادشاہ: مثلاً یہ کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مرہٹہ سردار شیواجی پر کئی بار ڈرامہ یا سوانگ ہوا اس میں مرہٹوں اور خاص طور پر شیواجی کو ہیرو کے طور پر پیش کیا جاتا تھا اور اورنگزیب عالمگیر اور مغل فوج کی تضحیک کی جاتی تھی۔ جب جب شیواجی سٹیج پر نمودار ہوتا تو حاضرین جن میں زیادہ تر مرہٹہ لڑکے ہی تھے زوردار نعرہ لگاتے، شیواجی مہاراج کی "جے" اور ہمارا خون کھول کے رہ جاتا۔

آصف: اس صورت حال پر بحیثیت مجموعی مسلمان لڑکوں کا ردعمل کیا تھا؟

گل بادشاہ: اس وقت ہم سب کم عمر تھے۔ دوقومی نظریے کا ہمیں کوئی علم نہیں تھا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس ہندوانہ کلچرل فضا سے نہ صرف مسلمان طلبار متاثر نہیں ہوئے بلکہ ردعمل کے طور پر ان میں قومی جذبہ اور مذہبی احساس زیادہ شدت سے ابھرا۔

آصف: اس کا اظہار کیسے ہوا؟

گل بادشاہ: مسلم قومیت کا سب سے زیادہ امتیازی اظہار تو نماز با جماعت ہے۔ نماز انفرادی طور پر تو ہم پہلے بھی پڑھتے تھے اور جمعے کی نماز کے لیے حضرت معین الدین چشتی کے مزار پر جاتے تھے لیکن کالج میں با جماعت نماز پڑھنے کے لیے نہ کوئی مسجد تھی اور نہ کوئی انتظام تھا۔ جب ہم میں قومی شعور ذرا زیادہ پختہ ہوا تو ہم نے فیصلہ کیا کہ کالج میں باجماعت نماز شروع کرنا چاہیے۔ چنانچہ چیٹ وڈ ہاؤس کے سٹور روم میں با جماعت نماز کا

اہتمام کیا گیا۔ اسحاق (تاؤ) نے عصر کی نماز کی اذان دی۔ یہ اذان پہلی اذان تھی جو کے۔جی آر اجمیر کی فضاؤں میں گونجی۔ اس وقت کالج میں اسحاق نامی دو لڑکے تھے ان میں وہ اسحاق جو اسحاق تاؤ کے نام سے معروف تھا، اس نے امامت کی اور مقتدی چار لڑکے تھے۔ میں (گل بادشاہ) ۳۶۹، شریف ۲۳۷، شبیر اور ۶۲۹ سکندر اس پہلی اذان اور اس پہلی باجماعت نماز کا ایکسائٹمنٹ مجھے نہیں بھولتا۔ اس نے ہمارے علیحدہ قومی وجود کو اور ہماری انفرادیت کو غیروں کی نظر میں مستحکم کر دیا۔ یہ واقعہ اگست ۱۹۴۶ء کا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس دن بادل گھرے تھے اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔

آصف : اس کے بعد؟

گل بادشاہ : یہ اذان یہ پہلی باجماعت نماز ایک طرح سے ہمارا اپنا اقدام (Initiative) تھا۔ جب انتظامیہ کو ہمارے اس جذبے کا علم ہوا تو انہوں نے کچھ دنوں کے بعد ہمارے لیے ایک ٹینٹ لگوا دیا۔ اس خیمے کو ہم مسجد کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ یہ ٹینٹ کالج کی عمارتوں سے فاصلے پر کالج اور اجمیر جیل کے درمیان لگوایا گیا تھا۔ تو یہ علاقہ بھی کالج ہی کا تھا لیکن ویران تھا۔

آصف : اس ویرانے میں ٹینٹ لگوانے کی کیا مصلحت تھی؟

گل بادشاہ : غالباً فرقہ وارانہ تصادم سے بچانے کے لیے۔

آصف : یہ تو نماز کا سلسلہ ہوا۔ مسلمان لڑکوں کی مذہبی تعلیم کا کیا انتظام تھا؟

گل بادشاہ : جب ہماری تعداد تیس چالیس کے قریب ہو گئی تو ہمارے رومن اُردو کے استاد مروت علی فاروقی صاحب ہی ہمیں دینیات پڑھانے لگے وہی جمعے کی نماز پڑھاتے تھے۔

آصف : آپ لوگ وہاں کوئی مذہبی تقریب بھی کرتے تھے؟

گل بادشاہ : جی ہاں، عید کی نماز تو خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ پر جا کر پڑھتے تھے لیکن عید میلاد النبی کے موقع پر ایک جلسہ ضرور کرتے تھے جس میں تقریروں اور نعتوں کے بعد شیرینی تبرک کے طور پر تقسیم ہوتی تھی۔

آصف : عید میلادالنبی کے ان جلسوں کی کوئی چیز یاد ہے آپ کو؟

گل بادشاہ : میں نعت پڑھا کرتا تھا خاص طور پر یہ

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی

اس میں ۶۳۷ محمد شریف اور ۶۴۰ خالق داد بھی میرے ساتھ ہوتے تھے۔

آصف : اس تقریب میں کبھی کوئی غیر مسلم بھی شریک ہوتا تھا۔

گل بادشاہ : یہ تقریب ایک آدھ بار ہی ہوئی۔ اس میں کمانڈانٹ کرنل سیلبی، سیکنڈان کمانڈ کیپٹن ڈیسائی، چند ہندو افسروں اور لڑکوں نے بھی شرکت کی، مٹھائی کا انتظام بھی سرکاری طور پر کیا گیا تھا۔ بظاہر انتظامیہ کی طرف سے کسی مذہبی تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا تھا مثلاً جب ہم جمعے، عید وغیرہ کی نماز کے لیے شہر اجمیر جاتے تھے تو اس کے لیے ٹرانسپورٹ کا انتظام سرکاری ہوتا تھا۔ اس اہتمام کے باوجود ایسے چھوٹے شاخسانے ہوتے رہتے تھے جن سے ہندو مسلمان کا فرق نمایاں ہوتا رہتا تھا۔

آصف : مثلاً؟

گل بادشاہ : مثلاً لیٹرین جاتے وقت ہندو سکھ بغیر پیندے اور ٹونٹی کی لٹیا کے جاتے تھے۔ مسلمانوں نے کہا ہمیں ٹونٹی والا لوٹا دیا جائے۔ بڑی بحث کے بعد انہیں لوٹا دیا گیا۔ لوٹے کے بعد ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا۔

آصف : وہ کیا؟

گل بادشاہ : ہندو ہم سے کہتے تھے کہ تم لوگ اپنے لوٹے کو لیٹرین سے آنے کے بعد مانجھتے کیوں نہیں۔ (ہندو سکھ اپنی لٹیا کو لازماً ریت مٹی سے رگڑ رگڑ کر مانجھتے اور ہر وقت چمکا کر رکھتے تھے) ہم کہتے ٹونٹی کا یہی فائدہ ہے کہ اس کو مانجھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسی طرح ایک اور چھوٹے سے معاملے میں ہندو مسلمان کا امتیاز پیدا ہو گیا تھا۔

آصف : وہ کیسے؟

گل بادشاہ : اس کی ایک مثال یہ ہے کہ وہاں کھانے کے بعد لڑکے اپنے برتن خود دھوتے تھے چونکہ ہندو سکھ جھٹکے کا گوشت کھاتے تھے اور مسلمان ذبیحہ کا، مسلمانوں نے کہا

ہم جھٹکے کے برتنوں کو ہاتھ نہیں لگا بیں گے۔ چنانچہ کچن کے باہر ایک جگہ مسلمان لڑکوں کے لیے مخصوص کی گئی کہ وہ یہاں راکھ سے اپنے برتن مانجھا کریں۔ یہ باتیں ۴۷-۱۹۴۶ء کی ہیں اور کلاس روم سے باہر کی ہیں۔ کلاس روم میں بھی بعض ہندو استاد بڑے Insidius طریقے سے ہندو تاریخ اور ہندو کلچر کا پرچار کرتے رہتے تھے۔

آصف: اس کی کوئی مثال؟

گل بادشاہ: وہ بھی عرض کرتا ہوں۔ ۱۹۴۵ء میں تاریخ کے استاد مسٹر رام موہنی شرما ہماری چھٹی کلاس کو انڈین ہسٹری پڑھایا کرتے تھے۔ ایک روز پراچین بھارت میں علم و تعلیم کا ذکر آیا تو فرمایا کہ آج سے سینکڑوں سال پہلے ایک ہندو بھاٹ (عوامی داستان گو اور بھانڈ) بھی اتنی ٹرگنومیٹری (Trignometry) جانتا تھا، جتنی بہت سے پڑھے لکھے آج بھی نہیں جانتے۔ پھر یہ قصہ سنایا کہ مہاراج پرتھوی راج کو محمد غوری نے دھوکے سے پکڑ کر اندھا کر دیا تھا اور اپنے قلعہ میں قید کر دیا تھا۔ قلعہ کے ٹاور پر کھڑے ہو کر وہ کبھی کبھی چینک کیا کرتا تھا۔ ایک وفادار بھاٹ نے پھلوں کی ٹوکری میں رکھ کر مہاراج کو تیر کمان بھیجے۔ پھر وہ مہاراج کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پھر ان کی انگلی پکڑ کر زمین پر اس طرح کا ایک تکون بنوایا اور کہا بھجا پچاس ہاتھ چل کر بھیت (دیوار) چار بانس ۲۴ گز انگل اشٹ پر بیٹھا محمد غوری چنانچہ مہاراج نے بھاٹ کے کہنے کے مطابق اسی زاویے سے تیر چلانا اور وہ مت چوک اے چوہان۔ چنانچہ اس اشارہ پہ چوہان نے تیر چلایا اور سلطان ڈھیر ہو گیا۔ یہ سب افسانہ سہی لیکن کچے ذہنوں پر ایک اثر چھوڑ گیا۔ اب ایک اور مثال دیتا ہوں۔ جوالادت جوشی ہمیں اُردو اور ہندی دونوں زبانیں پڑھاتے تھے ایک روز ترنگ میں آکر ایک ہندو شاعر کے کمالات کا اظہار فرمانے لگے۔ ارشاد ہوا کہ کسی مسلمان حاکم نے اس ہندو شاعر سے فرمائش کی لالہ جی ایسا شعر کہو جس میں اسلام کا لفظ بھی آئے۔ ہندو شاعر نے پرنام کے بعد کہا حضور یہ کون سا مشکل کام ہے اور برجستہ دوہا پڑھا۔

اُلٹے لام کے پرکار پوتر دھار میرے شیو کی
گنگا پوتر ہو گئی فرمان میں اس لام کے

نوٹ: ہندو دیو مالا کے مطابق گنگا شیو دیو کے سر کی چوٹی جس کی شکل اُلٹے لام کی سی تھی، سے فوارہ کی طرح نکلی تھی۔

وہاں کے استادوں میں ہندو قومیت، ہندو کلچر سے کتنی عصبیت تھی؟ اس کا کچھ اندازہ ان دو مثالوں سے کیا جا سکتا ہے۔ دسمبر ۴۷ء میں یہاں ملٹری کالج میں آکر مجھے حیرت ہوئی اور خوشی بھی، حیرت اس بات کی کہ یہاں کلاس روم میں یا کلاس سے باہر پاکستان قوم پرستی، وطن پرستی کی فضا وہ نہیں تھی جو وہاں تھی۔ وہاں کے ہندو استاد بڑے Subtle طریقے سے ہندو کلچر کا پرچار کر رہے تھے۔ یہاں وہ کچھ بات نہیں تھی۔ یہاں تعلیم کی فضا سیکیولر تھی۔ خوشی اس لیے ہوئی کہ یہاں تاریخ کو مسخ نہیں کیا جا رہا تھا۔

آصف: وہاں کی ہندوانہ فضا سے مسلمان لڑکے کتنے متاثر ہوئے؟

گل بادشاہ: بالکل نہیں بلکہ ان کی ان کوششوں سے مسلمان لڑکوں میں مسلم قومیت کا احساس اور چمکا۔

آصف: اس کی بھی کوئی مثال؟

گل بادشاہ: مثال اس کی یہ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں دہلی میں جوائنٹ کے جی کالجز باکسنگ ہوئی اس میں ملٹری کالج اجمیر ہی کا مسلمان لڑکا نمبر ۹۴۴ فضل حسین المعروف گورکھا رنگ میں ملٹری کالج جہلم کے مشہور باکسر ۱۲۳۲ امام دین کے مدمقابل کھڑا ہوا تو محض اس لیے کہ امام دین مسلمان کالج (ملٹری کالج جہلم) کی نمائندگی کر رہا تھا ہم نے امام دین کے لیے دعائیں اور جہلم کے ٹرافی لینے پر خوش ہوئے۔

آصف: بے حد شکریہ گل بادشاہ صاحب، آپ نے بے حد قیمتی اور دلچسپ معلومات اور مشاہدات سے نوازا۔ اس سے ملٹری کالجوں کے تقابلی مطالعہ میں مدد ملے گی۔ اس جائزہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو ذہن کتنا بیدار ہے۔ بہر حال اب آپ کے پہلے چراغ میجر سومنت کی طرف لوٹتے ہیں۔ ان کے کردار پر کچھ روشنی ڈالیے۔

گل بادشاہ: اس متعصب ماحول کو سامنے رکھا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ وہ شخص ایک ممتاز استثنا (Honourable exception) تو ضرور تھا لیکن تھا یقیناً ایک غیر معمولی ذہن اور کردار کا مالک۔ چونکہ مسلمان میں تعصب نہیں ہوتا (اور حکومت مسلم کی گم شدہ میراث ہے) اس لیے میں اپنے اور اجمیر کے تمام مسلمان طلبا اور سٹاف کے

محسن جناب سومدت کا ذکر کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔

آصف: کچھ ان کے سوانحی حالات پر بھی روشنی ڈالیے۔

گل بادشاہ: ایک ڈوگرہ سیشن جج کے بیٹے میجر سومدت یونیورسٹی گریجویٹ اور ۱۷ ڈوگرہ رجمنٹ سے تعلق رکھتے تھے۔ اوائل ۱۹۴۵ء میں کالج میں سیکنڈ ان کمانڈ کے طور پر پوسٹ ہوئے تھے۔ ستمبر ۱۹۴۶ء میں لیفٹیننٹ کرنل سیلبی کے کالج سے جانے کے بعد کالج کے کمانڈانٹ مقرر ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۴۶ء ہی سے کالج کو آزادی کے تقاضوں کے مطابق بدلنا شروع کر دیا تھا۔

۱۵ اگست کو ہندوستان کے یوم آزادی کے موقع پر کالج میں پریڈ کرنے اور نیا انڈین فلیگ لہرانے اور اس کو سلامی دینے کا معاملہ چونکہ ذرا حساس (Sensitive) تھا (کالج میں تقریباً چالیس مسلم طلباء اور سٹاف موجود تھے جنھوں نے آخر کار پاکستان جانا تھا) اس مسئلہ کا حل میجر سومدت کی فراست نے یہ نکالا کہ کالج میں کوئی پریڈ سرے سے کرائی ہی نہیں۔ کالج کے لڑکوں نے اجمیر گیریزن کی پریڈ میں حصہ لیا جس میں حصہ لینا مسلمان کیڈٹس کے لیے لازمی نہ تھا۔ بعض نے حصہ لیا، بعض نے نہیں بھی لیا۔ ترنگے کو سلامی دینے کا مسئلہ جناب سومدت نے اس طرح حل کیا کہ ہمارے آنے تک کالج میں صرف کالج کا جھنڈا لہروایا۔ اس رواداری، عالی ظرفی بے تعصبی کی (جو وہاں عام طور پر نایاب تھی) جتنی داد دی جائے کم ہے۔ ! He was great - میں اس وقت آٹھویں میں تھا۔ اگست ۴۷ء سے دسمبر ۴۷ء تک میں نے خود اپنے لاکر میں قائداعظم کا فوٹو رکھا سومدت کی کمان کی وجہ سے کسی نے اس سے تعارض نہیں کیا۔ آزادی کے تیسرے دن عید تھی۔ تمام مسلمان لڑکوں کو عید کی نماز پڑھنے کے لیے سرکاری انتظام سے درگاہ شریف بھیجا گیا تھا۔ نماز کے بعد کمانڈانٹ کے بنگلے پر ہماری دعوت تھی۔ سومدت صاحب ہم سے بہت شفقت سے پیش آئے حالانکہ ہم پاکستان زندہ باد قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے کمانڈانٹ کے بنگلہ میں داخل ہوئے تھے۔

اگست ۴۷ء کے اواخر میں کیپٹن نوبیال کے یہاں سے جانے کے بعد سے وہاں

کی فضا نہایت مکدر ہوئی تھی۔ ستمبر میں تمام مسلمان لڑکوں کو چیٹ وڈ ہاؤس میں اکٹھا کر دیا گیا تھا اور کمانڈانٹ نے ایک ڈارمیٹری میں فون لگوا دیا تھا کہ کوئی مسئلہ ہو تو دن رات کسی وقت ان کو اطلاع دی جائے۔ ایک رات افضل خواب میں بڑبڑانے لگا کہ آ گئے آ گئے اور پھر اٹھ کر بھاگنے لگا۔ دوسرے لڑکے بھی اٹھ بیٹھے۔ کسی نے گھبرا کر فون کی گھنٹی بجا دی۔ چند منٹ کے بعد سومدت شب خوابی کے کپڑوں میں اپنی سرخ سپورٹس کار میں آ موجود ہوئے۔ پستول ہاتھ میں تھا۔ روڈ واک اینڈرسن کے لیے ہم کالج کے سائڈ گیٹ سے باہر جاتے تھے۔ اس کے سامنے جھیل تھی۔ وہاں پر روز مضافات سے مسلمانوں کی لاشیں آتی رہتی تھیں۔ جب سومدت کو خبر ہوئی تو وہ دروازہ بند کروا دیا اور ہم مین گیٹ سے آنے جانے لگے۔ ہاں جس قسم کا تعصب عام تھا اور جس طرح اگست ۴۷ کے بعد سے نوٹیال کے یہاں سے جانے کے بعد سے وہاں حالات خراب ہوئے تھے اگر جناب سومدت جرأت فراست، دردمندی، اور عالی ظرفی سے کام نہ لیتے تو ہمارا کیا حشر ہوتا کہا نہیں جا سکتا۔ میں اس انسان کی عظمت کو سلام کرتا ہوں جس نے بحیثیت استاد اپنی ذمہ داری کو سمجھا اور انسانیت کے تقاضوں کو اپنے لیے خطرات مول لے کر بھی پورا کیا۔

آصف : سبحان اللہ۔ سر، اب کیپٹن رحمان کی بات بھی ہو جائے۔

گل بادشاہ : کیپٹن رحمان پہلے اے ایس سی میں کمیشن ہوئے تھے۔ وہاں سے اے ای سی میں آئے ان کا پی اے نمبر ۱۵۸۸ تھا۔ ان کے کمرہ میں مولوی فضل الحق اور رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ اس سے ان کے ذہن کے رخ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ مجھے اس زمانے کے دوسرے کچھ اساتذہ جن کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا کے گھروں میں بھی جانے کا موقع ملا۔ ان میں سے بلا استثناء کسی کے گھر میں نے قائداعظم یا اقبال یا کسی اور سیاسی و علمی شخصیت کی تصویر نہیں دیکھی۔ ہاں ایک دو کے ہاں لیو نارڈ ڈی ونچی، واٹ، روبنز (Rubens) رینالڈز (Reynolds) اور چغتائی جیسے مشہور عالم مصوروں کے فن پارے دیواروں پر ضرور آویزاں تھے۔ نیشنلزم کے بعد بلکہ ساتھ ساتھ کیپٹن رحمان کی دلچسپی موسیقی سے تھی۔ ایک شام ایف اے سی سی میں

رات کے پچھلے پہر کا راگ

مدھوکر شام نورے انگنا میں چور

کے ٹکڑے پر انہوں نے پون گھنٹے تک گایا۔ ایک لیب اسسٹنٹ مسٹر عمر ہوتے تھے۔ ان کے بیٹے کو طبلہ کا بہت شوق تھا۔ اس نے سنگت دی تھی۔ کیپٹن رحمان صاحب جگموہن اور پنکج ملک کے بڑے مداح تھے۔ سپورٹس مین بھی تھے۔ فٹ بال کھیلتے تھے۔ بنگالی تھے لیکن گرمیوں میں کرتا شلوار پہن کر اور پوڈی کلون لگا کر باہر نکلتے تھے۔ پائپ میں اعلیٰ قسم کا خوشبودار تمباکو استعمال کرتے تھے۔ مطالعہ کا شوق تھا اور مطالعہ پر بہت زور دیتے تھے۔ میں نے چراغوں کی قطار کے لیے کیپٹن رحمان کو اس لیے منتخب کیا ہے کہ کیپٹن رحمان کے واسطے سے ہمارے ذہنوں میں کچھ ایسی لہریں پیدا ہوئیں جو یہاں ممنوع یا بہت کمزور تھیں۔ ایجوکیشن تو نام ہی Variety of experience کا ہے۔ رحمان صاحب کی وجہ سے ہمارے ذہنوں کا وہ Exposure ہوا جو پاکستان کے اس خطہ کے گھٹے ہوئے روایتی اور ایک صدی کی غلامی سے ڈسے ہوئے ماحول میں بظاہر ممکن نہ تھا۔

——— بریگیڈئر سلطان احمد ستارۂ جرأت

جنگ بہت ہی پیچیدہ انسانی کارروائی ہے اس میں بنیادی سطح پر جرأت کے علاوہ ذہن اور Imagination کی بھی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے لیکن جو لوگ لڑائی میں براہِ راست حصہ لیتے ہیں وہ سپرمین نہیں ہوتے۔ جرأت خوف کے فقدان کا نہیں خوف پر غالب حاوی ہونے کا نام ہے۔ خوف پر غالب آنا یعنی جرأت کا مظاہرہ کرنا کوئی اضطراری فعل نہیں جس کے لاشعور میں جرأت نہیں اس کی جری ہونے کی شعوری کوشش کبھی کارگر نہیں ہوسکتی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لاشعور میں جرأت کیسے جائے؟ یا کیسے جاتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جرأت میں کسی کلچر یا ماحول یا تاریخ کی قوت ہوتی ہے۔ جرأت اس فضا میں ہوتی ہے جس میں بچہ پیدا ہونے کے بعد سانس لیتا ہے پھر اس گھر میں ہوتی ہے جہاں بچہ پرورش پاتا ہے۔ ماں کے دودھ میں، باپ کے رویے میں جرأت ہوتی ہے

جرأت اور غیرت مندی کے ان رویّوں کو بچہ لاشعوری طور پر اپنا لیتا ہے۔ گھر کے بعد اور اس سے آگے ایک اور قوت محرکہ (Motivating force) اس ادارہ کی بھی ہوتی ہے جہاں کوئی شخص تعلیم و تربیت پاتا ہے۔ ادارہ کا تعلیمی نظام اور تربیتی طریق کار اس کے اساتذہ کے توسل سے طلبا کے دل و دماغ میں اثر پاتا ہے۔

۱۹۶۵ء میں کالی دھار (کشمیر) کا کمانڈو ایکشن ہو یا ۱۹۷۱ء کا جمال پور کا معرکہ کتاب ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔ لڑائی میں بھی کتاب کی تاثیر کا میں بڑا قائل ہوں۔ اور پڑھنے کی یہ عادت مجھے ملٹری کالج میں پڑی اور کیپٹن منظور الرحمان کی کاوشوں سے۔ ۱۹۴۷ء میں جب بنگلور میں، میں داخل ہوا تو مجھے انگریزی کے صرف چند جملے آتے تھے۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں بنگلور کے ۴۲ مسلمان لڑکوں کا جو قافلہ یہاں پہنچا ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ دو اڑھائی برس میں حیدری صاحب نے انگریزی کی بنیادیں اتنی مستحکم کر دی تھیں کہ ۱۹۵۰ء میں جب آٹھویں اسے میں منظور صاحب نے انگریزی پڑھانی شروع کی زبان میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھی۔ انہوں نے جو پہلی کتاب مجھے پڑھنے کو دی اس کا نام Doctor Do Little تھا اس کے بعد تو تانا بندھ گیا تقریباً ہر روز وہ مجھے ایک نئی کتاب دیتے تھے جس کو پڑھ کر مجھے اس پر اپنے تاثرات بھی لکھنے پڑتے تھے چارلس لیمب کی Stories from Shakespeare کے بعد شیکسپیئر کے ڈراموں اور انگریزی کے کلاسیکل ناولوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈکنس (Dickens) اور Stevenson کو تو میں نے پہلے ہلے میں پڑھ ڈالا تھا۔ پھر ہسٹری کو چاٹنا شروع کر دیا۔ کیپٹن منظور صاحب موسیقی کے ماہر بھی تھے لیکن میں ان کو ایک Intellectual ہونے کی حیثیت سے یاد کر رہا ہوں۔

۱۹۴۷ء کے بعد کالج کی تعلیمی و ثقافتی فضا میں جو یکایک تبدیلی ہوئی اور غیر معمولی ترقی ہوئی اس میں ان کا اہم حصہ تھا۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں جب وہ جنیدہ کالج کے پرنسپل تھے کٹر بنگلہ دیشی ہونے کی وجہ سے ہنگاموں کی نذر ہو گئے۔ وہ علیحدہ مسئلہ ہے میں ان کو کالج کے ایک پرانے اور منفرد معلم کی حیثیت سے یاد کر رہا ہوں۔

سراج احمد علوی

——— محمد زمان بھٹی

یہ تنہا استاد تھے جو ہمیشہ شیروانی پائجامے میں نظر آتے اور اس وضع داری میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ہمارے نصاب میں پوری مسدس حالی شامل تھی۔ اس کے حوالے سے سراج احمد علوی صاحب نے ہمیں مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان پڑھا دی۔ سرسید، علی گڑھ اور تحریک پاکستان کے منظر اور پس منظر سے آگاہ کیا اور ہمارے اندر مسلم قومیت کا جذبہ جگایا۔ وہ مسدس بغیر کتاب دیکھے پڑھایا کرتے تھے۔ غالباً پوری نظم زبانی یاد تھی، تاریخ اسلام، ابن خلدون، سید امیر علی شبلی کی سیرت النبی کے حوالے برجستہ دیتے تھے۔ ان کی وجہ سے ہم سے بیشتر کو مسدس کا خاصا حصہ زبانی یاد ہو گیا تھا۔ انہی نے بتایا تھا کہ مسدس حالی کے بعض حصوں کا ترجمہ سر راس مسعود نے انگریزی میں کیا ہے جو Realms of Gold نامی کتاب میں شائع ہوا ہے۔

علوی صاحب میں Glamour نہیں تھا، صاف ستھرا سادہ لباس، نرم خو منکسر مزاج جتنا جانتے تھے اس سے بہت کم ظاہر کرتے تھے۔ یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔ غالباً ۵۲ء میں کالج کو خیر باد کہا۔ ایک عرصہ کے بعد ان سے اسلامیہ کالج فیصل آباد میں ملاقات ہوئی تو فوراً پہچان لیا۔ شفقت سے پیش آئے دیر تک کالج کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے ان کو بتایا "سر! آپ کا نک نیم مسدس حالی تھا۔ خوش ہوئے بولے یہ بہت بڑی عزت افزائی ہے۔ ورنہ میں کہاں اور حالی کہاں! مئی ۱۹۵۰ء کے کالج میگزین میں ان کا حالی پر ایک مضمون اردو کا سعدی کے عنوان سے بھی چھپا تھا۔ ——— میجر گل بادشاہ

سراج احمد علوی صاحب کو غالب کے شعر بہت یاد تھے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جب وہ کسی نہ کسی سلسلہ میں غالب کا کوئی نہ کوئی شعر نہ سناتے ہوں۔ دیوان غالب کے بارے میں وہ ایک نقاد (ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری) کا یہ قول اکثر کوٹ کرتے تھے۔ ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں ایک وید مقدس دوسرے دیوان غالب پھر کہتے وہ کون سا نغمہ ہے جو اس ساز کے تاروں میں خوابیدہ یا بیدار موجود نہیں؟

اب ان کی کلاس کا ایک لطیفہ سناتا ہوں۔ کلاس کے ایک کنارے پر ۵۸۳ اور ۵۳۴

اظہر دوسرے کنارے پر بیٹھا تھا۔ جب ایک سبق پڑھتے ہوئے ظہور نے نامور کو ناموری پڑھا تو علوی صاحب نے "ہوں" کہہ کر اس کو تنبیہ کی اور کلاس نے اس کو سلپ آف ٹنگ سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیا۔ لیکن جب دوسرے گوشہ سے عارف نے تاجور کو تاجوری پڑھا تو کلاس میں قہقہہ پڑا۔ اور سراج احمد علوی بھی خلاف معمول مسکرائے۔ اس دن سے دونوں کا نک نیم ناموری اور تاجوری پڑ گیا۔

—— راجہ محمد افضل[1]

سراج احمد علوی صاحب لکھنؤ کے کلچر کے زندہ نمونہ تھے۔ اُردو اور اُردو کے ذوق کو انہوں نے فروغ دیا۔ مسدس حالی کو انہوں نے اس ذوق وشوق سے پڑھایا کہ مسدس ہر ایک کے دل میں اتر گئی۔ اس زمانے میں پاکستان نیا نیا بنا تھا اس پس منظر میں انہوں نے مسدس کو پڑھایا۔ اور جذبہ تعمیر کو ابھارا۔

علوی صاحب کو فارسی اور اُردو کے بے شمار شعر یاد تھے ہر موقع پر برجستہ شعر پڑھتے تھے ان کی وجہ سے لڑکوں میں شعر وشاعری کا شوق پیدا ہو گیا چند لڑکے تو شعر بھی کہنے لگے ان دنوں مشہور شاعر روش صدیقی کے آنے پر کالج میں جو مشاعرہ ہوا تھا اس میں ان نوخیز شاعروں نے اپنی غزلیں اور نظمیں سنائی تھیں۔

—— محمد یونس کیانی

میر کا یہ شعر: اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گذر گئے

زیر بحث تھا۔ فرمایا صحیح شاعر قوم کا سب سے زیادہ باشعور فرد ہوتا ہے۔ میر کا یہ شعر غم جاناں سے زیادہ غم دوراں کی عکاسی کرتا ہے۔ پھر میر ہی کا یہ شعر سنایا:

مزاجوں میں یاس آگئی ہے ہمارے — نہ مرنے کا غم نہ خوشی زندگی کی

اسی سلسلہ میں انہوں نے کہا Frustration کی کیفیت پر شعراء نے بڑے بڑے نازک شعر کہے ہیں۔

شاید تمہارے ساتھ بھی واپس نہ آسکیں — وہ ولولے جو ساتھ تمہارے چلے گئے

اس موضوع پر جگر کا یہ شعر بھی قابل غور ہے۔

ان کے بہلائے بھی نہ بہلا دل — رائیگاں سعیٔ التفات گئی

---

[1] تاریخ نمبر ۱۷۰۰

شیفتہ کہتے ہیں۔

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے شیفتہ طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں

سراج احمد علوی صاحب نے اپنے طلبا ء میں جو ذوق شعر ابھارا وہ بے وجہ نہ تھا۔ وہ خود بھی خوش ذوق شاعر تھے۔ ایک بار میں نے کلاس میں پوچھا سر، آپ اتنے شعر سناتے ہیں کیا آپ خود شعر نہیں کہتے؟ فرمایا۔ میں سکہ بند شاعر نہیں ہوں کبھی کبھی آمد ہوتی ہے تو کچھ کہہ لیتا ہوں۔" ہمارے اصرار پر کہ سر، کچھ سنائیے انہوں نے "ایک نہر کو دیکھ کر" سنائی۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ یہ نظم اپنی اسی اپر جہلم نہر پر ہے جب میں نے پچھلے سال گرمیوں کی ایک صبح پہلے اس نہر کو دیکھا تو دل میں تاثرات کی جو لہریں اٹھیں وہ اس نظم میں ڈھل گئیں یہ نظم میں نے فی البدیہہ کہی تھی۔ رودکی (فارسی شاعر) کو جوئے مولیاں یاد آتی تھی مجھے یہ جوئے جہلم یاد آتی ہے۔ میری درخواست پر انہوں نے یہ نظم مجھے اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی تھی جو میں اپنی بیاض سے یہاں نقل کرتا ہوں۔

ایک نہر کو دیکھ کر

چشمہ جو یہ رواں ہے اک شور کر رہا ہے
اس شور میں نہاں ہے آرام زندگی کا!
ہر چند مختصر ہے ہمت مگر بڑی ہے
ہر موج دے رہی ہے پیغام زندگی کا

چشمہ جو یہ رواں ہے

تنکے سوار پتے ہیں راستے کے روڑے
کچھ بھی رکاوٹیں ہوں اس کو نہیں ہے پروا
موج ہوا سے ہر دم لرزاں ہے اس کا پانی
ہنگامہ اک بپا ہے ناکام زندگی کا

چشمہ جو یہ رواں ہے

پودے ہرے بھرے ہیں لیتے ہیں اس سے پانی

سوکھی زمین کو ہر آن سیراب کر رہا ہے
آب حیات اس کا ہے راز زندگانی
سیرابی خیابان انجام زندگی کا
چشمہ جو یہ رواں ہے

نا آشنائے منزل پروا نہیں فنا کی
آزاد ہے وہ لیکن پابند ہے رضا کا
جب تک کھلا ہے پانی جاری ہے فیض اسکا
پانی نہیں تو سمجھو اتمام زندگی کا
چشمہ جو یہ رواں ہے

ہے درس جوش وہمت چشمے کی یہ روانی
پانی دکھا رہا ہے تصویر زندگانی
یہ زور یہ تلاطم یہ نغمہ یہ ترنم
انسان کے لیے ہے پیغام زندگی کا
چشمہ جو یہ رواں ہے

______ واجد علی[1]

سراج احمد علوی صاحب یوں تو اردو کا درس دیتے تھے لیکن ساتھ ہی درس زندگی بھی دیتے جاتے۔ ایک روز فرمایا انسان کی نجات اس میں ہے کہ مالک کے کام آئے۔ اور مالک کے کام آنا یہ ہے کہ جو جہاں ہے اپنا کام دیانت اور شوق سے کرے۔ کچھ عرصہ کے بعد ۱۹۵۲ء کا تربیت شائع ہوا تو اس میں ایک تمثیلچہ کاغذ، کوئلہ اور لکڑی کے نام سے شائع ہوا جس میں کاغذ، کوئلہ اور لکڑی اپنی اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو آتش دان جو یہ بحث خاموشی سے سن رہا تھا یوں نغمہ سرا ہوتا ہے۔

---

[1] کالج نمبر ۱۸۹۱

یہ کوئلہ یہ لکڑی! یہ صاف صاف کاغذ
اے دو جہاں کے مالک تو نے انہیں بتایا
آواز تیری سُن لی اور آگیا سمجھ میں
اُڑتا ہے جل کے کاغذ لکڑی بچٹخ بچٹخ کر
کوئلہ دہک دہک کر بنتا ہے راکھ آخر
آخر ہیں ان سبھوں کو یکساں ہی ہم نے پایا
جو کچھ ہے پاس اپنے دیتے ہیں یہ لٹا سب
بے شکوہ وشکایت کرتے ہیں فرض ادا یہ
تیری بھی ہے یہ مرضی بے کار ہو نہ ہستی
مالک کے کام آئے جل کر کے نام پائے

یہ مصرع "مالک کے کام آئے" وہ بار بار دہراتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں تصوف کا چراغ جل رہا تھا۔

مسز کارنیلیئس

—— شربت خان محسود

میٹرن صاحبہ نے دو ایک بار ایسٹر اور بڑے دن پر ہنٹر بیف کھلایا، وہی یاد ہے۔

—— لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر

جو بھی اپنے کام کو جانتا ہے اور اسے دیانت داری سے کرتا ہے اسے اپنے اوپر اعتماد بھی بہت ہوتا ہے اور اس کی کام پر گرفت بھی سخت ہوتی ہے۔ یہی حال میٹرن صاحبہ کا تھا اکثر ڈاکٹر کی عدم موجودگی کو انھوں نے محسوس نہ ہونے دیا۔ چونکہ ان کا کوارٹر اسپتال سے ملا ہوا تھا، وہ بیشتر وقت اسپتال میں موجود ہوتی تھیں اور دوسرے اوقات میں اپنے گھر کی کھڑکی سے اسپتال پر نظر رکھتی تھیں اور ڈسپلن کے معاملہ میں بہت سخت تھیں۔ ایک صاحب زادے جو بہت تیز بنتے تھے ان کا قصہ مجھے بھی معلوم ہے۔ گھٹنے پر پھوڑا نکلا تو اس کا آپریشن اپنے پرکار کی نوک سے کیا۔ نتیجہ ظاہر ہے زخم کے Septic ہونے کی صورت میں نکلا۔ میٹرن صاحبہ نے سختی سے منع کیا۔

گھٹنے کا زخم ہے چلتے پھرتے رہو گے تو ٹھیک نہ ہوگا اور امتحان سے رہ جاؤ گے۔ لیکن وہ صاحب زادے نہ مانے جوں ہی میٹرن صاحبہ اپنے گھر جاتیں وہ اسپتال میں اودھم مچانا شروع کردیتے۔ انہوں نے ایک بار چیک کیا دو بار چیک کیا۔ تیسری بار ان کا پاجامہ اتروا کر اسپتال کے وارڈ میں بند کروادیا اور ڈریسنگ اردلی کو حکم دیا جب یہ شیطان باتھ روم جائے صرف اسی وقت پاجامہ دینا ہے۔ اس طرح چار دن وہ یہاں بستر میں رہے اور اس عرصے میں زخم ٹھیک ہوگیا۔ آخری روز میٹرن صاحبہ نے گھر لاکر پیسٹری کے ساتھ چائے پلائی (میرا خیال ہے مجھے اب نام بتانے کی ضرورت نہیں)۔

میٹرن صاحبہ سے ڈرامہ کے زمانہ میں ہم کپڑے بھی مستعار لیتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنے قیمتی کپڑے بخوشی دے دیتی تھیں بلکہ گرین روم میں آکر زنانے کپڑے پہننے میں مدد بھی دیتی تھیں۔

——— بریگیڈیر یعسوب علی ڈوگر

کالج اسپتال میں میٹرن تھیں۔ ان کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ آٹھویں درجہ کے نئے لڑکے ویکسینیشن اور ٹی سی، ٹی اے۔ بی کے انجکشن کے لیے ایک قطار میں کھڑے تھے۔ ہر لڑکے کو دو دو انجکشن لگ رہے تھے۔ مجھ سے آگے جو لڑکا کھڑا تھا شاید اس نے کبھی انجکشن نہیں لگوایا تھا۔ جوں ہی اس کی باری آئی وہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ مسز کارنیلیئس نے جو لڑکوں کے نمبر لکھ رہی تھیں جب اس سے نمبر پوچھا تو وہ بمشکل جواب دے سکا۔ انہوں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور اس سے کہا میرے بچے گھبراؤ نہیں میں تمہارے لیے باریک سوئی لاتی ہوں۔ وہ گئیں اور خاص طور سے اس کے لیے دوسری باریک سوئی لائیں۔ اس کے بازو کو ہاتھ میں لے کر پوچھنے لگیں کہاں سے آئے ہو۔ کتنے بہن بھائی ہیں۔ اس طرح اسے باتوں میں لگایا اور خود باریک سوئی سے اتنی تیزی سے ٹیکہ لگایا کہ جب اس نے مڑ کے دیکھا تو انہوں نے کہا بس بس لگ چکا۔ شاباش۔ اسی بات چیت کے دوران ٹیکا واقعی لگ چکا تھا۔ اس لڑکے کے چہرے پر سکون اور شکر گزاری کا جو تاثر تھا وہ نہیں بھول سکتا۔

——— میجر عبد الرشید اے ای سی

مسز کارنیلیئس کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ وہ بہت باوقار اور وضع دار اور کارپرداز

خاتون تھیں۔ جب بھی باقاعدہ ڈاکٹر موجود نہ ہوتا تو ڈاکٹر کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتی تھیں۔ ان کا گھر اسپتال سے ملحق ہی تھا، اس لیے بچوں کی نگہداشت کے لیے دن رات موجود ہوتی تھیں۔ اور ایک مشکل کام کو بہت خوبی سے انجام دے رہی تھیں۔ رات کو لائٹس آؤٹ کے بعد وارڈ میں ضرور جاتی تھیں اور ہمیشہ انگریزی میں ڈانٹ ڈپٹ کرتی تھیں۔

ان کی یہ وضع داری تھی کہ میں نے برسہا برس ان کو مغرب کے وقت اسپتال کے سامنے اپنے بچوں کے ساتھ ٹہلتے دیکھا۔ ایسٹر کے موقعوں پر وہ مجھے بھی اپنے گھر پر دعوت دیتی تھیں۔ ان کے بڑے بیٹے البرک کو شکار کا شوق تھا وہ اکثر میرے اور فردوس صاحب کے ساتھ شکار کو جایا کرتا تھا۔

مسز کارنیلیس تقریباً ہر روز تمام سٹاف کوارٹرز کا چکر لگاتی تھیں اور سٹاف کے خاندانوں کے صحتی مسائل سے کمانڈانٹ کو باخبر رکھتی تھیں۔ کمانڈانٹ کرنل رفیق ان کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ ان کے زمانہ میں وہ سٹاف میس کی باقاعدہ ممبر تھیں۔ کالج میں ان کا ایک خاص مقام تھا جو انہوں نے اپنی پروفیشنل اہلیت اور کرداری وضع داری سے بنایا تھا۔

کیپٹن ستار بخش ملک

——— بریگیڈئر محمد اکرم ظفر

۱۹۴۹ء میں ملک صاحب یہاں کچھ عرصہ کے لیے پوسٹ ہوئے تھے۔ میں نے ۱۹۴۹ء میں ایف ایس سی کے لیے ریاضی انہی سے پڑھی۔ استاد کا اپنا امتحان یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مضمون کا ذوق اپنا طلبا ء میں پیدا کر دے۔ ستار صاحب نے مجھے بہت کم عرصے پڑھایا لیکن اس طرح پڑھایا کہ نہ صرف میں ریاضی کے ساتھ ایف ایس سی کر سکا بلکہ ریاضی کا ذوق بھی پیدا ہو گیا۔ اس کے رموز کو بھی سمجھنے لگا۔ پھر بی ایم اے میں بھی ان سے ریاضی میں استفادہ کیا۔ ۱۹۶۰ء میں جب انگلستان میں ٹی ایس او کورس کے لیے گیا تو اس میں اچھی خاصی ریاضی تھی۔ اور کامن ویلتھ کے ممالک کے بہت سے افسر یہ کورس کر رہے تھے۔ ان سب میں میری کارکردگی بہت اچھی رہی یہ ستار بخش صاحب کی تدریس کا نتیجہ تھا۔ بہت ہی شریف النفس انسان تھے۔ نہایت سکون اور اطمینان سے ریاضی پڑھاتے اور مشکل سے مشکل مقام کو آسان بناتے جاتے۔ کبھی غصے میں نہیں آتے تھے۔ ایسے

شفیق استاد کہاں ملتے ہیں۔ یہ انہی کا فیضان تھا کہ ایف ایس سی فرسٹ ائر کے امتحان میں Do any five questions کے جواب میں، میں نے See any five questions لکھا اور آٹھوں سوال حل کر دیئے۔

سید آفاق احمد

——— بریگیڈئر محمد اکرم ظفر[1]

غالباً ۱۹۴۸ء کے اواخر میں کالج کے سٹاف میں شامل ہوئے۔ دبلے پتلے، سانولا رنگ نازک خدوخال، بکھرے بکھرے بال، اور پُر خمار آنکھیں عموماً سفید شیروانی اور علی گڑھ کا کھڑا پائجامہ پہنتے تھے۔ کبھی کبھی سوٹ میں بھی نظر آتے۔ لمبے بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر مچلتی رہتی تھی جسے وہ وقفہ وقفہ سے ہاتھ سے ہٹاتے رہتے ان کا سراپا شاعرانہ اور انداز دانشورانہ تھا۔ کلاس سے باہر شاذ ہی نظر آتے۔ کلاس میں بھی ہلے دبے رہتے۔ کلاس میں آتے ہی بغیر کسی تمہید کے پڑھانا شروع کر دیتے پڑھانے کے علاوہ کسی چیز سے سروکار نہ تھا۔ ایف ایس سی میں ان سے پوئٹری پڑھنے کا جو لطف آیا اس کی یاد آج بھی دل میں باقی ہے۔ پڑھاتے تو کلام کو اپنے اوپر طاری کر لیتے یوں جیسے شاعر نے ان کے دل کی بات چرا کر شعر میں ڈھال دی ہے۔ اشعار کو پڑھتے نہیں Recite کرتے تھے اور Recite کرتے ہوئے اس بے ساختگی سے داد دیتے کہ لطف آجاتا تھا۔ ایف ایس سی کی پوئٹری کی کتاب Bridges of song میں بڑی خوبصورت نظمیں تھیں۔ جب رابرٹ برنس کی رومانی نظم A Red, Red Rose

O my Love's like a red, red rose
That's newly sprung in June;
That's sweetly play'd in tune;
As fair art Thou my bonnie lass,
So deep in love am I;
And I will love thee still, my dear,
Till a' the seas gang dry:

---

[1] کالج نمبر ۱۲۲۳ زمانہ تعلیم ۱۹۴۲-۵۰ء

شروع کی تو پہلے ہی مصرع O my Love's like a red, red rose
پر پھڑک اٹھے۔ واہ، واہ کیا بات کہہ دی ظالم نے، Red, red rose اگر صرف
Red Rose کہتا تو بات نہ بنتی Red, red rose کتنی دلکش اور شوخ
Imagery ہے۔ میر نے بھی تو کہا ہے:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

"کی سی ہے" میں جو بلاغت ہے وہی حسن Red, red کی تکرار میں ہے کیٹس (Keats)
کہتا ہے A thing of beauty is a joy for ever
یہ ان کے پڑھانے کا کمال تھا کہ آج چالیس سال کے بعد بھی ان کی آواز اور ان کے پڑھانے کے
انداز کی Images میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہیں۔ پوری نظم بھی میں نے اسی یادداشت
سے لکھی ہے۔ بعض دفعہ کسی نظم کو اتنے ڈوب کر پڑھتے جیسے یہ ان کے اپنے دل کی آواز ہے۔
ایسے موقعوں پر ہمیں ان سے ہمدردی ہوجاتی۔ ہم میں سے بیشتر کا یہ سنجیدگی سے خیال تھا کہ وہ
خود محبت کے مارے ہوئے ہیں۔ غالباً ایسا نہ تھا صرف پڑھانے میں Involve ہونے
سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا۔ ایک اور نظم تھی Thomas Campbell کی
Lord Ullin's Daughter جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

A chieftain to the Highlands bound
Cries, 'Boat man, do not tarry;
And I'll give you a silver pound
To row us o'er the ferry.

اسے بھی آفاق صاحب نے اس طرح ڈوب کر پڑھایا کہ ہم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ ایک لوک
گیت (Ballad) ہے جس میں رومانی مہم جوئی اور محبت کی جنوں خیزیوں کی دردناک
داستان بیان کی گئی ہے۔ ہیروئن (لارڈ الن کی لڑکی) اپنے محبوب (ہائی لینڈ سردار) کے ساتھ
فرار ہوتی ہے، اس کا باپ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ دو دن دو راتوں سے اس کا تیزی سے پیچھا کر
رہا ہے۔ اب وہ ساحل پر پہنچتے ہیں کہ سمندر میں شدید طوفان آیا ہوا ہے۔

A Chieftain to the highlands - bound
Cries, Boat man, do not tarry;
And I'll give you a silver pound
To row us o'er the ferry.

ملاح پیسے کے لیے نونہیں اس کی حسین محبوبہ کی خاطر اس طوفان میں بھی انہیں کشتی میں بٹھا کر کشتی کے لنگر کھول دیتا ہے۔ اتنے میں تعاقبی لشکر کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سُنائی دینے لگتی ہیں۔ لڑکی اس ملاح سے کہتی ہے۔

"O haste thee, haste; the lady cries
Though tempests round as gather;
I'll meet the raging of the skies;
But an angry, father.

اس بند کو آفاق صاحب نے اس طرح بار بار دہرایا کہ طوفانی سمندر کی بپھری موجوں میں ہچکولے کھاتی کشتی میں بیٹھی اس پرعزم لڑکی کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگی۔ طوفان کی غضب ناکی میں اضافہ ہوتا رہا لیکن محبت کے دیوانوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔

And still they rowed amidst the roar
Of waters fast prevailing
Lord Ullin reached the fatal shore
His wrath was changed to wailing.

آخر کار کشتی ڈوبنے کا منظر سامنے آیا۔

For sore dismayd, through storm and shade
His child he did discover
One lovely hand stretched for aid,
And one was round her lover.

آخری دو مصرعوں

کو آفاق صاحب نے اس طرح ڈرامائی انداز میں Express کیا کہ ان میں جو درد اور حسن ہے وہ ہمارے دلوں کی دھڑکنوں میں شامل ہوگیا۔ آفاق صاحب کے پوئٹری پڑھانے سے ہم شاعرانہ احساسات اور شاعری کی فنی نزاکتوں سے کچھ آشنا ہوئے۔ Regimentation

کے ماحول میں وہ بھی عہدِ سٹیبنگ کی ہوش ربا سختیوں کے بعد آفاق صاحب کا شاعرانہ اور فلسفیانہ وجود تازہ ہوا کے جھونکے سے کم نہیں تھا۔ وہ بہت تھوڑا عرصہ کالج میں رہے لیکن جتنا عرصہ رہے علم وفن کے Red, Red Rose کی طرح رہے۔ جس جس نے ان سے پڑھا وہ تعلیم کے اس Red, Red Rose کی بے مثال خوبصورتی اور خوشبو سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور اس کی ایجوکیشن میں ایک نئی Dimension کا اضافہ ہوا۔ جو کسی اور طرح ممکن نہ تھا۔ اس کالج کے ناقابل فراموش استادوں کی Galaxy میں ایک روشن نام آفاق صاحب کا بھی ہے جنہیں ستارۂ صبح کہنا چاہیے۔

——— سید عترت حسین

مسٹر آفاق کی انگریزی میں جادو تھا۔ ان کے لفظ لفظ کو ہم مسحور ہو کر انہیں سنتے تھے وہ انگریزی کے Artisan نہیں آرٹسٹ تھے۔ وہ بہت تھوڑے عرصے یہاں رہے غالباً ان کی تنہا یادگار وہ ایک انشائیہ ہے جو انہوں نے مئی ۱۹۴۹ء کے کالج میگزین میں Of Cigarettes کے عنوان سے لکھا۔ اس میں سٹائل کا جو حسن ہے جو Subtle humour ہے، جو زیریں شوخی ہے اس کا لطف تو پورا انشائیہ پڑھنے ہی سے اٹھایا جا سکتا ہے۔ نمونے کے طور پر میں ان کی یاد میں اس بہت ہی خوبصورت انشائیے کے آخری دو پیرے نقل کرتا ہوں۔

It will do your heart good to see in CHURCHILL's with his inseparable for Cigar between fat lips. Without it he would have been never Churchill, but, with it, he has done wonders - nay, he has worked a miracle - a miracle in the twentieth century which is not a fruitful soil for the performance of miracles, that, somehow, used to occur on such a large scale in the past, confound them. His cigar has beaten the Germans not only black and blue but into all the colours of the rainbow. Consider for a while, your non-smoker Mr.

Clement Attlee to whose bungling the British people should be grateful for dismembering the empire over which the sun had never set. The beloved Quaid-e-Azam (May his soul ever watch over us) was dainty in his cigarettes as he was fastidious in every thing else. Little do we realise that is due to his Stage Express Cigarettes, that in large measure, we owe the glorious birth of Pakistan. From all this let me conclude, therefore that all your prestigious, Himalayan blunders are your tee totallers (May their tribe never increase).

——— لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال

استاد جو کچھ پڑھاتا ہے اس سے کہیں زیادہ قیمتی چیز خود اس کی شخصیت ہوتی ہے۔ طلبار استاد کے پڑھائے ہوئے نصاب سے بہت جلد آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن اس کی شخصیت سے جو اثرات قبول کرتے ہیں ان کی روشنی زندگی کے سفر میں مسلسل ان کے ساتھ رہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بیشتر اساتذہ انسٹرکٹر کی منزل سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ جو صحیح معنوں میں استاد ہوتے ہیں اور اپنی انفرادیت رکھتے ہیں وہ زندگی بھر ایک حوالہ بنے رہتے ہیں۔ حیدری صاحب کے علاوہ کم از کم میرے لیے یہ مقام مسٹر آفاق احمد کو حاصل تھا۔ ۱۹۴۸ء میں کالج میں آئے تھے بہت تھوڑے عرصے کالج میں رہے غالباً چند ماہ لیکن ان کے یہ چند ماہ دوسروں کے سالوں پر بھاری تھے۔ انگریزی پڑھاتے تھے۔ خاص طور سے پوئٹری پڑھانے کے ماہر تھے۔ ماہر کیا ماہروں کے ماہر تھے۔ میں ان کے پڑھانے کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایک کلاسیکی پروفیسر کی طرح اپنے مضمون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت ہماری ذہنی سطح سے بہت بلند ہو کر پڑھاتے تھے۔ ان کے بیشتر نکات اور حوالے ہمارے سروں پر سے گزر جاتے تھے۔ مگر روشنی کی ان لہروں میں سے کوئی لہر ذہن میں اٹک کر رہ بھی جاتی تھی۔ مثلاً آج بھی یہ لائن یاد ہے۔

Let ROME in Tiber melt. My place is here.

مگر یہ یاد نہیں کہ یہ لائن کس سلسلہ میں سنائی تھی یہ بھی بہت بعد کو پتہ چلا کہ یہ لائن شیکسپیئر کے شہرۂ آفاق ڈرامے جولیئس سیزر کی ہے۔ آفتاب صاحب اکثر کہا کرتے اگر پوئٹری کو صحیح طریقے سے پڑھوگے تو آدھا مفہوم از خود پالوگے اور صحیح اس وقت پڑھ سکو گے جب نظم کے جذبے کو محسوس کرلوگے۔ پوئٹری پڑھاتے وقت وہ اچھا خاصا وقت نظم کے ہر بند اور سطر کو صحیح طریقے سے ادا کرنے اور اس کے تجربے کو Recreate کرنے پر صرف کرتے تھے۔ جو بات میں ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آفاق صاحب کے اس طرح پڑھانے سے ہمارے ذہن جاگے، ہمیں لاشعوری طور پر علم کی نئی سمتوں کا احساس ہوا۔ اور مجھے یقین ہے کہ میری طرح اور بہتوں نے بھی روشنی کی پھوار اپنے دلوں میں اترتی محسوس کی ہوگی۔ ایسے کلاسیکل استاد کم ہوتے ہیں لیکن ہوتے ضرور ہیں۔ اس طرح کے ایک اور استاد پی۔ ایم اے میں ڈاکٹر مظہر علی خاں تھے۔ اللہ اکبر ان کا کیا علم تھا اور کیا شخصیت۔ وہ فائنل ٹرم میں پاس آؤٹ ہونے سے قبل ایک طویل لیکچر انسانی تعلقات (Human Relations) پر دیتے تھے۔ عملی زندگی کا وہ کون سا پہلو تھا جو وہ اپنے لیکچر میں کور نہیں کرتے تھے۔ انگریزی کا تو خیر کیا کہنا۔ آفاق صاحب اور ڈاکٹر صاحب مظہر علی خاں ایسے لوگ صرف مدرس نہیں معلم ہوتے ہیں اور کسی ادارہ کی سب سے قیمتی متاع۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ آفاق صاحب ملٹری کالج میں زیادہ عرصے نہ ٹھہر سکے۔ آخر کیوں؟

ایک روز عمر خیام کا ذکر آگیا۔ پہلے تو بتایا کہ وہ بڑے پائے کا سائنس دان بھی تھا۔ Astronomy کی دنیا میں اس کا بڑا مقام ہے لیکن مشہور وہ شاعر کی حیثیت سے ہوا پھر انہوں نے فٹزجیرالڈ کے Version میں خیام کی ایک رباعی سنائی جو اس وقت بھی مجھے یاد آرہی ہے۔

The Moving Finger writes, and having writ,
Moves on nor all thy piety nor wits
Shall lure it back to cancel half a line
Nor all thy Tears wash out a word of it.

مجھے کچھ یاد پڑتا ہے انہوں نے عمر خیام اور ہارڈی کے Fatalism پر بھی گفتگو کی

تھی۔ وہ استاد نہیں جادوگر تھے۔ یہ جادوگری نہیں تو کیا ہے کہ ان کی پڑھائی ہوئی اور Quote کی ہوئی نظموں کے بند کے بند مجھے آج بھی مختلف اوقات میں یاد آتے رہتے ہیں۔

———— تنویر احمد سید انجینئرز

آفاق صاحب کے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے تو خود ہر نظم کو نظم کی طرح پڑھتے یعنی Recite کرتے تھے۔ پھر ہم سے Recite کرواتے اس کے بعد وضاحت کرتے، بیک گراؤنڈ سمجھاتے ان کی کوشش ہوتی کہ ہم نظم کی سپرٹ کو یا اس کے Emotion کو محسوس کریں اگر رزمیہ نظم ہوتی تو وہ اسے Declamation کے انداز میں سنانے ڈرامائی Touches دیتے۔ ان کا پوئٹری کا پیریڈ سب سے دلچسپ پیریڈ ہوتا تھا۔ یاد ہے کہ انہوں نے ٹینی سن کی نظم The Charge of Light Brigade ۱۸۵۴ء کی Cremian War کے ایک حقیقی واقعہ پر مبنی اس نظم کو انہوں نے اس ڈرامائی انداز سے پڑھایا اور اس کی Theme :

Theres not to reason why

Theres but to do and die

کو پاکستانی فوج کے حوالے سے ہمارے دلوں میں اتار دیا۔ یہ آفاق صاحب کے پڑھانے کا اعجاز تھا کہ ہمیں انگریزی پوئٹری سے محبت ہوگئی۔ میں چاہتا ہوں کہ کالج کی تاریخ میں ان کا ذکر سونے کے حروف میں کیا جائے۔

———— زمان بھٹی ایڈووکیٹ

۴۹-۱۹۴۸ء میں انہوں نے ہمیں فرسٹ ایئر میں انگریزی پڑھائی۔ انگلش پوئٹری ہم پہلے بھی پڑھتے تھے اور شاید نثر کے طور پر پڑھتے تھے۔ انہوں نے نظم کو نظم کی طرح پڑھایا وہ ضرور شاعر ہوں گے۔ پوئٹری پڑھتے بھی ترنم سے تھے۔ انگلش پوئٹری کے آہنگ کا تھوڑا بہت احساس انہیں کے پڑھانے سے ہوا۔ ان کی پڑھائی ہوئی نظمیں یاد بھی فوراً ہو جاتی تھیں۔ رابرٹ ہیرک کی نظم Gather Ye Rose lids اس وقت بھی یاد آ رہی ہے۔

Gather Ye roselids while Ye may,
Old Time is still aflying
And the same flower that smiles today
Tomorrow will be dying.

اس کو پڑھاتے ہوئے انھوں نے بتایا تھا کہ زندگی میں مواقع بار بار نہیں آتے۔ بقول شیکسپیئر

There is a tide in the affairs of men

حالی نے پوری نظم کو اس مصرع میں نچوڑ کر رکھ دیا ہے:

کچھ کر لو نوجوانو، اٹھتی جوانیاں ہیں

افسوس کہ آفاق صاحب کالج میں زیادہ عرصہ نہیں رہے لیکن ان کی خوشبو باقی ہے۔

کیپٹن محمد شفیع [۱]

—— خادم حسین

کیپٹن شفیع نے جو بعد میں بریگیڈیر ہو کر ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن کے منصب سے ریٹائر ہوئے مجھے دسویں اور ایف ایس سی میں حساب پڑھایا۔ پڑھانے میں اتنے ماہر تھے کہ میں جو آرمی سپیشل میں دو بار فیل ہو گیا تھا ان کے پڑھانے سے حساب کلیر کر لیا بہت تیز بولتے اس سے زیادہ تیز لکھتے اور حساب کے سوال اس تیزی سے حل کرتے کہ ہماری نظریں فالو نہ کر پاتیں ایک آدھ بار تو میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ ان کی نظریں کہیں اور ہوتیں لیکن انگلیاں سوال صحیح حل کر رہی ہوتیں۔ پھرتی اور تیزی ان کی پوری زندگی میں تھی۔ چلتے بھی تیز تھے۔ شاید ان کا ذہن Flashes میں کام کرتا تھا۔ ان کی ذہانت ان کے ہر کام سے پھوٹی پڑتی تھی۔

۱۹۵۳-۵۴ء میں سکین ہاؤس میں جو اس وقت بے بی ہاؤس تھا وہ اس کے ہاؤس آفیسر تھے اور ہاؤس ماسٹرز مسٹر منظر اور سر راشد۔ اس سے پہلے کہ میں ہاؤس کے حوالے سے کچھ کہوں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ لکھوں۔ فرسٹ ائیر میں، ایک دن اتفاق سے ایسا ہوا کہ اس دن کا مجوزہ سبق چند منٹ پہلے ختم ہو گیا تو کچھ اس وجہ سے کہ میں آئی ایس ایس بی کے سامنے جانے والا تھا اور کچھ ہاؤس کے رشتے سے میں نے ہمت کر کے ان سے پوچھ لیا کہ سر اپنے بارے میں بھی کچھ بتائیں (ہمت کر کے اس لیے لکھ رہا ہوں کہ وہ پیریڈ کے پہلے منٹ سے لے کر آخری لمحہ تک اس طرح انہماک سے پڑھاتے تھے کہ کوئی اور بات کرنے یا پوچھنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور یوں بھی وہ غیر متعلق بات نہ کرتے تھے اور نہ

---

[۱] قبلہ شفیع صاحب بریگیڈیر کے عہدہ اور ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن کے منصب سے ریٹائر ہوئے۔

کرنے دیتے تھے) بہر حال اس دن میں نے یہ سوال کر لیا اور اس کا جواب بھی انہوں نے دیا۔ فرمایا

تم لوگ بہت خوش قسمت ہو کہ یہاں وہ تمہارا ہاؤس ہے۔ یہ بین بلاک ہے اور پڑھنے کھیلنے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں کوئی کام نہیں دنیا جہان کی سہولتیں اور آسائشیں رہنے سہنے اور تعلیم کی میسر ہیں۔ میں گورداسپور کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ نزدیک ترین سکول چار میل کے فاصلے پر تھا۔ سکول سے واپس آکر کھیتوں میں چارہ کاٹنے چلا جاتا تھا۔ لالٹین کی بھی نہیں سرسوں کے تیل کے دیئے کی روشنی میں ہائی سکول کیا۔ وظیفے پر کالج میں پڑھا۔ اس زمانہ میں سول سروس کا سب سے بڑا امتحان آئی سی ایس کا تھا اس کا مقابلہ کا تحریری امتحان تو پاس کر لیا تھا۔ آگے خاندانی غربت آڑے آئی۔ سول سروس کے انتخاب میں خاندان کا Status بھی ایک ضروری شرط تھی۔ بہر حال برسوں کوشش کرنے کے بعد کمیشن کے لیے سیلیکٹ ہوا۔

ہاؤس میں وہ انتھک کام کرتے تھے ہر روز ہاؤس میں آتے اور کوئی کام ایسا نہ تھا جس کی نگرانی وہ خود نہ کرتے ہوں۔ کرنل رفیق نے آکر ہر ماہ انٹرویو کا سسٹم شروع کیا تھا۔ شفیع صاحب بہ نفس نفیس ہر لڑکے کا انٹرویو اس پر پلس اور مائنس Observation کی روشنی میں کرتے تھے۔ انٹرویو کرنے اور رپورٹ لکھنے کا ان کا اپنا طریقہ تھا۔ پلس اور مائنس پوائنٹس الگ الگ لکھتے تھے تاکہ سمجھنے اور سمجھانے میں آسانی ہو۔ ان کا طریقہ کار سائنٹیفک تھا۔

——— کرنل محمد یونس[1]

کرنل یونس: سر، ۱۹۵۱ء میں جب ہم آسی کلاس میں آئی ایس ایس بی کی تیاری کر رہے تھے تو آپ مسٹر اقبال کے پیریڈ میں چند روز ہمارا ڈسکشن گروپ لینے آئے تھے۔ آپ نے لیڈرشپ کے سلسلہ میں کہا تھا کہ جنگ میں جیتنے کا عزم (Will to win) زندگی میں جینے کا عزم (Will to live) اور تعلیم میں سیکھنے کا عزم (Will to learn) بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

بریگیڈیئر محمد شفیع: جی ہاں، کبھی کبھی تو ہار یا جیت کا فیصلہ اسی Factor پر ہو جاتا ہے

---

[1] کالج نمبر ۱۶۰۶ زمانہ تعلیم ۵۲-۱۹۴۷ء

لیکن جب تک یہ Will ایک Passion کی صورت نہ اختیار کر لے تو بات نہیں بنتی۔

کرنل یونس : سر مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ نے طارق بن زیاد سے لے کر ابراہام لنکن، مصطفٰے کمال اور قائداعظم تک بہت سے لیڈرز کی مثالیں دی تھیں جن کے ناقابل شکست عزم نے تاریخ میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کیا تو میں نے آپ سے یہ پوچھا تھا کہ سر، آپ کا اپنا تجربہ کیا ہے تو آپ نے اپنے کمیشن سے پہلے کی زندگی کے چند بہت ہی Inspiring واقعات مثلاً وہ آپ کا آٹا دال کوئلے لاد کر جائے ملازمت پہ لے جانا۔ وہ انڈے وغیرہ فروخت کر کے کام چلانا، وہ چند استادوں کا آپ کو سہارا دینا۔ پھر پارٹیشن کے موقع کے المناک حوادث آپ نے سنائے تھے۔ ان واقعات و حوادث کی تفصیلات میرے ذہن سے اتر گئی ہیں۔ لیکن ان کی انسپریشن زندگی کے مشکل لمحوں میں ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہے میرے چراغوں میں آپ سرفہرست ہیں۔ میں آج اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ ان واقعات کی تفصیلات آپ سے دوبارہ پوچھوں تاکہ قطرہ کے گہر ہونے تک کی Most inspiring داستان دوسروں کے بھی کام آسکے۔

بریگیڈیئر محمد شفیع : اس وقت برسبیل تذکرہ میں نے ضرور کچھ اپنے بارے میں بتایا ہوگا نئی نسل کے لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اپنے غریب لیکن غیور والدین، اور اپنی پرصعوبت لیکن باغیرت ابتدائی زندگی پر فخر ہے جو کچھ آج میں ہوں یہ سالہاسال کی کوہ کنی کا نتیجہ ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اپنے بارے میں کچھ کہنا میرے لیے مناسب ہوگا۔ اپنے منہ سے اپنی جدوجہد کی داستان اچھی نہیں لگتی۔

کرنل یونس، نہیں سر، آپ کو تو اپنی سوانح حیات لکھنی چاہیے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ ایک بے یارومددگار دیہاتی بچہ کن منزلوں سے گزر کر ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن بنا اور اے ای سی میں اس وقت کے امکانی بلندترین عہدے (بریگیڈیئر) تک پہنچا۔ کم ازکم میں تو آپ سے مسلسل انسپریشن لیتا رہا ہوں۔ میری طرح آپ کے بہت سے شاگرد آپ سے انسپائر ہوئے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اس چراغ کو باہر آنا چاہیے۔ اس لیے براہ کرم سر، محض دوسروں کی رہنمائی

کے خیال سے اپنی زندگی کے اس دور سے ضرور پردہ اٹھائیں اس لیے پہلے تو آپ یہ بتائیں کہ بچپن کہاں اور کیسے گزرا؟

بریگیڈیر محمد شفیع : میری پیدائش قصبہ دھرم کوٹ رندھاوا کی ہے یہ خاصا بڑا قصبہ ڈیرہ بابا نانک کے قریب ضلع گورداسپور میں واقع ہے۔ میں سات سال کا تھا اور دھرم کوٹ کے پرائمری سکول کی دوسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ اچانک میرے والد کا انتقال ہو گیا اس وقت میرا چھوٹا بھائی صرف چودہ دن کا تھا۔ والد کی معمولی سی ملازمت تھی جوان کے ساتھ ختم ہو گئی۔ رہنے کو ایک چھوٹا سا کچا مکان تو تھا لیکن کوئی اور جائداد یا زمین نہیں تھی جو ذریعۂ معاش بن سکے اس لیے ہم اپنے ننھیال کے پاس چلے گئے یہ لوگ گورداسپور شہر سے کوئی پانچ میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے نانا اور پھر ماموں صاحبان ہمیں کچھ جنس دے دیا کرتے تھے جس پر ہمارا گزارا تھا۔ ماں جی کیسے ہم تین جانوں کا رشتہ زندگی سے برقرار رکھے ہوئے تھیں یہ سمجھنے سے میں آج تک قاصر ہوں کہ ایک دور افتادہ گاؤں کی اس ان پڑھ خاتون نے ساری بازی میری اور میرے بھائی کی تعلیم پر کیوں لگا دی تھی۔ ان کی غیرت اور دیانت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنے بھائیوں یعنی میرے ماموں سے باوجودیکہ وہ ننھیال کی تمام زرعی کمائی پر تصرف رکھتے تھے نہ کوئی مدد مانگی اور نہ لی۔ کہا کرتی تھیں اگر میں نے اپنے بھائیوں سے کچھ مانگا یا حصہ سے زائد لیا تو میرے بچے امتحان میں فیل ہو جائیں گے۔

آپ مجھے چراغ کہہ رہے ہیں اور چراغوں کی قطار میں شامل کر رہے ہیں۔ میں کہاں اور چراغ کہاں۔ چراغ تو وہ تھیں جو بیوگی کی چوٹ کھا کر مردانہ وار اٹھ کھڑی ہوئی تھیں سوچ ایسی کہ پہلی ترجیح تعلیم کو بنایا اور غیرت اتنی کہ کسی سے کچھ مانگا نہیں۔ دو چار برس نہیں بیس برس کے طویل عرصے میں، ۱۹۴۳ء میں میرے سنسر بورڈ میں ملازم ہونے تک کتنی جدوجہد کی، کتنے صبر آزما مرحلوں سے گزریں۔ اس کا حساب اور اجر اللہ ہی کے پاس ہے۔ ویسے شکر الحمدللہ کہ انھوں نے اپنی جان جوکھوں سے پروان چڑھائی ہوئی کھیتی کو لہلہاتے ہوئے بھی دیکھا۔ ۱۹۶۷ء میں جب ان کا لالہ زار کی اسی کوٹھی میں

انتقال ہوا تو میں لیفٹیننٹ کرنل تھا۔ کار تھی، دوسرے وسائل تھے حتی المقدور میں نے ان کی خدمت بھی کی۔ لیکن ماں اور خصوصاً بیوہ ماں کے احسانات کا بدلہ چکانا ممکن ہی نہیں۔

کرنل یونس: ایسی باشعور اور غیور مائیں اصل میں قوم کا قیمتی اثاثہ ہوتی ہیں۔

بریگیڈیر محمد شفیع: جی ہاں، اس میں کیا شک ہے؟

کرنل یونس: سر، آپ اپنے بچپن کے حالات اور واقعات سنا رہے تھے۔

بریگیڈیر محمد شفیع: جی، تو ۱۹۲۷ء میں، پانچویں جماعت میں، میں نے گورنمنٹ ہائی سکول گورداسپور میں داخلہ لیا۔ یہ سکول ہمارے ننھیالی گاؤں سے پانچ میل دور تھا۔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۳ء تک چھ برس تک میں پیادہ پانچ میل آتا اور پانچ میل جاتا رہا۔ گو سائیکل مل سکتا تھا جیسا کہ میرے چھوٹے بھائی نے ضد کر کے لیا۔ لیکن میں نے گھر کی صورت حال کے پیش نظر اس کے لیے اصرار نہ کیا۔ یہ چھ سال مجھ پر بہت سخت گزرے۔ گو گھر میں کھانے پینے کی ایسی قلت نہیں تھی۔ پھر بھی روزانہ دس میل آنے جانے کی مشقت اور بے وقت کھانے پینے سے میری صحت ضرور متاثر ہوئی اور قد چھوٹا رہ گیا۔ چنانچہ مجھے سکول کی پی ٹی کے پیریڈ میں چھوٹے لڑکوں کی پہلی لائن میں کھڑا ہونا پڑتا (پانچویں جماعت کا میں تنہا لڑکا تھا جو دوسری تیسری کے بچوں کی صف میں کھڑا ہوتا) بعض ستم ظریفوں نے جو صبح شام مجھے پیدل آتے جاتے دیکھتے رہتے تھے مشہور کر دیا تھا محمد شفیع جتنا رات کو بڑھتا ہے دن کو آتے جاتے اتنا گھس جاتا ہے۔ اس دوران میں اکثر گھر سے فالتو دو چار انڈے لے جاتا تاکہ ان کو بیچ کر میں اپنی چھوٹی موٹی ضروریات پوری کر سکوں۔ تنگدستی کے اس طویل دور میں میری والدہ پر کیا گزری وہ مجھے نہیں معلوم لیکن انھوں نے ہمیں کبھی بھوکا نہیں سونے دیا۔ بلکہ مجھے اب گمان ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے وسائل کے لحاظ سے غالباً اپنا پیٹ کاٹ کے ہمیں اچھا ہی کھلایا اور موٹا جھوٹا پہناتی بھی رہیں غرضیکہ وہ ہماری بنیادی ضرورتیں کسی نہ کسی طرح پوری کرتی رہیں۔ وہ صرف ایک معاملہ میں سخت تھیں اور وہ میری پڑھائی کا معاملہ تھا۔ گرمیوں میں سکول چونکہ

سات بجے لگتا تھا اور گھر میں کوئی گھڑی نہیں تھی۔ اس لیے صبح سویرے جس وقت آنکھ کھلتی رات کی روکھی سوکھی کھا کر میں چل پڑتا۔ اکثر تو تارے کھلے ہوتے راستہ میں ہندوؤں کے دو مرگھٹ پڑتے تھے۔ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے بہت ڈر لگتا اکثر جنگلی کتوں سے بھی واسطہ پڑتا۔ کبھی کبھی لمبے سانپ بھی راستہ کاٹ جاتے۔ واپسی کا مرحلہ چلچلاتی دھوپ کی وجہ سے سخت تر ہوتا تھا۔ پیاس سے اور تھکن سے بُرا حال ہوتا لیکن اس خیال سے کہ ماں دروازہ پر لسی کا کٹورا لیے کھڑی ہوگی میرا قدم رکتا نہیں تھا۔ جاڑوں میں سکول چونکہ صبح دس بجے لگتا تھا۔ اس لیے سوائے صبح کی سردی کے کوئی اور مسئلہ نہ تھا۔ آٹھویں نویں میں پہنچتے پہنچتے میں اکثر جاڑوں میں اپنے حساب کے بنگالی استاد مسٹر بنرجی سے حساب پڑھنے کے لیے ان کے گھر چلا جاتا تھا۔ جب کبھی ان کے ہاں رکنا ہوتا تو میں گھر بتا کر جاتا کہ ماں جی آج میں دیر سے آؤں گا۔ ایک روز میں ان کو یہ بتا کر نہیں آیا تھا اتفاق سے اس روز دیر بھی ہوگئی اتنی کہ گورداسپور سے نکلتے نکلتے ہی سورج غروب ہونے لگا تھا۔ بہر حال میں جب گاؤں پہنچا تو خاصا اندھیرا بلکہ رات ہو چکی تھی ماں گاؤں سے خاصی دور باہر آکر لالٹین لیے بیٹھی تھیں۔ مجھے آتا دیکھ کر انہوں نے دوڑ کر مجھے گلے لگایا۔ ان کے گرم آنسوؤں سے مجھے اندازہ ہوا کہ ماں تا کیا چیز ہے۔ اس واقعہ کے بعد سے میں ان کو بتائے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں نکالتا تھا اور واپسی کے بتائے وقت سے پہلے خواہ کچھ ہو جائے ضرور گھر میں واپس آجاتا تھا۔ زندگی کے آخری چند سال انہوں نے یہاں اس گھر میں گزارے اس وقت میرا معمول تھا کہ ان کو بتا کر باہر جاتا تھا۔ اور متوقع وقت سے پہلے واپس آتا تھا جب جی ون ہوا اور گھر میں فون لگ گیا تو بصورت مجبوری فون کر دیا کرتا تھا۔ محبت کا احترام کرنا واجب ہی نہیں فرض ہے۔ ہاں تو میں سکول آنے جانے کی بات کر رہا تھا۔

کرنل بونس : جی، سر۔

بریگیڈئر محمد شفیع : جب میں دسویں جماعت میں پہنچا اور میٹرک کے امتحان کی تیاری شروع کی تو امتحان سے دو تین ماہ پہلے میرے وہی مہربان استاد مسٹر بنرجی کہنے لگے۔ گاؤں آنے

جانے میں تمہارا بہت وقت ضائع ہوتا ہے جس سے تمہارا رزلٹ متاثر ہو سکتا ہے اس لیے بہتر ہے کہ تم یہیں شہر میں رہنے لگو۔ پھر انہوں نے میرے ٹھہرنے کے مسئلہ پر عربی کے استاد مولوی محمد عالم صاحب سے گفتگو کی۔ بنرجی صاحب مجھے خود اپنے پاس رکھنے کو تیار تھے۔ لیکن اس خیال سے کہ کہیں کوئی مذہبی مسئلہ نہ اٹھ کھڑا ہو انہوں نے اس پر اصرار نہ کیا۔ آخر کار طے یہ ہوا کہ میں رہوں مولوی صاحب کی بیٹھک میں اور کھانا کارپنیٹری کے استاد محمد دین کے ہاں کھایا کروں۔ صبح کو آدھ سیر دودھ کا انتظام خود بنرجی صاحب نے اپنے خرچ پر ایک قریبی دوکاندار کے ہاں کر دیا تھا شام کو میں ان سے حساب پڑھتا تھا۔ مسٹر بنرجی کی ہمدردانہ دوراندیشی اور بروقت اقدام اور مولوی محمد عالم صاحب اور محمد دین صاحب کے بھرپور تعاون کی وجہ سے میں میٹرک فائنل کے امتحان میں نہ صرف اپنے سکول بلکہ پورے ضلع میں فرسٹ آیا۔ الحمد للہ۔ اپنے استادوں کی صف میں میں اپنا پہلا چراغ مسٹر بنرجی کو سمجھتا ہوں۔ صرف استاد شاگرد کے ناطے سے، صرف انسانیت کے حوالے سے انہوں نے مجھے اس وقت سہارا دیا جو میرے کیریئر کے لیے بہت ہی Crucial تھا۔ ان مہربان استادوں کی شفقت سے میرا چند ماہ گورداسپور میں رہ کر میٹرک کے امتحان کی تیاری کرنا اور پھر فرسٹ آنا میں سمجھتا ہوں کہ بفضلِ خدا میری زندگی کا Turning point تھا فرسٹ ایئر میں میں نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ہر چند کہ میٹرک کے امتحان کی میرٹ پر میرا پچیس روپے ماہانہ کا وظیفہ اصولی طور پر لگ چکا تھا لیکن ہنوز جاری نہ ہوا تھا۔ اس لیے اب پھر وہی مسئلہ پیدا ہوا کہ وسائل کہاں سے آئیں۔ اس مرحلہ پر گورداسپور کے ایک مسلمان وکیل شیخ چراغ دین میرے آڑے آئے۔ ان کی سفارش پر لاہور میں ان کے خسر نے زمان ٹرسٹ سے لاہور میں میرے تعلیمی اخراجات پورے کیے جو بعد کو میرے وظیفے سے منہا ہوتے رہے۔ اللہ کے کرم سے پھر ایف اے میں بھی وظیفہ ملا جو بی اے کے اختتام تک ملتا رہا۔ ۱۹۳۷ء میں، میں نے اسلامیہ کالج سے بی اے کیا۔

کرنل یونس: یہ جو چار سال آپ نے اسلامیہ کالج لاہور میں گزارے یہ آپ کی تعلیم اور شخصیت

کے ارتقار کے حوالے سے کیسے رہے ؟

بریگیڈیر محمد شفیع : اس عرصہ میں مالی لحاظ سے نسبتاً آسودہ رہا۔ اس لیے تعلیم پر زیادہ توجہ دینے کا موقع ملا۔ ذہنی افق وسیع تر ہوا۔ میٹرک تک میرا مطالعہ لازماً اور ضرورتاً نصابی کتابوں تک محدود تھا۔ لاہور کے در و دیوار علم اور فضل کی روشنی سے روشن تھے۔ یہاں آکر میرے ذہن کے دریچے کھلنے شروع ہوئے۔ اب تک میں، معلومات کی دنیا میں سفر کر رہا تھا۔ یہاں سے علم کی سرحدیں شروع ہوئیں اس زمانہ کے لاہور میں علامہ اقبال کے علاوہ، ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، صوفی تبسم، عبدالمجید سالک، مولانا مہر، پطرس بخاری، وغیرہ علم و فضل میں ایک سے ایک بڑھ کر شخصیت موجود تھی۔ خود ہمارے اسلامیہ کالج کے پرنسپل اس دور کی علمی شخصیت ایکس آئی ای ایس، قرآن حکیم کے انگریزی مترجم علامہ عبداللہ یوسف علی تھے۔ ان کے علاوہ بھی اسلامیہ کالج کے سٹاف پر ڈاکٹر سعید اللہ، ڈاکٹر عبدالواحد جیسے مشہور اساتذہ تھے۔ گو ان حضرات سے میرا براہ راست تعلق یا رابطہ نہیں تھا لیکن روشنی کی لہریں کتنی بھی دور ہوں محسوس ضرور ہوتی ہیں۔ اسلامیہ کالج کا زمانۂ تعلیم میرے ذہنی ارتقار کے لیے ایک اہم منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تجربہ کی بنار پر میری پختہ رائے ہے کہ کم ازکم انسان کی کالجی تعلیم جب تک کسی روشنیوں کے شہر (مرکز علوم و فنون) میں نہ ہو، جہاں اس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ Exposure اس دور کے کم ازکم چند بہترین دماغوں سے نہ ہو تو اسے علم کی وسعتوں اور گہرائیوں کا اندازہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ذہنی افق کی توسیع کا کوئی اور ذریعہ نہیں اس زمانہ کا اسلامیہ کالج بڑے معرکہ کی چیز تھا۔ وہاں اسلامی قوم پرستی کی روایت موجود تھی، وہاں کے اس دور کے بہت سے اولڈ بوائز نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسلامیہ کالج کے ریواز ہوسٹل کے میرے ایک ساتھی اور کلاس فیلو ایبٹ آباد کے محمد شریف تھے جنہوں نے بعد کو نسیم حجازی کے نام سے صحافت اور تاریخی ناول نگاری میں بڑا نام پایا۔ سید ضمیر جعفری بھی وہیں پڑھتے تھے۔

کرنل یونس : سر، آپ اپنے تعلیمی کیریر کی بات کر رہے تھے۔

بریگیڈیر محمد شفیع : جی ہاں، ۱۹۳۷ء میں بی اے کرنے کے بعد میں نے بٹالہ ضلع گورداسپور کے ایک

سکول میں بغیر معاوضہ کے سکول ماسٹری شروع کی محض اس لیے کہ سکول میں پڑھانے کی وجہ سے میں ایم اے عربی کا پرائیویٹ امتحان دے سکوں۔

—— بٹالہ میں میرے حقیقی چچا بھی رہتے تھے۔ والدہ نے میری تربیت اس طرح کی تھی کہ بجائے ان پر بوجھ بننے کے میں نے پانچ روپیہ ماہانہ پر ایک کمرہ کرائے پرلے کر رہنے کی ٹھانی اور خود کچی پکی روٹی اور بڑے اچھے چاول پکا کر دن گزارے۔ خرچ بچانے کے لیے بیس پچیس میل دور گھر سے آٹا دال حتیٰ کہ کوئلے سائیکل پہ لاد کے لانا تھا۔ اس مہم پہ عموماً میرا چھوٹا بھائی میرے ساتھ آتا اور سائیکل بٹالہ سے واپس لے جاتا۔ ایم اے کر کے میں نے دو بار آئی سی ایس کے تحریری امتحان میں کامیابی حاصل کی لیکن آخری مرحلے، انٹرویو کو عبور نہ کر سکا۔ وجہ ظاہر ہے کہ میرا تعلق Elite طبقہ سے نہ تھا۔ سرکاری ملازمت کے لیے مقررہ عمر (۲۳ سال) کے قرب کی وجہ سے میں نے بعد کوشش ڈی سی آفس گورداسپور میں ایک کلرکی کی آسامی حاصل کی۔ اس دوران میں اپنے ہم جماعتوں سے جن سے تعلیمی میدان میں، میں کہیں آگے رہا کرتا تھا، شرمندگی کے مارے چھپتا پھرتا تھا اور سخت ذہنی کوفت میں مبتلا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں مجھے سنسر کے شعبہ میں کراچی میں نوکری مل گئی۔ کراچی میں میرے ساتھ میرے اسلامیہ کالج کے کلاس فیلو محمد شریف نسیم حجازی جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں رہتے تھے۔ وہ اس زمانہ میں ایک اخبار "زمانہ" میں بیس روپے ماہانہ پر نوکری کر رہے تھے۔

۱۹۴۶ء میں مجھے شارٹ کورس میں ڈائریکٹ کمیشن مل گیا۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۴ء تک ملٹری کالج میں استاد اور ہاؤس ماسٹر رہا۔ میری تدریسی زندگی کا یہ بہترین زمانہ تھا۔ ملٹری کالج جیسے قومی ادارہ میں کام کرنا ایک بہت بڑا اعزاز، ذمہ داری اور چیلنج ہوتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہاں کچھ خدمت کر سکا۔ آپ چراغوں کی قطار کے لیے یہ انٹرویو کر رہے ہیں میرا پہلا چراغ میری ماں ہے۔ میرے استادوں میں یہ منصب میری نگاہوں میں مسٹر بنرجی کا ہے —— میں اکثر سوچتا ہوں کہ وہ کون سے اسباب تھے جنھوں نے نہایت نامساعد حالات میں جو سالہا سال پر محیط تھے مجھے حوصلہ نہیں ہارنے دیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ

شفقت تھی جس کے ساتھ ہماری ننھیال نے ہماری پرورش کی، انھوں نے ہمیں یتیمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ہماری عزت نفس کو ٹھیس نہیں پہنچنے دی۔ ہم نے ان کے گھر میں محض طفیلی (Parasite) بن کر رہنا گوارا نہیں کیا ان کے کہے بغیر ہی ان کے کام کاج میں فرصت کے اوقات خصوصاً چھٹیوں میں ان کا ہاتھ بٹانے میں عار محسوس نہیں کی۔ میں نے ہل چلانے کے علاوہ سبھی زرعی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ حتیٰ کہ جانوروں کو باہر جنگل میں لے جا کر چرایا ہے، یہ میرا محبوب مشغلہ تھا کیونکہ قدرتی ماحول سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ مطالعہ کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ ہمارے ننھیال کا گھرانہ حدیث نبوی کی بہترین مثال تھا جس میں کہا گیا ہے مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ بہترین سلوک کیا جاتا ہے۔ اگر یہ ٹھکانا ہمیں نہ ملتا تو ہم غیروں کے گھروں میں ٹھہرنے اور محنت مزدوری کر کے اپنی گزر اوقات کرنے پر مجبور ہو جاتے جس سے نہ صرف ہماری عزتِ نفس مجروح ہوتی بلکہ ترقی کا راستہ مسدود ہو جاتا۔ تقسیم کے وقت جب میں الہ آباد میں بہ سلسلہ ملازمت مقیم تھا تو خوش قسمتی سے میرا چھوٹا بھائی فوج کی ملازمت چھوڑ کر گورداسپور میں محکمہ آب پاشی کے ایک تربیتی ادارہ میں زیر تعلیم تھا تو اسے خبر ملی کہ ہمارے ماموؤں کو کچھ اور لوگوں سمیت سکھ درندوں نے تہ تیغ کر دیا ہے۔ ہندو پرنسپل کی دھمکیوں کے باوجود کچھ فوجی لوگوں کو گاؤں لے جانے میں کامیاب ہو گیا جہاں سے ایک سکھ صاحب دل واقف کار کے گھر سے لٹے پٹے باقی ماندہ لوگوں کو (جن میں ہماری والدہ اور سب سے چھوٹے ماموں شامل تھے) نکال کر قافلہ کی حفاظت میں نارووال پہنچانے کا پرخطر کارنامہ جو اس نے انجام دیا وہ اس کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ مجھے حسرت ہے کہ میں اس کام میں دور ہونے کی وجہ سے اس کا ہاتھ نہیں بٹا سکا۔ بہرحال ننھیال نے آڑے وقت جو ہماری مدد کی تھی اس کا بدلہ کسی حد تک اس طرح چکایا گیا کہ آہ وبکا کے دلخراش ماحول میں ان کی آبادکاری کے کام کی سعادت مجھے نصیب ہوئی اور جو کچھ میں ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے کر سکتا تھا کیا۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ سب سے چھوٹے ماموں جواب ۸۷/۸۵

سال کے ہوں گے اور بدقسمتی سے فالج کا شکار ہو چکے ہیں، ابھی زندہ ہیں۔ اور
ان سے مل کر اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کے برگزیدہ بندے صدموں کی تابڑ توڑ بوچھاڑ کے
باوجود کس درجہ پُروقار اور پُرسکون رہ سکتے ہیں یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار
دے۔ دوسرا سبب جس نے میرے حوصلہ کو مائل بہ پستی نہ ہونے دیا وہ سکول میں
میرے ساتھ اساتذہ کا حُسنِ کہ رؤسائے شہر کا مربیانہ رویہ تھا اس سلسلہ میں ہیڈ ماسٹر
احمد دین (والد بزرگوار سابق اسٹبلشمنٹ سکریٹری وقار احمد) عربی ماسٹر محمد عالم اور ریاضی
ماسٹر بنرجی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ساتھ ہی میرے ہم جماعت طلباء بھی مجھے عزت و احترام
کی نظر سے دیکھتے تھے۔ میرے کپڑے واجبی ہوتے مسلسل سفر کے باعث غبار آلود بھی،
جوتے بھی Ill-fitting اور چونکہ زیادہ چلنے سے پاؤں میں چھالے پڑ
جاتے، اس لیے زیادہ تر ننگے پیر ہی وقت کٹتا۔ سبق چلتے چلتے یاد کرنا پڑتا تھا یا رات کو
سرسوں کے تیل سے جلنے والے دیئے کی ٹمٹماتی لو میں۔ آدھی چھٹی میں لڑکے اپنی پاکٹ منی
سے میرے سامنے چیزیں لے کر کھاتے لیکن میں یہ Afford نہیں کر سکتا تھا
غرضیکہ مادی وسائل کے لحاظ سے آسودہ حال شہری طالب علموں سے میرا کوئی مقابلہ
نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود کسی لڑکے نے کبھی مجھے تضحیک کا نشانہ نہیں بنایا
گویا صرف میرٹ کی بنا پر مجھے قابل توقیر سمجھتے تھے اور میرے ساتھ یا آس پاس کی سیٹ
پر بیٹھنا باعث افتخار سمجھتے تھے۔ خدا جانے آجکل کے طلباء میں یہ رجحان ہے یا نہیں
لیکن میرے وقت میں یقیناً موجود تھا اور اس سے مجھے ناموافق حالات کا مقابلہ کرنے
میں بڑی تقویت ملی۔ البتہ جب میں تعلیم ختم کرنے کے بعد روزگار کی تلاش میں نکلا تو
یہ تلخ تجربہ ہوا کہ صرف میرٹ فیصلہ کن چیز نہیں ہے۔

کرنل یونس: تو سر، تو پھر آپ کے تجربے اور مشاہدہ کا لب لباب کیا ہوا؟

بریگیڈیر محمد شفیع: جو میں نے ملٹری کالج میں کہا تھا کہ جنگ میں Will to win، تعلیم میں
Will to learn، کیریئر میں Will to succeed اور زندگی میں
Will to live بہت Crucial کردار ادا کرتی ہے۔ دوسرے میرا

تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ قدرت ان اقوام اور افراد کی مدد کرنے کے لیے بے چین رہتی ہے جو دیانت داری سے خود اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔

(سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے) قرآن حکیم میں بھی اور ارشاد خداوندی ہے
لَیْسَ للانسان الاَّ مَا سعیٰ۔ ان اللہ لا یغیر بالقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم

——— لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین[1]

کیپٹن شفیع ۱۹۵۲-۵۳ء میں سکین ہاؤس میں ہمارے ہاؤس آفیسر تھے۔ ہر روز شام کو ہاؤس میں آتے تھے۔ مظہر صاحب ایک ونگ کے اور راشد صاحب دوسرے ونگ کے ہاؤس ماسٹر تھے۔ یہ تینوں ہر روز لائٹس آؤٹ کے بعد تک ہاؤس میں رہتے تھے۔ راشد صاحب ہر دو ہفتے کے بعد اور شفیع صاحب ہر مہینے پلس اور مائنس پوائنٹس کے ساتھ انٹرویو کرتے تھے۔ میں چونکہ سٹیج سرگرمیوں سے گریزاں رہتا تھا اس لیے انہوں نے مجھے بار بار تنبیہ بھی کی ایک بار میں نے ان کی ایک سالانہ رپورٹ کے خلاف اپیل بھی کی جو انہوں نے خود فارورڈ کی۔ ظرف اتنا تھا کہ انہوں نے اس کا بُرا نہیں مانا۔ میں آرمی سپیشل میں انگریزی کلیر نہیں کر سکا تھا۔ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ مجھے حکم دیا کہ تم ہر روز سی اینڈ ایم جی (سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کا انگریزی اخبار) کے ایڈیٹوریل کا خلاصہ (Precis) لکھ کر دکھایا کرو گے۔ مجھے یاد ہے اس زمانہ میں اس کے ایڈیٹر عبد المجید صاحب تھے جو بقول شفیع صاحب کے بہت فصیح انگریزی لکھتے تھے۔ وہ میری پریسی ہر روز ہاؤس کے ڈائننگ ہال میں بیٹھ کر چیک کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے بڑی آسانی سے انگریزی کا پرچہ بھی پاس کر لیا اور آئی ایس ایس بی کی تیاری کے لیے آرمی کلاس میں چلا گیا۔ یہ سب کچھ شفیع صاحب کی بروقت رہنمائی اور توجہ سے ممکن ہوا۔

جمعدار میر حیدر علی سخی صاحب

——— تنویر احمد سید[2]

آکناک ہاؤس میں، ہمارے ہاؤس ماسٹر ہوا کرتے تھے۔ جمعدار میر حیدر علی صاحب شاعر

---

[1] کالج نمبر ۱۶۲۳، زمانہ ۵۴-۱۹۴۷ء [2] انجینئر۔ ڈائریکٹر شمسی توانائی پروجیکٹ اسلام آباد، زمانہ تعلیم ۵۴-۱۹۴۶ء

بھی تھے۔ سخیؔ تخلص تھا۔ ایک بار ہاؤس فنکشن میں انہوں نے اپنی ایک غزل سنائی تھی جو بعد میں (تربیت ۱۹۵۲ء) میں شائع بھی ہوئی۔ اس کا مقطع یاد رہ گیا ہے۔

کیا واماندگان رہ کو منزل آشنا ہم نے کبھی چرچا ہمارا کارواں در کارواں ہوگا

کالج میں کرنل رفیق کے دور میں پاکستانیت کی جو لہر اٹھی تھی حسن صاحب نے ایک نظم قوم کے نونہالو لکھی تھی۔ حیدر علی صاحب نے بھی اسی موضوع پر نونہالان وطن کے نام سے طبع آزمائی کی۔

نونہالان وطن، آن وطن شان وطن تم ہی اس کے پاسبان ہو تم ہی جان وطن

تم سے مستقبل کی امیدیں ہیں وابستہ تمام دیکھنا اے نونہالو، ہو وطن کا تم سے نام

آج یہ کنگ جارج کالج ہے تمہاری درسگاہ تربیت سے جس کی تم پاؤ گے عزّ و جاہ

طرز تعلیم اس جگہ کا شہرۂ آفاق ہے درس علم و فن یہاں سرچشمۂ اخلاق ہے

تم سے پہلے سینکڑوں نکلے یہاں سے کامیاب آج میدان عمل میں ہیں وہ مثل آفتاب

اب اسی سانچے میں تم بھی ڈھل کے نکلو شادکام ہو درخشاں اپنے کالج کا ہمیشہ تم سے نام

ابر رحمت بن کے اٹھو تم زمانہ کے لیے درس امن و آشتی سب کو سکھانے کیلئے

اب تمہیں اسلاف کے کردار کو اپنانا ہے
قائدین پاک کی تاریخ کو دُھرانا ہے

ملٹری کالج میں ہماری کرداری تربیت کن خطوط پر ہو رہی تھی، اس کا اندازہ آخری دو شعروں سے کیا جا سکتا ہے۔ حیدر علی صاحب جنوبی ہند کے تھے۔ حیدر علی نام سے ظاہر ہوتا ہے شاید بنگلور میسور کے ہوں۔ بہرحال نام ہی حیدر علی نہ تھا کچھ حیدری جذبہ بھی رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں بھی دھان پان تھے۔ اب کہاں زندہ ہوں گے۔ بہرحال میرے دل میں زندہ ہیں اچھے لوگ اپنے کام میں زندہ رہتے ہیں ہمیشہ!

صوبیدار عریف الحسن

——— خادم حسین

۵۴-۱۹۵۳ء میں ہمیں حساب صوبیدار عریف الحسن پڑھاتے تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے بی ایس سی آنرز تھے۔ نہایت قابل لائق استاد اور بہت اچھے انسان، ہیں آرمی سپیشل حساب کے

امتحان میں دو بار فیل ہو چکا تھا۔ یہی حال امان اللہ، ریاض، اعظم، اکرم وغیرہ کا تھا۔ یہ عریف الحسن صاحب ہی کی ہمت تھی کہ ہم جیسے نالائقوں کو انہوں نے پار لگایا۔ رات کے پریپ میں پڑھاتے تھے۔ ویک اینڈز پر بلا لیتے تھے۔ خواہ دو ہی لڑکے ہوں پورے جوش سے پڑھاتے تھے۔ بڑے خوش مزاج تھے۔ "چنا" تکیہ کلام تھا۔ مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے۔ اگر کالج میں عریف الحسن لیسے استاد نہ ملے ہوتے آج ہم میں سے بہت سے کن تاریک راہوں میں بھٹک رہے ہوتے۔

کیپٹن اسماعیل[1]

——— محمد اعظم خان

ایک روز کیپٹن اسماعیل حسب معمول تاریخ کا پیریڈ لینے آئے تو بہت اداس تھے۔ کہنے لگے تم لوگوں نے کشمیر میں سیز فائر کی خبر سنی ہوگی یہ ہمارے لیے بدترین خبر ہے۔ آج کشمیر کی غلامی پر مہر لگ گئی۔ یو۔ این۔ او کی قرارداد بہت اچھی ہے۔ اس میں کشمیریوں کے حق خود ارادیت کو تسلیم کیا گیا ہے Plebicite کی یقین دہانی کرائی گئی ہے لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ Plebicite کبھی نہ ہو گا۔ میں ہندوؤں کے ساتھ (مشرقی پنجاب میں) رہا ہوں میں ہندو بنیئے کی ذہنیت کو جانتا ہوں۔ جس وقت ریڈ کلف نے گورداسپور کا ضلع ہندوؤں کو دے کر ڈنڈی ماری تھی کشمیر اسی وقت ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ رہی سہی کسر اب پوری ہو گئی۔

پھر وہ جالندھر اور امرتسر میں ان مظالم کے واقعات سناتے رہے؛ جو ہندوؤں اور سکھوں نے تقسیم کے وقت مسلمانوں پر ڈھائے تھے۔ کس طرح مسلمان عورتوں نے کنوؤں میں چھلانگیں لگا کر اپنی عزتیں بچائی تھیں۔ کس طرح مسلمان باپ بیٹے اپنی ماں بیٹیوں کو سکھ درندوں سے بچانے کے لیے مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ کیپٹن اسماعیل نے اس دن یہ بھی بتایا کہ جہاد کشمیر کے شروع میں گورنر جنرل پاکستان قائداعظم نے سی این سی جنرل میسروی کو کشمیر میں فوجیں بھیجنے کا حکم دیا تھا۔ مختلف بہانے کر کے جس کی تعمیل کرنے سے اس نے معذوری ظاہر کر دی تھی۔

---

[1] کیپٹن محمد اسماعیل اے ای سی میجر ہو کر ریٹائر ہوئے۔

اسماعیل صاحب خاصے پہلوان قسم کے آدمی تھے۔ لیکن اس روز ہم نے ان کی آنکھوں میں نمی اور آواز میں رقت محسوس کی۔ یہ باتیں اوائل ۱۹۴۹ء کی ہیں میں اپنے استاد کی تاریخی فراست کی داد دیتا ہوں کہ جو پیشگوئی انہوں نے کی تھی وہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی ہے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین[1]

برڈووڈ ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر تھے۔ انہوں نے ہاؤس کو اپنی جان بنا لیا تھا۔ اور یہی سپرٹ سارے ہاؤس میں بھر دی تھی۔ برڈ ی الگ پہچانا جاتا تھا۔ ایک تو سر کے چھوٹے بالوں سے دوسرے سپورٹس میں اپنی غیر معمولی دلچسپی سے، ہاؤس کا اپنا کچن گارڈن تھا۔ باغبانی تھی۔ ہاؤس کے سامنے عالمگیری کنواں تھا اس کو ہم لڑکے ہی کھینچ لیتے تھے۔

——— منصور احمد[2]

اسماعیل صاحب برڈووڈ ہاؤس (حال ایم۔ جی۔ ہاؤس) کے ہاؤس ماسٹر تھے۔ پہلوان تو نہیں تھے لیکن پہلوانی کا شوق تھا۔ برڈووڈ ہاؤس کے سامنے اکھاڑہ بنوا رکھا تھا۔ اس میں کشتی کرواتے تھے۔ ہاؤس میں مگدر رکھے ہوئے تھے۔ وزن اٹھانے کی مشق کرانے کے لیے لکڑی کی ایک ڈھول نما چیز بھی رکھی تھی۔ اسماعیل صاحب کالج کے سامنے ایک کچی ہٹ میں رہتے تھے۔ وہاں ایک گھوڑا بھی پال رکھا تھا۔ یہ اس زمانہ کا رائڈنگ کلب تھا۔ چند لڑکے جن میں میرے علاوہ ۱۵۲۳ کاظم کمال (شہید) اس گھوڑے پر سواری سیکھتے تھے کیپٹن اسماعیل کبھی کبھی ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔ اس گھوڑے کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ واپسی کا سفر اتنی تیزی سے طے کرتا تھا کہ اس کو روکنا مشکل ہو جاتا۔ معلوم ہوا کہ اس کو راتب واپسی پر ہی ملتا ہے۔

اسماعیل صاحب تندرستی کو زندگی میں کامیابی کی بنیاد سمجھتے تھے۔ بلکہ یہ بات ان کے ذاتی Convictions میں شامل تھی On health کے عنوان سے انہوں نے اپریل ۴۹ء کے کالج میگزین میں ایک مضمون بھی لکھا تھا جس میں انہوں نے صحت سازی کے لیے ذہنی صفائی (Mental Hygiene) پر بھی بڑا زور دیا تھا۔

---

[1] کالج نمبر ۱۶۲۳، زمانہ تعلیم ۵۴-۱۹۴۷ء [2] کالج نمبر ۱۶۵۶ زمانہ تعلیم ۵۴-۱۹۴۷ء

——— بریگیڈئر سلطان احمد

یہ واقعہ ۱۹۵۰ء کا ہے۔ اطلاع ملی کہ آج شام کو مسٹر شہاب الدین اور کیپٹن اسماعیل میں نمائشی کشتی ہوگی۔ کشتی وہ بھی دو استادوں میں بڑی دلچسپ اطلاع تھی۔ چنانچہ شام کو فٹ بال گراؤنڈ میں (اس جگہ جہاں اب موتی ہال ہے) سارا کالج جمع ہوا۔ دونوں پہلوانوں نے بڑے داؤ پیچ استعمال کیے۔ کبھی ایک اوپر ہوتا کبھی دوسرا۔ آخر کار کرنل زیدی نے جو کشتی کے ریفری تھے کشتی برابر چھڑا دی۔ ویسے لڑکوں کا اپنا خیال تھا کہ اسماعیل صاحب طاقت میں زیادہ اور شہاب صاحب میں فن زیادہ تھا۔ اسماعیل صاحب جس Agressive انداز سے اپنے مدمقابل کی طرف بڑھتے تھے وہ منظر دیدنی تھا۔

ماجد صدیقی[1]

——— کرنل سردار خان

۱۹۵۰ء کے اواخر میں آئے۔ صرف ڈیڑھ سال رہے۔ ان کی یاد باقی ہے۔ ایم اے ایم ایڈ تھے۔ ایم ایڈ ہمارے لیے نئی کوالیفکیشن تھی۔ تفصیل پتہ کی تو پتہ چلا کہ یہ ایم اے ایجوکیشن کا مخفف ہے۔ بے حد سمارٹ تھے۔ لاجواب حد تک خوش لباس۔ دوہری ناٹ کی ٹائی باندھتے پہلے پہل میں نے انہی کو دیکھا لیکن جو یاد آج بھی میرے دل میں باقی ہے وہ ان کے پڑھانے کا انوکھا انداز تھا۔ آٹھویں میں ہمیں ہسٹری پڑھاتے تھے۔ مغل دور کی تاریخ کو اس طرح قصوں اور کہانیوں میں پرو کر لاتے تھے کہ ہمیں ان کے پیریڈ کا انتظار رہتا تھا۔ محمد حسین آزاد کی قصص ہند اور دربار اکبری تو بعد کو پڑھی۔ تزک تیموری، تزک بابری، اور تزک جہانگیری اور اکبر نامہ کے حوالے تو ایک عرصے کے بعد نظر سے گزرے۔ ان کتابوں کی داستانیں وہ بہت پہلے ہمیں سنا چکے تھے۔ ماجد صدیقی صاحب کی وجہ سے بہت سے لڑکوں میں تاریخ کا شوق پیدا ہوا میں بھی ان سے ایک ہوں۔ تقریباً تیس برس کے بعد ایبٹ آباد میں ان سے ملاقات ہوئی اس وقت وہ ایبٹ آباد پبلک سکول کے پرنسپل تھے۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے لیکن Gracefulness میں کمی نہیں آئی تھی۔

---

[1] ماجد صدیقی صاحب ایبٹ آباد پبلک سکول کی پرنسپلی سے ریٹائر ہوئے۔

قبلہ ریحان احمد بلگرامی

—— شوکت جنجوعہ

ہمیں آٹھویں میں تاریخ پڑھاتے تھے ایک روز کہنے لگے ابن خلدون سے لے کر ٹائن بی (Toynbee) تک مورخ اس چکر میں پڑے رہے ہیں کہ اگر یوں نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اگر سکندر دو چار برس اور جی جاتا اگر قلوپطرہ کی ناک ذرا اور لمبی ہوتی۔ اگر سیزر اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر نہ ہوتا۔ اگر ہلاکو خاں بغداد کو تاراج نہ کرتا اگر۔ اگر۔ کا یہ سلسلہ بہت دراز ہے۔ بلگرامی صاحب لطیفوں کے بادشاہ تھے۔ اکثر خیال انگیز پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے تھے۔ ایک روز لڑکوں نے فرمائش کی۔ سر، آج پڑھنے کا موڈ نہیں بن رہا۔ کوئی لطیفہ سنائیے۔" فرمایا لطیفہ نازل ہوتا ہے۔ وارد ہوتا ہے زبردستی دماغ سے کھینچ کے نکالا نہیں جاتا۔ تم لوگوں کو معلوم نہیں کہ اپنے عہد کے بہت بڑے لطیفہ گو انشاء اللہ خاں انشاء کا کیا حشر ہوا تھا یہ شعر انہی کا ہے۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی　　تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

کسی نے پوچھا سر کیا حشر ہوا تھا۔ انہوں نے کہا لکھنؤ کے نواب سعادت علی خاں کے دربار میں انشاء حاضر تھے اور برجستہ اور بذلہ سنجی کے لیے مشہور تھے۔ ایک روز دربار میں کسی خوشامدی درباری نے نواب صاحب کو خوش کرنے کے لیے کہا۔ حضور تو نجیب الطرفین ہیں انشاء نے برجستہ کہا بلکہ انجب، لفظ انجب کے عربی میں کئی معنی ہیں ایک تو یہی جو زیادہ نجیب الطرفین (اعلیٰ خاندان کا) ہو۔ انجب کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ وہ جو لونڈی کے پیٹ سے ہو چونکہ نواب کے بارے میں افواہ تھی کہ وہ دراصل ایک لونڈی کی اولاد ہیں۔ تو ہوا یہ کہ نواب نے اس فقرہ کو اپنے اوپر چوٹ سمجھا۔ حالانکہ انشاء اللہ غریب نے ان کی تعریف میں انجب کے معروف معنوں میں کہا تھا جادو الٹ جائے تو بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اب انشاء اللہ خاں پر عتاب آ گیا نواب نے حکم دیا کہ ہر روز دو لطیفے نئے سنایا کرو۔ انشاء اللہ خاں جیسا لطیفوں کی تلاش میں جینیئس آخر دیوانہ ہو گیا۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں یہ پورا قصہ لکھا ہے۔ اس لیے عزیز دلطیفہ کبھی کبھی مروا بھی دیتا ہے۔

ایک روز ہمیں یہ قول سچا ہوتا نظر آیا۔ بلگرامی صاحب بڑے مزے میں لکھنؤ کے بانکوں

کے قصے سنا رہے تھے۔ مشہور بانکے نکٹے مرزا جنہوں نے طیش میں آکر اپنی ناک کاٹ کے باپ کے سامنے ڈال دی تھی، کا نصف ابھی آدھا ہوا تھا کہ چیف انسپکٹر میجر ابراہیم دروازہ پر نمودار ہوئے۔ بلگرامی صاحب نے اس خوبصورتی سے بات بدلی کہ لطف آگیا۔ بعد کو ہمیں بہت ڈانٹا "ظالمو، لطیفوں کی فرمائش نہ کیا کرو آج تو تم نے مرا ہی دیا تھا۔"

برڈ وڈ ہاؤس میں وہ ہمارے پاکٹ منی انچارج تھے۔ صرف وہی تھے جن سے لڑکوں کا ادھار چلتا تھا۔

—— واجد علی

بلگرامی صاحب نے ہمیں آٹھویں میں اردو پڑھانی شروع کی۔ اپنے بارے میں کچھ نہ بتایا کون ہیں کہاں سے آئے ہیں۔ کتنے تعلیمی اعزازات ہیں وغیرہ۔ صرف اتنا کہا بھئی یہاں اُردو کے صحیح استاد تو علوی صاحب ہیں۔ راشد صاحب ہیں میں کس کھاتے میں ہوں۔ چونکہ کوئی اور استاد اُردو پڑھانے کے لیے موجود نہ تھا۔ میں یہاں بھیج دیا گیا ہوں۔ بھیا مل جل کر پڑھیں گے۔ جہاں آپ کی سمجھ میں نہ آئے آپ مجھ سے پوچھ لیں۔ میری سمجھ میں نہ آیا میں کسی اور سے پوچھ لوں گا۔ حضرت علی رض کا قول ہے جو بات معلوم نہ ہو اس کو پوچھنے میں شرم نہیں کرنی چاہیے کہ علم حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ چنانچہ ہم بچے ان کی باتوں میں آگئے، خوب اچھل اچھل کر ان سے سوالات پوچھا کرتے وہ کچھ کا جواب تو فوری طور پر دے دیتے ایک آدھ سوال اپنے پاس نوٹ بھی کر لیتے کہ کل پوچھ کر بتاؤں گا۔ بڑے مزے سے کلاس چلتی رہی۔ خوب سوال ہوتے میرا خیال ہے جتنی ایکٹی وٹی ہمارے کلاس میں ہوتی تھی کسی اور کلاس میں نہ ہوتی ہو گی۔ مختصر یہ کہ یہ ڈرامہ بڑی کامیابی سے چلتا رہا۔ ایک روز رات کے پریپ میں (جو ان دنوں کلاس روم میں ہوتی تھی) میں ان سے پوچھ بیٹھا سر انگریزی کا یہ ٹیڑھا پیراگراف میرے قابو میں نہیں آرہا۔ بولے ہے تو انگریزی لاؤ میں بھی زور لگاتا ہوں۔ وہ پیرا Ten Tales کا تھا۔ انہوں نے اس کی وہ زبردست تشریح کی، ایک ایک لفظ کے وہ بخیے ادھیڑے میں تو حیران رہ گیا۔ اور آخر میں نادانی سے کہہ گیا کہ "سر آپ کی تو انگریزی بھی اچھی ہے"۔ مسکرا کر فرمایا "میاں آپ کی مہربانی ہے ورنہ ہماری بیوی تو اب تک ہماری اردو کو بھی نہیں مانتیں۔ لکھنؤ کی جو ہیں۔ اس وقت میرے کان کھڑے

ہوئے کہ بیوی لکھنؤ کی ہیں تو یہ خود کہاں کے ہوں گے۔ چوں کہ ان کی ظاہری صورت شکل اور قد خواجہ ناظم الدین سے مشابہ تھا۔ اس لیے کچھ فیصلہ کر نہیں پا رہے تھے کہ کہاں کے ہیں مجھے کریدلگ گئی کہ پتہ کروں کہ قبلہ کا تاریخ جغرافیہ کیا ہے۔ مائی گاڈ۔ جب پتہ چلا کہ حضرت لکھنؤ کے ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ فلسفہ کے ایم اے، علی گڑھ کے بی ٹی ایل ایل .بی ہیں تو میں سناٹے میں آگیا۔ جب علمی زندگی کے سفر میں کچھ آگے بڑھا تو پتہ چلا کہ قبلہ بلگرامی صاحب سقراط کا روپ دھارے ہوئے تھے اور سقراطی طریقے سے پڑھا رہے تھے یعنی نادان بن کر دانائی سکھاؤ۔ اللہ اکبر۔ ملٹری کالج کے افق پر کیسے کیسے روشن ستارے چمکتے رہے ہیں۔

——— لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر

بڑ ڈوڈ باڈرز کا ایک فنکشن ہورہا تھا۔ بلگرامی صاحب بھی موجود تھے۔ فہیم درانی ان کے پاس آیا اور عرض کیا "سر اجازت ہو تو آپ کی نقل کروں"

"شوق سے۔ اپنا شوق پورا کرو" فہیم نے ان کے چلنے اور چلتے چلتے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے چھوڑنے کے انداز کی بہت کامیاب کاپی کی اور سب بہت محظوظ ہوئے۔ جب وہ ختم ہو چکا تو کہا تم کمال کے نقال ہو۔ بہت لطف آیا۔ ایک بار تم نے اپنے شوق سے نقل اتاری تھی اب ایک بار ہماری فرمائش پر اتارو تاکہ بچوں کو ایک بار پھر انجوائے کرنے کا موقع ملے۔ بلگرامی صاحب بڑے زندہ دل بزرگ اور استاد تھے۔

——— سلیم اختر کیانی[1]

بلگرامی صاحب آٹھویں جماعت کو اُردو پڑھانے آئے اور آتے ہی کہا مجھے حکم ملا ہے کہ آپ لوگوں کو اردو پڑھاؤں تو حاضر ہو گیا ہوں۔ ورنہ میں کہاں اور اردو کہاں۔ میں تو مفت میں پکڑا گیا ہوں۔ تو میاں ایسا کریں گے کہ مل جل کر کام چلائیں گے۔ جہاں میں رکوں آپ مجھے بتائیں۔ جہاں آپ رکیں میں آپ کی مدد کروں۔

یہ تھا انداز ان کے Humour کا اتنا Subtle ہوتا تھا کہ حد نہیں۔ اس ضمن میں دو ایک باتیں اور یاد آرہی ہیں، وہ بھی عرض کرتا ہوں۔

---

[1] کالج نمبر ۲۳۱۹ زمانہ ۶۴-۱۹۵۶ء نائب صدر ملٹری کالج یونین ۶۳-۱۹۶۲ء کالج ہیڈبوائے ۶۴-۱۹۶۳ء

کالج سے جانے کے کئی سال بعد (گورنمنٹ کالج لاہور کی طالب علمی کے زمانہ میں) میں کالج آیا۔ تو ٹھہرا نور راشد صاحب کے پاس۔ رات کے کھانے کے لیے علوی صاحب نے دعوت دی تو بلگرامی صاحب نے اصرار کیا کہ کم از کم صبح کا ناشتہ میں ان کے ساتھ کروں میرے لیے یہ بہت بڑی عزت افزائی تھی۔ میں نے سر تسلیم خم کیا۔ اب ہوا یہ کہ صبح راشد صاحب کے ہاں سے نکلتے نکلتے دیر ہو گئی۔ جب کالونی میں بلگرامی صاحب کے ہاں پہنچا تو غالباً وہ میری آمد سے مایوس ہو کر ناشتہ سمیٹ چکے تھے۔ میرے پہنچنے پر دوبارہ اہتمام شروع ہوا اور اس میں اتنی دیر ہوئی کہ بلگرامی صاحب کچھ Embarrass محسوس کرنے لگے۔ اور بات کو ٹالنے کے لیے، زور سے کہا بیگم اب آپ سلیم کو معاف کر دیں اور ناشتہ لے آئیں۔ پھر مجھ سے مسکرا کر کہا تسلیم جب میں تم لوگوں کے امتحان کی کاپیاں دیکھا کرتا تھا تو ٹوٹل بیگم کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ یہ پوچھتی تھیں یہ کون لڑکا ہے جس کے نمبروں کا ٹوٹل کرتے کرتے مجھے اتنی دیر لگتی ہے۔ آج وہ پرانا حساب چکا رہی ہیں۔"

جب میں ۱۹۷۴ء میں ملتان میں اے سی پوسٹ ہوا تو کسی نے بتایا کہ بلگرامی صاحب یہیں گلگشت کالونی میں فروکش ہیں۔ میں سلام کرنے کے لیے حاضر ہوا تو کم و بیش فوراً کہا میاں یہ سگریٹ وگریٹ نہیں چلے گا۔ پائپ بہتر ہے اور دوسرا تیسرا فقرہ یہ تھا اپنے بچوں کو پڑھانا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ دونوں باتیں کشف کی حیثیت رکھتی تھیں۔ میں نے انھی دنوں پائپ شروع کیا تھا۔ اور دو دن پہلے چھوٹی بچی کو جو اس وقت دوسری میں پڑھتی تھی کسی غلطی پر مارا تھا۔ ملتان میں ان کی گفتگو میں عارفانہ رنگ جھلکتا دیکھا۔ یہ بھی فرمایا۔ صبح شام کچھ لوگ آجاتے ہیں ان کے ساتھ قرآن حکیم کی کچھ آیات پر تفسیری بحث ہو جاتی ہے تفہیم القرآن کے ساتھ ساتھ مولانا امین اصلاحی کی تفسیر تدبر قرآن بھی دیکھتا رہتا ہوں۔ بعض نکات اس میں زیادہ خیال انگیز انداز میں بیان کیے گئے ہیں، مثلاً الحمدللہ کا یہ ترجمہ کہ تمام شکر گزاریاں اللہ ہی کے لیے ہیں" جب وہ ملتان میں تھے میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ گیا تو ایک بہت اعلیٰ قسم کا پائپ پن سے صاف کر رہے تھے۔ فرمایا " یہ نہایت قیمتی پائپ ہماری بھانجی صاحبہ نے انگلینڈ سے بھجوایا ہے۔ اس میں فلٹرنگ کا ایسا پیچیدہ نظام ہے کہ دھویں

اندر نہیں پہنچتی - اب ہم پائپ آپ کے لیے تو نہیں نکوٹین کے ہی لیے تو پیتے ہیں - چنانچہ پائپ پینا اکارت جاتا ہے - میں نے بھانجی صاحبہ کو لکھا ہے ایسا بے ضرر پائپ بھجوانے کا شکریہ اب ایک شیشی نکوٹین کی بھی بھجوا دیں تاکہ گلشن کا کاروبار چلے

ملتان میں ان سے اکثر ملاقات رہتی - ایک بڑی دلچسپ بات میں نے یہ نوٹ کی، میاں بیوی میں ایسی ذہنی ہم آہنگی (Understanding) تھی کہ بلگرامی صاحب اکثر بات کرتے کرتے رکتے اور پکارتے بیگم پھر کیا نام تھا ان کا اور بیگم دوسرے کمرہ سے پکارتیں خورشید عالم اور بلگرامی صاحب سلسلہ کلام جاری رکھتے - کچھ دیر بعد پھر پکارتے بیگم وہ دوسرا مصرع اور وہ باورچی خانے ہی سے جواب دیتیں - ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

— ہاں تو میر درد نے کیا شعر کہا ہے -

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

— واہ واہ - یہ وہ شخص ہے جس کی زیارت کو بادشاہ وقت قلعہ معلیٰ سے چل کر خود آتا تھا -

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

— بلگرامی صاحب کے مزاح اور بذلہ سنجی سے ذہن کے دریچے کھل جاتے تھے - انہیں تو مزاح کی یونیورسٹی کا وائس چانسلر کہنا چاہیے -

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

پہلا مصرع: پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

میں نے قصداً حذف کر دیا چونکہ پراگندہ طبع کے معنی لوگ آسانی سے نہیں سمجھتے -

——— بریگیڈیئر یعسوب علی ڈوگر

بلگرامی صاحب ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے - ان کا پورا نام ریحان احمد بلگرامی تھا جس کا مخفف (آر - اے - بی) تھا - وہ اس طرح دو نقطوں کے ساتھ اپنے دستخط کرتے تھے - میں نے ان کی شخصیت سے کتنا اثر لیا اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ میں نے اپنے دستخطوں کے لیے ان کا انداز اختیار کیا اور (وائی - اے - ڈی) اسی طرح بیچ میں دو نقطوں کے ساتھ لکھتا ہوں - ایک بار میں ان کے گھر کلاس کی کاپیاں چھوڑنے گیا تو ان کی بیگم نے اس طرح میرا لاڈ

کیا جیسے ہیں کوئی چھوٹا بچہ ہوں۔ بعد میں معلوم ہوا، ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ہمیں ہی اپنی اولاد سمجھتے تھے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل شمیم احمد جاوید

بلگرامی صاحب سے ساتویں میں انگریزی پڑھی۔ بہت باریکی سے اور تواتر سے کاپی دیکھتے تھے۔ ان کا کوڈ نیم (Rab) ریب تھا۔ خوش مزاجی سے فقرے چست کرتے لیکن ان کا ہیومر اکثر ہمارے سروں کے اوپر سے گزر جاتا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ مزاحیہ فقرہ کہتے ہوئے بہت سنجیدہ رہتے تھے۔ ایک روز علوی صاحب نے غالب کے طنز و مزاح پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا Wit میں بھی غالب کا جواب نہیں۔ اور کالج میں اس فن میں یکتا اپنے بلگرامی صاحب ہیں۔

——— میجر عبد الرشید[1]

بلگرامی صاحب کی حاضر جوابی مشہور تھی۔ برمحل فقرہ چست کرنے میں اور وہ بھی بڑے بھولے پن سے، ان کا جواب نہ تھا۔ سٹاف روم میں ان کی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہتی تھیں۔ ۶۱-۱۹۶۰ء کا واقعہ ہے۔ اس زمانہ میں کانگو میں خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ راشد صاحب سٹاف روم میں کم آتے تھے۔ اور آتے تھے تو بی بی سی کی کسی خبر کا تحفہ لے کر آتے تھے۔ ایک روز حسب معمول وہ مخصوص انداز میں سٹاف روم میں داخل ہوئے اور آتے ہی گویا ہوئے۔ لومبا کو مار دیا گیا یہ اس کی نہیں ایک Symbol کی موت ہے۔ ابھی ہم سب اس خبر کے مضمرات کو سمجھنے بھی نہ پائے تھے کہ بلگرامی صاحب نے دعائیہ انداز میں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ شکر ہے لومبا بچ گیا سمبل ہی پر بیتی۔ یہ سنتے ہی سٹاف روم زعفران زار بن گیا اور راشد صاحب نے الٹے پاؤں واپسی ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

بلگرامی صاحب Humour کے بے تاج بادشاہ تھے طنز ان کا میدان نہ تھا۔ ان کا مزاح اپنی جگہ لیکن سونے پر سہاگہ ان کا بھولا انداز اور معصوم سراپا تھا۔ اس سادگی سے فقرہ چست کرتے کہ لطف آ جاتا۔ ان کے بعض واقعاتی لطیفے اب کلاسیکی حیثیت اختیار کر

[1] اے ای سی، سابق استاد ملٹری کالج۔

چکے ہیں بلگرامی صاحب برج بہت اچھی کھیلتے تھے۔ جب کمانڈانٹ زیدی صاحب کو انکے اس کمال کی خبر ہوئی تو ان کو اپنی برج محفلوں میں بلانے لگے۔ خصوصاً اس وقت جب کوئی باہر کا بڑا کھلاڑی آتا اور اسے مات دینا مقصود ہوتی۔ اب برج گھنٹوں کا نہیں دنوں کا کھیل ہے۔ شام کی بچھی بساط صبح کی خبر لاتی ہے۔ بلگرامی صاحب کی بیگم نے شروع میں تو ان کی لمبی غیر حاضری کو برداشت کیا پھر جائز طور پر معترض ہوئیں۔ اولاد نہ ہونے سے بالکل اکیلی رہ جاتی تھیں، اب بلگرامی صاحب نے زیدی صاحب سے کہا آپ شام کو کسی آدمی کو میرے ہاں بلانے بھیجیں تو وردی میں بھیجیے گا۔ انھوں نے حامی بھرلی۔ اور شام کو ڈیوٹی این سی او سے کہہ دیا بلگرامی صاحب کو مغرب کے بعد پیغام دینے آنا۔ این۔ سی۔ او آیا دروازہ پر دستک دی۔ بلگرامی صاحب غسل خانہ میں چلے گئے اور بیگم سے کہا، ذرا دیکھنا کون ہے۔ اس نے سیدھا سا پیغام پہنچا دیا بلگرامی صاحب نے غسل خانہ سے آکر پوچھا کون تھا کیا کہنا چاہتا تھا؟ بیگم نے بتایا ایک فوجی تھا کہتا تھا کرنل صاحب نے فوراً بلایا ہے۔ بلگرامی صاحب نے فرضی گھبراہٹ طاری کرتے ہوئے پوچھا جاؤں یا نہ جاؤں یہ فوجی نوکری ہے ذرا دیر ہو جائے تو کورٹ مارشل کر دیتے ہیں "کورٹ مارشل کیا ہوتا ہے"؟ "کھڑے کھڑے گولی مار دیتے ہیں" تو جاؤ دیر کیوں کر رہے ہو۔

ایک روز زیدی صاحب کے ہاں کوئی برج کے دیوانے اونچے مہمان آرہے تھے لمبی محفل جمنی تھی۔ پورے دو دن کا پروگرام تھا۔ بلگرامی صاحب نے پھر ڈرامہ کیا۔ بیگم کو بتایا کہ سرکاری ڈیوٹی پر پنڈی جانا ہے۔ کرنل صاحب بھیج رہے ہیں۔ باقاعدہ تانگہ منگوایا سامان رکھا اور گیٹ کے سامنے کمانڈانٹ کے گھر جا کر اتر گئے۔ دوسرے دن ایک مہمان آگئے تو راز کھلا۔ بیوی بھی سب سمجھتی تھیں۔ میاں کا شوق تھا طرح دے جاتی تھیں۔ دونوں میاں بیوی اندر سے دکھی تھے اوپر سے ہنس بول کر زندگی گزار رہے تھے۔ وہ لڑکوں کے لیے فرشتۂ رحمت تھے۔ اتنے پیار سے اور گھل مل کر پڑھاتے تھے کہ لڑکے اب تک یاد کرتے ہیں۔

قادر بخش مالی

——— پروفیسر سعید راشد

ملٹن کا مشہور فقرہ ہے

They also serve who only stand and wait.

میں اس میں یہ اضافہ کرتا ہوں وہ بہت زیادہ Serve کرتے ہیں

جو پردہ کے پیچھے رینک اور منصب کی چمک دمک سے عاری ایک طرح سے مسلسل
گمنامی کی حالت میں اصل معنٰی میں صلہ کی تمنا اور ستائش کی پرواہ کیے بغیر Serve
کرتے ہیں اور مسلسل ناقدری کے باوجود Serve کرتے رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں
کہ اصل ہیرو گمنام سپاہی ہی ہوتا ہے جو بڑے بڑے ناموروں کی ناموری کو ممکن بناتا ہے۔
۱۹۵۰ء میں میرے دامن دل کو ملٹری کالج میں قدم رکھتے ہوئے جس چیز نے پہلے کھینچا
وہ، وہ پھول وہ پودے تھے جو کالج سٹاف کے ایک گمنام کارکن اور کارگزار بخش مالی کی خاموش
کاوشوں کا نتیجہ تھے۔

گرمی، سردی دھوپ، برسات ہر موسم میں، میں نے بوڑھے قادر بخش کو جس کے لیے
عمر کے بوجھ سے سیدھا چلنا بھی مشکل تھا، صبح سے شام تک کھر پا لیے کیاریوں اور روشوں
میں کام کرتے دیکھا۔ وہ ہیڈ مالی تھا۔ وہ تھوڑی سی چودھراہٹ بھی کر سکتا تھا۔ لیکن وہ
بقول رشید احمد صدیقی انسانوں کی اس بہت کمیاب قسم میں سے تھا جو مال میں یا کھال میں
نہیں اپنے کام میں مست رہتے ہیں۔
یہ مرنجاں مرنج بے زبان اور بظاہر کم حیثیت آدمی تو اپنی محبت کے تحفظ میں بڑا سخت نکلا
ہوا یہ کہ ۱۹۵۵ء کی سالانہ تقریب انعامات کے سلسلہ میں، میں نے اپنے Cub Pack کو
ریہرسل کرانے کے لیے وہ لان منتخب کیا جو اب یادگار شہدا اور آفیسرز میس کے بیچ میں واقع
ہے۔ صبح و شام میں وہاں ریہرسل کرانے لگا۔ تقریباً تیس لڑکے وہاں خوب اچھلتے کودتے تھے
بابا قادر نے ایک دو دن تو یہ تماشا دیکھا۔ پھر مجھ سے کہا۔ "صاحب آپ اپنے بچوں کو کہیں اور
لے جائیں یہ ساری گھاس خراب کر دیں گے"۔ میں نے بات سنی ان سنی کر دی۔ ایک دن اسی
طرح اور گزر گیا۔ تیسرے دن مجھے کرنل رفیق نے بلایا۔

"مسٹر راشد، آپ Cubbing کے ریہرسل کے لیے اس لان کے سوا کوئی اور
جگہ منتخب نہیں کر سکتے؟" میں سمجھ گیا کہ بظاہر بے ضرر بوڑھا بابا قادر وار کر گیا ہے۔ سبحان اللہ
سچ ہے محبت انسان کو بہت جرأت دے دیتی ہے۔ کالج میں بابا قادر کے دم قدم سے
تمام سال اور خاص طور سے بہار کے موسم میں بہار پر جو بہار آتی تھی اس کے موج در موج

حسن کو محسوس کیے بغیر کوئی رہ نہیں سکتا تھا۔ یادش بخیر کرنل رفیق تو کام کی قدر دانی اور لڑکوں کی تربیت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ کالج کی تاریخ میں پہلی بار اور اب ۱۹۸۸ء تک آخری بار ۱۹۵۲ء میں جشن بہاراں کا اہتمام ہوا۔

وہ پھولوں کا میلہ موجودہ میوزیم کے سامنے لگایا گیا تھا کہ اسی علاقہ کے تختوں اور کیاریوں میں پھٹ کے بہار آئی تھی۔ میلہ کی استقبالی محراب اس موڑ پر کھڑی کی گئی تھی، جہاں آجکل خطبہ حجۃ الوداع کا فریم نصب ہے۔ سرخ محراب پر لکھا۔

جشن بہاراں مبارک

جشن بہاراں کا افتتاح کرنل رفیق نے کیا افتتاح کے بعد ہیڈ مالی قادر بخش نے آگے بڑھ کر کمانڈانٹ کے ڈارک بلیو سوٹ کے لیپل پر سرخ گلاب کی ایک کلی لگائی۔ محراب سے سڑک کے دونوں طرف پھولوں کے گملے رکھے تھے جن پر پھولوں کے نام انگریزی اور اردو میں لکھے ہوئے تھے۔ آگے چل کر میوزیم کے ٹھیک سامنے فائن آرٹس اینڈ کلچرل سنٹر نے شامیانہ کے نیچے پھولوں کی کلاسیکی تصویروں کی نمائش کا اہتمام کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی آرٹ کلب کے لڑکوں کی بنائی ہوئی پھولوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ موجودہ یادگار شہداء کے آس پاس کی پھولوں کی کیاریوں اور تختوں پر کتبے تھے۔ وہ مستطیل تختہ جہاں سرخ گلابوں کا ہجوم تھا یہ شعر لکھا تھا۔

گلشن میں لگ رہی تھی رنگ گل سے آگ میر ... بلبل پکاری دیکھ کے، صاحب پرے پرے

گل لالہ کے تختہ پر لکھا تھا۔ ... شہید ازل، لالہ خونیں کفن

پھولوں کی نمائش کے بعد سب لوگ، سٹاف، ان کی فیملیز، کیڈٹس اور کالج کے دوسرے کارکن اس ہال میں جمع ہوئے جہاں اب میوزیم ہے۔ ہال میں سٹیج کے پیچھے کی دیوار کے ساتھ سرخ کپڑے پر اقبال کے ساقی نامہ کے یہ اشعار لکھے تھے۔

ہوا خیمہ زن کاروان بہار ... ارم بن گیا دامن کہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن ... شہید ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردہ رنگ میں ... لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور ... ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

اس تقریب کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا مہمان خصوصی مالی قادر بخش کو بنایا گیا تھا۔ تقریب کی ابتداء اس کورس سے ہوئی۔

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن — مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار — اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

پھر کمانڈانٹ نے کھڑے ہو کر ہیڈ مالی قادر بخش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ پھولوں کا میلہ ہمارے ہیڈ مالی جناب قادر بخش کی دن رات کی محنتوں کا نتیجہ ہے۔ انہی کی کاوشوں سے سارے سال کالج میں کسی نہ کسی رنگ کے پھول کھلے رہتے ہیں۔ ان کی محنت اور کام سے محبت ہم سب کے لیے نمونہ ہے۔ میں آپ سب کی اور اپنی طرف سے یہ خلعت نذر کرتا ہوں"

یہ کہہ کر کمانڈانٹ نے قادر بخش کو سرخ بانات کا ایک چوغہ پہنایا۔ اور ان کو مبارک پیش کی کچھ عرصے کے بعد قادر بخش کے قدردان کرنل رفیق کا تبادلہ ہو گیا اور فنکار قادر بخش بابا قادر بن کر پھر قعر گمنامی میں چلا گیا۔ اور چند سال بعد خزاں کے سوکھے پتے کی طرح ٹوٹ کر بے رحم موت کی وادی میں کھو گیا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی قبر کو اپنی رحمت کے گلابوں کی خوشبو سے معطر رکھے۔ ایک ادارہ خصوصی ایک تعلیمی ادارہ کو ہر طرح کے چراغوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں قادر بخش مالی کو اور قادر بخش ایسے تمام قوم کے خاموش خدمت گزاروں کو سلام کرتا ہوں جو کہیں بھی، کسی نام سے بھی گمنامی کی زندگی میں اور شاید ناقدری کے ماحول میں اپنے کام کو صرف محنت ہی سے نہیں محبت اور شوق سے انجام دے رہے ہیں۔ قومیں ایسے ہی خاموش لیکن ذمہ دار کارکنوں سے بنتی ہیں۔

قاضی عبدالحکیم صاحب

——— بریگیڈئر عبدالرزاق

حکیم صاحب ڈرائینگ پڑھاتے تھے۔ مصور بھی تھے۔ مصوری کی تعلیم لندن میں حاصل کی تھی۔ شاید وہاں پڑھایا بھی تھا۔ ایک آدھ بار وہاں کے قصے بھی سنائے۔ لیکن حیرت ہمیں اس وقت ہوئی جب ہاکی میچ کا ذکر آنے پر انہوں نے کہا۔ تم میں سے جن لوگوں کو ہاکی سے دلچسپی ہے وہ آج سہ پہر یہاں آجائیں۔ میں آپ کو یہ کھیل کھیلنا سکھاؤں گا۔

—— ہم نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کہ قاضی صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ قاضی صاحب اور ہاکی —— دو متضاد چیزیں ہیں۔ ان دنوں بھی انہیں دمے کی تکلیف تھی۔ دبلے پتلے پہلے سے تھے۔ اس تکلیف کی وجہ سے اور نڈھال سے نظر آتے تھے۔ پھر وہ کلاس میں ہاکی سکھانے کی بات کر رہے تھے۔ بہر حال میں، اخلاق ۴۵ ۲۳ اور تقریباً پندرہ بیس اور لڑکے وقت مقررہ پر ڈرائینگ ہال میں پہنچ گئے۔ قاضی صاحب آئے اور چاک لے کر پہلے تو بورڈ پر ہاکی فیلڈ بنائی۔ پھر ہر پوزیشن کا نشان لگایا پہلے اس امر کی وضاحت کی کہ اس کھیل میں گیارہ کھلاڑی ہی کیوں کھیلتے ہیں۔ پھر ہر پوزیشن کی ضرورت اور اہمیت کا تجزیہ کیا۔ مدافعت اور حملے کی تدبیر کاری کی توجیہہ کی۔ اس طرح زندگی میں پہلی بار اس کھیل کو سائینٹیفک انداز میں سمجھا اور پھر جب تک ہاکی کھیلتا رہا۔ ان کے سمجھائے ہوئے نکات کو کھیلتے ہوئے ملحوظ رکھا۔ وہ یقیناً جوانی میں ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی رہے ہوں گے میں ہاکی میں انہیں اپنا استاد سمجھتا ہوں اور مانتا ہوں۔

برکت علی چوہان

—— عبد الحکیم[۱]

چوہان صاحب حساب پڑھاتے تھے لیکن بڑے مزے سے۔ حساب پڑھنا کبھی بوجھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ بھاری بھر کم تھے۔ سٹیل گرے نقری پلیس سوٹ ان کی پہچان تھا جس کے کوٹ کے اوپر والی جیب سے ایک سرخ رنگ کا تکونا رومال جھانکتا رہتا تھا۔ ہمیشہ مسکراتے ہوئے آتے۔ چوڑا سانولا چہرہ ڈبل چن۔ ان کی شخصیت میں ایک بزرگانہ کشش تھی۔ سر کے گرے بالوں سے کچھ اندازہ ہوتا کہ ان کی عمر زیادہ ہے۔ وہ چونکہ ان چند استادوں میں سے تھے جن سے شعوری یا لاشعوری طور پر ڈر نہیں لگتا تھا۔ ہم نے ایک روز پوچھ لیا کہ سر آپ کے بال کہیں کہیں سے سفید کیوں ہیں۔ کہنے لگے ۶۶ برس کی عمر میں گرے ہی ہوں گے۔ پھر خود ہی بتایا کہ میں ۱۹۱۳ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں میتھس پڑھاتا تھا۔ اب حساب لگالو۔ بعد کو پتہ چلا کہ وہ کالج میں اعزازی طور پر پڑھاتے تھے۔ جہنم

۱۔ کالج نمبر ۱۹۸۱ء زمانہ تعلیم ۵۷-۱۹۵۰ء

میں سوات کی کسی فرم کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ ان دنوں کالج میں میتھس کے استاد کی ضرورت تھی۔ چیف انسٹرکٹر کیپٹن ابراہیم جوان کو پشاور سے جانتے تھے ان سے پڑھانے کی مدد کی درخواست کی تو وہ فوراً تیار ہو گئے۔ وہ اس زمانے میں ہمیں سائنسی کہانیاں سناتے تھے۔ سائنس فکشن کا نام تو ہم نے بہت بعد میں سُنا۔ سائنسی فکشن سے انہی نے ہی متعارف کرایا۔ ایک روز کہنے لگے ریاضی تمام سائنسوں کی ماں ہے۔ پھر باہر سے گلاب کا ایک پھول توڑ کر لائے۔ دیکھو اس میں بھی جیومیٹری ہے۔ تناسب ہے۔ انہوں نے بہت کچھ بتایا۔ تفصیلات یاد نہیں رہیں۔ لیکن یاد تاثر باقی ہے کہ بہت قابل تھے۔ بہت پیار سے پڑھاتے تھے۔ اور اب جبکہ یہ خیال آتا ہے کہ وہ صرف تعلیم کی محبت میں پڑھا رہے تھے اور بھی حیرت ہوتی ہے۔

______ بریگیڈیر عبد الرزاق تمغہ امتیاز[1]

چوہان صاحب پیریڈ کے آخری دس منٹ میں ایک سلسلہ وار موجودہ ٹی وی سیریز سٹار ٹریک قسم کی کہانی سناتے تھے۔ ایک کہانی ایک ہفتے، کبھی دو ہفتے میں ختم ہوتی تھی۔ ایک آدھ بار ہم نے ضد کی کہ سر، آج پوری کہانی سنیں گے تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ آئس کریم کھانے کے آخر میں کھائی جاتی ہے۔ ایک روز باتوں باتوں میں بتایا کہ افلاطون نے اپنی اکیڈیمی کے باہر لکھوا رکھا تھا کہ جس کو جیومیٹری نہیں آتی وہ اندر نہ آئے۔

پھر فرمایا ہندوستان میں مشہور تھا کہ مسلمانوں کو حساب نہیں آتا۔ علامہ مشرقی نے کیمبرج میں ریاضی میں امتیازات حاصل کر کے اس مفروضے کو غلط ثابت کر دیا۔ ایک روز کہنے لگے۔ الف لیلہ کی ایک کہانی جس میں بادشاہ نے اپنے بیٹوں سے سب سے اچھی چیز تحفہ لانے کو کہا ہے تو ایک اڑتا ہوا قالین دوسرا دور کی چیزیں دکھانے والا آئینہ اور تیسرا ہر مرض کا علاج سیب لاتا ہے۔ اب یہ تینوں چیزیں حقیقت ہو کر سامنے آگئی ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آرٹ اور سائنس دونوں میں Imagination کام آتا ہے۔ صرف اس کا طریق استعمال مختلف ہوتا ہے۔

ایک عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ آنریری استاد تھے۔ عمر ستر کے قریب ہوگی لیکن

---

[1] کالج نمبر ۲۱۸۶ زمانہ تعلیم ۶۲-۱۹۵۳ء

تھے چاق و چوبند اور زندہ دل۔ ایک روز کلاس میں آئے تو ہم نے دیکھا کہ آج کسی وجہ سے شیو نہیں کی ہوئی۔ انھوں نے بھی ہمارے تجسس کو نوٹ کیا۔ کہنے لگے رات بھر تاش کی بازی لگی رہی سید ھا وہیں سے اٹھ کر آ رہا ہوں اب جا کر شیو کر کے ناشتہ کروں گا۔۔۔ جاتے جاتے کہنے لگے کام اپنی جگہ شوق اپنی جگہ۔

محمد حسن صاحب

——— مسٹر منظور حسین

قبلہ محمد حسن صاحب علی گڑھ کے پرانے بی ایس سی جیالوجی تھے۔ یہاں آنے سے پہلے گلگت وغیرہ میں ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے۔ اس لحاظ سے کافی معمر تھے۔ لیکن تاب و توانائی میں جوانوں سے بڑھ کر تھے۔ اُردو کے ساتھ ساتھ ڈوگری کے بھی شاعر تھے اور کلاس میں کبھی کبھی ڈوگری کے شعر بھی ترنم سے سناتے تھے۔ مجھے دو تین مصرعے یاد رہ گئے ہیں۔

میرے بانکو دیا چا چسوا۔ اساں کی دے گیوں کھر پہ داڑی۔ آپنوں کردا ایں نوکری چاکری۔

ہم نے ایک روز پوچھا۔ مضمون تو آپ کا سائنس ہے۔ شاعر آپ کیسے بنے؟ فرمایا "اس کو بھی ایک اتفاق سمجھو۔ میں گلگت کے ایک سکول میں پڑھاتا تھا۔ وہاں آرمی کا ایک مقامی نوجوان کیپٹن ایک حادثہ کا شکار ہو کر انتقال کر گیا۔ وہ وہاں بہت معروف اور اس سے زیادہ مقبول تھا۔ اس کے والدین سے میرے کچھ مراسم تھے۔ میں بھی ان کے گھر تعزیت کے لیے گیا۔ دو چھوٹی چھوٹی بچیاں تو حادثہ کی نوعیت سے بے خبر ادھر ادھر پھر رہی تھیں لیکن اس کی جوان بیوہ پر صدمہ سے سکتہ طاری تھا۔ وہ پتھر کی مورت بنی بیٹھی تھی۔ مرحوم کے بوڑھے والدین کا حال اس سے برا تھا۔ گھر کی سوگوار فضا نے مجھ پر بہت اثر کیا۔ احباب بھی افسردہ بیٹھے تھے۔ کسی نے مجھ سے مرثیہ لکھنے کی فرمائش کی۔ میں مرثیہ کیا لکھتا میں نے اس وقت تک ایک شعر بھی نہیں کہا تھا۔ صرف شعر گنگنایا کرتا تھا۔ بہرحال اس ماحول کی اداسی کو دل میں اتارے میں گھر چلا گیا اور اس رات جو دو چار ٹوٹے پھوٹے شعر ہوئے وہ میں لے صبح احباب کو سنائے انھوں نے بہت پسند کیے ان کی داد سے حوصلہ پا کر میں نے دو چار شعر اور کہے۔ اس طرح

لہ کالج نمبر ۲۱۴۹، ایڈووکیٹ میرپور زمانہ تعلیم ۶۲-۱۹۵۳ء

ایک مرثیہ تیار ہوگیا۔ پھر تو گویا چٹان سے سوتا پھوٹ پڑا۔ اب تو اکثر اشعار خود بخود زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی عطا ہے۔

حسن صاحب زندہ دل اور جواں ہمت تھے۔ کالج کی سالانہ کھیلوں کے آخر میں جو سٹاف ریس ہوئی وہ اس میں ضرور حصہ لیتے۔ منگلا، رسول، کھیوڑہ، لاہور جہاں جہاں ہم سیر سفر کے لیے جاتے وہ بھی ہمارے ہمراہ ہوتے اور ان موقعوں پر فی البدیہہ شعر سناتے تھے اور ہر سرگرمی میں ہمارے ساتھ حصہ لیتے۔

اس وقت ہمارے لیے یہ معمولی بات تھی۔ آج تیس برس کے بعد یہ لکھنے بیٹھا ہوں تو اندازہ ہو رہا ہے ساٹھ پینسٹھ کے اس بوڑھے جوان نے کس خوبصورتی سے ہمیں زندگی کا ایک بہت قیمتی سبق اپنی زندگی سے سکھا دیا۔ جو شاید اس وقت کوئی اور نہ سکھا سکتا۔ یعنی:

How to grow old gracefully and usefully and enjoy every moment of it.

پتہ نہیں کسی نے اس امر پہ ریسرچ کی یا نہیں کہ اس زمانہ میں یعنی ۵۰ء کے ملٹری کالج کے سٹاف میں عمر، تجربہ، مزاج، صلاحیت (Talent) علاقہ اور علم کی کتنی ورائٹی تھی۔ حسن صاحب قبلہ نے اقبال کی نظم

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے — جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی

بہت ذوق شوق سے پڑھائی۔ اقبال کے آباؤ اجداد کشمیری تھے۔ اس حوالے سے کشمیر کی تاریخ پر بھی سیر حاصل گفتگو کی۔ جموں کشمیر کی تحریک آزادی کی ابتدا ۱۹۳۳ء میں پونچھ سے ہوئی تھی ڈوگرہ راج کے مظالم کی جو تفصیلات انہوں نے سنائیں ہم کشمیری بچوں کا تو خون کھولنے لگا تھا۔

——— لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر

غالباً ۱۹۵۵ء میں حسن صاحب نے ایک کورس (Chorus) تیار کروایا تھا۔

چل چل رے نوجوان	رُکنا نہیں تیرا کام
چلنا تیری شان	آفت سے لڑے جا
آندھی ہو یا طوفان	رکنا نہیں تیرا کام
چلنا تیری شان	چل چل رے نوجوان

ے کالج نمبر ۲۱۹۶ زمانہ تعلیم ۶۱-۳-۱۹۵۴ء

۱۹۵۷ء میں رفیق صاحب سارے کالج کو منگلا فورٹ پر ہائیکنگ اور پکنک پر لے گئے تھے۔ (اس وقت تک منگلا ڈیم پر کام شروع نہیں ہوا تھا) وہاں انہوں نے فی البدیہہ ایک نظم سنائی تھی۔ برجستہ شعر کہتے ہوئے ہم نے انہیں کو دیکھا اسی طرح ہیڈ رسول کے مقام پر کرنل رفیق کے زمانہ میں پورے کالج کا جو دو روز کا کیمپ ہوتا تھا۔ اس کی کیمپ فائر میں فی البدیہہ شعر سنائے تھے۔

جمعہ کی شب کو کالج ہال میں جو توسیعی لیکچر ہوتے تھے ان میں وہ مذہبی موضوعات پر لیکچر دیتے تھے۔

——— ڈاکٹر سرفراز مرزا[1]

یوں تو Social commitment کے شعور اور جذبہ کی نشو و نما Secular Education کا بھی ایک بنیادی مطمح نظر (Objectives) ہوتا ہے لیکن ایک نظریاتی مملکت میں تو ملی اور ملکی Commitment کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اوائل ۵۰ء میں ملٹری کالج میں (خاص طور سے کرنل رفیق کے دم قدم سے) ملی اور قومی ذمہ داری کا جذبہ بڑی شدت سے جاری وساری تھا۔ ۱۹۵۰ء میں جب میں کالج میں داخل ہوا تو کالج میں یہ نغمہ گونج رہا تھا۔

تن من دھن قربان تجھ پر پاکستان — عظمت انساں قائم تجھ سے
رونق بزم جہاں پیارے پاکستان — زندہ رہے پائندہ رہے تو
اونچا تیرا نشان پاکستان — پیارے پاکستان

اس زمانہ میں حیدری صاحب نے انگریزی نغمہ Sons of Pakistan لکھا تھا جس کا آخری بند آج تک میرے دل پر نقش ہے۔

Our pride's to live and die
To see our flag e'er high
And freedom far and nigh
We are sons of Pakistan
Zinda bad our Pakistan

---

[1] کالج نمبر ۲۰۰۰، پی ایچ ڈی۔

جناب حسن نے ۱۴/اگست ۱۹۵۲ء کی تقریب پر جو نظم سنائی تھی (وہ ۵۳-۱۹۵۲ء کے ترہیت سے نقل کر کے) آج ان کی یاد کی نذر کرتا ہوں۔

وطن کے نونہالو! شاہی کالج کے جواں تم ہو
جو پاکستان قالب ہے تو اس قالب میں جاں تم ہو

تمہاری نقل و حرکت ڈالتی ہے جاں کالج میں
رگوں میں اسکی مثل خوں رواں تم ہو دواں تم ہو

تمہیں ہے فخر کالج پر تو کالج تم پہ نازاں ہے
تمہارا پاسباں یہ ہے اور اسکے پاسباں تم ہو

بنایا قائداعظم نے جس کو جانفشانی سے
یہ لازم ہے کہ اس کشور کی خاطر جانفشاں تم ہو

تمہاری ذات سے روشن ہوا نام قائداعظم
کہ اس مرد مجاہد کے یہاں نام و نشاں تم ہو

دکھا کے تیغ کے جوہر بٹھادو دھاک دنیا پر
عدو کے سینہ ناپاک میں نوک سناں تم ہو

یہ پاکستان کا پرچم کہ لہراتا ہے کالج پر
اسی کی سربلندی سے جوان عزوشاں تم ہو

آخر میں، میں جناب حسن کی ایک اور نظم :

"مادر پاکستان" کا اپنے بچوں سے خطاب

۵۷-۱۹۵۶ء کے ترہیت سے نقل کرنا چاہوں گا یہ انھوں نے ۱۹۵۷ء کے یوم جمہوریہ کے موقع پر کالج ہال میں سنائی تھی۔

سنو اے قوم کے بچوں! جواں ہونے کا وقت آیا
تمہاری ناتوانی کو تواں ہونے کا وقت آیا

مرے نازوں کے پالو! امتحاں ہونے کا وقت آیا
ہیں جو جوہر نہاں، انکے عیاں ہونے کا وقت آیا

وطن کا نام اپنے کارناموں سے کرو روشن
مری آنکھوں کے تارو! ضوفشاں ہونے کا وقت آیا

ہواؤں کا تقاضا دم بدم ہے بند نافوں سے
نثل مشک ختن، عنبر فشاں ہونے کا وقت آیا

فضائے آسماں! سونی پڑی ہے ایک مدت سے
وطن کے شاہیں بچو! پرفشاں ہونے کا وقت آیا

زمانے کی نگاہوں میں حزف ریزے نہیں بچتے
جگر گوشہ میرے! لعل گراں ہونے کا وقت آیا

علوم نو سے سیکھو، علم اشیا کی جہانگیری
ضمیر کن فکاں کے راز داں ہونے کا وقت آیا

تمہیں سونپا گیا ناموس پاکستان کا ورثہ
امینو امانت کے امینو! پاسباں ہونے کا وقت آیا

آخری تین شعر خاص طور پر کتنے معنی خیز اور خوبصورت ہیں۔ سبحان اللہ! حسن صاحب کو

شاعر ملٹری کالج کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ خدا کرے ملٹری کالج کے بام و در میں کسی اور حسن کی آواز بھی بانگ درا بن کر گونجے اور گونجتی رہے اِکہ ادارہ ایسی غیر معمولی ہستیوں سے ہی بنتا ہے۔

———— لیفٹیننٹ کرنل منیر افضل پراچہ[1] امتیازی سند

نومبر ۱۹۵۵ء میں کرنل رفیق نے کالج کی کمان دوبارہ سنبھالتے ہی اسے پبلک سکول کا رنگ دینے کا جو ہمہ گیر پروگرام شروع کیا اس میں کالج کے لیے ایک ہفتہ وار آٹھ صفحاتی اخبار کا اجراء بھی شامل تھا جو انگریزی میں نیوز اینڈ ویوز اور اردو میں خبر و نظر کے نام سے شائع ہوتا تھا (ہر ہاؤس کا اپنا اپنا اردو و انگریزی وال پیپر علیحدہ تھا) خبر و نظر کے نگراں راشد صاحب اور میں اس کا پہلا ایڈیٹر تھا۔ چونکہ اس وقت تک اردو ٹائپ عام نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اردو کا سٹینسل میں خود کاٹتا تھا۔ پھر یہ سائیکلو سٹائل ہوتا تھا۔ آمدم برسرِ مطلب ۲۳ مارچ ۵۶ء کو پہلا یوم جمہوریہ منانے کے لیے ہم نے خبر و نظر کا ایک خاص ایڈیشن نکالا تھا جس کے ٹائٹل پر مکمل آزادی کے سورج کو طلوع ہوتے اور غلامی کی زنجیر کو ٹوٹتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ کالج یوم جمہوریہ کی تقریب کے لیے قبلہ محمد حسن صاحب نے ایک نظم کہی تھی۔

پاس ہوا اپنا دستور

جو پہلے خبر و نظر کی بھی زینت بنی تھی۔ بعد میں ۵۶-۱۹۵۵ء کے تربیت میں شائع ہوئی:

شب کی ظلمت دور ہوئی   چار دانگ میں چھایا نور
پاکستان ہے بقعۂ نور   چھوٹے بڑے ہیں سب مسرور

پاس ہوا اپنا دستور

بچہ بچہ ہے دل شاد   پاکستان ہوا آزاد
زندہ و پائندہ باد   ہے یہ نعرۂ جمہور

پاس ہوا اپنا دستور

---

[1] کالج نمبر ۲۲۶۲، زمانہ تعلیم ۶۱-۱۹۵۴ء

ملک کی ہے دستور سے شان　　　دورِ آئین سے اس کی آن
بے آئین ہیں جو انسان　　　ہیں تہذیب سے کوسوں دور
پاس ہوا اپنا دستور

اسلامی جمہوریہ یہ نام　　　ہے مقبول خاص و عام
کہتے ہیں اہل اسلام　　　خوشی سے ہوئے ہیں معمور
پاس ہوا اپنا دستور

خوشی سے ہو کالج سرشار　　　بخت ہوا تیرا بیدار
بڑھے گا تیرا عزّ و وقار　　　ہو گا عالم میں مشہور
پاس ہوا اپنا دستور

ریکارڈ پر لانے کے لیے یہ بھی لکھنا ضروری ہے کہ یوم جمہوریہ کے موقع پر حیدری صاحب نے بھی انگریزی میں ایک نظم لکھی تھی۔

Hail, Republic Day
Let cheers sing out and joyful songs be heard
Peal happy bells and ring the cares away

حسن صاحب کو فی البدیہہ شعر کہنے اور پیروڈی کرنے میں بھی کمال حاصل تھا۔ اقبال کی مشہور نظم پرندے کی فریاد۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ　　　وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی　　　اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

کی پیروڈی حسن صاحب نے سکین ہاؤس کے ایک فنکشن میں جہاں نئے لڑکے نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ سنائی:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ　　　وہ گاؤں کی فضائیں وہ بکریاں چرانا
اٹھ کے سویرے کھانا وہ باجرے کا ڈھوڈا　　　لسّی کی پوری چاٹی اک آن میں لنڈھانا
ستو کی لے کے مٹھی اتنی ہی ڈالی شکر　　　مکھن چرا کے گھر کا اس میں ملا کے کھانا!
کھیتوں سے توڑ لانا وہ باجرے کے سٹے　　　اور رکھ کے منہ میں ان کو وہ شوق سے چبانا

سختی سے گرمیوں کی گھر کے جوہڑوں میں ـــ بھینسوں کے ساتھ مل کر وہ ڈبکیاں لگانا
اماں کے لاڈ پر بھی بہنوں کے پیار پر بھی ـــ اماں کو تنگ کرنا بہنوں کا منہ چڑانا
پیڑوں کی چوٹیوں پر بے خوف ہو کے چڑھنا ـــ اور گھونسلوں سے انڈے سارے نکال لانا
گاؤں کے مدرسے کو روتے رلاتے جانا ـــ اور واپسی پہ اکثر ہنستے ہنساتے آنا
لکھا پڑھا تو بھولے لیکن نہیں ہیں بھولے ـــ غصے میں ماسٹر کا مرغا ہمیں بنانا
آزاد ماسٹر تھے آزاد ہم تھے سارے ـــ موقوف تھا خوشی پر پڑھنا ہو یا پڑھانا
وہ دن کہاں ملیں گے جب ہم کو تھا میسر ـــ من مانیاں کرانا من مانیاں چلانا
راحت کا وہ زمانہ اک خواب ہو گیا ہے ـــ وہ ناز پروری کے دن ہو گئے فسانہ
لاگو ہوا ہے جاں کا کالج کا ٹائم ٹیبل ـــ بُنتے ہیں رات دن ہم اس کا ہی تانا بانا

یادش بخیر کبھی کالج میں ایک آکنلک ہاؤس ہوتا تھا جس کا ۱۹۴۳ء میں اس وقت کے کمانڈر انچیف جنرل کلاڈ آکنلک (بعد کو سر فیلڈ مارشل کلاڈ آکنلک) نے افتتاح کیا تھا۔ یہ جنگ کے زمانہ میں ایمرجنسی کے طور پر بنایا ہوا کچا ہاؤس تھا۔ جو دس پندرہ سال میں خاصا خستگی کا شکار ہو گیا تھا۔ جس کی خستگی کا بھرم رکھنے کے لیے اس کے باسی اسے پیار سے شیش محل کہتے تھے۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں جب سکین ہاؤس نو تعمیر شدہ ہاؤس ٹیپو سلطان میں منتقل ہوا تو آکنلک ہاؤس کے باسی سکین ہاؤس شفٹ ہو گئے۔ گھر کتنا ہی خستہ ہو آخر گھر ہی ہوتا ہے۔ سکین ہاؤس میں جانے سے پہلے آکیز نے ہاؤس میں ایک الوداعی تقریب کی۔ اس میں قبلہ حسن صاحب نے جو اس وقت آکنلک ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر تھے آکیز کی زبانش پران کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک نظم پڑھی۔ شیش محل سے رخصت ہوتے ہوئے:

اے آک ہاؤس تجھ کو ہے جانتا زمانہ ـــ مشہور ہے جہاں میں ہر سو ترا فسانہ
کالج میں جگہ تجھ کو صف آخر میں ملی تھی ـــ لیکن سوا تھا سب سے منظر ترا سہانہ
وہی حال اب بھی تیرا جو روز اولیں تھا ـــ دم خم تیرے وہی ہیں وہی تیرا دندنانا
کوہ وقار بن کر تو یوں کا توں کھڑا ہے ـــ پائے ثبات تیرے کیا جانیں ڈگمگانا
سائے میں تیرے گزرے یوں روز و شب ہمارے ـــ گویا یہ زندگی تھی ہمیں عیش جاودانہ

تو گلستاں تھا اپنا، ہم تیری بلبلیں تھے
تھا تیری ڈالیوں میں عرصے سے آشیانہ

دیوار و روزن و در شیشوں سے گو تھے خالی
اس پر بھی ہم نے تجھ کو اک شیش محل جانا

بھاتے تھے دل سے ہم کو سب نقص و عیب تیرے
تیرا ٹپکنا ہم کو تھا تال سُر میں گانا

سینوں میں داغ فرقت لے جا رہے ہیں تیرا
دیکھیں کہاں ہے لکھا قسمت میں آب و دانا

افسوس مدتوں کا اب ساتھ چھُٹ رہا ہے
پامال ہو رہا ہے بستا ہوا گھرانا!

جائے گی اپنے دل سے لیکن نہ یاد تیری
اے شیش محل تو بھی ہم کو نہ بھول جانا

——— لیفٹیننٹ کرنل اعجاز احمد[1]

حسن صاحب شاعر تھے۔ اور انہیں یہ کمال حاصل تھا کہ کھڑے کھڑے شعر کہہ کر سُنا دیتے تھے۔ رسول ہیڈ ورکس، منگلا، رہتاس اور کھیوڑہ کی سیروں کے موقع پر انہوں نے برجستہ شعر کہہ سنائے۔ ۱۹۵۹ء کے آخر میں جب وہ ریٹائر ہو کر کالج سے جانے لگے تو ان کے اعزاز میں یادگار کے لانز میں ایک شاندار ڈنر دیا گیا تھا اور جو سپاسنامہ پیش کیا گیا تھا اس کے جواب میں اپنی تقریر کے آخر میں انہوں نے جو شعر سنائے ان کا ایک مصرع اس وقت مجھے یاد آرہا ہے:

حسن کا بھی آج اس کالج سے جانے کا وقت آیا

ایک بار انہوں نے اقبال کی ایک غیر مطبوعہ غزل سنائی تھی جس کا ایک شعر تھا۔

مبارک ہو زاہد کو جنت
میں تیرا سامنا چاہتا ہوں

——— بریگیڈئر محمد مشتاق[2]

حسن صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ کلاس میں حساب کے علاوہ کوئی بات نہیں کرتے ان کے صاحب زادے مسٹر کے ایچ خورشید کی جب آزاد کشمیر کے صدر ہونے کی خبر پہنچی تو ہم نے انہیں گھیرا۔ سر، آپ کے بیٹے آزاد کشمیر کے صدر انہوں نے صرف اتنا کہا نو گویا کہ نالائق ہے۔ اور الجبرے کا سوال حل کرنا شروع کر دیا۔ کلاس سے باہر وہ داستان گو تھے لیکن کلاس میں کیا مجال ہے کہ کوئی غیر متعلق بات ہو جائے۔

---

[1] کالج نمبر ۵۸۲۳، زمانہ ۶۲-۱۹۵۶ء [2] کالج نمبر ۲۴۱۰، زمانہ ۶۲-۱۹۵۸ء

ـــــــ لیفٹیننٹ کرنل شمیم احمد جاوید[1]

۱۹۵۷ء میں سالوں میں، میں نے حسن صاحب سے جغرافیہ، تاریخ اردو، حساب انگریزی غرض ہر مضمون پڑھا ہے۔ ہوتا یہ تھا جب کسی مضمون کا استاد کسی وجہ سے چھٹی پر ہوتا تو وہ ریلیف پیریڈ میں آتے تو وہ وہی مضمون پڑھاتے جس کا وہ پیریڈ ہوتا اس طرح ان سے ہر مضمون پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ تخصیص انہی کو حاصل تھی ورنہ دوسرے استاد اپنے مضمون کے علاوہ دوسرا کوئی مضمون نہیں پڑھاتے تھے اور سیلف سٹڈی کروا دیتے تھے۔

برڈووڈ ہاؤس کے سٹرڈے فنکشن میں وہ اکثر آغا حشر کے ڈراموں کے ٹکڑے سناتے تھے انہیں آغا حشر کے ڈراموں کے سین ازبر تھے۔ ایک روز آغا حشر کے ڈرامہ خوب صورت بلا کا پورا پہلا سین سنا ڈالا جو نیکی بدی کے مکالمہ سے شروع ہوتا ہے۔ ابتدا نیکی کے گانے سے ہوتی ہے۔

جس راہ میں ہوں ٹھوکریں، وہ راہ اے انسان نہ چل
جرم و گنہ کے بوجھ سے ورنہ گرے گا منہ کے بل
تاریکیاں ہیں ہر طرف اندھا نہ بن اب بھی سنبھل
ایمان کا فانوس لے اور اس میں جلا شمع عمل
اٹھ دوڑ بھاگ آ اس طرف طاقت ابھی ہے پاؤں میں
آرام و راحت زندگی سب ہیں خدا کی چھاؤں میں

بدی: (سامنے آکر) میں ہوں جہاں کی خوشی، میں ہوں، دنیا کی معیبت، خدا اور انسان کے بیچ میں دیوار۔

تم بہشت کی امیدیں دنیا کو دوزخ بناتے ہوئے میری طرف آؤ اور میرا دروازہ کھٹکھٹاؤ میری سخاوت کے بادل موتی برسائیں گے اور تمہارے دامن کو بھی مالا مال کر دیں گے۔

نیکی: تو جھوٹی ہے تو آدمی کو ذلت، مصیبت اور خوفناک موت کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔

بدی: چپ، تو ہی میری طرف آنے والوں کو روکتی ہے۔

نیکی: اور تو نیک راہ چلنے والوں کو جہنم کے اندھیرے غار میں گراتی ہے۔

---

[1] زمانہ تعلیم ۶۴-۱۹۵۷ء

بدی : تو نہ ہوتی تو دنیا میں بہشت کا مزہ آتا۔
نیکی : بدی تو نہ ہوتی تو خدا جہنم کو پیدا ہی نہ کرتا۔
بدی : نیکی لڑائی چھوڑ۔
نیکی : بدی بڑائی چھوڑ۔

اسی سین میں آگے چل کر ملکہ شمسہ اور ڈرامہ کے ہیرو توفیق میں وہ مکالمہ تھا جو لڑکوں میں بہت مقبول تھا اور جس کی بار بار فرمائش کی جاتی تھی۔

ملکہ شمسہ : جاؤ اس ضدی کتے کو میرے سامنے لاؤ ضد کس سے مجھ سے، مجھ سے جو طوفانی سمندر کی طرح غصے میں دیوانی ہو جاتی ہے۔ جو دم کے دم میں آندھی کی طرح بلائے ناگہانی ہو جاتی ہے

قتلو : ملکۂ عالم، قیدی کو حاضر کیا جائے۔

شمسہ : حاضر کرو اس سرکش کو،

شمسہ : (توفیق سے) کیوں، توفیق کس حال میں ہے ؟

توفیق : کس حال میں ہے؛ شیر لوہے کے جال میں ہے۔

شمسہ : سرکش۔
کیوں تباہی لا رہا ہے اپنے عز و جاہ پر۔

توفیق : پرواہ نہیں جو آج زمانہ خلاف ہے راستہ وہی چلوں گا جو سیدھا اور صاف ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ شیکسپیئر کے ڈرامہ مرچنٹ آف وینس کا پورا کورٹ سین حافظہ سے سنا دیا۔ ڈرامہ کی ہیروئن Portia کی مشہور Mercy speech

The quality of mercy is not strained,
It droppeth as the gentle rain from heaven upon
The place beneath. It is twice blest,
It blesseth him that gives, and him that takes

کو اس طرح ادا کیا کہ لطف آ گیا۔

ایک آدھ بار ڈوگری کے گیت بھی سنائے ایک گیت جس کی ان سے اکثر فرمائش کی جاتی تھی۔ یہ تھا:

ییں کی دی نال کہنی کچھ دے   مہاڑے بانکونے دا چا ہوا

ان کی زندہ دلی، ہمارے لیے باعث حیرت تھی۔ اور اب باعث رشک ہے۔ ایک روز ہم نے کلاس میں پوچھا "سر آپ کی عمر کیا ہوگی؟" یہی کوئی چھیاسٹھ سال۔ یہ واقعہ ۱۹۵۸ء کا ہے لطف کی بات یہ کہ یہ فقرہ یہی کوئی چھیاسٹھ سال انہوں نے اس طرح بے ساختگی اور روا روی سے ادا کیا جیسے اسے وہ کوئی اہمیت نہیں دے رہے۔ اس حقیقت کا ادراک مجھے تیس برس بعد ہوا کہ اصل چیز ماہ وسال کی گردش کا حساب نہیں۔ دل ودماغ کی فضا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں شخصیت ہے جس کا گردش ماہ وسال سے کوئی تعلق نہیں۔

———— کرنل غلام علی

۱۹۵۸ء میں جب میں یہاں ساتویں درجہ میں داخل ہوا لیکن ایک دور افتادہ دیہاتی سکول سے آنے کی وجہ سے انگلش میڈیم نام کی کسی چیز سے واقف نہ تھا۔ انگریزی شروع بھی چھٹی میں کی تھی۔ سال بھر کی بہت Indifferent schooling کی وجہ سے انگریزی جتنی اچھی ہو سکتی تھی ظاہر ہے مختصر یہ کہ دوسرے مضامین کی بہتری اپنی جگہ لیکن انگریزی میں Proficiency میں کمی کی وجہ سے مجھے کالج کی سب سے کمزور کلاس ساتویں ڈی میں جگہ ملی۔ اس میں میری طرح کے بلکہ بعض تو مجھ سے بھی زیادہ کمزور تھے۔ لیکن خوش قسمتی سے (یہ کرنل رفیق ایسے صاحب نظر Educationist کے انتخاب کا کمال تھا) کہ انگریزی پڑھانے کو حسن صاحب ملے۔ اب مجھے تفصیل یاد نہیں کہ انہوں نے کیسے پڑھایا۔ کون سا جادو کیا کہ ہماری انگریزی آہستہ آہستہ چمک اٹھی۔ جب انگریزی سنبھلی تو باقی منزلوں کو سر کرنا چنداں دشوار نہ تھا۔ حسن صاحب کا تکیہ کلام گویا کہ نالائق تھا۔ گویا کہ نالائق کہتے کہتے انہوں نے ہمیں لائق سے لائق تر کر دیا۔

حسن صاحب قبلہ کی ایک اور خصوصیت کا بھی ذکر کرنا چاہوں گا۔

میں نے انہیں چنا ہے تو ایک اور وجہ سے اور وہ یہ کہ اگرچہ ان کے بالوں کی سفیدی اور چہرے کی جھریاں بتاتی تھیں کہ ان کی جسمانی عمر ساٹھ پینسٹھ سے کم نہیں لیکن چاق وچوبند نوجوانوں سے زیادہ تھے۔ کیا مجال کہ کسی نے کسی سے شرارت سے مسکراہٹ بھی Exchange

کی ہویا ڈیسک کے ساتھی کی انگلی اندر ہی اندر مروڑی ہو اور انھوں نے فوراً اس کا نوٹس لیا نہ ہو۔ ان کا پُر شباب بڑھاپا میرے لیے ایک آئیڈیل بن گیا ہے۔ برسہا برس کے بعد ایک کتاب پڑھی How to grow old gracefully وہ کتابی باتیں تھیں مزہ نہیں آیا۔ میں اپنی آنکھوں سے ایک Graceful old man کو بڑی خوبصورتی سے زندگی گذارتے دیکھ چکا تھا۔

مجھے زندگی بھر حسرت رہے گی کہ میں ان کے جنازے میں شریک نہ ہو سکا۔ اب زندگی بھر ان کے لیے دعا کرتا رہوں گا۔

اے نگارِ وطن تو سلامت رہے اے مادرِ درسگاہ تو سلامت رہے۔ تو نے اپنے بچوں کو کیا کچھ نہیں دیا۔

——— بریگیڈیئر یعسوب علی ڈوگر

مجھے یاد ہے کہ امتحان ہو رہا ہوتا اور وہ نگرانی پر ہوتے تو ٹہلتے جاتے اور شعر گنگناتے جاتے۔ خدا معلوم انہیں کتنے ہزار شعر یاد تھے۔ انہیں کراس ورڈ پزل حل کرنے کا شوق بھی تھا۔ شوقیہ معمے حل کرتے رہتے تھے۔ ان کے بیٹے کے ایچ خورشید جو قائداعظم کے سکریٹری بھی رہ چکے تھے ان دنوں آزاد کشمیر کے صدر تھے۔ لیکن حسن صاحب نے نہ کبھی ان کا تذکرہ کیا نہ فخر۔ قطعیٔ نارمل رہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے ہر جمعہ کی شب مذہبی موضوعات پر لیکچر ہال میں لیکچر بھی دیتے تھے۔

قاضی حامد علی

——— کرنل امتیاز احمد[1]

قاضی صاحب ہمیں میٹرک میں انگریزی پڑھاتے تھے ان کا بیٹا جاوید بھی اسی کلاس میں ہمارے ساتھ پڑھتا تھا۔ اس کو کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہ تھی۔ جو سلوک ان کا دوسروں کے ساتھ تھا وہ اس کے ساتھ تھا۔ اس زمانہ میں نام کے ساتھ نمبر بھی استعمال ہوتے تھے۔ وہ اس کو بھی اکثر اسی رسمی طریقے سے بلاتے تھے۔

---

[1] کالج نمبر ۲۱۲۴۔ زمانہ ۵۹-۱۹۵۲ء

دوسری بات یہ کہ اس زمانہ میں پورے ملک میں مذہب کا وہ چرچا اور قرآن و حدیث کا حوالہ دینے کی وہ روایت عام نہ تھی جو آجکل ہے۔ لیکن قاضی صاحب قبلہ انگریزی پڑھاتے ہوئے اکثر قرآنی آیات کا حوالہ دیا کرتے تھے لَیْسَ لِلْاِنسانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ لَا تَقْنَطُوا مِن رَحْمَۃِ اللہ اور لا یضیع اجر المحسنین افلا تعقلون افلا تعلمون وغیرہ جیسی آیات میں نے پہلے پہل ان ہی سے سنی تھیں دسمبر کی تعطیلات میں ہمیں امتحان کی تیاری کے سلسلہ میں رکنا پڑا تھا۔ قاضی صاحب پابندی سے انگریزی میں کمزور لڑکوں کی کلاس لیتے تھے۔ ہمارے ہوتے ہوئے اے ای سی میں کمیشن لے کر پوسٹ آؤٹ ہو گئے تھے۔

——— مسٹر حسن اختر[1]

یہ واقعہ ۱۹۵۵ء کا ہے۔ سال میں دوبار کچھ منتخب لڑکے پی۔ ایم۔ اے کاکول پاسنگ آؤٹ پریڈ دیکھنے جاتے تھے۔ عموماً ان لڑکوں کو بھیجا جاتا تھا جنہوں نے پڑھائی میں یا کھیلوں وغیرہ کسی ہم نصابی سرگرمی میں کوئی امتیاز حاصل کیا ہو۔ سوئمنگ کے مقابلوں کے گروپ ڈے میں مجھے Best swimmer کا اعزاز مل چکا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ اس بار پی۔ ایم۔ اے جانے والوں لڑکوں کی فہرست میں میرا نام بھی ہو گا لیکن جب سرکلر نکلا تو اس میں میرا نام نہ تھا۔ میں سیدھا ہاؤس ماسٹر قاضی حامد علی صاحب کے پاس گیا اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا تو انہوں نے کہا۔ ساری غلطی ہو گئی۔ یہ حق تمہارا بنتا ہے۔ اور اپنے ہاتھ سے ہاؤس پریفکٹ کا نام کاٹ کے جس نے کوئی امتیاز حاصل نہیں کیا تھا میرا نام لکھ دیا۔ بعد میں، میں اپنی خوشی سے ہاؤس پریفکٹ کے حق میں دست بردار ہو گیا۔ لیکن قاضی صاحب کی عدل پروری کی یاد آج بھی دل میں باقی ہے۔

——— کرنل محمد یامین[2]

قاضی صاحب انگریزی پڑھا رہے تھے لڑکے باری باری ریڈنگ کر رہے تھے۔ پڑھتے پڑھتے ایک لفظ بال (Ball) آیا جس کو اس لڑکے نے کال (Call) کے وزن پر منہ کھول کر بال پڑھ دیا اب کیا تھا۔ قاضی صاحب نے اسے بار بار بتایا کہ اسے یوں ادا کرو جیسے اے

---

[1] کالج نمبر ۲۲۰۰ زمانہ تعلیم ۶۰-۱۹۵۴ء [2] کالج نمبر ۲۲۵۵ زمانہ ۶۱-۱۹۵۴ء

نہیں اور (ہ) ہے۔ بول۔ غریب ایسا Confuse ہوا کہ اس بے یہ لفظ صحیح طور پر ادا نہ ہو۔ اودھر قاضی صاحب لگے ہوئے ادھر اس کی سوئی رکی ہوئی۔ جتنا وہ اسے بتاتے اتنا ہی وہ بوکھلائے۔ خاصا وقت گزر گیا آخر کار انہوں نے اسے سانس لینے کا وقت دیا۔ شکر ہے کہ دوسرے راؤنڈ میں وہ بال کو صحیح تلفظ سے ادا کر سکا۔ قاضی صاحب بھی اس عرصہ میں پسینہ پسینہ ہو چکے تھے۔

شفیق صاحب

ـــــــ لیفٹیننٹ کرنل محمد ایوب[1]

ایک عالمگیرین کیپٹن شیر افضل کوارٹر ماسٹر تھے۔ انہوں نے سٹاف میں سرکلر کیا کہ فرنیچر کے کسی آئیٹم کی مرمت درکار ہو تو وہ ان کے دفتر میں پہنچا دیا جائے۔ شفیق صاحب بدست خود ایک ٹوٹی ہوئی کرسی لے کر ان کے دفتر پہنچ گئے۔ یہ لیجیے Broken chair brought I have شیر افضل یہ سن کر باہر بھاگے کہ ان سے ہنسی ضبط نہیں ہو رہی تھی۔ اور استاد کا ادب بھی ملحوظ تھا۔

ـــــــ سید زمان خان[2]

شفیق صاحب کلاس میں آتے ہی شروع ہو جاتے اور کبھی کرسی پر بیٹھ کر نہیں پڑھاتے تھے۔ ایک روز پڑھاتے پڑھاتے ایک دم کرسی پر بیٹھ کر کچھ بتانے لگے۔ لڑکوں نے کہا سر آخر کار آپ بھی بیٹھ ہی گئے۔ ارشاد ہوا: Resting a bit I am بعد میں پتہ چلا کہ موٹر سائیکل سے سلپ ہونے سے کمر میں جھٹکا آیا تھا۔ لیکن یہ اللہ لوگ پھر بھی کلاس لینے آ گئے تھے۔

ـــــــ بریگیڈیئر یعسوب علی ڈوگر

شفیق صاحب میں حیدری صاحب کا سا Glamour اور علوی صاحب کا سا Sophistication تھا۔ لہجہ ٹھیٹ پنجابی انداز کبھی شاہانہ اور کبھی ملنگانہ لیکن بے حد مخلص اور اپنے مضمون میں طاق، وہ موج میلہ کے ماحول میں کیمسٹری ایسے

---

[1] کالج نمبر ۲۲۰۹ زمانہ تعلیم ۶۰-۱۹۵۳ء اور [2] کالج نمبر ۲۱۳۹ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ لندن زمانہ تعلیم ۵۹-۱۹۵۳ء اور

مضمون کو پانی کر دیتے تھے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد اقبال اکبر خان

شفیق صاحب فنا فی المضمون تھے کیمسٹری سے ہمیں کبھی بور نہیں ہونے دیا۔ یہ تھی کہ بے حد ڈوب کر پڑھاتے۔ پورے Concentration کے ساتھ لیکن ان کا پڑھانے کا اپنا سٹائل تھا۔ ان سے اپنی مٹی کی خوشبو آتی تھی۔ ان میں ایک ایسی اپنائیت تھی جس سے وہ بہت قریب محسوس ہوتے تھے۔ اکثر جملوں کے الفاظ کو اپنی من مانی ترتیب سے بولتے جس سے سب لطف اندوز ہوتے۔ جو لڑکے شوخی کرتے ان کی مکوں سے تواضع بھی کرتے جاتے۔ ان کا کھتی مارنے کا خاص انداز مکوں سے گھبیں کرتے تھے۔ یہ بھی ان کا خاص لفظ ہے۔ ان کا لباس بھی ان کے مزاج سے ہم آہنگ ہوتا تھا۔ بہت قیمتی ٹائی بہت معمولی کوٹ کے ساتھ بہت اچھا کوٹ بہت معمولی پتلون کے ساتھ۔ وغیرہ وغیرہ اگر کسی اور میں اس طرح کے Mannerisms ہوتے تو بڑا عجیب سا لگتا لیکن شفیق صاحب شفیق صاحب تھے۔ اب ان کی Ideosyncracies ان کی Image کا حصہ بن گئی ہیں ان کے بغیر ہم اپنے بہت ہی "شفیق" شفیق صاحب کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان کی ذات کے حوالے سے میں نے یہ سبق سیکھا کہ انسان اپنے کام میں کامل اور دل کا گہرا ہو تو اس کی Odd باتیں اس کی ادا بن جاتی ہیں اور اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ لکھتے ہوئے راشد صاحب کا سنایا ہوا ایک شعر یاد آ گیا۔

کامل نہ اٹھا فرقہ زہاد سے کوئی ۔۔۔ جو کچھ ہوئے یہی رندان قدح خوار ہوئے

شفیق صاحب سائنسی میدان میں بڑے Creative اور Imaginative تھے۔ اگر وہ کسی انڈسٹریل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ہوتے تو ملک کو بہت فائدہ پہنچتا۔ مشینوں کو خوب سمجھتے تھے۔ جس طرح ایک "مردہ" موٹر سائیکل میں انہوں نے جان ڈالی تھی۔ اس کی داستانیں اس وقت بھی زبان زد خاص و عام تھیں۔ زندہ ہو کر یہ موٹر سائیکل جس شان سے اپنی زندگی کا اعلان کرتی تھی، وہ قبر کے مردوں کو جگانے کے لیے کافی تھا۔ (اس کا نک نیم شور لیبٹ تھا)

شفیق صاحب کی جزرسی کے بارے میں عجیب عجیب قصے مشہور تھے مثلاً یہ کہ کالونی سے کالج کی طرف سائیکل پر آرہے تھے کہ سڑک پر ایک نٹ پڑا دیکھا فوراً سائیکل سے اُترے اور اسے جیب میں محفوظ کر لیا کہ کسی کے کام آئے گا۔ ضائع کیوں جائے۔ یہ کنجوسی نہیں۔ صرف ایک رویے کی بات ہے۔

لڑکے ان سے لاڈ بھی شوخیاں کرتے رہتے تھے۔ ان دنوں بھارت پاکستان میں ہاکی کا میچ ہو رہا تھا۔ ایک روز اپنے دو پیریڈوں کے پہلے پیریڈ میں شفیق صاحب نے کچھ ڈایاگرام بنائے تھے۔ دوسرے پیریڈ کے شروع میں کسی نے ڈایاگرام کے ایک حصے کو مٹا کر وہاں ہاکی کے ساتھ پاکستان کا جھنڈا بنا دیا۔ شفیق صاحب آئے تو صرف اپنے قیافہ سے سیدھے اس لڑکے کے پاس جس پر انہیں شبہ تھا کہ اس نے یہ جرأت کی ہوگی۔ اور ان کا اندازہ غلط نہ تھا گئے اور اسے کہنیوں سے خوب گھیں کیا اور پھر نارمل طریقے سے پڑھانا شروع کر دیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ موسیقی سے ان کا شوق مشہور تھا۔ اکتوبر ۶۸ کی ری یونین پر انہوں نے بانسری پر دھنیں سُنا کر لوٹ لیا۔ پیانو کی مرمت کرتے ہوئے بھی اکثر دیکھے گئے۔

آخر میں ان کی میزبانی اور ذوق تربیت کے واقعہ کا ذکر کرتا ہوں۔ جب ان کی شادی ہوئی تو ہم چند سینئر لڑکے ان کے گھر مبارک باد دینے گئے۔ تواضع میں انہوں نے قندھاری اَنار پیش کیے۔ ہم انار کاٹنے کی تکنیک سے واقف نہ تھے۔ ہم نے بے دریغ چھری چلا دی انار غریب کا سارا رس نکل گیا۔ یہ نظارہ دیکھ کر وہ مسکرائے اندر سے مزید انار منگوائے اور انار کاٹنے کا صحیح طریقہ سمجھایا۔ اب بھی جب کبھی انار کھانے لگتا ہوں تو "پور لائل" کا یہ مرد درویش یاد آجاتا ہے جو تعلیم و تربیت دونوں کے فن میں طاق تھا۔

——— سید شاہین پرویز[۱]

شفیق صاحب کی عادت تھی کہ اکثر اوقات ایک آدھ لفظ کو ادھورا چھوڑ دیتے اور کلاس سے توقع رکھتے کہ وہ لفظ کو پورا کرنے ان کا ایسا ایک خاص لفظ Presipitate تھا۔ جو وہ لیبارٹری میں اکثر استعمال کرتے اور صرف Presipi کہہ کر رک جاتے اور کلاس

---

[۱] کالج نمبر ۲۲۸۶ زمانہ تعلیم ۱۹۶۶ تا ۱۹۷۱ء حال مقیم ہالینڈ

باجماعت کہتی Tate تو وہ خوش ہوتے اور بات آگے بڑھتی۔ ایک روز کلاس نے آپس میں طے کیا کہ کچھ ہو جائے آج Tate نہیں کہنا۔ دراصل میں قصہ یہ تھا کہ شفیق صاحب کو چھیڑنے میں لطف آتا تھا) چنانچہ جب وہ Presipi کہہ کے رکے تو ساری کلاس چپ رہی۔ انھوں نے تین بار یہ آدھا لفظ ادا کیا اور ساری کلاس نہایت سعادت مندی سے چپ سادھے رہی تو انھوں نے اپنا وہ مشہور فقرہ کہا جس کو سننے کے لیے یہ شرارت کی گئی تھی ہر بات میں ان کی اپنی انفرادیت تھی۔

میجر وجاہت حسین[1]

"بے شرم نمبر لیتے ہو چار، باتیں کرتے ہو ہزار۔ جاؤ باہر کلاس سے۔"
"یہ کس کی آواز ہے؟"
"شفیق صاحب؟"

"جی ہاں۔ یہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔" میں اپریل ۶۸ء میں کالج میں داخل ہوا تھا۔ اسی سال اکتوبر میں اولڈ بوائز کی بڑی ری یونین ہوتی تھی۔ اس میں پہلی بار شفیق صاحب کی بانسری سنی حاضرین کی بے پناہ داد سے اندازہ ہوا کہ یہ استاد پرانے اور نئے لڑکوں میں بہت مقبول ہیں۔ نویں میں ان سے کیمسٹری پڑھی تو ان کے گن کھلے۔ شفیق صاحب نے ایڈیسن کی طرح ایک موجد کا دماغ پایا ہے۔ کیمیائی چیزیں اور مشینوں میں ان کا دماغ یکساں چلتا تھا۔ سائنسی موضوعات پر کتابیں مسلسل پڑھتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ اکثر رات کو فلم پر بھی کتاب ان کے ہاتھ میں دیکھی گئی۔

کیپٹن نوشاد حمید[2]

میرا نام شفیق ہے، پڑھاؤں گا تمھیں کیمسٹری کرے گا جو شرارت، نکال دوں گا اسے باہر، پکڑ کے کان۔ ہمارے پیارے شفیق صاحب پہلے روز کلاس میں تشریف لائے تو اس انوکھے انداز سے اپنا تعارف کرایا۔ جب موج میں ہوتے تو لفظوں کو آگے پیچھے کر کے بولنا ان کا خاص سٹائل تھا۔ اسی انداز میں ان کی من موہنی شخصیت چھپی ہوئی تھی۔ شفیق صاحب

---

[1] کالج نمبر ۳۲۱۶، زمانہ تعلیم ۱۹۶۸ء تا ۷۳ء ۱۹ [2] کالج نمبر ۳۴۹۳، زمانہ تعلیم ۷۷-۱۹۷۲ء

"مانگ" تھے۔ جو نام وہ پہچان، شفقت کی مُورت، مارتے بھی بہت تھے اور ان کا مارنے کا انداز بھی منفرد تھا۔ کہنیوں سے ہیک ٹھک لگاتے تھے۔ کبھی کبھی چاک کے ٹکڑوں کے مزائلوں سے بھی تواضع کرتے۔ لڑکے ان سے شوخیاں کرکے اور پٹ کر مزے لیتے تھے۔ آج سب سے زیادہ وہی انہیں یاد کرتے ہیں۔

شفیق صاحب کیمسٹری کے قابل ترین استاد تھے۔ کتاب تو شاید زبانی یاد تھی۔ تنہا ان کا پیریڈ ایسا تھا جس میں کبھی Strain محسوس نہیں ہوا۔ Lovable انسان تھے۔

——— کیپٹن اختر نواز

شفیق صاحب اللہ لوگ تھے۔ ان کی سج دھج اپنے رنگ کی تھی۔ غالباً ان کی تنہا کلاس تھی جس میں لڑکے Relaxed رہتے تھے اور سیکھتے بھی بہت تھے۔

بات کرنے کا اپنا انداز تھا۔ جملے میں الفاظ کی ترتیب اپنے حساب سے رکھتے مثلاً ٹیسٹ کے نمبر پوچھنے ہوتے تو یوں پوچھتے۔ نمبر لیے ہیں کتنے تم نے۔ چونکہ وہ کالج کے سینما کلب کے انچارج بھی تھے۔ لڑکے ان سے شوخیاں کرتے "سر آ رہی ہے فلم کون سی؟" اور پھر وہ کہنیوں سے ان کی تواضع کرتے۔ ان کی شخصیت میں متضاد رنگ تھے۔ ایک طرف کیمسٹری، دوسری طرف میوزک، بانسری، وائلن، پیانو، ہارمونیم، ستار غرض کوئی ساز ایسا نہ تھا جسے وہ بجانے نہ ہوں، طبیعت میں بے چینی اتنی تھی کہ میوزک سنٹر میں جاتے تو چند منٹ میں سب سازوں کو چھیڑ ڈالتے۔

چند سال پہلے میں ان سے کالج میں ملا تو مجھ سے پوچھنے لگے اختر، بومے رینگ کے ڈیزائن کا کچھ پتہ ہے"؟ میں نے کہا میں تو ایرونا ٹیکل انجینئرنگ کر رہا ہوں اس میں اس کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ کہنے لگے اچھا پتہ کرکے بتانا۔ انہوں نے سائنسی دماغ پایا تھا۔ چیزوں کی ساخت اور عمل کے بارے میں کھوج لگاتے رہتے۔ اگر انہیں سازگار ماحول میسر آتا تو وہ بہت بڑے ایجاد کار ہو سکتے تھے۔

میرا خیال ہے لوگوں کو شفیق صاحب کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اب بھی نہیں ہے

لہ کالج نمبر ۱، ۳۵، زمانہ تعلیم ۷۷-۱۹۷۴ء

حیدری صاحب، علوی صاحب، راشد صاحب، آرٹ اور کلچر کی نمائندگی کرتے تھے۔ آرٹ اور کلچر کا اپنا Glamour ہوتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا حوالہ شفیق صاحب ہی تھے۔ ان کی ملنگیت نے ان کے کمالات کو پس منظر میں ڈال دیا ہے۔ ایک اور بات کہ وہ بھری بزم میں راز کی بات کہہ ڈالتے تھے۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ کھری بات منہ پر کہنا بھی کم بڑی بات نہیں ہے زندگی میں Pragmatic approach کے Protagonist بھی وہ تھے۔

ـــــــ ڈاکٹر تنویر الحق گھمن[۱]

یہ شفیق صاحب کے لیے لڑکوں کی محبت تھی کہ وہ ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر انہیں کندھوں پر اٹھا کر موتی ہال میں داخل ہوئے۔

ـــــــ کیپٹن محسن عباس[۲]

کالج میں شفیق صاحب شاید تنہا استاد تھے جن کی بے انتہا عزت تو تھی لیکن جن سے شوخیاں کرنا لڑکے اپنا حق سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں کلاسز میں پلی پر رول کرتا ہوا سیاہ کینوس بلیک بورڈ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ایک لڑکے نے شرارت کی بلیک بورڈ پر "ہیگا" کا کارٹون بنایا اور پیچھے کو رول کر دیا۔ شفیق صاحب نے پڑھاتے پڑھاتے اسے گھمایا تو "ہیگا" سامنے آ گئے شفیق صاحب فوراً تاڑ گئے یہ کس کی حرکت ہے اپنے مخصوص سٹائل میں کہنیوں سے اس کی خوب تواضع کی۔ کیمسٹری کے صحیح معنوں میں ماسٹر تھے۔

ـــــــ کیپٹن علی طاہر سید

شفیق صاحب نے کبھی کیمسٹری کی کتاب نہیں کھولی۔ غالباً پوری کتاب زبانی یاد تھی۔ کبھی کوئی غلط پڑھتا یا پڑھتے ہوئے کچھ چھوڑ دیتا تو فوراً ٹوکتے پھر پڑھو۔ اپنے مضمون کیمسٹری میں توان کا انہماک اس درجہ کا تھا۔ دوسری طرف حالت یہ بھی کہ اگر دوسرے پیریڈ میں پڑھا کر جانتے تو پانچویں چھٹے میں آ کر پھر پوچھتے کہ میرا پیریڈ یہاں تو نہیں۔ اگر دوسرا استاد اس وقت تک نہ آیا ہوتا تو ہم کہہ دیتے کہ ہاں سر، آیئے دو چار منٹ کے بعد دوسرے سیکشن کا لڑکا آ کر کھڑا

---

[۱] کالج نمبر ۳۸۵۸، زمانہ ۷۹-۱۹۷۶ء [۲] کالج نمبر ۳۸۸۹، زمانہ تعلیم ۷۹-۱۹۷۶ء

ہوتا کہ سر آپ کا پیریڈ تو ہمارے ہاں ہے۔ وہ اس لڑکے کو جس نے کہا ہوتا کہ سر آپ کا پیریڈ یہاں ہے کہتی مار کر کتنے بچو! تجھے کل سمجھاؤں گا۔ اس عرصے میں وہ اصل استاد شفیق صاحب کو پڑھاتا دیکھ کر واپس سٹاف روم کو لوٹ چکا ہوتا اور ہم عیش کرتے۔ وہ کیمسٹری پر مکمل طور پر حاوی تھے اور انہوں نے اسی مضمون کو ہمارے لیے پانی کر دیا تھا۔ وہ ہماری کلاس کے فارم ماسٹر بھی تھے۔ اور کلاس کو سٹیشنری ایشو کراتے تھے۔ ایک بار ٹرم ختم ہونے سے پہلے فرمائش کی گئی کہ سر رف کاپیاں ایشو کرائیں انہوں نے کہا میں پہلے چیک کر دوں گا۔ اور کاپیوں کے ورق کاؤنٹ کرنے لگے۔ رف کاپی کی کون پرواہ کرتا ہے جن لڑکوں کی کاپیوں کے ورق پورے نہیں تھے ان کے نام انہوں نے لسٹ سے کاٹ دیئے۔

ایک بار کلاس میں، میرے ہاتھ سے جیومیٹری بکس گر پڑا، تھوڑی دیر کے بعد اتفاق سے پھر گرا تو شفیق صاحب نے غصے سے کہا تیرے جیومیٹری بکس کو کیا تکلیف ہے۔ میں نے کہا سر یوں ہی گر پڑتا ہے۔ بولے اگر گھر سے لائے ہوتے تو سینے سے لگا کر رکھتے۔ تمہارا فاؤنٹن پن کیوں نہیں گرتا۔ پھر سمجھا کر کہا "بچے" سرکاری چیزوں کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔

ایم جی ہاؤس میں شفیق صاحب ہاؤس ماسٹر تھے۔ ہاؤس انسپکشن پر گملوں اور دیواروں پر لگانے کی سرخ گیری خود جا کر بازار سے لاتے تھے تاکہ ہاؤس فنڈ کے چار آٹھ آنے بچ جائیں ایک بار ہاؤس میں ٹیوب لائٹس لگنا تھیں۔ اس کا سامان بھی وہ خود بازار سے جا کر لائے اور اپنی نگرانی میں مجھ سے اور ظہیر الدین بابر سے ٹیوبیں لگوائیں۔ اگر یہی کام وہ ایم ای ایس کے آدمیوں سے کرواتے تو کچھ پیسے وہ بناتے۔ ہاؤس فنڈ زیادہ خرچ ہوتا۔ سرکاری چیزوں اور پیسوں کے بارے میں وہ بہت محتاط تھے۔ اس وقت تو ان کی چھوٹی چھوٹی بچتیں بیکار نظر آتی تھیں بعد کو احساس ہوا کہ بات کم یا زیادہ پیسوں کی نہیں روّیے کی تھی۔

ہاؤس میں چھوٹے موٹے فائن بھی ہوتے رہتے تھے۔ بہت ڈراتے دھمکاتے لیکن آخر میں پاکٹ منی سے کاٹتے نہیں تھے۔ سوائے اس فائن کے جو کھڑکی یا دروازہ کا شیشہ یا گملہ توڑنے پر ہوتا ہو۔

شفیق صاحب سے لڑکے شغل بھی کرتے تھے۔ بہت اچھے سوئمر تھے۔ سٹاف اور کیڈٹس کے واٹر پولو میچ میں بعض لڑکے ان کو گھیرتے تو وہ بھی اس کو ڈک کر کے چھوڑتے

تھے ایک زمانہ میں وہ سینما کے انچارج بھی تھے۔ اکثر لڑکے ان کو چھیڑنے کے لیے پوچھتے کہ سر کون سی فلم آ رہی ہے۔ ایک جمعرات ڈنر کے بعد کنٹین کے سامنے وہ مجھے مل گئے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ان سے پہلے دس لڑکے پوچھ چکے ہیں۔ شامت اعمال میں نے بھی پوچھ لیا کہ سر آج فلم .... وہ فوراً مجھ پر جھپٹے۔ فلم، فلم تم لوگوں نے فلم میری چڑ بنا رکھی ہے اور مار مار کے مجھے کیاری میں گرا دیا۔ پھر گرجے تو، تو بھائی سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ میں کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور ساری سر کہا۔ پھر پوچھنے لگے چوٹ تو نہیں لگی ؟

A lovable person he was.

——— کیپٹن طارق محمود

شفیق صاحب ملنگ بادشاہ تھے۔ ایک روز جمعہ کے لیے آئے تو شرٹ کے ساتھ ٹائی بھی بندھی ہوئی تھی۔ نماز کسی حال میں قضا نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۷۹ء کا شوٹنگ مقابلہ ہو رہا تھا۔ عصر کی نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ سب بیٹھے تھے۔ شفیق صاحب اٹھے ایک طرف قبلہ رُخ ہوئے اور اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کر دی۔

۱۹۷۹ء کی ری یونین پر وہ بانسری بجائی کہ ہال کو لوٹ لیا۔

——— کیپٹن حسن منصور شیرازی[1]

میں نے شفیق صاحب سے بانسری سیکھنے کی درخواست کی پہلے تو وہ اپنے مخصوص سٹائل میں ناراض ہوئے۔ باتیں کرتے ہو ہزار، وغیرہ وغیرہ لیکن جب میرا اصرار نہ صرف بڑھا بلکہ قائم رہا تو ان کا دل پسیجا اور انہوں نے بانسری پر دو چار سبق مجھے دیئے۔ میں ان سے پیانو بھی سیکھتا لیکن پیانو بر وقت ٹھیک نہ ہو سکا۔

——— پروفیسر عین الدین علوی[1]

شفیق صاحب کی شخصیت کی سب سے بڑی صفت ان کی بے ساختگی اور ایک عجیب انداز کی قلندری و درویشی تھی۔ وہ تکلفات کے پردوں اور تہذیب کے تکلفات اور مصنوعی خوش اخلاقی کے ان بہروپوں سے بے نیاز رہتے تھے جن کا کسی نہ کسی حد تک ہم سب ہی

[1] کالج نمبر ۱۸۸/۱۴ سے ۸۴-۱۹۸۳ انٹر بیت کے اداریہ سے ماخوذ

شکار ہوتے ہیں۔ ان کے ظاہر و باطن میں فاصلے نہیں تھے۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہم نے ان کے اندر وہ وصف بھی دیکھا جو سائنس گریجوئیٹس میں عموماً نایاب ہے کہ وہ سائنس سے عملی دلچسپی بھی رکھتے تھے۔ ان کا ذہن بڑا زرخیز اور تخلیقی تھا۔ ہمیشہ نئے نئے اقدامات، تدبیریں اور منصوبے سوچنے میں مصروف رہتا اگر انہیں مغربی سائنسدانوں کی طرح وسائل میسر ہوتے تو آج چند ایجادیں ضرور ان سے منسوب ہوتیں۔

وہ بظاہر متضاد خصوصیات کا سنگم تھے۔ سائنس کے ساتھ ساتھ ادب و شاعری کے ذوق سے بھی آشنا تھے۔ نغمہ و موسیقی کے شغف کا یہ عالم کہ بانسری بجاتے تو پہروں اسی محویت میں گزر جاتے۔ گٹار، بینجو، وائلن، بین ان کی بے چین طبیعت کسی ساز سے بیگانہ نہیں رہی۔

حوالدار پہلوان خان

کرنل اخلاق احمد[1]

پہلوان خاں باکسنگ کے کوچ اور اتھیلیٹکس کے انچارج تھے۔ ٹریک بھی وہی بنواتے تھے۔ ۱۹۵۷ء میں کرنل رفیق نے سال میں دو بار ایتھلیٹکس کے مقابلے شروع کرائے تھے۔ اس کے لیے پہلوان ٹریک تیار کروا رہے تھے۔ پسینہ پسینہ تھے۔ اسی حالت میں انہوں نے کھانا منگوایا اور پیڑ کے نیچے بیٹھ کر کھایا۔ میں نے پوچھا "سٹاف" آپ نے میس میں کھانا کیوں نہیں کھایا۔ بولے کام پر اپنی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔" لیکن آرام سے کھانا کھانا بھی تو ضروری ہے۔ ڈیوٹی اس سے زیادہ ضروری ہے۔ پھر یہ میرا شوق ہے۔ ٹریک بنے گا۔ آپ لوگ دوڑیں گے باڈی بنائیں گے۔ مجھے خوشی ہوگی۔ جب ٹریک بن چکا تو پریکٹس کرتے ہیں جس وقت بھی ٹریک کا رخ کیا کرتا اکثر پہلوان خاں کو وہاں موجود پاتا۔ میں نے پوچھا۔ آپ وقت ناوقت کیا ہمیں چیک کرنے آتے ہیں؟ بولے نہیں ٹریک کو چیک کرنے آتا ہوں۔ جس چیز کو چیک نہ کیا جائے وہ خراب ہو جاتی ہے۔ حوالدار پہلوان خاں کا سینہ بہت چوڑا تھا۔ کوئی ۴۰۔۴۲ انچ تو ہو گا۔ میں نے ایک روز پوچھا سٹاف ایکسرسائز تو سب ہی کرتے ہیں۔ سینہ چوڑا کرنے کا نسخہ بتائیں۔ بولے خوش رہا کرو۔

---

[1] کالج نمبر ۴۵ ۲۳ زمانہ تعلیم ۶۲۔ ۱۹۵۶ء

جمعہ خان لانگری

ـــــــ شربت خان محسود

۱۹۵۵ء میں، میں برڈووڈ ہاؤس میں تھا۔ فٹ بال کھیل کر آتا تو سخت بھوک لگی ہوتی ہیوی ویٹ میں لڑتا تھا۔ اس سے وہ لوگ جو مجھے براہِ راست نہیں جانتے اندازہ کر لیں کہ میرا وزن اور ڈیل ڈول کتنا ہوگا اور اس حساب سے خوراک کتنی چاہیے ہوگی۔ بہر حال خدا بھلا کرے برڈووڈ ہاؤس کے لانگری (باورچی) جمعہ خاں کا کردہ میرے لیے اپنے طور پر کچھ ایکسٹرا ڈائٹ کا انتظام کر رکھتا تھا۔ ورنہ اپنے حصے کی دو تین چپاتیوں سے اپنا کام کیا چلتا۔ کوئی میچ کھیل کر آتا تو ضرور پوچھتا۔ خان کوئی گول کیا۔ اچھا آدمی تھا اپنی ذات سے باہر دیکھ سکتا تھا۔

کیپٹن این ڈی احمد[1]

ـــــــ بریگیڈئر عبدالرزاق تمغۂ امتیاز

کیپٹن این ڈی احمد نے برڈووڈ ہاؤس میں جو اپریل ۵۶ء سے جونیئر ہاؤس بن گیا تھا یہ کامیاب تجربہ کیا کہ ہاؤس پریفکٹ بھی جونیئر ہاؤس ہی کا ہو۔ اس موقع پر انہوں نے سینئر ہاؤس پریفکٹ کے اعزاز میں باقاعدہ ایک تقریب منعقد کر کے اسے اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔ اور نئے ہاؤس کی نئی کیبنٹ کو ایک Investiture ceremony میں حلف وفاداری کے ساتھ Induct کیا۔ ان دو تقریبوں کی مصلحتیں بہت دیر میں سمجھ میں آئیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میری طرح اور بہتوں نے اس عمل سے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔

انہوں نے ہاؤس میں باکسن، ہاکی کا کھیل متعارف کرایا اور ہاؤس میں انڈور گیمس کو بہت وسیع پیمانے پر شروع کیا۔ حد یہ کہ انڈور گیمس کو انٹر ہاؤس مقابلوں میں شامل کروایا اور ہاؤس کی طرف سے انڈور گیمس ٹرافی بھی عطیہ کے طور پر دی۔

---

[1] جناب نیاز الدین احمد صاحب کرنل کے رینک میں ۷۳-۱۹۷۰ء تک کالج کے کمانڈانٹ بھی رہے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔

ان کی ایک اور خوبی کا بھی ذکر کرنا چاہوں گا کہ وہ اپنے سویلین رفقار کار مسٹر حیدری اور مسٹر علوی کی Talents سے خائف نہیں تھے۔ برڈووڈ ہاؤس کا ترانہ انہوں نے حیدری صاحب سے لکھوایا تھا۔ فنکشنوں میں بھی ڈرامے وغیرہ انہی دو آرٹسٹوں کے ہوتے تھے۔ برملا اس کا کریڈٹ ان کو دیتے تھے۔ میں نے اس کے خلاف بھی بہت کچھ دیکھا ہے اس لیے ان کی عالی ظرفی کا ذکر کر رہا ہوں۔ ہر ایک سینئر میں سینئر کا ظرف اور حوصلہ نہیں ہوتا۔[1]

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد اسحاق

جنوری ۱۹۵۶ء میں برڈووڈ ہاؤس جونیئر ہاؤس بنا اور کیپٹن این ڈی احمد (نیاز الدین احمد) نے ہاؤس آفیسر کے طور پر چارج لیا۔ ہماری خوش قسمتی سے کمانڈانٹ کرنل رفیق نے ہمیں جو دو ہاؤس ماسٹر دیئے مسٹر علوی اور حیدری۔ وہ بھی کالج کے آفتاب و ماہتاب تھے اس طرح برڈووڈ ہاؤس میں تعلیمی و تربیتی پروگراموں کا ایک سنہری دور شروع ہوا۔

کیپٹن احمد نے پہلا کام یہ کیا کہ ہاؤس سے تالے اتروا دیئے۔ ہاؤس کو ایک نیا ماٹو دیا Birdies Never Tell a lie حیدری صاحب نے ہاؤس کا ترانہ لکھا:

Birdies don't tell a lie
Birdies are never sly

ہاؤس کے ماٹو اور ہاؤس کے سانگ کی روح ایک ہی تھی یعنی دیانت اور عزت نفس گویا احمد صاحب تربیت سے شروع ہوئے۔ انہوں نے تعلیم کی روح کو اہمیت دی۔ اسی لیے آج میں انہیں یاد کر رہا ہوں۔ برڈووڈ ہاؤس میں غیر نصابی سرگرمیوں کے لیے ایک کلب ہلال کے نام سے شروع کیا تھا اس کا پہلا سکریٹری مقرر ہونے کی عزت مجھے ملی۔ ۲۲۴۹ سلطان محمود اسسٹنٹ سکریٹری تھا۔ ہلال کے زیر اہتمام ہم نے کہانی لکھنے اور ڈرائینگ اور پینٹنگ کے مقابلے کروائے اردو ڈرامے تقریریں مذاکرے ہوئے برڈووڈ ہاؤس کا سالانہ میلہ ہوا جس کے مہمان خصوصی اے جی میجر جنرل امراؤ خاں تھے۔ سپورٹس پروگرام کے انعامات ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن کرنل جعفری نے تقسیم کیے تھے۔ تعلیمی کارکردگی کا مقابلہ بھی ہوتا تھا۔ غرض دو سال جو میں نے برڈووڈ ہاؤس میں گزارے گویا نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ احمد صاحب بڑے نرم خو اور نرم گفتار تھے اور بڑی خاموشی اور انکساری سے کام کرتے۔

[1] کالج نمبر ۲۲۴۷

تھے۔ یہ خوبی کسی کسی سربراہ میں ہوتی ہے۔ ہاؤس کے سالانہ فنکشن کے موقع پر انہوں نے واشگاف الفاظ میں مسٹر علوی اور مسٹر حیدری کو خراج تحسین پیش کیا ورنہ عام سربراہ تو اپنے سارے رفقاء کار کا کریڈٹ اپنے کھاتے میں ڈال لیتے ہیں۔

——— شاھد احمد پی سی ایس[1]

۷۲-۱۹۷۱ء میں، میں شیر شاہ ہاؤس کا ہاؤس پریفیکٹ تھا تو کرنل احمد صاحب نے پریفیکٹس کے لیے ایک کورس رن کیا تھا۔ اور آخر میں ایک کتابچہ A Practical Course in Leadership بھی دیا تھا اس میں Self Assessment کا ایک پُر وقار، بھی تھا۔ کرنل احمد نے ہاؤسوں میں آنر کاؤنسلس، آنر کورٹس، آنر شاپیں بھی شروع کروائی تھیں۔ ہمارے ہاؤس میں تو پہلے سے آنر سسٹم تھا۔ سارے لاکر کھلے رہتے تھے۔ ہاؤس کی لائبریری بھی آنر سسٹم پر چل رہی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے سزا اور جزا کا ایک نیا سسٹم پھول اور کانٹے (Thorns and Roses) بھی چلانے کی کوشش کی تھی "چلانے کی کوشش کی تھی" میں نے اس لیے کہا کہ آنر سسٹم اور یہ پھولوں کانٹوں کا سسٹم زیادہ چلا نہیں شاید اس لیے کہ ماحول سازگار نہ تھا۔ ہوا کے خلاف چلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آج وہ مجھے اسی حوالے سے یاد آرہے ہیں۔

——— سعید راشد

ملٹری کالج میں بڑے بڑے Professionally competent, imaginative اور Creative ذہن کے مالک اساتذہ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کرنل نیاز الدین احمد تھے۔ نیاز صاحب بحیثیت جے سی او ۱۹۴۸ء کے شروع میں یہاں کچھ عرصے پوسٹ رہے تھے۔ ۵۸-۱۹۵۵ء کے عرصے میں وہ برڈووڈ ہاؤس کے ہاؤس آفیسر تھے۔ اس دوران میں سکین ہاؤس کا ہاؤس ماسٹر تھا۔ اس حوالے سے ان سے حریفانہ کشمکش رہتی تھی برڈووڈ اور سکین دونوں جونیئر ہاؤس تھے اور آپس میں سخت مقابلہ رہتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ نیاز صاحب کے معاون علوی صاحب، حیدری صاحب تھے۔ اور ان کا پلہ بھاری تھا۔ علوی صاحب اور حیدری صاحب دونوں اپنے اپنے میں دائرہ آفتاب و ماہتاب تھے۔ اس وقت نیاز صاحب اپنے

---

[1] زمانہ تعلیم ۷۲-۱۹۶۷ء

رینک (کیپٹن) کی وجہ سے ہاؤس آفیسر ضرور تھے لیکن کسی Complex میں مبتلا نہیں تھے۔ انہیں احساس تھا کہ Talents کے امتیاز سے ان کے ماتحت کتنے باکمال ہیں میں احمد صاحب کے ظرف اور فراست کی بھی داد دوں گا کہ انہوں نے ان باکمالوں کو کام کرنے کا پورا موقع دیا اور ان کی کارگزاریوں کو کبھی اپنے کھاتے میں نہیں ڈالا اور خود پس منظر میں رہ کر ہاؤس کو آگے بڑھاتے رہے۔ اس زمانے میں برڈوڈ ہاؤس ہر اعتبار سے ٹاپ پر تھا۔ ۱۹۵۶ء میں اس کے دو ہاؤس فنکشن جن کے مہمان خصوصی علی الترتیب ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن کرنل جعفری اور اے جی میجر جنرل امراؤ خان تھے، آج بھی مجھے یاد ہیں۔ باکمال ماتحتوں سے Jealous نہ ہونا بہت مشکل کام ہے۔ احمد صاحب اس آزمائش پر پورے اترے۔ میں ان کے ظرف کا اس زمانہ سے قائل ہوں۔ ورنہ Egoism بڑے بڑے قابل سینئرز کو لے ڈوبتا ہے۔

اکتوبر ۷۰ء میں جب احمد صاحب کرنل کے رینک میں کالج کی سربراہی کی ذمہ داریاں سنبھالنے آئے تو پبلک سسٹم کا وسیع مطالعہ اور فوجدار ہٹ کالج چٹاگانگ کی کامیاب پرنسپلی کا گہرا تجربہ اپنے ساتھ لائے۔ اس عرصے میں وہ صاحب قلم بھی ہو چکے تھے۔ افغان وار پر ان کی کتاب چھپ چکی تھی اور مشرقی پاکستان کے مشہور انگریزی اخبار ڈھاکہ آبزرور میں پاکستان میں پبلک سسٹم کے عنوان سے ان کے بہت معلوماتی اور خیال انگیز سلسلۂ مضامین ملک کے اس گوشہ میں بھی بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا تھا۔ کہنے کو تو سب ہی کہتے ہیں کہ امتحانات بالکل Fair ہوں ورنہ یہ ہوگا وہ ہوگا وغیرہ وغیرہ لیکن میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں اپنی زندگی میں میں نے یہ دوسرا آدمی دیکھا Who really meant it ریکارڈ پر ہے کہ احمد صاحب نے سرگودھا بورڈ کے کنٹرولر کو لکھا کہ سخت سے سخت سپرنٹنڈنٹ کو امتحان لینے بھیجا جائے۔ میں اپنے سونے میں کھوٹ نہیں دیکھنا چاہتا کہ یہ پاکستان کے کام آنا ہے۔ مختصر یہ کہ ۱۹۷۱ء کے امتحان میں انٹر کا نتیجہ ۵۷ فیصد رہا اور احمد صاحب نے اپنوں اور غیروں کی تنقید کا نشانہ بننا قبول کیا۔ ۱۹۷۲ء کے ایف ایس سی کے امتحان میں پھر ۲۱ فیل ہوئے اور ۶۴ فیصد رزلٹ رہا۔ ایک بار پھر جگ ہنسائی ہوئی۔ کیا کیا الزامات نہ لگے لیکن وہ اصولی لڑائی Conviction اور Courage کے ساتھ لڑتے رہے۔

(ان کے زمانہ میں ہر ہاؤس نے اپنا اپنا ماٹو بھی اپنایا تھا۔ یہ ماٹو بابر ہاؤس کا تھا) اور تعلیمی معیار کو تعلیمی طریقے سے اونچا کرنے کی ساتھ منصوبہ بندی کے ساتھ جد وجہد کرتے رہے تا آنکہ ۷۳، ۱۹۷۴ کا انٹر کا رزلٹ بھی سو فیصد آیا۔ میٹرک میں بھی ۴۸ سے ۴۷ فرسٹ ڈویژن میں آئے صرف ایک سیکنڈ میں۔ اس کے علاوہ کالج نے ہم نصابی سرگرمیوں کا Tempo بھی خاصا تیز رہا۔ احمد صاحب نے یہ جو تعلیمی جہاد کیا اس کو میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں۔ کسی ادارہ کی پاکستان کے حوالے سے روح کو کرپشن سے آلودہ نہ ہونے دینا بہت بڑی بات ہے۔

احمد صاحب Charisma اور Glamour سے معرا تھے Plain اور Unassuming بھی۔ لیکن اللہ جل شانہ نے انہیں ایمان کی مضبوطی سے نوازا تھا کہ ملٹری کالج پر یہ خدا کا خاص کرم تھا کہ اس نے اسے ایسا سربراہ دیا جو پبلک سکول طرز تعلیم و تربیت کے فلسفہ کو سمجھتا تھا۔ اور اتنا Imaginative تھا کہ اسے بروئے کار لا سکے اور اتنی اخلاقی جرأت رکھتا تھا کہ ذاتی پبلسٹی اور پروجیکشن کے بہترین مواقع کو لڑکوں کے مفاد پر قربان کر دے۔ میرا اشارہ اس تجربہ کی طرف ہے جو انہوں نے فروری ۷۳ء میں کیا۔ صورتحال یہ تھی اور اب بھی ہے کہ سالانہ جلسہ تقسیم انعامات جسے یوم والدین بھی کہا جاتا ہے، بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ سارا زور مہمان خصوصی پر اور غریب والدین کی اتنی رعایت کہ وہ بھی دوسری تیسری صف میں بیٹھ کر شو دیکھ لیں اور چائے پی کر گھر چلے جائیں۔ والدین کو کمانڈانٹ سٹاف سے باہمی رابطے کا (جو یوم والدین کی سپرٹ ہے) کوئی وقت یا موقع نہیں ملتا تھا۔ احمد صاحب نے یہ جدت کی کہ ہر ہاؤس سے کہا آپ اپنا اپنا یوم والدین اپنے طور پر Arrange کریں۔ والدین، سٹاف اور اساتذہ غیر رسمی ماحول میں ایک دوسرے سے طلبا کے حوالے سے ملیں چنانچہ ۴ فروری ۷۳ء کو ایم جی ہاؤس اور بابر ہاؤس نے علیحدہ علیحدہ یوم والدین منایا۔ ۱۱ فروری ۷۳ء کو اورنگ زیب ہاؤس اور ٹیپو ہاؤس نے ایسا ہی کیا۔ ان تمام فنکشن میں کمانڈانٹ بالکل بیک گراؤنڈ میں رہے۔ ان فنکشنوں کے مہمان خصوصی بھی اپنے اولڈ بوائز ہی تھے۔ ۱۸ فروری کو شیر شاہ ہاؤس کا یوم والدین منایا گیا ہمارا یہ فنکشن پانچ گھنٹے کا تھا جس میں ہاؤس کے تمام ۸۳ لڑکوں نے حصہ لیا تھا۔ اور

سال بھر کی ہم نصابی سرگرمیوں ڈرامے تقریریں، مذاکرے آرٹ کی نمائش — کی جھلکیاں پیش کی گئی تھیں۔ ہم نے کرنل احمد ہی کو مہمان خصوصی بنایا تھا۔ وہ آتو گئے لیکن کہا یہ "راشد صاحب آپ کو تو پبلک سکول کی یہ روایت معلوم ہے کہ ہاؤس میں ہاؤس ماسٹر ہی سب کچھ ہوتا ہے اس لیے مجھے ایک عام مہمان ہی رہنے دیں تو بہتر ہے" چنانچہ تمام فنکشن میں انہوں نے وی آئی پی ہونے کا کوئی تاثر نہیں دیا۔ آخر میں میرے اصرار پر انہوں نے انعامات ضرور تقسیم کیے اور اپنی اختتامی تقریر میں فنکشن کا سارا کریڈٹ بلکہ اس تجربے کا کریڈٹ بھی ہاؤس سٹاف کی جھولی میں ڈال دیا۔ سبحان اللہ! لیکن بات یہیں تک ختم نہیں ہوئی کالج کا سالانہ فنکشن جنگی قیدیوں کے واپس نہ آنے کی وجہ سے بہت سادہ طریقے سے ہوناتھا انہوں نے اسے امکانی حد تک Low key پر رکھا۔ ۲۴ مارچ ۳ء، رکولاگ ایریا کمانڈر بریگیڈیئر انوار الحق کو انعامات تقسیم کرنے آنا تھا ایک دن پہلے معلوم ہوا کہ کسی وجہ سے وہ بھی تشریف نہ لا سکیں گے تو بجائے اس کے وہ فنکشن ملتوی کرتے یا کسی اور وی آئی پی کو رونق محفل بنانے کی کوشش کرتے انہوں نے خود ہی وقت مقررہ پر موتی ہال میں انعامات تقسیم کر دیئے۔

تجربہ کرنے کے لیے Vision ہی نہیں جرأت اور خلوص بھی چاہیے۔ احمد صاحب نے یہاں آتے ہی پبلک سکول سسٹم پر ایک سیمینار کا اہتمام کیا پھر اگلے سال نہ صرف تعلیم وتربیت پر بلکہ سپورٹس پر بھی سیمینار کروائے۔ آنرسسٹم، آنرکورٹس، آنرکاؤنسل کو بھی زندہ کیا، ڈرامہ، تقریروں Outward سرگرمیوں کو بھی تیز کیا۔ لیکن میں ان کارروائیوں کو ثانوی حیثیت دیتا ہوں۔ انسان کا اصل کام اخلاقی ہوتا ہے اسی سے تعلیمی منصوبوں اور تربیتی سرگرمیوں میں برکت آتی ہے۔ ورنہ باتیں بنانا، دکان سجانا، تماشے دکھانا اور اپنی ڈفلی بجانا کسے نہیں آتا۔

کیپٹن سید واصف علی

— سید زمان خان[1]

واصف صاحب بڑے سنجیدہ استاد تھے۔ کبھی کبھی کوئی لطیفہ بھی سناتے تو خود نہیں

---

[1] کالج نمبر ۲۱۲۹ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ لنڈن زمانہ تعلیم ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۷ء

ہنستے تھے۔ اپنے مضمون ہسٹری پر بڑا عبور تھا۔ جملوں کو دہرائے بغیر مطلب کی وضاحت کر دیتے تھے۔ ہسٹری آف انگلینڈ بھی انہی نے پڑھائی تاریخ کا جغرافیہ اور معاشی ارتقا سے تعلق ہے اس کی بھرپور وضاحت کی جب انگلینڈ میں رہنا شروع کیا، واصف علی صاحب کی پڑھائی ہوئی تاریخ اکثر یاد آئی۔

—— پروفیسر سعید راشد

واصف صاحب قبلہ اسلامیہ کالج بریلی میں میرے استاد تھے۔ بریلی تحریک پاکستان کا گڑھ تھا۔ واصف صاحب پکے مسلم لیگی یعنی پاکستانی تھے۔ پاکستان بننے کے بعد کوئٹہ کے جی۔ ایس۔ پی۔ سی۔ ٹی ایس سے وابستہ ہوئے اس کے ٹوٹنے کے بعد پی ایم اے میں انسٹرکٹر رہے۔ وہاں سے ۱۹۵۷ء میں یہاں پوسٹ ہوئے جب وہ یہاں آئے تو ستائیس سال کا تدریسی تجربہ اپنے ساتھ لائے۔ وہ تاریخ پڑھاتے تھے مغل دور پر سرکار اور موجمدار جیسے محققوں نے جو کام کیا ہوا تھا اس کے حوالے سے تحقیقی انداز میں پڑھاتے تھے۔ شاعر بھی تھے غزل کے علاوہ نعت اور منقبت بھی کہتے تھے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہی ہیں وجہ تزئین دو عالم — انہی سے محفل امکاں حسیں ہے
یہ کیسی ہر طرف ہے افراتفری — مسلماں ہر طرح اندوہ گیں ہے
یہ ہنگامے یہ شور و شر یہ فتنے — یہ سب کچھ کیا الہ العالمیں ہے؟
سوئے مسلم کرم ہو جائے مولا — وہ اب بھی پیرو دین مبیں ہے
مسلمانوں کو یکجائی عطا ہو — یہی ان کے لیے حبل المتیں ہے

چونکہ وہ خود تحریک پاکستان سے وابستہ رہے تھے اور تاریخ کے سکالر تھے۔ جس نے ان سے تاریخ پڑھی کندن ہو گیا۔

کیپٹن مختار

—— راجہ محمد اعظم خان[1]

اس وقت کے افسر استادوں میں سب سے زیادہ معمر تھے۔ سر کو تھوڑا سا خضاب لگاتے

[1] کالج نمبر ۲۱۱۸ زمانہ تعلیم ۵۸-۱۹۵۲ء

تھے آئے تو کیپٹن تھے جاتے جاتے میجر کا رینک لگایا تھا۔ لیکن ہم نے انہیں کبھی ان کے رینک کے حوالے سے نہ دیکھا نہ تولا۔ ان کا اپنا وزن تھا اور بہت تھا۔ پورا نام اے اے مختار (آفتاب احمد مختار) تھا اور عربک کالج دہلی کے پڑھے ہوئے تھے جس کو قائداعظم اور لیاقت علی خاں کی سرپرستی حاصل تھی۔ تحریک پاکستان کے معروف کارپرداز اور مورخ The struggle for Pakistan کے مصنف ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے شاگردوں میں سے تھے۔ اکثر ان کا ذکر کرتے تھے۔

ہمیں تاریخ پڑھاتے تھے جس کے دوران تحریک پاکستان کا ذکر اکثر آجاتا۔ لیکچر کہیں سے شروع ہو پر ختم وہیں ہوتا۔ ہمیں تو مزہ آتا تھا لیکن امتحانی کیڑے اس سے پریشان ہوئے۔ ڈرتے ڈرتے عرض کی سر اس طرح کورس کیسے ختم ہوگا۔ فرمایا کورس تو کورس کی کتاب میں بند ہے اس کو تم خود بھی پڑھ سکتے ہو میں تو اس کی بیک گراؤنڈ بتاتا ہوں۔ بہر حال اس روز وہ کچھ بدمزہ ہوئے بلشتر طلبا کی دلچسپی علم میں نہیں امتحان میں ہوتی ہے۔ ظالم، یہ نہیں سمجھتے کہ جب علم زیادہ ہوگا تو امتحان بھی بہتر ہو گا۔ لیکن وہ آسان راستہ ڈھونڈھتے ہیں، اسی کا نام دنیا ہے۔

رفیق صاحب کے زمانہ میں جمعہ کی شب کو ایک توسیعی لیکچر ہوتا تھا جو عموماً حسن صاحب دیا کرتے تھے۔ ایک بار مختار صاحب نے سورہ العصر کی تفسیر پیش کی اور بہت خیال انگیز باتیں کیں۔

اپنے افسروں کے سامنے اکڑ کے رہتے تھے لیکن ماتحتوں اور غریبوں سے خاکساری برتتے تھے۔ کالج کے چوتھے درجے کے ملازموں سے خاص طور سے بہت اچھی طرح پیش آتے تھے۔ ایک روز بتایا کہ مجھے آرمی کی وجہ سے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لینا پڑتا ہے لیکن میں اکثر تھرڈ کلاس میں سفر کرتا ہوں۔ ان کی باتیں سن کر پاکستان کی صحیح صورت حال سامنے آتی ہے ملٹری کالج زندہ باد کہ کیسے کیسے موتی اس کے دامن میں تھے۔

——— کیپٹن (نیوی) محمود علی[1]

آکنلک ہاؤس میں ہمارے ہاؤس ماسٹر تھے۔ آکنلک ہاؤس بہت خستہ حالت میں تھا

---

[1] کالج نمبر ۲۴۰۲، زمانہ تعلیم ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۱ء

انھوں نے ہاؤس میں پرائڈ دی وہ لڑکوں کو ہمیشہ میرے شیر کہا کرتے تھے۔ ان کا مضمون تاریخ تھا۔ امپیریلزم کا مطلب پہلے پہل انہی نے ہمیں سمجھایا۔ خود اسلام میں خلافت سے ملوکیت اور آمریت کی طرف جو سفر ہوا ایک روز اس پر بھی کھل کر بحث کی۔ اس کی معنویت بعد کو سمجھ میں آئی مرشد وہدایت کے سلسلہ میں بہت قائل تھے۔ خود بھی کسی بزرگ سے بیعت تھے اور تصوف سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی یہ دلچسپیاں ہمارے ذہنی افق کی توسیع کا ذریعہ بنیں۔ کرکٹ کے بہت خلاف تھے۔ فرماتے تھے جس طرح ہر سسٹم کا ایک تعلیمی نظام ہوتا ہے ایک کلچر ہوتا ہے اس کا ایک کھیل بھی ہوتا ہے۔ کرکٹ امپیریلزم کی یادگار ہے۔ ترقی پذیر ممالک کو اس سے دور ہی رہنا چاہیے۔ ہم وقت کا اتنا ضیاع Afford نہیں کر سکتے اور پھر یہ (Elite) خواص کا کھیل ہے۔ عوام مفت میں بے وقوف بنتے ہیں۔

میجر عبدالعزیز ھاشمی

——— نثار کیانی

ہاشمی صاحب انگریزی پڑھاتے تھے۔ لیکن ان کی تاثیر ان کے پڑھانے میں نہیں ان کی شخصیت میں تھی۔ جب جذب کی کیفیت طاری ہوتی تو پڑھاتے پڑھاتے رو پڑتے۔ لڑکے ان کے خلوص اور بے ریائی سے متاثر تھے۔ ان کے گلے میں سُر تھا۔ ہارمونیم کے ساتھ غضب کا گاتے تھے۔ سالانہ ڈرامہ یا خاص خاص فنکشنوں کے موقع پر جب وہ ہارمونیم پر وجد میں آ کر غزل چھیڑتے تو سماں بندھ جاتا۔ میں چونکہ سنگرز گروپ میں شامل تھا مجھے موسیقی میں ان کے کمالات دیکھنے کا زیادہ موقع ملا۔ وہ ایک غزل کو کئی دھنوں یا راگوں میں گا کر آواز کا وہ جادو جگاتے کہ سننے والے بے خود ہو جاتے۔

۱۹۶۰ء کے یوم اقبال کی تقریب پر اقبال کی یہ غزل:

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر

انھوں نے اپنی نکالی ہوئی دھن میں قوالی کے انداز میں تیار کروائی۔

———— میجر عبدالرشید اے ای سی ؎

ہاشمی صاحب میجر خوشحال خاں صاحب کے پوسٹ آؤٹ ہونے اور نئے چیف انسٹرکٹر میجر منظور الحسن کے آنے کے درمیانی وقفے میں چند ماہ ایکٹنگ چیف انسٹرکٹر بھی رہے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ استاد تھے اور کلاس روم میں ہی ان کے جوہر کھلتے تھے۔

۴۷ء میں دہلی میں تقسیم ہند کے وقت خونِ مسلم کی جو ارزانی ہوئی وہ دردناک مناظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ کلاس میں اکثر ان مظالم کا جو مسلمانوں پر دہلی، ہانپٹہ، رہتک حصار میں توڑے گئے ذکر کرتے کرتے رو پڑتے۔

طلبا اور سٹاف میں وہ اپنے مخصوص ترنم اور ہارمونیم نوازی کے لیے بھی مقبول تھے ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۱ء کے عرصے میں کالج کے سٹیج اور آفیسرز میس میں اپنی آواز کا جادو اکثر جگاتے تھے۔ جگر کی یہ غزل:

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز — کانٹوں سے بھی نباہ کیا جا رہا ہوں
یوں زندگی گزار رہا ہوں تیرے بغیر — جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں

ان سے بار بار سنی اور ہر بار نیا لطف آیا انہوں نے اپنے ڈائن آؤٹ پر جس غزل سے محفل کو لوٹ لیا وہ یہ تھی۔

بہاریں پھر بھی آئیں گی نہ جانے ہم کہاں ہوں گے
ہمارے بعد محفل میں اب افسانے بیاں ہوں گے
اسی انداز سے جھومے گا موسم، گائے گی دنیا
محبت پھر حسین ہوگی نظارے پھر جواں ہوں گے
نہ ہم ہوں گے نہ تم ہو گے نہ دل ہو گا مگر پھر بھی
ہزاروں منزلیں ہوں گی ہزاروں کارواں ہوں گے

یہ باتیں ۱۹۵۸-۶۱ء کی ہیں جبکہ آتش جواں تھا۔ اس کے تقریباً پچیس برس کے بعد اوائل ۱۹۸۸ء میں کراچی کے ایک فلیٹ میں ہاشمی صاحب سے ملا تو وہ بالکل صوفی ہو چکے تھے

؎ سابق استاد ملٹری کالج ۱۹۵۹-۶۱ - ۱۹۶۸-۱۹۶۷ء

لمبی نورانی داڑھی، پیشانی پر کثرتِ سجدہ سے سیاہ گٹے کا نشان، درویشانہ انداز، فرمانے لگے "رشید صاحب اللہ بس باقی ہوس"۔ ایک طرف کو ہارمونیم بھی رکھا تھا۔ میں نے پوچھا قبلہ۔ یہ سلسلہ جاری ہے فرمایا چشتیہ سلسلہ میں بیعت ہوں اس میں سماع چلتا ہے۔ یوں بھی اب اس کا رخ (اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس کی طرف ہے میں نے عرض کیا کچھ سنائیے گا۔

"ضرور، تواضع کار خیر ہے، اب یہ سوز و ساز ہی زندگی کا ساتھی ہے زندگی بھر کی ساتھی نے تو ساتھ چھوڑ ہی دیا اللہ غریق رحمت کرے۔"

....(آنسو پونچھ کر) رشید صاحب آج آپ کو اپنی پسندیدہ چیز سناتا ہوں۔

امیر خسرو کا کلام ہے قالو بلیٰ میں پھنس گئی رے (عہد الست کی طرف اشارہ ہے جب انسانی روح نے اللہ سے قالو بلیٰ کہہ کر اقرار ربوبیت کیا) عرض کرتا ہوں۔

قالو بلیٰ میں پھنس گئی رے   ارے میں تو پھنس گئی قالو بلیٰ میں
الم کا پردہ اپنے ہٹا کر سامنے آ جا   عشق خدا میں پھنس گئی رے!!!
ارے میں تو پھنس گئی قالو بلیٰ میں

اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ کہہ کر۔ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ

عشقِ نبی میں پھنس گئی رے   ارے میں تو پھنس گئی قالو بلیٰ میں

رشید صاحب۔ اسی میں ایک شعر کا اضافہ مجھ عاجز نے بھی کیا ہے۔

لاالٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ کلمہ طیبہ میں پھنس گئی رے، ارے میں تو پھنس گئی قالو بلیٰ میں

رشید صاحب!

اب تعوذ سے لے کر آمین تک الحمد شریف کا ترجمہ سناتا ہوں۔

کہ زندگی کی اس منزل میں جب جی گھبراتا ہے تو اسی سے سکون پاتا ہوں۔

تعوذ پناہ مانگتا ہوں میں اپنے خدا کی   لعین اور مردود شیطان سے
تسمیہ شروع کرتا ہوں نام لے کر خدا کا   جو ہے مہربان درگزر کرنے والا
سورۂ فاتحہ یہ تعریف سب اس خدا کیلئے ہے   جو ہے پالنے والا کل عالموں کا

رحیم اور رحمٰن ہے ذات جس کی　　خداوند ہے جو کہ روزِ جزا کا
عبادت کیا کرتے ہیں صرف تیری　　تجھی سے مدد مانگتے ہیں خدایا
دکھا سیدھا رستہ ہمیں بھی انہی کا　　جنہیں تو نے انعام سے ہے نوازا
نہ وہ جو کہ گمراہیوں کے سبب سے　　رہ راست سے کر چکے ہیں کنارا

آمین ثم آمین!

دعا کر یہ مقبول میری خدایا　　یہی التجا ہے دوبارہ سہ بارا

مجھے کسی نے بتایا تھا کہ ہاشمی صاحب شعر بھی کہنے لگے ہیں۔ میں نے عرض کیا:
ہاشمی صاحب، کچھ اپنے کلام سے بھی نوازیئے۔ میں کیا اور میرا کلام کیا۔ مسلمانوں کی حالت دیکھ کر دل بہت کڑھتا ہے۔ ابھی چند روز ہوئے یہ شعر ہوئے تھے۔ پیش کرتا ہوں۔

وہ ذکر حسیں رحمت کا ایں کہتے ہیں جسے قرآن مبین
بطحیٰ کا جو درس شہ نے دیا ہم پڑھنا پڑھانا بھول گئے
اغیار کا جادو چل بھی گیا ہم ایک تماشا بن بیٹھے
خود کو مٹانا سیکھ لیا باطل کو مٹانا بھول گئے
ہم حرص و ہوس کی دلدل میں ایمان و صداقت کھو بیٹھے
دنیا میں ذلیل و خوار ہوئے عقبیٰ کا ٹھکانا بھول گئے
عبرت کا مقام ہے یہ پستی، پھر قابل حیرت ہے یہ مستی
قوموں نے ابھرنا سیکھ لیا ہم ہوش میں آنا بھول گئے

میں چلنے لگا تو فرمایا۔ اللہ ملٹری کالج کو زندہ و تابندہ رکھے کہ اس کے حوالے سے پہچانا جاتا ہوں۔ پرانے شاگرد عزت و محبت سے یاد کرتے رہتے ہیں۔ اس کا کریڈٹ بھی ادارہ ہی کو جاتا ہے۔ جیسا گل ہوتا ہے ویسی بو ہوتی ہے۔

حق اللہ! پاک ذات اللہ!

کیپٹن آئی آر صدیقی[1]

لیفٹیننٹ کرنل اعجاز رفیع

مجھے ۵۹-۱۹۵۸ء میں صدیقی صاحب سے حساب پڑھنے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے
پہلے دن کلاس میں آئے تو غالباً ہم سب کے پرسنل فائل پڑھ کر آئے تھے۔ بجائے اس کے کہ ہم
اپنا تعارف کراتے انہوں نے فرداً فرداً اس طرح گفتگو کی کہ ہمیں اطمینان ہوا۔ مجھ سے یوں بات کی
ہیلو مسٹر سنگر ایٹڈ ایکٹر، مجھے یہاں یہ اعتراف کرنے میں باک نہیں کہ حساب کے مضمون
سے مجھے نفرت تھی یہ صدیقی صاحب کے پڑھانے کے سٹائل کا اعجاز تھا کہ میں اور میری
طرح وہ جو حساب میں کورے تھے اس مضمون میں چل نکلے۔ لیکن یہاں میں صدیقی صاحب
کی ان بیش بہا تاریخی خدمات کو ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں جو انہوں نے کالج میں سکاؤٹنگ
کے لیے کیں I owe it to him صدیقی صاحب نے ۱۹۵۸ء میں سکاؤٹنگ کا
چارج سنبھالا۔ ۵۵-۱۹۵۴ء میں کالج میں سکاؤٹنگ شروع ہوئی تھی۔ اس وقت سے کرنل
رفیق کی وجہ سے سکاؤٹنگ کا انتظامی پہلو بہت شاندار تھا۔ گھوڑا گلی کیمپ میں ایم سی
ٹروپ کی کارکردگی پہلے بھی اچھی تھی لیکن یہ سارا کام ایک رسم (Ritual) کے طور پر ہو رہا
تھا۔ صدیقی صاحب نے اس میں جان ڈالی۔ ایم سی کو پہلے ملکی سطح پر پھر انٹرنیشنل سطح پر
متعارف کرایا۔ ۱۹۵۸ء میں جب ایم سی ٹروپ کو گھوڑا گلی لے گئے تو سب سے پہلے یہ کام
کیا کہ پرونشل بوائے سکاؤٹس کے سکریٹری مسٹر رؤف اور کیمپ آرگنائیزر مسٹر اکبر وغیرہ سے
ذاتی طور پر رابطہ قائم کیا، ان سے تعاون کیا اور کیمپ کے انتظام، پروگرام کے لیے اپنی خدمات
پیش کیں۔ اس طرح انہوں نے ہمیں صوبائی سطح پر اچھی طرح متعارف کرادیا اور ملکی سطح پر ہمارے
Exposure کے لیے راہ ہموار کرنے لگے جس کا موقع جلد آگیا۔ ۱۹۶۰ء کی لاہور کی انٹرنیشنل
جمبوری میں وہ ایم سی ٹروپ لے کر گئے یہ Exposure ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہوا
گھوڑا گلی میں ہمارا مقابلہ لارنس کالج اور ایک آدھ اور معمولی اداروں سے ہوتا تھا جسے ہم باآسانی
جیت لیتے تھے۔ اور یوں ہم اپنے آپ کو بڑا تیس مار خاں سمجھنے لگے تھے۔ لاہور کی جمبوری میں ہمارا

---

[1] عنایت الرحمٰن صدیقی صاحب بریگیڈیئر کے عہدہ میں ۸۴-۱۹۸۳ء کے عرصہ میں کالج کے کمانڈنٹ بھی رہے۔

واسطہ پورے ملک خاص طور پر کراچی کے اور دوسرے ملکوں جرمنی، فرانس، انگلینڈ، انڈونیشیا، ترکی، ایران وغیرہ کے سکاؤٹوں سے پڑا۔ ان میں ایک سے ایک Talented سکاؤٹ پڑا تھا۔ اس سے ہمیں دو فائدے ہوئے جو Over-confidence تھا وہ دور ہوا اور دوسروں کے معیار کو دیکھ کر اپنے معیار پر فخر ہوا۔

اسی طرح خانس پور میں جو کیمپ ہوا تھا اس میں امریکن اور کینیڈین سکاؤٹ بھی تھے وہ ہمارے کیمپ میں آتے جاتے تھے۔ اچھی گپ شپ رہتی اس رابطے سے ہمارے ٹروپ کی خود اعتمادی میں بے پناہ اضافہ ہوا اور نئی باتیں سیکھنے کی راہ کھلی۔ اس کیمپ میں مسٹر توقیر اور مسٹر کمال بھی ہمارے ساتھ تھے۔ رات گئے تو کیمپ فائر کا پروگرام ہی چلنا تھا۔ اس کے بعد گھنٹہ گھنٹہ بھر کے لیے ایک ٹروپ واچ ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔ صدیقی صاحب کئی بار واچ پارٹی کو خود چیک کرتے تھے۔

۱۹۶۲ء میں یونان کے شہر ایتھنز میں جو انٹرنیشنل جمبوری ہوئی تھی۔ جس میں ۸۰ ممالک کے سکاؤٹس نے حصہ لیا تھا اس میں ایم سی ٹروپ کے تین سکاؤٹوں نے شرکت کی۔ یہ گویا ایم سی ٹروپ کو انٹرنیشنل سطح پر متعارف کرانے کی پہلی اور اب تک غالباً آخری کوشش تھی اندازہ کیجیے کہ پنڈی ڈویژن سے چار سکاؤٹس کا انتخاب ہونا تھا جن میں سے تین شہاب ناصر، اسلم کیانی اور میں ملٹری کالج کے تھے۔ انھوں نے ہمیں انتخاب کے انٹرویو کے لیے اس طرح تیار کیا کہ ہمارا انتخاب یقینی ہو گیا۔ شاید میں بتانا بھول گیا کہ لاہور کی جمبوری اور خانس پور کے انٹرنیشنل کیمپ میں صدیقی صاحب نے پنجاب بوائے سکاؤٹس اور پاکستان بوائے سکاؤٹس ایسوسی ایشن کے ارباب حل و عقد کے ساتھ جو تعاون کیا تھا۔ اس کی وجہ سے ان کی حیثیت بوائے سکاؤٹس کی تنظیم میں ایک کمشنر کی سی ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس سے بھی ملٹری کالج کا نام اونچا ہوا۔ اور ہمیں وہاں زیادہ پذیرائی ملی۔ گریس کی جمبوری کے لیے ہم تینوں کے انتخاب کا مراسلہ آگیا تو مسئلہ پیدا ہوا کہ فی کس دو دو ہزار روپے جو جمع کروانے تھے ان کا کیا انتظام ہو۔ مختصر یہ کہ صدیقی صاحب کی کاوشوں سے یہ مسئلہ بھی حل ہوا۔ پندرہ سو روپے فی کس کی گرانٹ ملی اور ہمارے ذمے صرف پانچ پانچ سو آئے۔ ملک سے باہر جانے کے لیے

پاسپورٹ وغیرہ کے جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے، وہ بھی صدیقی صاحب نے خود طے کیے حتیٰ کہ ہماری آؤٹ فٹ کا خاطر خواہ انتظام کیا۔ صدیقی صاحب کی خوبی یہ تھی جو کام انہیں کرنا ہوتا تھا وہ اس پر دشمن کی طرح پڑجاتے تھے۔ لیکن ہر قدم پر Tact اور Imagination سے بھی کام لیتے تھے۔ چنانچہ اس مرحلہ میں بھی ان کی یہ خوبیاں بروئے کار آئیں۔ اور کم و بیش تن تنہا انہوں نے اس ہفت خواں کو طے کیا آخر میں جو لطیفہ ہوا وہ بھی بیان کرتا چلوں۔ لاہور ریلوے سٹیشن سے مغربی پاکستان کے دستے کو کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ہمیں خدا حافظ کہنے صدیقی صاحب لاہور تک ہمارے ساتھ گئے وہاں پہنچے تو وہاں ایک جشن کا سماں تھا۔ دوسرے اداروں کے سربراہ اور طلبا اپنے اپنے سکاؤٹس کو ہار پہنا رہے تھے۔ ایک سکول نے تو بینڈ کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ ہمارا معاملہ سوکھا تھا۔ بہرحال حسب معمول صدیقی صاحب کا تخیل حرکت میں آیا اور انہوں نے اپنی جیب سے حسنین آغا کو بیس روپے نکال کر دیئے کہ سٹیشن کے باہر سے بہت سے ہار لے آؤ۔ اب صورت حال یہ تھی کہ دوسرے سکاؤٹس ہاروں سے لدے ہوئے تھے ان کے اساتذہ اور طلبا اور غالباً والدین بھی ان پر واری ہو رہے تھے۔ اور ہمارے آغا صاحب ہانپتے کانپتے واپس لائے۔ (ہانپتے اس لیے کہ ماشاءاللہ حسنین ہیوی ویٹ تھے۔ بھاگ دوڑ نے ان کا پسینہ نکال دیا تھا) بڑے شوق سے صدیقی صاحب نے تھیلا کھولا۔ یا مظہر العجائب یہ کیا؟ یہ تو آم ہیں؟

"سر، ہار تو ملے نہیں، میں نے سوچا آم ہی لے لوں۔ ونڈرفل، ونڈرفل، قہقہہ پڑا۔ اتنے میں گاڑی چل پڑی۔ دور تک صدیقی صاحب کا سفید رومال ہلتا نظر آتا رہا۔

——— چیف وارنٹ آفیسر فضل کریم[1]

ریاضی کی کلاس ماسٹری اور غزنوی ہاؤس کی ہاؤس ماسٹری کے علاوہ ایک اور ماسٹری بھی انہوں نے کمال کے ساتھ کی۔ وہ سکاوٹ ماسٹری تھی۔ ان کا ذہن بہت رسا تھا۔ تربیت کے نت نئے طریقے سوچتے رہتے تھے۔ گھوڑا گلی میں سکاوٹ بنک کا قیام ان ہی کی Brain wave تھا۔ ۱۹۶۰ء میں جب سکاوٹ ٹروپ نتھیا گلی کے دورے پر تھا تو انہوں نے تو اس وقت

---

[1] کالج نمبر ۲۳۶، زمانہ تعلیم ۶۲-۱۹۵۹ء

کے وزیر خارجہ منظور قادر سے ملاقات کروائی۔ وہ لڑکوں کی تربیت کا کوئی موقع سے جانے نہیں دیتے تھے۔ انہیں کام کو سلیقہ سے کرنے میں بھی کمال تھا۔ وہ ایم سی ٹروپ گھوڑا گلی کیمپ کیلئے اتنی مکمل تیاری کے ساتھ لے جاتے جیسے کوئی ملک فتح کرنے چلے ہوں۔ انسپکشن کیلئے چونا تو چونا پینٹ کے ڈبے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ گیجٹ بنانے کا سارا سامان ہوتا۔ اعجاز اکبر صاحب کی طرح وہ بھی انتظامی معاملات کی جزئیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ نفاست اور رکھ رکھاؤ میں بھی انکا ایک مقام تھا۔ وہ ایک مکمل استاد تھے

—— لیفٹیننٹ کرنل ذوالفقار ارشد تمغہ رسالت [1]

صدیقی صاحب مجھے وزیر آباد تک چھوڑنے آئے میرے پاس کالج کا مخصوص جہازی سائز کا سیاہ ٹرنک تھا جو کتابوں کاپیوں کے علاوہ بے شمار چیزوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ اور خاصا بھاری ہوگیا تھا۔ وزیر آباد میں بس کے اڈہ سے جب ہم ریلوے سٹیشن کی طرف چلے تو میرے محسن صدیقی صاحب نے وہ بھاری ٹرنک ایک طرف سے اٹھایا ہوا تھا۔

کیا اب بھی کوئی آئی۔ آر صدیقی ملٹری کالج میں ہے؟ خدا کرے کہ ہو۔ جن سرحدوں کو اہل شہادت نصیب نہ ہوں وہ سرحدیں مٹ جاتی ہیں۔ جن شہروں کو اہل جمال نہ ملیں وہ بے رونق ہو جاتے ہیں اور جن اداروں کو اہل احسان استاد میسر نہ ہوں وہ بام و در کی ہر آرائش کے باوجود اجڑ جاتے ہیں۔ ع

یاد آئیں گے زمانے کو مثالوں کیلئے   جیسے بوسیدہ کتابیں ہوں حوالوں کیلئے

—— ونگ کمانڈر ارشد نواز [2]

ایم سی پٹرول کے ساتھ میں گھوڑا گلی میں سکاؤٹنگ کیمپ کر رہا تھا۔ کہ یکایک بخار ہو گیا۔ صدیقی صاحب نے میری بہت دلجوئی کی میں نے کہا سر، مجھے واپس بھیج دیجئے۔ وہ نہ مانے مری سے ڈاکٹر کو بلوایا۔ شکر ہے کہ دوسرے دن ہی میرا بخار اتر گیا اور کیمپ کی سرگرمیوں میں شامل ہو گیا۔ انہیں کیمپ میں نئی نئی جدتیں کرنے میں کمال حاصل تھا۔ کیمپ میں آزشاپ کھولی، اپنے سکاؤٹس کے لیے بنک چلایا اور انہیں باقاعدہ چیک چھپوا کر دیئے۔ کیمپ فائر میں نئے نئے آئیٹم پیش کرواتے تھے۔ انہوں نے سکاؤٹنگ کو کالج میں نمائشی نہیں حقیقی طور

---

[1] کالج نمبر ۲۵۶۳، زمانہ ۶۵-۱۹۶۰ [2] زمانہ تعلیم ۱۹۵۹ء

پر ایک فعال ادارہ بنایا۔

——— میجر ساجد مجید بٹ

صدیقی صاحب کا ذہن بڑا رسا تھا۔ سکاؤٹنگ اور یوتھ ہاسٹلنگ میں ایسی ایسی جدتیں پیدا کرتے تھے جو اس وقت تو صرف دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔ آج انکی Originality اور ان کے Vision پر حیرت ہوتی ہے اور Pride بھی۔ اس زمانہ میں کالج میں سکاؤٹنگ کا ایک اپنا مقام تھا۔ سکاؤٹنگ، ہائکنگ، یوتھ ہاسٹلنگ وغیرہ Outward-bound سرگرمیوں کو انہوں نے فی الواقعہ کردار سازی اور لیڈر شپ کی ٹریننگ کا ایک موثر ذریعہ بنایا جو ان سرگرمیوں کا اصل مقصد ہے۔

گھوڑا گلی کے سکاؤٹ کیمپوں میں سکاؤٹ بنک اور کیمپ کے اخبار دی پائن (The Pine) کا اجرا آنر شاپ کا قیام مووی کیمرے کا استعمال انہی کے ذہن رسا کی کارفرمائیاں تھیں۔ جولائی ۶۷ء میں، فورتھ آل پاکستان جمبوری منعقدہ کراچی میں صدیقی صاحب نے ایم سی پیٹرول کی قیادت کی تھی کالج کے ہم آٹھ سکاؤٹوں نے سکاؤٹ کرافٹ کے انٹرڈویژن مقابلوں میں جس انتہائی کارکردگی کا مظاہرہ کیا وہ تو کیا ہی انہوں نے اپنی جدت طرازی سے ایم سی کیمپ ایریا کو جمبوری کا ایک قابل دید مقام بنا دیا تھا۔ کیمپ کے Layout کے حسن کے علاوہ انہوں نے وزیٹرز بک گیجٹ (Gadget) واٹر گیجٹ، کالج سٹال گیمٹ جو بنوائی تھیں وہ ایسی انوکھی اور خوبصورت تھیں کہ مہمان ہمارے خیمہ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ وہ ہمیں Encourage کرتے تھے کہ ہم دوسرے قومی اور انٹرنیشنل سکاؤٹوں سے ملیں جلیں اور ان کا مطالعہ کریں۔ جمبوری کے بعد قائداعظم کے مزار پر حاضری دینا تو ہمارا فرض تھا ہی اس کے علاوہ بھی انہوں نے ہمیں کراچی کے تمام قابل دید مقامات کی سیر کرائی۔ سیر کرانے کا مقصد یہ نہیں کہ گھوم پھر کر آ گئے ہوں۔ بلکہ ہر چیز اور ہر مقام کا مطالعہ کروایا۔ پاکستان نیوی کے تربیتی اداروں کی پی این ایس کارساز ڈھاکہ کو بھی اسی انداز سے وزٹ کیا۔ بے شمار اہم افراد سے ہمیں ملوایا اور خاطر تواضع بھی اسی انداز سے کروائی۔ پی آر میں بھی ان کا جواب نہ تھا۔ یہ بھی ایک آرٹ ہے۔ ہم جہاں جاتے اور جس سے ملتے

---

[۱] کالج نمبر ۱۹۰۱ء

ان کی وجہ سے ہم وی آئی پی ہو جاتے تھے۔ مسز عثمانی کے تحائف مسٹر نعیم فاروقی کی مٹھائی، کرنل اقبال کی گاڑیاں، شہاب ناصر کا لیکچر آج بیس بائیس برس کے بعد بھی یہ باتیں اکثر یاد آتی ہیں۔ یہ سارا Social exposure ایجوکیشن کا پروسس تھا۔ جس سے انہوں نے ہمیں گزارا۔ کالج میں ہائکنگ اور کوہ پیمائی کو تربیتی لحاظ سے زیادہ منظم اور موثر بنانے کے لیے انھوں نے یوتھ لیڈرز کلب قائم کیا اور اس کے تحت یوتھ کونسل تشکیل دی۔ اس دور میں Outward-bound سرگرمیوں کو Meaningful اور موثر ان ہی نے بنایا۔

یوتھ ہائیکنگ ایسوسی ایشن آف پاکستان نے آل راؤنڈ بیسٹ پرفارمنس شیلڈ انکو دی ہوئی تھی۔ اسی طرح سکاؤٹنگ کا سب سے بڑا فنی کورس وڈ بیج کی Beads ان کے پاس تھیں اور چیف سکاؤٹ آف پاکستان صدر پاکستان نے انہیں Parchment عطا کیا تھا۔ ان کے اعزازات اور پروفیشنل فتوحات کا ذکر میں اس لیے کر رہا ہوں کہ استاد کا ہر اعزاز اس کا پڑھایا ہوا ہر لفظ اس کی سوچی ہوئی ہر بات کسی نہ کسی طرح اس کے شاگردوں تک پہنچ جاتی ہے۔ آئی آر صدیقی نے ہمیں بہت Educate کیا۔ وہ بنیادی طور پر معلم تھے کاش ان کی صلاحیتیں ایک عرصہ تک وردی میں ضائع نہ ہوئی ہوتیں۔ وہ قومی نقطہ نظر سے موتیوں میں تولنے کی چیز تھے۔

کیپٹن اعجاز اکبر

——— مسٹر منظور حسین[1]

اعجاز اکبر صاحب جو بریگیڈیئر ہو کر ریٹائر ہوئے ہمیں نویں دسویں میں ریاضی پڑھاتے تھے۔ حساب الجبرا جیومیٹری تینوں خشک مضمون ہیں اس لیے ریاضی دانوں کی خشکی مشہور ہے۔ لیکن اپنے اعجاز اکبر صاحب بڑے زندہ دل اور پرجوش آدمی تھے۔ پیریڈ کے شروع میں دو چار منٹ لائٹ باتیں جان بوجھ کر کرتے تاکہ ذہن کا دوران خون تیز ہو جائے پھر وہ چاک لے کر شروع ہوتے تو پیریڈ آنکھ جھپکنے میں گزر جاتا۔

ان کے پیریڈ میں Tension نہیں ہوتا تھا۔ ان کی خوش مزاجی سے شہ پا کر ایک

---

[1] ایڈووکیٹ میرپور زمانہ تعلیم ۶۰-۱۹۵۳ء

روز چند شوخ لڑکوں نے ضد کی کہ سر میتھس تو روز پڑھتے ہیں آج آپ کوئی شعر سنائیں اعجاز صاحب یہ سن کر مسکرائے اور کہا بھائی ریاضی کے استاد کو تو خواب بھی ریاضی کے ہی نظر آتے ہیں تو سر! آپ شعر بھی ریاضی کا سنا دیں۔

"ریاضی کا شعر؟"

"ہاں سر، ریاضی کا شعر"

تو پھر سنو۔ ایک ریاضی دان اپنی محبوبہ سے کہتا ہے:

نفی نفی مل کے بنتا ہے مثبت

تو بھی خدا کے واسطے کہہ دے نہیں! نہیں

تو یہ تھے اعجاز اکبر صاحب۔ ہم نے لاکھ کوشش کی کہ پٹڑی سے اتریں لیکن انہوں نے الٹا الجبرے کا فارمولا حلق سے نیچے اتار دیا۔ وہ بھی آئس کریم کے مزے کے ساتھ۔

——— چیف وارنٹ آفیسر فضل کریم[1]

میتھس جیسے بور مضمون کو دلچسپ بنانا انہی کا کام تھا۔ وہ فنا فی المیتھس تھے میتھس پڑھاتے وقت ان کا انہماک دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں ٹیچرز سیاہ گاؤن پہن کر آتے تھے وہ کلاس سے نکلتے تو ان کا ہاتھ آستین بلکہ گاؤن کے سامنے کا حصہ چاک کی گرد سے اٹا ہوا ہوتا تھا۔ اپنے کام سے مکمل Involvement کی وہ جیتی جاگتی تصویر تھے۔ اور یہی ورثہ ہے جو ان سے ان کے شاگردوں کو ملا۔ اور آج بھی ان سب کے لیے سب سے قیمتی متاع ہے۔ وہ ہر کام کو اس کی انتہا تک پہنچا کر کرنے کے عادی تھے۔ جب وہ ٹیپو سلطان ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر ہوئے تو اس کو چار چاند لگا دیئے۔ ہاؤس میں تقریروں اور ڈراموں کا معیار کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ڈراموں کی ڈائریکشن خود کرتے۔ مجھے یاد ہے جب لڑکے ریہرسل کرتے کرتے تھک جاتے تو وہ امام دین کے شعروں سے تواضع کرتے۔ ایک آدھ بار ہیر بھی سنائی۔ یہ تو لائٹ سائڈ تھی دوسری طرف اخلاقی تربیت پر اتنی توجہ تھی کہ ہاؤس میں باجماعت نماز شروع کروائی اکثر فجر کی نماز کی امامت خود کرتے۔ سبحان اللہ۔ حساب پڑھاتے تھے تو کام

---

[1] کالج نمبر ۳۷۲۵ زمانہ تعلیم ۶۲-۱۹۵۹ء

بھی قاعدے سے کرتے تھے۔ ہاؤس کا وال پیپر نوائے ٹیپو جاری کروایا تو یہ نہیں کہ یوں ہی کسی کو ایڈیٹر بنا دیتے، پہلے مضمون نگاری کا مقابلہ کروایا۔ جو فرسٹ آیا اسے ایڈیٹر مقرر کیا اعجاز صاحب کی سرپرستی میں یہ وال پیپر بڑی کامیابی سے چلا اس کا ایک راز یہ تھا کہ انہوں نے اسے لڑکوں کا اخبار ہی رکھا۔ اسے سٹاف سے بار بار اصلاح کروا کے دکھانے کی چیز (شوپیس) نہیں بنایا۔

شاید بہت سے لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ اعجاز اکبر کچھ عرصہ پاک فضائیہ سے وابستہ رہنے کے بعد اے ای سی میں آئے تھے۔ غالباً اس سے بھی پہلے شادیوال میں ہیڈ ماسٹر رہے تھے۔ بظاہر سنجیدہ اور سخت گیر لیکن اندر سے حد درجہ ہمدرد اور پرشفقت۔ آرمی برن ہال کی پرنسپلی کے زمانہ سے ان کی ملک گیر شہرت شروع ہوئی۔ بریگیڈیر کے عہدۂ جلیلہ سے ریٹائر ہوئے پھر وہیں ایبٹ آباد میں انٹرنیشنل پبلک سکول کی داغ بیل ڈالی۔ وہ چلتا پھرتا چراغ ہیں عام طور پر مشہور ہے کہ اچھے استاد اچھے منتظم یا عملی آدمی نہیں ہوتے۔ اعجاز صاحب میں یہ خوبی بھی ہے کہ بہت اچھے منتظم ہیں اور عملی معاملات میں بھی حرف آخر اور اس امر کا ثبوت کہ اچھا استاد اچھا عملی انسان بھی ہو سکتا ہے۔

——— ھارون رشید[1]

مئی ۱۹۶۴ء میں اعجاز اکبر صاحب نے ہاؤس ہی کے برآمدہ کے سامنے ایک شاندار سٹیج بنا کر ایک شاندار ہاؤس شو کروایا تھا۔ ٹیپو سلطان پر جو ڈرامہ تھا وہ انہوں نے خود ڈائریکٹ کیا شو اور بھی بہت کچھ تھا جہانگیر نواز وغیرہ بہت سے لڑکوں نے مزاحیہ اسکٹوں میں حصہ لیا تھا حوصلہ افزائی اعجاز اکبر صاحب پر ختم تھی۔ یہ ان کا کرم تھا کہ ٹیپو سلطان کے روپ میں میری تصویر کو انہوں نے اپنے ڈرائینگ روم میں جگہ دی۔

——— میجر ساجد مجید بھٹی[2]

ٹیپو ہاؤس میں کوئی فنکشن تھا۔ اعجاز صاحب نے گجرات سے کچھ سازندے بلوائے تھے کوئی لوک ڈانس کرتا تھا۔ سب سے پہلے اعجاز صاحب نے خود وہ ڈانس کیا۔ پھر ہمارے ساتھ شامل

---

[1] کالج نمبر ۸۱ ۲۵ زمانہ تعلیم ۶۴-۱۹۵۹ء [2] کالج نمبر ۲۹۰۱

ہوئے۔ اس کے بعد ہم خود رواں ہو گئے۔ یوں کہ روکے نہیں رُکتے تھے۔

اس وقت تو یہ باتیں معمولی نظر آتی تھیں اب جبکہ میں خود ذمہ داریاں اٹھانے کی منزل میں ہوں۔ مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ ہم جن چیزوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے ان کو کرنے کے لیے بھی خاصی جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے استادوں نے ہماری تربیت کے لیے کیا کیا جتن نہ کیے۔ اور کس خوش دلی سے۔ سٹیج کی ایکٹنگ تو وہیں ختم ہو گئی لیکن کام کرنے اور کرانے کا رویہ آج تک ہمارے ساتھ ہے۔ ملٹری کالج زندہ باد پائندہ باد۔

شاہد محمد احمد

—— منظور حسین[1]

جب ۱۹۵۸ء میں شاہد صاحب نے ہمیں فرسٹ ایئر میں انگریزی پڑھانا شروع کی تو اس وقت غالباً لیفٹیننٹ تھے۔ ان کا نام میرے ذہن میں بغیر ان کے رینک کے آیا۔ اسی طرح لکھ دیا غالباً اس کی لاشعوری وجہ یہ ہو سکتی ہے وہ اپنے طرز احساس اور انداز میں فوجی کم سویلین زیادہ تھے۔ ادب سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ انگریزی پڑھاتے پڑھاتے اردو کے اشعار بھی سناتے تھے۔ ہوم ورک چیک کرتے تو لڑکے پر اور کام پر خاص خاص ریمارکس لکھتے تھے۔ ایک دفعہ اردو کا ایک شعر

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

ترجمہ کرنے کو دیا۔ ہم نے بڑا زور لگایا۔ اور بات نہ بنی تو خود (اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا) یہ ترجمہ بورڈ پر لکھا۔

Evenings come and mornings go
A man's life ends so.

شاہد صاحب انگریزی پڑھاتے وقت علوی صاحب کی طرح نصاب سے ہٹ کر بھی بہت کچھ بتاتے جاتے تھے۔ ایک فقرہ اس وقت بھی کانوں میں گونج رہا ہے۔

Great things happen, when man and mountains meet

وہ انگریزی نظموں کو پہلے خود بار بار Recite کرتے تھے۔ ان کے یوں بار بار کے سنانے سے ہمیں انگریزی شاعری کے مخصوص آہنگ کا کچھ احساس ہوا۔

---

[1] کالج نمبر ۲۱۴۹

——— لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر[1]

جناب شاہد محمد احمد جو اس زمانے میں اے ای سی میں لیفٹیننٹ اور بعد میں ۱۹۸۷ء میں کرنل ہو کر ریٹائر ہوئے۔ وردی میں سویلین تھے۔ نرم خو اور بے حد شائستہ لب و لہجہ کے مالک انگریزی فنکارانہ انداز سے پڑھاتے اُردو کے مشہور شاعر اور نقاد فراق گورکھپوری کے شاگرد تھے اور الہ آباد یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور یوپی کے ایک علمی خانوادے سے ان کا تعلق تھا۔ کلچر کا رچاؤ اور علم کا انکسار ان میں موجود تھا۔ انگریزی پڑھاتے ہوئے اُردو کے حوالے بھی دیتے جاتے تھے۔ فراق کا یہ شعر منزلیں ہیں کہ گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں

پہلے انہی نے سنایا تھا۔

——— سید زمان خان[2]

لیفٹیننٹ شاہد صاحب فرسٹ ائیر میں ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے وہ Imagination پر بہت زور دیتے تھے۔ کہا کرتے تھے نظم کو اپنے Imagination سے Create کرو گے تو اسے محسوس بھی کر سکو گے انگریزی پڑھاتے ہوئے اردو کے شعرا میرؔ اور غالبؔ کو بھی کوٹ (Quote) کرتے تھے۔ شعر کے Symbolism کی بات ہو رہی تھی تو یہ شعر سنایا۔

ہر چند کہ ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اپنے استاد فراق گورکھپوری کے شعر بھی اکثر سنایا کرتے تھے۔ ایک بار فراق کے کسی خط کا یہ ٹکڑا سنایا۔

وہ کم بخت اچھا کیا ہوتا وہ تو برا بھی نہ ہو سکا۔ پھر وہ اچھے اور بُرے Behaviour کے نفسیاتی اسرار و رموز پر بحث کرتے رہے۔ ان کے بارے میں ایک اور بات یاد آئی کہ کلاس میں جو مضمون لکھنے کو دیتے ان کے عنوانات میں بڑی جدت سے کام لیتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے Originality ذہانت کی جان ہوتی ہے۔

کیپٹن آغا نسیم

——— کرنل اخلاق احمد

آغا صاحب جو کرنل ہو کر ریٹائر ہوئے سخت Disciplinarian بھی تھے کیا مجال

---

[1] کالج نمبر ۲۱۹۶ زمانہ تعلیم ۱۹۵۳-۵۶ء [2] کالج نمبر ۲۱۳۹ زمانہ تعلیم ۱۹۵۳-۵۷ء

کہ کوئی ایک سیکنڈ بھی لیٹ آئے۔ اور وہ نوٹس نہ لیں۔ یا گھنٹی بجنے کے بعد کوئی کلاس سے
باہر کھڑا ہو اور وہ اس کی سرزنش نہ کریں۔ لکڑی کا ڈسٹر کھٹاک سے اُلٹے ہاتھ پر مارتے تھے
لیکن میں نے ان سے بڑھ کر میتھمس کا استاد اپنی زندگی میں نہیں دیکھا وہ گولڈ میڈلسٹ
وغیرہ بہت کچھ تھے۔ ان کی لکھی ہوئی Calculus کی کتاب ہمارے نصاب میں تھی
مطلب کہنے کا یہ ہے کہ قابل بھی بے انتہا تھے۔ اور پڑھانے کے آرٹ میں بھی کامل تھے۔
Devotion کا یہ عالم تھا کہ اپنی خوشی سے سہ پہر کو ہماری ایکسٹرا کلاس لیتے تھے۔ دلچسپ
بات یہ کہ اس وقت ان کے پڑھانے کا لطف زیادہ آتا Reason سے پڑھاتے۔ میتھمس
پڑھایا ہی نہیں اس کی سمجھ بھی دی۔ ایسے بے مثال استاد کو تو ملٹری کالج میں زندگی بھر رکھنا چاہیے
تھا اور تمام ترقیاں وہیں نذر کی جاتیں۔

——— لیفٹیننٹ کرنل شمیم احمد جاوید[1]

آغا صاحب ہمیں ایف ایس سی میں میتھمس پڑھایا کرتے تھے۔ اور انہیں اس مضمون
میں جینئس کا درجہ حاصل تھا۔ انہوں نے میتھمس کو ہمارے لیے پانی کر دیا تھا۔ اپنے مضمون
کے علاوہ کوئی اور بات نہ کرتے۔ ان کے علم کا اتنا رعب تھا کہ ان کے پیریڈ میں کوئی اور مسئلہ
چھیڑنے کی ہمت بھی نہیں پڑتی تھی۔ کہا کرتے ریاضی سائنس کی ماں ہے، اس سے ذہن کی
تربیت ہوتی ہے۔ اس سے پہلے ہم ریاضی کو بحیثیت ایک مضمون کے پڑھتے آئے تھے
انہوں نے ہمیں اس کی علمی اہمیت سے آگاہ کیا۔

ایک بار آغا صاحب Infinity کی تعریف بتا رہے تھے۔ انہوں نے اس کی یوں
تعریف کی Infinity is a number greater than the greatest
اس پر کسی نے کہا۔ سر ہم سیدھا سا Greatest number کیوں نہیں کہہ دیتے۔
Greater than the greatest کی کیا ضرورت ہے؟ آغا صاحب نے وضاحت
کی Greatest کی تعریف زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے
Infinity is infinity یہ بلند ترین سے بلند تر ہے۔

---

[1] ۲۲۱ کالج نمبر زمانہ تعلیم ۴۲-۵۸-۱۹۵۸ء

God is infinity اللہ اکبر کا یہی مفہوم ہے۔

آغا صاحب بڑے ذہین آدمی تھے۔ ان کے ذہن کی شعاعیں ہمیں اپنے ذہنوں اور دلوں میں اترتی محسوس ہوتی تھیں۔

کیپٹن رشید

——— کرنل اخلاق احمد[1]

عبدالرشید صاحب نے جو میجر ہو کر ریٹائر ہوئے، ہاؤس میں پینٹنگ کلب قائم کیا تو وہ نمائشی چیز نہیں تھا کہ لڑکوں کے نام سے خود تصویریں بنا کر وہاں رکھ دی ہوں۔ وہ واقعی ہمیں فری ہینڈ ڈرائینگ اور پینٹنگ سکھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہمیں اس فن کی بنیادی باتیں خطوط کی کمپوزیشن اور رنگوں کی آمیزش کے اصول سکھائے۔ اور ہمارے ہاتھوں سے ہاؤس کے ریڈنگ روم کو چار چاند لگوائے۔ انہوں نے جس طرح دیواروں کو Motifs سے مزین کروایا اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ ضرور انہوں نے انٹیریر ڈیکوریشن یا ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کی ٹریننگ لی ہوگی۔ مصوری کے شوق یا ذوق کے لیے میں انہی کا ممنون ہوں۔ ریڈنگ روم کی ڈیکوریشن سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے ہمیں باقاعدہ مصوری کی تعلیم اور تربیت دی۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے پاس رباعیات عمر خیام کا ایک مصوّر ایڈیشن تھا۔ ہر رباعی کو Miniature سے Illustrate کیا گیا تھا ایک ایسی پینٹنگ کی کمپوزیشن میں جو فنی باریکیاں تھیں وہ سمجھائیں اور کہا۔ اگر ہو سکے تو اس پر اپنا ہاتھ آزماؤ۔ میں نے کئی دن کی کوشش کے بعد وہ پینٹنگ بنا کر پیش کی۔ لیکن بات نہیں بنی تھی۔ کچھ بددل ہو کر وہ تصویریں ان کو دکھائی اور کہا "سر، میں وہ تاثر نہیں دے پا رہا جو اصل میں ہے" دوسرے دن انہوں نے وہ تصویر مجھے دی تو میں اسے پہچان نہ سکا۔ میری حیرت کو دیکھ کر انہوں نے کہا یہ وہی تصویر ہے میں نے صرف ری ٹچ کیا ہے۔

مختصر یہ کہ کالج کے سالانہ یوم والدین اور تقریب تقسیم انعامات پر وہ تصویر آرٹ کی نمائش میں رکھی گئی اور وہ مہمانوں کی توجہ کا مرکز رہی۔

ان کی فنکارانہ مہارت سے بھی زیادہ جو چیز مجھے یاد آرہی ہے وہ ان کی سیلز مین شپ

---

[1] کالج نمبر ۲۳۴۵۔ زمانہ تعلیم ۶۲-۱۹۵۶ء

اور سیلف پروجیکشن سے مکمل بے نیازی ہے۔ جس کی وہاں بھی کمی نہیں تھی۔ وہ اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر تھے اور بیک گراؤنڈ رہ کر کام کر رہے تھے۔ ہمارے ہاؤس کا ریڈنگ روم اس زمانے میں کالج کا شو پیس تھا۔ کمانڈانٹ ہر مہمان کو کسی نہ کسی بہانے سے وہاں ضرور لاتے تھے ایسے موقعوں پر اگر وہ ہاؤس میں موجود بھی ہوتے تو قصداً اِدھر اُدھر ہو جاتے بعد میں جب ہم نے سیلز مین شپ کی دوڑ کے دلچسپ اور عبرتناک مناظر دیکھے تو ان کی قدر پہلے سے زیادہ ہوئی ۱۹۶۱ء کے بعد سے آج تک ان سے ملاقات نہیں ہو سکی ہے۔ آج ان سطروں کے ذریعے میں اس فنکار درویش کو خراج تشکر پیش کر رہا ہوں۔

——— لیفٹیننٹ کرنل اعجاز رفیع

میں اس وقت کی بات کر رہا ہوں جب رشید صاحب بحیثیت لیفٹیننٹ ۶۰-۱۹۵۹ء میں کالج میں نئے نئے پوسٹ ہوئے تھے اور اورنگ زیب ہاؤس کے اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر مقرر کیے گئے تھے۔ وہ بھی ایک گوہر بے بہا تھے۔ شروع میں تو ہمیں اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ اتنے Talented فنکار ہیں اور ان کی دلچسپیوں یا Hobbies کی فہرست اس قدر طویل ہے جب انہوں نے ہاؤس کے ریڈنگ روم کا چارج سنبھالا تو یہ ہال نما کمرہ صرف ریڈنگ روم ہی تھا۔ انہوں نے بہت جلد اسے ایک تصویر خانہ بلکہ نگار خانہ بنا دیا۔ بلاشبہ یہ اس زمانہ میں آرٹ گیلری کی حیثیت رکھتا تھا۔ کمال یہ کہ آرائشی پکچرز (Panels) اور Patterns میں کوئی چیز بھی Printed نہ تھی۔ سارے حسن پارے رشید صاحب کی نگرانی میں لڑکوں نے خود تخلیق کیے تھے۔ طاقوں اور الماریوں میں کچھ سامان وڈورک، لیدر ورک، پلاسٹر آف پیرس وغیرہ کا بھی تھا۔ رشید صاحب کو ہینڈی کرافٹ میں بھی خاصا دخل تھا۔ ایک روز علوی صاحب نے بتایا کہ رشید صاحب مچھلی کے شکار سے لیکر شیر کے شکار تک کے ماہر ہیں۔ ایک دن میس میں ان سے باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ وہ کھانا پکانے پر بھی ماہرانہ نظر رکھتے ہیں ہاؤس میں ان کی ہمدردانہ فرض شناسی کے مظاہرے بھی دیکھنے میں آتے رہتے تھے۔ ہر اچھا استاد کوئی نہ کوئی انفرادیت رکھتا ہے اور اس انفرادیت کے حوالے اپنے شاگردوں کی راہیں روشن کرتا ہے۔ رشید صاحب کی پہچان ان کا کمال فن تھا جسے ان کے جمال شخصیت نے اور

بھی خوبصورت بنا دیا تھا۔ آخر میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ وہ "افسریت" کی خو بو سے قطعاً مبّرا سو فیصد استاد تھے۔ ایک روز کرنل ڈاکٹر مسعود الحسن نوری (ہارٹ سپیشلسٹ) سے ان کا ذکر آیا تو کہنے لگے۔ اصل میں وہ حیدری صاحب، علوی صاحب، راشد صاحب کی Category اور Commitment کے استاد تھے۔ ان کو زندگی بھر کے لیے ملٹری کالج میں پوسٹ رکھنا چاہیے تھا۔

——— پروفیسر سعید راشد

اس زمانہ کے طلبا اور استادوں کو یاد ہو گا کہ اس وقت کالج میں دو کیپٹن رشید نامی تھے ایک سانولے رنگ کے حاضر سروس کیپٹن دوسرے ذرا کھلتے ہوئے رنگ کے کیپٹن رشید (تھے تو سویلین استاد لیکن سگنلز میں کپتانی سے ریٹائر ہو کر ابھی تک کیپٹن رشید لکھتے اور اور اسی طرح مشہور تھے) بلگرامی صاحب کی مزاح پسند طبیعت نے ملیح کیپٹن رشید کو رشید سیاہ اور صبیح کیپٹن رشید کو رشید سفید کا لقب دے رکھا تھا۔ اور کم ازکم سٹاف کی حد تک دونوں انھی ناموں سے معروف تھے۔

میں رشید سیاہ کی بات کر رہا ہوں اور قسم کھا کر کہتا ہوں کہ رشید سیاہ سے زیادہ ہمدرد، دردمند وضع دار، اور عملی طور پر تعلقات نبھانے والا انسان اور کالج کا متوالا انسان کم ازکم میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ انسان دوستی اور وضع داری اور تعلقات نبھانے میں، میں انہیں اپنا پیر سمجھتا ہوں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن سے مل کر اور کام کرتے دیکھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ یہ باتیں میں نے ان کی شخصیت کے ایک پہلو سے متعلق کہی ہیں۔ ورنہ بہت اچھے استاد، بہت اچھے آرٹسٹ، باکمال شکاری، کوہ پیما، سکاؤٹ ماسٹر کھانا پکانے کے ماہر، یہ صفات اس پر مستزاد ہیں۔

ان کا تعلق اعظم گڑھ کے ایک علمی اور مذہبی خانوادے سے ہے۔ ان کے والد گرامی مولوی محمد حسین انسپکٹر محمڈن سکولز یو۔پی کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ دادا مولوی ابوالحسن یار محمد افغانی بہار کے ایک دینی مدرسہ میں حدیث اور فقہ کے استاد تھے۔ چوکھا رنگ یوں ہی تو نہیں

سلہ استاد ملٹری کالج ۱۹۵۰ تا ۱۹۸۸ء

آجاتا۔ جو جیسا ہوتا ہے اس کی جڑیں بھی کہیں ہوتی ہیں۔

رشید صاحب دو بار ملٹری کالج میں رہے پہلی بار مارچ ۵۹ء سے جون ۶۱ء تک اور پھر فروری ۶۷ء سے دسمبر ۶۸ء تک پہلی پوسٹنگ کے دوران اورنگ زیب ہاؤس کے اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر اور دوسری تعیناتی کے عرصے میں اسی ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر رہے اور سکاؤٹنگ سمیت آرٹ، ہینڈی کرافٹ کے انچارج بھی تھے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ کبھی کالج سے گئے ہی نہیں تقریباً ہر بڑے فنکشن پر خاص طور سے کراچی سے آتے ہیں اور سال میں ایک آدھ چکر یوں بھی لگ جاتا ہے۔ یہ کالج ان کی رگ و پے میں ہے۔ یہاں سے بے شمار لوگ گئے ہیں لیکن وہ تنہا استاد ہیں جو اتنا زیادہ آنا جانا رکھے ہوئے ہیں۔ علوی صاحب مرحوم کے بعد وہ تنہا استاد ہیں جنہوں نے مجھے کالج کی ہسٹری، تذکرۂ شہدا، اور جرأتوں کے نشاں لکھنے میں بے انتہا مدد دی۔ مجھ پر ذاتی طور پر بھی ان کے احسانات ہیں۔ میں نے تعلقات نبھانے کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کی ایک دو مثالیں دیتا ہوں ۱۹۸۷ء میں کالج کے ایک پرانے ہیڈ کلرک حسن سے کبھی شکار کے سلسلہ میں یاد اللہ تھی۔ انہوں نے بیس برس کے بعد اپنے عزیز کی شادی پر بلایا تو کراچی سے شرکت کرنے آئے۔ گذشتہ اکتوبر ۸۷ء میں علوی صاحب مرحوم کی بڑی بیٹی کی شادی تھی۔ میں نے انہیں لکھا کہ کھانے کا انتظام کرنے آئیں تو وہ دو ہفتہ پہلے آئے۔ سارا کام نمٹایا اور بارات کی خاطرداری کی وہ الگ، اتنا تو اپنے عزیز بھی نہیں کرتے ۱۹۶۷-۶۸ء میں یہاں تھے کالج کے لڑکوں کے لیے آرٹ کلب چلاتے تھے۔ میرے بچوں نے دلچسپی ظاہر کی تو انہیں گھر پر آکر وقت دیتے تھے۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

جب تک یہاں رہے ان کا وطیرہ تھا کہ بڑوں سے ذرا فاصلے پر اور چھوٹوں سے قریب تر رہتے تھے بلکہ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ انہی نے اپنے آپ کو کبھی افسر نہیں سمجھا۔ مروّت اور اخوت کا جو برتاؤ اس وقت تھا وہی آج بیس سال کے بعد بھی ہے۔

ان کو کوئی کارِ خیر کی طرف اشارہ کردے وہ دل وجان سے شروع ہوجاتے ہیں۔ ہمارے عبدالستار ایدھی وہی ہیں۔

جو دوست اتنا اچھا ہو، انسان اتنا اچھا ہو، غمگسار اتنا ہو، دردمند اس قدر ہو وہ استاد کیسا

ہوگا۔ ہاؤس ماسٹر کیسا ہوگا؟ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وقت کے لحاظ سے وہ تھوڑے عرصہ یہاں رہے لیکن انہوں نے کالج کو بلا واسطہ اور بالواسطہ طور پر دیا بہت کچھ۔ میں بھی ان سے فیض پانے والوں میں سے ہوں۔ میرے کام میں علوی صاحب کے علاوہ جس ایک شخص نے عملی طور پر اور خلوص دل سے تعاون کیا ہے بلکہ احسان کیا ہے، وہ رشید صاحب ہیں۔ میں انہیں اپنا محسن سمجھتا ہوں۔ اب میرے ذریعہ سے وہ کالج کے کام آ رہے ہیں۔ ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ایسے برگزیدہ بندوں کا اجر بندوں کے پاس نہیں اللہ جل شانہٗ کے پاس ہوتا ہے۔ ان کے لیے میرے دل سے دعا نکلتی ہے۔

مسٹر رشید

—— لیفٹیننٹ کرنل اقتدار علی[1]

مسٹر عبدالرشید جو سگنلز میں کیپٹن کے عہدہ سے ریٹائر ہونے کی وجہ سے کیپٹن رشید کے نام سے بھی مشہور تھے نویں درجہ میں ہمیں ہسٹری پڑھاتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ جو پڑھاتے وہی ہر روز ہوم ورک کے طور پر دیتے جسے دوسرے روز ایک نظر دیکھتے بھی تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ہوم ورک کو میرے بہت ہی خراب ہینڈ رائٹنگ کی وجہ سے پڑھا نہیں جا سکتا تو مجھے حکم دیا کہ ہوم ورک کے علاوہ ہر روز فور لائن کی کاپی پر ایک صفحہ لکھ کر دکھایا کرو۔ یہ سزا میرے بہت کام آئی۔ اور میرا خط اس حد تک ضرور بہتر ہو گیا کہ امتحان پاس کر سکوں۔

—— چیف وارنٹ آفیسر فضل کریم

اسلامی تاریخ پڑھاتے تھے۔ اور یہ مضمون پڑھانے کے لیے وہ موزوں ترین آدمی تھے نہ صرف تاریخ کا مطالعہ اچھا تھا بلکہ اسلامی تاریخ سے جذباتی تعلق بھی رکھتے تھے۔ وہ جوش وجذبہ ہمارے دلوں میں بھی اتر تا رہتا تھا۔ ٹیپو سلطان کو بادشاہوں میں، شاہ ولی اللہ کو علماء میں اور سید احمد شہید کو مجاہدوں میں بہت مانتے تھے۔ جہاد کی سپرٹ اور آزادی کی تڑپ ان میں بہت تھی۔ اس سے لڑکے بھی متاثر ہوئے۔

تھے تو سویلین انسٹرکٹر لیکن چونکہ فوج میں کیپٹن رہ چکے تھے۔ پڑھانے کا انداز فوجی تھا۔ کلاس

---

[1] کالج نمبر ۲۵۱۰، زمانہ تعلیم ۵۸-۱۹۶۸ء

میں اپنے مخصوص انداز میں لڑکوں کی خاطر تواضع بھی کرتے رہتے تھے۔ "ہیں جی" ان کا تکیہ کلام تھا۔ اپنے آباؤ اجداد کی جرأت اور حمیت پر فخر کرنا اور مردوں کی طرح سزا کھانا انہی نے سکھایا۔

—— عرفان الرشید[1]

رشید صاحب نے ایک عرصہ ہوا سگنلز کور میں کیپٹن کے عہدہ سے فوج چھوڑ دی تھی لیکن ان کے اندر فوجی انداز اور فوجی طنطنہ باقی تھا۔ ہماری فوجی غیرت کو بھی پیار سے للکارتے رہتے تھے۔

یہ واقعہ ۱۹۷۰ء کا ہے۔ نویں درجہ میں رشید صاحب ہسٹری پڑھانے آئے۔ کسی وجہ سے کتاب پڑھانے کے بجائے سیلف سٹڈی کرنے کو کہا۔ چنانچہ کلاس نے کتابیں کھولیں اور خاموشی سے پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ میں نے اس دن میتھس کا ہوم ورک نہ کیا تھا۔ میتھس کے استاد کیپٹن (اب بریگیڈیئر) نیبر زمان تھے ان کا ہوم ورک نہ کرنا کوئی Afford کر ہی نہیں سکتا تھا چنانچہ میں نے چوری چوری میتھس کا ہوم ورک کرنا شروع کر دیا۔ رشید صاحب کی عقابی نظروں سے بچنا محال تھا فوراً میرے پاس آئے۔ "آپ ذرا کھڑے ہو جائیں جی" میں کھڑا ہو گیا۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں جی۔ سر میں.... میں نے جملہ پورا نہیں کیا تھا کہ ان کا ایک کرارا تھپڑ پڑ گیا۔ میں نے ذرا سا سر کو جھکایا۔ تو گرجے۔ آپ بہادروں کی اولاد ہیں جی۔ تن کے کھڑے ہوں جی، مردوں کی طرح تھپڑ کھائیں جی۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ دو تین تھپڑوں سے اور تواضع کی۔ اس بار میں تن کے کھڑا رہا۔ یہ ٹھیک ہے جی، شیروں کے بچے اس طرح تھپڑ کھاتے ہیں جی۔

آئندہ ہمارے پیریڈ میں ایسی جرأت نہیں کرنی ہے جی۔ ہمارا تھپڑ نیبر زمان کے تھپڑ سے کمزور نہیں ہے جی۔

اور میں گواہی دیتا ہوں کہ ہرگز نہیں تھا۔ اب جی چاہتا ہے کہ ان کے گھٹنے پکڑ کے معافی مانگوں کیا استاد تھے!! کندن بنا دیا!

—— کیپٹن نوشاد حمید[2]

تم گکھڑ ماجرہ ہے، فوجی کا بچہ۔ سیدھے کھڑے ہو جاؤ.... طالب علم غیرت میں آ کر سیدھا

---

[1] کالج نمبر ۳۲۷۱

[2] کالج نمبر ۳۹۴۴ بہ زمانہ تعلیم ۷۷-۱۹۷۲ء

کھڑا ہو گیا۔ پھر زوردار تھپڑ پڑا۔ آپ نے پہچانا یہ کون صاحب ہیں؟ "رشید صاحب؟" جی ہاں ٹھیک پہچانا آپ نے، یہ تاریخ کے استاد اپنے رشید صاحب ہی ہیں۔ یہ واردات شروع سالوں کی ہے۔ جوں جوں ہم سینیئر ہوتے گئے تھے تھپڑ بازی کم اور کردار سازی زیادہ ہونے لگی رشید صاحب نے ہماری فائٹنگ سپرٹ کو ابھارا اور مستحکم کیا۔ غیرت مندی ایسا ضروری سبق ہے جو رشید صاحب نے ہمیں دیا۔

——— کیپٹن مرزا محمد عطاء اللہ[1]

رشید صاحب کٹر پاکستانی تھے۔ تحریک پاکستان میں کام کیا تھا۔ ایک بار جب قائداعظم کشمیر سے آئے ہوئے تھے دینہ سے گزرتے تھے تو رشید صاحب نے بھی ان کی زیارت کی تھی اور ہاتھ ملایا تھا۔ یہ واقعہ وہ اکثر سناتے تھے پاکستان کی محبت سے انھوں نے ہمارے دلوں کو بھی گرمایا۔ ——اور ہاں جب جلال میں آتے تو فوجی کے بچے ہو جی ..... سینہ تان کے کھڑے ہو جاؤ۔ جی تڑاخ! تڑاخ! .... وہ سلسلہ بھی تھا۔

——— لیفٹیننٹ زاہد نسیم اکبر[2]

جب کسی لڑکے سے خوش ہوتے تو بے اختیار اسے گلے لگا لیتے۔ ناراضگی کی صورت میں تھپڑ بھی اسی بیساختگی سے پڑتا۔ وہ تحریک پاکستان کے پُرجوش سپاہی رہے تھے۔ ہندوؤں کے جبر و استبداد اور اس ظلم و ستم کی داستانیں جن کا نشانہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کو بنایا وہ بڑے جوش سے سنایا کرتے تھے ان کے اسلامی جذبے اور پاکستانی جذبے سے ہم سب متاثر ہوئے۔

جہاد ان کا خاص موضوع تھا۔ ایک روز جوش میں آکر کہنے لگے ایک روز ہمیں ہندو سے حساب چکانا ہے۔ وہ ہمیں چین سے نہ رہنے دے گا۔ دیکھو، جب تم میدان جنگ میں ہندو کے سامنے کھڑے ہو تو عبدالرشید کی عزت کا خیال رکھنا عبدالرشید نے تمہیں پڑھایا ہے۔

——— لیفٹیننٹ ساجد شکور[3]

رشید صاحب نے یکم دسمبر ۱۹۸۱ء کو اپنی ریٹائرمنٹ کی الوداعی تقریب پر جو پرجوش اور پُر درد اختتامی تقریر کی تھی اس نے ہمارے خونوں میں بجلیاں دوڑا دی تھیں۔ خوش قسمتی سے ۸۳-۱۹۸۲ء

---

[1] کالج نمبر ۳۶۷۵، زمانہ تعلیم ۷۹-۱۹۷۴ء [2] کالج نمبر ۴۲۸۴ [3] کالج نمبر ۴۳۲۲

کے تربیت میں علوی صاحب نے اس تقریر کے اقتباسات شائع کیے تھے۔ میں اس سے دو ٹکڑے نقل کرتا ہوں:

"میرے بہادر بچو۔ ہم دلاوروں کی اولاد ہیں۔ سو پشت سے پیشۂ آباء سپہ گری ہے۔ ہم سینہ پر زخم کھانے والے ہیں۔ پیٹھ پر زخم کھانا ہمارا شعار نہیں۔

میرے سپوتو۔ یہ پاکستان، یہ منزل مراد، یہ کشور حسین، یہ پرچم ستارۂ ہلال اب تمہارے حوالے ہے۔ دیکھو یہ جھنڈا ہمیشہ اونچا رہے، خبردار اس پر آنچ نہ آنے پائے۔ قائد اعظم نے کہا تھا اور میں بھی تم سے یہی کہتا ہوں اس لیے کہ تم پر میرا حق ہے۔ اس مملکت خداداد کے لیے اسلام کے اس قلعہ کے لیے اگر جنگ لڑنی پڑے تو پیچھے نہ ہٹنا۔ سینے پر زخم کھانا ہتھیار کبھی نہ ڈالنا، ہوا، سمندر اور خشکی پر جنگ جاری رکھنا۔ یہ اس لیے کہ پاکستان ہے تو ہم بھی ہیں اور ہم ہیں تو پاکستان ہے"

مسٹر توقیر افضل ڈیمانسٹریٹر

——— لیفٹیننٹ کرنل اعجاز رفیع

توقیر صاحب اورنگ زیب ہاؤس میں ہمارے ہاؤس ٹیوٹر تھے۔ اور سپورٹس کے انچارج بھی ۱۹۶۰-۶۱ء کے سیشن میں ہم نے ان کی ولولہ انگیز رہنمائی میں، آؤٹ ڈور سپورٹس کی کامیاب شیلڈ اور ان ڈور گیمس کی ناردرن آرمی شیلڈ بڑے مارجن سے جیتی۔ کامیاب شیلڈ اس سال کا کالج بیٹر جیتنے میں بہت معاون ہوئی۔

لڑکوں کی عمر کھیلنے کی ہوتی ہے۔ وہ پریکٹس کر کے اکتا جاتے لیکن توقیر صاحب کو چنگ کرتے کرتے تھکتے نہیں تھے اور نہ اکتاتے تھے۔ ان مقابلوں کے لیے وہ صبح شام اس طرح جان لڑا کر پریکٹس کراتے تھے جیسے خود ان کے کیریر کی بازی لگی ہوئی ہو۔

سکاؤٹنگ میں بھی ان کی خاصی دلچسپی تھی۔ جون ۱۹۶۰ء میں خانس پور میں جو بین الاقوامی ٹریننگ کیمپ ہوا اس میں ایم سی ٹروپ کی کامیابیوں میں پھر اسی سال والٹن میں منعقدہ تیسری ورلڈ جمبوری میں ہمارے سکاؤٹس کی شاندار کارکردگی میں توقیر صاحب کی پس پردہ کاوشوں کا بڑا دخل تھا۔ اس وقت تو ہم ان کے ہمدردانہ اور دوستانہ رویے اور سپورٹس کے لیے ان کے جوش وجذبے ہی سے متاثر تھے لیکن اب تقریباً تیس برس کے بعد جب کبھی ان کی یاد آتی ہے

تو ساتھ ہی دل میں ان کے لیے Respect اور Regard کی ایک نئی لہر اٹھتی ہے۔ نہ وہ ہاؤس ماسٹر تھے اور نہ سکاؤٹنگ کے انچارج۔ اقتدار و اختیار میں کام کرنے کا اپنا Incentive ہوتا ہے انہوں نے Subordinate ہوتے ہوئے Lime-light سے جس طرح دور رہ کر ذوق سے بلکہ Involve ہو کر دن رات کام کیا وہ انہی کا حصہ تھا۔ وہ کالج میں بہت تھوڑا عرصہ رہے۔ بظاہر Status بھی آفیسرز سے کم تھا لیکن ان کی یاد بڑوں بڑوں سے زیادہ ہمارے دلوں میں تازہ ہے۔ کالج میں مسٹر توقیر کی توقیری سے اور چند دوسروں کی بے توقیری سے میں نے یہ سبق سیکھا کہ آخر کار انسان اپنی پوزیشن سے نہیں اپنی پرفارمنس سے پہچانا اور تولا جاتا ہے۔ میں مسٹر توقیر کی خاموش خدمتوں کو سلام کرتا ہوں۔

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد ذوالفقار ارشد تمغۂ بسالت[1]

چونکہ ۱۹٦۰ء میں کالج میں داخلے کے وقت میرے پاس پہلے سے فرسٹ کلاس سکاؤٹ کا بیج تھا اس لیے مجھے آتے ہی ایم سی ٹروپ کا ایک پٹرول لیڈر مقرر کر دیا گیا تھا خانس پور کے سکاؤٹنگ کیمپ میں ایم سی ٹروپ کی ٹریننگ میں مجھے مسٹر توقیر کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ ان کی شخصیت من موہنی تھی۔ بڑے خلوص سے اور محنت سے کام کرتے تھے اور بڑے پیار سے کام کرواتے تھے۔ اورنگ زیب ہاؤس اس زمانے میں جونیئر ہاؤس تھا۔ ہر سال کے "نوگرفتار" خوب پھڑکتے تھے۔ ۱۹٦۰ء میں بھی اس دور سے میں بھی گزرا۔ توقیر صاحب اکثر کیڈٹوں کے ساتھ گھنٹوں ٹیبل ٹینس کھیلتے۔ بلکہ کھلاتے اور یوں ہمارا دل بہلاتے۔ ان کی حیثیت ہمارے لیے ایک غمخوار کی سی تھی اس عمر میں یہ بھی ایک ضرورت تھی جسے توقیر صاحب نے پورا کیا۔

کچھ عرصہ بعد وہ دیارِ غیر چلے گئے۔ برمنگھم سے مجھے بڑے مزے مزے کے خط لکھتے رہے۔ منجملہ اور باتوں کے کئی خطوں میں لکھا کہ ذوالفقار! یہاں سب کچھ ہے زندگی کی تمام آسائشیں ہیں لیکن پاکستان پھر پاکستان ہے۔ اپنے دیس کی یاد بعض اوقات دل کو تڑپا دیتی ہے۔

کاش ہمارا سسٹم ایسا ہوتا کہ ہمارے گوہرِ شب چراغ غیروں کے بام و در کو روشن کرنے پر مجبور نہ ہوتے۔

---

[1] کالج نمبر ۲۵٦۱ زمانہ تعلیم ٦۵-۱۹٦۰ء

لیفٹیننٹ عبد الغفور

——— سی ڈبلیو اے فضل کریو

غفور صاحب جو فوج سے کرنل کے عہدہ میں ریٹائر ہوئے، کو فی البدیہہ تقریر کرنے میں کمال حاصل تھا۔ ۶۲-۱۹۶۰ء کے عرصہ میں جب میں کالج میں زیر تعلیم تھا غفور صاحب پرانے لیکچر ہال میں ہر ہفتہ صبح سویرے کلاس شروع ہونے سے پہلے اسلامی تاریخ اور قرآن وحدیث کی روشنی میں پانچ منٹ کی تقریر کرتے تھے۔ ایسے برجستہ حوالے دیتے کہ ہم حیرت زدہ رہ جاتے ان کی خطابت اور قابلیت دونوں سے ہم متاثر ہوئے۔

کلاس میں اسلامیات وہ ہمیں اسلامی تاریخ خاص طور پر برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ کے حوالے سے پڑھاتے تھے اور عموماً تان پاکستانیت پر ٹوٹتی۔ اپنے زمانہ طالب علمی میں انہیں علامہ اقبال سے نیاز حاصل رہا تھا۔ ایک روز بتایا مجھے علامہ کی بگھی کھینچنے کا شرف حاصل ہے ایک روز برسبیل تذکرہ یہ حیرت انگیز واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ علامہ کی میکلوڈ روڈ کی کوٹھی پر ہم چند طلبار علامہ کی خدمت میں حاضر تھے کہ علی بخش نے قریب آکر سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا کہ فلاں صاحب ملاقات کے لیے اندر آنا چاہتے ہیں (یہ صاحب غالباً یونینسٹ پارٹی کی کوئی بہت بڑی چیز تھے) ان کا نام سنتے ہی (چونکہ وہ حضرت مسلم لیگ کے خلاف کام کر رہے تھے) علامہ کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا اور کہا۔ اس سے کہہ دو یہ اقبال کا گھر ہے سوروں کا باڑہ نہیں۔ (اقبال کے اصل الفاظ تھے "اونھوں کہہ دیو ایہہ اقبال دا گھر اے سوراں دا باڑہ نیئں") سر کا خطاب یافتہ یہ صاحب، بڑے صاحب اختیار تھے۔ جب اقبال کا انتقال ہوا انھوں نے اقبال کے شاہی مسجد کے دامن میں دفن ہونے کی بڑی مخالفت کی لیکن مسلمانوں کے جوش وخروش کے آگے حکومت کو جھکنا پڑا۔

— ہو سکتا ہے کہ اس واقعہ میں کچھ مبالغہ بھی ہو لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ غفور صاحب کی پُرجوش پاکستانیت سے ہم میں بھی پاکستانیت کا جذبہ ابھرا اور مستحکم ہوا۔

نومبر ۱۹۶۰ء کے سالانہ کنسرٹ کے موقع پر اقبال کی شاہکار نظم شکوہ کو غفور صاحب نے ایک تابلو کی صورت میں پیش کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس آئٹم کے اعلان کے بعد ہال کی ساری بتیاں بجھا دی گئیں۔ پھر ایک شمع جلی جس کے پس منظر میں ایک مسجد کا مینار تھا۔ پھر ایک گھمبیر

آوازا بھری۔

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں | فکر فردا نہ کروں، محو غم دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں | ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو | شکوہ اللہ سے خاکم بدھن ہے مجھ کو

پھر آہستہ آہستہ سٹیج پر روشنی آنی شروع ہوئی۔ اور پھر اس بند:

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر | کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر
خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر | مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام تیرا | قوت بازوئے مسلم نے کیا کام تیرا

سے ڈرامائی پیشکش شروع ہوئی۔ میں وہ قلم کہاں سے لاؤں کہ اس طلسماتی تمثیل کی تصویر کھینچوں — اس شب اردو انگریزی کے بہت اچھے ڈرامے بھی دکھائے گئے لیکن محفل کو غفور صاحب کی اس پیش کش نے لوٹ لیا۔

کمال صاحب

——— ونگ کمانڈر ارشد نواز[1]

کمال صاحب کا پورا نام مصطفٰے کمال تھا اور اتا ترک مصطفٰے کمال سے اپنی اسی نسبت پر فخر کرتے تھے۔ چونکہ ان کے اندر بھی حریت کی تڑپ تھی اسلام کی عسکری روح کا اظہار ان کو علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک میں نظر آیا تھا۔ چنانچہ ایک عرصہ تک وہ بہت فعال خاکسار رہے تھے اور اس وقت بھی جب ہم ان سے پڑھتے تھے۔ ان میں خاکساری تھی۔ خدمت، قومی اور اسلامی جذبہ کی حد تک عوامی مزاج پایا تھا تحریک پاکستان کے زمانہ میں جلسہ جلوس بہت دیکھے اور نکالے تھے ان کا ذکر اکثر کرتے تھے لڑکے ان کے خلوص اور کام کی لگن سے بہت متاثر تھے۔ ان کے جوک بھی اتنے عام فہم ہوتے تھے کہ لڑکے ان کو بہت انجوائے کرتے تھے۔ خوش ہوتے یا ناخوش ہوتے تو ہر بار کسی نئے نام سے پکارتے تھے۔ جس کی جدت پر ہم سب ہنس پڑتے۔ مونگ پھلی کا چھلکا۔ آم کی گٹھلی، انار دانہ کے خطابات سے اکثر نوازتے۔

اپنے کام کے ماہر تھے۔ کرافٹس کے شعبہ کو انہوں نے زندہ کر رکھا تھا۔ پورٹریٹ بھی خوب

---

[1] کالج نمبر ۲۵۸۹۔ زمانۂ تعلیم ۶۴۔ ۱۹۵۹ء

بناتے تھے۔

——— میجر وجاہت حسین

یہ جون ۱۹۷۱ء کا واقعہ ہے گھوڑا گلی جانے سے پہلے کالج کے سکاؤٹس مشق کے طور پر اپر جہلم کینال کے بائیں کنارے دوسرے کیٹل برج کے اس پار کیمپ کر رہے تھے۔ حکم تو سختی سے تھا کہ نہر کے کنارے تک کوئی نہ جائے لیکن ایک لڑکا اسلم رومال دھونے نہر کے کنارے اترا تو سنبھل نہ سکا اور پھسل کر نہر میں گر گیا۔ بچاؤ بچاؤ کی چیخ پکار پڑی تو کمال صاحب نے جو غالباً نماز کی تیاری کر رہے تھے۔ بمع کپڑوں کے نہر میں چھلانگ لگا دی اور اسلم کو ہاتھ پر اٹھا کر نہر سے نکال لائے۔

کمال صاحب ہیوی ویٹ تھے۔ آرٹ اور ہنڈی کرافٹس کے ماہر، بے حد دلچسپ انسان ہزاروں قصے کہانیاں یاد تھیں۔ بچے ان سے بہت خوش رہتے تھے۔ اس زمانہ میں ڈرائینگ اختیاری مضمون تھی۔ جو لڑکے ڈرائینگ نہ بھی پڑھتے وہ بھی منہ کا مزہ بدلنے کے لیے کبھی کبھی ان کی کلاس میں جا بیٹھتے تھے۔ ماہیے سے لے کر شاہ نامے تک، تحریک پاکستان کے معرکوں سے لے کر شیر کے شکار کی داستانوں تک وہ رواں رہتے تھے۔ ایک روز ہم نے پوچھا کہ سر آپ کی صحت کا راز کیا ہے۔

"ایک آسمانی نسخہ ہے۔"

"وہ کون سا؟"

"ترپھلا۔ ہندوؤں کے ویدوں میں ہڑ بہیڑہ آملا کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ یہی ترپھلا ہے۔ جو بندہ صبح سویرے ترپھلا پھانکتا ہے اس کی بینائی خراب نہیں ہوتی۔ قبض نہیں ہوتا اس سے دل کا مرض نہیں ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ اس دن پورا گھنٹہ وہ جڑی بوٹیوں کے خواص پر ہی باتیں کرتے رہے۔ اس دن انہوں نے سانپ کے کاٹے کا تریاق بھی بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ ناگن کے انتقام کی ایسی ایسی داستانیں سنائیں کہ ہمارا خون خشک ہونے لگا۔

ایک ادارہ میں ہر طرح کے مخلص آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

کیپٹن غلام سرور

——— کرنل اخلاق احمد

سرور صاحب جو بعد کو فوج میں کرنل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے اور ایک مصنف اور مبصر کی حیثیت سے بہت نام پایا۔ ان چند استادوں میں سے تھے جو نصاب سے ہٹ کر بھی کچھ بتاتے رہتے تھے۔ چوں کہ ان کی کلاس میں دستور زبان بندی بھی نہیں تھا اس لیے ہم ان سے سوال جواب بھی کرتے رہتے تھے۔ ایک روز برسبیل تذکرہ توحید اور رسالت پر کچھ اظہار خیال کیا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر ان سے ایک غیر متوقع سوال پوچھ لیا۔ وہ اس وقت تو خاموش رہے۔ پیریڈ ختم ہونے کے بعد مجھے بلا کر پوچھا "کیا تم وہابی ہو؟" میں نے کہا نہیں، چونکہ آپ نے کہا ہوا ہے کہ سوچا کرو اور سوال پوچھا کرو۔ اس لیے میں نے وہ سوال پوچھا تھا۔ فرمایا۔ اگرچہ سوال غلط تھا لیکن تمہاری اپیروچ ٹھیک ہے۔ افلا تعقلون، افلا تفکرون اور افلا تدبرون قرآن ہی کے احکامات ہیں" یہ دوسرا واقعہ ۱۹۶۲ء کا ہے۔ ایف ایس۔ سی کے سالانہ امتحان قریب تھے۔ ہم نے ان سے فرمائش کی سر، آج یہ نہیں وہ سبق پڑھائیں۔ کہنے لگے۔ نہیں۔ ہر چند کہ یہ کتاب پڑھانے مدت ہوگئی ہے۔ لیکن میں بغیر تیاری کے نہیں پڑھاتا یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ اگر آپ لوگوں کا یہ سبق پڑھنے کو جی نہیں چاہتا تو آج سیلف سٹڈی کرلیں۔ لیکن بغیر تیاری کے پڑھاؤں یہ نہیں ہو سکتا پھر وہ پانچ منٹ تک بڑی تیز و تند انگریزی میں اس اصول کی وکالت کرتے رہے۔

——— کمانڈر عبدالسلام قدوس

۱۹۶۷ء کا واقعہ ہے ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان قریب تھا۔ کورسز ختم ہو چکے تھے ہم چاہتے تھے کہ ہم فری ہو کر اپنے طور پر تیاری کریں۔ بعض اساتذہ نے یہ رعایت دے بھی دی تھی لیکن ہمارے انگریزی اور اردو کے مشترکہ استاد کیپٹن (اب کرنل ریٹائرڈ۔ اُردو اور انگریزی کے مشہور و معروف مصنف) غلام سرور مصر تھے کہ ساری کلاس اکٹھی ہو اور وہ ہم سب کو Collective Revision کرائیں۔ مارچ کا مہینہ ہو فضا پُر فضا ہو کالج کی گراؤنڈز کی گھاس مخملیں ہوگئی ہو، درختوں پر نکھار ہو۔ کالج کی باؤنڈری اس پار گنے کے ساتھ ساتھ

گندم کے کھیتوں کی ہریالی اور پھولی ہوئی سرسوں کے پیلے پیلے پھول بھی نظر آرہے ہوں اور عمر کا یہ کافر حصہ ہو تو ہم کیسے سائنس ہال کی چار دیواری میں بیٹھ کر سرور صاحب کی کلاس اٹنڈ کریں۔

بہر حال سرور صاحب پھر سرور صاحب تھے۔ انہوں نے باتوں باتوں میں (Casually) کہا۔ آپ لوگوں کو معلوم ہے آئین سٹائن کو گنتی نہیں آتی تھی۔

آئن سٹائن جیسے ریاضی دان کو گنتی نہیں آتی تھی؟ ہم حیرت سے بولے۔ جی ہاں یہی تو بتانے جا رہا ہوں آپ لوگ ذرا بیٹھیں تو سہی۔

جب کلاس جمی تو سرور صاحب نے کہا کل میں ریڈرز ڈائجسٹ میں پڑھ رہا تھا کہ آئن سٹائن ایک بار ایک اومنی بس میں سفر کر رہے تھے۔ جب بس کنڈیکٹر نے انہیں ٹکٹ کے ساتھ بقایا ریزگاری واپس کی جناب آئن سٹائن نے ریزگاری گنی اور یہ کہہ کر واپس کر دی کہ کچھ سینٹ کم ہیں۔ کنڈیکٹر نے ریزگاری ان کے سامنے دوبارہ گنی رقم ٹھیک تھی۔ اس نے حیرت سے کہا: "اولڈ مین تمہیں گنتی نہیں آتی"

سرور صاحب نے کہا یہ واقعہ بالکل سچا ہے اصل میں جینئس کی توجہ کا ارتکاز (Concentration) اتنی اونچی چیزوں پر ہوتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزیں آوٹ آف فوکس ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ آئن سٹائن کی پڑوسی بچی کا ہے۔ جو کے جی کلاس میں پڑھتی تھی ایک روز دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ اور کہا انکل مجھے یہ سوال سمجھا دیں اور غریب آئن سٹائن کو مشکل پیش آ گئی کہ بچی کو سوال کیسے سمجھائیں۔ سوال سمجھا دینے سے بچی کا مطلب تھا کہ سوال نکال دیں یا حل کر دیں۔ اسی طرح انہوں نے اور بڑے آدمیوں کے دلچسپ واقعات سنائے سرور صاحب کا انداز بیان اتنا دلچسپ تھا کہ ہم محو ہو کر یہ سب کچھ سنتے رہے۔ آخر میں کہا بھئی ایسا کریں کہ یہ گنتی والا قصہ انگریزی میں تو لکھ ڈالیں پھر جو دکھاتا جائے چھٹی کرتا جائے۔

ایک مرتبہ سرور صاحب غالب کی غزل:

ابن مریم ہوا کرے کوئی   میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

پڑھا رہے تھے اور بڑے موڈ میں تھے (ہم سمجھتے تھے کہ وہ صرف اقبالی ہیں لیکن وہ تو

غالبی بھی نکلے) ہم نے کہا سر یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ شعر نہ کہتے ہوں۔ جو شعر نہ کہتا ہو وہ غالب کو اس طرح نہیں پڑھا سکتا۔ بہرحال جب ہمارا اصرار بڑھا تو انہوں نے کہا۔ جو اس وقت یاد آرہا ہے۔ سنائے دیتا ہوں۔

اے ستارو کہاں کی ٹھانی ہے کس طرف کو رواں ہو تم

آؤ تم کو کچھ پلا لائیں کتنے کمزور ناتواں ہو تم

لڑکوں نے مکرّر کی صدا لگائی تو یہ قطعہ انہوں نے کئی بار پڑھا۔ اور آخری بار کچھ ترنم سے بھی لطف آگیا۔ اس دن سرور صاحب کا کچھ ایسا موڈ بنا تھا کہ جب ہم نے کچھ سنانے کی ضد کی تو انہوں نے یہ شعر سنائے۔

زندگی کی اداس راہوں پر اک دیا اب بھی ٹمٹماتا ہے

اے تمنا اسے بھی گل کردے ڈھل چکی رات اب کون آتا ہے

یہ واقعہ تقریباً پچیس سال پہلے کا ہے لیکن حیرت ہے کہ وہ ماحول، وہ منظر، وہ ان کا شعر سنانے کا انداز اپنی پوری جزئیات کے ساتھ آج بھی میرے تخیل میں تازہ ہے۔ استاد ایسا ہوتا ہے سرور صاحب کلاسیکی استادوں کی طرح ایک ایک لمحہ اپنے شاگردوں کی تعلیمی ترقی کے لیے صرف کرتے تھے اگر سبق گھنٹہ ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے بھی ختم ہو جاتا تو وہ کچھ نہیں تو دو نئے لفظ ہی بورڈ پر لکھ دیتے کہ ان کے معنی تلاش کرو۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ سرور صاحب اقبال کے بڑے دلدادہ تھے۔ اقبال کا بہت سا کلام زبانی یاد تھا۔ سنانے پر آتے تو سناتے ہی چلے جاتے۔ اور پھر اشعار کی تشریح میں وہ وہ نکتہ آفرینیاں کرتے کہ حیرت ہوتی۔

اس وقت ان کے پڑھائے ہوئے دو شعر از خود شعور کی سطح پر ابھر آئے وہی لکھتا ہوں۔

ترے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالین ہیں ایرانی لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے وہ کیا تھا زور حیدر، فقر بوذر و صدق سلمانی

ان اشعار سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کس زاویے سے ہمیں پڑھاتے ہوں گے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل سید افتخار حسین شاہ ؎

کیپٹن سرور علوی صاحب اور راشد صاحب کی طرح نصاب کو وسیع تر پس منظر میں پڑھاتے تھے۔ ہمارا ان سے ذہنی رابطہ تھا۔ کتاب کی بات ہو یا کتاب سے باہر کی ہم ان سے بے تکلفی سے پوچھ سکتے تھے اور وہ کمال توجہ سے اس کا جواب دیتے تھے۔ مجیب کے چھ نکات ہوں یا ویت نام کی جنگ، یا معاہدۂ تاشقند، نپولین کی ذاتی زندگی ہو، خیام کی رباعیات، یا منصور حلاج کی صدائے انا الحق، وہابی تحریک یا پان اسلام ازم، ہپی ازم ہو یا بیل باٹم پتلونوں کا رواج، محبت کی شادی یا جنریشن گیپ، غرض دنیا جہاں کے موضوعات پر ان سے بے جھجک بات کی جا سکتی ہے۔

لیفٹیننٹ احسان الحق

——— چیف وارنٹ آفیسر فضل کریم

احسان صاحب پاک فضائیہ میں بطور پائلٹ اپنی تربیت کو آخری مراحل میں چھوڑ کر آرمی ایجوکیشن کور میں شامل ہوئے تھے۔ ٹیپو ہاؤس کے انفارمیشن روم کو انہوں نے جدید خطوط پر استوار کیا۔ کوئز بورڈ وغیرہ پہلے پہل انہی نے بنوائے تھے۔ ہمارے ساتھ فٹ بال وغیرہ بھی کھیلتے تھے۔ بہت Straightforward تھے۔ لگی لپٹی بالکل نہیں رکھتے تھے دل کے کھرے زبان کے کھرے۔ جتنی ڈپلومیسی کی نوکری میں ضرورت ہوتی ہے وہ اس کے بھی قائل نہیں تھے۔ نہ جانے کرنیلی تک کیسے پہنچے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو صرف اپنے کام کے سہارے آگے بڑھتے ہیں۔

یہ واقعہ غالباً وسط ۱۹۷۷ء کا ہے میں پشاور سی۔ ایس۔ ڈی کے سپر شاپ پر کسی کام سے گیا تو کیا دیکھا کہ میجر احسان صاحب اپنی بیگم کے ساتھ وہاں کچھ خریداری کر رہے ہیں میں دوستوں کے ساتھ دروازہ کے قریب کھڑا ہو گیا کہ جب ادھر سے گزریں گے تو نیاز حاصل کروں گا۔ دوستوں نے پوچھا کون صاحب ہیں میں نے بتایا یہ میجر احسان الحق ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں میرے فزکس کے استاد تھے۔ اور اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر بھی۔ انہوں نے کہا تم نے تو پہچان لیا وہ بھی

؎ کالج نمبر ۲۸۰۲ زمانہ تعلیم ۶۷-۱۹۶۳ء

نہیں پہچان سکیں گے ؟ میں نے کہا شاید، کچھ اتا پتہ بتانا پڑے۔ بہرحال جب وہ پاس سے گزرنے لگے تو میں نے سیلوٹ کیا۔ وہ رک کے غور سے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا تعارف کراتا بولے ۲۵۳۷، فضل کریم ہو؟ ڈپو ہاؤس کے ؟ میڈیکلی ڈسچارج ہوئے تھے ؟ میں نے عرض کیا جی فضل کریم ہی ہوں۔ بہت خوش ہوئے۔ پھر انہوں نے یاد دلایا کہ جگو ہیڈ پر جب ہاؤس پکنک کے لیے گیا تھا تم نے ریت میں کس کو دبایا تھا ؟ تم نوائے ڈپو کے ایڈیٹر تھے نا ؟ اب کیا کر رہے ہو ؟ فضائیہ کی ایجوکیشن برانچ میں ؟ " بڑا اچھا ہے "

— اچھا گھر چلو، بیٹھ کر آرام سے گپ شپ کریں گے۔ چونکہ مجھے ڈیوٹی پر واپس جانا تھا میں نے معذرت چاہی۔

جب میں ڈیوٹی پر واپس جا رہا تھا تو میں نے فخر سے دوستوں کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھا کیا خیال ہے میرے استاد کے بارے میں ؟

میجر رحمان

——— لیفٹیننٹ کرنل اقتدار علی[۱]

فزکس کے استاد میجر رحمان کا سراپا بھی پہلی نظر میں Impress کرتا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، چہرے کے خدوخال ابراہام لنکن کے سے اس فرق کے ساتھ کہ ان کا چہرہ بھرا بھرا تھا۔ چوڑا چکلا سینہ گہرا سانولا رنگ، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے مائیکل انجیلو نے گرے نائٹ پتھر سے ایک دیو قامت مجسمہ تراشا ہے جس میں جان پڑ گئی ہے۔ ایک مصنف نے لکھا ہے کہ بعض لوگ شکل وقامت سے وی سی (وکٹوریہ کراس) لگتے ہیں۔ رحمان صاحب کو دیکھ کر یہی گمان ہوتا تھا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ چٹانوں سے تراشا ہوا یہ انسان اندر سے بہت سافٹ (Soft) اور دردمند تھا۔ لڑکے انہیں دیکھ کر خواہ مخواہ ڈرتے تھے لیکن ان کا مزاج جارحانہ نہیں تھا۔ ۱۹۶۴ء میں میرے والد نیپال کی پاکستان ایمبیسی میں پوسٹ تھے۔ چھٹیوں میں مجھے نیپال جانا تھا۔ شیڈول کچھ ایسا تھا کہ مجھے کالج میں گرمائی چھٹیاں ہونے سے دو دن پہلے جانا تھا۔ ایک ہفتہ پہلے میں نے رحمان صاحب کو صورت حال سے آگاہ کیا اور ساتھ یہ بھی بتایا

---

[۱] کالج نمبر ۲۵۱۰ زمانہ تعلیم ۶۳-۱۹۵۸ء

کہ اس امر کی درخواست میرے والد نے کمانڈانٹ کو بھیج دی ہوگی۔ جانے سے پہلے کی شام کو میں نے انہیں یاد دلایا کہ سر مجھے کل جانا ہے۔ درخواست کا کیا ہوا۔ دو ایک لمحہ کو خاموش رہے پھر کہا۔ درخواست کا دیکھا جائے گا۔ تم کل کلاسز کے بعد چلے جانا۔ چنانچہ میں کلاسز کے فوراً بعد لاہور کے لیے روانہ ہو گیا لاہور سے مجھے کراچی اور وہاں سے نیپال فلائی کرنا تھا۔ جب میں ماموں خورشید عالم کے گھر پر پہنچا تو وہ حیران ہوئے۔ افتخار تمہیں چھٹی کیسے ملی؟ یہاں تو درخواست واپس آئی پڑی ہے۔ کمانڈانٹ نے "نو" لکھا ہوا ہے۔ ہم تو بڑی فکر میں پڑ گئے تھے جہاز کی سیٹ بک ہو چکی تھی۔ میں ابھی کمانڈانٹ کو کال بک کروائے بیٹھا تھا۔ ظاہر ہے کہ رحمان صاحب نے مجھے اپنی ذمہ داری پر بھیجا تھا۔ پھر کمانڈانٹ سے ان کا جو ٹاکرہ ہوا ہوگا اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

اس زمانہ میں رحمان صاحب کے ہم قد دو اور استاد کیپٹن (اب بریگیڈیئر) حامد رضا صدیقی اور کیپٹن (اب بریگیڈیئر) محمد علی چغتائی بھی تھے۔ اور ایک تیسرے چھوٹے قد دوہرے جسم کے استاد لیفٹیننٹ اجمل فاروقی تھے۔ ان چاروں کا آپس میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ شام کو اکثر ایک ساتھ نکلتے اگر رحمان صاحب اور صدیقی صاحب کے بیچ میں اجمل فاروقی صاحب خراماں ہوتے تو لڑکوں نے اس ٹرائے او (Trio) کا نام 101 رکھ چھوڑا تھا۔ اور اگر فاروقی صاحب کے بجائے تینوں Longfellows سیر کو نکلتے تو وہ ٹرپل ون 111 کہلاتے۔

میجر محمد عارف چوہان

——— ڈاکٹر زبیر خورشید[1]

۷۹-۱۹۷۷ کے دوران جب میں ایم جی ہاؤس میں تھا تو ایم جی ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر میجر (بعد میں لیفٹیننٹ کرنل) چوہان صاحب تھے۔ جیسا کہ مشہور تھا سخت ضرور تھے لیکن کھرے اور صاف دل انسان تھے۔ پہلے ہی دن چند سینئرز کو سخت سزا دی لیکن دل میں نہیں رکھا جب انہوں نے ہاؤس ٹیک اوور کیا تو ہاؤس کا ماٹو ورک از ورشپ (Work is Worship) تھا انہوں نے اپنے ایڈریس میں کہا۔ یہ اچھا ماٹو ہے لیکن اس میں غزنویت نہیں ہے۔ جوش نہیں

---

[1] کالج نمبر ۳۸۸۸، زمانہ تعلیم ۷۹-۱۹۷۶ء

ہے جو غزنویوں میں ہونی چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے ہاؤس ماٹو بدل کر Strive till Death رکھ دیا۔ سپورٹس میں بھی کھرے تھے۔ ہم سے کہہ رکھا تھا کہ ہاؤس سپرٹ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ My House right or wrong یہ غلط بات ہے۔ ایک اور بات مجھے یاد ہے کہ رمضان میں شام کو ہاؤس میں آتے تھے۔ اور عصر کی نماز کی امامت کرتے تھے۔

کیپٹن محمد بشیر

——— لیفٹیننٹ کرنل اعجاز رفیع[1]

ان کے سلور گرے بالوں نے ان کی ظاہری شخصیت کو بھی پرکشش بنا دیا تھا۔ ان کا Treasure Island پڑھانے کا انداز نہیں بھولتا۔ ہم لوگ کلاس میں سحرزدہ بیٹھے ہوتے یوں جیسے ہم ہی Jim Hawkins ہیں جنہیں John Silver بے رحمی سے Chase کر رہا ہے۔ ان کی آواز میں تاب و توانائی آنکھوں میں عقابی تیزی اور خیالات میں قوم پرستی کی جھلک تھی۔ تھوڑے عرصے رہے لیکن اثر چھوڑ گئے۔

——— ھارون رشید

۱۹۶۴ء میں ٹیپو ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر تھے۔ قدرے سن رسیدہ ان کے سلور گرے بال انہیں بہت پُروقار بناتے تھے۔ چونکہ ان بالوں کے نیچے ایک غیر معمولی دماغ بھی تھا اس لیے ان کی شخصیت بہت پُرکشش تھی۔ وہ تاریخ اور انگریزی پڑھاتے تھے اور کامل عبور کے ساتھ لیکن میرے دل کے گوشہ میں ان کی یاد کا جو چراغ جل رہا ہے، وہ اس وجہ سے ہے کہ وہ بہت فراخدل استاد تھے۔ کلاس میں میرے الٹے سیدھے سوالوں کو نہ صرف برداشت کرتے بلکہ مزید حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ ہاؤس میں بھی میری عجیب حرکتوں میں صرف وہ کوئی روشن پہلو دیکھ سکتے تھے۔ مثلاً ایک روز میں رات کے پریپ کے لیے یکایک اٹھا اور آنکھوں پہ پٹی باندھ کر یہ تجربہ کرنے لگا کہ دیکھوں بینائی سے محروم افراد اردگرد کی چیزوں کو کیسے محسوس کرتے ہیں اس تجربے سے پریپ کی خاموشی کے دوران جو ہنگامہ ہو سکتا تھا وہ ہوا۔ اتفاق سے بشیر صاحب

---

[1] کالج نمبر ۲۵۸۱ زمانۂ تعلیم ۱۹۶۴

ڈیوٹی پر نھے لڑکوں نے ان سے شکایت کی۔ انہوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ اس کو کچھ نہ کہو یہ فلسفی ہے۔ بشیر صاحب نے ٹیپو سلطان ہاؤس کی نسبت کو صحیح سمجھا اور سمجھایا۔ ٹیپو کا مشہور قول انگریزی اردو میں کئی جگہ لکھوا رکھا تھا ہاؤس فنکشن پر کئی بار ٹیپو کے کردار اور کارناموں کو موضوع گفتگو بنایا۔

ایک ادو بات ان کی آنکھوں میں ذہانت کی جو غضب کی چمک تھی، وہ بھی انکی انفرادیت کو ابھارتی تھی۔ اقبال نے مسولینی کی آنکھوں کی چمک کو شعاع آفتاب کہا ہے۔ یہ شعاع آفتاب میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھی۔

فضل حسین صاحب ویٹر

—— میجر عبدالرشید اے ای سی

آفیسرز میس کے ایک گوشہ میں بھی ایک چراغ تھا جس کو چراغوں کی قطار میں جگہ ملنی چاہیئے فضل میس ویٹر، دبلا پتلا، دراز قد، سفید براق شلوار، سفید پگڑی اور سفید پی ٹی شوز، میں نے فضل کو جب بھی میس جاتے ہوئے یا باہر آتے دیکھا اسے صاف ستھرے دیکھا باوقار لباس میں دیکھا۔ عام طور پر میس دیٹرز وغیرہ ضرورتاً یا حکماً ڈیوٹی پر صاف ستھرا لباس پہنتے ہیں۔ فضل طبعاً اور عادتاً پہنتا تھا۔ (بلکہ پہنتے تھے ہیں اس شخص کے لیے بڑے احترام کے جذبات رکھتا ہوں اس لیے جی چاہتا ہے قصداً الفاظ بھی احترامی استعمال کروں) مجھے بار بار فضل لکھتے ہوئے ندامت ہوتی ہے غالباً پورا نام فضل حسین ہو گا۔ یہ بھی کمزوری ہمارے معاشرہ کی روایتی کمزوری ہے کہ ہم کلاس سوم چہارم کے ملازمین کے پورے نام بھی نہیں جانتے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ہم ان کو صرف کام کی جاندار مشین سمجھتے ہیں۔ جو شخصیت یا ذاتی تشخص سے عاری ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

جناب فضل کی خاموش شائستگی اور متین مسکراہٹ کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ جو منچلے نوجوان افسروں کی بعض غیر ذمہ دارانہ باتوں یا حرکتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے چہرے پر آجاتی تھی۔

دیٹروں کا کام ہی ایسا ہے کہ جس میں کھانے پینے کی چیزوں سے ہر وقت واسطہ پڑتا

رہتا ہے میں نے ککُ عبدالرحمٰن کی طرح جس کا ذکر علیحدہ کیا ہے فضل کو بھی کبھی کوئی چیز کھاتے یا پیتے یا کچن میں بلاوجہ گھستے ہوئے نہیں دیکھا۔ کوئی افسر فضل کو دامے، درمے کسی اور طرح سے ٹپ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص حد درجہ خوددار ہے۔ میس ویٹر کا کام اس لحاظ سے مشکل ہوتا ہے کہ ہر افسر یہی چاہتا ہے کہ پہلے اسے سرو کیا جائے اور پہلے اس کی فرمائش پوری کی جائے۔ خصوصاً وہ جو دوسروں سے سینئر ہو تو وہ سروس بھی سینئر مانگتا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی فضل نے افسروں سے ایک طرح کی انڈرسٹینڈنگ کی ہوئی تھی کہ آپ بُرا نہ منائیں کام سب کا ہوگا لیکن باری باری۔

میں نے صرف فضل کو ایک بار جلال میں دیکھا۔ ایک نئے افسر نے کچھ زیادہ صاحب بننے کی کوشش کی اور کچھ نامناسب رویّہ اختیار کیا تو فضل نے صاف کہہ دیا۔ سنبھل کر بات کریں دوسروں کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔ فضل ایسے خدمت گزار جو نہ صرف اپنے کام کو اچھی طرح جانتے اور کرتے ہوں بلکہ اچھے اور باوقار انسان بھی ہوں ایک تعلیمی ادارہ کے لیے خاص طور سے ایک نعمت ہوتے ہیں۔

نورحسین

میجر عبدالرشید اے ای سی[1]

نورحسین چپراسی کے ذکر کے بغیر کالج کے چراغوں کی داستان نامکمل رہ جائے گی۔ دنیا کا دستور کچھ ایسا ہے کہ وہ انسان کے کام کو اس کے منصب کے حوالے سے تولتی ہے۔ اگر منصب بڑا تو چھوٹا کام بھی بڑا اور اگر منصب چھوٹا تو بڑا کام بھی چھوٹا۔ میں اس اصول کا قائل ہوں کہ انسان کی اصل بڑائی کام میں ہے۔ مقام میں نہیں۔ نورحسین چپراسی تھا۔ چپراسی کا بھی کوئی کام متعین تو ہوتا ہے اس کا بھی ضرور ہوگا لیکن میں نے تو اسے صبح شام اتنا مصروف اور اتنے مختلف النوع کام کرتے ہوئے دیکھا کہ مجھے آج تک علم ہی نہیں ہو سکا کہ اس کا اصل کام کیا تھا۔ جس کا جو کام اٹکا ہوتا وہ آتے جاتے نورحسین کو آواز دیتا اور اس کو کام بتا دیتا۔ بہانہ کیا جائز انکار بھی اس نے نہ سیکھا تھا۔ صبح سویرے جگو ہیڈ سے سائیکل پر آتا اور مغرب کے

---

[1] کالج نمبر ۲۲۱۴، زمانہ تعلیم ۶۴-۱۹۵۸ء

وقت واپس جانا اس کا معمول تھا۔ میں اور قدوس صاحب مرحوم اکاؤنٹنٹ شکار کے سلسلہ میں اکثر اس کے گاؤں کے پاس سے گزرتے تھے اس کا مسلسل اصرار ہوتا کہ ہم اس کے گھر آئیں اور کچھ کھائیں پیئیں۔ گو پیسہ کم تھا لیکن دل فراخ تھا۔

نور حسین کا بیٹا اصغر کالج میں پڑھتا تھا اور نگ زیب ہاؤس کا پریفیکٹ اور کالج کے بہت برائٹ لڑکوں میں سے تھا۔ (آج ماشاء اللہ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہے) نور حسین نے از خود کبھی اصغر کا ذکر نہ کیا۔ (نہ سفارش کے طور پر اور نہ فخر کے طور پر) اور جب میں نے اور کسی نے اس کی تعریف کی تو ہمیشہ کالج کا شکر گزار ہوا، خاص طور پر کرنل رفیق کا جنہوں نے اسے داخل کیا تھا۔ انسان کی عزت اس کے کام سے ہوتی ہے۔ یاد بھی وہی آتا ہے جو یاد کیے جانے کے قابل ہو۔ موت سب فاصلے مٹا دیتی ہے اور ایک نیا امتیاز ابھرتا ہے دیانت داری اور خلوص سے اپنا کام کرنے کا امتیاز نور حسین اپنے کام میں آج بھی زندہ ہے۔

خوشاشب خاں گیٹ کیپر

محمد رفیق

خوشا شب خاں گیٹ کیپر کو میں زیادہ نہیں جانتا لیکن ایک ہی واقعہ نے لڑکوں میں اسے ہیرو بنا دیا۔ یہ واقعہ یوں سنا ہے کہ جنرل یحییٰ جن دنوں سی۔ جی۔ ایس تھے ان کا بیٹا علی آغا یہاں پڑھتا تھا۔ وہ کھاریاں جاتے ہوئے ایک روز گیٹ پر آئے۔ خوشا شب خان نے گیٹ بند رکھتے ہوئے باہر آکر پوچھا صاحب، کس سے ملنا ہے۔ انہوں نے فرمایا اپنے بیٹے علی آغا سے۔ خوشا شب نے فوراً سیلوٹ مارا۔ صاحب آج ملاقات کا دن نہیں۔ آپ لڑکے سے نہیں مل سکتا۔ یحییٰ خاں نے کہا ٹھیک ہے۔ اور ڈرائیور کو اشارہ کیا کہ گاڑی کمانڈانٹ کے بنگلہ کی طرف موڑے۔ وہاں سے انہوں نے کمانڈانٹ کو فون کیا اور اپنے بیٹے کو گھر پر بلا لیا۔ جاتے وقت جنرل یحییٰ نے پچاس روپے انعام کے طور پر خوشا شب خاں کو بھیجے۔

یہ واقعہ ۱۹۶۱ء کا ہے۔ انہی دنوں ہم نے مولوی عبدالحق کا لکھا ہوا ایک خاکہ نور خان چوکیدار پڑھا تھا۔ نور خاں نے اورنگ آباد دکن کے قلعہ میں ایک مقام پر جہاں سگریٹ پینا منع ہے کی تختی لگی تھی وائسرائے ہند کو سگریٹ سلگانے سے روک دیا تھا۔ اور یہ دیکھ کر نظام دکن

سناٹے میں آ گئے تھے۔ جب یہ خوشا شب کا واقعہ ہوا تو علوی صاحب کا سنایا ہوا ایک شعر یاد آیا

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

عبدالرحمٰن کک

—— میجر عبدالرشید[1]

۱۹۵۹ء میں، جب میں کالج میں آیا تو مفلس تھا۔ (کراچی والوں کی اصطلاح میں مفلس اسے کہتے ہیں جو مجبوراً یا قصداً بغیر بیوی بچوں کے رہتا ہو) اس لیے میس کا مقدر ٹھہرا تھا میس میں پہلی ملاقات عبدالرحمٰن سے ہوئی۔ حد درجہ شائستگی اور خلوص سے پیش آیا۔ انداز میں میس ویٹرانہ کوئی بات نہیں تھی۔ چند روز گزرے تو پتہ چلا کہ یہ شخص جسے میں میس ویٹر سمجھا تھا میس کا ہیڈ کک تھا۔ میس حوالدار، اسسٹنٹ میس سیکرٹری یعنی ہمہ تن میس ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا مجھے عبدالرحمٰن کے گوناگوں کمالات کا علم ہوتا گیا۔ مجھے جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس کا رکھ رکھاؤ اور پر تمکنت رویہ تھا۔ خدمت اور نوکری میں اس نے واضح خط بھی کھینچا ہوا تھا۔ اس کی بددماغی بھی اس کے کمال فن اور کمال دیانت کا خراج تھی۔ وہ کام کرتا تھا خدمت کرتا تھا لیکن ٹیڑھی بات یا ٹیڑھے رویے کا روادار نہ تھا۔ اس لیے افسرانہ مزاج کے افسر اس سے نالاں بھی رہتے تھے۔ لیکن میں اس کی اس وقت بھی قدر کرتا تھا۔ اور آج بھی کرتا ہوں۔ جب میں ۱۹۶۷ء میں دوبارہ پوسٹ ہوا تو عبدالرحمان کو قدرے نرم پایا۔ اس کے رویے میں بزرگانہ انداز آ گیا تھا۔ نوجوان افسروں کو تنہائی میں سمجھا بھی دیا کرتا تھا۔ صاحب ذرا روک کر خرچ کیا کیجیے۔ احتیاط سے خرچ کرنا اچھا ہوتا ہے۔

میں نے اپنی تعلیمی زندگی کا سفر الٰہ آباد یونیورسٹی سے شروع کیا تھا۔ ۱۹ برس فوج کی نوکری کی، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ملٹری کالج کو اس لحاظ سے میں نے منفرد پایا کہ یہاں پر ہر سطح پر ایک سے ایک گوہر نایاب پایا۔

---

[1] استاد ملٹری کالج، زمانہ ۵۹-۶۱ - ۶۷-۱۹۶۸ء

مسٹر سیموئیل سوئیپر

—— ڈاکٹر محمد سرفراز عالم[1]

شیر شاہ ہاؤس میں سعید راشد صاحب اور آنٹی کے علاوہ ایک اور شخصیت کا کردار بھی مثالی تھا۔ یہ ہاؤس کا سوئیپر سیموئیل تھا۔ اس قبیل کے لوگ عموماً ندیدے یا کام چور ہوجاتے ہیں لیکن سیموئیل ان کمزوریوں سے بلند تھا۔ نئے لڑکوں کے پاس کھانے پینے کی بے شمار چیزیں آتی تھیں اور سامنے پڑی رہتی تھیں۔ کیا مجال ہے کہ یہ بندہ ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے۔ اگر کوئی لڑکا کچھ دینا بھی چاہتا تو کہہ دیتا۔ یہ آپ کے بیبے ہے، آپ کھائیں تھینک یو۔ صبح سویرے ہاؤس کیپٹن کی سیٹی کی آواز سن کر چاروناچار اٹھنا ہی پڑتا تھا۔ اس کے بعد جو آواز ہمارے کانوں میں پڑتی تھی وہ ڈارمیٹری میں سیموئیل کی جھاڑو کی آواز تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ ہاؤس کیپٹن کی سیٹی کی آواز کا انتظار کر رہا ہوتا کہ وہ بج چکے تو میں اپنا کام شروع کروں۔ بارش ہو یا طوفان ہم پی ٹی پر جائیں یا نہ جائیں۔ سیموئیل وقت پر اپنی ڈیوٹی پر موجود ہوتا تھا۔ اس کا لباس اور سراپا بھی ٹھیک ٹھاک ہوتا تھا اور Self Respect رکھتا تھا۔

ایک بار صاحب زاد کل ڈارم میں لڑکے لڑ رہے تھے۔ سیموئیل شام کی صفائی کرنے آگیا ہم میں سے کسی نے کہا، "چچا، سر کو نہ بتانا۔ اس نے فوراً جواب دیا اگر آپ لوگ لڑیں گے اور نقصان کریں گے تو ضرور بتاؤں گا۔"

ایک آدھ بار میں نے اسے ہاؤس سے گزرتے ہوئے رک کر رات آٹھ بجے کی اردو خبریں بھی سنتے ہوئے دیکھا۔ سر نے ہاؤس بوائے (سخی محمد) اور ہاؤس سوئیپر کو چھانٹ کر رکھا تھا۔ شیر شاہ ہاؤس میں ہر بندہ لاجواب تھا۔ اور یہ سب اہتمام ہماری تربیت کے لیے تھا۔

—— پروفیسر سعید راشد

سیموئیل کہنے کو تو سوئیپر تھا اور کام بھی یہی کرتا تھا لیکن انسان بہت اونچا تھا اس نے خاکروبی کے کام کو جس ذمہ داری، وفاداری اور معیار سے کیا اس نے معزز بنا دیا تھا ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۸ء تک جو لڑکے شیر شاہ ہاؤس میں رہے ہیں یا جن افسروں کا اس سے واسطہ پڑا ہے، وہ

---

[1] کالج نمبر ۳۹۰۳، زمانہ تعلیم ۷۹-۱۹۷۶ء

جب کالج کو یاد کرتے ہیں تو ان یادوں کے ہجوم میں ایک روشن یاد سیموئیل سویئیپر کی بھی ہوتی ہے۔ ذمہ داری کا یہ عالم تھا کہ اس کے جو اوقات کار مقرر تھے۔ اس کی پابندی گھڑی دیکھ کر کرتا تھا۔ مثلاً سہ پہر کو ۳ بجے سے ۵ بجے تک اسے ہاؤس میں فٹیگ یعنی کھرپے سے صفائی کا کام کرنا ہوتا تھا۔ بڑے بڑے سخت موسم میں وہ وقت پر کام شروع کرتا تھا اور وقت پر کام ختم کرکے چھٹی کر لیتا تھا۔ صرف کام کے شروع میں پوچھتا تھا کہاں کام کرنا ہے۔ یا خود بتا دیتا تھا وہاں کام کرنے جا رہا ہوں۔ اس ذمہ داری، دیانت داری اور جانفشانی سے مسلسل کام کرنے کا نتیجہ یہ تھا کہ شیر شاہ ہاؤس صفائی کے اعتبار سے کالج کا مستقل طور پر ہمیشہ بہترین ہاؤس رہا اس وقت ہاؤس میں روم بوائے بھی ایک ہوتا تھا اور ہاؤس کا علاقہ بھی خاصا وسیع ہے جو آگے پیچھے سے ہر وقت آنے جانے والوں کی نظر میں رہتا ہے۔

جو اپنے کام کو جانتا ہے اور اسے شوق سے کرتا ہے تو اس میں Self Respect کے علاوہ Self-pride بھی آجاتی ہے اور غالباً انہی وجوہ سے وہ کام بھی اس طرح اور اس معیار سے کرتا ہے۔ سیموئیل بھی اسی وجہ سے خوددار اور کچھ تنک مزاج تھا۔ ایک دوبار ایسا ہوا کہ میں نے اس علاقہ میں جو شیر شاہ ہاؤس اور کیفیٹیریا کے درمیان ہے، صبح اس کو ایک کام بتایا سہ پہر کو جا کر کچھ اور بتا دیا تو اس نے قدرے پُر ادب ناراضگی سے کہا۔ سر پہلے آپ سوچ لیا کریں کہ کہاں کام کرنا ہے۔ بیچ میں کام چھوڑ دینے سے کام نہ نظر آتا ہے نہ اسے کرنے میں مزہ آتا ہے۔"

ایک بار وہ ہاؤس کے علاقہ میں کام کر رہا تھا کہ سنٹر کے حوالدار میجر نے اسے کسی کام کرنے کو کہا۔ اس نے کہا میجر صاحب برائے مہربانی میں ہاؤس ماسٹر کے انڈر کام کرتا ہوں آپ پہلے ان سے کہیں وہ جہاں کہیں گے وہاں کام کروں گا۔ اسے یہ سننے کی تاب کہاں۔ اس نے دھمکی دی میں تمہاری پیشگی کرادوں گا۔ اس نے کہا وہ جو چاہے آپ کرائیں میں نے کام سے انکار نہیں کیا صرف صاحب سے اجازت لینے کو کہا ہے۔ اگر کل میرا تبادلہ سنٹر میں ہو گیا تو آپ کے حکم کے مطابق چلوں گا۔ اس وقت صاحب کو بھی جواب یہی دوں گا۔ جو آج آپ کو دے رہا ہوں۔ اس کا اس قسم کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے ٹاکرہ کئی افسروں سے بھی ہوا۔ کام کرنے والے کو سب پہچانتے

ہیں اور اس کی قدر کرتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں اس کے ایک قدرداں افسر کچھ دنوں کے لیے
ایبٹ آباد سی۔آئی بنے تو اس کا تبادلہ اپنے بنگلہ پر کروالیا۔ اس دن جاتے وقت اس نے
افسردہ ہوکر کہا "حکم حاکم ہے۔ سر میں اپنی خوشی سے نہیں جا رہا۔" پھر ہوا یہ کہ حالات اس قسم
کے پیدا ہوئے کہ سیموئیل دوبارہ شیر شاہ ہاؤس کو مل گیا۔ ارباب اقتدار سے میری دلیل یہی تھی
کہ ہاؤس کے بچوں کو ایک ذمہ دار، باوفا، صاف ستھرا ڈسٹ بین چاہیے۔ (ہاؤس میں اس
کا نام سیموئیل ڈسٹ بین تھا) اس کے کپڑے اور حلیہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے یا کسی اور نے
معیار سے کم پایا ہو۔

اس کی ذمہ داری کی دو ایک مثالیں دوں گا۔ صبح پی ٹی کے وقت ڈارمیٹریوں کی صفائی
شروع کرتا تھا۔ اگر کوئی چھوٹا لڑکا کسی تکلیف کی وجہ سے وقت پر نہ اٹھا ہو یا کسی نے رات کو
قے کی ہو یا اس قسم کی کوئی اور پرابلم ہو تو سب سے پہلے وہی مجھے یا میری بیگم کو آ کر بتاتا تھا
کہ فلاں ڈارم میں یہ پرابلم ہے۔ ایک بار ایک لڑکے نے انگیٹھی میں پیشاب کر دیا تھا۔ اس کو معلوم
ہو گیا تھا کہ اس لڑکے کا نام کیا ہے لیکن اس نے مجھے نہیں بتایا۔ اور صرف یہ کہا رات کو ڈارم
اندر سے بند ہوتی ہے۔ رات کو بچوں کو پیشاب آئے تو کیا کریں آپ اس کا بندوبست کریں۔

ایک اور واقعہ اس کی وفاداری کا یاد آ گیا ۶۶-۱۹۶۰ء کے عرصے میں جب شیر شاہ ہاؤس
جونیئر ہاؤس کی حیثیت سے قائم نہیں ہوا تھا تو میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے لڑکے اپنے فائنل
امتحان کے زمانے میں مہینے دو مہینے کے لیے یہاں آکر رہتے تھے اور فری ہونے کی وجہ سے
کبھی کبھار مستیاں کرتے تھے ایک روز اس نے مجھے آکر بتایا کہ آئینہ والی ڈارم (بعد کو علم الدین
شہید) کے لڑکے فرنیچر کے ٹکڑے انگیٹھی میں جلا رہے ہیں۔ ہاؤس کی ہر چیز پر اس کی نظر
رہتی تھی تاکہ کوئی چیز ضائع نہ ہو۔ ہاؤس کے سٹور میں مچھر دانی لگانے کے لیے لوہے کی سلاخیں
پڑی تھیں جن پر لوگوں کی نظر رہتی تھی۔ وہ ایک ایک سلاخ کا حساب رکھتا تھا۔

ہمارے گھر کے پیچھے اور سامنے پھلوں کے بے شمار درخت تھے آم، امرود، پپیتا، شہتوت،
جامن، انار، آڑو اور لوکاٹ لیکن مجال ہے کہ نیچے گرا پھل بھی اٹھا کر اس نے منہ میں رکھا
ہو یا جھولے میں ڈالا ہو۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ اس کے حوالے سے بھی ہاؤس کے

لڑکوں کے سامنے کام کا اور کردار کا ایک معیار تھا۔

سیموئیل کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ اور کلاس فوروں کی درخواستیں وغیرہ لکھ لیا کرتا تھا۔ اس حلقے میں وہ ماسٹر کے نام سے معروف تھا۔ واقعی اس کے ماسٹر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس نے اپنی ذات اور کام سے بچوں کو بہت کچھ سکھایا اور شاید بعض "بڑوں" سے زیادہ سکھایا میں اس کی یاد۔ کو سیلیوٹ کرتا ہوں۔

صوبیدار عبدالرشید

—— میجر ظفر اقبال[1]

۶۹-۱۹۶۷ء میں شیر شاہ ہاؤس کے اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر تھے۔ دسمبر ۶۷ء میں ہاؤس کا پہلا بڑا فنکشن اس ہال میں ہوا تھا جس میں آج کل آرٹ گیلری ہے۔ اس کی تیاری میں انہوں نے راشد صاحب کی بڑی مدد کی تھی۔ ڈائریکشن اور سکرپٹ راشد صاحب کا تھا۔ پورے فنکشن کو پروڈیوس عبداللہ صاحب نے کیا تھا۔ شروع کے چند سالوں میں شیر شاہ ہاؤس کا اپنا میس نہ تھا سر سید ونگ کے لڑکے "اے" میس میں اور اقبال ونگ کے لڑکے "بی" میس میں جاتے تھے۔ ان کے ساتھ اکثر عبداللہ صاحب بھی جاتے تھے۔

وہ ان بہت قیمتی لوگوں میں سے تھے جو پس پردہ خاموشی سے بہت ضروری خدمات انجام دیا کرتے ہیں۔ شیر شاہ ہاؤس کو ابتدائی سالوں میں بنانے کا ان کا بڑا ہاتھ تھا۔

آر پی حوالدار خان بہادر

—— میجر پی وین خالد بابر

شیر شاہ ہاؤس تو ۱۹۶۷ء میں بنا تھا لیکن اس کا میس ۱۹۷۲ء میں جاری ہوا۔ اس سے پہلے یہ ایک عرصے سے کباڑ خانے کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ اور بند پڑا تھا۔ راشد صاحب میس کے سامنے کھڑے اسے صاف کروا رہے تھے کہ اتنے میں آر۔ پی حوالدار خان بہادر صاحب وہاں آ گئے۔ کہنے لگے سر، ویسے تو آپ بہتر جانتے ہیں لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ باورچی خانے اور ڈرائینگ ہال کو فنائل سے دھلوا کر چونا کروانے سے پہلے کم از کم ایک ہفتہ کھلا چھوڑ دیجئے گا۔ کھڑکیاں

[1] کالج نمبر ۲۹۷۰، زمانہ تعلیم ۷۲-۱۹۶۷ء

دروازے سب کھلے ہوں۔ ہوا اور روشنی نیچرل Purifier ہے۔
خان بہادر صاحب نے اصرار کرکے ہاؤس کے باہر کچرے کے لیے ایک ڈرم رکھوایا۔
ایک روز میں نے دیکھا کہ تربوز کا ایک حصہ جو لانگری کی غلطی سے ڈرم سے باہر پھینک دیا تھا
انہوں نے خود اٹھاکر اندر ڈال دیا۔

ایک دن شام کے کھانے کے بعد میں سک رپورٹ کے ایک لڑکے کو لے کر اسپتال
جارہا تھا، راستہ میں خان بہادر صاحب مل گئے۔ پوچھا کیا بات ہے۔ میں نے بتایا کہ اس لڑکے
کے پیٹ میں درد ہے۔ وہ کچن میں آئے اور لانگریوں سے کہنے لگے آپ لوگ صفائی کا خیال
رکھا کریں یہ بچے، ہمارے بچے ہیں۔ ابھی بچے کے پیٹ میں درد تھا۔ پانی چیک کریں، برتن
چیک کریں۔ میں آر۔پی خان بہادر کی یہ باتیں نہیں بھول سکتا۔ وہ ان بہت قیمتی لوگوں میں
سے تھے جو اپنے کام سے اور انسانوں سے محبت کرتے ہیں اور اسی لگن میں رہتے ہیں۔
لیڈرشپ کا ایک بہت قیمتی سبق جناب خان بہادر ہی سے سیکھا بڑائی عہدے سے نہیں
کام سے ہوتی ہے۔ میں اس گمنام اور کم مرتبہ کارکن کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔

میجر محمد الیاس

——— شاہد احمد بلہٹہ پی سی ایس

میں نے اپنی زندگی کا سفر کالج میں ۱۹۶۷ء میں شیر شاہ ہاؤس سے شروع کیا تھا۔ اس کا
اس وقت، اور تو سب کچھ تو ٹھیک تھا لیکن اس کا اپنا میس نہ تھا اس لیے کھانے کے لیے
اقبال ونگ کے لڑکے اے میس میں اور سرسید ونگ کے لڑکے بی میس جاتے تھے فاصلے اور موسم
کی سختیوں کے علاوہ بھی ایک سنگین تر مسئلہ تھا۔ وہ یہ کہ اکثر سینئر ہاؤسوں کے بھائی جان
کی سنیارٹی کھانے کی میز پر بھی رنگ دکھاتی تھی۔ صبح کا بریک خاص طور پر اس کا نشانہ بنتا تھا بہر حال
جو ملتا وہ چپکے سے کھاکر واپس آجاتے۔ ہر چند کہ ہمارا اپنا افسر بھی ہمارے ساتھ جاتا تھا۔ لیکن
صورت حال میں زیادہ فرق پڑتا۔ یہ سلسلہ مارچ ۱۹۷۱ء تک چلا۔ یہاں تک کہ میں ہاؤس میں
دوبارہ ہاؤس پریفکٹ کی حیثیت سے آگیا۔ مارچ کے اواخر میں بہار کی چھٹی جانے سے
چند دن پہلے سر راشد نے بتایا کہ لو بھئی شاید تمہارا آنا مبارک ہو، ہاؤس کا اپنا میس کھل رہا ہے

اپنا میس ! حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پھر انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ ایسا کیونکر ممکن ہوا۔ فرمایا میں تو اپنی سی برسوں سے کر رہا تھا۔ لیکن یہ کامیابی اورنگ زیب ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر میجر الیاس صاحب کی وکالت سے ممکن ہو سکی انہوں نے کمانڈانٹ کو بالآخر اپنے مشاہدات سے Convince کر ہی لیا: بچوں کو علیحدہ میس کی اشد ضرورت ہے۔

سر راشد کے بتانے پر یاد آیا کہ الیاس صاحب اکثر شیر شاہ کی چار میزوں پر خاص طور پر جاتے تھے اور وہاں بیٹھ کر کھانا چیک کرتے تھے۔

سر راشد صاحب نے ایک روز مجھ سے کہا، شاید میرا دل چاہتا ہے کہ ہاؤس کے اس محسن کے نام کی تختی میس میں لگوا دوں۔ میں نے بڑے ہاؤس ماسٹروں کو اپنے ہاؤس کی حمایت میں دوسروں کے حقوق کو نظر انداز کرتے دیکھا ہے۔ ایک ہمارے شاہ صاحب ہیں کہ دوسرے ہاؤس کے بے زبان بچوں کے کام آئے۔ وہ بھی خاموشی سے پس پردہ۔

مجھے سر راشد نے بتایا کہ الیاس شاہ کے والد گرامی بزرگوار صوبیدار سید عالم شاہ صاحب ۳۰ میں یہاں استاد تھے۔ ۷۰ میں الیاس صاحب نے یہاں پڑھایا۔ ان کے بیٹے ہارون نے یہاں پڑھا۔ کالج سے تین نسلوں سے تعلق رکھنے کا امتیاز اور اعزاز شاید کسی اور کو حاصل نہ ہوا ہوگا۔

کرنل ظہور الحق

——— مسٹر محمد ایوب خان

ظہور صاحب ۱۹۶۹ء میں چیف انسٹرکٹر ہو کر آئے تو انہوں نے ایک بہت اہم اور ضروری تاریخی کام یہ کیا کہ انہوں نے کالج کی Functioning کے ہر پہلو پر مفصل ہدایات (Instruction) نکالنے کا سلسلہ شروع کیا۔ تدریس، تربیت، امتحانات، نصابی، اہم نصابی سرگرمیاں سپورٹس غرض کالج کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس کے بارے میں انہوں نے ضوابط و قواعد مرتب نہ کیے ہوں یا مروجہ ضوابط و قواعد کو ضبط تحریر میں نہ لائے ہوں۔ یہ بہت بڑا کام تھا جو کوئی قلم کا دھنی ہی کر سکتا تھا۔ یہ SOPS کی سرخ کتاب ان کے دور کا بہت قیمتی سرمایہ ہے جو کالج کی تاریخ کا ایک حصہ بننا چاہیے۔ تاریخ پر یاد آیا کہ ان کا ذہن تحقیقی اور تخلیقی تھا۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں انہوں نے شعبہ تحقیق و ترقی کھولا۔ اور اس کے دائرہ کار کو بہت وسیع رکھا۔ اس شعبہ کے تحت

میں نے ان کے ایما سے کالج کی ایک مختصر تاریخ ملٹری کالج کے پچاس سال (Fifty years of Mil. College) کے نام سے مرتب کی جو نومبر ۷۵ء میں کالج کی گولڈن جوبلی کے موقع پر شائع ہوئی۔ ظہور صاحب کو کالج کا نیا ترانہ لکھوانے اور کمپوز کروانے کا کریڈٹ بھی جاتا ہے۔ کالج کا پرانا ترانہ انگریزی میں تھا۔ ضروری تھا کہ کالج کا ترانہ عام فہم اردو میں ہو اور کالج کے تشخص کو ابھارنے کے ساتھ ساتھ قومی امنگوں اور Ideals کی ترجمانی بھی کرے۔ یہ ضرورت ایک حد تک ترانے

علم کی شمعوں سے روشن ہیں ہر کیڈٹ کی راہیں
ذہن منور، ہستی آنکھیں، اور فولادی بانہیں

سے پوری ہوتی ہے۔ اس ترانے کا گراموفون ریکارڈ بھی جوبلی پر ریلیز کیا گیا تھا۔ جوبلی ہی پر راشد صاحب کی دو کتابیں From School to College اور Steps towards Maturity بھی آر اینڈ ڈی نے چھپوائی تھیں۔ پھر آئندہ سالوں میں تو ریسرچ سیل کی کتابوں کا تانتا بندھ گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ راشد صاحب کو سیل کا ڈائریکٹر بنانا بھی ظہور صاحب کے کریڈٹ کے کھاتے میں جاتا ہے۔ انہوں نے ان کے اندر کے محقق اور مصنّف کو ڈھونڈ نکالا۔ اور اس کو ایک فورم مہیا کیا۔ کالج میں بزم ادب کا خیال سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کرنل ظہور کی نظر تعلیم کے وسیع تر مقاصد تھی۔ یہ بزم کوئی کاغذی چیز نہیں تھی جس سے نمائشی کام لیا جانا مقصود ہو۔ اس بزم کے اجلاسوں میں مجھ جیسے عزلت گزیں نے بھی شرکت کی اور مبارک احمد ابن الحسن، ضمیر جعفری جیسے شعرا اور صدیق سالک اور کرنل محمد خاں جیسے ادبا کے کلام بلاغت نظام یا افکار عالیہ سے مستفیض ہوا۔ ان کے دور میں ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے کالج کے انتظام و انصرام اور تربیت کا مرکز اپنی ذات کو نہیں بنایا بلکہ اس کو Decentralise کیا دوسروں پر اعتماد کرنے اور مرکزی پالیسی کے فریم ورک ان کے Initiative کی حوصلہ افزائی کرنے کے نتائج اچھے برآمد ہوئے وہ قدر دان بھی بہت تھے۔ شاید باہر کے لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ انہوں نے علوی صاحب اور راشد صاحب کی خصوصی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اعترافی شیلڈیں بھی ان حضرات کی

خدمت میں نذر کی تھیں۔ آخر میں، میں ایک اور صورتحال ریکارڈ پہ لانا چاہتا ہوں کہ جب جے سی بی شروع ہوئی اور فیصلہ یہ کیا گیا آئندہ وائی کیڈٹس، جے سی بی ایم اے جایا کریں گے کالج کو کالج کے درجہ سے کم کر کے صرف میٹرک تک محدود کرنے کی تجویز سامنے آئی تو ظہور صاحب نے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل غلام حسن کو Convince کر کے ایک خط سی او اے ایس کو لکھوا کر اس تجویز کو اگر ختم نہیں تو ملتوی کروایا اور کالج اپنے کالج سیکشن کو برقرار رکھ سکا۔

میجر غلام عباس

——— کیپٹن شوکت چاندنہ[1]

میجر غلام عباس بنیادی طور پر کیمسٹری کے استاد تھے اور اس مضمون پہ ماہرانہ نظر رکھتے تھے لیکن ان کی انگریزی بھی لاجواب تھی۔ وہ کئی سال کالج کے میگزین تربیت کے انگریزی سیکشن کے ایڈیٹر رہے۔ انگریزی میں ان کا بڑا مطالعہ تھا۔ ۷۵-۱۹۷۴ء کے تربیت کے لیے مجھے ان کے معاون کے طور پہ کام کرنے کا موقع ملا۔ ایک مرحلہ پہ مضامین کے نیچے خالی جگہوں کو پُر کرنے کا سوال آیا تو انھوں نے برٹرنڈ رسل کی کتاب ایجوکیشن اینڈ سوشل آرڈر پر چند نشانات لگا کر مجھے دیئے تم خود پڑھو اور ان کو مناسب جگہ پر فٹ کر دو۔ ان اقتباسات کی حیثیت چھوٹے چھوٹے خیال انگیز مضمونوں کی سی تھی۔

غلام عباس صاحب اپنے چہرے مہرے سے بھی سکالر نظر آتے تھے۔ جب ان سے پڑھنا شروع کیا تو محسوس ہوا جیسے کوئی یونیورسٹی پروفیسر ہمکلام ہے۔ ان کی گھمبیر علم سے شخصیت میں جو گہرائی آجاتی ہے۔ وہاں کی چال ڈھال بات چیت کے انداز، اور رویے میں تھی۔ ایک آدھ بار میں نے انہیں جلال میں بھی دیکھا۔ اس وقت ان کی انگریزی میں تیزی اور لہجے میں قدرے تندی آجاتی تھی۔ کاش انہیں تاحیات ملٹری کالج کے لیے پابند کر لیا جاتا۔ اس علم اور شخصیت کے استاد روز روز کہاں ملتے ہیں۔ پبلک سکولوں کو ایسے استادوں کی ضرورت ہوتی ہے جو کیمسٹری کی زبان میں ذہنی Catalyst کے طور پہ کام آئیں۔ سلسلہ روز شب

---

[1] کالج نمبر ۳۴۵۰

کے غبار میں ملٹری کالج کی بہت سی یادیں دھندلائی جاتی ہیں لیکن ایک ستارہ صبح سے جو ذہن کے افق پر اسی تابناکی سے جھلملاتا ہے۔ یہ امیج جناب غلام عباس کی ہے۔

نومبر ۱۹۷۹ء میں اپنی یونٹ سے پنڈی آیا تو وہاں آرمی سنٹرل لائبریری میں لیفٹیننٹ کرنل غلام عباس کو بحیثیت لائبریری آفیسر دیکھا۔ کتابوں میں گھرے ہوئے بیٹھے تھے۔ لوگ باگ کتابیں لے دے رہے تھے۔ لیکن شاید انہیں خبر نہیں تھی کہ یہاں سب سے قیمتی کتاب وہ صاحب کتاب ہے جو دور ایک گوشہ میں محو مطالعہ ہے۔

بریگیڈئر اکرام امین

—— میجر جاوید مجتبیٰ

صرف میرا خیال نہیں مجھے یقین ہے کہ اگر میں ملٹری کالج میں بریگیڈیئر اکرام امین کا ایڈجوٹنٹ نہ رہا ہوتا تو جیسا بھی آج ہوں اس سے مختلف ہوتا اور کمتر ہوتا۔ حالانکہ وہ سکالر تھے۔ ایجوکیشنسٹ تھے۔ کمانڈ اور کنٹرول ان کی فیلڈ نہیں تھی۔ لیکن وہ اس فیلڈ میں بھی حرف آخر تھے۔ میں پکا انفنٹیرین ہوں۔ کمانڈ اور کنٹرول کے بڑے بڑے پہاڑوں کو دیکھا ہے میں بلا مبالغہ کہہ رہا ہوں کہ وہ اس فیلڈ میں بڑے سے بڑے کمانڈر سے زیادہ نہیں تو کم Effective بھی نہیں تھے۔ کمانڈ کا ان کا اپنا سٹائل تھا۔ ان کا کمال یہ تھا کہ Low Profile کے ساتھ کمانڈ کرتے تھے۔ کبھی خاموش ہو کر کبھی غور سے دیکھ کر کبھی ہلکی مسکراہٹ سے ان کی Stare کوئی Face نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ماہر نفسیات اور ماہر سرجن کی طرح فنکشن یا Operate کرتے تھے۔ ان کا رعب تھا۔ دہشت نہیں تھی۔ ان کے سامنے بلکہ ان کی کمانڈ میں سب چھوٹے بڑے Secure محسوس کرتے تھے مجھے Socalled شریف کمانڈرز کا تجربہ بھی ہے۔ جن کے عہد میں کام کرنے والے غیر محفوظ اور کام چور اکڑتے پھرتے ہیں کہ کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا وہ بڑے بڑے ٹیڑھوں کے بل نکال دیتے تھے لیکن بہت خاموشی سے بغیر Blustering کے میں نے ان سے یہ بات سیکھی کہ وہ غصہ میں آتے لیکن طیش میں نہ آتے۔ کبھی دھمکی آمیز زبان استعمال نہیں کرتے

لہ کالج نمبر ۲۹۸۴ —— ایڈجوٹنٹ ملٹری کالج ۸۰-۱۹۷۸ء

جو کچھ کرنا ہوتا بڑے اطمینان سے ایک سرجن کی طرح اور اسی جذبے سے کرڈالتے۔

نپولین کی طرح ان کی شخصیت میں Charisma تھا۔ناقابل بیان کشش۔ان کی دانشوری کی بھی میں نے بہت تعریف سنی ہے۔لیکن ان کی کمانڈ کے حوالے سے ان کی شخصیت کی مقناطیسیت کی بات کر رہا ہوں۔ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو یہ تھا کہ وہ کسی جادو سے بچوں کو اپنا بنا لیتے تھے۔ایک روز میرے یہاں آئے میرا بھانجا عادل اس وقت ڈیڑھ دو برس کا تھا انہوں نے ہیلو کہا لیکن اس نے انہیں لفٹ نہیں کرائی تو وہ مسکرائے۔پھر نہ جانے انہوں نے کون سا گر اپنایا کہ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ ان کی گود میں آکر بیٹھ گیا۔اور ان کے ساتھ گیٹ تک گیا پھر وہ ان کا ایسا فین ہوا کہ اکثر ان کو یاد کرتا تھا۔یہی حال لڑکوں کا تھا شیر شاہ ہاؤس کے جونیئر لڑکے ہوں یا سینئر کلاسز کے وائی کیڈٹس، وہ ہر ایک سے اس کی عمر اور ذہن کے مطابق بات کرتے۔سینئرز کے انہوں نے نک نیم بھی رکھے ہوئے تھے۔ان کا ہر ایک سے نفسیاتی رابطہ تھا۔جس دن وہ رخصت ہو رہے تھے تو لڑکے ان کو الوداع کہنے لائن اپ ہوئے تھے۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ گزرتے گزرتے ہر ایک سے Communicate کر رہے تھے کسی سے ہیلو، کسی سے آنکھوں آنکھوں میں ہاؤ آر یو؟ کسی کے شانے پر ہاتھ اور بے شمار آنکھیں ان پر مرکوز تھیں۔اور ہر ایک میں اپنائیت کی چمک تھی۔نپولین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنی ساری رعایا کو جانتا تھا۔اکرام امین صاحب یقیناً اپنے ہر شاگرد کو جانتے تھے۔اس سے اگلی Frequency پر رابطہ تھا۔انہوں نے کالج کو نئی زندگی دی۔کیڈٹس کو جنہیں آفیسر بننا ہوتا ہے سب سے زیادہ ایک موثر لیڈر شپ کے نمونے کی ضرورت ہوتی ہے۔بریگیڈیر اکرام امین جس طرح ایک آئیڈیل کمانڈر مجھے نظر آیا اس طرح سارے کیڈٹس کو نظر آیا ہوگا۔اور آج ان کے مرنے کے بعد ان کی لیڈر شپ کی امیج ایک Guiding star کی طرح ان کے ساتھ ہوگی۔میرے ساتھ تو ہے۔اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی قدر بڑھتی جاتی ہے۔

میں ان کے ایڈجوٹینٹ کی حیثیت سے ان کے بہت قریب تھا۔میں نے ان کے ساتھ کئی بار سفر بھی کیا۔ان کے ڈرائینگ روم میں ان سے گپ شپ کا اعزاز بھی ملا۔بے تکلفی میں یا آف گارڈ انسان جن خیالات کا اظہار کرتا ہے وہی اس کے اصل خیالات ہوتے

ہیں۔ ان بے تکلف لمحوں میں انہوں نے اپنے سینیئر کولیگس کا بڑے احترام سے ذکر کیا۔ وہ اتنے بڑے تھے کہ اپنے بعض سینیئر سویلین رفقاء کار کی بڑائی سے خائف نہیں تھے۔ مجھے وہ ان چند اساتذہ کی زبانی کلامی نہیں دل سے عزت کرتے تھے جو ہم اولڈ بوائز کے دلوں کی روشنی ہیں۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ پوسٹنگ سے پہلے میں ان کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ لیکن جب میں نے ان کے ہم قدم چلنے کی کوشش کی تو انہوں نے میری ہر طرح رہنمائی اور میرے نام کی دل سے قدر کی۔ ۸۰ء کے جلسہ تقسیم انعامات کے بعد گھر آکر میں سو گیا تھا صبح آٹھ بجے آکر انہوں نے میرے کمرے کی کھڑکی پر آہستہ سے دستک دی۔ ہیلو راجہ ۔۔۔۔ پھر کس طرح بے ساختہ انہوں نے مجھے مبارکباد دی کس فراخ دلی سے فنکشن کا سارا کریڈٹ میری جھولی میں ڈال دیا۔

ان کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ جونیئرز کی رسمی تعریف سب ہی کمانڈرز کیا کرتے ہیں۔ میں اس Genuine personal touch کی بات کر رہا ہوں جو ان کی کمانڈ کی خصوصیت تھی۔ نیپولین کی طرح وہ سوتے بھی بہت کم تھے ان کا سٹیمنا ناقابل یقین تھا ایک دوبار ضرور تمام ہاؤسز کا چکر لگاتے تھے جس کی وجہ سے سب کو چوکنا رہنا پڑتا تھا وہ مجھ پر بحیثیت ایڈجوٹنٹ کے بہت اعتماد کرتے تھے۔ بہت اہمیت دیتے تھے لیکن مجھے یہ امپریشن کبھی نہیں دیا جیسے کہ کالج کا ڈسپلن میں ہی چلا رہا ہوں۔ Pamper وہی لوگ کرتے ہیں جو اندر سے کمزور ہوں جنہیں ایک Strong ایڈجوٹینٹ کے سہارے کی ضرورت ہو وہی صحیح معنوں میں ان لمانڈ تھے۔ مشکل فیصلے کرنے کا Strain خود لیتے تھے پھر نتائج کو Tackle کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ وہ Strewed بھی بہت تھے۔ فراست بھی بہت تھی۔ غلط جگہ یا معمولی بات سٹینڈ لینے میں ان کو نہیں دیکھا ان کا Sense of timing اور Sense of priorities بہت ہی ساؤنڈ تھا۔ وہ بہت قیمتی انسان تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور اب بھی سیکھ رہا ہوں۔ ان پر تو پوری کتاب لکھی جانی چاہیے۔

کرنل اکرام امین

—— کیپٹن رانا شرافت علی انجینئر

۱۹۷۳ء میں جب کرنل اکرام امین کالج میں چیف انسٹرکٹر ہو کر آئے تو ہم اولڈ میٹرک کلاس میں تھے۔ اور بورڈ کے امتحان کی تیاری کے لیے فری ہونے کے لیے پر تول رہے تھے۔ پہلے ہی دن سے ان کی موجودگی کالج میں محسوس کی گئی وہ اس طرح کہ جوں ہی پہلے پیریڈ کی گھنٹی بجنی شروع ہوئی وہ سی آئی کے دفتر کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ ان کی عقابی نگاہوں کی زد میں پوری اکرم شہید روڈ تھی اور کھڑے ہونے کا انداز ایسا کہ سست سے سست لڑکے کو اندازہ ہو گیا کہ موسم بدل گیا ہے۔

ان کے آتے ہی پہلا فرق تو یہ پڑا کہ انہوں نے آؤٹ گوئنگ میٹرک کو فری تو کر دیا لیکن کسی کو نہ گھر جانے دیا اور نہ بالکل فری کیا کہ جس کا جی چاہے جس طرح پڑھے۔ جیسا کہ پہلے ہوتا آیا تھا۔ پہلی تکمیل تو یہ دی کہ تیاری کا پروگرام دیا۔ اور سمجھایا کہ طریقہ یہ ہے اس طرح کام کرنا ہے لیکن پروگرام دینا اور بات ہے اور اس پر عمل درآمد کرا لینا اور بات۔

ان کی تمام کاوشوں کا نتیجہ یہ نکلا میٹرک کا نتیجہ سو فیصد رہا۔ اور سب نے اے گریڈ لیا یہ بڑی حد تک اکرام امین صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

۱۹۷۳ء کے اواخر میں جب ہم پی ایم اے گئے تو وہ وہاں ہم سے پہلے ہی ڈی او۔ ایس پروموٹ ہو کر پہنچ چکے تھے۔ پہلا مرحلہ سائنس یا آرٹس کورس لینے کا تھا۔ اس مقصد کے لیے ہماری پلاٹون، سارجنٹ کی نگرانی میں ڈی او ایس کے دفتر کے سامنے لائن اپ ہوئی۔ میں نے اور آصف عبداللہ نے پہلے سے فیصلہ کیا ہوا تھا کہ آرٹس پڑھیں گے۔ حالانکہ ہم نے یہاں سے ایف ایس سی کی تھی۔ یہی فارم میں لکھ دیا تھا۔ بہر حال چونکہ اکرام صاحب کو ہم اور وہ ہمیں ملٹری کالج سے جانتے تھے اس لیے کچھ ڈر بھی لگ رہا تھا کہ کہیں ناراض نہ ہوں۔ پہلے آصف اندر گیا۔ جب انٹرویو کے بعد باہر آیا تو منہ اترا ہوا تھا۔ میں نے سارجنٹ سے نظر بچا کر پوچھا کیا ہوا کہنے لگا اندر جا کر دیکھ لینا کچھ دیر انتظار کے بعد میرا نمبر بھی آ گیا۔ مے آئی کم ان سر کہہ کے اندر گیا۔ تو انہوں نے نظر اٹھا کے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ خوش ہو کر کہا "ماسٹر ادھر پہنچ گئے

ہوئے میں نے کہا "یس سر" پھر انہوں نے میرے فارم پر نظر ڈالی۔ تو وہاں آرٹس لکھا دیکھا ایک دم جلال میں آگئے (My bloody foot! you'll take Science
۵۶ ویں لانگ کورس میں تقریباً بیس عالمگیرین تھے۔ انہوں نے سب کو سائنس دی۔ صرف دو کو آرٹس مضامین لینے کی اجازت دی بلکہ خود کہا تم آرٹس لو۔ ان دو میں سے ایک شوکت چاندنہ تھا۔

اب آگے کی داستان سنئے۔ ۱۹۷۷ء میں ۵۶ ویں لانگ کورس کی پاسنگ آؤٹ ہو چکی تھی سینئر انڈر آفیسر ظاہر شاہ اور میں گاؤن پہنے کانووکیشن کے لیے بٹالین میس میں داخل ہوا ہی چاہتے تھے کہ کرنل اکرام امین سامنے آگئے۔ ہمیں بی ایس سی کے بڈ اور گاؤن میں دیکھ کر کھل اٹھے This is what I was preparing you for
میرا خیال ہے کہ اس کانووکیشن پر سب سے زیادہ خوش کرنل اکرام ہوں گے کیوں کہ جن تین جی سیز (G.C.s) نے تینوں ٹاپ پوزیشنز لیں وہ ان کے ملٹری کالج کے اپنے شاگرد تھے۔ ظاہر شاہ نے اعزازی تلوار کے ساتھ ساتھ سائنس میں اور شوکت چاندنہ نے آرٹس میں پہلی پوزیشن لی تھی۔ وہ Educationist ہونے کے ساتھ ساتھ لیڈر شپ میں بھی طاق تھے۔ اس لحاظ سے بھی انہوں نے اپنے دور کے سارے کیڈٹس کو متاثر کیا۔ میں تو اپنی انجینئرنگ کی ڈگری کے لیے بھی انہی کا مرہون منت ہوں۔ انہیں جتنا بھی یاد کیا جائے کم ہے!

—— کیپٹن اختر نواز[1]

اکرام صاحب کالج میں پہلے سی آئی تھے، پھر ہمارے سامنے ہی کمانڈانٹ ہو کر آئے میرے ذہن میں کمانڈ کی پہلی تابناک Image انہی کی ہے بعض لوگ Efficient ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھے جو Efficient ہونے کے ساتھ ساتھ بے انتہا Effective بھی تھے جو بدرجہا مشکل مرحلہ ہے اس وقت فوری مسئلہ رزلٹ کو بہتر بنانے کا تھا۔ انہوں نے صحیح طور پر یہ سوچا کہ جب تک ڈسپلن کو ٹائٹ نہیں کیا جائے گا بات نہیں بنے گی۔ چنانچہ وہ لگ گئے۔ نہ کوئی تقریر کی نہ کوئی سرکلر نکالا یہ کرو گے تو یہ ہوگا بس انہوں

---

[1] کالج نمبر ۱۵۷۱، ۳۸ زمانۂ تعلیم ۷۸-۱۹۷۴ء

نے خاموشی سے چیکنگ شروع کر دی اور ادھر بھی بڑے بڑے کائیاں، پرانے گنہگار پڑے ہوئے تھے۔ دونوں طرف سے شاطروں نے اپنے اپنے مہرے آگے بڑھانے شروع کر دیئے۔ جن کو باہر جانے کا چسکا پڑا تھا وہ آسانی سے کب باز آتے انہوں نے پچھلے پہر رات کا ہر وقت اور کالج سے باہر نکلنے کا ہر امکانی راستہ آزمایا یہ رات کے ہر وقت ایک لمبی ٹارچ لیے ہر جگہ موجود۔ لوگوں نے بھیس بدلے، بہروپ بھرے، چادریں اوڑھیں، اوورکوٹ پہنے پگڑیاں باندھیں وہ بھی کبھی موسٹی ہال کے پیچھے کبھی جھاڑیوں کی اوٹ میں، کبھی سرائے کی طرف کی دیوار کے پاس گھات لگائے موجود رہتے تھے۔ ہم سب کو اب تک حیرت ہے کہ وہ جُو مُکھی کیسے لڑ رہے تھے اور لطف یہ کہ جو شکار ہاتھ آتا وہ اس کا حساب وہیں بے باک کر دیتے۔ انہوں نے بڑے ٹیڑھوں کے بل نکال دیئے۔ میں نے ان سے یہ سبق سیکھا۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

اکثر اچھے آدمی کمزور ہوتے ہیں۔ مشکل فیصلہ کرنے سے بچتے ہیں۔ ضروری سخت اقدام کو بھی ٹالتے رہتے ہیں ہر قیمت پر Compromise ان کا لائف سٹائل بن جاتا ہے۔ ان کے عہد میں شریف غیر محفوظ اور شریر ہو جاتے ہیں۔ اکرام صاحب نے اچھوں سے مہا اچھے تھے تو ٹیڑھوں کو سیدھا کرنے کی جرأت بھی رکھتے تھے۔ اور توازن کے ساتھ، تحمل کے اور فراست کے ساتھ غلط آدمی پر اس طرح ہاتھ ڈالتے تھے پھر وہ ہل نہ سکے۔ یہ شخصیت کا بہت بڑا وصف ہے جو جناب اکرام امین میں تھا۔ وہ جہاں رہے جم کر رہے چونکہ کام کے اور کردار کے پکے تھے۔

ان کے بارے میں مشہور تھا وہ چلتے ہوئے آگے پیچھے دائیں بائیں چاروں طرف دیکھ سکتے ہیں اس کا میں خود شاہد ہوں۔ ہوا یہ کہ اپریل ۱۹۷۴ء میں جب ہم شیر شاہ ہاؤس میں آٹھویں میں داخل ہوئے تو ابھی پھولوں کی بہار باقی تھی۔ پھولوں کا سمندر دیکھ کر میرا دل للچایا۔ گلاب کا ایک پیارا سا پھول توڑنے کو ابھی ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اکرام امین صاحب نے جو بہت آگے نکل چکے تھے۔ دفعتاً پیچھے مڑ کے دیکھا اور بولے "ہاں ہاں" توڑ لو توڑ لو، لیکن آئندہ نہیں میں گھبرا کر پیچھے ہٹا تو وہ لوٹ کے آئے پھول توڑ کے مجھے دیا۔ لو دل خوش کر لو۔ یہ جونیئر شیر ہیئنز پر بہت مہربان تھے۔ ہمارے فرانڈے فنکشنز پر تواتر سے آتے تھے۔ کہتے

تھے کہ نیا کالج یہاں سے ابھرے گا۔ ہوا بھی یہی کہ ان کے زمانے کی شیر ٹینز نے اعزازی تلواروں کی لائن لگا دی۔ ان کا ۱۹۷۸ء کی ایف ایس سی کی انٹری پر خاص احسان ہے ہم لوگ ۶۱ لانگ کورس کے لیے سیلکٹ ہوئے تھے۔ لیکن چونکہ ساٹھواں کورس چند مہینے لیٹ تھا اگر اکسٹھویں کا انتظار کرتے بہت دیر ہو جاتی۔ انہوں نے کوشش کر کے ہمیں ساٹھویں کورس ہی میں بھجوایا۔ اور جب ہم پی۔ ایم۔ اے گئے تو وہ اس سے ذرا پہلے وہاں ڈی۔ او ایس ہو کر پہنچ چکے تھے۔ وہ ہمیں وہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ یہ میرے Saplings ہیں ہمیں آٹھویں میں انہوں نے ہی منتخب کیا تھا۔

اکرام امین صاحب ان غیر معمولی لوگوں میں سے تھے جن کا قد وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ حق مغفرت کرے ان کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے۔

—— مسعود راشد[1]

اکرام امین صاحب کی ایک خصوصیت جو شاید کسی اور نے نہ لکھی ہو یہ تھی کہ سٹاف کے بچے ان سے بہت مانوس تھے۔ اگر انہیں کوئی بچہ راستہ میں ملتا تو وہ خاص طور سے رک کر اس سے دو چار باتیں ضرور کرتے۔ سپورٹس گراؤنڈ پر یا کسی فنکشن پر بچے آتے تو وہ ضرور تھوڑا لفٹ دیتے۔ بچوں سے ملنے کا ان کا خاص انداز تھا۔ گردن کو ایک طرف کو ذرا سا خم دے کر اور مسکرا کر بات کرتے۔

نشیر شاہ ہاؤس جونیئر ہاؤس تھا۔ یہاں وہ اکثر آتے۔ ان دنوں میرا چھوٹا بھائی آصف چار پانچ سال کا تھا اور اکثر ہاؤس میں کھیلتا ہوتا۔ اکرام امین صاحب جب آتے اس سے ضرور دو چار باتیں کرتے۔ ایک بار ہمارے گھر سے ان کے ہاں پپیتہ بھیجا گیا جو خاصا بڑے سائز کا تھا۔ اکرام امین صاحب نے اس دن آصف سے پوچھا۔ آپ کے ہاں تربوز پپیتوں پر لگتے ہیں"؟ ہمارے گھر کے بائیں باغ میں امرودوں، پپیتوں اور لوکاٹ کے بہت سے پیڑ تھے جن پر طوطے بہت آتے تھے۔ اکرام صاحب ایک روز آصف سے پوچھنے لگے آپ نے اتنے بہت سے طوطے پال رکھے ہیں۔ انہیں آپ نے بولنا نہیں سکھایا

---

[1] کالج نمبر ڈی ایس ۵۶۔ زمانہ ۸۰-۱۹۷۵ء

چونکہ ہاؤس میں اقبالیات کا بہت چرچا تھا، ہر فنکشن پر اقبال کی کوئی نہ کوئی نظم یا غزل سنائی جاتی یا اقبال کے اشعار کی بیت بازی ہوتی تھی۔ آصف نے بھی بہت سے شعر یاد کر لیے تھے۔ اکرام صاحب اس سے فرمائش کر کے ایک آدھ شعر ضرور سنتے تھے۔

ایک روز کوئی انٹر ہاؤس میچ ہو رہا تھا۔ میچ پر میجر عبدالخالق (اب لیفٹیننٹ کرنل) کا بیٹا بھی آیا ہوا تھا۔ وہ ان کو دیکھ کر یکایک خالق صاحب کے پاس سے اترا اور کہنے لگا میں نے انکل اکلام امین سے ملنے جانا ہے اور دوڑتا ہوا اکرام صاحب کی گود میں جا بیٹھا۔

——— کیپٹن احسان الحق[۱]

یہ واقعہ ۱۹۷۵ء کا ہے۔ کرنل امین چیف انسٹرکٹر تھے۔ اور ان کا خاص مضمون پاکستانیات تھا۔ ہماری نویں کلاس کے ایک کیڈٹ شاہد افضل نے دسمبر ٹیسٹ میں پاکستان سٹڈیز میں ۷۹ مارکس لیے تو اکرام صاحب کلاس میں آئے۔ اور شاہد افضل سے کہا۔

You are the one who scored the highest marks. I salute you, my boy.

شاہد افضل کی جنرل نالج بہت اچھی تھی۔ آٹھویں میں اس نے ٹی وی کے ایک کوئز پروگرام میں کالج کی نمائندگی کی تھی۔

——— کیپٹن جمیل سرور[۲]

نور عمران جو کالج پریفیکٹ تھا۔ جب اسے میڈیکل میں ان فٹ قرار دیا گیا اور اس کا اپیل میڈیکل بورڈ ہوا تو کرنل امین اسے خود پنڈی لے کر گئے جس طرح والدین اپنے بچوں کے ساتھ جاتے ہیں اور اسے مختلف مرحلوں سے گزارا۔

——— ڈاکٹر زبیر خورشید[۳]

ایک دفعہ ہمارا ایم جی ہاؤس صبح پی ٹی پر نہ جا سکا ہاؤس پریفیکٹ کی آنکھ بر وقت نہ کھل سکی تھی۔ اور جب کھلی تو کمانڈانٹ کرنل امین کی شارپ شاؤٹ سے نتیجہ ظاہر ہے سارے ہاؤس کو فرنٹ رول اور فراگ جمپ کرتے ہوئے پی ٹی گراؤنڈ تک جانا پڑا۔ ان

---

[۱] کالج نمبر ۳۶۳۷، زمانہ ۷۹-۱۹۷۴ء [۲] کالج نمبر ۳۷۴۴، زمانہ تعلیم ۷۸-۱۹۷۵ء [۳] کالج نمبر ۳۸۸۸، زمانہ تعلیم ۱۹۷۶ء

کاریکارڈ تھا کہ کالج میں جہاں کہیں دن رات آندھی بارش طوفان کسی وقت کوئی غلط بات ہونا ممکن تھا کہ آپ گردن موڑ کے دیکھیں اور وہاں کرنل ایبن موجود نہ ہوں ۔ لیڈرشپ کی یہ امیج تھی جو انہوں نے ہمیں دی۔

—— سعید راشد

ایبن صاحب ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جو پبلک سکول سسٹم کی غرض و غایت اور اس کی روح کو سمجھتے تھے ۔ اور ان کی شخصیت میں اتنی قوت تھی، اتنا Drive اور Stamina تھا کہ وہ اپنے Vision کو عملی صورت میں بروئے کار لا سکیں ۔ ایک روز برسبیل تذکرہ کہا ۔ پبلک سکول میں لڑکے کا جو قدم بھی اٹھتا ہے اس کی ایک تربیتی Value ہوتی ہے مثبت یا منفی، تعلیم کے پروسیس پر ان کی بہت گہری نظر تھی اور ملٹری کالج میں تعلیمی و تربیتی مقاصد کی ترجیحات کے بارے میں ان کے ذہن میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا ۔ چنانچہ یکم مارچ ۶۴ء تقسیم انعامات کی سالانہ تقریب کے موقع پر انہوں نے رپورٹ میں نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کے دائرہ میں کالج کی غیر معمولی کامیابیوں کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ بھی کہا:

We are fully conscious that only academic excellence, physical fitness and intellectual breadth cannot serve our ends here to be a good military leader, a young man needs something more; he has to be deeply nationalistic in outlook and intensely patriotic in thought and action.

انہوں نے کالج کے ڈسپلن اور معیار کو آگے بڑھانے میں جتنی مسلسل جدوجہد کی اس کا Impact غالباً آج تک ان کے شاگردوں پر ہو گا مجھ پر تو ہے۔

بولنے بھی خوب تھے۔ ۲۳ مارچ ۶۳ء کو تحریک پاکستان کے عوامل پر جو تقریر انہوں نے کی تھی اس کا نقش آج تک میرے دل پر ثبت ہے ۔ طلباء کی ذہنی امنگوں کو جگانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ سکول و کالج کے زمانہ میں خاص طور سے ان کا واسطہ غیر معمولی طور پر Talented شخصیتوں سے پڑے ۔ اس قسم کا Exposure ان کی اپنی

شخصیتوں کی تشکیل و تعمیر میں Catalyst کے طور پر کام کرتا ہے۔ مرحوم اکرام امین کو یہ مقام حاصل تھا۔ ان کی شخصیت میں جو Charisma تھا اس کی وجہ سے وہ پبلک سکول کے روایتی آئیڈیل ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے جو اداروں کی تقدیریں بدل دیتے ہیں۔ کاش ان کی صلاحیتیں وردی کے تقاضوں سے انتظامی امور کے بہت کمتر میدان میں صرف بلکہ ضائع نہ ہوتیں کاش وہ صرف معلم ہی رہتے اور اس منصب میں انہیں وہ سب کچھ پیش کر دیا جاتا جس کے لیے انہیں بریگیڈیر اور سکریٹری ایجوکیشن بننا پڑا لیکن یہ المیہ ان کا ذاتی نہیں پوری قوم کا ہے۔

—— مختار احمد[1]

کرنل اکرام امین صاحب نے مجھے بھرتی کر کے بین آفس میں ڈسپیچ کے کام پر لگا دیا تھا کام نہ زیادہ تھا نہ پیچیدہ میں اسی نوکری کو بہت سمجھ رہا تھا کہ ایک روز کسی کام سے مجھے ان کے دفتر جانا پڑ گیا۔ وہ کام کر کے جب میں واپس آنے لگا تو انہوں نے مجھ سے پنجابی میں کہا۔ کیا خیال ہے میں تمہیں اکاونٹس آفس میں لگانا چاہتا ہوں۔ وہ پکی نوکری ہے اور اکاونٹس کا کام سیکھ لوگے تو ترقی کروگے۔ جی چاہے تو کل سعید شاہ صاحب کے پاس چلے جانا، مجھے کسی نے ڈرا رکھا تھا کہ اکاونٹس کا کام بہت ذمہ داری کا اور دن رات کا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس اندیشہ سے میں ان کے مشورے کو گول کر گیا۔ دوسرے دن انہوں نے شاہ صاحب سے چیک کیا کہ میں نہیں پہنچا تو انہوں نے مجھے دفتر میں بلا کر بہت سخت جھاڑ پلائی۔ بندہ کا پتر بن! آگے بھی سوچ۔ اکاونٹس میں ترقی کی گنجائش ہے ورنہ یہاں پڑا سڑتا رہے گا تیرے باپ نے کالج کی بڑی خدمت کی ہے۔ اب تو بھی اپنی جگہ بنا۔" سخت بھی بہت تھے۔ لیکن اپنے انداز سے۔ ایک بار رات کو ایک چوکیدار کو سوتے ہوئے پکڑا۔ اسے جھنجھوڑ کر پنجابی میں کہا۔ بڑا چوکیدار جاگ رہا ہے۔ تو سو رہا ہے۔ اس نے کہا سر، ایک بار معافی دے دیں، یہ بولے ٹھیک ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا میرے ہاں دوسری باری نہیں آتی اور یہ سب کو معلوم تھا کہ جو وہ کہتے تھے اس کا مطلب وہی ہوتا تھا جو وہ کہتے تھے۔

---

[1] اکاونٹس کلرک ملٹری کالج از ۱۹۷۵ تا حال۔

حیدری صاحب

—— بریگیڈئر عبدالرزاق[1]

میں ۱۹۵۳ء میں کالج میں پانچویں میں داخل ہوا تھا۔ حیدری صاحب ہفتے میں دو دن نرسری رائم کا پیریڈ ایف اے سی سی میں لیتے تھے۔ خود پیانو پر بیٹھ جاتے۔ جب رائم رواں ہو جاتا تو اس کی موومنٹ سکھاتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلا رائم

Old Mac-Donald had a Farm تھا۔

Quack, quack, here is a quack's a quack

کی آواز اور موومنٹ کو لڑکے بہت انجوائے کرتے تھے۔ ایک اور رائم

Mulberry Bush

Here we go round a mulberry bush
On a cold and frosty morning

بھی بہت مقبول تھا۔ پھر یہ رائمز سالانہ تقریب انعامات پر جونیئرز پہلے کے ساتھ سٹیج پر پیش کیے جاتے تھے۔

فروری ۱۹۵۸ء میں جو انگلش ایلوکیوشن ہوا تھا اس میں کمانڈانٹ کرنل رفیق کے علاوہ مسٹر حیدری نے بھی حصہ لیا تھا۔ انہوں نے جولیس سیزر سے مارک انٹنی کی مشہور Funeral Speech کرنی تھی۔ ان کے سٹیج پر آنے سے پہلے سٹیج کے روسٹرم کو لٹا کر اس پر سیاہ کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔ گویا یہ سیزر کا تابوت تھا پھر مسٹر حیدری رومن سینٹر مارک انٹنی کے روپ میں سٹیج پر نمودار ہوئے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ساتھ ہی ایک خاموش ہیجان بھی تھا۔ ایک بالکل نیا ڈرامائی منظر ہمارے سامنے تھا۔ پھر حیدری صاحب شروع ہوئے۔

Friends, Romans, countrymen, lend me your ears;
I come to bury Caesar, not to praise him.
The evil that men do live after them.
The good is oft interred with their bones;

---

[1] کالج نمبر ۲۱۸۶ زمانہ تعلیم ۶۲-۱۹۵۳ء، تمغہ امتیاز

So let it be with Caesar. The noble Brutus
Hath told you Caesar was ambitious:
If it were so, it was a grievous fault;
And grievously hath Caesar answer'd it.

Here, under leave of Brutus and the rest,
For Brutus is an honourable man;
So are they all, all honourable men,-
Come I to speak in Caesar's funeral.

He was my friend, faithful and just to me.
But Brutus says he was ambitious;
And Brutus is an honourable man.
He hath brought many captives home to Rome,

Whose ransoms did the general coffers fill:
Did this in Caesar seem ambitious ?
When that the poor have cried, Caesar hath wept
Ambition should be made of sterner stuff:

Yet Brutus says he was ambitious:
And Brutus is an honourable man.
You all did see that on the Lupercal
I thrice presented him a kingly crown,

Which he did thrice refuse: was this ambition ?
Yet Brutus says he was ambitious:
And, sure, he is an honourable man.

I speak not to disprove what Brutus spoke,
But here I am to speak what I do know.
You all did love him once, - not without cause:
What cause withholds you, then, to mourn for him?

O judgement, thou art fled to brutish beasts,
And men have lost their reason ; - Bear with me:
My heart is in the coffin there with Caesar,
And I must pause till it come back to me.

خطابت کے جادو کا یہ ناقابل فراموش منظر کاش تاریخ کے لیے ویڈیو ٹیپ کیا جا سکتا۔

دسویں میں بھی حیدری صاحب سے انگریزی پڑھی۔ نصاب میں ایک کتاب Treasure Island بھی تھی۔ وہ اس کو اتنے ڈرامائی انداز میں پڑھاتے جیسے اسے سٹیج کر رہے ہوں۔ نصاب میں کئی کتابیں تھیں Treasure Island کو ہم Pleasure Island کہتے تھے۔ لیکن اس کی باری کے علاوہ بھی اکثر اصرار کیا کرتے کہ سر آج Pleasure Island ہو جائے۔ چونکہ میں ڈراموں میں آتا رہتا تھا وہ کلاس میں اکثر مجھ سے مکالمے ادا کرواتے Accent اور Intonation اور Expression کے Concepts انہی نے واضح کیے۔ اکثر بتلاتے کہ لب ولہجہ سے جملے کے معنی بدل جاتے ہیں۔ ایک جملہ اس وقت یاد آ رہا ہے۔

What an example to be followed

انگریزی زبان اور فائن آرٹس کا جو ذوق انہوں نے طلبا کی کئی نسلوں میں پیدا کیا وہ ان کی ناقابل فراموش خدمت ہے۔

مسٹر ایٹن

لیفٹیننٹ کمانڈر محمد نواز[1]

۱۹۳۲ء میں کچھ عرصہ میں نے سر ایٹن سے دسویں میں انگریزی پڑھی۔ چونکہ فوج کے لیے میری عمر کم تھی۔ مسٹر ایٹن نے مجھے اپنے ساتھ جونیئر کلاسز کو پڑھانے پر لگا لیا وہ مجھے پڑھانے کے طریقے بھی سکھاتے اور خود پڑھنے کے لیے کتابیں بھی دیتے تھے۔ پہلی کتاب جو انہوں نے مجھے دی اور جس سے میرے اندر پڑھنے کا شوق بیدار ہوا وہ اسٹیونس کی ٹریژر آئی لینڈ تھی اس کے بعد انہوں نے مجھے چارلس ڈکنس سے متعارف کرایا۔ میرے شوق کو دیکھ کر انہوں نے اپنی ذاتی لائبریری کے دروازے میرے لیے کھول دیئے تھے۔ وہ اور ان کی مسز مجھ سے ناول ڈسکس بھی کرتی تھیں جارج ایلیٹ کی جین ائر اور برانٹے سسٹرز کو میں نے ان کے کہنے پر پڑھا مختصر یہ کہ تھوڑے عرصے میں انگلش کلاسکس کو میں چاٹ گیا ہارڈی کا سٹائل بہت مشکل ہے۔ اسے بھی پڑھ ڈالا سکاٹ کے یورلی سیریز کو بھی کھنگالا۔

مسٹر ایٹن نے مجھے سکول لائبریری کا اسسٹنٹ بھی بنا دیا تھا جس کی تین الماریاں سنٹرل ہال کے ایک گوشے میں رکھی تھیں۔ ایک الماری میں کچھ کتابیں اردو کی بھی تھیں — تذکرۃ الاولیا شبلی کی سیرۃ النبی اور محمد حسین آزاد کی قصص ہند اور دربار اکبری میں نے سکول لائبریری سے لے کر ہی پڑھی تھیں۔

مسٹر ایٹن کا مجھ پر یہ بڑا احسان ہے کہ ان کے توسط سے میری انگریزی اردو کی بنیادیں مضبوط ہوئیں اور ذہن کو بالیدگی نصیب ہوئی۔

حیدری صاحب

کرنل منیر چوہان[2]

حیدری صاحب سے میں نے پڑھا بھی۔ ان کے ڈرامے بھی دیکھے۔ لیکن میں نے جو اثر ان سے قبول کیا وہ براہِ راست نہیں، بالواسطہ طور پر ان کی تحریر سے تھا۔ وہ تربیت کے انگلش سیکشن کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے ۶۳-۱۹۶۲ء کے تربیت کے آخر میں

---

[1] کالج نمبر ۱۸ زمانہ تعلیم ۳۳-۱۹۲۵ء [2] کالج نمبر ۲۵۶۴ زمانہ تعلیم ۶۵-۱۹۶۰ء

Readers' Treasure Chest کے عنوان سے کارڈنل ہنری نیومن کی Definition of a gentleman اور رڈیارڈ کپلنگ کی نظم تبرک کے طور پر نقل کی تھی۔ اصل میں یہ ان کے اپنے ٹریژر چیسٹ کے دو گوہر گراں مایہ تھے جو انھوں نے ہم طلبار کو عطا کیے ان دو تحریروں کا میری زندگی میں ایک خاموش مگر موثر کردار رہا ہے۔ آج ان کی یاد میں یہ خزانہ میں قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔ جو جو پڑھے وہ ان کے لیے دعا کرے۔

——— بریگیڈیر محمد حیات ستارۂ جرأت[1]

کرنل سٹیبنگ کا ٹریننگ کا اپنا فلسفہ تھا۔ عہدہ میں جو جتنا زیادہ سینئر ہوتا اس سے اتنی زیادہ باز پرس ہوتی۔ چنانچہ سینئر کیڈٹ آفیسر کی آئے دن سختی آئی رہتی تھی ۹۸ مائل سٹون تک کی ایکسٹرا ڈرل ملنا آئے دن کی بات تھی۔ ایک روز سینئر پرلفیکٹس اسی طرح کی ای ڈی پر تھے تو کرنل سٹیبنگ نے جونیئر پرلفیکٹس کو بنگلہ پر چار پر بلایا۔ (ان کا طریقہ تھا کہ جوں جوں سنیارٹی بڑھتی جاتی وہ سوشل روابط بڑھاتے جاتے) چار پر مسز سٹیبنگ نے ایک بڑا کیک (غالباً خود بنا کر) رکھا۔ اس کی شکل مشہور لنڈن برج کی سی تھی۔ کیک انھوں نے اس طرح کاٹنا چاہا کہ اصل برج سلامت رہے لیکن یا تو چھری غلط چل گئی یا کچھ اور ہوا کہ برج ایک دم ہی گر پڑا۔ مسز سٹیبنگ سسکیاں بھرنے لگیں ہائے میرا لنڈن اسی طرح تباہ ہو رہا ہے وہ زمانہ جنگ عظیم دوم کی ابتدار کا تھا اور لنڈن پر جرمن بمبار طیارے مسلسل بمباری کر رہے تھے۔

انہیں روتا دیکھ کر ہم بھی کچھ متاثر سے نظر آنے لگے۔ یہ دیکھ کر کرنل سٹیبنگ بولے مسز کچھ جذباتی ہو گئی ہیں۔ ان سے ہمدردی ضرور کرو لیکن خبردار اس سے اثر بالکل نہیں لینا ہے۔ تم لوگ مرد ہو۔ تمہیں آگ اور خون سے کھیلنا ہے۔ تمہیں اور ہمیں جرمنوں اور جاپانیوں کو ہرانا ہے

---

[1] کالج نمبر ۷۴۸۔ زمانہ تعلیم ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۳ء

پروفیسر علوی کا خاندانی اور ذہنی پس منظر

——— از سعید راشد

(علوی صاحب کے خاندانی پس منظر اور سوانحی کوائف کے لیے ان کے برادر عزیز پروفیسر فخر الدین علوی صاحب[1] سے ایک گفتگو)

سعید راشد: علوی صاحب کی شخصیت میں جو رچاؤ تھا، جو گہرائی تھی، علم و فن اور کلچر کا جو آب و رنگ تھا وہ از خود نہیں آجاتا۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے پیچھے صدیوں کی ریاضت و روائت ہے۔ اس پس منظر ی مطالعہ کے لیے آپ کو زحمت دے رہا ہوں پہلے تو آپ اپنے تعارف کے طور پر کچھ فرمائیں۔

فخر الدین: جیسا کہ آپ کو معلوم ہے فخر الدین علوی میرا نام ہے میں ۱۹۵۹ء سے پی اے ایف پبلک سکول لوئر ٹوپہ پھر ۱۹۶۸ء سے پی اے ایف کالج سرگودھا میں استاد رہا ہوں اور اب کالج کے شعبہ علم و ادب کا سربراہ ہوں۔ مرحوم عین الدین علوی رشتہ میں میرے تایا زاد بھائی تھے۔ میرے والد ماجد قمر الدین علوی مرحوم بھائی عین الدین کے والد مولانا بدر الدین علوی مرحوم کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ مرحوم عین الدین بھائی مجھ سے عمر میں پانچ سال ہی بڑے تھے لیکن میں ان کو صرف بڑا بھائی ہی نہیں اپنا مربّی اور استاد بھی سمجھتا ہوں میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے ان جیسے غیر معمولی انسان، بلکہ نابغۂ روزگار کو بچپن سے بہت قریب سے دیکھا۔ اور ان سے فیض حاصل کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں جو کچھ بھی ہوں عین الدین بھائی مرحوم اور تایا بدر الدین علوی مرحوم کے طفیل ہوں۔ والد ماجد قمر الدین علوی مرحوم کے انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۹ء یعنی تیسری جماعت سے بی اے تک میری تعلیم و تربیت عین الدین بھائی مرحوم کی صحبت میں تایا بدر الدین علوی مرحوم کے زیر سایہ ہوئی۔

سعید راشد: فخر الدین صاحب آپ سب کے خاندانی نام سے ہی پتہ چلتا ہے کہ آپ لوگ

---

[1] پروفیسر فخر الدین علوی۔ علوی صاحب کے چچازاد بھائی۔

نسلاً علوی سید ہیں۔ اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں کچھ بتایئے۔

فخر الدین: ہمارا معروف سلسلۂ نسب حضرت خواجہ رکن الدین علوی یک لکھی ثمرقندی (اس کا قدیم فارسی نام اپنے میٹھے پھلوں کی نسبت سے ثمر قند ہے لیکن اردو میں عام طور پر اس کے ہجے سمر قند لکھے جاتے ہیں) ثمر قندی تک پہنچتا ہے۔ حضرت رکن الدین اپنے عہد کے بہت بڑے عالم، محدث اور مجاہد بھی تھے۔

سعید راشد: یک لکھی سے کیا مراد ہے؟

فخر الدین: چونکہ انہیں ایک لاکھ حدیثیں ازبر تھیں اس لیے رکن الدین یک لکھی ثمر قندی کے نام سے مشہور ہوئے۔

سعید راشد: آپ کے بزرگ کس زمانہ میں برصغیر تشریف لائے۔

فخر الدین: حضرت خواجہ رکن الدین، ناصر الدین محمود شاہ دہلی کے عہد حکومت میں وسط ایشیا کی گردش چنگیز خانی میں ہندوستان آئے اور مخدوم اسد الدین آفتاب ہند ظفر آبادی کے چوتھے اور آخری جہاد ظفر آباد میں ان کے ساتھ ظفر آباد (مشرقی یوپی) تشریف لائے ان کے جلیل القدر خلیفہ بنے۔ ظفر آباد میں ہی سکونت اختیار کی اور ۸۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کی اولاد یوپی کے مشرقی اضلاع میں سکونت پذیر رہی۔ ان کی چوتھی اور پانچویں پشت میں حضرت مخدوم شاہ نصیر الحق قدس سرہٗ (متوفی ۹۱۵ھ) اور حضرت شاہ نور الحق قدس سرہٗ اپنے دور کے نامی گرامی عالم اور سلسلۂ قلندریہ کے پیر و مرشد تھے۔ ان بزرگوں کے تذکرے "اصول المقصود"، "فصول مسعودیہ"، "بحر زخار" اور "تجلی نور" میں مذکور ہیں۔ ان کی اولاد میں سے کچھ لوگ مختلف ادوار میں مناصب قضات پر بھی فائز رہے ہمارے پردادا یعنی عین الدین بھائی کے والد ماجد بدر الدین مرحوم کے دادا مولوی سخاوت علی صاحب انگریزوں کے دور میں یوپی کے اضلاع ایٹہ و مرزا پور وغیرہ میں منصف (سول جج) رہے تھے۔ سخاوت علی صاحب کے سب سے بڑے بیٹے اور ہمارے دادا حافظ عبدالرحیم نے بسلسلۂ وکالت ۱۸۸۵ء کے بعد علی گڑھ میں سکونت اختیار کی تھی۔ وہ چوٹی کے وکیل تھے۔ سیاست میں بھی دلچسپی اور حصہ

لیتے تھے ۱۹۰۹ء میں بنارس کے مقام پر آل انڈیا نیشنل کانگریس کی پراونشل کانفرنس کے پریذیڈنٹ مقرر ہوئے اور متعدد بار ڈویژنل کانفرنس کی صدارت بھی کی۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس پائے کے آدمی تھے۔

سعید راشد : فخر الدین صاحب، کیا آپ علوی صاحب کے ننھیال کے بارے میں بھی کچھ بتا سکتے ہیں۔

فخر الدین : جی ہاں کیوں نہیں، عین الدین بھائی کے نانا خان بہادر مولوی مقبول عالم صاحب بنارس کے نامی گرامی وکیل تھے اور ایسی خاندانی وجاہت کے مالک تھے کہ بنارس جیسے ہندوؤں کے گڑھ میں لگاتار دس سال بنارس میونسپلٹی کے چیئرمین رہے۔ ان کے نام پر اب بھی بنارس میں مولوی مقبول عالم روڈ موجود ہے۔ عین الدین بھائی کے ماموؤں نے اپنے زمانہ کی اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کی۔ ان کے ایک ماموں منصور عالم مرحوم الہ آباد ہائی کورٹ کے بہت اونچے وکیلوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ الہ آباد ہائی کورٹ میں سینئر سٹینڈنگ کاؤنسل رہے۔ ان کا ہائی کورٹ کی ججی کا بھی چانس تھا لیکن وہ مسلم لیگی تھے۔ تقسیم برصغیر کے بعد پاکستان آ گئے اور یہاں ایڈووکیٹ جنرل مشرقی پاکستان پھر کسٹوڈین جنرل پاکستان بھی رہے۔ سب کے لیے یہ بات باعث حیرت ہو گی کہ عین الدین بھائی مرحوم نے اپنے حقیقی ماموں کی حیثیت سے کبھی کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

سعید راشد : عین الدین صاحب کے والد گرامی کے بارے میں بھی کچھ بتائیے۔

فخر الدین : عین الدین بھائی کے والد مولانا بدر الدین علوی حافظ عبد الرحیم کے فرزند ارجمند تھے۔ انھوں نے عربی ادب اور علوم دینی کی تعلیم اپنے دور کے جیّد عالم مفتی لطف اللہ سے حاصل کی جن کے شاگردوں میں حبیب الرحمٰن خان شیروانی اور مفتی مولانا عبد اللطیف جیسے بلند پایہ لوگ تھے۔ ہمارے پرانے نظام تعلیم میں ایک مشترک استاد مختلف ادوار پر پھیلے ہوئے سینکڑوں شاگردوں کے درمیان ایک اہم اور مضبوط رابطہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے اپنے تایا مولانا بدر الدین مرحوم سے ہی "استاد بھائی"

کی اصطلاح سنی تھی اور دیکھا تھا کہ مفتی لطف اللہ کے شاگردوں میں کتنی محبت و
یگانگت تھی۔ تمام لوگ معزز ترین "استاد بھائی" کے گھر پر روز شام کو جمع ہوتے اور علمی و
ادبی موضوعات پر باتیں ہوتیں۔ مجھے یاد ہے کہ علی گڑھ میں یہ بیٹھک پہلے مولانا سلیمان اشرف
اور ان کے انتقال کے بعد کبھی حبیب الرحمان خان شیروانی اور کبھی مفتی عبداللطیف صاحب
علی گڑھ یونیورسٹی کے ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی کے گھر پر ہوا کرتی تھی۔ پابندی کا یہ عالم تھا
کہ اگر بارش بھی ہو رہی ہوتی تب بھی چھتری لگا کر جایا کرتے تھے۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ شدید
بیماری کے علاوہ کبھی انہوں نے ناغہ کیا ہو۔ بہت شائستہ اور پاکیزہ زبان انسان تھے سخت
غصہ اور ہیجان انگیز حالات میں بھی شدید ترین لفظ مذمت جو ان کی زبان پر آتا تھا وہ صرف
"نامعقول" تھا گویا یہ ان کی سب سے بڑی گالی تھی۔ گفتگو کچھ زیادہ ہی مفصل ہوتی جا رہی ہے
لیکن وہ محفلیں اپنے دور میں ایک ادارہ کی حیثیت رکھتی تھیں اور تایا مولانا بدرالدین علوی مرحوم
بھی خود اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ عین الدین بھائی اس دنیا سے
رخصت ہونے کے بعد ایک ادارہ محسوس ہو رہے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ تفصیلات بے محل نہیں۔

سعید راشد: یہ تفصیلات بڑی موزوں اور برمحل ہیں ان سے عین الدین علوی صاحب
کی وضعداری اور تہذیب و شائستگی کا پس منظر واضح ہوتا ہے۔ آپ بات جاری
رکھیے اور ان کے والد صاحب کی تعلیم اور علمی کام کے بارے میں مزید تفصیلات بتائیے۔

فخرالدین: میرے تایا مولانا بدرالدین علوی مرحوم پرانے رواج کے مطابق درس نظامی کے
فاضل تھے لیکن پھر اپنے شوق سے عربی اور فارسی ادب کا بہت وسیع مطالعہ کیا اور
انگریزی زبان پر بھی بہت اچھی دسترس حاصل کی۔ عربی علم و ادب پر تو اتنا عبور حاصل کیا کہ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۵۱ء تک درس و تدریس کے
فرائض انجام دیتے تھے۔ یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ انگریزی میں بی اے ایم اے
کی ڈگری نہ ہونے ہوئے بھی ایم اے عربی تک کی کلاسوں کو انگریزی میڈیم میں پڑھایا۔ مزید
برآں قدیم عربی ادب پر انہوں نے بڑی قابل قدر ریسرچ کی۔ ان کی علمی تحقیق کے معیار کا
اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ ان کی زیادہ تر تحقیقی کتابیں مصر سے شائع ہوئی ہیں

ایک تو یہ سامنے شیلف میں پڑی ہوئی ہے" بشار بن برد " عربی کے ایک شاعر ابن درید پر ان کی تحقیق اتنی بلند پایہ تھی کہ جرمنی کی ایک یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کی پیش کش کی تھی لیکن اس کے لیے رسمی داخلہ اور جرمنی میں سال چھ ماہ کا قیام ضروری تھا جو ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ مگر اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ ان کے علمی وقار اور شہرت میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور وہ ریٹائر ہوتے ہوئے عربی کے صدر شعبہ بھی رہے۔

سعید راشد: گویا علم و ادب کا ذوق علوی صاحب کو ورثہ میں ملا تھا۔

فخر الدین: یقیناً اور اس میں خود انہوں نے کئی سمتوں کا اضافہ کیا۔

سعید راشد: وہ کیسے؟

فخر الدین: انہیں پڑھنے لکھنے کا بے پناہ شوق بچپن ہی سے تھا۔ قرآن ناظرہ اور عربی فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد ایک دم چھٹی جماعت میں مسلم یونیورسٹی سٹی ہائی سکول میں داخل ہوئے لیکن اس سے پہلے گھر پر جو بھی مختلف النوع کتابیں دستیاب تھیں پڑھ چکے تھے۔ کتابوں کو ایک جگہ پر جمع کر کے لائبریری سی بنائی ہوئی تھی۔ ان میں اپنے والد کی دقیق علمی کتابیں بھی لا کر رکھ لیا کرتے۔ جب ضرورت پڑنے پر ان کی تلاش ہوتی تھی تو وہ عین الدین بھائی کی لائبریری سے ملتی تھیں۔ مختصر یہ کہ بالکل کم عمری میں گھر کی ساری دینی کتب کا مطالعہ کر ڈالا تھا جو اس عمر کے بچے کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ مجھے بتایا کرتے تھے کہ اس وقت کی پڑھی ہوئی زیادہ تر باتوں کا ادراک ہائی سکول اور یونیورسٹی کی سطح پر پہنچ کر ہوا۔ تعلیمی مدارج میں ترقی کے ساتھ ساتھ ذوق مطالعہ بھی بڑھتا رہا اور اس میں مختلف الانواع مضامین کا اضافہ ہوتا رہا۔ بی اے تک پہنچتے پہنچتے ذوق و شوق مطالعہ نے جنون کی سی شکل اختیار کر لی۔ ادب خاص طور پر عربی ادب و تحقیق کا ذوق انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ اس میں انہوں نے فلسفہ نفسیات و فنون لطیفہ کے ذوق کا اضافہ کیا۔ انگریزی ادب کا بہت وسیع و عمیق مطالعہ کیا۔ بی اے میں ان کے خصوصی مضامین انگریزی زبان و ادب، عربی اور فلسفہ تھے، علی گڑھ یونیورسٹی

میں بی اے تک اُردو اور تھیالوجی (دینیات) لازمی مضامین تھے۔ بی اے میں عین الدین بھائی کی فرسٹ ڈویژن اور پانچویں پوزیشن آئی۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ انگریزی میں Distinction آئی جو علی گڑھ میں ۷۵ فیصد سے زیادہ نمبروں پر ملا کرتی تھی۔ خصوصاً انگریزی میں یہ امتیازی کارکردگی ایک کارنامہ سے کم نہیں۔

سعید راشد: ان کے ذوق مطالعہ اور استغراق کے بارے میں کوئی واقعہ آپ کو یاد ہے؟

فخرالدین :۔ مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آرہا ہے جس سے ان کے ذوق وشوق مطالعہ اور استغراق و بے خودی کا اندازہ آپ کو ہو جائے گا۔ پڑھائی میں اتنے غرق رہتے کہ کسی چیز کا ہوش نہ رہتا۔ نہ کھانے پینے کا ہوش نہ بالوں اور کپڑوں کا ہوش غرض یہ کہ اپنی ذات سے بھی بے خبر۔ مجھے یاد ہے جب بی اے کا امتحان ہونے والا تھا اس زمانہ میں عین الدین بھائی کتب بینی میں اتنے مگن تھے کہ امتحان کا داخلہ فارم بھرنا بھی بھول گئے اور اس کی آخری تاریخ بھی گزر گئی۔ تایا بدرالدین علوی مرحوم یونیورسٹی کے رجسٹرار عظمت الٰہی زبیری صاحب کے پاس خود گئے۔ زبیری صاحب تاخیر سے فارم قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے اس زمانہ میں لیٹ فیس وغیرہ کا بھی رواج نہ تھا۔ زبیری صاحب نے کہا یہاں ہزاروں لڑکے پڑھ رہے ہیں اگر ایک آپ کے بیٹے نے وقت پر فارم نہیں داخل کیا اور وہ امتحان سے رہ جاتا ہے تو کیا ہوا۔ اگلے سال امتحان دے لے گا۔ بہر حال کافی ردّوکد ہوئی اور بالآخر وائس چانسلر کے خصوصی اختیارات سے فارم داخل ہوا۔ جب عین الدین بھائی کے اس رزلٹ کا اعلان ہوا جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے تو تایا بدرالدین علوی مرحوم نے زبیری صاحب کو جتایا کہ ایسے لڑکے کا امتحان دینے سے رہ جانا ایک اور سال ضائع ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ بڑی زیادتی ہوتی۔ زبیری صاحب نے تسلیم کیا اور کہا "عین الدین علوی نے خصوصی رعایت کا حق ادا کر دیا"۔ راشد صاحب یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہو گا کہ عین الدین بھائی مرحوم نے کبھی ڈویژن یا پوزیشن کے لیے خصوصی کوشش نہیں کی۔ بس عام مطالعہ کرتے رہتے تھے اور امتحان سے تھوڑا پہلے درسی کتابوں کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔

سعید راشد: جی ہاں۔ یہ تو ہمارا بھی مشاہدہ تھا کہ ان کا عام مطالعہ بہت وسیع تھا اور انہیں فلسفہ و فنون لطیفہ سے خصوصی دلچسپی تھی۔

فخر الدین: لیکن فلسفہ اور خصوصاً مغربی فلسفہ اور فنون لطیفہ میں ان کی دلچسپی خاندانی روایت سے ذرا ہٹ کر تھی وہ کلاسیکی موسیقی میں اچھا خاصا دخل رکھتے تھے راگ راگنیوں کی بہت اچھی پہچان تھی۔ ہارمونیم پر دھنیں نکال لیتے تھے۔ مجھے یاد ہے اکثر رات گئے پکے گانے کا ریاض کیا کرتے تھے۔

سعید راشد: آپ کے تایا کچھ نہیں کہتے تھے؟

فخر الدین: مجھے معلوم نہیں کہ عین الدین بھائی سے کبھی کچھ کہا یا نہیں لیکن ایک دلچسپ واقعہ یاد کر کے میں اکثر محظوظ ہوتا ہوں۔ نصف شب کے بعد ایک مرتبہ اتفاقاً میری آنکھ کھلی تایا بدر الدین علوی مرحوم بھی اس وقت نماز تہجد کے لیے بیدار ہوئے تھے۔ عین الدین بھائی مرحوم کونے والے کمرے میں پکا گانا گا رہے تھے۔ تایا مرحوم یہ کہتے ہوئے وضو کے لیے غسل خانہ کی طرف چلے گئے "ہمارے گھر میں یہ تان سین کہاں سے آگیا جو آدھی رات کو بھیرویں الاپ رہا ہے۔"

سعید راشد: گویا ان کے والد کا رویہ عین الدین صاحب کے ان مشاغل کے بارے میں Indifferent سا تھا۔

فخر الدین: جی، فنون لطیفہ میں ان کی دلچسپی کا ذکر ہو رہا تھا۔ عین الدین بھائی کو پینٹنگ اور سکیچنگ کا شوق سکول کے ہی زمانہ سے ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی تک پہنچتے پہنچتے فنون لطیفہ میں ان کی کوششوں اور صلاحیتوں کو بہت جلا ملی۔ خاصی ڈرائنگ اور پینٹنگ کی پینسل کلر پیسٹل میں لینڈ سکیپ پینٹنگ کی۔ پہاڑوں، جنگلوں، چوٹیوں گلیشیروں اور جھرنوں کے خوبصورت مناظر پینٹ کیے اور یہ شوق اس حد تک پہنچ گیا کہ بی اے کے بعد وہ ون سکول آف آرٹس میں داخلہ لینے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگے

سعید راشد: پھر داخلہ کیوں نہیں لیا؟

فخر الدین: میرا خیال ہے کہ ہمارے تایا مولانا بدر الدین علوی آڑے آئے۔ غالباً ان کی

خواہش کا احترام کرتے ہوئے ایم اے عربی میں داخلہ لیا تاکہ خاندانی روایت برقرار رہے۔ تایا بدرالدین علوی مرحوم نے بھی اس کے بعد کسی مرحلہ پر عین الدین بھائی کے کیریر کے بارے میں اپنی خواہش ان پر ظاہر نہیں کی۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ عین الدین بھائی ایم اے عربی کے بعد مقابلہ کے امتحان میں بیٹھیں لیکن اس کے بعد انہوں نے اردو میں ایم اے کیا اور پھر خودکفیل ہونے کی دھن میں علی گڑھ ضلع میں ہی راشن کے محکمہ میں انسپکٹری بھی کی جس سے ۱۹۴۸ء میں پاکستان آنے سے قبل استعفٰی دیا۔

سعید راشد: علوی صاحب کی اس ملازمت پر آپ کے تایا کا کیا ردعمل تھا؟

فخر الدین: راشن کی یہ ملازمت تایا مرحوم کی مرضی اور پسند کے بالکل خلاف تھی لیکن جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ ایک مرتبہ فائن آرٹس میں بیٹے کے داخلہ کو روک چکے تھے لہٰذا اس معاملہ میں انہوں نے کوئی تعارض نہیں کیا اور اس پر صبر کر لیا۔ یہ ملازمت بھی عین الدین بھائی کی شان کے خلاف تھی لیکن بس اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی دھن یا خاموش احتجاج کہہ لیں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو یہ بات قابل تعریف ہے کہ باپ کے احترام میں کبھی سرمو بھی فرق نہیں آیا۔ بات طویل ہوتی جا رہی ہے لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ اس ملازمت میں ان کے انتخاب کا واقعہ سناؤں جو آپ کے لیے بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ عین الدین بھائی نے سادے کاغذ پہ ایک درخواست لکھ کر ڈال دی تھی۔ انٹرویو کال نہیں آئی لیکن معلوم ہوا کہ علی گڑھ کے ٹاؤن راشننگ آفس میں انٹرویو ہو رہے ہیں۔ وہاں پہنچ گئے۔ سارے انٹرویو ہو چکے اور ان کا نام نہیں پکارا گیا تو ایک چٹ پر اپنا نام لکھ کر اندر بھیجا۔ فوراً بلا لیے گئے۔ انٹرویو لینے والے علی گڑھ کے ڈپٹی کمشنر سید حامد علی تھے۔ پی سی ایس اور علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے۔ ہمارے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے انہوں نے کھڑے ہو کر استقبال کیا حیرت و استعجاب کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ ملازمت آپ کے خاندان اور آپ کی ڈگری کے وقار سے بہت کمتر ہے۔ لیکن عین الدین بھائی نے اصرار کیا تو انہیں منتخب کر لیا

گیا۔ تقرر کا پروانہ مل گیا اور انوپ شہر میں پوسٹنگ ہوگئی۔ یہ قصبہ علی گڑھ کے مشرق میں دریائے گنگا کے کنارے کھادر کے علاقہ میں واقع ہے۔ ہندوؤں کی بڑی اکثریت ہے۔ مشہور زمانہ گڑھ مکتیشر جہاں ہندوؤں کا مذہبی میلہ لگتا ہے اس کے قریب ہی واقع ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں تقسیم برصغیر سے کچھ پہلے مسلمانوں کا قتل عام ہوا تھا۔ عین الدین بھائی کو اتنی مخدوش جگہ پر پبلک ڈیلنگ کے ایک محکمہ میں کام کرنا تھا۔ جہاں بہت ادنٰی درجہ کے گھٹیا لوگوں سے واسطہ تھا، اور ہر وقت سازشوں کا سامنا تھا لیکن وہ اپنی زندگی کے اس کٹھن دور سے بخیر وخوبی عہدہ برآ ہوئے۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ ان جیسے Intellectual اور آرٹسٹ کے لیے اس ملازمت کا دور کتنا صبر آزما رہا ہوگا۔

سعید راشد: فخر الدین صاحب اب ذرا کچھ ان کی زمانہ طالب علمی کی عادتوں اور مشاغل کے بارے میں بھی بتائیے۔

فخر الدین: انٹرینس یعنی میٹرک تک کی تعلیم انھوں نے مسلم یونیورسٹی سٹی ہائی سکول میں حاصل کی۔ ٹاپ کے طالب علم تھے اور ہائی سکول تک ہمیشہ پہلی تین پوزیشنوں میں رہے زیادہ تر فرسٹ۔ ہم نصابی سرگرمیوں ڈیبیٹنگ اور بزم ادب وغیرہ میں حصہ لیتے تھے ایف اے سے ایم اے تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا۔ جب بی اے میں تھے تو بالکل فنا فی العلم ہو گئے تھے۔ فلسفہ اتنا پڑھتے تھے کہ دنیا ومافیہا کا ہوش نہ رہا تھا۔ رات گئے تک مطالعہ میں مستغرق رہتے تھے۔ لوگوں سے ملنا جلنا، ہم نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینا اور کھیل کود بالکل ترک کر دیا تھا۔ ظاہری ہیئت بھی بالکل فلسفیانہ بن گئی تھی۔ سر کے بال بڑھ کر گردن تک آ گئے تھے اور بالکل ہپوں کی سی شکل بن گئی تھی۔

سعید راشد: ان کی اس ہیئت پر کوئی انگشت نمائی نہیں کرتا تھا۔

فخر الدین: ان کی اس ہیئت وکیفیت پر مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آرہا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں تو یونیفارم اور وضع قطع کی یکسانیت کا بڑا اہتمام تھا۔ انہیں اس حلیہ

میں یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم (جنہیں علی گڑھ کے لڑکے ابا حلیم کہا کرتے تھے) نے ایک مرتبہ دیکھا تو ٹوکا اور کہا کہ یہ آپ نے Musicians کے جیسے بال رکھے ہوئے ہیں۔ مولانا صاحب (یعنی ان کے والد مولانا بدرالدین) آپ کو کچھ نہیں کہتے۔ انہیں کٹوایئے۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ وہ پٹے بی اے فائنل کے بعد ہی کٹے۔ یہ اتفاق ہے کہ اس عرصہ میں عین الدین بھائی کی مڈ بھیڑ پروفیسر اے بی اے حلیم سے دوبارہ نہیں ہوئی ورنہ حلیم صاحب Disciplinarian اور حکم عدولی برداشت نہیں کرتے تھے۔ لیکن میرے خیال میں بھائی عین الدین مرحوم کا یہ طرزِ عمل حکم عدولی کے زمرہ میں آتا نہیں تھا۔ جتنا کہ یہ ان کی غیر معمولی انفرادیت کا مظاہرہ تھا۔

سعید راشد: جی ہاں۔ ان میں انفرادیت تو بہت زیادہ تھی۔

فخرالدین: مختصر یہ کہ ان کی زندگی کا وہ دور تھا جب ان کے اوپر استغراق فی العلم کی وجہ سے ایک بے خودی طاری تھی۔ لباس اور رہن سہن کسی چیز کا ہوش نہ تھا ایک طرح سے عقلیت پرستی کی طرف مائل تھے اور فلسفیانہ ومنطقی استدلال کے بغیر کوئی بات ان کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ اس سلسلہ میں مجھے ان کی تعلیمی زندگی کا ایک انوکھا واقعہ یاد آرہا ہے جو ان کی زندگی کے اسی دور کا ہے اور ان کی جرأت رندانہ کی ایک مثال ہے۔ ایک مرتبہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ فلسفہ، عالمی شہرت یافتہ فلسفی ڈاکٹر سید ظفر الحسن تھرڈ ایئر کی فلسفہ کی کلاس لے رہے تھے۔ عین الدین بھائی نے ایک نکتہ اٹھایا جس پر بحث شروع ہو گئی جو کافی طویل ہو گئی تو ڈاکٹر صاحب نے بالآخر قطعی دلیل کے طور پر کلام پاک کی ایک آیت سنائی کہاں تھرڈ ایئر کا طالب علم اور کہاں ایک عالمی شہرت کا فلسفی، لیکن آپ عین الدین بھائی کی صاف گوئی اور جرأت ملاحظہ کیجیے۔ وہ صرف یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ "کلام الہٰی" کا سہارا لینے پر بڑی مایوسی ہوئی" اور پوری کلاس پر سناٹا چھا گیا۔

سعید راشد: لیکن عین الدین علوی صاحب کو ہم نے جب سے دیکھا مذہب اور روزے نماز کا پابند پایا۔

فخرالدین: جی ہاں۔ عین الدین بھائی کی یہ کیفیت بی اے فائنل تک ہی رہی، پھر ان کی

زندگی میں ایک نیا دور آیا جب انہوں نے از خود مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا۔ کنفیوشس زرتشت اور گوتم بدھ (زرتشت کی ہجے زردشت بھی ہے نسیم اللغات کے مطابق) کے بارے میں بہت کچھ پڑھا۔ علامہ اقبال۔ مولانا مودودی۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ قدیم مسلمان علماء امام غزالیؒ، بو علی سینا اور ابن خلدون کا بھی خوب مطالعہ کیا اور دور جدید کے ہندو مفکر گاندھی اور رادھا کرشنن وغیرہ کو بھی تمام مذاہب ابراہیمی کا ضروری مطالعہ کیا۔ غرض یہ کہ بہت کچھ پڑھا ——————

اور از خود لادینیت سے دامن چھڑا کر دین اسلام کی حقانیت کے قائل ہوئے اور اسلام پر پکا اور سچا یقین لائے۔ عموماً اس قسم کے لوگ "کٹھ ملا" ہو جاتے ہیں لیکن وہ "ملاازم" سے ہمیشہ دور رہے اور "لبرل ازم" کی چھاپ ان پر ہمیشہ قائم رہی۔

سعید راشد: گویا انہوں نے "لاالہ" سے "الا اللہ" تک کا ذہنی سفر طے کیا۔

فخر الدین: جی ہاں۔ یہی سمجھ لیجیے۔

سعید راشد: علوی صاحب کی یونیورسٹی تعلیم کا زمانہ علی گڑھ میں تحریک پاکستان کے عروج کا زمانہ بھی تھا۔ کیا انہوں نے ملکی سیاست میں کوئی خاص حصہ لیا؟

فخر الدین: جہاں تک میرے علم میں ہے عملی سیاست میں انہوں نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ صرف ایک مرتبہ مسلم یونیورسٹی یونین کے الیکشن میں اپنے ایک ساتھی اسد اللہ کے لیے کام کیا تھا۔ اس کے علاوہ بحیثیت ایک عام طالب علم کے علی گڑھ میں سیاسی جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ قائداعظم کو بھی سننے جاتے تھے لیکن سیاسی لیڈری سے انہیں کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا۔ یونین کے الیکشن میں اسد اللہ صاحب سے تعاون بھی کسی سیاسی وابستگی کی بنا پر نہ تھا بلکہ ان کی سنجیدگی و انفرادیت کی وجہ سے تھا۔ معلوم نہیں وہ اسد اللہ صاحب اب کہاں ہیں۔

سعید راشد: ان کے زمانہ طالب علمی کے کوئی اور دوست بھی آپ کو یاد ہیں؟

فخر الدین: عین الدین بھائی خود بہت سنجیدہ اور شائستہ انسان تھے اور ان کے دوست بھی انہی کی طرح متین اور مہذب تھے۔ مجھے ان کے سکول کے زمانہ کے چند دوست اب بھی یاد ہیں۔ سید ماہر رضوی۔ سید علی ابن حامد رضوی، عطا محمد۔ سید مصطفٰی علی بریلوی

(سید الطاف علی بریلوی کے بھانجے یا بھتیجے) بڑی شائستہ اور نفیس کمپنی تھی۔ کچھ معلوم نہیں یہ لوگ کہاں کہاں ہیں۔ ان میں سید ماہر رضوی کی شخصیت بڑی Intellectual اور منفرد شخصیت تھی۔ یہ دوسری جنگ عظیم میں فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ تقسیم برصغیر کے بعد پاکستان بھی آئے۔ اب معلوم نہیں کہاں ہیں۔

سعید راشد: علوی صاحب کچھ کھیلتے بھی تھے؟

فخر الدین: سکول اور فرسٹ سیکنڈ ائر تک کھیل کود میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ سکول ہی کے زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کے سوئمنگ پول میں پیراکی سیکھی۔ اچھے پیراک تھے۔ کھیلوں میں کرکٹ سے شوق تھا۔ سلو گگلی بالنگ کرتے تھے۔ گیند میں غیر معمولی فلائٹ ہوتی تھی اور بہت ٹرن ہوتی تھی بیٹنگ بھی اچھی کرتے تھے اور کیچ شاذونادر ہی دیتے تھے مسلم یونیورسٹی کے کرکٹ نیٹ تک پہنچے لیکن یونیورسٹی یا ہال کی کسی ٹیم میں نہیں کھیلے اصل میں بی اے تک پہنچتے پہنچتے ان کی زندگی نے نیا رُخ اختیار کر لیا تھا۔ جس کا پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ علی گڑھ میں نمایاں پوزیشن تھرڈ فورتھ ائر تک ہی حاصل ہوتی تھی۔ لہٰذا تعلیمی زندگی کے اس شعبہ میں انہوں نے نمایاں پوزیشنیں حاصل نہیں کیں۔

سعید راشد: یہاں تو ٹینس بھی بہت اچھی کھیلتے تھے۔

فخر الدین: ٹینس بعد میں شروع کی ہوگی۔ علی گڑھ میں ٹینس کبھی نہیں کھیلے۔ ہاں ایک بات یاد آئی جو آپ لوگوں کے لیے دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی۔ وہ سال سوا سال مسلم یونیورسٹی جمنیزیم کے ساتھ کلو پہلوان کے اکھاڑے میں بھی جاتے رہے تھے اور ورزش کرتے تھے۔ اس زمانہ میں وہ بڑے Robust ہو گئے تھے۔ گو زندگی کے آخری دور میں بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے لیکن یاد کیجیے ان کی چوڑی ہڈی اور کشادہ ہاڑ دورِ جوانی کی صحت کی غمازی کرتا تھا۔ انہیں کوہ پیمائی کا بھی بڑا شوق تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں کشمیر اور یوپی کے ہل سٹیشنوں کی بڑی سیر کی اور کوہ پیمائی کی۔ رانی کھیت المورڑہ اور نینی تال کی سیر میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ پہاڑی راستوں پر ہم لوگ بہت دور تک چلے جاتے تھے اور جب ہیبت ناک بلندی اور سناٹے

سے خوف محسوس ہونے لگتا تھا، تب واپس آتے تھے۔ انہوں نے اس وقت میٹرک کا امتحان دیا تھا اور میں نے چوتھی جماعت کا۔ وہ فطری مناظر کے حسن کے بڑے دلدادہ تھے۔ میرے خیال میں انہیں لینڈ سکیپ پینٹنگ کی انسپریشن (Inspiration) انہیں پہاڑی مقامات کی سیروں سے ہوئی تھی۔ جوانی میں جسمانی طاقت اور لبعد کی سخت کوشش جو زندگی کے آخری دور تک برقرار رہی بچپن کے اسی دور کی باقیات میں سے تھی۔

سعید راشد: علوی صاحب نے یہاں کالج میں آتے ہی بہت اعلیٰ درجے کے ڈرامے ڈائریکٹ اور پروڈیوس کیے کیا یہ شوق وہاں بھی تھا؟

فخرالدین: جی ہاں، بالکل تھا۔ انہیں خود کسی ڈرامہ میں ایکٹ کرتے تو نہیں دیکھا انہوں نے براہِ راست ڈائرکشن دینے سے اس ہابی کو شروع کیا تھا۔ اس کی ابتدا "علوی کلب" سے ہوئی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس فن میں بہت ترقی کی۔ مجھے یاد ہے علی گڑھ یونیورسٹی ڈرامیٹک کلب کے سیکرٹری سید قطب مرحوم، عین الدین بھائی کے پاس اکثر بیٹھے رہتے تھے اور ڈراموں کے انتخاب اور ہدایت کاری میں ان سے مشورہ اور مدد لیتے تھے۔ اس زمانہ میں انہوں نے فلم بینی بھی کافی تھی۔ اس کے علاوہ ان کا ڈرامہ کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ قدیم یونانی ڈرامہ نگار سوفوکلیز (Sophocles) سے لے کر شیکسپیئر اور ابسن (Ebsen) اور ہمارے دور کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار برنارڈ شا کے تقریباً تمام ڈرامے انہوں نے پڑھے تھے۔ اردو ڈرامہ پر بھی ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ آغا حشر کے بڑے مداح اور قدردان تھے۔ کالی داس اور خلیل جبران کے بھی۔

سعید راشد: انہوں نے کوئی کھیل لکھا بھی؟

فخرالدین: جہاں تک میرے علم میں ہے انہوں نے کوئی طبع زاد ڈرامہ نہیں لکھا۔ برنارڈ شا کے متعدد ڈراموں کے ترجمے کیے: Arms And the Man، Candida وغیرہ۔ اس کے علاوہ بہت سارے انگریزی ڈراموں کو اُردو زبان اور برصغیر کے معاشرتی قالب میں اس طرح ڈھالا کہ وہ بالکل طبع زاد کام محسوس ہوتے تھے

مثلاً وکٹر ہیوگو کے Les Miserables پر مبنی ڈرامہ "ضمیر" کے نام سے لکھا جو غالباً ملٹری کالج جہلم کے ہی سٹیج پر کھیلا گیا۔ آپ کے "عالمگیرین" کے کسی پرانے شمارہ میں اس کا تذکرہ بھی ہے۔ یہ ڈرامہ "چراغ راہ" میں چھپا بھی تھا۔ بہت پرانی بات ہے عین الدین بھائی نے مجھے بتایا بھی تھا کہ نگار اور نقوش والوں نے ان سے گلہ بھی کیا تھا کہ آپ نے یہ ڈرامہ ہمیں دینے کے بجائے "ملاؤں" کے رسالہ میں کیوں چھپوایا۔ ان کی مختلف چیزیں رسائل میں چھپتی رہتی تھیں۔ معلوم نہیں ان کی کاپیاں کہیں محفوظ بھی ہیں یا نہیں۔ وہ ڈرامہ اور فلم کے بہت اچھے نقاد بھی تھے میرے علم میں ان کے اس قسم کے تنقیدی مضامین ہیں لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں چھپے یا کہیں چھپے بھی ہیں یا نہیں۔

سعید راشد: علوی صاحب پاکستان کب آئے اور کیا مشغلہ رہا؟

فخر الدین: غالباً اوائل ۱۹۴۸ء میں اور کچھ دنوں کے بعد بھائی امین الدین علوی وغیرہ کے ساتھ سندھ کے شہر ٹنڈو آدم میں ایک نیا علی گڑھ پبلک سکول قائم کیا۔ ٹیڈم سکول تھا نام اس کا۔ اس کے قائم ہونے سے پہلے ریڈیو پاکستان کے لیے پروگرام اسسٹنٹ کا انٹرویو دیا تھا لیکن جب اس کے سلیکشن کی اطلاع آئی اور تقرر نامہ ملا تو ٹنڈو آدم میں ٹیڈم سکول شروع ہو چکا تھا لہٰذا انکار لکھ بھیجا اور ریڈیو والوں کے متعدد تقاضوں کے باوجود وہاں نہیں گئے۔ اگر ۱۹۴۸ء میں وہاں چلے گئے ہوتے تو ڈائریکٹر کے عہدے تک ضرور پہنچتے۔

سعید راشد: سنا ہے کہ وہ پاکستان میں مقابلہ کے امتحان میں بھی بیٹھے تھے۔

فخر الدین: جی ہاں۔ کراچی میں غالباً رشتہ داروں کے اصرار پر مقابلہ کے امتحان میں بیٹھے تھے۔ لیکن کوئی خاص تیاری وغیرہ نہیں کی بے اعتنائی کے ساتھ ایک نیم دلانہ (Half hearted) کوشش کی تھی لیکن پچھلا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ تحریری امتحان میں ٹاپ کی بیس پچیس میں سے کوئی پوزیشن حاصل لیکن انٹرویو میں صرف دو نمبر سے رہ گئے۔ پبلک سروس کمیشن نے انہیں Argumentative

گردانا اور and uncompromising intellectual
سول سروس کے لیے ناموزوں سمجھا۔ ظاہر ہے جس شخص کو سو میں سے اٹھانوے (۹۸)
نمبر دیئے گئے تھے اسے سو (۱۰۰) بھی دیئے جا سکتے تھے بہر حال انہوں نے کبھی
اس کا کوئی غم نہیں کیا۔ ان کے والد مولانا بدر الدین مرحوم کو البتہ اس کا افسوس رہا اور
ہم لوگوں کو بھی لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتے I'm not a CSP material میرے
لیے تو یہی پیشہ سب سے زیادہ مناسب ہے جس میں قول و فعل کی مکمل آزادی
ہے اور اگر کوئی پابندی ہے بھی تو وہ خود عائد کردہ (Self imposed) ہے۔

سعید راشد: فخر الدین صاحب ٹیڈھم سکول کے بارے میں مزید بتایئے۔ کیا عین الدین
علوی صاحب وہاں پرنسپل تھے؟

فخر الدین:- نہیں۔ پرنسپل تو ایک مشتاق صاحب تھے۔ بھائی عین الدین وہاں استاد
اور ہاؤس ماسٹر تھے۔ نیا نیا سکول تھا۔ مسائل بہت زیادہ تھے اور وسائل بہت
کم۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تقریباً بغیر تنخواہ کے ہی کام کرتے تھے۔ ذرا تصور کیجئے
قیام پاکستان کے بعد کا ابتدائی دور جو اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے حصول کے لیے بہترین
دور تھا اور جائیداد و املاک کی لوٹ مچی ہوئی تھی یہ ہندوستان میں جائیداد چھوڑ کر
بھی آئے تھے اور ان کے حقیقی ماموں پاکستان کے کسٹوڈین جنرل بھی تھے لیکن وہ
سارا زمانہ انہوں نے مفت بغیر تنخواہ کے کام میں گزار دیا۔ وہ بڑے مضبوط اعصاب
والے آدمی تھے اصولی اختلاف پر ڈٹ کر Stand لیتے تھے اور غلط بات پر یعنی
جسے وہ غلط سمجھتے ہوں کبھی Compromise نہیں کرتے تھے۔ ٹیڈھم سکول میں
ان کا سارا وقت اسی کشمکش میں گزرا لیکن سکول پر انہوں نے دن رات اتنی محنت
شاقہ کی کہ ان کی صحت متاثر ہو گئی تا آنکہ بیمار پڑ گئے اور بہت سخت قسم کا ملیریا ہو گیا۔

سعید راشد: تو کیا یہ ٹیڈھم سکول سے دل برداشتہ ہو گئے؟

فخر الدین: بالکل نہیں، وہ ہمت ہارنے والے آدمی تھے ہی نہیں۔ ان کی بہن جب انڈیا
سے آکر ناظم آباد میں آباد ہوئیں تو ان کے اصرار پر میں ہی عین الدین بھائی کو

ٹنڈو آدم سے کراچی لایا تھا۔ وہ صحت یاب ہو کر ٹنڈو آدم واپس جانا چاہتے تھے کہتے تھے یہ کام مجھے پسند ہے۔ وہ بنیادی طور پر معلم ہی تھے۔

سعید راشد: پھر ٹنڈو آدم واپس کیوں نہیں گئے؟

فخر الدین: انہوں نے تو بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن ہم عزیزوں نے اور خصوصاً ان کی بڑی بہن نے، جن کا وہ بہت ادب کرتے تھے جانے نہیں دیا ہم ان کی صحت کی طرف سے متفکر تھے۔ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ کام پر صحت کی بازی لگا دیں ان کی قوت ارادی کچھ اس قسم کی تھی کہ انہوں نے زندگی بھر کسی علالت یا ناسازی طبع کو اپنے کام میں حائل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ مطالعہ کا تو انہیں جنون سا تھا اپنی آخری بیماری کے دو تین ہفتوں کو چھوڑ کر شاید زندگی بھر وہ کبھی ایک بجے رات سے پہلے نہیں سوئے۔ عموماً دس بجے کے بعد مطالعہ شروع کرتے تھے۔ انگریزی اور اُردو ادب کے علاوہ فلسفہ، نفسیات، معاشیات اور مذہبیات سے خصوصاً دلچسپی تھی۔ ٹیگور کے بھی دلدادہ تھے۔ بنگلہ، سنسکرت، ہندی، جرمن اور فرنچ میں اچھی خاصی شد بد تھی۔

سعید راشد: مزاح نگار بلکہ طنز نگار بھی تھے۔

فخر الدین: جی ہاں۔ طبیعت میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ایک بلند عالمانہ ظرافت بھی تھی پطرس اور جسٹس کیانی کے بڑے قدردان تھے لیکن مجھے ان کی طنز و مزاح نگاری کا علم نہیں۔ یہ بعد کی بات ہو گی۔ میں تو علی گڑھ، ٹنڈو آدم اور کراچی کی بات کر رہا ہوں میں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ ہمہ جہت صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ اپنے قائم کردہ نیو علی گڑھ ٹیڈم سکول کو نہیں چھوڑنا چاہتے تھے لیکن عزیزوں کے اصرار پر جب ۱۹۵۳ء میں ملٹری کالج جہلم آ گئے تو پھر دنیا جہان کو اس کے لیے چھوڑ بیٹھے۔ پانچ چھ مرتبہ تو میں نے ان کی لیاقت و صلاحیت کے مطابق اعلیٰ ملازمتوں کے اشتہارات کے تراشے انہیں بھیجے اور التجا کی کہ درخواست ڈال دیں لیکن انہوں نے کبھی ہم لوگوں کی اس قسم کی فرمائشوں کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور ملٹری کالج کو چھوڑنے

کا تصور بھی ان کے ذہن میں کبھی نہیں آیا۔

سعید راشد: بلکہ جان دے کر اٹھے۔ملٹری کالج ان کے لیے صرف ایک ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک مشن بھی تھا۔

فخر الدین: جی ہاں۔ اس میں کیا شک ہے۔ میں نے سنا ہے، یہاں انہیں کمیشن بھی آفر ہوا تھا۔

سعید راشد: جی ہاں۔ ایک بار نہیں کئی بار۔ انہیں ایک سے ایک بہتر ملازمت مل سکتی تھی وہ اپنی ذہانت اور قابلیت کے اعتبار سے یونیورسٹی کی سطح کے آدمی تھے لیکن انہوں نے ملٹری کالج کی آبیاری کرنا بہتر سمجھا۔

فخر الدین: وہ بے حد دیانت دار، خود دار اور بہت اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حامل انسان تھے اصل میں وہ ایک Idealist تھے۔

سعید راشد: Intellectual تخلیقی (Creative) فنکار بھی۔

فخر الدین: میں اس میں ان کی اصول پسندی کا بھی اضافہ کروں گا۔ ان کے بڑے Strong convictions تھے اور اس معاملہ میں وہ کسی Compromise کے قائل نہیں تھے۔

سعید راشد: فخر الدین صاحب ایک اور بات، میں علوی صاحب کے خط کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ علوی صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے میں نے دیکھے ہیں ان کا خط نہ صرف پختہ تھا بلکہ اس میں خط نستعلیق کی فنی خوبیوں کے ساتھ خط طغرا کی بھی ہلکی سی جھلک نظر آتی۔ اس کا کیا پس منظر ہے۔

فخر الدین: آپ بھی صاحب نظر ہیں۔ آپ نے خوب پہچانا۔ بھائی عین الدین مرحوم نے خطاطی بحیثیت ایک فن کے مشہور خطاط منشی امجد علی صاحب مرحوم سے سیکھی تھی جن کا تعلق مفتی لطف اللہ کے خاندان سے تھا اور جو بیسویں صدی کے نصف اوّل میں ماہرین فن خطاطی کی آخری نسل سے تھے۔ عین الدین بھائی مرحوم کی اُردو خوشخطی منشی امجد علی صاحب مرحوم کے خط نستعلیق کی قریب ترین شبیہ تھی۔ ان کا اُردو خط تو آپ نے اور ملٹری کالج کے ہزاروں طالب علموں نے دیکھا ہے۔ ذرا

پھر غور سے دیکھیے۔ اس میں کتنی Perfection ہے اس کے زیر و زبر شوشے اور دائرے اور حروف کی شکل و عام کشید میں جو باریکی، تناسب اور حسن ہے وہ عین الدین بھائی مرحوم کی شخصیت کی باطنی نفاست کو منعکس کرتا ہے۔ خوشخطی کے علاوہ انہیں خط طغرا سے بھی خصوصی دلچسپی تھی اور زمانہ طالب علمی کے فارغ اوقات میں بڑے خوبصورت طغرے بنایا کرتے تھے۔

سعید راشد: خوش قسمتی سے خط نستعلیق اور خط طغرا میں علوی صاحب کی خطاطی کے نمونے میں نے خود دیکھے ہیں۔ جب میں آپ سے اس انٹرویو کی تیاری کر رہا تھا تو میں نے انیس سلمہ سے کہا تھا کہ وہ علوی صاحب کے پرانے کاغذات میں سوانحی مواد تلاش کریں۔ انہوں نے مجھے ان کی بی اے کے زمانے کی پرانی کاپیاں دکھائی تھیں جس میں خط طغرا، خط نستعلیق اور خط نسخ میں آف ہینڈ خطاطی کی گئی تھی۔

فخر الدین: سبحان اللہ کتنی ہمہ گیر شخصیت تھی۔

سعید راشد: فخر الدین صاحب اس تمام گفتگو میں ان کی شاعری کا ذکر نہیں آیا۔

فخر الدین: مجھے اس پہلو کا علم نہیں۔

سعید راشد: وہ میں بتاتا ہوں۔ وہ پیشہ ور شاعر تو نہیں تھے لیکن فن عروض سے واقف تھے کالج میگزین کی اردو نظموں اور غزلوں کی اصلاح وہی کرتے تھے بلکہ پوری پوری نظم یا غزل دوبارہ لکھتے تھے۔ جب میں میگزین کے انگریزی سیکشن کا ایڈیٹر تھا تو لڑکوں کی لکھی ہوئی انگریزی کی نظموں کی اصلاح انہی سے کراتا تھا۔ اب حال ہی میں انیس سلمہ نے مجھے بتایا کہ انہوں نے علوی صاحب کی ایک پرانی بیاض دیکھی تھی جس میں ان کی زمانہ طالب علمی یا اس کے فوراً بعد کی غزلیں لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ بیاض تلاش کریں تاکہ اسے کالج میوزیم کے علوی سیکشن میں رکھا جا سکے۔ اسی طرح ان کے تنقیدی اور ادبی مضامین اکٹھے کرنے کی ضرورت ہے۔ میں خود علویات کے نام سے ان کی اردو تحریروں کو جمع کر رہا ہوں۔ ان میں سے بیشتر کالج کے میگزین ترنیت / عالمگیرین میں چھپی تھیں۔ ان کے اخذ کیے ہوئے ڈراموں کے مسودوں کی

تلاش بھی جاری ہے۔ تربیت کے ادارئیے بھی خاصے کی چیز ہوتے تھے۔ فخرالدین صاحب ایک اور سوال جو بار بار نیم شعور کی دہلیز پر آکر دستک دیتا ہے یہ ہے کہ کوئی ایسا واقعہ بھی آپ کو یاد ہے جس سے ان کی قائداعظم یا تحریک پاکستان سے وابستگی ظاہر ہوتی ہو۔

فخرالدین: ''سیاست میں دلچسپی نہ ہونے کے باوجود قائداعظم سے بچپن ہی سے بے پناہ عقیدت تھی۔ قائداعظم ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کی تنظیم نو اور اس کی صدارت پر فائز ہونے کے بعد غالباً جب پہلی بار علی گڑھ تشریف لائے تو عین الدین بھائی مرحوم اس وقت نویں جماعت میں تھے اور میں تیسری میں۔ علی گڑھ کے ریلوے سٹیشن پر قائداعظم کے استقبال کے لیے ایک خلقت جمع تھی۔ عین الدین بھائی مرحوم مجھے ساتھ لے کر سٹیشن کی طرف پیدل روانہ ہو گئے جو یونیورسٹی سے تقریباً ڈیڑھ میل دور تھا۔ ہم لوگ سٹیشن کے اندر نہیں پہنچ سکے۔ اس کے صدر دروازے ہی تک جا سکے۔ دونوں طرف لوگ ہار لیے ہوئے کھڑے تھے۔ بعض باریش لوگ کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے اور اشکبار تھے قائداعظم کی سواری کے لیے حبیب الرحمٰن خان شیروانی کی گھوڑا گاڑی آئی تھی ہم دونوں اس کے پاس ہی کھڑے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علموں نے اس کے گھوڑے نکال دیئے تھے اور اس فٹن پر قائداعظم کو بٹھا کر خود حبیب منزل تک کھینچ کر لے جانے کے لیے تیار تھے۔ میں تو بہت چھوٹا تھا لیکن عین الدین بھائی مرحوم دوسرے بڑے بڑے لڑکوں کے ساتھ اس میں جُتنا چاہتے تھے۔ قائداعظم سٹیشن سے سے نکل کر فٹن کی طرف تشریف لا رہے تھے کہ انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کا ایک ریلا آیا اور ہم دونوں گر گئے۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ ایک قوی ہیکل غالباً سرحدی طالب علم نے ہم دونوں کو گرتے ہوئے دیکھ لیا اور یہ نعرہ لگاتے ہوئے کہ سکول کے بچے ہیں انہیں بچاؤ ہم دونوں کو مجمع کے نرغے سے نکال کر محفوظ جگہ پر پہنچایا۔ ورنہ ہمارا تو کام تمام ہو گیا تھا۔

سعید راشد: فخرالدین صاحب۔ آخر میں ایک اور سوال کروں گا جو پہلے پوچھنا چاہیے تھا وہ

یہ کہ قبلہ عین الدین علوی صاحب کے بھائی بہن کتنے ہیں؟

فخرالدین: دو بھائی اور دو بہنیں۔ بڑے بھائی ڈاکٹر ضیاء الدین علوی جو علی گڑھ یونیورسٹی میں جغرافیہ کے پروفیسر رہے۔ قرون وسطیٰ کے عرب جغرافیہ دانوں پر بلند پایہ تحقیقی کام کیا اور آخر میں جنرل ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ بھی رہے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں ایک چھوٹی بہن بھی وہیں انڈیا میں ہیں۔ بڑی بہن ۱۹۶۲ء میں پاکستان آ گئی تھیں جن کا پچھلے سال جولائی میں انتقال ہو گیا اور اب یہ خود شہاب ثاقب کی طرح ٹوٹ کر بکھر گئے۔

سعید راشد: اور روشنی کی ایک لکیر پیچھے چھوڑ گئے۔

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

——— آصف سعید[1]

جینیئس کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ مختلف سمتوں میں غیر معمولی ذہنی اور تخلیقی صلاحیت رکھتا ہے۔ سر علوی ان معنوں میں بلاشبہ ایک جینیئس تھے۔ ان کی شخصیت کے ایک نہیں کئی پہلو تھے اور ہر پہلو نے کسی نہ کسی طرح کالج کی تعمیر کے لیے کام کیا اور یہ سلسلہ ایک دو نہیں، چونتیس سال تک جاری رہا۔ ملٹری کالج کی خوش قسمتی تھی کہ اسے اتنے طویل عرصے تک ایسے یکتا و یگانہ مدرس، معلّم، ماہر تعلیم، فنکار اور ادیب کی خدمات حاصل رہیں۔ اب تو ان کا جسمانی وجود مٹی میں مل چکا ہے جس سے کسی فانی انسان کو مفر نہیں۔ لیکن ان کی شخصیت، ان کا کام باقی ہے اور ملٹری کالج کے تشخص کا ایک لازوال حصہ ہے۔ ان کے کنٹری بیوشن کا جائزہ لینے کے لیے سر سعید راشد سے زیادہ موزوں اور کون ہو سکتا تھا اس موضوع پر سر راشد کے تاثرات اور افکار ایک انٹرویو کی شکل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

آصف: سر، وہ طلبہ یا وہ لوگ جو سر علوی کو تھوڑا بہت جانتے ہیں یا جو ان کے شاگرد رہے ہیں انہیں تو ان کی غیر معمولی صفات اور خدمات کا تھوڑا بہت اندازہ ہے لیکن وہ جنہیں ان سے فیضیاب ہونے کا براہ راست موقع نہیں ملا یا کالج کی آئندہ نسلیں۔ ان

---

[1] کالج نمبر ڈی ایس ۶۳۔

کے استفادہ کے لیے ضروری ہے کہ کالج میں پروفیسر علوی کے کیریئر اور کنٹری بیوشن کا جائزہ لیا جائے۔ اس سلسلہ میں مجھے آپ سے انٹرویو کرنے کا خیال آپ کے اس انٹرویو کو پڑھ کر ہوا جو آپ نے علوی صاحب کے کزن جناب پروفیسر فخرالدین علوی سے لیا تھا۔ وہ انٹرویو سر علوی کے خاندانی پس منظر تعلیم اور یہاں آنے سے پہلے کے واقعات پر محیط ہے۔ یہ انٹرویو ان کے یہاں آنے سے ان کے انتقال تک کے سوانح و کوائف پر حاوی ہوگا اور بہتر ہوگا کہ دونوں کو ایک ساتھ پڑھا جائے تو سر اجازت ہے کہ میں اپنا سوال نکالوں۔

پروفیسر راشد: ضرور۔

آصف: میرا پہلا سوال تو یہ ہے کہ ان کا کارناموں یا خدمات کی تفصیلات میں جانے سے پہلے ملٹری کالج میں ان کی رسمی ذمہ داریوں کا کچھ تذکرہ ہو جائے۔

پروفیسر راشد: علوی صاحب اپریل ۱۹۵۳ء میں یہاں اُردو کے سینیئر ماسٹر ہو کر آئے۔ اسی سال سینیئر کلاسوں کو اُردو پڑھانے کے علاوہ انھوں نے تین اضافی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ کالج کے میگزین تربیت کے اردو سیکشن کے انچارج مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء کا تربیت انہیں کے زیر ادارت شائع ہوا۔ یہ کام ان کے پاس تا دم آخر رہا۔ اس کے علاوہ اردو ڈرامہ اور ملٹری کالج سٹوڈنٹس یونین (۱۹۵۸ء تک کالج کی ڈیبیٹنگ سوسائٹی کا نام علی گڑھ کی روایت پر کالج یونین ہی تھا) کا چارج بھی سنبھالا۔ مزید برآں اسی سال وہ آکنلک ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر بھی مقرر ہوئے۔ ہاؤس آفیسر کیپٹن غلام علی تھے۔ ۱۹۵۶ء میں وہ برڈووڈ ہاؤس (حال محمود غزنوی ہاؤس) کے ہاؤس ماسٹر ہوئے اس وقت اس کے ہاؤس آفیسر کیپٹن این ڈی احمد (بعد کو کرنل این ڈی احمد جو ۷۳-۱۹۷۱ء میں کالج کے کمانڈنٹ بھی رہے) تھے۔ ۱۹۵۹ء میں علوی صاحب اورنگزیب ہاؤس کے ہاؤس آفیسر مقرر ہوئے ۶۴-۱۹۶۳ء میں وہ محمود غزنوی ہاؤس کے ہاؤس آفیسر رہے۔ یہ آخری ہاؤس ماسٹری تھی جو انھوں نے کی۔ ۱۹۷۰ء میں وہ حیدری صاحب کے ریٹائر ہونے پر اولڈ بوائز ایسوسی ایشن عالمگیر نیز ایسوسی ایشن کا نام ۷۹ء میں پڑا) کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ نومبر ۸۶ء کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر وہ چوتھی بار سیکرٹری منتخب ہوئے گویا پچھلے سترہ سالوں سے وہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سیکرٹری جنرل چلے آ رہے تھے۔ ۸۳ء میں جب کیڈٹس کونسل قائم ہوئی تو وہ اسکے پہلے چیئرمین مقرر ہوئے تھے اپنی وفات تک وہ اس

منصب پر فائز رہے۔ یونین کے صدر جیسا کہ پہلے بتایا ہے، ۵۳ء رہے تھے یہ سب ذمہ داریاں تحلیقی نوعیت کی تھیں ان میں سوچنا لکھنا پڑھنا اور خون جگر جلانا ہر روز کا کام تھا۔

آصف رسر، یہ تو سرسری جائزہ ہوا۔ ان کی گوناگوں ذمہ داریوں کا۔ اب میں درخواست کروں گا کہ آپ ان سرگرمیوں پر باری باری تبصرہ کریں تاکہ پڑھنے والوں کو اندازہ ہو کہ ان میدانوں میں ان کا کیا مقام تھا۔

پروفیسر راشد: میں ان کے ڈراموں سے بات شروع کرتا ہوں جیسا کہ فخر الدین علوی صاحب نے اپنے انٹرویو میں کہا ہے کہ ڈرامہ کے فن سے انہیں علی گڑھ میں اپنے زمانہ طالب علمی سے دلچسپی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے ٹیڈم سکول میں بھی کوئی ڈرامہ سٹیج کیا ہو۔ یہاں آکر انہوں نے نومبر ۱۹۵۳ء میں ڈرامہ سٹیج کیا اس کا نام ضمیر تھا۔ اسے لکھا بھی انہوں نے خود تھا اور خود ہی ڈائریکٹ اور پروڈیوس کیا تھا۔ اس کے بعد سے نومبر ۱۹۸۶ء میں ڈائمنڈ جوبلی تک جو ڈرامے انہوں نے سٹیج کیے ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۹۵۳ء ضمیر۔ ۱۹۵۴ء کار کی شادی۔ ۱۹۵۶ء انسپکٹر جنرل ۱۹۵۷ء، انسپکٹر جنرل ۱۹۵۷ء شامت اعمال ۱۹۵۸ء پہلی پیشی اور چاندنی بی ۱۹۵۹ء خدائی فوجدار۔ ۱۹۶۰ء آسمان سے گرا۔ ۱۹۶۱ء جو تشی۔ ۱۹۶۲ء فٹ پاتھ کے شہزادے۔ ۱۹۶۳ء خانہ جنگی۔ ۱۹۶۵ء ریہرسل ۱۹۶۶ء کار برائے فروخت ۱۹۶۸ء جوتشی۔

۱۹۷۰ء سے مسٹر حیدری کی ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے انگریزی ڈراموں کا بھی چارج سنبھالا۔ ان اردو انگریزی ڈراموں کی تفصیل یہ ہے۔

	انگریزی	اُردو
۱۹۷۰-۷۱ء	Shivering Shocks	مہربان کیسے کیسے
۱۹۷۲-۷۳ء	Dear Departed	اناس اور ایٹم بم
۱۹۷۳-۷۴ء	Hostile Witness	مریدپور کا پیر
۱۹۷۵-۷۶ء	Betrayal	خوشی
۱۹۷۶-۷۷ء		خاک نشین

۷۹-۱۹۷۸ء	Dear Departed	بڑا صاحب
۸۰-۱۹۷۹ء		کاربرائے فروخت / رستم و سہراب
۱۹۸۲-۸۳		شامت اعمال / خواب ہستی

ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر انھوں نے انگریزی میں Dear Departed اور اردو میں جو نشی پیش کیا۔ صرف تعداد کے لحاظ سے بھی یہ تعداد قابل لحاظ ہے۔ لیکن اصل چیز ان ڈراموں کا معیار ہے۔ حیدری صاحب تو انٹرنیشنل سطح کے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر تھے علوی صاحب بھی کم نہیں تھے۔ ایک زمانہ میں جب کالج لاہور ایجوکیشن بورڈ سے ملحق تھا اور بورڈ انٹر کالج ڈراموں کے مقابلے کراتا تھا تو برس ہا برس تک کالج تمام پنجاب میں اول آتا رہا۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۲ء میں کالج کے ڈراموں کو بورڈ کی طرف سے جانچنے کے لیے مشہور ریڈیو آرٹسٹ موہنی حمید آئی تھی۔ انہوں نے ڈرامہ شو دیکھ کر کہا یہ پروفیشنل معیار کے ڈرامے ہیں۔ ڈراموں میں میوزک بھی ضرور ہوتا ہے کورس وغیرہ۔ علوی صاحب کلاسیکی موسیقی سے بھی واقف تھے۔ ہارمونیم بجا لیتے تھے۔ بلکہ مختلف راگوں میں دھنیں بھی نکال لیتے تھے۔ کالج میں ڈراموں کا جو معیار انھوں نے قائم کیا اور جس طرح سینکڑوں لڑکوں کو انھوں نے ڈراموں کے لیے اور موسیقی کے لیے تیار کیا وہ ان کا اتنا بڑا کنٹری بیوشن ہے جس کا کچھ اندازہ ان ہی کو ہو سکتا ہے جنھوں نے تیس برس تک انہیں اس فن کے ذریعہ سے لڑکوں کو پروان چڑھاتے دیکھا۔ یہاں میں ایک اور بات بھی زور دے کر کہنا چاہتا ہوں، ڈرامہ یا کسی اور فنکشن کا صرف معیار ہی Count نہیں کرتا یہ تو فنی پہلو ہے ایک اور چیز بھی کاؤنٹ کرتی ہے اور زیادہ کاؤنٹ کرتی ہے، وہ فنکار کا خلوص اور لگن ہے۔ علوی صاحب نے سٹیج کا سارا کام ۳۴ سال تک جس والہانہ دلچسپی اور لگن سے کیا اس Devotion کا لڑکوں پر اور ان کے کردار پر جو دور رس اثر پڑا اصل کارنامہ تو وہ ہے اسی طرح کالج یونین کو انھوں نے سنبھالا اور پروان چڑھایا اوسطاً ہر سال ۶۴ لڑکے انٹر ہاؤس تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے تھے۔ ان سب کو ۳۴ سال تک کم و بیش خود

ہی تیار کرتے رہے۔ ان کے علاوہ کالج یونین کے زیرِ اہتمام تمام قومی مذہبی ایام جیسے عید میلاد النبیؐ، یوم اقبال، یوم قائداعظم، یوم استقلال پاکستان، یوم دفاع وغیرہ پر وہ ہر سال شاندار تقریبات کا اہتمام کرتے تھے۔ ان کے بیشتر مضامین خود لکھتے تھے اور نظموں، غزلوں، کورسوں کو بھی تیار کراتے اور اس کام کو بھی وہ جس جذبے اور لگن سے کرتے وہ بہت Inspiring تھا۔ ڈرامہ کی طرح اس معاملہ میں بھی وہ کمال پسند Perfectionist تھے۔ بہترین سے کم تر کوئی چیز انہیں مطمئن نہیں کر سکتی تھی۔ جن طلبہ نے ان تقریبات کے لیے ان کے سامنے ریہرسل کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ایک باریک سی غلطی کو وہ دس بار نہیں پچاس بار ٹھیک کرانے سے نہیں تھکتے تھے۔ اللہ اکبر کتنی صلاحیت تھی اور کتنا Commitment تھا۔

آصف: ان کے معیار ادارت پر بھی کچھ کہیئے گا۔

پروفیسر راشد: وہ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۸۷ء تک کالج میگزین کے اُردو سیکشن کے ایڈیٹر رہے ان رسالوں کے اداریئے بھی خاصے کی چیز ہیں ان کا سٹائل یہ تھا کہ وہ ہر سال کے اداریہ میں کالج کی سال بھر کی نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں اور پالیسی تبدیلیوں کا جائزہ لیا کرتے تھے یہ اہتمام اس لیے بھی تھا کہ کالج کی سرگرمیوں کی رپورٹ انگریزی سیکشن میں ہوتی تھی۔ اردو سیکشن میں ایسا کوئی جائزہ نہیں ہوتا تھا۔ ان کے ایڈٹ کیے ہوئے میگزین میں مواد کا تنوع اور سٹائل کا حسن قابل داد اور قابل ذکر تھا۔ خصوصاً مزاحیہ اور تخلیقی مضامین میں ان کا اپنا رنگ صاف دیکھا جا سکتا تھا۔

آصف: آپ کا اشارہ کس طرف ہے۔

پروفیسر راشد: میرا روئے سخن ان کی مزاح و طنز نگاری کی طرف ہے۔ علوی صاحب ایک صاحبِ طرز ادیب تھے۔ طنز و مزاح ان کا خاص میدان تھا۔ تربیت کے ہر شمارہ میں ان کا ایک طنزیہ انشائیہ ضرور شائع ہوتا تھا۔ اگر ان انشائیوں کو یکجا کر کے شائع کر دیا جائے تو یہ علوی صاحب کو خراج عقیدت ہی نہیں بلکہ ادب کی خدمت بھی ہوگی اور طلبہ کو روشنی ملے گی کہ طنز و مزاح ایسے لکھا جاتا ہے۔ علوی صاحب

انفرادیت کے بڑے قائل تھے۔ ادب اور زندگی کے بڑے اچھے نقاد اور طنز نگار بھی۔ یہ تینوں رجحانات ان کے اداریوں اور مرتب کیے ہوئے شماروں میں ملتے ہیں سیاست میں جمہوری لبرل ازم اور معیشت میں ابوذر غفاری کا نقطہ نظر رکھتے تھے تربیت (اب عالمگیرین) کے ذریعہ انھوں نے ہر اس لڑکے کو قلم پکڑ کر لکھنا سکھا دیا جس میں قلمکاری کی تھوڑی سی بھی رمق تھی اور جو اس میدان میں خصوصی صلاحیت (Talent) رکھتے تھے ان کی انہوں نے بھرپور تربیت کی وہ ادیب گر تھے۔ مفکر تھے اور سوچنا بھی سکھاتے تھے۔ He was a great noncon formist لکیر کے فقیر نہ وہ خود تھے اور نہ کسی کو دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کالج میں ان کی حیثیت سقراط کی سی تھی۔ افسوس کہ ان کا واسطہ بڑے بڑے اونچے "عقلمندوں" سے بھی پڑا۔

آصف: آپ کا روئے سخن کس کی طرف ہے؟

پروفیسر راشد: بغیر نام لیے صرف ایک واقعہ ریکارڈ پر لاتا ہوں۔ ان کے ایک انشائیے کا عنوان کپڑے، تہذیب اور چھلکے ہے۔ ۱۹۶۴ء کے تربیت میں شائع ہوا اس کو پڑھ کر ایک بلند مقام نے کہا "میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا یہ آپ کیا لکھ لائے ہیں"۔ علوی صاحب کے خاموش کرب کو میں نے دیکھا۔ اس کے علاوہ بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ اپنی سوچ میں یہاں تنہا تھے۔ ان کے علم و فضل دونوں کو یہاں بہت کم سمجھا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس جگہ کے لیے بہت بڑے تھے بہت ہی بڑے۔ جیسا کہ میں نے ان کی یاد میں اپنی تعزیتی تقریر میں کہا تھا کہ جو لوگ پہاڑوں پر رہتے ہیں انہیں پہاڑوں کی بلندیوں کا احساس نہیں ہوتا۔ علوی صاحب ایک عام انسٹرکٹر کی حیثیت سے اتنے گھلے ملے تھے، اتنی عام سی چیز بنے ہوئے تھے کہ ان کی بڑائیوں کا اندازہ پورے طور پر نہ ہو سکا۔ دیکھنے کے لیے آنکھوں ہی کی نہیں روشنی کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

آصف: سر، کالج یونین یا ڈیبیٹنگ سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے ان کا کیا کارنامہ ہے۔

پروفیسر راشد: کالج یونین کے سربراہ کی حیثیت سے انہوں نے لڑکوں کو بولنا ہی نہیں سکھایا بلکہ ان کے ادبی ذوق اور قومی و ملی شعور کو بھی اجاگر کیا۔ اس کام کو انہوں نے عبادت

کی طرح پورے تواتر اور انہماک سے کیا۔ اس دائرہ میں بے شمار طلبہ نے ان سے فیض حاصل کیا۔ دنیا کا کام تو چلتا ہی رہتا ہے ان کے بغیر اب کالج کی ہم نصابی سرگرمیوں کے بارے میں کیا کہوں۔ بقول غالب

؎ مجنوں جو مر گیا ہے جنگل اداس ہے

آصف: علوی صاحب تقریباً دس برس ہاؤس ماسٹر بھی رہے۔ اس دائرہ میں ان کا طریق کار کیا تھا؟

پروفیسر راشد: اسی علوی نامہ میں ان کے چند رفقاء کار اور شاگردوں کے تاثرات شائع ہو رہے ہیں۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے اور میں بحیثیت ان کے ایک رفیق کار کے شاہد ہوں کہ وہ پبلک سکول کے مثالی ہاؤس ماسٹر بھی تھے۔ Committed اور Understanding بھی۔ نرم دم گفتگو گرم دم جستجو۔ اولڈ بوائز میں سے ان کے اصل شیدائی (Fan) وہی ہیں جنہوں نے ان سے ان کے ہاؤس میں تربیت حاصل کی۔ ایم جی ہاؤس اور اورنگ زیب ہاؤس کی سوشل شاموں Social Evenings کو بھی جس معیار پر انہوں نے پہنچا دیا تھا ویسا سماں تو کالج سٹیج پر بھی مشکل سے بندھتا ہے۔ ہاؤس میں انہوں نے پبلک سکولوں کے روایتی استاد باپ کا کردار ادا کیا۔

آصف: سر، وہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سیکرٹری اور کیڈٹ کونسل کے چیئرمین تھے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

پروفیسر راشد: ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۷ء تک عالمگیرینز کی انجمن کے سیکرٹری رہے۔ یہ بھی اچھا خاصا کام ہے۔ انہوں نے اس عرصے میں ۱۹۷۵ء کی گولڈن جوبلی اور ۱۹۸۶ء کی ڈائمنڈ جوبلی کو مڑھے چڑھایا۔ ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۲ء کی ۲ ری یونین بھی کرائیں۔ عالمگیرینز نیوز لیٹر بھی نکالا۔ غرض اس ذمہ داری کو بھی انہوں نے آخر دم تک مخصوص انداز میں دل و جان سے نبھایا۔ ایسوسی ایشن کے سابق صدر اور سرپرست اعلیٰ جنرل اقبال اور موجودہ صدر لیفٹیننٹ جنرل اقبال نے اپنے تعزیت ناموں میں ان کی خدمات کو جس دل سوزی اور گہرے خلوص سے سراہا، کراچی، لاہور، راولپنڈی، میرپور،

کوئٹہ، گلگت ز دنوں میں جو تعزیتی جلسے ہوئے ان کی رو دادوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس دائرہ میں بھی ان کی مخلصانہ خدمات بہت زیادہ تھیں۔

آصف : سر، پروفیسر علوی اتنے بڑے ادیب تھے ان کی کوئی تصنیف یا تالیف بھی ہے؟

پروفیسر راشد : ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ میں علویات کے عنوان سے مرتب کر رہا ہوں۔ ان کے علاوہ ان کی ایک کتاب فلسفہ تعلیم پر ہے جو دراصل مشہور امریکی تعلیمی فلسفی جان ڈیوی (Dewey) کی ایک کتاب Education & Democracy کا ترجمہ ہے۔ جسے الطاف علی بریلوی نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے شائع کیا تھا۔ اسی طرح انہوں نے برنارڈ شا کے ایک دو ڈراموں Candida اور Arms And the Man کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ آخری دنوں میں خلیل جبران کی کتاب Sand & Foam کا ترجمہ بھی کر رہے تھے۔

آصف : اب میں ایک سوال خاص طور سے ان کے پڑھانے کے سٹائل پر پوچھنا چاہوں گا۔

پروفیسر راشد : ہاں یہ اہم سوال ہے اور تفصیل چاہتا ہے۔ مسٹر علوی کا خصوصی Contri-bution اسی دائرہ میں ہے۔ اچھے استاد تین قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو اچھے Subject teachers ہوں۔ وہ جو کتاب کے حوالے سے نصاب کے حوالے اپنے مضمون کو اچھی طرح پڑھا سکیں ان کی Teaching محض Reproduc-tive ہوتی ہے۔ ان کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ طلبا کو اچھے نمبروں سے امتحان پاس کرا دیں اور بس۔ اس قسم کے اچھے استادوں کی اپنی اہمیت ہے۔ ایک ادارہ میں اس قسم کے استاد ۶۰ یا ۷۰ فیصد بھی ہوں تو کافی ہیں۔ چونکہ امتحان پاس کرنا اور کرانا بھی بہرحال ایک ضرورت تو ہے۔ دوسری قسم کے استاد وہ ہوتے ہیں جو اپنے مضمون اور متعلقہ مضامین پر ماہرانہ نظر رکھتے ہیں جو صرف مضمون کی کتاب ہی نہیں پڑھاتے، اس مضمون کی Under-standing اور اس کا ذوق بھی اپنے طلبا میں پیدا کر سکتے ہیں۔ جو ہر سبق کی گہرائی میں جاتے ہیں۔ اس کو Inter-pret کرتے ہیں۔ اس کی تعبیر کرتے ہیں جو کتاب ہی نہیں پڑھاتے زندگی کو بھی سامنے رکھتے ہیں جو طلبا کی شخصیت، کردار

اور عمومی آگہی General awareness کی نشو ونما پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ جن کا اپنا مطالعہ اور مشاہدہ اور ذہنی گہرائی Intellectual depth طلبہ کے Views ہی کو نہیں ان کے Vision کو بھی متاثر کرتی ہے۔ یہ وہ استاد ہیں جو معلومات اور علم میں فرق کرنا جانتے ہیں جو محض Instruct نہیں کرتے Educate کرتے ہیں۔ جو ہمہ گیر تعلیم Total education میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کو Creative teachers کہا جاتا ہے۔ عموماً یہ لوگ خود بھی بہترین یونیورسٹیوں میں پڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور بہترین استادوں سے براہِ راست فیض یاب ہوتے ہیں۔ ایک پبلک سکول میں ایسے ممتاز اساتذہ کم از کم بیس فیصد ہونے چاہیئں ستر فیصد وہ عام اساتذہ Subject Teachers ہوئے اساتذہ کی تیسری قسم بھی ہے جو دوسری قسم کے اساتذہ کی صفات رکھتے ہوئے خود جینیئس قسم کی چیز ہوتے ہیں یعنی highly Talented ہوتے ہیں۔ ایک یا دو تین شعبوں میں۔ اس کی ایک مثال مسٹر حیدری ہیں اور دوسری مسٹر علوی۔ حیدری صاحب کو انگریزی زبان پر ماہرانہ عبور حاصل تھا۔ ان سے اچھا انگریزی کا استاد کم از کم میں نے نہیں دیکھا۔ انگریزی ڈرامہ پیش کرنے پر ماہرانہ اور فنکارانہ دسترس تھی۔ وہ آج کل کے بڑے سے بڑے پروفیشنل پروڈیوسر سے بھی زیادہ تھی کم نہیں۔ اسی طرح موسیقی، مصوری میں بھی ایک مقام تھا۔ ظاہری شخصیت بھی Person-ality بھی بہت Impressive تھی۔ یہی حال علوی صاحب کا تھا۔ اُردو۔ فارسی۔ عربی کے علاوہ انگریزی اور کسی حد تک فرانسیسی پر ماہرانہ عبور رکھتے تھے۔ فلسفہ و تصوف، نفسیات، معاشیات، عمرانیات پر فاضلانہ نظر تھی اور دنیا کا ادب تو اتنا پڑھ رکھا تھا جس کا حد وحساب ہی نہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ مسلسل پڑھتے رہتے تھے۔ دس گیارہ بجے سے ایک ڈیڑھ بجے تک ہر روز پڑھتے تھے ۳۴ برس تک مسلسل وہ یہاں پڑھتے رہے۔ زمانہ طالب علمی میں بھی انہیں مطالعہ کا جنون تھا۔ اس لیے کم از کم اس کالج میں وہ علم و فضل کا حوالہ تھے۔ اس نظری علم و کمال کے علاوہ خود بھی انگریزی اُردو

کے ادیب تھے۔ بہترین ڈائریکٹر پروڈیوسر تھے۔ ان تمام صفات کا جو Impact ہوا اور تیس سال جو Impact ہوتا رہا وہ اس کالج کی تاریخ کا سب سے زیادہ روشن باب ہے۔ اتنی جہتیں (Dimensions) کہیں اور کم از کم مجھے نظر نہیں آئیں میری اپنی طویل تدریسی اور تعلیمی زندگی کا لب لباب یہ ہے کہ استاد کا اصل کام شاگرد میں بلندیوں، ترقیوں، امکانات کی Awareness پیدا کرنا ہے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب استاد کی اپنی شخصیت میں کمال و جمال پایا جاتا ہو جب وہ خود بڑی صلاحیتوں اور قدروں کا حوالہ ہو جو خود Inspire کر سکتا ہو۔ منٹر علوی کمال علم و فن کے اس سنگھاسن پر فائز تھے۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں :: تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

آصف: علوی صاحب کے تعلیمی نظریات کیا تھے اور ان کا پس منظر کیا تھا؟

پروفیسر راشد: علوی صاحب کے تعلیمی نظریات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان کا اپنا تعلیمی و تہذیبی پس منظر کیا تھا۔ وہ کوئی عام سے استاد نہیں تھے۔ ان کے خاندان میں دو سو برس سے علم کی ہی نہیں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی روایت موجود تھی۔ خود ان کے والد مرحوم جناب بدرالدین علوی برس ہا برس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں عربی کے استاد رہے وہ اس پائے کے محقق تھے کہ ان کی کتابیں مصر میں طبع ہوئیں اور عربی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی گئیں۔ ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر ضیاء الدین علوی ابھی حال میں علی گڑھ کے شعبہ جغرافیہ سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ خود علوی صاحب نے نہ صرف علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھا بلکہ یونیورسٹی کیمپس میں پرورش بھی پائی۔ اس کے معنی یہ ہوئے بچپن سے انہیں برصغیر کی بہترین یونیورسٹی کا بہترین تعلیمی اور تہذیبی ماحول میسر آیا۔ تعلیم اور روشنی تو اس فضا میں تھی جس میں انہوں نے آنکھ کھولی اور پروان چڑھے رسمی اور غیر رسمی جتنا تعلیمی ایکسپوژر Exposure ان کا ہوا وہ ہر ایک کی قسمت میں نہیں ہوتا۔ اس زمانہ کے بہت سے یگانہ روزگار معلم استاد اور ماہران تعلیم جیسے، خواجہ غلام السیدین، پروفیسر حبیب

ڈاکٹر ہادی حسین، ڈاکٹر علیم، پروفیسر رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، پروفیسر خواجہ منظور وغیرہ تھے۔ ان سب کو انہوں نے قریب سے دیکھا اور کسب فیض کیے۔ یونیورسٹی کا اپنا معیار اور روایتیں تھیں By the way جس استاد نے خود کسی مسلمہ معیار کی یونیورسٹی میں دو چار سال نہ پڑھا ہو اور اس دور کے بہترین دماغوں سے اس کا تھوڑا بہت واسطہ نہ رہا ہو یعنی جس کا صحیح معنوں میں تعلیمی و تہذیبی Exposure نہ ہوا ہو وہ اچھا سبجیکٹ ٹیچر ہو تو ہو اچھا معلم نہیں ہو سکتا۔ اس تہذیبی اور تعلیمی پس منظر کے ساتھ ساتھ خود ان کا اپنا ذہن، شخصیت بھی قابل غور ہے۔ جیسا فخر الدین علوی صاحب نے اپنے انٹرویو میں کہا ہے کہ انہیں بچپن سے مطالعہ کا جنون سا تھا۔ بہت پڑھتے تھے اور اُردو، فارسی، عربی ادب کے علاوہ فنون لطیفہ علم کی مختلف شاخوں فلسفہ، معاشیات، تقابلی مذہبیات پر ان کا گہرا مطالعہ تھا۔ ان سب عوامل نے ان کے تعلیمی نظریات کی تشکیل میں حصہ لیا تھا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں مشہور امریکی تعلیمی مفکر جان ڈیوی کی کتاب Education and Democracy کا ترجمہ انہوں نے تعلیم اور جمہوریت کے نام سے کیا تھا۔ جن مفکروں اور ادیبوں روسو، والٹیر، ایمرسن، برٹرنڈ رسل، برنارڈ شا، خلیل جبران سے خاص طور سے متاثر تھے۔ وہ سب اپنی آزادی فکر اور Liberalism کے لیے مشہور ہیں۔ وہ اقبال سے بھی بہت متاثر تھے۔ اقبال کے تعلیمی افکار و نظریات پر خواجہ غلام السیدین کی کتاب Educational Philosophy of Iqbal ان کی پسندیدہ کتاب تھی۔

میرا خیال ہے اس طویل تمہیدی گفتگو کے بعد اب میں اس سوال کا کہ علوی صاحب کے تعلیمی نظریات کیا تھے، براہِ راست جواب دیتا ہوں۔ وہ معلومات اور علم میں فرق کرتے تھے وہ Reproductive ہرگز نہیں تھے۔ اقبال کی طرح کہتے تھے کہ علم حاصل کرو اور علم پیدا بھی کرو۔ وہ معلم میں Creativity اور انفرادیت کے قائل تھے۔ اگر میں یہ کہوں کہ مسٹر علوی ملٹری کالج کے سقراط تھے تو غلط نہ ہوگا وہ برسہا برس کلاس روم میں اور کلاس روم سے باہر ذہنوں کے دریچے

کھولتے رہے۔ ان کا سب سے بڑا Contribution یہ ہے کہ انہوں نے تعلیم کو مروجہ نصاب کے جوہڑ سے نکالا۔ دلوں کو گرمی اور ذہنوں کو روشنی دی۔ مسٹر علوی کی اصل اہمیت ڈراموں اور تقریروں کی وجہ سے نہیں تخلیقی تعلیم کی وجہ سے طلبا کے ذہنی افق کو وسیع کرنے کی وجہ سے ہے۔ استاد کا پہلا اور آخری امتحان کلاس روم ہی میں ہوتا ہے وہیں اپنی لڑائی جیتنا یا ہارنا ہے۔ انہوں نے ۷۵-۱۹۷۴ء کے تربیت کے اداریہ میں لکھا "ملٹری کالج میں صرف کتاب خواں قسم کے طلبا پیدا کرنا مقصود نہیں ہم سے توقع کی جاتی ہے کہ ہم زندہ کتابیں تخلیق کریں"۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جملہ ان کے تعلیمی نظریات کی عکاسی کرتا ہے

آصف: سر، آپ نے پبلک سکول سسٹم آف ایجوکیشن کے حوالے سے ان کے نظریات پر بات نہیں کی۔

پروفیسر راشد: اچھا ہوا کہ تم نے خود ہی یہ سوال اٹھا دیا ورنہ پبلک سکول سسٹم پر گفتگو کیے بغیر علوی صاحب کے Contribution کی بات مکمل نہیں ہو سکتی۔ پبلک سکول سسٹم پر ایجوکیشن اینڈ سوشل آرڈر میں برٹرنڈرسل نے جو اعتراضات کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس سسٹم میں Will-power قوت ارادی اور Will to win power اقتدار حاصل کرنے کی خواہش کو ذہن Intellect تخیل Imagination اور Affection محبت کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور زیادہ مضبوط کیا جاتا ہے جیسا کہ A Social History of England میں Trevelyan نے لکھا ہے کہ پبلک سکولوں نے ملکہ وکٹوریہ کی سلطنت کو پھیلانے اور مستحکم کرنے میں تاریخی رول ادا کیا۔ واٹرلو کی جنگ ایٹن کے میدانوں میں ضرور جیتی گئی ہو گی۔ لیکن برٹش ایمپائر ختم بھی وہیں ہوئی A Passage to India کے مصنف ای ایم فارسٹر نے صحیح لکھا ہے An empire was lost for want of a smile یہ نقائص تو اصل پبلک سکولوں میں تھے جن کی نشاندہی خود انگریز دانشوروں نے کی۔ برصغیر میں جو پبلک سکول تھے ان میں ان بنیادی خامیوں کے علاوہ ان کی بنیادی خوبیاں جیسے Patriotism اور مذہبی رویہ Religious sentiment

بھی معدوم تھیں۔

بہر حال مجھے کہنا ہے کہ ملٹری کالج کی شروع سے ایک بڑی خامی یہ رہی ہے کہ یہاں Intellect کو Academic excellence کو تحقیقی رویوں اور Imagination اور Humanism کو نسبتاً کم بلکہ بہت کم اہمیت دی جاتی رہی ہے اور اب بھی صورتحال بہت زیادہ مختلف نہیں اس خامی کو جو سسٹم میں تھی جو کری کیوںلم میں تھی اسے کالج میں چند غیر معمولی جینیئس قسم کے استادوں نے اپنے طور پورا کرنے کی کوشش کی۔ مسٹر علوی مرحوم ان میں سے ایک ایسے ممتاز استاد تھے۔ وہ گریک ٹریڈیشن Greek tradition کے استاد تھے۔ خود سوچنے اور سوچنا سکھاتے تھے ان کا رجحان Non-conformism کی طرف تھا۔ انہوں نے اپنے طرز تعلیم سے (Intellect) ذہن کو فروغ دیا اور اپنی ذات سے Affection کو میں سمجھتا ہوں کہ بحیثیت پبلک سکول کے استاد کے ان کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس سسٹم کی بنیادی خامیوں کی تلافی کی اور اس کی خوبیوں کو ابھارا۔ ملٹری کالج کے طلباء میں آج جو کچھ Intellectual touch ہے ذہن کا جو آفاقی انداز ہے جو قومی وژن (Vision) ہے جو Humanism ہے وہ بڑی حد تک مسٹر علوی کی دین ہے۔

آصف: سر، آخر میں چند باتیں ان کی زندگی کی لائٹ سائڈ کی بھی ہو جائیں۔

پروفیسر راشد: ضرور۔

آصف: ان کی دلچسپیاں کیا تھیں؟

پروفیسر راشد: اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بڑے فلسفی یا زاہد خشک نہیں تھے۔ ٹینس کے بڑے اچھے کھلاڑی تھے۔ بیڈمنٹن تو میں نے خود ان کے ساتھ کھیلا ہے۔ تیراک بھی تھے۔ موسیقی کا فنون لطیفہ کا ادراک اور بلند ذوق تھا۔ پکچر بڑی پابندی سے دیکھتے تھے کالج میں فلم شو شروع ہونے سے پہلے فلم دیکھنے جہلم جاتے تھے۔ تعلقات بھی نبھاتے تھے۔ سفر بھی کرتے تھے، گلگت، ہنزہ، جھیل سیف الملوک تک گئے تھے۔

آصف : اور مزاح؟

پروفیسر راشد: جی ہاں مزاح (Humour) بھی چونکہ Humorist تھے، حس مزاح بہت تیز تھی۔ ہر موقع وہ فقرہ چست کرتے کہ لطف آجاتا۔ سنا ہے کہ کلاس میں بھی مزاح کی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہتی تھیں۔ غرض بڑی باغ و بہار شخصیت تھی۔ بعض موقعوں پر Rigid ضرور نظر آتے۔ لیکن وہ دائرہ ان کے Convictions کا تھا وہ اپنی بات کہنا اور جس بات کو صحیح جانتے تھے اس کو مدلل انداز سے کہنا اور اس پر اصرار کرنا جانتے تھے۔ یہ بھی کردار کی ایک صفت ہے۔

آصف : سر، آپ ان کی شخصیت کو سم اپ Sum-up کیسے کریں گے؟

پروفیسر راشد: نگہ بلند، سخن دلنواز اور جان پرسوز

آخر میں میں انگریزی کی ایک نظم کا ایک بند Quote کرنا چاہوں گا جو ابھی ابھی میری یادوں کے اُفق پر ابھرا ہے۔

We live in deeds, not years, in

thoughts, not breaths, in feelings,

not figures on dial.

We should count time by heart

throbs. He most lives who thinks

most, feels the noblest, acts the best.

مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر نے یہ نظم علوی صاحب ہی کے لیے لکھی تھی۔

لیفٹیننٹ کرنل اورنگزیب خان[1]

نامور عالمگیرین لیفٹیننٹ جنرل محمد اکبر خان سابق صدر اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے نوجوان صاحبزادے ظفر اکبر کے ۷۱ء کی جنگ میں شہید ہونے پر علوی صاحب نے جو خط اپنے قلم سے مرحوم کو لکھا اس کی کاپی میں منسلک کر رہا ہوں۔ جنرل اکبر مرحوم سے میری قریبی عزیزداری ہے۔ پچھلے دنوں میں اپنے گاؤں کلری گیا تو جنرل اکبر کے بڑے بھائی محمد اشرف صاحب کالج نمبر ۲۴۳ نے مجھے یہ خط دیا (مرحوم کے ذاتی فائل سے نکلا ہوگا) علوی صاحب سے میرا ذاتی تعارف بہت کم تھا۔ اس خط سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کتنے عظیم خیالات کے مالک تھے۔

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن
ملٹری کالج جہلم
۲ مارچ ۱۹۷۲ء

محترم و معظم جنرل صاحب

آپ کے فرزند عزیز نے وطن کی آبرو اور اسلام کی سربلندی کے لیے حالیہ جنگ میں اپنی جان کی قربانی پیش کر کے یقیناً اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قابل رشک مرتبہ حاصل کیا ہے اور ہمارے دلوں میں بھی پیارے نوجوان بیٹے کی جدائی کتنا بڑا صدمہ یہ کوئی باپ ہی جانتا ہے۔ میں ملٹری کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی جانب سے آپ کی خدمت میں دلی تعزیت کے جذبات پیش کرتا ہوں۔

اس غم کے پیچھے ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی بھی جلوہ گر ہے۔ اور وہ ہمیں تسلی دے رہی ہے۔ وہ ہم سب کو، فوج کے ہر مجاہد کو، پوری قوم کو حوصلہ دے رہی ہے۔ جاں بازی سکھا رہی ہے۔ جو عظمت انھوں نے پائی ہے وہ ہر مجاہد کو نصیب نہیں ہوئی۔ وہ مرے نہیں غیر فانی ہو گئے ہیں۔ ہم سے جدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ ہم سے بہت اونچے ہو گئے ہیں۔

ہم اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کو اور دوسرے عزیزوں کو اس آزمائش میں صبر و سکون عطا کرے اور شہید کو اپنی رحمت و مغفرت سے مالا مال کر دے۔ آمین

مخلص
علوی

[1] کالج نمبر ۵۸۴ زمانہ تعلیم ۴۱-۱۹۳۵ء

——— حسن اختر کیانی[۱]

ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر اولڈ بوائز کے ورائٹی پروگرام میں، میں نے اپنی نظم ایک کیڈٹ یادگارِ شہدا کے سامنے سنائی تھی۔ دوسرے روز صبح علوی صاحب کے سلام کے لیے ان کے درِ دولت پر حاضر ہوا تو انہوں نے پہلے اسی نظم کا تذکرہ کیا۔ فرمایا مجھے یہ شعر

ماند خورشید دن کو، شب کو تاروں کی طرح میرے خون سے ہوگا روشن ہر چراغ کارواں

خاص طور پر پسند آیا۔ مبارک ہو (مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ گذشتہ رات انہوں نے یہ شعر صرف ایک دو بار سنا تھا اب صبح انہیں یاد تھا) میں نے عرض کیا "سر یہ نظم میں نے کل شام یادگار شہدا کے سامنے کہی تھی۔ جب یادگار کے سامنے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اپنے بچھڑے یاد آنے لگے اور از خود شعر زبان پر جاری ہو گئے" فرمایا۔ مشقِ سخن جاری رکھو۔ تمہارے ہاں تخیل اور تفکر کا بہت اچھا امتزاج ہے۔ بہر حال پھر بھی کسی استادِ فن سے استفادہ کرنا بھی مفید ہوگا۔" چلتے وقت میں نے اپنے اردو مجموعہ کلام تذبذب اختر کی ایک جلد نذر کی تو ارشاد ہوا جب میں تمہیں مغربی جرمنی ڈائمنڈ جوبلی کا دعوت نامہ بھیج رہا تھا تو راشد صاحب نے تمہارے ذوق شاعری کا کچھ تذکرہ تو کیا لیکن مجھے علم نہ تھا کہ ماشاءاللہ تم صاحب دیوان شاعر ہو گئے ہو۔

غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں

یہ علوی صاحب سے میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ پھر علوی نامہ پڑھ کر حسرت آئی کہ اتنے بڑے سکالر سے صرف چند لمحے فیضیاب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

——— جنرل محمد اقبال خاں[۲]

مسٹر علوی سے میرا پہلا رابطہ ۱۹۷۹ء میں ہوا۔ جب عالمگیرین ایسوسی ایشن نے مجھے اپنا صدر منتخب کیا۔ مسٹر علوی اس وقت بھی اس کے سکریٹری تھے۔ اس وقت تک ایسوسی ایشن کا نام ملٹری کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن تھا۔ مسٹر علوی کے مشورہ سے اس کا نام عالمگیرین

---

[۱] حال مقیم مغربی جرمنی مصنف اور شاعر "تذبذب اختر" مجموعہ شاعری۔ انسانی حقوق کے سائے میں (جرمن زبان میں) کالج نمبر ۱۰۶۳ زمانہ تعلیم ۵۰-۱۹۴۲ء [۲] کالج نمبر ۱۱۸۷ زمانہ تعلیم ۴۵-۱۹۴۳ء سرپرست اعلیٰ عالمگیرین ایسوسی ایشن۔

ایسوسی ایشن رکھا گیا۔ ۱۹۷۹ء کی ری یونین میں انہوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ۱۹۸۰ء میں عالمگیرین کے نام سے انہوں نے ایک نیوز لیٹر بھی نکالا۔ ۱۹۸۲ء کی ری یونین کو بھی انہوں نے اپنی بھرپور کاوشوں سے کامیاب بنایا۔ ایسوسی ایشن کے ویلفیئر ٹرسٹ کے سلسلہ میں کافی کام کرنا پڑا۔ اس کا سہرا بھی انہی کے سر رہا۔

——— لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال[1]

پروفیسر علوی ۱۹۷۰ء سے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سکریٹری چلے آرہے تھے۔ نومبر ۱۹۸۶ء میں ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر پانچویں جنرل میٹنگ نے متفقہ طور پہ انہیں مزید چار سال کے لیے سیکرٹیری منتخب کیا۔ اس امر سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عالمگیری برادری میں ان کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ ان سے میرا براہِ راست رابطہ مئی ۱۹۸۵ء سے ہوا جب میں نے ایسوسی ایشن کے صدر کی ذمہ داریاں سنبھالیں اس سلسلہ میں ان سے یہاں دفتر میں اور وہاں کالج میں بارہا گفتگو ہوئی اور بعض مسائل پر بحث بھی۔ اس تعلق اور تجربے کی بنا پر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک کلاسیکی دانشور تھے۔ معاملہ کی تہہ کو فوراً پہنچ جاتے تھے ہر مسئلہ کا واضح ادراک رکھتے تھے۔ ذہن بالکل صاف تھا اور بے حد منطقی انداز میں اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرتے تھے۔ ان کی شخصیت کے بہت سے تابناک پہلو تھے۔ میں صرف ایسوسی ایشن کے حوالے سے یہ کہوں گا کہ اس اضافی ذمہ داری سے بھی ان کی لگن اور دلچسپی مثالی تھی۔ دوسرے شعبوں کی طرح اس ضمن میں بھی وہ قطعاً انتھک تھے۔ گوکہ ڈائمنڈ جوبلی کے زمانہ میں بھی ان کی صحت اچھی نہیں تھی اس کے باوجود انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو درجہ کمال تک پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ میں ان کی یاد کو تمام عالمگیرینز کی طرف سے سلام کرتا ہوں۔

——— شوکت جنجوعہ[2]

استاد کی تین حیثیتیں ہیں۔ مدرس، معلّم اور مربی علوی صاحب تینوں حیثیتوں میں کامل تھے میں ان کی تیسری حیثیت کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ وہ مس خام کو بھی کندن بنا

---

[1] کالج نمبر ۱۳۴۳، زمانہ تعلیم ۵۰-۱۹۴۴ء پریزیڈنٹ عالمگیرینز ایسوسی ایشن۔

[2] کالج نمبر ۱۸۲۱ اسسٹنٹ سیکرٹری عالمگیرینز ایسوسی ایشن زمانہ تعلیم ۵۴-۱۹۴۸ء

دیا کرتے تھے میرے اندر کے ادیب اور صحافی کو انہی نے اپنی نظر کیمیا اثر سے جگایا اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ وہ کلاس میں طرح کا تلفظ پوچھ رہے تھے۔ تقریباً ساری کلاس نے ر پر زیر کے ساتھ "طرِح" پڑھا میں نے ر پر زبر دیا تو خوش ہوئے اور انہوں نے دل ہی دل میں مجھے ادبی تربیت کے لیے چن لیا۔ نویں کے سالانہ امتحان میں چاندنی رات پر مضمون تھا۔ اس کی کافی منظر نگاری کی تعریف انہوں نے اتنی فراخ دلی سے کی کہ میں شرمندہ ہوا لیکن حوصلہ بہت ہوا۔ انہی کے ایما پر میں نے رابرٹس ہاؤس کے ایک فنکشن کے لیے ایک ڈرامہ لکھا۔ میں نے تصحیح کیلئے پیش کیا تو ایک آدھ جگہ پنسل سے نشان لگا کر جوں کا توں واپس کر دیا۔ تبصرہ کے طور پر ماشاء اللہ لکھا میں نے گلہ کیا "سر" آپ نے تصحیح نہیں کی۔ ارشاد ہوا جو ہے فی الحال ٹھیک ہے۔ اگر اس فن میں کمال حاصل کرنا ہے تو پہلے دنیا کا تمثیلی ادب غور سے پڑھ جاؤ۔ ہاں کالیداس کی شکنتلا مگیھ دوت ضرور پڑھنا مسلمانوں میں موجودہ ڈرامہ نہیں انگریزی میں شیکسپیئر شا، وغیرہ تو ہیں ہی ناروے کے ایسن کو بھی پڑھنا روس میں چیخوف ترجنیف وغیرہ ہیں اور وہاں ڈرامہ اور ناول میں تکنیک کا فرق ہوتا ہے چیز ایک ہی ہے اس لیے دنیا کے بڑے بڑے کلاسیکی ناول پڑھے بغیر بھی بات نہیں بنے گی۔ اردو میں ڈرامہ اندر سبھا سے شروع ہونا سمجھا جاتا ہے۔ بہتر ہے کہ اردو کے کلاسیکی ڈرامے آغا حشر سے امتیاز علی تاج تک پڑھ جاؤ۔ مرزا ادیب بھی اچھا لکھ رہے ہیں مختصر یہ کہ علوی صاحب کی توجہ، حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی بدولت مجھے قلم پکڑنا آ گیا جس نے آگے آ کر مجھے بڑا سہارا دیا۔ اس لیے میں علوی صاحب کو اپنا مربّی سمجھتا ہوں۔

جو ملٹری کالج میں پڑھے اس کی شعوری اور لاشعوری منزل تو فوج ہی ہوتی ہے۔ بہرحال میری قسمت میں ترقی کی یہ شاہراہ نہ تھی۔

انہی پتھروں پر چل کر اگر آ سکو تو آؤ میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

مجھے پتھروں پہ چلنا پڑا وہ بھی ننگے پاؤں۔ یہاں علوی صاحب پھر آڑے آئے۔ ۱۹۵۴ء میں جب میڈیکلی ان فٹ ہوا تو میرے حوصلہ فرسا حالات میں جتنا دل شکستہ میں ہو سکتا تھا میں ہوا۔ دفتر سے آرمی سپیشل پاس سرٹی فکیٹ لے کر الوداعی ملاقات کے لیے علوی صاحب

کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو مجھے امید تھی کہ وہ میرے آنسو پونچھیں گے لیکن خلاف توقع انہوں نے میری ناکامی پر کچھ زیادہ تاسف کا اظہار نہیں کیا۔ میں سمجھا کہ شاید انہیں میرے انتہائی گھمبیر حالات کا پوری طرح اندازہ نہیں ہے میں نے اشاروں کنایوں میں بتایا کہ میں تو تپتے ہوئے صحرا میں آگیا ہوں۔ چکوال میں واپس جا نہیں سکتا۔ آگے پڑھنے کے وسائل نہیں، میری جیب میں ــــ علوی صاحب نے میری بات کاٹ کر کہا۔

شوکت! میں تمہارے حالات اور صورتحال سے بے خبر نہیں ہوں۔ کوئی اور ہوتا تو میں شاید ہی روک کر رخصت کرتا۔ لیکن تم شوکت ہو۔ مجھے تم پر اعتماد ہے۔ تمہاری جیب بے شک خالی ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہارا ذہن روشنی سے اور قلب حوصلے سے خالی نہیں ہے۔ جاؤ۔ ملک خدا تنگ نیست وہ فارسی کی مثل تم نے بارہا سنی ہوگی۔ ہمت مرداں مدد خدا۔

جب کالج کے مین گیٹ کے سامنے سے میں لاہور جانے والی جی ٹی ایس بس میں بیٹھا تو علوی صاحب کے ولولہ انگیز الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے لیکن عملی صورتحال یہ تھی کہ لاہور کا ٹکٹ لے کر میرے پاس جو پیسے بچے وہ اتنے کم تھے کہ ایک وقت کا کھانا بھی کسی اچھے ہوٹل میں نہیں کھا سکتا تھا۔ وہ رات میں نے باغ جناح کے ایک ہمدرد بوڑھے مالی ــــ کے جھونپڑے میں گزاری دوسرے دن میرے محسن نے مجھے ۱۲ آنے کی پرانی سُرخ قمیض لادی تاکہ ریلوے سٹیشن پر قلی گری کر سکوں۔

ــــ یہ لمبی داستان ہے مختصر یہ کہ میں پتھروں پر چل تو رہا تھا۔ لیکن لہولہان ہو گیا تھا جب دل بیٹھنے لگا تو علوی صاحب کے الفاظ یاد آئے مختصر یہ کہ علوی صاحب نے جو قلم پکڑنا سکھایا تھا وہ کام آیا۔ لاہور کے روزنامہ آفاق میں سٹور کیپری کی ملازمت اس انگریزی کے سہارے مل گئی جو ایوب صاحب نے سکھا دی تھی۔ مولانا مہر قبلہ ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے کچھ سونگھ کر مجھے اپنا پرسنل اسسٹنٹ بنا لیا اور اس طرح مجھے طباعت صحافت کا کچھ تجربہ ہوا ادبی حلقوں سے تعارف ہوا۔ یہ میری زندگی کا Turning point تھا۔ چند سال بعد میں نے اپنا ہفتہ وار اخبار نقاد نکالا تو پہلا پرچہ علوی صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ ان کا جواب آیا۔ تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول

علوی صاحب میری حوصلہ افزائی کے لیے اکثر نقادیں لکھا کرتے تھے۔ میں اس کی اعزازی کاپی لائبریری میں بھیجتا تھا۔ غالباً علوی صاحب نے میرا ذکر کرنل رفیق صاحب سے کیا اور پھر مجھے لکھا کہ تم کالج آؤ کرنل صاحب تمہارے ایڈیٹر ہو جانے سے بہت خوش ہیں۔ بہر حال میں آیا مجھے یہاں وی آئی پی ٹریٹ منٹ دیا گیا۔ میں نے کالج میں صحافت اور اخبار کی طباعت وغیرہ پر لیکچر دیئے۔ کرنل رفیق نے جو عزت افزائی کی وہ تو کی ہی یہ واقعہ ۱۹۵۷ء کا ہے۔ ۱۹۸۷ء میں ان کے انتقال تک میں ان سے روشنی لیتا رہا۔ عالمگیر پیپر ایسوسی ایشن کے رشتے سے اور بھی قریبی تعلق رہا۔

ان کو میرے زندگی بھر کے مربی اور محسن کی حیثیت حاصل ہے۔

ایک سقراط

——— لیفٹیننٹ جنرل آر ڈی بھٹی[1]

اب سے تیس پینتیس سال پہلے جب میں ملٹری کالج میں علوی صاحب سے پڑھتا تھا تو ظاہر ہے عمر کی اس منزل میں انکے Mannerism اور Externals of personality ہی کو Appreciate کر سکتا تھا۔ ان کے پڑھانے کے انداز سے صرف تھوڑا سا مبہم احساس تھا کہ یہ نئے استاد جو سرسید کے علی گڑھ سے آئے ہیں دوسرے عام استادوں سے مختلف ہیں۔ اس مختلف ہونے کی نوعیت کیا ہے اس کی Dimensions کیا ہیں اور اس کی اہمیت ہمارے لیے، اس ادارہ کے لیے کیا ہے، اس بارے میں کوئی واضح تصور نہیں تھا۔ غالباً اس وقت ہو ہی نہیں سکتا تھا Qualitative difference کو سمجھنے میں ہمیشہ دیر لگتی ہے۔ اب جبکہ میں زندگی کے سفر کی بہت سی منزلیں طے کر چکا ہوں اور بہت سے علمی و تحقیقی اداروں سے استفادہ کا موقع ملا ہے، اس تناظر Perspective میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو پروفیسر علوی مجھے Outstanding calibre کے استاد نظر آتے ہیں اب جبکہ کالج اس جینئس (Genius) کی خدمات سے محروم ہو چکا ہے اور کالج کو اس قسم کے استادوں کی ضرورت ہے (اور ہمیشہ رہے گی) تو اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ پروفیسر علوی کو سمجھا جائے کہ اصل میں وہ تھے کیا۔ علم و فن کی دنیا کی کس

---

[1] کالج نمبر ۱۸۶۲ - زمانہ تعلیم ۵۶ - ۱۹۴۹ء

روایت Tradition کے آدمی تھے اور تعلیم و تربیت کے کس نظریئے کے قائل اور عامل تھے۔ تعلیم و تعلم کے دو معروف و مروج نظریئے اور Approaches ہیں ایک Convergent thinking کو فروغ دیتا ہے دوسرا وہ جو Divergent thinking کو تعلیمی Process کا مقصود و منتہا گردانتا ہے۔ ایک کا زور علم پر ہے دوسرے کا عملی معلومات Practical knowledge اور مہارتوں Skills پر، تاریخی اعتبار سے Divergent thinking کے نظریئے کی بہترین ترجمانی گریک ماڈل Greek model کرتا ہے۔ جس کو سقراط، ارسطو اور افلاطون Symbolise کرتے ہیں۔ سقراط استاد مقرر Lecturer نہ تھا، ٹیچر یا معلم تھا، وہ معلومات Information نہیں دے رہا تھا، علم کو ادراک Understanding کو فروغ دے رہا تھا۔ قرآنی اصطلاح میں وہ تعقل، تفکر، تدبر کی آبیاری کر رہا تھا۔ اس مطمح نظر کے مطابق اس نے جو طریق تعلیم اختیار کیا جسے دنیا سقراطی طریق تعلیم Socratic method کے نام سے جانتی ہے۔ اس میں بنیادی اہمیت Teaching کی نہیں Learning کی، معلم کی نہیں متعلم کی تھی۔ اس کا منتہا Convergence اتفاق، اتباع نہیں Divergence اختلاف، تنوع اجتہاد تھا۔ اس طریق میں استاد شاگرد کو اپنی سوچ، اپنی معلومات نہیں دیتا بلکہ اس کو سوچنے اور ضروری معلومات حاصل کرنے کے قابل بناتا ہے۔ یہی سقراطی طریقہ تعلیم ہے یہی Divergent thinking کا فلسفہ ہے جبکہ Convergence یا Conformity کے فلسفہ میں معلومات Information اور Processes کی وضاحت کی جاتی ہے یہ صحیح ہے کہ دنیا کا بڑا کام Convergence ہی سے چل رہا ہے طبعی علوم Natural sciences کی تعلیم ریسرچ کی سطح کو چھوڑ کر Convergences کے طریق کار ہی کا تقاضا کرتی ہے اور اس کی اپنی اہمیت اور ضرورت ہے۔

پروفیسر علوی تعلیم اور تربیت دونوں دائروں میں سقراطی نقطہ نظر رکھتے تھے۔ Divergence انفرادیت Creativity کے قائل تھے اور اسی کو ابھارتے تھے۔

بدقسمتی سے ہمارا قومی نظام تخلیقی یا Divergent تو کیا ہونا وہ نوامریکی ماڈل کی طرح Convergent بھی نہیں۔ وہ تو معلومات اور مہارتیں Skills بھی نہیں دے پاتا اس تاریک صورت حال میں اگر ایک سقراط ملٹری کالج میں تیس پینتیس سال تک تفکر تعقل، تدبر، تخلیق کاری Creativity کو فروغ دیتا رہا وہ بھی اتنے سستے داموں اور اتنے انکسار کے ساتھ تو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے ایک علوی صاحب کے ہونے سے ملٹری کالج کی ایجوکیشن میں جو نئی Dimensions آئیں ان پر ریسرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علوی صاحب کی یاد میں صرف ایک علوی نامہ نکالنا کافی نہ ہوگا۔ ان پر تحقیقی کام کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ یہ روایت کالج میں زندہ رہے۔ ورنہ بغیر روشنی کے محض در و دیوار میں کیا رکھا ہے۔

—— واجد علی واجد

نومبر ۱۹۵۳ء میں، علوی صاحب نے جو پہلا اردو ڈرامہ ضمیر پروڈیوس کیا تھا، اس میں میرا کردار پادری کا تھا۔ ضمیر ڈرامہ خود ان کا لکھا ہوا تھا۔ وکٹر ہیوگو کا اصل ناول لامزابل Les-Miserables فرانسیسی میں تھا۔ اس کو انہوں نے بڑی خوبصورتی سے اردو ڈرامہ کے روپ میں ڈھالا تھا۔ یہ بڑا سنجیدہ ڈرامہ تھا۔ یہ علوی صاحب کے لکھے ہوئے مکالموں اور ڈائریکشن کا کمال تھا کہ ڈرامہ ہٹ ہوا۔ دوسرے سال انہوں نے عظیم چغتائی کا طنزیہ کھیل مرزا جنگی پروڈیوس کیا۔ ڈرامہ ڈائریکٹ کرنے کا ان کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے کھیل پڑھنے کو دیتے۔ پھر اس کی تفہیم اور پس منظر ڈسکس کرتے اس کے بعد ہر پارٹ کو مومنٹ کے ساتھ ادا کر کے سمجھاتے۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ اصلاح کرتے نہیں تھکتے تھے نہ مایوس ہوتے اور نہ مایوس کرتے۔ مرزا جنگی ڈرامے میں سب کردار لکھنؤ کے تھے۔ وہ بھی واجد علی شاہ کے دور کے لکھنؤ کے جب تکلفات حد سے زیادہ بڑھ چکے تھے یہ کردار ان ان لڑکوں سے کامیابی سے کروانا جو اہل زبان تو کیا پوری طرح اہل علم بھی نہیں تھے۔ اس ڈرامہ کے بعد ایک کورس بھی پیش کرنا تھا۔ اس کی دھن بھی انہی کو نکالنی تھی۔ ایف اے سی سی کے پیانو پر کالج کی سانگ کی ریہرسل حیدری صاحب کروا رہے تھے۔ غالباً اس

لیے علوی صاحب نے مجھ سے کہا واجد تم ہارمونیم اٹھا کر کمانڈانٹ کے دفتر کے سامنے کے لان میں لے جاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔

پونم کا چاند نکلا ہوا تھا۔ سامنے سفیدے کے دیوتا قامت درخت سحر زدہ کھڑے ہوئے تھے اور خوشگوار خنکی تھی۔ اس شاعرانہ اور ساحرانہ فضا میں وہ یادگار محفل جمی جس کی یاد رہ رہ کر دل کو تڑپاتی ہے۔

علوی صاحب پہلے تو ہارمونیم پر کچھ دیر سرگم بجاتے رہے۔ پھر کورس کے بول

پاکستان کے ہم متوالے ، پاکستان ہمارا ہے

گنگناتے رہے اور دیکھتے دیکھتے راگ درباری میں اس کورس کی ایک بہت خوبصورت دھن نکال دی۔ پہلے دھیمے سروں میں خود گایا۔ پھر مجھ سے کہا کہ آواز ملاؤں۔ آخر کار مجھ سے اکیلے گانے کی مشق کرائی۔ جب میں نے انترہ اٹھایا تو بہت خوش ہوئے اس عرصہ میں پونم کے چاند کا حسن اور نکھر آیا تھا اور فضا کا رومانی جادو اور بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے پھر ہارمونیم سنبھالا اور مجھ سے کہا۔ واجد اب تم کچھ سناؤ۔ میں نے ان کی پسندیدہ چیز شروع کی۔

چاند نکلا تری صورت لیکر   رات آئی تری خلوت لے کر

عجب فسوں خیز سماں تھا۔ میں ڈوب کر گا رہا تھا اور وہ بے خود ہو کر ہارمونیم پر سنگیت دے رہے تھے۔ پتہ نہیں یہ سلسلہ کتنی دیر چلتا کہ کورس کے دوسرے لڑکے بھی وہیں آگئے اور علوی صاحب نے کورس کا ریہرسل کرانا شروع کر دیا۔

تن من دھن قربان   تجھ پر پاکستان
رونق بزم جہاں پیارے پاکستان   زندہ رہے پائندہ رہے تو
اونچا تیرا نشان   پیارے پاکستان

ــــ ہائے۔ کیا انسان تھے جب علوی صاحب کے مرنے کا خیال آتا ہے تو دل میں ایک بھبھوکا سا اٹھتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ دیواروں سے سر ٹکراؤں یا ان کی قبر پر جوگی بن کر بیٹھ جاؤں۔

ایک نڈر انسان

———— لیفٹیننٹ کرنل سردار خان[1]

علوی صاحب فلسفی بھی تھے۔ بہت دور کی کوڑی لاتے تھے۔ اقبال کے اشعار کے ایسے ایسے معنی نکالتے کہ ہم حیران رہ جاتے۔ لیکن مجھے علوی صاحب کی جو بات یاد ہے اور بہت واضح طور پر یاد ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے خیالات میں انقلابیت تھی۔ ان کے کالج کے اُفق پر نمودار ہونے سے پہلے ہماری تعلیم و تدریس ناک کی سیدھ میں چل رہی تھی۔ لکیر کی فقیری پر نہ معلّم کو اعتراض تھا نہ متعلم کو، جو کتاب میں لکھا ہے پڑھ لیا۔ بس چلا تو زبانی یاد کر لیا۔ امتحان پر نظر رکھی۔ گھسے پٹے سوالات، گھسے پٹے جوابات جو جواب جتنا کتاب سے قریب ہوتا اتنا اچھا سمجھا جاتا۔ تربیت کا منتہا ٹینی سن کی نظم دی چارج Charge of Light Brigade آف لائٹ بریگیڈ تھا یعنی Theirs not to reason why - ریزن Reason کرنے کا یا کسی چیز میں ریزن Reason کی طرف آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم لوگوں نے یس سر کی فضا میں پرورش پائی تھی۔ سب ٹھیک ہے کا رویّہ عام تھا۔ جنرل نالج کا مضمون ہمارے نصاب میں ضرور تھا۔ لیکن جنرل نالج کا مطلب ہم یہ سمجھتے تھے کہ کون سی چیز کیا ہے کہاں ہے۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ سارا زور کیا پر تھا۔ کیوں اور کیسے کے تصوّر سے ہم واقف نہ تھے۔ علوی صاحب نے ہمیں کیوں اور کیسے کی دنیا سے روشناس کرایا۔ اس زمانے میں کوریا کی تین سالہ جنگ تو ختم ہو چکی تھی لیکن مشرقی و مغربی بلاک میں سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ سرد جنگ کا مطلب بھی انھی نے بتایا۔ امریکی وزیر خارجہ جان فاسٹر ڈلس جو سرد جنگ کو گرم کرنے میں خاصے مصروف تھے، ان کی مزاج پرسی بھی وہ خوب کرتے رہتے تھے۔ اسی زمانہ میں عراق میں پہلا انقلاب آیا تھا۔ شاہ فیصل اور وزیر اعظم نوری السعید کے حسرت ناک انجام کا تجزیہ انھوں نے مشرق وسطیٰ میں برطانوی اور فرانسیسی سامراجی عزائم کے پس منظر میں کیا تھا۔ ملک میں یا ملک سے باہر ظلم، بے انصافی، استحصال کا جو مظاہرہ بھی ہوتا وہ اس پر اسلام کے حوالے سے، اقبال کے حوالے سے سخت تنقید کرتے ان کا خیال تھا کہ اسلام کو ایک انقلابی قوت کے طور پر ابھارا جائے۔ اقبال کا کلام ان

[1] کالج نمبر ۱۹۵۵، زمانہ تعلیم ۵۰-۱۹۵۷ء، اے کیو لاگ ایریا پشاور

کے لیے صرف پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ ایک نئی دنیا کی تعمیر کا بلیو پرنٹ تھا۔

ایک روز طارق کی دعا پڑھاتے پڑھاتے امپیریلزم اور کولونیلزم کا ذکر آگیا تو بات تک پہنچی۔ پہلے تو رڈیارڈ کپلنگ پر جس کا یہ فقرہ ہے White man's burden ایک آدھا چھینٹا مارا۔ پھر طنز یہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ لارڈ کلائیو اور لارڈ ہیسٹنگز بچارے اسی بوجھ کو ہلکا کرنے میں مصروف تھے۔

ان کا کالج میں آنا ساکن پانی میں پتھر پھینکنے کے مترادف تھا جس سے بے شمار لہریں پیدا ہوئیں۔ ذہنوں میں سوال ابھرے۔ حوصلے ابھرے۔ نئی سمتوں کا احساس ہوا۔ ہر آدمی دوسرے کو اپنے ظرف اور مزاج کے مطابق پسند یا ناپسند کرتا ہے۔ علوی صاحب کی جس خصوصیت نے مجھے متاثر کیا، وہ یہ تھی کہ وہ نڈر تھے ان کا بہت وسیع اور گہرا مطالعہ تھا بہت انفرادی انداز میں سوچتے تھے اور پھر اپنی سوچوں کو مدلّل طریقے سے مگر دھڑلے سے بیان کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔ انقلابیت ان کی فکر کی اور دبنگیت ان کی شخصیت کی پہچان تھی۔ اس وجہ سے ہمیں یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ یہ جو وہ ہر روز جمے جمائے بتوں کو توڑتے پھوڑتے رہتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دن کوئی انہیں لے کر آگ میں ڈال دے۔ کسی نے انہیں آگ میں نہیں ڈالا۔ لیکن وہ خود اپنی آگہی کی آگ میں جلتے رہے زندگی بھر — جس کی چنگاریاں کچھ سینوں میں آج بھی سلگ رہی ہیں۔

دیدۂ بینا

—— سرفراز مرزا[1]

"تم ہینڈ ٹو ماؤتھ ہی رہو گے"۔ اگرچہ اس وقت یہ جملہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن یہ تھے وہ پہلے الفاظ جو علوی صاحب نے مجھ سے کہے تھے۔ اس وقت میں غالباً چھٹی یا ساتویں کلاس کا طالب علم تھا۔ مرحوم بہت اچھے پامسٹ تھے۔ ملٹری کالج کی روایات کے برخلاف کبھی کبھی وہ طلبا سے گھل مل بھی جاتے تھے اور یہی وہ لمحات ہوا کرتے تھے جب ہم

---

[1] مورخ، مصنف اور محقق "ڈاکٹر سرفراز حسین مرزا" ڈپٹی ڈائریکٹر سنٹر فار ساؤتھ ایشین سٹڈیز پنجاب یونیورسٹی لاہور، کالج نمبر ۲۰۰۰ کالج میں زمانہ تعلیم ۵۶-۱۹۵۰ء

موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوجی طرز کی روٹین سے ہٹ کر کچھ لطیف اور ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کر لیا کرتے تھے۔

آکلنک ہاؤس (جو اب مسمار ہو چکا ہے) کے ہاؤس ماسٹر بن کر آئے تو گاہے گاہے کیڈٹس سے نجی گفتگو بھی کر لیا کرتے۔ اس وقت شاید بہت کم لوگوں کو علم ہو گا کہ وہ علم موسیقی سے بہت شغف رکھتے تھے ہارمونیم بہت اچھا بجانتے تھے۔ کبھی کبھی رات گئے ان کے کوارٹر سے ریاض کرنے کی آواز آتی تھی۔ پرانے راگوں سے والہانہ لگاؤ تھا اور رفیع مرحوم کے انداز گائیکی کو سراہا کرتے تھے۔

درس وتدریس کے علاوہ علوی صاحب (اس دور میں) کھیلوں سے دلچسپی رکھا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب کبھی کرکٹ کے کھیل میں مجھ سے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ ہوتا تھا تو جی بھر کے داد دیا کرتے تھے۔ گویا ان کی حوصلہ افزائی کلاس روم سے کھیل کے میدان تک یکساں ہوا کرتی تھی، آرٹ، موسیقی، ادب سے ان کا لگاؤ ان کی لطیف طبیعت کی غمازی کرتا ہے۔

۱۹۵۶ء میں کالج سے فراغت کے بعد ایک طویل عرصے تک علوی صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ تعلقات کی تجدید کا آغاز (بذریعہ مراسلت) ۱۹۷۰ء میں ہوا جبکہ میں نے اپنی پہلی تصنیف ان کی خدمت میں ارسال کی۔ ظاہر ہے کہ ان کی طرف سے حد درجہ ہمت افزائی ہونا ہی تھی کہ مجھے جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں، یہ اعزاز پہلے ہی حاصل رہا تھا۔ ہمت افزائی کیوں نہ کرتے کہ ان کا لگایا ہوا پودا پروان چڑھ رہا تھا۔ ان کی محنت رنگ لا رہی تھی۔ چونکہ میں نے انہی کے میدان (تعلیم وتدریس) کو منتخب کیا تھا۔ لہٰذا قدرتی طور پر ان کی شفقتیں میرے لیے دوبالا ہو گئیں۔ ۱۹۷۰ء کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا اور جب بھی وقفوں وقفوں سے میری تصنیفات شائع ہوتی رہیں۔ ان کی خدمت میں پہنچتی رہیں اور تعریفی جملے وصول ہوتے رہے۔ بیس سال بعد ان کی قدم بوسی کا شرف ۱۹۷۵ء میں گولڈن جوبلی کے موقع پر حاصل ہوا۔ پھر ۱۹۷۵ء میں جبکہ میں اسلام آباد جاتے ہوئے چند لمحوں کے لیے کالج میں رکا، استاد گرامی سے ملاقات ہوئی۔ ایک عجیب تاثر تھا۔ ایک عجیب کیفیت تھی۔ کہنے لگے "بھئی کل کے بچے ہو، ہم سے آگے نکل گئے، کیا حلیہ بنا رکھا ہے"۔ یہ جملے میرے

بالوں کی سفیدی اور چہرے کی جھریوں کی طرف اشارہ تھے۔ بہت سی دعائیں لے کر رخصت ہوا تھا جن کا احساس آج بھی تازہ ہے۔ علوی صاحب سے آخری ملاقات ڈائمنڈ جوبلی ۱۹۸۶ء کے موقع پر کالج ہی میں ہوئی۔ دورانِ ملاقات تفصیل میں تو نہ جا سکے لیکن اتنا کہتے تھے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور میں سکونت ہوگی تو لکھنے پڑھنے کا پروگرام مرتب کریں گے۔ بس یہی وہ آخری الفاظ تھے جو میرے کانوں میں آج بھی گونج رہے ہیں۔

ابھی چند ماہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ راشدی صاحب نے ایک جملہ پر مشتمل خط لکھا "کیا تمہیں یقین آئے گا کہ اپنے علوی صاحب کام کرتے کرتے، خدمت کرتے کرتے، چراغ جلاتے جلاتے یکایک قبر میں جا سوئے"۔ یہ جملہ پڑھ کر مجھ پر کیا گزری کیسے بتاؤں۔

ایک چراغ بجھ گیا۔ اس عظیم قطار کا ایک چراغ، جس نے سینکڑوں ننھے ننھے چراغوں کو ضیاء بخشی تھی۔ ان کے جلائے ہوئے چراغ آج ملک کی ہر سطح پر دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بنے ہوئے ہیں۔ ایک "تحریک" اپنے انجام کو پہنچی۔ علوی مرحوم ایک "تحریک" ہی تو تھے۔ اپنی ہی ذات میں ایک محرک ادارہ۔

میرا مربی میرا محسن

میجر جنرل طارق نظامی[۱]

ملٹری کالج میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۶ء تک زیر تعلیم رہا۔ اس عرصے میں دو استادوں مسٹر حیدری اور مسٹر علوی سے خاص طور سے متاثر ہوا۔ ان دونوں کا تعلق اساتذہ کی اس قسم سے تھا جسکو کلاسیکی کہا جا سکتا ہے۔ استاد کا کام صرف سبق پڑھانا یا معلومات دینا ہی نہیں، طالب علم کی تخلیقی صلاحیتوں کو دریافت کرنا اور انہیں پروان چڑھانا اور سماجی اور جذباتی تربیت کرنا بھی ہے اور یہ ذمہ داری پہلی ذمہ داری سے اہم تر ہے۔

علوی صاحب سے براہِ راست کلاس روم میں میں نے کبھی نہیں پڑھا۔ وہ ۱۹۵۴ء میں کالج میں آئے تھے۔ اسی سال سے انھوں نے مجھے فائن آرٹس اینڈ کلچرل سنٹر کے اردو ونگ سے وابستہ کر لیا، اور اردو ڈراموں میں پارٹ دینا شروع کر دیا، ضمیر، کار کی شادی

---

[۱] کالج نمبر ۲۰۱۵ کالج میں زمانہ تعلیم ۵۶-۱۹۵۰ء

مجھے اب بھی یاد ہیں۔ ایسے موقعوں پر چونکہ غیر رسمی ماحول ہوتا ہے۔ اس لیے علوی صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے یعنی ان کی اصل شخصیت کو سمجھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ ان کی بحثیں، تبصرے اور باتیں سنیں۔ کلاسیکی اساتذہ کی طرح ان کو مختلف علوم و فنون پر فاضلانہ دسترس تھی۔ اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے علاوہ وہ فلسفہ، تاریخ، نفسیات، معاشیات پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے اور تو اور کلاسیکی موسیقی کے راگوں اور مصوری کے مبادیات سے بھی واقف تھے۔ استاد کیا ہوتا ہے۔ اس کی میری پہلی امیج پروفیسر علوی کی ہے اور بہت کچھ دنیا دیکھنے کے بعد بھی اس میں اضافہ نہ ہو سکا۔

ذہن کو بیدار کرنے کے ساتھ استاد کا دوسرا کام جذباتی تربیت ہے۔ اس دائرہ میں بھی ان سے فیضیاب ہوا وہ ۱۹۵۴ء میں آکنلک ہاؤس میں میرے ہاؤس ماسٹر تھے۔ وہ زمانہ کالج میں سخت افراتفری کا تھا۔ پچھلا ریجی منٹیشن کا نظام ختم کر دیا گیا تھا۔ پبلک سکول کے مشکل تر سسٹم نے جڑیں نہیں پکڑی تھیں۔ نتیجتاً کالج میں ڈسپلن کی حالت دگرگوں تھی۔ ہر روز کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہوتا رہتا تھا۔ ایک روز اسی طرح کا کوئی ہنگامہ ہوا جس میں مجھے بھی بے قصور ملوث کرنے کی کوشش کی گئی۔ علوی صاحب کو ہاؤس میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن اس عرصے میں مجھے ان پر اعتماد ہو گیا تھا کہ یہ صحیح آدمی ہیں اور یہ کہ یہ مجھے جانتے ہیں۔

(اگر دیکھا جائے یہ معمولی بات نہیں۔ کسی کو جاننا پہچاننا بغیر تعلق کے ممکن نہیں ہوتا) بہر حال میں ان کے پاس چلا گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے بلکہ ٹپک رہے تھے۔ میں نے سسکیوں میں صرف سر کہا تھا کہ انھوں نے مربیانہ شفقت سے فرمایا " طارق تمہیں صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں میں تمہیں جانتا ہوں لیکن دل برداشتہ نہ ہو۔ اس طرح کی پرابلمز زندگی میں آتی رہتی ہیں۔ تمہیں خزاں کا پتہ نہیں ہونا چاہیے کہ ذرا تیز ہوا چلی تو کھڑکھڑانے لگا۔ سچے آدمی کو تو بہت مضبوط ہونا چاہیے یوں تو کام نہیں چلے گا۔ ابھی تو تم نے زندگی شروع کی ہے۔ کٹھن منزلیں تو آگے آتی ہیں۔

مجھے ابھی تک یاد ہے کہ یہ آکنلک ہاؤس کے دائیں طرف جو کچا ہٹ تھا۔ اس کے

برآمدہ میں یہ باتیں ہوئی تھیں۔ ان کے سامنے سٹول پر کوئی موٹی سی کتاب الٹی رکھی تھی اور وہ اس وقت سفید کرتے اور علی گڑھ کٹ پاجامے میں ملبوس تھے۔ جب میں آنکھوں میں آنسو لیے بوجھل قدموں سے ان کے پاس گیا تھا تو اور انسان تھا۔ جب چند منٹ کے بعد ان کے برآمدہ سے واپس آرہا تھا تو میرے قدموں کی رفتار ہی مختلف نہیں تھی، میں اندر سے بھی بدل چکا تھا یہ مکتب کی کرامت نہیں فیضان نظر تھا۔

ایک کام دیوانہ انسان

محمد سرور خان[1]

مجھے علوی صاحب کا شاگرد ہونے کی عزت بھی حاصل ہے لیکن یہاں میں ان کے آفس سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے چند باتوں کا تذکرہ کروں گا۔

علوی صاحب نے ۱۹۷۰ء میں حیدری صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد ایسوسی ایشن کے سیکرٹری کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس وقت سے ان کے انتقال تک میں ایسوسی ایشن کے آفس میں ان کے ساتھ کام کرتا رہا۔

۱۹۸۳ء کی سالانہ تقریب انعامات سے کچھ دن پہلے کالج کے سامنے جی ٹی روڈ سرائے عالمگیر ان کی موٹر بائک کا ایک بس سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ رات کو میں ان کو دیکھنے گیا تو بولے "سرور" یہ ایکسیڈنٹ معمولی سہی لیکن ہوا بہت ناوقت ہے۔ اینول ڈے کا سارا کام باقی ہے تم دعا کرو کہ دو چار دن میں، میں بستر چھوڑ دوں۔ ہاں ایسا کرو کل نہیں تو پرسوں ضرور مجھے پرانے فائل دکھا دینا۔ خصوصاً دعوت ناموں والا"

ان کی آخری علالت کے زمانے میں، میں ان کو دیکھنے گیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ سی ایم ایچ جہلم سے گھر آگئے تھے اور ابھی سی ایم ایچ کھاریاں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ دوسروں کی طرح میں بھی ان کی صحت بلکہ زندگی کی طرف سے فکرمند تھا۔ جب میں نے کمرہ میں قدم رکھا تو دور سے ان کی حالت دیکھ کر کچھ ٹھٹکا۔ لیکن جب قریب گیا تو انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا۔ اور پھر خود ہی کہا اب بہتر ہوں۔ اس دن ان کی ہچکی

---

[1] محمد سرور۔ آفس سپرنٹنڈنٹ۔ ملٹری کالج نمبر ۲۰۲۱، کالج میں زمانہ تعلیم ۵۷-۱۹۵۰ء

کچھ کم تھی۔ پھر بولے "سرور ڈائریکٹری کے پرد فارمے آرہے ہوں گے۔ ابھی بہت کام باقی ہے۔ پچھلے ٹائم بیٹھ جایا کریں گے۔ آپ فائل ورک شروع کر دیں" وہ حوصلہ سے بات تو کر رہے تھے لیکن ان کی حالت کم تشویش ناک نہیں تھی۔ کمزور بے انتہا نظر آرہے تھے میں جب انہیں دیکھ کر باہر آیا تو حیران تھا کہ اس حالت میں بھی ڈائریکٹری کا کام ختم کرنے کی سوچ رہے ہیں۔

وہ کلاسز کے بعد تقریباً ہر روز ایسوسی ایشن کا کام کرنے رُک جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو بہت دیر ہو جاتی میں کسمساتا کہ دیر ہو رہی ہے لیکن وہ بڑے اطمینان سے ڈرافٹس کی نوک پلک درست کیے جاتے۔ ان کی عادت افسری جتانے یا غصہ کرنے کی نہیں تھی، بڑے صبر و تحمل سے کام کرتے اور کام لیتے۔ مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا کہ ایک بار میں نے انہیں بہت تکلیف پہنچائی۔ پچھلے سال گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو ایسوسی ایشن کا کچھ کام کرنا تھا میں چھٹیوں میں کچھ چھٹی جانا چاہتا تھا۔ کام تھا کہ ختم ہی نہیں ہونا تھا۔ میں نے ایک دم ذرا بے صبر بلکہ تلخ ہو کر کہہ دیا۔ سارے افسر چھٹی چلے گئے۔ آپ کب چھٹی جا رہے ہیں۔ صرف اس دن انہوں نے قدرے آزردگی سے کہا "سرور۔ اس طرح نہیں کہا کرتے، یہ کام چھٹی جانے سے زیادہ ضروری ہے"

ایک اور بات جو میں نے نوٹ کی یہ تھی کہ وہ سرکاری یا ایسوسی ایشن کے پیسے کو بہت احتیاط سے استعمال کرتے اور کرواتے تھے۔ کالج کے میگزین کو باہر کے ملکوں میں بھیجنے کے لیے خاصی رقم لگتی ہے۔ وہ ابوظہبی، کویت، قطر، جرمنی، انگلینڈ وغیرہ بھیجے جانے والے میگزین کے پتے لکھوا کر رکھوا لیتے اور مجھ سے کہتے "سرور، خیال رکھنا کوئی آتا جاتا ہو تو یہ میگزین بھجوا دینا۔ چنانچہ میں نے اکثر یہ میگزین گلف کی ریاستوں میں اس طریقے سے بھجوائے مثلاً ۸۷ء اور عزیز کو کویت کے بنک میں میگزین اور ایسوسی ایشن کا لٹریچر انہوں نے خود اسی طرح کئی دفعہ بھیجا۔

علوی صاحب

——— لیفٹیننٹ جنرل محمد اشرف[1]

آکنلک ہاؤس کے پیچھے مہے گاؤں تک کھلا میدان تھا۔ کھیت تھے۔ ہم اکثر کبھی کبھی چھٹی کے دن ادھر آؤٹنگ کے لیے نکل جایا کرتے تھے۔ ایک روز ہم مہے گاؤں کے پاس سے گزر رہے تھے تو گاؤں کے چند لڑکوں نے کبڈی کے لیے چیلنج کیا۔ ہم نے چیلنج منظور کیا لیکن یہ کہا "آج نہیں۔ کل آپ بھی اپنی تیاری کر لیں ہم بھی کر لیں گے۔" چنانچہ دوسرے روز وہ معرکہ ہوا اور ان کو بُری طرح سے ہرایا لیکن وہ لڑکے ہار نہیں مانتے اور لڑنے پر اتر آئے مجبوراً ان کی تواضع کرنی پڑی۔ دوسرے روز ان لوگوں نے کالج آکر رپورٹ کی اور چند دوسرے جھوٹے الزام بھی لگائے۔ تفتیش کے لیے کیس بالآخر آکنلک ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر مسٹر علوی تک پہنچا۔ انہوں نے ہاؤس میں پوچھ گچھ شروع کی تو میں نے ان سے عرض کیا "سر پارٹی کا سرغنہ میں تھا۔ یہ دوسرے لڑکے تھے اور اصل واقعہ یہ ہے کہ (کرنل رفیق کا اثر سسٹم شروع ہو چکا تھا) جب میں واقعہ بیان کر رہا تھا تو وہ غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"Is it the whole truth"

Yes Sir, it is.

"مار کھائی یا مارا؟"

ظاہر ہے کہ پٹائی کی تھی تبھی تو وہ شکایت لے کر آئے۔ "ٹھیک ہے لیکن اس قسم کی معرکہ آرائی میں اپنا وقت اور توانائی ضائع کرنے کا فائدہ۔ تم جا سکتے ہو۔"

وہ بڑے Mature ہاؤس ماسٹر تھے۔ آکنلک ہاؤس سینئر ہاؤس تھا۔ جب بھی کوئی ڈسپلن کا مسئلہ کھڑا ہوتا وہ اسے ایک عام انسٹرکٹر کی طرح نہیں ایک تجربہ کار ماہر تعلیم استاد کی طرح حل کرتے تھے۔

——— شربت خان محسود

علوی صاحب سے ۵۸-۱۹۵۷ء میں فرسٹ ائیر میں اردو پڑھی اور کرنل رفیق صاحب نے صرف ہم چار لڑکوں (۱۹۳۱ عطا، ۲۰۵۳ میں شربت خان، ۲۰۸۱ سعید اور ۲۱۳۸ شہیالی)

---

[1] کالج نمبر ۲۰۵۳ - زمانہ تعلیم ۵۸-۱۹۵۱ء

کے لیے آرٹس کی کلاسیں شروع کروائیں۔ ایف ایس سی ہمارے بس کا روگ نہ تھا اور علوی صاحب نے ہمیں اس قابل بنا دیا کہ ہم اردو اختیاری لے کر پاس ہو سکیں۔ شروع کے ایک دو ہفتہ تو انہوں نے نصابی کتاب کھولی ہی نہیں۔ لسانیات سے شروع ہوئے اسامی اور آریائی زبانوں کی تاریخ، اردو کی تاریخ، اردو شاعری کی تاریخ، شاعری کے اور نثر کے سکول، غرض کوئی پہلو ایسا نہیں جو پیاسا چھوڑا ہو۔ وہ شاعری کو بھی تاریخ اور سیاسی پس منظر کے حوالے سے پڑھاتے تھے ان کا لیکچر اکثر ہمارے سروں کے اوپر سے گزر جاتا تھا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ لفظوں سے آگے دیکھنے اور بین السطور میں پڑھنے کی عادت پڑ گئی۔

——— محمد اعظم[1]

۱۹۵۶ء میں، میں برڈ وڈ ہاؤس میں میس سیکرٹری تھا۔ علوی صاحب کے کمرہ کی بتی بارہ ایک بجے رات تک یقینی طور پر جلتی رہتی تھی۔ یہ وقت ان کے مطالعہ کا تھا۔ اس کے بعد بلاناغہ وہ ہاؤس کی چیکنگ کے لیے نکلتے۔ اس زمانہ میں میس سیکرٹری راشن کا حساب کتاب ایک لمبے چوڑے رجسٹر میں رکھتا تھا جس کو اپ ٹو ڈیٹ رکھنا ہوتا تھا۔ (یہ بیگار نہیں ایک تربیت تھی جو آج بینکنگ میں میرے کام آ رہی ہے) اس کی وجہ سے مجھے سونے میں دیر ہو جاتی اور پھر اکثر سونے کی جلدی کی وجہ سے میں مچھر دانی اچھی طرح نہ لگا پاتا۔ علوی صاحب نے ایک نہیں کئی مرتبہ رات گئے میری مچھر دانی ٹھیک کی۔ جاڑوں میں بچوں کے گرے ہوئے کمبل سمیٹتے رہتے تھے۔ علوی صاحب کی وجہ سے برڈ وڈ ہاؤس میں بڑے شاندار فنکشن اور ہاؤس شو ہوئے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن کرنل جعفری کے آنے پر منجملہ اور چیزوں کے تمبولا بھی ہوا تھا۔ اور اے جی میجر جنرل اداراللہ کے آنے پر شاندار ورائٹی پروگرام کیا گیا تھا۔ حیدری صاحب کا لکھا ہوا برڈ وڈ ہاؤس کا انگریزی ترانہ Birdies never tell a lie بھی کورس کی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ خود حیدری صاحب نے پیانو کی پس منظری موسیقی دی تھی۔

---

[1] اے وی پی یو بی ایل میرپور کالج نمبر ۲۱۱۸۔

—— میجر اختر حیدر[۱]

علوی صاحب میں نہ رفیقی جلال تھا نہ حیدری "جمال" پھر بھی وہ ایک مرعوب کن شخصیت کے مالک تھے اور ان کے رعب کا راز ان کا ہمہ گیر علم تھا۔

غالباً عین عربی میں آنکھ کو کہتے ہیں۔ اگر نہیں کہتے تو کہنا چاہیے کیونکہ علوی صاحب کی عینیں ان کے احساسات بلکہ ان کے افکار کی بھی غماز تھیں۔ ان کی شخصیت ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ ایک سحر تھا ان کی آنکھوں میں اپنے کردار اور افکار کے لیے انہیں ملٹری کالج کا قائداعظم اور سرسید کہنا چاہیے ان ہی دو اکابر کی طرح ان کی ساری زندگی قوم کی کرداری اور علمی خدمت میں گزری۔ ان کے مزار کے کتبہ پر لکھا ہے۔ وہ جو چراغ جلاتے جلاتے خود جل اٹھے۔ حقیقت کی بالکل صحیح عکاسی ہے۔

—— ارشد رانا[۲]

کالج سٹیج پر سالانہ کنسرٹ کے موقع پر ایک ڈرامہ کار کی شادی پیش کیا جانا تھا۔ اس کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ اس میں ایک رول میرا بھی تھا ایک دن ریہرسل پر جانے میں مجھے کوئی پانچ منٹ کی دیر ہو گئی۔ میں سٹیج پر پہنچا تو دیکھا علوی صاحب انتہائی بے چینی سے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی برس پڑے۔

"ارشد۔ میرے پانچ منٹ لاؤ۔"

انہوں نے جس جلال کے عالم میں یہ الفاظ کہے میں تو کانپ گیا۔ کہیں مجھ پر کوئی قہر نازل نہ ہو جائے —— زندگی بھر ان کا مجھ پر کرم رہا اور بے حساب!

—— بریگیڈئر عبدالرزاق تمغۂ امتیاز[۳]

انٹر ہاؤس کراس کنٹری ریس کے مقابلے کی تیاری کے لیے ہاؤس بر ڈووڈ پریکٹس کے لیے اسی روٹ پر بھیجا گیا۔ واپسی پر کچھ لڑکوں نے شارٹ کٹ کیا۔ علوی صاحب کو خبر ہوئی تو ہاؤس کو فالن کروا کے بڑے گمبھیر انداز میں صرف ایک فقرہ کہا:

I have guaged the depth of your character

---

[۱] کالج نمبر ۲۱۶۳ زمانہ تعلیم ۶۱-۱۹۵۳، پہلا انعام یافتہ بہترین ایکٹر انگریزی [۲] کالج نمبر ۲۱۹۰ زمانہ تعلیم ۶۱-۱۹۵۳ء
[۳] کالج نمبر ۲۱۸۶۔ زمانہ ۶۲-۱۹۵۳ء

——— لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر[1]

۱۹۵۳ء کے ڈرامیٹک شو میں علوی صاحب نے مجھے گلوکاری کا موقع دیا تھا ۱۵۵۱ خادم، ۱۷۶۵ موجود، ۱۸۷۴ اسلم، ۱۸۹۱ واجد بھی کورس میں تھے۔ علوی صاحب نے آغا حشر کے کسی ڈرامہ کے کورس ہم سے ہری بھری ہے پھلواری

پیش کیا اور اس کی دھن بھی ترتیب دی تھی۔ اس زمانہ میں علوی صاحب کو ہارمونیم پر اکثر گاتے سنا۔ کلاسیکی موسیقی کا ذوق بھی تھا اور موسیقی کی فنی باریکیوں پر نظر رکھتے تھے۔ راگ درباری ان کا پسندیدہ راگ تھا۔

اردو ڈرامہ کے علاوہ Elocution کے بھی وہی انچارج تھے۔ پہلے ایلوکیوشن میں "بڈھے بلوچ کی نصیحت" میں نے پیش کی تھی۔ ۲۰۷۱ سلطان محمود کا آئیٹم "شکوہ اور جواب شکوہ" تھا۔

۲۱۹۰ ارشد رانا کا نثر کا انتخاب بھی بہت دلچسپ تھا۔ علوی صاحب نے حسن نظامی کے انشائیہ "مچھر کا جنازہ" کا اقتباس بھی شامل کیا تھا۔ پیش کس نے کیا تھا یہ یاد نہیں رہا۔

اپنے فلسفیانہ تفکر و تدبر کے باوجود وہ زاہد خشک نہیں تھے۔ ان کا مزاح بہت لطیف اور برجستہ ہوتا تھا، تربیت میں ان کے انشائیے اردو کے مزاحیہ اور طنزیہ ادب میں ایک مقام رکھتے ہیں۔

اپنے تمام کمالات کے باوجود وہ سامنے کی تیز روشنی (Lime light) میں آنے سے گریز کرتے تھے۔ پس پردہ کام کرنا اور کرتے رہنا انہیں زیادہ پسند تھا۔ اگر کسی فن میں وہ پیچھے تھے تو وہ Salesmanship کا فن تھا۔

خرد افروز

——— سلیم اختر کیانی[2]

ایک دفعہ کلاس میں "یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے" پڑھاتے ہوئے کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا "انصاف کی بات تو یہ ہے کہ انٹر

---

[1] کالج نمبر ۲۱۹۶ زمانہ تعلیم ۶۲-۱۹۵۱ء بہترین مقرر اور تمثیل کار [2] ڈپٹی سیکرٹری چیف منسٹر پنجاب کالج نمبر ۲۲۱۹ زمانہ تعلیم ۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۴ء

کے کورس میں صرف یہی ایک نظم ہوتی تو سارا سال پڑھائی جا سکتی تھی بلکہ معاملہ پھر بھی تشنہ ہی رہتا۔" یعنی علوی صاحب کا مقصد صرف سبق پڑھانا ہی نہیں تھا بلکہ موضوع کو طالب علم کی ذات، شخصیت اور روح کا حصہ بنا دینا تھا۔

ایف اے میں اردو اعلیٰ کی کلاس لیتے ہوئے ہوم ورک کے لیے ہمیں مضمون لکھنے کو کہا۔ جب کلاس نے پوچھا کہ سر کس عنوان پر لکھنا ہے تو بہت برہم ہوئے۔ کہنے لگے آپ پرائمری کے طالب نہیں، عنوان کیا ہونا ہے کسی چیز پر لکھ لائیں اور کبھی کوئی عنوان تجویز نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم لوگوں نے مضمون، نظم، ڈرامہ، افسانہ اور انشائیہ سب کچھ لکھا۔ Original thought ہماری تحریروں کا حصہ بنا اور سوچ کے سوتے پھوٹے اور خشک نہ ہونے پائے۔

ایک مرتبہ مجھے اور چند اور کیڈٹس کو محمود غزنوی ہاؤس سے اپنے گھر بلوایا۔ چائے بلوائی اور ہمیں موسیقی کے بارے میں نہ صرف بتایا بلکہ ہارمونیم منگوا کر اس پر "پیلو راگنی" بجائی۔

کالج میں میری ہابی موسیقی تھی۔ اس میں مجھے سازوں کی موسیقی کے لیے انعام بھی ملا۔ کالج میں میری پہلی Inspiration شفیق صاحب کے علاوہ علوی صاحب بھی تھے یہ بات اس وقت کی ہے جب فائن آرٹس اینڈ کلچرل سنٹر کمانڈانٹ صاحب کے دفتر کی ساتھ والی عمارت میں ہوا کرتا تھا کہ مجھے اس سنٹر کے آگے سے گزرتے ہوئے آرگن پر فلم داغ کے گانے "اے میرے دل کہیں اور چل" کی دھن سنائی دی۔ جس انداز میں یہ دھن بجائی جا رہی تھی اس نے مجھے رک جانے پر مجبور کر دیا۔ آواز کی سمت بڑھا تو دیکھا کہ علوی صاحب ایک ناقابل بیان انہماک کے ساتھ آرگن پر یہ دھن بجا رہے ہیں۔

ائیر فورس اکیڈمی رسالپور میں ملٹری کالج کی طرف سے حصہ لینے کی تیاری ہو رہی تھی اقبال فرید کے ساتھ مجھے حصہ لینا تھا۔ علوی صاحب نے میرے لیے تقریر لکھی۔ اس مقابلہ میں دو مقرر بولتے تھے۔ ایک سنجیدہ موضوع پر ایک مزاحیہ موضوع پر۔ مجھے مزاحیہ موضوع پر اظہار خیال کرنا تھا۔ میں نے خود بھی اپنے لیے ایک تقریر لکھی جب علوی صاحب نے میری تحریر پڑھی تو اپنے لکھے ہوئے دو صفحات کی بجائے شروع کے دو صفحے

جو میں نے Attempt کیے تھے وہ شامل کر لیے۔ مجھے عملی سبق دیا کہ اچھی اور موزوں بات کا مقام اتنا اعلیٰ ہوتا ہے کہ اس کے سامنے ذات، انا، استاد شاگرد کا رشتہ سب Subservient ہیں۔ اس حقیقت سے علوی صاحب نہ صرف آگاہ تھے بلکہ اس پر عمل پیرا بھی تھے۔
ایک مرتبہ گرمیوں کی تعطیلات سے چند روز پہلے مجھے بلوایا اور کہا: "سلیم! یہ کتابیں آپ چھٹیوں میں پڑھ ڈالیں"۔ کیسی ذرّہ نوازی تھی کہ کالج لائبریری سے خود ہی کتابیں منتخب کیں، میری استعداد اور ضرورت کے مطابق اور پھر مجھے پڑھنے کو دیں۔

ان کتابوں میں اردو ادب کا تجزیاتی اور تنقیدی جائزہ تھا۔ اس مطالعہ کی وجہ سے باوجود اس امر کے کہ میں نے ابتدائی تعلیم کانونٹ سکولوں میں حاصل کی تھی۔ میں نے نہ صرف ایف اے میں اعلیٰ اردو پڑھی بلکہ پی سی ایس کے مقابلے کے امتحان میں بھی اردو ادب کا پرچہ رکھا اور اس میں بہت اچھے نمبر حاصل کیے۔ یہ سب بالواسطہ طور پر علوی صاحب کا فیض تھا۔
بنیادی طور پر علوی صاحب "خرد افروز" تھے Enlightenment ان کا مشن تھا وہ سپرٹ آف انکوائری (Spirit of enquiry) کے ذوق کی تربیت کرنا چاہتے تھے اور یہ کام انہوں نے تیس برس تک کمال کامیابی سے کیا۔ ملٹری کالج کے افق پر اس روشن ستارہ کا ظہور ملٹری کالج کی تاریخ کا نہایت اہم واقعہ تھا اور اب اس کا غروب سنگین نرحادثہ۔

——— کرنل اخلاق احمد[1]

میں کالج میں ۱۹۵۵ء سے ۶۲ء تک زیر تعلیم رہا۔ یہ دور بیشتر کرنل رفیق کی قیادت کا ہے۔ کردار سازی اس دور کی امتیازی خصوصیت تھی۔ اس زمانے کے سارے اساتذہ بالخصوص راشد صاحب، علوی صاحب، ایوب صاحب، بلگرامی صاحب، حیدری صاحب کردار سازی پر زور دیتے تھے لیکن علوی صاحب کی ایک اور خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کا کینوس بہت وسیع تھا۔ کلاس روم ہو یا ہاؤس وہ قومی اور بین الاقوامی حالات و مسائل پر ماہرانہ انداز سے تبصرہ کرتے اور ہمیں اس طرح سمجھاتے جیسے ملک کی باگ ڈور ایک دن ہم نے ہی سنبھالنی ہے۔ وہ حکومتِ وقت کی پالیسیوں پر ایک انقلابی کی حیثیت سے بحث کرتے

---

[1] کالج نمبر ۲۳۴۵ زمانہ تعلیم ۶۲-۱۹۵۵ء

تھے اور بر ملا اپنے تصورات کا اظہار کرتے تھے۔ جی حضوریت ان سے کبھی نہ ہو سکی۔ ان کی معروضی "تنقید کو سن کر اختلاف کرنے کا خوف دل سے دور ہو جاتا تھا بلکہ خیال کی قوت کا احساس ہوتا تھا۔ میرے زمانے میں وہ تنہا شخص تھے جنہوں نے ہمارے ذہنوں کو وسعت اور جذبوں کو روشنی بخشی۔ اگر دیکھا جائے تو ان کا دائرہ کار ایک لحاظ سے محدود ہی تھا۔ وہ ایک استاد تھے اور استاد بہر حال نصاب اور کلاس کا پابند ہوتا ہے لیکن انہوں نے اقبال کے حوالے سے ان پابندیوں کو وسعتوں میں بدل دیا تھا۔ انہیں ملٹری کالج کے سقراط کا درجہ حاصل تھا۔ وہ سمجھوتہ (Compromise) کرنے کے قائل نہ تھے۔ ان جیسے فکر و ذہن کے آدمی کے لیے دوسرے عام آدمیوں کے ساتھ چلنا مشکل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان کا اختلاف حکام بالا اور رفقاء کار سے ضرور ہوتا ہو گا لیکن انہوں نے اپنی گفتگو میں ذاتیات کو موضوع کبھی نہیں بنایا۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں ایک آدھ اس دور کے کالج کے حاکم نے ان سے ہمارے سامنے خاصی بے ادبی سے پیش آنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن انہوں نے اس شریف آدمی کے خلاف اس وقت بھی منہ سے کچھ نہیں نکالا۔ اور بعد کو کچھ نہیں کہا بلکہ اس ناگوار واقعہ کو بظاہر کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ دانشور کا دل شیشہ خانہ ہوتا ہے اندر جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہوگی اس کا حال خدا ہی جانتا ہے لیکن باہر آواز نہیں آنے دی۔ اس سے بھی ہماری تربیت ہوئی مجھے یقین ہے کہ میری طرح اور بہتوں نے بھی اس واقعہ کے حوالے سے ان سے انسپریشن لیا ہو گا۔ ان کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی تھا۔

یہ واقعہ ۱۹۵۷ء کا ہے۔ علوی صاحب نے برڈووڈ ہاؤس میں (محمود غزنوی ہاؤس) مجھے ایک ڈارمیٹری کا جونیئر پریفکٹ نامزد کیا۔ ۱۹۵۶ء میں کالج میں داخل ہوا تھا۔ صرف ایک سال کے بعد عہدہ پر میرا تقرر خاصی عزت افزائی کی بات تھی لیکن کچھ حالات ایسے ہوئے کہ میں نے اس عہدہ سے دستبردار ہونا چاہا۔ علوی صاحب نے مجھے قائل کرنے کے لیے جو دلیلیں دیں ان میں سے چوتھی دلیل یہ تھی کہ زندگی کے سفر میں ہر قدم پر ایک نیا چیلنج ہوتا ہے۔ کہیں نہ کہیں سے Resistance ہوتی ہے اس Resistance کو توڑنے ہی سے زندگی آگے بڑھتی ہے اگر آج تم نے Line of least resistance

اختیار کرنے کی نباہ کن غلطی کی تو پھر تیچھے ہی ہٹتے جاؤ گے۔ اور تمہاری خودی پامال ہوتی جائے گی۔ علوی صاحب کی نصیحت کو میں نے پلّے میں باندھا تا آنکہ وہ دن بھی آیا کہ انہوں نے ۱۹۶۳ء میں مجھے برڈ ووڈ ہاؤس کا ہاؤس پریفکٹ مقرر کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس فقرہ میں خود علوی صاحب کی شخصیت سمٹ آتی ہے انہوں نے Least Resistance کی راہ نہ خود اختیار کی اور نہ اپنے شاگردوں کو اختیار کرنے دی۔ اس وقت تو خیر میں کیا سمجھتا لیکن اب وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ روایت پرست ہونے کے برعکس درایت پسند (Non conformist) تھے۔ وہ Resist کرنے دباؤ کا مقابلہ کرنے پر یقین کرتے تھے۔

علوی صاحب نے اپنے طلبا میں مدافعت کرنے اور چیلنجوں کو قبول کرنے کا جو حوصلہ پیدا کیا وہ میرے خیال میں ان کا بہت بڑا احسان تھا۔ وہ ادیب تھے تخلیقی فنکار تھے۔ اس حوالے سے نرم رو اور نرم خو بھی ضرور تھے لیکن اندر سے وہ بہت مضبوط اور جرأت مند تھے اور غلط آدمی اور غلط بات کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس کی مثالیں بھی بہت ہیں۔

علوی صاحب کی قومی اور لسانی عصبیت بھی بہت زیادہ تھی۔ وہ قومی کلچر اور قومی زبان کا بہت شدت سے دفاع کرتے تھے۔ اردو کے مقام اور منصب پر گھنٹوں زور دار بحث کرتے تھے لیکن اس معاملہ میں بھی تنگ نظر نہیں تھے۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی جب میں نے انہیں پہلی بار پنجابی بولتے دیکھا۔ ان کا مخاطب اردو، انگریزی، پنجابی جو زبان بول رہا ہو وہ اس سے اسی زبان میں بات کرتے تھے لیکن پاکستانیت کے حوالے سے وہ اردو کے قائل تھے اور اردو بولتے وقت انگریزی الفاظ کا سہارا نہیں لیتے تھے۔

آخر میں، میں کہوں گا کہ استاد کا اصل کام معلومات دینا نہیں، ذوقِ آگہی کو پروان چڑھانا اور کردار کی تربیت کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ کام مرحوم علوی صاحب نے بدرجہ اتم کیا ان کے ساتھ اور پڑھ دفا طرز زندگی کا اپنا حسن تھا۔

نشان کیانی[1]

ایک روز محمود غزنوی ہاؤس میں علوی صاحب سینئر لڑکوں سے لائٹ موڈ میں باتیں کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں فیملی پلاننگ کا محکمہ نیا نیا کھلا تھا اور اس کا بڑا چرچا تھا۔ محمود اختر شاہین میرے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے جرأت کی اور پوچھا سر آپ کا اس سلسلہ میں کیا خیال ہے کیا یہ کامیاب ہو سکتی ہے۔" کامیاب ہو سکتی تھی اگر قدرت تعاون کرتی۔"

"سر، وہ کیسے۔" وہ اس طرح کہ اگر نظام قدرت ایسا ہوتا کہ ایک بار بچہ بیوی پیدا کرتی دوسری بار یہ سعادت شوہر صاحب کو نصیب ہوتی تو مجھے امید ہے کہ بات تین بچوں سے آگے نہ بڑھتی۔" سر وہ کیونکر" شاہین نے شوخی سے پوچھا۔" ظاہر ہے کہ عقلمند آدمی صبر آزما مرحلوں سے بار بار گزرنا پسند نہیں کرتا۔

یہ انداز تھا کہ ان کے طنز و مزاح کا ذرا سوچنا پڑتا تھا۔ ایک روز غزل پڑھا رہے تھے شاعر نے محبوب کے وعدہ کرنے اور بار بار توڑنے کا گلہ کیا تھا۔ کسی نے کہا یہ حضرت وعدہ توڑنے کا گلہ کر رہے ہیں۔ آج کل تو لوگ قسم توڑ دیتے ہیں۔ علوی صاحب نے مسکرا کر کہا بقول والٹیئر قسم اور انڈہ توڑنے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ ان کے طنز و مزاح کے شگوفے اور دنبر ان کے ان انشائیوں میں دیکھے جا سکتے ہیں جو وہ تواتر سے ۱۹۵۴ء سے ۱۹۸۶ء تک مسلسل کالج میگزین میں لکھتے رہے جن کے عنوانات ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان میں کیا کچھ نہ ہو گا۔

ہنسی	سالنامہ	۱۹۵۴ء
کہتے ہیں جس کو آرٹ	"	۱۹۵۸-۵۹ء
شعلہ سا لپک جائے ہے	"	۱۹۵۹-۶۰ء
بڑے آدمی چھوٹے آدمی	"	۱۹۶۰-۶۱ء
افواہ	"	۱۹۶۳-۶۴ء

---

[1] پرسر پی آئی اے کالج نمبر ۲۳۵۳ زمانہ تعلیم ۶۲-۱۹۵۶ء

خوش فہمیاں سالنامہ ۶۳-۱۹۶۲ء

کھڑکی ۶۶-۱۹۶۵ء

یہ عنوانات میرے زمانے کے میگزینوں سے لیے گئے ہیں اگر علوی صاحب کے سارے انشائیے جمع کر کے شائع کر دیئے جائیں تو یہ اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک وقیع اضافہ ہو گا۔

——— لیفٹیننٹ کرنل اعجاز احمد[1]

جیسا کہ راشد صاحب نے ملٹری کالج کی تاریخ داستان علم و عمل جلد اوّل میں لکھا ہے کہ ملٹری کالج کے اولڈ بوائز کی پہلی مختصر سی میٹنگ ۱۹۳۶ء میں ہوئی تھی۔ پھر مئی ۱۹۴۸ء میں تقریب ملاقات کی صورت ہوئی۔ اس کے بعد نومبر ۱۹۵۰ء میں سلور جوبلی کے موقع پر اولڈ بوائز کی ری یونین ہوئی تھی لیکن باقاعدہ کوئی تنظیم عمل میں نہیں آئی۔ غالباً ۱۹۶۲ء میں تنظیم بنانے کی کچھ کوشش ہوئی۔ عالمگیرینز ایسوسی ایشن ملٹری کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے نام سے اکتوبر ۱۹۶۸ء کی ری یونین کے موقع پر باقاعدہ طور پر تشکیل عمل میں آئی اور اس کا آئین بھی تیار ہوا اور مسٹر حیدری اس کے پہلے سیکرٹری تھے۔

۱۹۷۰ء میں مسٹر علوی ایسوسی ایشن کے اعزازی سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۵ء کی گولڈن جوبلی پر انہیں دوبارہ اس عہدہ کے لیے جنرل باڈی نے منتخب کیا۔ ۱۹۸۲ء میں تیسری بار اور نومبر ۱۹۸۶ء میں ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر انہیں چوتھی بار اعزازی سیکرٹری منتخب کیا گیا۔

عالمگیرینز ایسوسی ایشن کے اصل معمار مسٹر علوی ہی تھے۔ انہوں نے اس کو کراچی لاہور کی دو شاخوں سے شروع کیا اور اسے رفتہ رفتہ ملک کے طول و عرض میں سات شاخوں تک پھیلا دیا۔ جس زمانہ میں لیفٹیننٹ جنرل اقبال بہاولپور میں جی او سی تھے تو وہاں ایسوسی ایشن کی شاخ قائم ہوئی تھی جب میں پشاور گیا تو انہوں نے مجھے لکھا کہ تم پشاور میں شاخ قائم کرو اس طرح انہوں نے کوئٹہ، میرپور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، ملتان میں ایسوسی ایشن کی شاخیں کھلوائیں اور ایسوسی ایشن کی ڈائریکٹری بنانے کا سلسلہ شروع کیا۔ جب میں نے پنڈی زون کی سکریٹری شپ لی تو ان سے مسلسل رابطہ رہا۔ کالج کی گولڈن جوبلی اور ڈائمنڈ جوبلی کی تقریبات کو کامیاب بنانے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

---

[1] کالج نمبر ۲۳۵۸ زمانہ ۱۹۵۶ء

——— لیفٹیننٹ کرنل اقبال شاہین [1]

یہ واقعہ ۱۹۶۰ء کا اورنگ زیب ہاؤس کا ہے۔ اورنگ زیب ہاؤس سے موتی ہال کے پیچھے سے شارٹ کٹ لیتے ہوئے مسجد کو جاتے تھے تو سٹاف کوارٹرز کے سامنے سے گزرتے تھے وہاں ایک پرانے شریں کے درخت میں طوطوں کے گھونسلے تھے۔ آتے جاتے طوطوں کو درخت کی کھوہ میں دیکھتا رہتا اور انڈوں سے بچے نکلنے کا انتظار کرتا رہتا۔ ایک روز ایک کلاس فور کو درخت کے نیچے تاک لگائے کھڑے دیکھا میں سمجھ گیا کہ اس کی نیت کیا ہے اس سے پہلے وہ ہاتھ مارے دوسرے اتوار کو صبح سویرے دو دوستوں کی مدد سے درخت پر چڑھا اور دونوں بچے نکال لیے شاید ایک آدھ دن ہی کے تھے کہ ان کے جسم پر کوئی پر نہ تھا بالکل گوشت کے لوتھڑے سے تھے۔ ڈارم پرلیفکٹ ہونے کی وجہ سے میرے پاس دو لاکرز تھے۔ ایک لاکر کا نچلا خانہ میں نے ان کے لیے مخصوص کر دیا۔ جب تک وہ بالکل بچے رہے تو پڑے رہتے تھے۔ کالج سے آکر میں چنے کی دال ڈال دیا کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہ میرے کالج سے آنے کا انتظار کرتے رہتے۔ میرے، مٹھو میاں کہنے کی آواز پر وہ ٹیاؤں ٹیاؤں کرتے۔ اسی طرح کچھ عرصہ گزر گیا، سب ڈارم کو معلوم کہ شاہین نے طوطے پال رکھے ہیں۔ میری طوطوں سے گپ شپ کو انجوائے کرتے۔ اب آگے کی سنیئے۔ انٹر ہاؤس انسپکشن سے پہلے ہاؤس ماسٹر علوی صاحب کا انسپکشن تھا اس سے پہلے کہ میں اپنے لے پالک طوطوں کو کہیں چھپاتا علوی صاحب وقت سے پہلے ڈارم میں آگئے اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا بیٹے کیسے ہو۔ طوطے یہ سمجھے کہ ان کو لفٹ دیا جا رہا ہے انہوں نے ٹیاؤں ٹیاؤں شروع کی جس کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ بیٹے کیسے ہو؟ اب علوی صاحب حیران کہ یہ کیا ماجرا ہے میں نے ہمت کی، سر میں بتاتا ہوں پھر میں نے پوری طوطا کہانی سنائی۔ بہت ہنسے کہا۔ طوطے اس طرح نہیں پلتے۔ اگر پالنا ہے تو گھر پر پالو۔ دوسرے دن ویک اینڈ دیا جاؤ طوطے گھر چھوڑ آؤ۔ علوی صاحب نے تو ہنس کر ٹال دیا تھا والد نے طوطوں کا تحفہ وصول کرتے ہوئے اچھی خاصی تواضع کی۔

---

[1] کالج نمبر ۲۳۶۷ زمانہ ۶۴-۱۹۵۴ء

——— لیفٹیننٹ کرنل غلام سرور

کبھی آپ نے کنوئیں کو بھی پیاسے کے پاس جاتے دیکھا ہے؟ یہ خوش نصیبی مجھے حاصل ہوئی۔ وہ واقعہ لکھنے سے پہلے میں اس کا پس منظر بیان کرنا چاہوں گا۔ اس زمانہ میں میٹرک میں اُردو اختیاری مضمون تھا۔ کچھ لڑکے اردو لیتے اور کچھ آرٹ اور ڈرائینگ — کچھ فطری لگاؤ ہونے کی وجہ سے جب آٹھویں کے سالانہ امتحان میں ڈرائینگ میں میرے ۱۰۰ میں سے ۹۶ مارکس آئے اور اُردو میں ۶۷ تو میں نے نویں میں ڈرائینگ کو اختیاری مضمون کے طور پر پڑھنے کا ارادہ کیا اور جب وقت آیا تو ڈرائینگ کی کلاس میں جا کر بیٹھ گیا اردو کے لڑکے، اردو کے سیکشن میں چلے گئے۔ ڈرائینگ کے ہال میں بیٹھے ہوئے مجھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ علوی صاحب وہاں آگئے اور اشارہ سے کہا۔ اُٹھو، میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ یہ سمجھ کر کہ کوئی کام ہے پھر حکم ملا اُردو کی کلاس میں چلو۔ اب وہ آگے آگے میں پیچھے پیچھے۔ لیکن میری آنکھوں میں ”کیوں کا“ جو سوال تھا اور جو قدم بھاری تھے اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میں اس حکم سے خوش نہیں ہوں میرے منہ سے صرف یہ آدھا جملہ کہ سر! ڈرائینگ میں میرے نمبر . . . . علوی صاحب اس وقت کچھ جلال میں تھے انہوں نے قدرے درشتی سے فرمایا۔ سرور! میں جانتا ہوں اور کچھ اور بھی جانتا ہوں۔ مختصر یہ کہ میں چپکے سے اردو کی کلاس میں جا بیٹھا اور علوی صاحب نے پہلا سبق زبانوں کی تاریخ سے شروع کیا۔ دنیا کی زبانوں کے تین بڑے خاندانوں آریائی، سامی اور عبرانی کا تعارف کرایا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر سبز واری کی لسانیات کی کتاب ”اردو لسانیات“ کا ذکر بھی کیا تھا۔ پھر انہوں نے آریائی زبانوں پر بحث کی مجھے خوب یاد ہے کہ انہوں نے بتایا کہ ابھی تک چند بنیادی الفاظ باپ (پنجابی اردو) پتا ——— پدر (فارسی، فادر (انگریزی) میں مشترک ہیں۔ ماں، ماتا، مادر، بھائیا، بھائی برادر، بردر، وغیرہ بھی دو ایسے ہی الفاظ ہیں جو تمام آریائی زبانوں میں مشترک ہیں اور ان کی مشترک نسل کی غمازی کرتے ہیں۔ اس بحث کے بعد انہوں نے اُردو (ترکی لفظ بمعنی لشکر) کی پیدائش کے متعلق مختلف نظریئے جیسے دکن میں اردو، سندھ میں اردو، برج بھاشا اور پنجاب میں اُردو ڈسکس کیے اور کہا پنجاب میں

حافظ محمود شیرانی کی تحقیقی کتاب ہے جس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ اردو پنجابی کی بیٹی ہے۔
چند روز کے بعد علوی صاحب نے فرمایا۔ سرور، تم آرٹ کلب جوائن کر لو اور اپنی
ہابی جاری رکھو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور اردو کو اختیاری مضمون کے طور پر پڑھتا رہا
بالآخر اردو سے دلچسپی اتنی بڑھی کہ انٹر میں اردو اعلیٰ کو از خود اختیاری مضمون کے طور پر لیا۔
اب جو سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ چونکہ آگے چل کر انجنیئرنگ تو مجھے پڑھنی نہیں تھی
اس لیے میٹرک میں ڈرائینگ پڑھنا بے فائدہ ہوتا۔ آرٹ کا مجھے شوق تھا سو اس کی آبیاری
ہوتی رہی جبکہ اردو پڑھنے سے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بحر العلوم علوی صاحب سے اُردو
پڑھنے سے ادب اور زندگی کا جو تھوڑا بہت شعور مجھے نصیب ہوا وہ اس فیصلہ کا فیض ہے
جو اس دن انھوں نے میرے لیے کیا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس دن کے بعد پھر اُس
موضوع کو انہوں نے نہیں چھیڑا غالباً اس خیال سے کہ کہیں میں شرمندہ نہ ہوں یا ان کے
سامنے اپنی شکر گزاری کا اظہار نہ کروں یہ بھی ان کی عظمت کا ایک پہلو تھا۔ خدا کرے پاکستان
کو ایسے استاد ملتے رہیں جو اپنے شاگردوں کی خوابیدہ صلاحیتوں پر اتنی گہری نظر رکھتے ہوں
کہ جو یہ کہہ سکیں کہ ہاں میں کچھ اور بھی جانتا ہوں۔
۔۔۔ اللہ اکبر! یہ تھے علوی صاحب! پچھلے ہفتہ میں اپنے بیٹے سرور کے ساتھ کالج
کے سامنے جی ٹی روڈ کے پار کی مسجد کے پہلو کے قبرستان میں کھڑا ان کی قبر پر کھڑا فاتحہ پڑھ
رہا تھا تو کتبہ لوحِ مزار پہ نظر پڑی جو چراغ جلاتے جلاتے خود جل بجھے۔ دل کی گہرائیوں سے
آواز آئی اس میں کیا شک ہے۔

۔۔۔۔ کمانڈر غلام مصطفیٰ کیانی[۱]

علوی صاحب فلم اور ڈرامہ کے بہت اچھے نقاد تھے مجھے یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے ایک
بار بتایا تھا کہ انہوں نے ایک فلم سٹوری بھی لکھی تھی۔ ڈرامہ کے مانے ہوئے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر تو تھے ہی۔
۱۹۵۸ء میں جب کرنل رفیق سارے کالج کو ہارس اینڈ کیٹل شو کے لیے لاہور لے
گئے تھے تو وہاں کئی دن ٹھہرے تھے۔ تاریخی مقامات دیکھنے کے علاوہ ریگل سینما میں وار اینڈ

---

[۱] کالج نمبر ۲۳۶۲ زمانہ ۶۳-۱۹۵۶ء

پیس کا میٹنی شو بھی دیکھا تھا (تاریخی عمارات کا تعارف لیفٹیننٹ میر کرامت کراتے تھے اور) فلم شو کا تعارف علوی صاحب نے کرایا تھا یہ فلم ٹالسٹائی کے مشہور زمانہ ناول وار اینڈ پیس پر مبنی ہے جو روس پر نپولین کے حملہ کے دور کو کور کرتی ہے علوی صاحب نے وار اینڈ پیس ناول پر بھی عالمانہ تبصرہ کیا اس کے علاوہ علوی صاحب نے ہمیں سہراب مودی کی فلم کندن دیکھنے کی بھی اجازت دی بلکہ یہ کہا کہ جاؤ یہ فلم جا کر دیکھو اس میں نمی نے ایک بچی کا رول کیا تھا۔ کندن ایک پولیس انسپکٹر کی جدوجہد کی کہانی تھی۔ علوی صاحب آرٹ اور فن کو تہذیبی تربیت کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے ایک بار جب میں نے انٹر ہاؤس باسکٹ بال میچ میں اپنے ہاؤس برڈ وڈ ہاؤس کے لیے پے بہ پے باسکٹ کئے تو وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے خاص طور پر مبارکباد دی۔ ١٩٦٣ء میں جب کالج کو خیرباد کہہ رہا تھا تو میں نے ان سے درخواست کی، سر زندگی کے کچھ راہنما اصول بتائیں جن کی روشنی میں آگے بڑھ سکوں فرمایا جتنا بھی، جیسے بھی ہو سکے، دنیا کو بہتر بنانے کی جدوجہد کرتے رہیں، اس کاوش کی کوئی انتہا نہیں۔ تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول

—— لیفٹیننٹ کرنل شاہد پرویز قریشی[1]

فروری ۵۹ء کا ایلوکیشن کا ٹیسٹ ہو رہا تھا۔ علوی صاحب نے مجھے جوش ملیح آبادی کی مشہور نظم شکستِ زنداں خواب، تحت اللفظ سنانے کو دی۔ (نظم)

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے، گونج رہی ہیں تکبیریں	اکتاتے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوتے ہیں زندانی	سینوں میں طلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے	اٹھو کہ وہ بیٹھی دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں

فرمایا یہ وہ نظم تھی جس نے کبھی غلامی کے دور میں دلوں میں آگ لگا دی تھی اور سوزِ یقین سے

---

[1] کالج نمبر ۲۳۹۳۔ زمانہ تعلیم ۶۲-۱۹۵۶ء

لھو کو گرما دیا تھا۔ اس دور میں سب ہی شاعر آزادی کے ترانے گا رہے تھے۔ حد یہ کہ اختر شیرانی جیسے رومانی شاعر نے کہا۔

اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

اس نظم کے کئی بند انہوں نے ہم سب لڑکوں کو سنائے تھے۔ افسوس کہ یاد نہ رہے۔ جتنا ہم نے علوی صاحب سے ڈیبیٹوں، ایلوکیشنوں اور ڈراموں کے دوران سیکھا، اتنا کلاس کے دوران نہ سیکھا ہوگا۔ یونین کا آفس ایک کھلی اکیڈیمی تھا جس کے اندر جانے کے لیے افلاطون کی طرح اقلیدس جاننے کی شرط نہیں تھی۔

——— محمد ایوب خان[۱]

زمیندارہ کالج گجرات میں ایک تقریری مقابلہ تھا۔

تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ

اس میں شرکت کے لیے جو دو لڑکوں کی ٹیم جا رہی تھی ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ تقریر کے دوران ایک موقع پر گردن کو ایک خاص انداز سے خم دینا تھا۔ ریہرسل کراتے وقت علوی صاحب نے کوئی دس بار تو بتایا ہوگا کہ گردن کو یوں حرکت دینا ہے۔ آج میں ان کی قوتِ برداشت اور ہمارے اندر ان کی دلچسپی اور اپنے کام سے لگن کے بارے میں سوچ کر حیران ہو جاتا ہوں۔ علوی صاحب ریہرسل پر اتنی محنت کرتے تھے کہ جیسے یہ موت و زندگی کا مسئلہ ہے۔ وہ تقریریں، وہ مباحثے، خواب و خیال ہوئے لیکن وہ تربیت باقی ہے اور زندگی کے سفر میں سب سے قیمتی متاع ہے۔

تقریروں کے سلسلہ میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ ۱۹۶۰ء میں ہمارے کالج سے گورنمنٹ کالج کیمبلپور کے تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے دو ٹیمیں گئی تھیں انگریزی کی ٹیم میں سلطان حیدر اور ممتاز اختر تھے۔ وہ جیتے اور انگریزی کی ٹرافی لائے۔ اردو مقابلہ میں میری دوسری پوزیشن آئی۔ پہلی پوزیشن ایک لڑکی کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ کمانڈانٹ کرنل سردار خان جب مجھے دوسری پوزیشن کا انعام دینے لگے تو انہوں نے مجھے طنزاً یا مذاقاً کہا

---

[۱] سیلز منیجر پی آئی اے کالج نمبر ۲۴۰۴ زمانہ ۶۱-۱۹۵۷ء کالج ہیڈ بوائے ۶۱-۱۹۶۰ء گارڈز میڈل ۶۱-۱۹۶۰ء

you were beaten by a girl. اس ٹیم میں میرے ساتھ ارشد رانا گیا تھا
بعد کو میں نے اس تبصرہ کا تذکرہ علوی صاحب سے کیا تو انہوں نے مسکرا کر کہا:
Chivalry کا تقاضا یہی تھا کہ تم ایک لڑکی کو ہارنے کی شرمندگی سے بچاتے۔
علوی صاحب کی گفتگو میں اتنا Subtle Humour ہوتا تھا کہ جس نے اچھا خاصا انگریزی ادب نہ پڑھا ہو، وہ اس کی کماحقہٗ داد نہیں دے سکتا۔
علوی صاحب اقبال کو تو خوب پڑھاتے ہی تھے۔ غالب بھی ان کا کم Favourite نہیں تھا۔ غالب کی مشہور غزل:

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر، ہمدم!
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

پڑھاتے جو نکتہ آفرینی کی وہ آج بھی میرے دل پر نقش ہے۔ غالب کے خطوط انہوں نے اس زمانے کے سیاسی پس منظر خصوصاً پہلی جنگ آزادی کے حوالہ سے جس طرح پڑھائے وہ بھی انہی کا حصہ تھا۔ غالب کے اردو خطوط کے فنی حسن کی بھی انہوں نے اس طرح وضاحت کی کہ میری طرح ان کے دوسرے شاگرد بھی غالب کے پیرائے میں خط لکھنے کی کوشش کرتے ہوں گے۔

—— بریگیڈئر محمد مشتاق[1]

میں ۶۰ء کی بات کر رہا ہوں، اس زمانہ میں رات کے پریپ کلاسنر میں ہوا کرتے تھے۔ ہر روز باری باری کوئی ایک انسٹرکٹر پریپ ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔ عموماً تو پریپ ٹھیک ٹھاک ہوتے تھے۔ لیکن ہر کلاس میں کچھ ذات شریف قسم کی چیز بھی ہوتے تھے جن سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا تھا۔ یہ لوگ جب باتیں کرتے یا ناول رسالے پڑھتے پکڑے جاتے تو ان کی خاطر تواضع بھی ہوتی۔ لیکن جس روز علوی صاحب ڈیوٹی پر ہوتے اور ان کی موٹر بائیک سی آئی کے دفتر کے ساتھ آ کر رکتی تو خاموشی سے پاس ورڈ کلاسوں میں گھوم جاتا کہ آج علوی صاحب ڈیوٹی پر ہیں۔ کسی کو شرارت نہیں کرنی۔ باتیں نہیں کرنی۔ واضح رہے کہ کبھی علوی صاحب سزا نہیں دیتے تھے۔ یہ محض ان کا احترام تھا۔

---

[1] کالج نمبر ۲۴۱۰ زمانہ تعلیم ۶۴ء، ۱۹۵۷ء

——— لیفٹیننٹ کرنل شمیم احمد

" لوگ کہتے ہیں کہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ اس لیے میں ہاتھ کو بہت صاف رکھتا ہوں"۔۔۔ ٹائی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اسے اتار کر دلی تسکین ہوتی ہے۔ اور کھانا بھی حلق سے اتر سکتا ہے"۔

یہ فقرے کس کے ہیں؟

" فلک پیما کے"۔

" رشید احمد صدیقی کے؟"

" پطرس کے؟"

—— جی نہیں۔ یہ فقرے علوی صاحب کے ہیں جو انہوں نے ایک روز اردو پڑھاتے ہوئے جملہ معترضہ کے طور پر برجستہ کہے۔ اور یہ روز کا معمول تھا۔ اس معیار کی بذلہ سنجی ان کے مزاج کا خاصہ تھی۔ ایک روز کلاس میں اردو شعراء کی آفاقیت زیر بحث تھی، میر غالب، اقبال تین نام تھے جو ابھر کر سامنے آئے۔ کسی نے یکایک پوچھ لیا۔

" سر ہمارے عہد کا آفاقی شاعر کون ہے؟"

" فیض" علوی صاحب نے فرمایا۔

واضح رہے کہ یہ باتیں ۱۹۶۲ء میں ہو رہی تھیں۔ اس وقت تک فیض اتنے معروف نہیں ہوئے تھے اور اتنے Establish نہیں ہوئے جتنے بیس پچیس برس بعد ہوئے۔ علوی صاحب جس پائے کے مبصر اور نقاد تھے افسوس ہی ہے کہ یہ پہلو دنیا کے سامنے نہ آسکا۔

اقبال تو خیر ان کا موضوع تھا ہی۔ مجھے سب سے زیادہ لطف ان کے خطوط غالب پڑھانے سے آیا۔ میرا خیال ہے کہ ان کا دماغ اقبال سے اور قلب غالب سے متاثر تھا یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ ذہن کی ہم آہنگی اقبال سے۔ مزاجی لگاؤ غالب سے تھا۔ غالب کے ہاں جو ژرف نگاہی، جو انفرادیت جو ظرافت کی چاشنی ہے، وہ علوی صاحب کو بہت اپیل کرتی تھی۔ غالب کے خطوط انہوں نے برصغیر کی سیاسی تاریخ کے حوالہ سے پڑھائے۔ جس میں کمپنی ——— ایسٹ انڈیا کمپنی ——— کی حکومت سے پہلے مغلوں اور

لودھیوں کی ملوکیت کے دور پر سیر حاصل تبصرہ تھا۔ اس نکتہ پر کہ کس طرح ایک عہد کا ادب اس دور کی سیاسی تاریخ پر سب سے بلیغ تبصرہ ہوتا ہے۔ انہوں نے دل کھول کر بحث کی۔ غالب کی بذلہ سنجی کے وہ بڑے مداح تھے۔ غالباً انہی نے ایک بار فرمایا تھا۔ ذہانت اور مزاح کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ بات خود ان پر بھی صادق آتی ہے۔ غالب کی بذلہ سنجی کا وہ مشہور واقعہ کہ جب غالب ۱۸۵۷ء کی داروگیر میں میجر براؤن کے سامنے تفتیش کے لیے پیش ہوئے۔

"ویل۔ تم مسلمان ہے؟"

"آدھا"

"آدھا؟"

"شراب پیتا ہوں۔ سور نہیں کھاتا۔"

سنا کر علوی صاحب نے یہ نکتہ بھی پیدا کیا کہ دیکھو غالب Crisis میں ہیومر سے باز نہیں آتا۔ وہ پڑھاتے ہوئے ایسی ایسی نکتہ آفرینیاں کرتے تھے کہ خیال انگیز حیرت ہوتی تھی۔ میر تقی کے لکھنؤ جانے پر ان کا جو مذاق اڑا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو — ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے!
دلی کہ جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — رہتے تھے جہاں منتخب روزگار کے!
اسے فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا — ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

اور انشاء اللہ خاں انشار کی جو گت بنی۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

—— وہ خود لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب پر بہت بلیغ تبصرہ ہے۔ پھر انہوں نے شاعری اور ادب میں دہلی اور لکھنؤ سکول پر سیر حاصل گفتگو کی۔ میر حسن کی مثنوی کا گلزار نسیم سے، اور باغ و بہار کا فسانۂ عجائب سے موازنہ کیا —— اور آخر میں بڑی خیال انگیز بات یہ کہی کہ اب پاکستان میں دلی کا سادہ لائف سٹائل نہیں لکھنؤ کا پُر تعیش (Consumption orientated) طرز زندگی مقبول ہو رہا ہے۔ (دلی

اور لکھنؤ دو علامتیں ہیں زندگی کی طرف دو رویوں کی) ـــــ ان کے لیکچر کی تان لامحالہ طور پر قومی اور بین الاقوامی صورتِ حال پر ٹوٹتی تھی۔ ادب برائے زندگی کے وہ بہت بڑے نقاد تھے۔ انہوں نے ادب کے حوالے سے ہمارے ذہنی افق کو تا حدِ نظر وسیع کیا۔ ان کا سب سے بڑا ہتھیار ان کی آنکھیں تھیں جنہیں میں چبھتی ہوئی آنکھیں Penetrating eyes کہوں گا۔ عام طور پر وہ ہم سے باز پرس اپنی آنکھوں ہی سے کرتے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ خوشی، ناراضگی، اقرار، انکار غرض ہر قسم کے اندرونی احساسات کا اظہار کرتے تھے۔ خصوصاً برہمی کی حالت میں ان کی آنکھوں کی تیزی کی کوئی تاب نہ لا سکتا تھا۔ شاید زندگی بھر اپنے ہاتھ سے کسی کو مارا نہیں۔ سخت ناراضگی کے عالم میں بے وقوف اور نامعقول کے الفاظ سے آگے نہیں بڑھے۔ لیکن ان کی شخصیت کا دبدبہ بہت تھا۔ ایک جمعہ کو ہمیں ہاؤس کے کامن روم میں کیرم کھیلتے ہوئے نماز کے لیے خاصی دیر ہو گئی۔ جب علوی صاحب کے گھر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو ہم بھاگ کر اپنی ڈارمیٹری میں چلے گئے۔ جب ان کا رُخ کسی طرف ہوا تو چارپائیوں کے نیچے پناہ ڈھونڈی۔ وہ ڈارم کے بیچ میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے (اس کا مطلب تھا بہت غصہ میں ہیں) ان کی خاموش موجودگی سے مجھے پسینہ آ گیا اور میں چپکے سے چارپائی کے نیچے سے نکل کر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ میری دیکھا دیکھی دوسرے بھی نکل آئے۔ انہوں نے انہیں چبھتی ہوئی نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور کہا "صرف دو منٹ" مطلب یہ تھا کہ دو منٹ میں تیار ہو کر مسجد جاؤ۔ اور ہم چلے گئے۔ یہ سخت ترین سزا تھی جو میں نے ان کے ہاتھوں کھائی۔

آخر میں دو ایک واقعات کا ذکر کروں گا جن سے ان کی شخصیت کے دو اور پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اپریل ۱۹۵۷ء میں جب کالج میں، میں داخل ہوا تو پہلا مرحلہ یہ تھا کہ کٹ کی سو سوا چیزوں کو کس طرح سنبھالا جائے۔ سہ پہر کے قریب علوی صاحب آئے اور نئے لڑکوں کو بتایا کہ کٹ کے کپڑوں اور دوسرے سامان پر اپنا نمبر لگانا ہے۔ یہ کام زیادہ سے زیادہ گھنٹہ بھر کا تھا۔ لیکن ہم بچے کھیل میں پڑ گئے۔ ایک نمبر لگا کے بھاگتے دوڑتے گپ شپ کرتے۔ حد یہ کہ مغرب کی نماز کے بعد بھی یہ سلسلہ چلتا رہا علوی صاحب

اس عرصے میں آتے جاتے رہے۔ کہا کچھ نہیں۔ اگر وہ چاہتے تو کسی پریفیکیٹ کی نگرانی میں یہ کام گھنٹہ بھر میں کرا سکتے تھے۔ لیکن ان کی نظر ہمارے دل بہلنے پر اور احساس آزادی پر تھی وہ رُوسو اور والٹیئر کی طرح انسانی آزادی کے بہت بڑے Exponent اور جبر سے خواہ کسی قسم کا ہو ذہنی، جذباتی، جسمانی — وہ نفرت کرتے تھے۔

ایک روز کھانے کے بعد لڑکے میس سے نکلے ہی تھے کہ لائٹ چلی گئی۔ لڑکوں نے زبردست شور کرنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے ٹھیک اسی وقت کمانڈانٹ صاحب بھی وارد ہو گئے۔ علوی صاحب کو کوارٹر سے بلوایا اور بے محابا شروع ہو گئے اور ان کی شان میں کچھ نامناسب الفاظ بھی استعمال کر گئے۔ علوی صاحب کی توہین سے ہمیں بہت ملال ہوا۔ بعد کو ہاؤس کے تمام سینئر لڑکوں نے وفد کی صورت میں جا کر ان سے معافی مانگی کہ ہماری وجہ سے آپ کو خفت اٹھانی پڑی۔ علوی صاحب نے اس معاملہ کو ذرا بھر اہمیت نہ دی۔ وہ بڑے ظرف کے آدمی تھے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل عبد المجید[1]

ساتویں جماعت میں میرے اردو کے استاد تھے، بہت مزہ آیا ان سے اردو پڑھ کر۔ اردو سے تھوڑا بہت لگاؤ بھی انہی کے طفیل پیدا ہوا۔ بدقسمتی سے آٹھویں درجہ میں اردو کی کلاس کے لیے ایک اور استاد مقرر ہوئے نام نہیں لوں گا۔ لیکن ان کے انداز و اطوار سے نہ صرف یہ کہ مجھے ان سے نفرت ہو گئی بلکہ اردو سے بھی دل اچاٹ ہو گیا۔ جب میں نویں درجہ میں گیا اور اختیاری مضمون لینے کا مرحلہ آیا تو میں ڈرائینگ کی کلاس میں جا کر بیٹھ گیا اتفاق سے ادھر سے علوی صاحب کا گزر ہوا۔ مجھے وہاں بیٹھے دیکھا تو بلایا تم اردو میں اچھے خاصے ہو پھر یہاں کیوں؟ میں نے جھجکتے ہوئے وجہ بتائی انہوں نے تسلی دی آجاؤ، میں خود اردو کی کلاس لوں گا۔ میں نے تعمیل کی آج اس لمحہ کو دعا دیتا ہوں جب دوبارہ علوی صاحب سے فیض حاصل کرنے کی صورت پیدا ہوئی ان کا تو بہر طور ممنون ہوں کہ خود بلا کر فیضیاب کیا بعد میں انہوں نے ابتدائی تسلی کا حق ادا کیا۔ ایسے خیال انگیز مگر دلنشین انداز میں پڑھاتے کہ بایدوشاید خصوصیت سے نظم یا غزل کی تشریح اس انداز سے کرتے کہ

---

[1] کالج نمبر ۲۴۲۴ زمانہ تعلیم ۶۴ - ۱۹۵۸ء

ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرعہ کی تشریح میں معانی کے دفتر لگا دیتے۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

—— بریگیڈئر مقصود الحسن[1]

ان کے پڑھانے کا اپنا ایک انداز تھا۔ بہت، پھیلا کر پڑھاتے تھے۔ بس ان کے دو ایک لیکچروں کا تذکرہ کروں گا۔ یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ خلائی جہاز سٹپنک کی پرواز کا بڑا چرچا تھا۔ چاند تک پہنچنے کی بات ہو رہی تھی۔ انہوں نے اقبال کی غزل:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

خلائی پروازوں کے حوالے سے پڑھائی۔ چند آیات کا حوالہ بھی دیا۔ پھر کہا دیکھیں یہ غزل اقبال نے سٹپنک کے دور سے ۳۰ سال پہلے لکھی تھی۔ لیکن اقبال کی نظر کہاں کہاں تھی۔ ہر تحقیق اور ایجاد پہلے انسان کے ذہن میں جنم لیتی ہے۔ اس موقع پر کسی لڑکے کے منہ سے نکل گیا لیکن سر، اقبال تو شاعر تھے۔ یہ دور سائنس کا ہے۔

اس سوال کے جواب میں انہوں نے بہت تفصیل سے بتایا کہ شاعر اور سائنسدان میں تخلیقی تخیل Creative imagination مشترک ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ سائنسدان کا ادراک تجرباتی Empirical ہوتا ہے اور شاعر کا ادراک وجدانی Intuitional اس سلسلہ میں انہوں نے فرانسیسی فلسفی برگسان کا تذکرہ بھی کیا اور دوسری گول میز کانفرنس کے بعد لندن سے واپس آتے ہوئے اقبال کی پیرس میں برگسان سے ملاقات کی تفصیل بھی بتائی اور اس کے نظریۂ وجدان پر بحث کی۔ وہاں سے بات پیراسائیکالوجی تک پہنچی E S P یعنی Extra-Sensory Perception کی وضاحت کی صوفیا کے کشف و کرامت کا تجزیہ کیا وہ چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا تھے، ان کا ہر سبق ذہن کو روشنی کی لہروں سے چارج کر دیتا تھا۔

ایک روز فلسفۂ خودی کی تشریح کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا:

---

[1] کالج نمبر ۲۴۲۸۔ زمانہ تعلیم ۶۴-۱۹۵۷ء

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

اور پھر ساقی نامہ سے اس کے آگے پیچھے کے شعر بھی سنائے۔

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لیے برگ و ساز سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز

غالباً پورا ساقی نامہ انہیں زبانی یاد تھا۔ اس دن وہ بڑے موڈ میں تھے اور بات بات پر شعر کوٹ Quote کر رہے تھے اس لفظ ذوق پرواز کی تشریح میں انہوں نے کیا کیا نکتہ آفرینیاں کیں، میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس ضمن میں ڈارون کے نظریۂ ارتقاء اور Survival of the Fittest پر بحث کی تھی۔ حیاتیاتی ارتقاء میں Mutation کی بات کی تھی مولانا روم کی مثنوی کے اشعار سنائے جن میں زندگی کی رو کے عالم جمادات، نباتات، حیوانات سے گزر کر انسان تک پہنچتے پہنچتے شعور کی شکل میں رونما ہونے بتایا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس زمانہ میں ویڈیو ٹیپ کا انتظام نہ تھا۔ ورنہ ان کے لیکچر فن تدریس و تعلیم کا ایک مستقل سرمایہ ہوتے۔

جو کچھ وہ بتاتے تھے اور جس انداز سے وہ پڑھاتے تھے وہ ہماری امتحانی اور نصابی ضروریات سے زیادہ بلکہ بہت زیادہ ہوتا تھا۔ بعض باتیں بالکل ہمارے سروں کے اوپر سے گزر جاتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود اس وقت بھی ایک مبہم سی آگہی (Awareness) ضرور پیدا ہوتی۔ زندگی کے بارے میں، زندگی کے مقاصد کے بارے میں، علوم و فنون کے بارے میں، جس نے بقدرِ ظرف ہر ایک کو ذوق پرواز دیا۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

یکتا و یگانہ تخلیقی معلّم

—— ڈاکٹر مقصود الحسن نوری[1]

کوئی لمحہ، کوئی واقعہ ہوتا ہے جس کے حوالے سے ہم کسی کو پہچانتے ہیں یا پہچاننا شروع کرتے ہیں۔ علوی صاحب کو میں نے سب سے پہلے ایک سبق کے حوالے سے پہچانا۔ یہ پریم چند کا ایک افسانہ تھا زیور کا ڈبہ جو دسویں درجہ کی اردو کی کتاب میں شامل تھا۔ بظاہر ایک سیدھا سادا سا قصہ تھا۔ ایک ایسے ملازم کا قصہ جو بہت دیانت اور پوری محنت سے اپنا کام کرتا ہے اور آخر کار اپنے آقا کا اعتماد حاصل کرنے میں اس حد تک کامیاب ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا مال و متاع اس کے ہاتھوں میں چھوڑ دیتا ہے جس میں قیمتی زیورات بھی شامل تھے۔ اب اسے زیورات کی ضرورت پیش آتی ہے کچھ دیر تک وہ ترغیب کا مقابلہ کرتا ہے پھر مغلوب ہو کر وہ زیورات کا ڈبہ غائب کر دیتا ہے لیکن اس کا مالک اور اس کے گھر والے اس پر قطعاً شک نہیں کرتے۔ اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے۔ آخر ضمیر کی خلش سے مجبور ہو کر وہ ڈبہ واپس کر دیتا ہے وغیرہ۔ انہوں نے افسانہ کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ کیا۔ انسان کے ضمیر Conscience کی قوت کی بات کی۔ ضمیر کیا ہے کیسے بنتا ہے۔ پھر وہ جرم و سزا کی گہرائیوں میں گئے۔ وکٹر ہیوگو کے ناول Les Miserables لامزرابل اور دوستوفسکی کے ناول Crime and Punishment کا حوالہ بھی دیا۔ میں حیرت زدہ ہو کر یہ باتیں سنتا رہا جو وہ ایک سیدھے سادے قصہ جس کا صرف خلاصہ امتحان میں آنا تھا کے سلسلہ میں بتا رہے تھے۔ انہوں نے ہم سے پریم چند کا ایک اور افسانہ کفن بھی پڑھنے کو کہا اور یہ بھی کہ یہ دنیا کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ یا خدا یہ استاد ہے کہ علم کا جن جس کا مطالعہ اور مشاہدہ کا خزانہ اتنا بڑا ہے جس چیز کو میں تا زندگی نہیں بھول سکتا وہ ان کا یہ فقرہ تھا کہ ہر شخص کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی ترغیب Temptation کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ خیر و شر کی یہ کشمکش کبھی نہ

---

[1] ڈاکٹر مقصود الحسن نوری پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ساؤتھ کیرولینا یونیورسٹی امریکہ حال استاد انسٹی ٹیوٹ فار ریجنل سٹڈیز اسلام آباد کالج نمبر ڈی ایس ۲۱ زمانہ تعلیم ۶۴-۱۹۶۰ء

کبھی ہر دل میں ہلچل مچاتی ہے۔ ہر شخص کے ایمان کی قیمت لگتی ہے۔ اس کے ضمیر کو سولی پر چڑھایا جاتا ہے۔ گویا ہر شخص کا اپنا زیور کا ڈبہ ہوتا ہے' یہ آخری فقرہ مجھے اکثر یاد آتا ہے۔ جب بھی زندگی میں کوئی ترغیب سر اٹھاتی ہے تو ساتھ ہی لاشعور سے ایک آواز تحت شعور کی دہلیز پر آہستہ سے دستک دیتی ہے۔ "ہر شخص کا اپنا زیور کا ڈبہ ہوتا ہے۔ ہر شخص کا اپنا ....."

تدریس اسے کہتے ہیں۔ آج پچیس برس کے بعد بھی دنیا کی چار بہترین یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسٹر علوی کی یاد دل سے نہیں جاتی، تدریس، تعلیم اور تربیت کا جو معیار انہوں نے متعین کر دیا تھا اس سے آگے مجھے کوئی اور نہیں ملا۔ یہ تو میں نے ایک سبق کی مثال دی ہے۔ ان کا ہر سبق نظم ہو یا نثر ذہن میں روشنی کے دریچے کھولتا جاتا تھا۔ کلاس روم کے باہر بھی مجھے ان سے نیاز حاصل رہا۔ وہ سٹیج کی سرگرمیوں کے نگران اور رہنما بھی تھے۔ ان کی اس رہنمائی سے تو میں محروم رہا لیکن علمی راہنمائی سے استفادہ کرتا رہا۔ ۱۹۷۵ء میں ایک عرصے کے بعد ملٹری کالج گیا' وہاں جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ علوی صاحب سے ملاقات ہو۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں آرمی چھوڑ رہا ہوں اور تعلیم و تحقیق سے وابستہ ہونا چاہتا ہوں۔ وہ خوش ہوئے بلکہ بہت Excited بھی۔ جب میں ساؤتھ کیرولینا یونیورسٹی میں اپنا تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا تو میں نے ان سے رابطہ رکھا چونکہ میری جڑیں ملٹری کالج میں تھیں جنہیں علوی صاحب نے پانی دیا تھا۔ میں نے دنیا کی چار معروف یونیورسٹیوں میں پڑھا ہے۔ مگر علوی صاحب علم دوستی میں کسی بھی بڑی یونیورسٹی کے استاد سے کم نہیں تھے۔ مجھے جو بات ان کی رہ رہ کے یاد آتی ہے" وہ علم کی تلاش کا رویہ ہے جس کو وہ اپنے طالب علموں میں بھی فروغ دیتے تھے۔ ان کا Humanism بھی بہت نمایاں تھا۔

پچھلے سال امریکہ سے آ کر میں نے انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل سٹڈیز اسلام آباد میں کام شروع کیا تو ڈاکٹریٹ کی مبارک باد دینے والوں میں وہ پیش پیش تھے۔ دراصل یہ پودا انہی کا لگایا ہوا تھا۔ مبارک باد تو مجھے ان کو دینی چاہیے تھی جیسا کہ میں نے اپنے جوابی

خط میں لکھا تھا۔

ہمارے ہاں بڑے معلموں کی قدر کرنے اور عزت افزائی کی کوئی روایت نہیں ہے علوی صاحب کے حوالے سے میں ملٹری کالج کے ارباب حل وعقد سے درخواست کروں گا کہ وہ کالج میں ایک Hall of Fame قسم کی کوئی شاندار چیز تعمیر کرائیں اور اس میں ممتاز اولڈ بوائز اور ٹیچرز کا نام زندہ رکھیں اس کی ضرورت اب علوی صاحب کو نہیں، ہمیں ہے کالج اور ملک کو ہے۔

ایک مفکر معلّم

— بریگیڈئر یعسوب علی ڈوگر[1]

چند مستثنیات کے سوا ہمارے وہ اساتذہ جو علی گڑھ کے پروردہ تھے، صرف پڑھے ہوئے نہیں براہ کرم میرے قارئین اس فرق کو نوٹ فرمائیں، وہ دوسروں سے الگ پہچانے جاتے تھے۔ ایک تو ان کا ذہن زیادہ کھلا ہوا تھا۔ دوسرے ان میں واضح طور پر قومی جذبہ نسبتاً زیادہ تھا علوی صاحب چونکہ صرف پروردہ ہی نہیں ساختہ پرداختہ بھی سرسید کے علی گڑھ اور قائداعظم کے علی گڑھ کے تھے، اس لیے ان میں سرسید کی عقلیت پسندی Rationeliem اور قائداعظم کی قوم پرستی کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ ملٹری کالج میں قومی رویہ کی ساخت وپرداخت میں علوی صاحب کا خاص حصہ تھا بلکہ خاص کردار تھا۔ آج یہ رویہ ملٹری کالج کی شناخت کا ایک اہم عنصر ہے میرا خیال ہے کہ اس تشخص کو Institutionalise کرنے کی تدبیر کرنی چاہیے آج علوی صاحب نہ رہے کل راشد صاحب ریٹائر ہو جائیں گے اتنی بڑی چیز کو صرف چند افراد کے ساتھ مربوط نہیں ہونا چاہیے۔ افراد تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ پاکستانی قومیت کے جذبے اور قومی یک جہتی کے احساس کو فروغ دینے کے لیے پبلک سکول قسم کے اقامتی ادارے اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ ملٹری کالج چونکہ ایک قومی ادارہ ہے اور قومی زندگی میں اس کو ایک بنیادی رول ادا کرنا ہے اس لیے اور بھی زیادہ ضروری ہے بلکہ لازمی ہے کہ یہاں قومی جذبہ کو ایک تعلیمی مقصد کے طور پر اپنایا جائے اور اسے فروغ دینے کا ایک واضح طریق کار وضع کیا جائے۔ علوی صاحب نے اس میدان میں

[1] کالج نمبر ۷۹-۱۹۷۸ء۔ زمانہ تعلیم ۶۴-۱۹۵۸ء

بڑا کام کیا لیکن وہ بڑی حد تک انفرادی کاوش تھی۔ اب اس کو ایک ٹھوس بنیاد فراہم کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس معاملہ میں بھی وہی گن کے پیچھے آدمی کی بات صحیح ہے اس لیے نئے "علوی" بھی تلاش کیجئے۔

——— کرنل اقتدار علی[1]

علوی صاحب کی میری پہلی بھرپور یاد اورنگ زیب ہاؤس کی نمبر ۲ ڈارمیٹری کی ہے میرا بستر دروازے کے بالکل سامنے تھا۔ دسمبر کی رات تھی۔ میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ علوی صاحب ہاتھ میں ٹارچ لیے لڑکوں کے کمبل ٹھیک کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں لڑکوں کو سٹور سے بھورے رنگ کے تین کمبل ملتے تھے جو آٹھویں درجہ کے نئے لڑکوں سے بمشکل سنبھلتے تھے۔ علوی صاحب کو اس طرح رات کو ڈارمیٹریوں کا چکر لگاتے اور کمبل سیٹ کرتے اکثر دیکھا۔ علوی صاحب ہاؤس کے ساتھ کے مکان میں رہتے تھے اور ان کی رہائش ہاؤس کے بالکل ملحق کمرہ میں تھی لیکن کبھی ان کے کمرہ سے ریڈیو کی اونچی آواز بھی نہیں آئی۔ میٹرک میں ان سے اُردو پڑھی۔ اقبال اور غالب کو پڑھاتے اور بہت وقت صرف کیا۔ مجھے یاد ہے کہ:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

اس شعر کو پڑھانے میں دو پیریڈ صرف کیے خودی کا سارا فلسفہ انہوں نے اس شعر کے حوالے سے سمجھایا۔ بال جبریل کی مشہور نظم فرمان الٰہی خدا فرشتوں کے نام:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

انہوں نے بہت Involve ہو کر پڑھائی اس ضمن میں انہوں نے اقبال کے معاشی نظریات سے بحث کی۔ ایک خط کا حوالہ بھی دیا۔ جو ۳۷ء میں قائد اعظم کو لکھا تھا۔ خود قائد اعظم کو چند تقریروں کا حوالہ بھی دیا ——— غالباً ان میں سے ایک چٹا گانگ کی تھی جس میں انہوں نے پاکستان کو ایک فلاحی اسلامی ریاست کے طور پر پیش کیا تھا۔ ہمارے نصاب میں شکوہ اور جواب شکوہ کے چند بند بھی شامل تھے انہوں نے دونوں نظموں کا مقابلہ اور موازنہ کر کے بتایا کہ شکوہ آمد ہے اور جواب شکوہ آورد جو دباؤ کے تحت لکھی گئی۔ جتنی ادبی تنقید علوی صاحب نے ہمیں میٹرک میں پڑھا دی تھی وہ شاید

[1] کالج نمبر ۲۵۱۰ زمانہ تعلیم ۶۵-۱۹۵۹ء

باہر ڈگری کلاسز میں بھی نہ ہوتی ہو ان کے اتنے تفصیل میں جانے کی وجہ سے ان کا نظم کا کورس ختم نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ہمارا کورس بھی امتحانی تیاریوں کی چھٹی کے دوران ختم کیا گیا وہ اس طرح کورس ختم کرانے کے قائل نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ایک نظم بھی صحیح طور پر پڑھ لی پڑھالی جائے تو دس نظمیں سرسری طور پڑھنے پڑھانے سے بہتر ہے۔ میٹرک ہی میں ایک افسانہ زیور کا ڈبہ پڑھانے کے بعد اور افسانہ کی تکنیک کی موٹی موٹی باتیں سمجھا کر کہا "اب آپ لوگ ایک ایک افسانہ لکھ کر لائیں"۔ افسانہ کیا ہم نے تو کہانی تک لکھی کیا پڑھی بھی نہیں تھی۔ بہر حال میں نے اس مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ لائبریری گیا دو چار افسانے پڑے اور ایک افسانہ لکھ مارا اور علوی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انھوں نے دیکھا اور کاپی پر لکھا" اچھا ہے مگر بہتر ہوتا کہ تم خود لکھتے۔ بعد کو وضاحت کی کہ مقصد یہ تھا کہ تمہارے تخیل کو تحریک ہو۔ پھر کہا نقالی ذہانت کی نفی شخصیت کی توہین اور فن کی موت ہوتی ہے غالب کے وہ بہت بڑے مداح اس لیے بھی تھے کہ اس کے ہاں انا انفرادیت اور اختراع پسندی (Originality) ہے۔

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے　　یار کا دروازہ پائیں گر کھلا!

فرمایا یہ قطعاً اچھوتا خیال ہے اُردو، فارسی، عربی کے کسی اور شاعر نے یہ خیال نہیں باندھا اور باندھتا کیسے یہ غالب کی اپنی شخصیت کا ایک اظہار ہے۔ غالب کی وہ غزل ہمارے نصاب میں تھی جس کی ردیف "کیوں ہو" ہے اس شعر:

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

کی تشریح کچھ نہیں تو ایک گھنٹہ تو ضرور کی ہوگی۔ اس سلسلہ میں غالب کے اور بہت سے مکالماتی شعر بھی سنائے۔

ہاں وہ نہیں وفا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی　　جس کو ہو جان و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں
کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو　　نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو
گدا سمجھ کے چپ تھا میری جو شامت آئے　　اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسبان کیلئے

سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
کہا ہیں نے کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی

ایک روز محاکاتی شاعری کا ذکر چل پڑا۔ داغ، جوش، جگر وغیرہ کے بے شمار اشعار سنائے
نظام رام پوری کے یہ دو شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں۔

دیکھا جو مجھے چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ
انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ

منہ پھیر کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ
دینا وہ کسی کا جام سے یاد ہے نظام

جگر کا ایک شعر جس پر لڑکوں نے بڑی بڑی واہ واہ کی تھی کچھ اس طرح کا تھا۔

آئے بھی وہ گئے بھی وہ نظر میں اب تک سما رہے ہیں

دوسرا مصرع مجھے یاد نہیں رہا۔ اسی دن یا کسی اور موقع پر انہوں نے جگر کا یہ شعر بھی سنایا تھا

جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں
یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر

ایک روز میں نے ان سے آٹوگراف بک پر جگر کا کوئی شعر لکھنے کی فرمائش کی تو یہ شعر لکھا۔

ترا غم، غم محبت میرا غم، غم زمانہ
سچ کہہ دوں جو فرق ہے مجھ میں اور تجھ میں

اور ساتھ مشورہ دیا کہ جگر کا پہلا مجموعۂ کلام شعلۂ طور پڑھوں۔

——— کیپٹن مشتاق فرید کیانی[1]

میں شروع ہی میں واضح کیے دیتا ہوں کالج سے متعلق میری یادیں بہت تلخ ہیں
بد قسمتی سے کالج میں میرا زمانہ تعلیم وہ تھا جب چھٹی اور کٹ یہ دیکھ کر دی جاتی تھی کہ لڑکے کے
والد کا رینک کیا ہے (اگر میں غلط کہہ رہا ہوں تو مجھ پر خدا کا عذاب نازل ہو) اس زمانہ میں
بہت سے ریڈ ٹیپ کے لڑکے کالج میں کسی خاص مصلحت سے داخل کر لیے گئے تھے جنہیں
ہر قسم کی مراعات جیسے علیحدہ کمرے، لمبے ویک اینڈ، ہاؤس اپائنٹمنٹ ——— اور امتحانات
میں رعایت اور بہت کچھ ——— سے نوازا جاتا تھا۔ علوی صاحب غالباً اس تمیز بندہ و آقا
کی پالیسی کو تو نہیں روک سکتے تھے لیکن انہوں نے یہ ضرور کیا کہ کم از کم اپنے ہاؤس (اوورگنز ہب)
ہاؤس میں کالج کے ایک کلاس فور سرونٹ (ریٹائرڈ سپاہی) کے ہونہار اور لائق سپوت
کو ہاؤس پریفکٹ بنایا اور یہ کامیاب تجربہ دو بار کیا۔ اس کے علاوہ دوسرے عہدوں اور

---

[1] کالج نمبر ۲۵ زمانہ ۱۹۵۶ء

سرگرمیوں میں بھی صرف لڑکوں کی اہلیت کو دیکھا۔ اور اسی بنیاد پر انہیں آگے بڑھایا علوی صاحب کا یہ خاموش جہاد معلوم سب کو ہے۔ شاید کہا کسی نے نہ ہو۔ اس لیے میں ریکارڈ پر لا رہا ہوں میں نے راشد صاحب کو بھی لکھا ہے کہ وہ تاریخ کے ساتھ انصاف کریں افراد کے ساتھ رعایت (مثبت یا منفی) تاریخ کے ساتھ ظلم ہوتا ہے۔

میں کلاس کے حوالے سے علوی صاحب کے بارے میں یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کلاس میں سوالات کرنے کا نہ صرف موقع دیتے تھے بلکہ سوالات کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ بعض اوقات بعض سوال بے ربط یا غیر ضروری بھی ہوتے تھے اور ان کے لیکچر کا بہاؤ ٹوٹ جاتا تھا لیکن وہ بُرا نہیں مناتے تھے۔ خود میں کبھی کبھی بے تکے سوالات کر بیٹھتا تھا، وہ اس کا برجستہ اور اکثر پرمزاح جواب دے کر سلسلہ کلام جاری رکھتے۔

ڈرامہ کے ماہر ترین پروڈیوسر تو وہ تھے ہی لیکن شاید یہ بات زیادہ لوگوں کو معلوم نہ ہو کہ بعض اوقات وہ لڑکوں کو محض ان کے شوق کی بنا پر ڈرامہ میں کاسٹ کر لیتے تھے۔ پھر خواہ انہیں ان پر کتنی ہی محنت کرنا پڑے وہ انہیں ڈرامہ سے نکالتے نہیں تھے نہ صرف یہ بلکہ جان مار کر ان سے بھی اچھی خاصی ایکٹنگ کروا لیتے تھے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل ذوالفقار ارشد تمغۂ بسالت[1]

۱۹۶۰ء میں کالج میں پہلا قدم رکھا تھا۔ پانچ برس تک یہاں کی دھوپ اور سائے دیکھے۔ پلا بڑھا، جوان ہوا، یہیں کی خیال انگیز فضاؤں کے شعور میں آنکھ کھلی اور نہ صرف نصابی کتابیں پڑھیں بلکہ درس زندگی بھی لیا۔ حیدری صاحب تھے۔ علوی صاحب تھے۔ یہ دو تو اللہ کو پیارے ہوئے۔ راشد صاحب ریٹائر ہوئے۔ اور وہاں جاؤں تو ان مانوس چہروں، میزبان آوازوں کو کہاں ڈھونڈوں۔

بے خواب راستوں میں کوئی پوچھتا پھرا خوابوں کے شہر کے وہ مسافر کدھر گئے

علوی صاحب تخلیقی استاد تھے۔ تعلیم کا رشتہ زندگی سے جوڑ کر پڑھاتے تھے۔ اردو کی کتاب میں پریم چند کا افسانہ دو بیل تھا۔ اس کو پڑھانے سے پہلے، پہلے تو انہوں نے فکشن پر

[1] کالج نمبر ۲۵۶۳ زمانۂ تعلیم ۶۵-۱۹۶۰ء

روشنی ڈالی۔ فکشن ہوتا کیا ہے۔ اس ضمن میں اردو کی کلاسیکی داستانوں طلسم ہوشربا سے لے کر فسانہ آزاد تک کا تاریخی اور فنی جائزہ لیا۔ پھر داستان، کہانی، افسانہ ناول کا فرق اور خصوصیات بتائیں۔ اُردو افسانہ کے تاریخی ارتقاء پر گفتگو کی۔ پریم چند کے افسانوں اور ناولوں کے تاریخی پس منظر پر سیر حاصل بحث کی۔

دو بیلوں بظاہر جھوری اور کاچھی کے دو بیلوں ـــ ھیرا اور موتی کی کہانی ہے۔

لیکن علوی صاحب نے اسے ایک علامتی افسانہ کے طور پر پڑھایا۔ بات یہاں سے شروع کی جانوروں کے بارے میں رڈیارڈ کپلنگ کی جنگل بکس (Jungle Books) بہت مشہور ہیں اور بھی بہت سی کتابیں جانوروں کے بارے میں ہیں لیکن جس طرح Animal Farm بظاہر جانوروں کے بارے میں ہوتے ہوئے ایک علامتی ناول ہے اسی طرح دو بیل بھی دراصل ایک علامتی کہانی ہے۔ دراصل یہ جانوروں کے بارے میں نہیں جس طرح صادق حسین کا ناول سلامبو ہے (جو ہرنی کے ایک بچہ کی کہانی ہے اور حقیقت نگاری کا حیرت انگیز مرقع ہے)۔

انہوں نے کہا ہیرا ہندوؤں کی اور موتی مسلمانوں کی ترجمانی کرتا ہے ہیرا کو دلیر مگر صبر و تحمل، ہمدردی اور دور اندیشی کا پیکر بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ موتی بھی دلیر ہے، درد مند ہے لیکن تند و تیز ہے جارحانہ مزاج رکھتا ہے۔ دونوں مل کر جبر و تشدد کا مقابلہ کرتے ہیں لیکن دونوں کے مزاج اور سوچ مختلف ہے۔ علوی صاحب نے دوران گفتگو کہا پریم چند اُردو اور ہندی کے پہلے ادیب افسانہ نگار ہیں جنہوں نے آزادی اور غریب کسانوں کی زندگی کو موضوع بنایا۔ لیکن وہ Idialist بھی تھے ان کے افسانوں میں Poetic justice ہے رومانوی آرزومندی ہے۔ البتہ ان کے آخری افسانوں میں Realism بہت ہے۔

انہوں نے پریم چند کے افسانہ کفن کا ذکر کیا جو ان کے خیال میں دنیا کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔

علوی صاحب نے ہندو مسلم قومی کردار کا بہت تفصیل سے جائزہ لیا۔ مشہور ہندو

مصلح راجہ رام موہن رائے اور بنگال کے ودیا ساگر کا ذکر کیا کہ کس طرح انھوں نے انگریزوں سے تعاون کو بنیاد بنا کر انگریزی کے ذریعے جدید علوم کی تحصیل کو اور اپنے اصلاحی مشن کو آگے بڑھایا جبکہ مسلمانوں نے تاریخی اور نفسیاتی وجوہ کی بنا کر انگریزوں کے ساتھ انگریزی اور جدید علوم کی تحصیل کو بھی رد کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اگرچہ کچھ ہندو بھی شریک تھے لیکن اصل جدوجہد مسلمانوں نے کی اور کمپنی کی حکومت کی ازلی دشمنی مول لی۔ ۱۹۲۱ء کی تحریک ترک موالات مسلمانوں کی جذباتی سیاست گری کا نتیجہ تھی جس سے قائداعظم نے اختلاف کیا۔ انہوں نے یہ نکتہ پیدا کیا قائداعظم مسلمانوں کے روایتی انداز کے لیڈر نہ تھے۔ نہ وہ عطاءاللہ شاہ بخاری، ظفر علی خاں، نواب بہادر یار جنگ کی طرح خطابت کے بادشاہ تھے اور نہ انہیں ہماشانی کی جذباتی سیاست سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے کہا حیرت کی بات ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی قیادت سرسید کے قومی نقطہ نظر اور طریق کار کے پیرو قائداعظم کے ہاتھ میں آئی تو کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے برصغیر میں انگریزوں کے عزائم اور لارڈ کلائیو اور ہیسٹنگز ایسے گھناؤنے چہروں کو بے نقاب دیکھنے کے لیے باری علیگ کی کتاب کمپنی کی حکومت پڑھنے کی تاکید کی تھی۔

علوی صاحب اعلیٰ درجہ کا تخلیقی ذہن رکھتے تھے۔ مجھے آج تک حیرت اور کچھ افسوس بھی ہے کہ تربیت کے اداریوں اور انشائیوں کے علاوہ انھوں نے کسی موضوع پر کوئی مستقل کتاب کیوں نہیں لکھی۔ اس سلسلہ میں میرے استفسار کے جواب میں انہوں نے ایک خط میں لکھا تھا کہ وہ سرسید پر ایک کتاب لکھنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ معلوم نہیں کیوں وہ اس ارادہ کو عملی شکل نہ دے سکے۔ اگر ان کے کلاس روم کے لیکچر ہی کو آڈیو ٹیپ کر لیا جاتا تو ایک کتاب تیار ہو جاتی۔ ان کے خطوط بھی علم و ادب کے شہ پارے ہوتے تھے۔ شرمندہ ہوں کہ میں بھی ان کو محفوظ نہ رکھ سکا۔

ملٹری کالج میں اتنے طویل عرصے معلم اور ہاؤس ماسٹر رہنے کے علاوہ تقریباً بیس برس وہ عالمگیر بنز ایسوسی ایشن کے سکریٹری بھی رہے۔ ان کی خدمات کے حوالے سے میں نے ان سے ایک روز پوچھا تھا۔ سر ملٹری کالج کی تاریخ میں آپ کا کیا مقام ہو گا۔ جو بھی کہا

بجائے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ ہیں نے یہاں کیا کیا۔

کالج سے ان کا تعلق اتنا گہرا تھا کہ کام کرتے کرتے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور ملٹری کالج کی مٹی ہی میں آسودہ ہیں۔ ہم عالمگیر یبنز کے دلوں میں ہی نہیں ملٹری کالج کی تاریخ میں بھی ان کا مقام محفوظ ہے۔ ان کے انتقال کے فوراً بعد علوی نامہ کی اشاعت ان کو خراج عقیدت ہی نہیں ان کی خدمات کا مختلف زاویوں سے بڑا بھرپور جائزہ ہے۔ بہتوں کو علوی نامہ پڑھ کر ان کی عظمت کا اندازہ ہوا ہو گا۔

لمحے لمحے کا دکھ سہنے گزریں موسم   جانے والوں کی سوغات تو دیکھو

—— لیفٹیننٹ کرنل نثار احمد[1]

صدر ایوب کے قائم کیے ہوئے ۱۹۵۹ء کے شریف ایجوکیشن کمیشن کی تجویز پر مغربی پاکستان میں اردو سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری سکول کی سطح پر رائج کی گئی۔ اس سے پہلے ان کلاسوں میں اردو کی حیثیت ایک اختیاری مضمون کی سی تھی۔ فرسٹ ائیر میں علوی صاحب نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ تقریباً ایک سو سال پہلے دہلی کالج اور رڑکی انجینئرنگ کالج اور آگرہ میڈیکل کالج میں ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کیا جا چکا ہے ابھی حال ہی میں حیدر آباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو تقریباً تیس سال تک تمام مضامین کی تدریس کا ذریعہ رہی ہے اور وہاں انگریزی ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی تھی۔ اٹھارھویں صدی میں انگریزوں نے لاطینی کی غلامی کا جوا اتار پھینکا ورنہ اس سے پہلے انگلستان کے پبلک سکولوں میں سرکاری زبان لاطینی کے بجائے انگریزی بولنے پر سزا ملتی تھی۔ اس بات پر لڑکوں نے حیرت کا اظہار کیا تو انہوں نے فرمایا آپ انگلش پبلک سکولوں کی کوئی تاریخ یا Treveylyan کی A Social History of England اٹھا کر دیکھ لیں اس مرحلہ پر میں نے پوچھا، سر، آپ ہی نے بتایا کہ قائداعظم نے صاف صاف کہا تھا پاکستان کی قومی زبان اردو ہو گی۔ ہمیں تو ہر جگہ انگریزی کا راج نظر آتا ہے کیا اردو کبھی انگریزی کی جگہ لے سکے گی؟ کبھی نہیں تو نہیں کہوں گا۔ لیکن بہت مشکل نظر

---

[1] کالج نمبر ۲۵۶۴ زمانہ تعلیم ۶۴-۱۹۵۹ء

آتا ہے۔ "کیوں"

اس لیے کہ مسئلہ محض زبان کا نہیں، طبقاتی مفادات کا ہے۔ انگریزی پاکستان میں مراعات یافتہ طبقہ کا وہ خفیہ اور پوشیدہ ہتھیار ہے جس کے ذریعہ سے وہ سول سروسز بلکہ تمام وسائل پر قابض ہیں۔ بہرحال یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمایا۔ پاکستان کو پاکستان بنانے بہت صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑے گا

یہ باتیں ۱۹۶۰-۶۱ء کی ہیں۔ میں یہ سطریں ۱۹۸۸ء کے اواخر میں لکھ رہا ہوں۔ وہ معلّم ہی نہیں اور بہت کچھ بھی تھے۔

ــــــ ھارون رشید[1]

۲۹ مئی ۱۹۶۵ء کی شام کو جب میں مادر درسگاہ کو ملے جلے جذبات کے ساتھ خداحافظ کہہ رہا تھا تو میں نے علوی صاحب کے سامنے آٹوگراف بک پیش کر دی جو اس وقت شیر شاہ ہاؤس کے کورٹ یارڈ میں واقع بیڈمنٹن کورٹ میں بیڈمنٹن کھیلنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ انھوں نے اقبال کا یہ مصرعہ

ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

لکھا اور نیچے اپنے دستخط کر دیئے۔ واپسی کے تمام راستے میں اپنے "مرشد" کے ان چند لفظوں پر غور کرتا رہا جن میں جہاں میرے لیے بے انتہا حوصلہ افزائی تھی تو لامحدود چیلنج بھی تھا ۱۹۶۵ء سے جنوری ۱۹۸۷ء تک مرشدی علوی صاحب سے بائیس برس نیازمندانہ تعلق رہا اور یہ تعلق بھی کئی منزلوں سے گزرا، کئی سطحوں پر ابھرا۔ اس موقع پر میں صرف آخری ملاقات کا مجملاً ذکر کروں گا جو ان سے سی ایم ایچ جہلم میں ہوئی۔ پہلی بات تو یہ کہ انھوں نے اپنی علالت کو موضوع بنائے بغیر حالات حاضرہ سے گفتگو شروع کی۔ اس میں غالباً میری دلداری بھی منظور تھی کہ انہیں میری دلچسپیوں کا علم تھا۔ (اللہ اکبر اس حالت میں بھی اپنے "بیٹوں" کی ذہنی خاطر تواضع کا خیال رکھا، کچھ دیر وطن عزیز میں سیاسی قیادت کے بحران پہ بحث جاری رہی۔ ایک مرحلہ پہ فرمایا "مولانا مودودی جیسی صاحب بصیرت شخصیت اور ان کی بے حد منظم اور مؤثر تنظیم سے صاحب الرائے طبقہ کو بڑی توقعات تھیں۔ (انقلابی

---

[1] کالج نمبر ۲۵۸۱ زمانۂ تعلیم ۶۵-۱۹۶۰ء

تبدیلیاں اس طرح خاموش مفکروں کی تحریروں سے رونما ہوتی ہیں۔ لیکن موصوف نے قرآن حکیم کی Interpretation میں غلطی کی۔" علوی صاحب اس تکلیف کے عالم میں بھی (جبکہ ان کے ہونٹ خشک تھے اور رہ رہ کے ہچکیاں آ رہی تھیں)، ذاتی ملکیت کے متعلق قرآنی تصور اور مولانا موصوف کے نقطۂ نظر کے اختلاف کی وضاحت کرتے رہے۔ علوی صاحب اس سلسلہ میں حضرت ابوذر غفاری کے مؤقف کے حامی تھے۔ اسی گفتگو کے دوران جب میں نے ایک متنازعہ نکتہ پر اپنی رائے دی تو پریشانی کے عالم میں مڑ کر بولے "کہیں تمہارے نظریات میں تبدیلی تو واقع نہیں ہو گئی۔ کیا تم اقتصادی اور معاشی نظام کو معاشرہ کی بنیاد تصور نہیں کرتے"۔ گذشتہ سال مجھے اپنے مرشد کی میزبانی سے سرفراز ہونے کا موقع بھی ملا۔ میں ان کی زیارت کو حاضر ہوا تھا تاکہ نیو پارک کی گرد کو جھاڑ سکوں اور اپنی کتاب "بلند شہر کا نامحرم" پر ان کا پیش لفظ حاصل کر سکوں۔ رات کو انہوں نے مجھے وہ کمرہ دکھایا جہاں مجھے سونا تھا۔ پھر تمام لوازمات سے متعلق پوچھ پوچھ کر مجھے شرمندہ کرتے رہے۔ پانی جگ اور گلاس بھی رکھوا دیا تھا۔ گلاس پر کور نہیں تھا۔ وہ اندر سے جا کر لائے۔ صبح سویرے یہ پوچھنے آئے کہ غسل کے لیے پانی گرم کیا جائے؟ اور خود غسل خانہ میں جا کر ضرورت کی چیزوں کا جائزہ لیا۔ شیونگ بلیڈ نیا ڈالا۔ چلتے چلتے پوچھا ناشتہ میں کوئی خاص ترجیح ہو تو بتاؤ۔ اللہ اکبر۔

ناشتہ کے بعد میں نے قصداً ان کے بیٹے انیس سے دو باتیں کرنے کا وقت نکالا میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ میرے عظیم استاد کے شب و روز کے معمولات کیا ہیں۔ مطالعہ کے اوقات اب بھی دوپہر رات سے سہ پہر رات تک کے ہیں یا کچھ فرق آیا ہے۔ اس گپ شپ کے دوران میرے منہ سے نکلا کہ علوی صاحب جیسے شخص کے لیے اکیس توپوں کی سلامی تو ان سے اظہار عقیدت و احترام کی پہلی منزل ہے۔ مرشد سے ملاقات کے بعد گھر لوٹا تو میری بیوی نے میرا یکسر بدلا ہوا رویہ دیکھ کر کہا "ایک عمر بیت گئی سمجھاتے سمجھاتے اور ناکام رہی علوی صاحب نے تمہیں دو دن میں بدل دیا"۔ نیک بخت وہ میرے مرشد ہیں

علوی صاحب Post-crisis شخصیت تھے۔ ظاہر و باطن سے آگاہ ان کیلئے ریٹائرمنٹ سے قبل اور ریٹائرمنٹ کے بعد کی کیفیات کا فرق بے معنی تھا۔ ان کیلئے حیات قبل از موت کا فرق بھی مٹ چکا تھا۔

——— لیفٹیننٹ کرنل اسد کمال خان[1]

میرے بڑے بھائی میجر کاظم کمال کالج نمبر ۲۴ ۵ نے مارچ ۷۱ء کے اواخر میں تانگیل (مشرقی پاکستان) کے مقام پر شہادت پائی جس کی تفصیل پروفیسر سعید راشد نے اپنی کتاب تذکرہ شہداء میں لکھی ہے۔

علوی صاحب نے بھائی کی شہادت پر جو تعزیتی خط میری والدہ کو لکھا تھا اس کی فوٹو دے رہا ہوں تاکہ میں بھی اپنے عظیم اساتذہ کو خراج عقیدت پیش کر سکوں۔

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن

ملٹری کالج جہلم

۷۱-۵-۲۳ محترمہ! السلام علیکم

آپ کے عظیم بیٹے میجر کاظم کمال کی شہادت نے ہمارا ہی نہیں ساری قوم کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔

اپنے جگر کے ٹکڑے کی دائمی جدائی آپ کے لیے بے شک بہت بڑا سانحہ اور صدمہ بھی ہے جسے ماں کا دل ہی سمجھ اور جان سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالےٰ کا وہ فرمان بھی ہمارے سامنے ہے کہ "جو اللہ کی راہ میں قربان ہوئے انہیں مردہ مت کہو وہ تو زندہ ہیں لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں"۔ کاظم کمال یقیناً زندہ ہیں۔ ہم سب کے دلوں میں۔ قوم کے حوصلے میں۔ تاریخ انہیں زندہ رکھے گی۔ انہوں نے پاکستان اور اسلام کی خاطر نہایت دلیری سے لڑتے ہوئے جان قربان کی اور شہادت کا وہ سب سے اونچا مقام حاصل کر لیا جس پر ہزاروں مجاہد رشک کریں گے۔

ملٹری کالج کو اپنے اس بہت بڑے فرزند پر ناز ہے۔ اس کی شاندار مثال ہمارے طلبہ کو ہمیشہ نیا ولولہ اور جوش دلاتی رہے گی۔ قوم کو آپ جیسی عظیم ماں پر بھی فخر ہے جس نے ایسے سپوت کو جنم دیا۔

---

[1] کالج نمبر ۲۶۲۲ زمانہ تعلیم ۶۳-۱۹۶۰ء

ہم اللہ پاک کے حضور میں دعا کرتے ہیں کہ وہ کاظم شہید کو اپنی بے حساب رحمتوں سے مالامال کرے اور اس کی شہادت کے طفیل ہمارے وطن کی لاج رکھ لے۔ مخلص

علوی

—— میجر شیخ حسین[۱]

یہ واقعہ ۱۹۶۶ء کا ہے شام کی پریپ حسب دستور کلاسوں میں ہو رہی تھی۔ علوی صاحب ڈیوٹی آفیسر تھے۔ ہماری ایف اے کی سینئر کلاس غالباً اس روز پڑھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ چنانچہ باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ باتوں کی بھنبھناہٹ سن کر علوی صاحب اندر آئے اور بلیک بورڈ پر Self study لکھ کر چلے گئے کچھ دیر تو خاموشی رہی پھر وہی سرگوشیاں شروع ہو گئیں علوی صاحب پھر اندر آئے اور سیلف سٹڈی کے نیچے No talking کا اضافہ کیا کہا اب بھی کچھ نہیں کچھ دیر کے بعد پھر وہی سلسلہ چل پڑا۔ اب کے وہ اندر آئے تو ٹھیک اس وقت پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے کہا آپ لوگ ذرا ٹھہر جائیں انہوں نے اس روز سیلف ڈسپلن پر بڑا موثر لیکچر دیا اور کہا ایک عالمگیرین کے لیے اشارہ کافی ہونا چاہیے۔ Self-respect and self-discipline go together آخر میں فرمایا زندگی کے سفر میں Self-restraint کامیابی کی پہلی شرط ہے۔

—— راجہ عبد الغفور[۲]

ایک روز کسی موقع پر میں نے اپنا پورا نام راجہ عبد الغفور لکھا۔ علوی صاحب نے دیکھا تو مسکرائے اور کہا مجھے معلوم نہ تھا کہ تم راجہ بھی ہو۔ پدرم سلطان بود پہچان کے لیے ہو تو میں نہیں مانتا۔ لیکن اگر اسے چیلنج سمجھا جائے تو بہتر ہے۔ سب سے اچھا تو یہ ہے کہ انسان اپنی پہچان آپ ہو۔ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے انہوں نے یہ نہیں کہا کہ اپنے آپ کو راجہ لکھو یا نہ لکھو۔ لیکن بات میرے دل میں اتر گئی اور دل میں ارادہ کیا جب کچھ بن جاؤں گا تو راجہ لکھوں گا۔

---

[۱] کالج نمبر ۲۶۳۹ ۔ زمانہ تعلیم ۶۶-۱۹۶۰ء [۲] ایکسین کالج نمبر ۲۷۱۱ زمانہ تعلیم ۶۸-۱۹۶۳ء

——— نوید اکبر حسین[۱]

یہ واقعہ ۱۹۶۸ء کا ہے۔ میں ایف اے میں اردو میں کمزور ہونے کے باوجود کبھی کبھی کسی نہ کسی بہانے کلاس گول کر جایا کرتا تھا۔ جس کا یقیناً وہ نوٹس لیتے ہوں گے ایک روز اس طرح کلاس سے غائب تھا کہ کوئی مہمان مجھ سے ملنے آیا اور شامت اعمال چوکیدار مجھے ڈھونڈتا ہوا ان کی کلاس میں آ پہنچا اور علوی صاحب سے کہا "سر نوید اکبر سے ملنے کوئی مہمان آیا ہے"۔ علوی صاحب نے برجستہ جواب دیا "وہ تو ہمارے مہمان ہوا کرتے ہیں"۔

دوستوں کی زبانی علوی صاحب کا یہ فقرہ مجھ تک بھی پہنچا اور یہ بھی کہ علوی صاحب نے یہ فقرہ طنزاً نہیں بڑے دکھ کے ساتھ کہا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھ پر اس بات کا امپیکٹ ہوا۔ اس کے بعد ان کا پیریڈ مس کرنے کی ہمت میں کہاں سے لاتا۔ کاش ہماری اولاد کو بھی ایسے استاد مل سکتے۔

——— میجر محمد خالد سعید[۲]

علوی صاحب کو جس کسی نے ملٹری کالج کا سقراط کہا تو بالکل ٹھیک کہا۔ وہ ہمارے اندر نہ اپنی ذات ٹھونستے تھے نہ اپنا علم ٹھونستے تھے بلکہ علم و دانش کو ہمارے اندر سے نکالتے تھے۔

دوسری چیز ان کا انکسار تھا۔ کالج سے جانے کے بعد جب تھوڑا بہت پڑھا اور اپنے زعم میں دانشور ہو گیا تو علوی صاحب سے کئی بار دانشورانہ انداز میں بحث کی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے اور مجھے بڑھاوا دیتے رہے ان کی حوصلہ افزائی نے مجھے اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا کہ میں بھی کچھ ہوں لیکن جب علوی نامہ پڑھا تو پتہ چلا کہ وہ تو بحر العلوم تھے اور تعلیمی و تہذیبی اور نسلی پس منظر کے لحاظ سے یکتا و یگانہ۔ اس وقت میں بہت شرمندہ ہوا کہ یہ قطرہ کس سمندر سے ٹکراتا رہا تھا یہ ان کا عالمانہ ظرف تھا ہم بندوں کی باتوں کو بھی غور سے سنتے۔

ان کو صرف اُردو کا معلّم کہنا غلط ہوگا۔ چونکہ وہ اُردو کے سبق سے شروع ہو کر

---

[۱] کالج نمبر ۲۷۵۱۔ زمانہ تعلیم ۶۹-۱۹۶۳ء [۲] کالج نمبر ۲۷۷۲، زمانہ تعلیم ۶۸-۱۹۶۳ء

فلسفۂ نفسیات، تصوف، معاشیات، سیاسیات، عمرانیات، بشریات غرض علم کی کسی شاخ کو چھوڑتے نہیں ایسا نابغہ روزگار ہمارا استاد تھا۔ یہ مکتب کی کرامت تھی ان کا فیضان نظر تھا کہ آج ہمارے دلوں میں جو تھوڑی بہت روشنی ہو رہی ہے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد اقبال اکبر[۱]

۱۹۶۴ء کے یوم والدین کے موقع پر علوی صاحب نے جو ڈرامہ پیش کیا تھا اس کے اصل مسودہ میں کردار کم تھے لیکن ڈرامہ میں حصہ لینے کے امیدوار زیادہ، علوی صاحب نے چھوٹے چھوٹے چند کردار خود تخلیق کیے اور کسی شوقین کو مایوس نہیں کیا اور لطف یہ کہ یہ ثانوی کردار اصل کرداروں سے زیادہ ہٹ ہوئے یہ ان کی ڈائریکشن کا کمال تھا۔

——— لیفٹیننٹ کرنل سید افتخار حسین شاہ[۲]

ایک روز علوی صاحب کلاس میں اقبال کو پڑھاتے ہوئے کہنے لگے عام محاورہ میں اقبال کا کلام اتنا بلند ہے کہ انسان سر اٹھا کر دیکھنا شروع کرے تو اس کی ٹوپی گر جائے یہ سن کر ۲۶۴۸ جاوید اختر جو غضب کا آرٹسٹ اور Imaginative تھا نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ سر میں بھی کچھ عرض کر سکتا ہوں۔ علوی صاحب پہلے تو حیران ہوئے پھر کہا ہاں کہو۔ جاوید بولا۔ ایک اور شاعر بھی ہے جس کے کلام میں اتنی گہرائی ہے اتنی گہرائی ہے کہ کوئی سر جھکا کر دیکھے تو اس کی ٹوپی گر جائے جس کو وہ اٹھا بھی نہ سکے۔

——— وہ کون؟

سر، استاد امام دین آف گجرات ان کا دیوان بانگ درل شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو۔ ساری کلاس ہنس پڑی۔ علوی صاحب بھی مسکرا دیئے۔ ہاں بھئی استاد کی کیا بات ہے کیا خوب فرما گئے ہیں۔

تم نے خوب پہچانا۔ ولی را ولی می شناسد

اس وقت تو کوئی اس جملہ کا مطلب نہیں سمجھا۔ جب سمجھے تو بہت لطف آیا۔ علوی صاحب کی حس مزاح بہت تیز تھی اور بڑا ظرف تھا۔

---

[۱] کالج نمبر ۲۷۷۵ [۲] کالج نمبر ۲۸۰۲ زمانہ تعلیم ۶۷-۱۹۶۳ء

——— لیفٹیننٹ کرنل خالد اسماعیل قاضی [1]

یہ واقعہ ۱۹۶۴ء کے اواخر کا ہے کہ میں بیمار ہو کر سی ایم ایچ جہلم کے آفیسرز وارڈ کے کمرہ نمبر ۴ میں داخل ہوا تو وہاں قبلہ علوی صاحب سے نیاز حاصل ہوا۔ وہ اسی کمرہ میں ٹائیفائیڈ کے لیے زیر علاج تھے۔ ان کے سرہانے اردو ڈائجسٹ کا ستمبر کا شمارہ پڑا ہوا تھا اس میں سے انہوں نے مجھ سے صیہونیت کے بارے میں مولانا ظفر احمد انصاری کا مضمون پڑھ کر سنانے کو کہا۔ پھر انہوں نے صیہونیت (Zionism) اور اس کے مضمرات پر تحقیقی انداز سے گفتگو کی ــــ یورپ اور امریکہ میں اسرائیلی لابی بلکہ تمام مغربی دنیا میں اسرائیلی پریشر گروپ کی کارستانیوں اور سازشوں کا تفصیل سے ذکر کیا۔ انہوں نے ۱۹۱۸ء کے اعلان بالفور کے وقت سے جس صیہونی توسیع پسندی کی طرف اشارہ کیا تھا وہ ۱۹۶۷ء کی اسرائیلی جارحیت اور بعد کے واقعات سے صحیح ثابت ہوئی انہوں نے مغربی دنیا میں یہودی لابی کی جس تخریبی قوت کا ذکر کیا تھا اس کے مظاہر بھی سامنے آئے وہ صرف اردو کے استاد نہیں بلکہ بین الاقوامی امور کے ماہر اور بیدار مغز دانشور بھی تھے۔

۱۹۶۷-۶۹ء میں جب انہوں نے اردو پڑھانا شروع کی تو پہلی بار ادبی مطالعہ کی جہتوں کا احساس ہوا۔ ادب کی ترقی پسند تحریک پر ان کی ناقدانہ نظر تھی۔ اور وہ نصاب کا مطالعہ بڑے وسیع حوالوں سے کرتے تھے۔ ان کی تلاش میں ادب، تاریخ، فلسفہ و نفسیات، عمرانیات کے علاوہ جمہوریت، سوشلزم، سرمایہ دارانہ معیشت، جاگیرداری نظام کا تذکرہ عام آتا رہتا تھا۔ ملکیت زمین وغیرہ کے بارے میں انہیں مولانا مودودی کے نظریات سے اختلاف تھا۔ غلام احمد پرویز صاحب کی بھی بعض امور میں تائید اور بعض پر تنقید کرتے تھے۔ وہ سیاست اور مذہب میں ایسے ایسے امور پر ایسے ایسے اکابر پر تنقیدی بحث کر سکتے تھے جن پر عام لوگ تو لب کشائی کی جرأت بھی نہیں کر سکتے۔ ذہنی جرأت کی وہ بہت بڑی علامت تھے۔

---

[1] کالج نمبر ۲۸۴۲ زمانہ تعلیم ۶۹-۱۹۶۴ء

—— میجر ساجد مجید بھٹی[۱]

غالباً ۱۹۶۸ء میں جونئیر ڈرامہ ہو رہا تھا۔ اس میں ایک کردار ایک لڑکی کنیز کا تھا۔ جس لڑکے کے حصے میں یہ کردار آیا تھا وہ اس کو اچھی طرح کر نہیں پا رہا تھا۔ علوی صاحب نے جھٹ چادر لی۔ اسے ساڑھی کی طرح باندھا اور اسے بتایا کہ یوں اٹھو، یوں بیٹھو، عورتیں ٹانگیں کھول کر نہیں بیٹھتی ہیں۔ چلو سر جھکا کر کہ اس موقع پر یوں لے جانا ہے، غصہ اس طرح کرنا ہے وغیرہ۔ علوی صاحب کتنے سنجیدہ تھے لیکن جب سکھانے کا موقع آیا تو سنجیدگی اور بڑے پن کو بالائے طاق رکھا بے جھجک لڑکی کا کردار کر کے دکھایا۔ میں نے دیکھا کہ وہ لڑکا اس کے بعد بے جھجک ایکٹنگ کرنے لگا۔

—— محمد ضرار[۲]

۱۹۷۳ء کے اوائل میں بڑی امنگوں کے ساتھ آئی ایس ایس بی کے سامنے گیا اور جب بات نہیں بنی تو سخت دل برداشتہ ہوا۔ اسی شدید مایوسی کے عالم میں ایک خط کالج کے کمانڈنٹ کرنل این ڈی احمد کو لکھ ڈالا۔ انہوں نے وہ خط قبلہ علوی صاحب کے حوالے کیا۔ انہوں نے جس دل سوزی سے اور جس طرح مجھے خط لکھا اس سے مجھے بڑا حوصلہ ہوا۔ اور میں زندگی کی دوڑ میں دوبارہ شامل ہو گیا۔ الحمدللہ اور بالآخر بینکنگ میں اپنا کیریئر بنانے میں کامیاب ہوا لیکن ظلمت شب میں علوی صاحب کا خط قطب ستارہ کی طرح مسلسل میری رہنمائی کرتا رہا۔ آج بھی ہر مرحلہ پر یہ مجھے حوصلہ دلاتا رہتا ہے۔

علوی صاحب کی یاد میں یہ ذاتی خط میں نذر قارئین کرتا ہوں۔

۲ مئی ۷۳ء

عزیزم ضرار چوہان سلمہٗ۔ دعائیں

کرنل صاحب نے تمہارا خط مجھے دیا ہے کہ بہ حیثیت سکریٹری اولڈ بوائز ایسوسی ایشن تمہیں اس کا جواب لکھوں۔ تم نے جو کچھ اپنے اس خط میں لکھا ہے اس سے تمہارے احساسات کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے اور محسوس ہوا ہے کہ تمہارا دل اس دوسری بار ناکامی سے

---

[۱] کالج نمبر ۲۹۰۱ء

[۲] کالج نمبر ۳۱۱۲ زمانہ تعلیم ۷۲-۱۹۶۷ء

بے حد متاثر ہوا ہے یہ رنج اور محرومی کا احساس یقیناً فطری ہے۔ جو چوٹ — دل کو لگی ہے وہ یقیناً تمہاری ذات کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہر سال تم ہی نہیں تم سے بھی زیادہ تعلیم یافتہ نوجوان فوج میں منتخب نہیں ہو پاتے یا اس وقت روزگار سے محروم حیران پریشان پھر رہے ہیں۔ وقتی طور پر ملک ایک بے روزگاری کی لہر کی لپیٹ میں آیا ہوا ہے لیکن مجھے پوری امید ہے کہ جلدی ایک لہر گزر جائے گی۔ اور روزگار کی گنجائشوں میں یکایک بہت سا اضافہ ہوگا۔ غالباً تمہاری یہ تمنا بھی پوری ہو سکے۔ فوجی زندگی سے کسی طرح کی وابستگی میسر آئے اور تم ایک مجاہد کی طرح ملک کے دفاع میں حصہ دار بن سکو۔ باقاعدہ فوج میں کمیشن لے کر — تو لازمی فوجی سروس کی صورت میں جس کا منصوبہ کچھ عرصے بعد ضرور زیر عمل ہوگا۔

ایک اور بات نہیں بھولنی چاہیے کہ زندگی میں ایک دروازہ بند ہو جائے تو کئی اور دروازے کھل بھی سکتے ہیں۔ اگر کمیشن کے لیے منتخب ہونے میں ناکام ہوئے تو کوئی بات نہیں دل شکستہ ہونے کی ضرورت نہیں سول میں کسی نہ کسی کام کے لیے قسمت آزمائی کرتے رہو۔ خواہ کسی پرائیویٹ فرم میں ہو۔ کسی سرکاری دفتر میں ہو۔ سکول یا کالج میں ہو۔ گشت کا ہو انشورنس کا ہو مگر یہ خیال رکھنا کہ انٹرویو دیتے وقت مایوسی کی باتیں کرنے سے اور — ترائش سے پرہیز کرنا چاہیے۔

دنیا میں کم ہی ایسے خوش نصیب ہوں گے جن کو وہی حاصل ہو گیا ہو جس کی انہیں آرزو تھی انسان کو اکثر وہ کام کرنے پڑتے ہیں جو اس کی مرضی کے نہیں ہوتے۔

جہاں تک آئی ایس ایس بی میں ناکامی کا تعلق ہے تو وہ ایک خاصا پیچیدہ عمل ہے اور اس کے کئی مختلف نوعیت کے پہلو ہوتے ہیں۔ بہت سے بظاہر نہایت موزوں اور ذہین لڑکے اس لیے رہ جاتے ہیں کہ کوئی ایسی صفت یا اہلیت ان میں نہیں ہوتی جو بورڈ کے خیال میں ضروری ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ لوگ کسی امیدوار کی ناجائز طور پر حق تلفی نہیں کرتے۔ اخیر میں ایک بار پھر مشورہ دوں گا کہ اپنے عزیز ترین مقصد میں ناکام ہو جانا غیر معمولی بات نہیں۔ لہٰذا حوصلہ پست نہ ہونے دو۔ جو چیز نہیں مل سکی

اس کا غم کھانا چھوڑ دو۔ جو چیز مل سکتی ہے اس کے لیے کوشش کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں حوصلہ اور کامیابیاں عطا فرمائے۔

تمہارا خیر اندیش

سیکرٹری عین الدین علوی

—— اصغر نواز[1]

اباجی کی شہادت پر علوی صاحب دوسرے سٹاف کے ساتھ ہمارے گھر پر تعزیت کے لیے آئے تھے۔ پھر انہوں نے ایسوسی ایشن کی طرف سے والدہ کو اپنے قلم سے تعزیت کا ایک خط لکھا جو میں تبرک کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن

ملٹری کالج جہلم

۲۴-۵-۷۱

محترمہ السلام علیکم!

یہ ایک بہت بڑا سانحہ ہے کہ آپ کے عظیم العذر شوہر لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی (شہید) ہم سے بچھڑ گئے۔ ہم ہی نہیں ساری قوم اس محرومی پر سوگوار ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے اس شاندار کارنامے پر جسے انجام دیتے ہوئے انہوں نے وطن اور اسلام کی خاطر اپنی جان قربان کر دی قوم کا سر فخر اور ناز سے بلند ہو گیا ہے۔ انہوں نے اپنی دلیری اور جانبازی سے وطن کی آبرو رکھ لی۔ انہوں نے حق کی راہ میں شہید ہو کر جو بلند مرتبہ حاصل کیا ہے وہ سب مجاہدوں کے لیے قابل رشک ہے۔

وہ اس کالج کے قابل فخر فرزندوں میں سے تھے۔ ان کی ہمت، جرأت اور شوق جہاد کا اعتراف ۶۵ء میں بھی ستارۂ جرأت کا اعزاز دے کر کیا گیا تھا اور اس حالیہ جنگ میں تو قوم ہی نے نہیں خود اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت کی نعمت سے نواز کر ستارۂ جرأت عطا کر دیا۔

کالج کے اساتذہ اور طلبہ کی طرف سے اور اپنی جانب سے تعزیت کا یہ پیغام بھیج رہا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو، عزیزی اصغر نواز کو اور دوسرے تمام

[1] کالج نمبر ۳۱۴۵ زمانہ تعلیم ۶۲-۱۹۶۷ء

اعزہ کو صبر و سکون عطا فرمائے اور اس عظیم شہید کی مثال قوم کے تمام نوجوانوں اور مجاہدوں کے حوصلے بلند کرے اور ایسی ہی عظیم قربانیوں کے لیے ہمت اور ولولہ عطا کرے۔

عین الدین علوی (سکرٹیری)

——— میجر وجاہت حسین[1]

۱۹۷۰ء کا واقعہ ہے کہ میں ویک اینڈ جا رہا تھا۔ سرائے سے بس پکڑی جو کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ بمشکل کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ بس چلی۔ تو تھوڑی دیر بعد آواز آئی۔ وجاہت! منہ پھیر کے دیکھا تو قبلہ علوی صاحب تھے۔ وہ غالباً کالج کے گیٹ سے بس میں بیٹھے ہوں گے۔ مجھے اشارہ سے بلایا جگہ نکال کے پیچھے گیا تو مجھ سے کہا اس پر بیٹھ جاؤ۔ ان کا اشارہ اپنے سوٹ کیس کی طرف تھا۔ میں نے عرض کیا سر، سوٹ کیس ٹوٹ جائے گا فرمایا ٹوٹتا ہے تو ٹوٹ جائے تم تو تکلیف نہ اٹھاؤ۔ ان کے اصرار پر میں ان کے سوٹ کیس پر بیٹھ گیا لیکن احتیاط یہ رکھی کہ اس پر پورا وزن نہ پڑے لیکن آگے چل کر بس جھٹکے سے رُکی تو بے خیالی میں یکایک میرا پورا وزن سوٹ کیس پر پڑ گیا اور سوٹ کیس کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں گھبرا کر اٹھنے لگا تو انہوں نے ہاتھ پکڑ کر پھر بٹھا دیا۔ بیٹھے رہو جو ہونا تھا ہو گیا۔ پھر انہوں نے کالج کے ڈرامے کی باتیں شروع کر دیں تاکہ میں شرمندگی محسوس نہ کروں۔

جب علوی صاحب نے پہلی بار میرے نام وجاہت کو اپنے بھرپور تلفظ سے ادا کیا تو میرے اوپر اپنی ذات کی آگہی کے دریچے کھل گئے۔ ہر بار وہ وجاہت اس انداز سے کہتے کہ میرا جی چاہنے لگا کہ جیسا نام ہے ویسی شخصیت بھی ہو۔

علوی صاحب کا حافظہ اتنا اچھا تھا کہ ہر کیریکٹر کا پارٹ خود انہیں بھی زبانی یاد ہوتا تھا۔ چنانچہ بغیر مسودہ کے وہ ڈائریکشن دیتے تھے۔ اکثر ترانوں اور غزلوں کی دھنیں وہ ہارمونیم پر خود بناتے تھے۔ اور پھر ہمیں سکھاتے تھے بڈھے بلوچ کی نصیحت

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا

اور بال جبریل زمانہ   جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ

---

[1] کالج نمبر ۳۲۱۶

کے دھنیں انہوں نے میرے سامنے بنائیں اور گا کر مجھے سکھائیں۔ کہا کرتے کہ پیشہ ور موسیقاروں نے اقبال کی غزلوں کی جو دھنیں بنائی ہیں، وہ کلام اقبال کی نفسیاتی فضا سے ہم آہنگ نہیں۔ کلام اقبال کی دھنوں میں امنگ اور ترنگ جوش و ولولہ ہونا چاہیے۔

علوی صاحب قومی زبان اور قومی لباس کے زبردست حامی تھے۔ لیکن علاقائی زبانوں سے تعصب نہ تھا۔ جو پنجابی بولتے ان سے پنجابی ہی میں گفتگو کرتے۔ قومی استحکام کے لیے معاشی اور معاشرتی انصاف کی ضرورت پر ہمیشہ زور دیا کرتے۔ ان کا ایک نکتہ مجھے بہت پسند آیا جس زمانہ میں ہماری فلمی صنعت آل انڈیا فلموں کی ریلیز کے خلاف واویلہ کر رہی تھی دلیل یہ تھی کہ یہ ہماری حب الوطنی اور قومی مفاد کے منافی ہے تو انہوں نے کہا یہ استحصالی طبقہ کی خاص تکنیک ہے جب ان کے اپنے مفادات پر چوٹ پڑتی ہے تو انہیں قوم و وطن کی یاد آتی ہے۔ انہوں نے ایک بار اس نکتہ کی وضاحت بھی کی کہ پاکستان میں حب الوطنی کے جذبہ کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ استحصالی طبقے لوگوں سے تو حب الوطنی کی توقع کرتے ہیں اور خود وطن اور اہل وطن کا خون چوسنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

میری ان سے آخری ملاقات ۲۳ جنوری ۱۹۸۷ء کو ہوئی۔ وہ اندر کمرہ میں لیٹے ہوئے تھے ان کے ہونٹ بالکل خشک تھے۔ بار بار زبان ہونٹوں پر پھیر رہے تھے۔ کپکپاہٹ بھی تھی لیکن وہ باتیں انسانی قدروں کی کر رہے تھے۔ فرمایا کسی بزرگ کی تعظیم کے لیے کھڑے ہونا بظاہر ایک معمولی بات ہے۔ لیکن یہ بھی ایک اہم قدر ہے۔ اس سے کسی معاشرہ کی تہذیب کا رخ متعین ہوتا ہے۔ میں نے گلہ کیا کہ سر آپ نے ایسی ایسی قدریں سکھا دی ہیں کہ اب ان کو نبھانا مشکل ہو رہا ہے۔ وہ اس تکلیف میں بھی مسکرائے۔ پھر کہا :

بیٹے کبھی بددل نہ ہونا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز   چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

سورۃ العصر یاد کرو۔ والعصر ان الانسان لفی خسر۔ الا الذین آمنوا و عملوا الصلحت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔

انسان کی مسئولیت (Accountability) محدود ہے۔

اور یاد رکھو ہر ایک کی ذمہ داری کی حدیں مختلف ہوتی ہیں ـــــ ویسے سچائی کا راستہ اتنا آسان ہوتا تو خدا سے صبح وشام اھدنا الصراط المستقیم کی دعا کیوں مانگا کرتے۔

اب غور کرتا ہوں تو حیرت زدہ ہو جاتا ہوں کہ یہ باتیں (میری رہنمائی کے لیے) وہ اس وقت کر رہے تھے جب ان کا مرض الموت شروع ہو چکا تھا۔

ـــــ شاہد سہیل انجنیئر[1]

یوم اقبال کی تقریب کی تیاریاں ہو رہی تھیں حسب معمول مجھے علوی صاحب مرحوم نے یاد فرمایا۔ میں موسیٰ ہال گیا تو کہا ،شاہد اس غزل کی دھن تو نکالو۔ غزل تھی :

بڈھے بلوچ کی نصیحت !

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا　　　اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا

میں نے ایک فلمی دھن میں اسے گانے کی کوشش کی، علوی صاحب نے کہا نہیں، اقبال کے ان اشعار میں جو امنگ جو ترنگ، جو وسعت، اور کشادگی ہے وہ اس فلمی دھن میں نہیں۔ پھر خود ہارمونیم لے کر بیٹھے کچھ گنگنانے لگے۔ آخر کار ایک بہت موزوں دھن نکالی۔ میں نے اور شوخی میں کہا سر آپ تو خود اتنا اچھا گا لیتے ہیں تو میری کیا ضرورت ہے یہ سن کر وہ مسکرائے اور کہا۔ طالب علم تم ہو کہ میں، میرے بچے یہ سارا سلسلہ میوزک ہو یا تقریریں ،یہ سب کچھ طلبہ کو سکھانے کے لیے ان کی تربیت کے لیے ہوتا ہے۔ ہمارا کام تو ان کی رہنمائی کرنا ان کی تربیت کرنا ہے۔

علوی صاحب علم کا دریا نہیں سمندر تھے اقبال کو جس گہرائی میں جا کر انہوں نے پڑھایا اس کا کچھ اندازہ ان ہی کو ہو سکتا ہے جنہوں نے ان سے کلاس روم میں پڑھا ہے افسوس ہے کہ ان کے لیکچرز کو ہم ویڈیو ٹیپ نہیں کر سکے۔ ۷۵-۱۹۷۴ء کے تربیت کے لیے جب انہوں نے مجھے طالب علم ایڈیٹر مقرر کیا تو میرے اصرار پر انہوں نے اقبال کے ان دو اشعار کی تشریح ،تربیت میں شامل کرنے کی زحمت کی جن کی وضاحت انہوں نے کلاس میں بڑی تفصیل سے کی تھی اس تشریح کو میں تربیت سے تبرک کے طور پر نقل کرتا ہوں۔

---

[1] کالج نمبر ۳۳۲۸ زمانہ تعلیم ۷۵-۱۹۷۰ء

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا — خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں

علامہ اقبال کی چھوٹی سی نظم "طارق کی دعا" ہم اکثر پڑھتے ہیں اور سنتے بھی ہیں۔ یہ چھوٹی سی نظم اصل میں بہت بڑی نظم ہے۔ بہت عظیم ۔۔۔ اس میں قوم کے لیے جوش و خروش کا بہت بڑا سرمایہ موجود ہے۔ اس میں سوجھ بوجھ کے خزانے چھپے ہوئے ہیں، یہ ہمارے لیے انسپریشن کا ایک لازوال سرچشمہ ہے، یہ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ اللہ کے وہ پراسرار بندے کیا چیز ہیں جنہیں غازی کہا جاتا ہے۔

پیش نظر شعر اسی نظم کا ہے:

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا — خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں

ذکر ہو رہا ہے انہی پراسرار بندوں کا جو شہادت کے شوق سے سرشار تھے۔ جن کا راستہ نہ پہاڑ روک سکے نہ سمندر۔ جو اسلام کی عجیب و غریب تاثیر سے پہلے محض بدو تھے۔ یہی اونٹوں کے رکھوالے اسلام کے اعجاز کی بدولت انسانیت کے رکھوالے بن گئے۔

علامہ اس شعر میں حضرت طارق بن زیاد کی زبان سے یہ بتاتے ہیں کہ اے مالک تو نے ان صحرا نشینوں کو تہذیب کی تین بلند ترین عظمتیں عطا کیں۔ تین میدانوں میں یہ یکتا اور لاثانی نکلے اور وہ تین میدان کون سے ہیں؟ ۔۔۔ خبر ۔۔۔ نظر ۔۔۔ اور اذانِ سحر۔

یہ تینوں لفظ بظاہر بڑے عام سے ہیں لیکن ان میں مفہوم کی جو گہرائیاں ہیں ان کی وضاحت اس مختصر مضمون میں آسان نہیں۔ میں ان پر روشنی ڈالنے کی ایک حقیر سی کوشش کر رہا ہوں، پہلا لفظ خبر۔ اس لفظ کا اخبار، ریڈیو یا ٹی وی قسم کی چیزوں سے جو تعلق ہے تھوڑی دیر کے لیے اسے بھول جائیے۔ یہاں خبر سے مراد ہے علم کی وہ شکل جو ہمیں دوسروں کے وسیلے یا ذریعے سے ہوتی ہے۔ اس میں وہ سارا علم آ جاتا ہے جو ہم کتابوں کے مطالعے سے سیکھتے ہیں۔ اور وہ علم بھی جو ہم عقلمندوں، بزرگوں، استادوں اور عالموں کی زبان سے سن کر حاصل کرتے ہیں۔ یوں تو سنی سنائی چیز کو خبر کہا جاتا ہے۔ لیکن وہ علم بھی خبر ہی میں شامل ہے۔ جسے ہم اپنی ذاتی تحقیق، تلاش یا تجربے سے معلوم کرتے ہیں۔ فلسفہ بھی خبر ہے۔ سائنس بھی خبر ہے۔ لیبارٹری کے تجربے بھی خبر ہے۔ سفر و سیاحت اور آنکھوں دیکھی چیزیں بھی خبر ہے غرض علوم یا معلومات کا سارا ذخیرہ خبر ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ دورِ اوّل کے

مسلمان علم خبر میں یکتا ثابت ہوئے۔ یعنی سائنس، فلسفے اور علوم و فنون کے میدان میں۔

دوسری چیز ہے نظر، یہ لفظ بھی معنی کی ایک دنیا ہے۔ نظر وہ علم ہے جو چیزوں کی گہرائی کو پا لیتا ہے۔ جو حقیقت کو دیکھ لیتا ہے۔ نظر وہ صلاحیت ہے جو غور و فکر کے بغیر ایک بجلی کے لشکارے کی طرح اتنا کچھ معلوم کر لیتی ہے جتنا فلسفی، مفکر اور سائنسدان مدتوں کے غور و فکر کے بعد بھی نہیں کر سکتے۔ یعنی نظر تقریباً وہ چیز ہے جسے ہم الہام یا وجدان کہہ سکتے ہیں یا جسے انگریزی میں Intuition کہتے ہیں۔ مذہبی زبان میں اسے علم لدنی بھی کہا جا سکتا ہے یہ علم ہر کس و ناکس کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔ یہ تو غیر معمولی انسانوں، عارفوں، صوفیائے کرام اور اللہ کے برگزیدہ بندوں ہی کا حصہ ہے۔ علم الیقین اسی کو کہتے ہیں جو نظر سے حاصل ہوتا ہے۔

علامہ اقبال نے ایک اور شعر میں علم کی ان دونوں قسموں کو ایک اور بڑے دلکش پیرائے میں یوں ادا کیا ہے:

ع تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

یعنی علم نظر کو تجلیات کہا ہے اور علم خبر کو سائنسدان کے مشاہدات۔

یہ مسلمان، یہ کلمہ توحید کے متوالے صرف سائنس و فلسفے کے شاہسوار ہی نہیں تھے بلکہ الہامی نظر سے بھی بہرہ مند تھے۔ نظر کا ایک اور مفہوم روحانی فیض بھی ہے۔ یہ نظر بھی عجیب و غریب طاقت تھی۔ اس سے تقدیریں بھی بدلی جا سکتی تھیں۔ یہی نظر تلوار کا کام بھی کرتی تھی اور معلم کا بھی۔ وہ مکتب کا علم تو نہیں تھا نبیؑ کی نظر ہی تو تھی جس نے معصوم اسمٰعیل کو پل بھر میں آداب فرزندی سکھا دیئے۔ وہ شمس تبریزی کی نظر ہی تو تھی جس نے جلال الدین رومی کو اللہ کا دیوانہ بنا دیا تھا۔

شعر کا تیسرا لفظ ہے اذانِ سحر

آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ یہاں اذانِ سحر کا بھی وہ مطلب نہیں جو ہم اور آپ عام طور پر لیتے ہیں۔ اذانِ سحر اور ایک بہت خوب صورت علامت ہے۔ ایک بڑا دلکش استعارہ ہے۔ ذرا تصور کیجئے ساری دنیا پر رات کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں، انسان

اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ جہالت کے اندھیرے بدکرداری کے اندھیرے، ظلم اور ناانصافیوں کے اندھیرے۔

اتنے میں کرۂ ارضی کے سٹیج پر اسلام نمودار ہوتا ہے۔ صبح کے اجالے کی پہلی کرن بن کر اسلام کی آمد ایک اعلان ہے کہ دنیا والو اٹھو۔ رات کی عمل داری ختم ہوئی۔ اب صبح کی روشنی پھیل رہی ہے۔ نیکی اور تقویٰ کی روشنی۔ علم کی روشنی۔ انصاف اور مساوات کی روشنی۔

آپ محسوس کر رہے ہوں گے کہ اذانِ سحر کا مفہوم کتنا وسیع ہے۔ مسلمانوں نے اس کرہ بستی میں رات کے خاتمے کی خبر دی۔ سحر کی آمد کا اعلان کیا۔ یہی وہ صبح کی اذان تھی جس کی طرف علامہ نے اشارہ کیا ہے۔ یہی بندہ مومن کی وہ اذان تھی جس سے شبستان وجود لرز جاتا تھا۔

خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل   دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اگر ہم غور کریں تو ہمارے دین کا نچوڑ دو لفظوں میں موجود ہے۔ اور وہ لفظ ہیں لاالہ الا اللہ ـــــ یہ دنیا کی سب سے عظیم الشان حقیقت ہے جس کا اعلان اسلام نے کیا ان دو لفظوں کی گرج سے سارے بت لرز کر منہ کے بل گر پڑتے ہیں۔ یہ دو لفظ جھوٹے خداؤں کی موت کا اعلان ہیں۔ یوں تو ہم سب دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم لاالہ پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ذرا اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہم زبانی اقرار سے آگے نہیں بڑھتے اگر سوال کیا جائے کہ کیا ہم ان عظیم ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہیں جو لاالہ کہنے کے بعد ہمارا فرض بن جاتی ہیں تو یقیناً ہمارا سر شرم سے جھک جائے گا۔

یہ دو لفظ تو ہم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم ہر باطل قوت کو ٹھکرا دیں۔ ہر جھوٹے خدا کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیں۔ ہماری ساری زندگی، ہمارا جینا، ہمارا مرنا سب اللہ کی رضا کے لیے ہو ہم اس خالق و مالک کی بندگی کے نشے میں سرشار ہوں۔ لیکن ہوتا کیا ہے؟ ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کی بندگی کرتے ہیں، حقیر انسانوں کی بندگی کرتے ہیں۔ دولت کو پوجتے ہیں، کرسی کی عبادت کرتے ہیں، نہیں جھکتے تو خدا کے آگے، نہیں ڈرتے تو اللہ سے ـــــ اور یہی ہماری پستی اور بربادی کا راز ہے

علامہ اقبال نے اس افسوسناک حقیقت کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور اس

طرح سے اس کا اظہار کیا ہے۔ ایک بار پھر شعر کو پڑھیے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

وہ فرما رہے ہیں کہ ہم لا الہ کو مانتے تو ہیں لیکن یہ آواز ہمارے دل کی گہرائیوں سے نہیں نکلتی۔

اس شعر میں ضمنی طور پر علامہ کا ایک اور پسندیدہ موضوع بھی آ گیا ہے۔ اور وہ ہے عقل اور دل کا مقابلہ۔ تمام صوفیوں کی طرح علامہ بھی عقل کے مقابلے میں دل کو زیادہ اونچا، زیادہ سچا اور زیادہ طاقت ور مانتے ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عقل ہمارے لیے بڑی ضروری چیز ہے۔ اس کے ہاتھوں بڑے بڑے کارنامے انجام پاتے ہیں۔ عقل کے زور سے انسان چاند تک جا پہنچا۔ لیکن عقل ایک حد تک ہی ہمارا ساتھ دے سکتی ہے جس طرح ہوائی جہاز صرف کرۂ ہوائی یعنی Atmosphere میں ہمیں لے جا سکتا ہے خلائی سفر اس کی طاقت سے باہر ہے اسی طرح عقل ہمیں ان دیکھی حقیقتوں کا علم نہیں دے سکتی۔ وہ خدا روح اور موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں جاہل ہے۔ روحانی، اخلاقی اور مذہبی معاملات اسکے بس کا روگ نہیں۔

پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہماری عقل جس بات کو تسلیم کرلے اس پر ہم سے عمل بھی کرا سکے ہر شخص کی عقل یہ تسلیم کرتی ہے کہ بے ایمانی بُری چیز ہے لیکن بے چاری اسے بے ایمانی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

اس سے ثابت ہوا کہ عقل ایک سطحی اور کمزور چیز ہے۔ ہماری شخصیت کی گہرائیاں اس کی پہنچ سے باہر ہیں۔ ہمارے افعال اور اعمال عقل کے قابو سے باہر ہیں۔ عقل ہماری زندگیوں پر حکمراں نہیں ہے، وہ چیز دل ہے یا جذبات ہیں جن کے کہنے پر ہم چلتے ہیں عقل زیادہ سے زیادہ ٹریفک کے سپاہی کی طرح ہے لیکن دل یا جذبات زندگی کی گاڑی کے ڈرائیور ہیں، عقل کی حیثیت پارلیمانی نظام کے صدر کی سی ہے جب کہ دل وزیر اعظم ہے۔ دل سے یعنی جذبات سے جو روشنی پھوٹتی ہے اس سے عقل کی آنکھیں

خیرہ ہو جاتی ہیں۔ عقل ایک چراغ رہ گزر ہے جو ارد گرد کی چند قدم زمین کو تو روشن کر سکتا ہے لیکن اندرون خانہ جو ہنگامے ہیں ان کا عقل کی روشنی میں پتہ نہیں چل سکتا۔ علامہ اقبال نے ایک جگہ یوں بھی کہا تھا۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور   چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل کا تعلق ہی دکھائی دینے والی چیزوں سے ہے۔ مگر دل کی روشنی میں انسان نظر آنے والی چیزوں سے پرے دیکھ سکتا ہے اور ان حقائق کا پتہ لگا سکتا ہے جو عقل کی پہنچ سے بالاتر ہیں۔

آیئے عقل اور دل کے اس مقابلے کے بعد ذرا اک بار پھر شعر کی طرف لوٹ آئیں علامہ کو شکایت ہے تو یہی کہ ہماری عقل نے تو لاالہ الا اللہ کی حقیقت کو تسلیم کر لیا لیکن صرف عقل کا تسلیم کر لینا بے کار ہے۔ اصل چیز تو یہ ہے کہ یہ لاالہ ہمارے دل میں گھر کر لے۔ ہمارے ریشے ریشے میں سما جائے۔

یہاں ایک لفظ اور ہے جس کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ نگاہ کا مسلمان ہونا۔ اس خوب صورت طرز بیان کا مفہوم یہ ہے کہ ہماری نگاہ کو بھی دنیا کی کوئی چیز اس قابل نظر نہ آئے کہ ہم اس پر فریفتہ ہو جائیں اس کی آرزو میں مبتلا ہو جائیں۔ خدا کے سوا دنیا کی تمام نعمتیں ہماری نگاہ میں ہیچ ہوں۔ نہ اقتدار کا لالچ ہمیں اپنا غلام بنا سکے نہ ہم دولت کی پرستش کریں۔ نہ ہم عیش و عشرت کے دیوانے ہوں جب ایسا دل اور ایسی نگاہ ہمیں نصیب ہو جائے گی تو ہم صحیح معنوں میں لاالہ الا اللہ کے علمبردار بن سکیں گے اس وقت ہم بندۂ مومن ہونے کا دعوای کر سکیں گے۔

——کیپٹن نوشاد حمید

ایک مرتبہ علوی صاحب نے ہوم ورک میں ایک خط لکھنے کو دیا ہم نے فوراً ٹیسٹ پیپر کا رٹا رٹایا خط خوبصورتی سے لکھ کر پیش کر دیا۔ کم و بیش دوسروں نے بھی یہی کیا تھا۔ علوی صاحب نے سب پر لکیر کھینچ دی اور پھر کہا خط یوں لکھو جیسے آمنے سامنے باتیں کر رہے ہیں۔ غالب کے خطوط کے ٹکڑے بھی پڑھ کر سنائے۔ میں نے ہمت کر کے ایسا ہی کیا۔ حد یہ کہ آخر میں اپنا گاؤں کا نام گلو بھی لکھ دیا۔ علوی صاحب بہت خوش

ہوئے اور نمبر بھی خوب دیئے۔ وہ انفرادیت کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ بڑے ناموں سے خود بھی قطعاً مرعوب نہیں تھے اور نہ ہمیں مرعوب ہونے دیا۔ کلاس میں وہ بڑے بڑے شاعروں اور نامی گرامی ادیبوں پر ہم سے یوں بحث کرواتے جیسے ہم بہت بڑے نقاد ہوں نئے خیالات کی اور مدلل اختلاف رائے کی قدر کرتے تھے، وہ بے پناہ قابلیت کے مالک تھے لیکن انہوں نے ہمارے تنقیدی شعور کو پروان چڑھایا۔ ذہنی آزادی جو شاید ہمارے پورے ماحول میں شجر ممنوعہ سمجھی جاتی تھی اور سمجھی جاتی ہے اسے چکھنے کا حوصلہ انہی نے دیا پہلے دن ان کو دیکھ کر مایوسی ہوئی تھی لیکن کالج سے جاتے جاتے مجھے ان سے محبت کی حد تک لگاؤ ہو گیا تھا۔ وہ عظیم ہستی جو کبھی باپ کبھی ماں اور کبھی دانشور روپ دھارتی تھی آج ہم میں نہیں، دل خون کے آنسو روتا ہے۔ خدا انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے آمین۔

——— کیپٹن اختر نواز[1]

علوی صاحب علمی شاعر تھے یعنی شاعری کے فن سے خوب واقف تھے۔ لڑکے جو تُک بندیاں کرکے، تربیت کے لیے انہیں دے دیتے وہ اسے شاعر کے قالب میں ڈھال کر شائع کر دیا کرتے تھے۔ خود اپنے شعر انہوں نے کبھی نہیں سنائے۔ کالج چھوڑنے کے بعد میں نے ایک نظم انسان کے عنوان سے لکھی تھی اس کی اصلاح بھی انہی سے کرائی۔

وہ کالج میں دکھائی جانے والی اُردو اور انگریزی کی ہر فلم کو بڑی پابندی سے دیکھا کرتے تھے۔ اور اس کے تکنیکی پہلوؤں پر بڑے ماہرانہ انداز میں تبصرہ کرتے تھے۔ ایک روز میں نے پوچھا سر پریم چند، منٹو وغیرہ بڑے بڑے ادیبوں نے فلم کی کہانیاں لکھی ہیں۔ کبھی آپ نے بھی فلم وغیرہ کی کہانی لکھی ؟ فرمایا ہاں لکھی تھی۔ ڈائریکٹر نے اس پر تبصرہ کرکے واپس بھیج دی۔ آجکل کے لوگ ایسی کہانیاں پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ کہانی کا موضوع کیا تھا ؟ ڈرامہ تو خیر وہ لکھتے ہی تھے۔

ہاکی ہمارا خاندانی کھیل ہے۔ تیز ہاکی کھیلنے کی وجہ سے ہم نواز برادران (احمد نواز، میں

---

[1] کالج نمبر ۳۵۷۱ زمانہ تعلیم ۴۸-۱۹۴۷ء

اختر نواز، سلیم نواز اور اللہ نواز) کالج میں بجلی کے نک نیم سے مشہور تھے مجھ سے پہلے احمد نواز بجلی مشہور تھے۔ پھر یہ لقب میرے حصے میں آیا ایک روز لائٹ موڈ میں مجھ سے پوچھنے لگے۔ اختر! تمہارے گھر کے بادلوں میں ابھی کتنی اور بجلیاں چھپی ہیں؟ میں نے مسکرا کر کہا سر سب سے بڑی بجلی تو والد خود تھے۔ اب ہم چاروں بھائی ہاکی کھیلتے ہیں۔ والد مرحوم ہم سے کہا کرتے تھے کہ تم پاکستان ٹیم تک پہنچو گے تو مجھے اصل خوشی اس وقت ہوگی علوی صاحب نے بکمال شفقت فرمایا مجھے بھی تم بجلیوں سے یہی توقع ہے کم از کم آرمی کی طرف سے بھائی احمد نواز اور سلیم نواز کھیلے تو مجھے علوی صاحب بہت یاد آئے۔ جب میں نے پی اے ایف کالج آف ایروناٹیکل انجینئرنگ سے اعزازی تلوار کا اعزاز حاصل کیا تو کالج سے سب سے پہلے مبارک باد کا خط انہی کا آیا تھا اللہ اللہ کیا لوگ تھے!

——— کیپٹن احسان الحق[1]

یہ واقعہ ۱۹۷۹ء کا ہے۔ ہم لوگ سیکنڈ ائر میں تھے اور علوی صاحب اردو کے نوٹس بلیک بورڈ پر لکھ رہے تھے۔ عمران نے شرارت کی اور چاک کسی لڑکے کے ماری جو Deflect ہو کر علوی صاحب کی پیشانی کے بائیں طرف جا لگی۔ علوی صاحب اسی طرح لکھتے رہے۔ صرف اتنا کہا۔ ماشاء اللہ نشانہ بہت اچھا ہے۔ اور اس بات کا کوئی اور نوٹس نہیں لیا۔

دوسرے دن باکسنگ عمران بھی لڑ رہا تھا اور بہت اچھا باکسر تھا اور اس کا مدمقابل کوئی خاص مہارت نہیں رکھتا تھا۔ پھر بھی ہوا یہ کہ مخالف کا ایک مکا عمران کی پیشانی کے بائیں طرف ٹھیک اسی جگہ لگا جہاں چاک Deflect ہو کر علوی صاحب کے لگی۔ اس کے خون نکل آیا اور اسے میڈیکلی ناک آؤٹ قرار دے دیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ محض اتفاق ہو لیکن یہ سوال اب بھی میرے ذہن میں ابھرتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔

——— کیپٹن مرزا محمد عطاء اللہ[2]

علوی صاحب نے بلیک بورڈ پر کچھ لکھنے کے لیے پیٹھ موڑی ہی تھی کہ پیچھے ایک

---

[1] کالج نمبر ۳۶۳۷ زمانہ ۷۹-۱۹۷۴ء [2] کالج نمبر ۳۶۷۵ زمانہ تعلیم ۷۹-۷۴ ۱۹ء کالج ہیڈ بوائے اور وائس پریذیڈنٹ کالج یونین ۷۹-۱۹۷۸ء

لڑکے کو شرارت سوجھی، اُس نے اگلی رو میں ایک لڑکے کے چاک ماری۔ نشانہ خطا گیا اور چاک علوی صاحب کے جا لگی۔ انہوں نے دیکھا۔ تو وہ لڑکا فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ آئی ایم ساری سر، میں نے دراصل میں طارق کو Aim کیا تھا۔ علوی صاحب نے مسکرا کر برخوردار تم نے تین غلطیاں کی ہیں۔ پہلی غلطی تو اردو کی ہے۔ دراصل میں۔ نہیں کہیے دراصل یا اصل میں کہیئے دوسری غلطی ڈسپلن کی ہے۔ وہ تو واضح ہے۔ تیسرے یہ کہ نشانہ بھی صحیح نہیں ہے۔

وہ لڑکا جتنا شرمندہ ہوا اور بعد کو جو حشر ہم نے اس کا کیا۔ وہ الگ داستان ہے میں اس استاد کی عظمت کو ہزار بار سلام کرتا ہوں جس میں اتنا تحمل تھا۔

——— محمد آصف خان[1]

ایک روز فلموں کی بات چل نکلی انہوں نے بنگالی فلم ڈائریکٹر اور پروڈیوسر ستیہ جیت رائے کی بڑی تعریف کی جس نے Live shooting کی روایت شروع کی اور بنکم چندر چٹر جی کے انقلابی سماجی ناولوں کو اپنی فلموں کی بنیاد بنایا۔ پھر فرمایا۔ اچھی کہانی اچھی فلم کی پہلی شرط ہے۔ میں نے کہا آپ کو ڈرامہ اور فلم کے میڈیم سے اتنی دلچسپی ہے کبھی فلم کے لیے کوئی سٹوری یا ریڈیو ٹی وی کے لیے کوئی ڈرامہ لکھا۔ مسکرا کر کہا ہاں جب آتش جواں تھا تو بہت کچھ لکھا۔ فلم کی کہانی بھی لکھی لیکن کسی فلم ساز نے اسے قبول نہیں کیا اصل میں ہمارے ہاں فارمولا فلمیں چلتی ہیں، میں نے پوچھا ہمارے ادیب فلموں کے لیے کیوں نہیں لکھتے۔ لکھنے تو ہیں پریم چند، سعادت حسن منٹو، امتیاز علی تاج، شوکت تھانوی بہت سے مستند ادیبوں نے فلم کے لیے لکھا لیکن بات بنی نہیں سوائے خواجہ احمد عباس کے کہ وہ ادیب بھی ہیں اور ڈائریکٹر بھی۔ بات کیوں نہیں بنی"

فلم آرٹ ہی نہیں ایک کمرشل چیز بھی ہے۔ کمرشل تقاضے کچھ ہوتے ہیں۔ ادب کے کچھ اور، بہر حال جیسی روح ویسے فرشتے جب ملک کے حالات بدلیں گے عام آدمی کی ذہنی سطح بلند ہو گی تو فلم کا معیار بھی بدلے گا۔ ٹی وی کے ڈرامے اس لیے بھی بہتر

---

[1] کالج نمبر ۳۶۸۷ زمانہ تعلیم ۱۹۷۶-۸۱ء

ہیں ان کے ناظرین مختلف ہوتے ہیں۔ میں نے پوچھا سر، آپ کی کوئی ایسی خواہش بھی ہے۔ جو پوری نہ ہوئی ہو۔ فرمایا ہاں۔ میری خواہش تھی کہ میں یونیورسٹی میں پڑھاتا۔ میں نے عرض کیا سر، کوئی نصیحت کیجئے۔ زیر لب مسکرا کر گویا ہوئے۔ کیا کرنا ہے۔ عقل مند کو اس کی ضرورت نہیں۔ بیوقوف سنتا نہیں۔"

——— کیپٹن شجاعت علی قاضی[۱]

۱۹۷۹ء کی ری یونین پر ہونے والے ڈرامے کی ریہرسل جاری تھی۔ جمعرات کی فلم کی وجہ سے ریہرسل بروقت نہ ہو سکی وہ اس روز فلم بھی کچھ زیادہ لمبی تھی کوئی گیارہ بجے ختم ہوئی تو علوی صاحب نے ہال میں اعلان کروایا کہ ڈرامے کے لڑکے رک جائیں۔ ریہرسل کرنے کا ہمارا قطعاً موڈ نہ تھا۔ علوی صاحب سے بہت کہا سنا لیکن وہ نہ مانے۔ اور تقریباً زبردستی ریہرسل کروایا۔ چونکہ بیدلی سے کر رہے تھے اس لیے کام بھی غلط ہو رہا تھا۔ اس لیے معمول سے دوگنا وقت لگا اور کوئی ڈیڑھ دو بجے فارغ ہوئے اور علوی صاحب کو Curse کرتے ہوئے ہاؤسوں کو لوٹے۔ یوں باتیں تو بے شمار ہیں لیکن اس دن کا ریہرسل باربار یاد آتا ہے ہم لوگوں نے غیر ذمہ داری اور بدتمیزی میں کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ لیکن یہ انہی کا ظرف کہ وہ سب کچھ برداشت کر کے کام کرتے اور کرواتے رہے۔ اللہ اکبر۔

——— سعید اختر عباس انجینئر[۲]

۱۹۷۹ء کی عالمگیر بیئرری یونین کے موقع پر جو انگلش ڈرامہ Dear Departed ہوا تھا اس میں Abel Merry Weather کا پارٹ ریاض عظیم کا اور مسٹر ہنری سلیٹر Henry Slater کا پارٹ میرا تھا۔ فنکشن سے پہلے اس کی ریہرسل زور و شور سے جاری تھی۔ کہ ایک روز ریہرسل کے وقت یعنی آٹھ بجے شب سے ذرا پہلے باد و باراں کا ایسا طوفان آیا کہ بجلی بھی چلی گئی چونکہ مجھے اور ریاض عظیم کو شیر شاہ ہاؤس سے سامنے موتی ہال جانا تھا ہم تو جیسے تیسے بھاگ کے وہاں پہنچ گئے۔ دو چار

---

[۱] کالج نمبر ۳۸۹۷ زمانہ ۷۹ - ۱۹۷۶ء [۲] کالج نمبر ۳۸۶۸ زمانہ ۷۹ - ۱۹۷۶ء

اور لڑکے محمد علی اور طارق نواز، جو لوبی کا پارٹ کر رہا تھا وہاں بارش شروع ہونے سے پہلے آچکے تھے موجود تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس بارش میں جبکہ لائٹ بھی نہیں ہے۔ ریہرسل کیا ہوگا کالونی سے علوی صاحب کیسے آئیں گے۔ بہرحال ہوا یہ کہ ابھی ہم یہ بحث کر ہی رہے تھے کہ علوی صاحب برساتی پہنے ایک ہاتھ میں چھتری دوسرے میں ٹارچ لیے نمودار ہو گئے اور آتے ہی چند منٹ دیر میں آنے کی معذرت کی چنانچہ جو لڑکے نہیں آئے تھے انہیں بارش کم ہونے پر ہاؤسز سے بلوایا گیا۔ اور اس روز ریہرسل موم بتیوں کی روشنی میں ہوا۔

سرسید کا مضمون بحث وتکرار پڑھنا تھا اس سے پہلے علوی صاحب نے سرسید کا تعارف کرانا شروع کیا بات اس نکتہ پر پہنچی کہ سب سے پہلے سرسید ہی نے دو قومی نظریہ پیش کیا تھا۔ ثبوت کے طور پر علوی صاحب نے اس تاریخی واقعہ کا حوالہ دیا کہ جب ۱۸۶۷ء میں بنارس کے ہندوؤں نے اردو ہندی کا جھگڑا کیا اور یہ کہہ کر کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے عدالتوں میں ہندی کے استعمال پر اصرار کیا تو بنارس کے ڈپٹی کمشنر مسٹر شیکسپیئر سے سرسید نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہے ہندو مسلمان اب مل کر یکجا نہیں رہ سکیں گے۔ ابھی تو ابتدا ہے جو زندہ رہے گا دیکھے گا۔ چونکہ یہ تاریخی تبصرہ تھا انہوں نے ہم سے کہا آپ اس فقرہ کو نوٹ کر لیں۔

اسی سلسلہ میں ہندوؤں کے کردار اور مزاج پر بحث چل پڑی فرمایا چونکہ ان کا مزاج ٹھنڈا اور کاروباری ہے وہ بہت دور کی سوچتے ہیں اس لیے مشہور تھا کہ ہندو حساب میں اچھے ہوتے ہیں۔ جبکہ اس مضمون میں مسلمانوں کی نالائقی مشہور تھی۔ یہ سن کر میرے منہ سے نکل گیا۔

"کیا آپ بھی حساب میں نالائق تھے؟"

سوال پوچھتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میرے منہ سے غلط فقرہ نکل گیا ہے۔ لیکن آفرین ہے ان پر وہ ہلکا سا مسکرائے اور میری گستاخی کو سرسری نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات کو جاری رکھا۔ سوال میرا یا کسی اور فرد کا نہیں مسلمانوں میں اس زمانہ میں خود علی گڑھ میں

بڑے نامور ریاضی دان جیسے سر ضیاء الدین، سر شاہ سلیمان موجود تھے۔ میں بحیثیت مجموعی قومی مزاج اور افراد کی بات کر رہا ہوں۔

ادب اور زندگی کا بیباک نقاد

——— کیپٹن حسین عباس[1]

جون ۱۹۸۱ء میں سر علوی اور کرنل حامد رضا صدیقی بمعہ اہل و عیال ہائکنگ ٹیم کے ساتھ گئے تھے۔ میں بھی اس ٹیم میں شامل تھا۔ دو ہفتہ کی اس تمام سیر اور سفر کے دوران وہ ہم نوجوانوں کے ہم قدم اور وقار کے ساتھ ہم سخن رہے وہاں ہمارے ساتھ کوئی انہیں دیکھتا تو گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی علوی صاحب ہیں جو کالج میں مفکرؔ، مدبرؔ اور فن کار سب ہی کچھ ہوتے ہیں۔

ان کے نظریات بہت پختہ تھے۔ تحریک پاکستان کے بارے میں بھی اور ادب سے متعلق بھی۔ اگر کوئی ان کے سامنے بحیثیت تاریخی ناول نگار کے نسیم حجازی کا نام لیتا تو وہ پھٹ پڑتے "تاریخی ناول نگار ہونا تو بڑی بات ہے۔ وہ تو میر باقر علی ایسے داستان گو بھی نہیں۔ ہاں کہا جا سکتا ہے کہ تاریخی قصے اچھے لکھے ہیں" پھر وہ خاصا وقت ناول اور تاریخی ناول کے فن کی باریکیوں کی وضاحت میں صرف کرتے جس کے دوران والٹر سکاٹ کے Waverly ناولوں اور ہیرالڈ لیم کے نیم تاریخی ناولوں کا ذکر بار بار آتا۔ ان کی اس تنقید سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہمیں یہ اندازہ ہو گیا کہ نسیم حجازی سے آگے بھی ناول کی دنیا ہے۔

مزاح میں وہ پطرس کے بڑے مداح تھے۔ پاکستان بنتے وقت لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے باؤنڈری کمیشن کے سربراہ ریڈ کلف سے ساز باز کر کے جس طرح گورداسپور کا پاکستانی علاقہ انڈیا کی جھولی میں ڈال دیا اور یوں کشمیر کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ اس پاکستان دشمنی اور بدنیتی کے حوالے سے وہ ماؤنٹ بیٹن سے سخت نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ انہی دنوں جب آئرش انتہا پسندوں کے ہاتھوں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی کشتی کے تباہ ہونے کی خبر

---

[1] کالج نمبر ۴۲۴۲۔ زمانہ تعلیم ۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۳ء

آئی تو انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔" یہ پاکستان دشمن انسان کچنر کی طرح اسی انجام کا مستحق تھا۔"

ان کے پڑھانے کا بھی اپنا طریقہ تھا۔ ایک مرتبہ کوارٹرلی امتحان ہو رہا تھا کہ انہوں نے ایک لڑکے کو کسی سے کچھ پوچھتے ہوئے دیکھ لیا۔ انہوں نے کہا "بے شک آپ کتابیں کھول لیں اور انہیں دیکھ کر پرچہ حل کریں۔ اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ چنانچہ بعض نے کتابیں کھول بھی لیں اپنے نوٹس بھی دیکھے لیکن نمبر انہی کے اچھے آئے جن کی تیاری اچھی تھی اور قلم برداشتہ لکھا تھا۔

وہ پڑھانے کے دوران شاگردوں کے تاثرات ضرور سنتے تھے۔ سوال کرنے کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ کہا کرتے میں واعظ نہیں کہ تم لوگ ثواب کی خاطر خاموشی سے سنو۔ میں معلّم ہوں۔ مجھ سے جو سنو اس کو تولو، Question کرو۔ اس کو سمجھو۔ ان کے اس رویے کی وجہ سے بعض لڑکے بڑے بڑے نامعقول سوال بھی کر جاتے تھے۔ لیکن وہ ان کا بھی بڑے تحمل سے جواب دیتے۔ انہوں نے کلاس میں کبھی کوئی ذاتی بات نہیں کی سوائے اس ایک موقع کے جب علی گڑھ میں ان کے والد کا انتقال ہوا تھا اور وہ ان کے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکے تھے۔ اس کا انہیں بہت دکھ تھا اس محرومی کا انہوں نے کلاس میں دوبار ذکر کیا۔

——— کیپٹن امجد کیانی[1]

یہ واقعہ ۱۹۸۲ء کا ہے جب میں ملٹری کالج کے جے سی بی ونگ میں زیر تعلیم تھا۔ ویک اینڈ سے واپس آنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ میں جہلم بس سٹینڈ پر کھڑا بس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس دن بسوں کی ہڑتال تھی کہ کیا مسئلہ تھا کوئی بس آتی جاتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ جب اندھیرا گہرا ہونے لگا تو میری تشویش بڑھی کہ کیا کروں اتنے میں ایک سوزوکی موٹر بائک پاس سے گزری میں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ جب وہ بائیک کوئی سو گز آگے جا کر رکی اور پھر واپس آئی تو میں نے پہچانا کہ یہ اپنے پروفیسر علوی ہیں؟ انہوں نے اشارہ سے مجھے بیٹھنے کو کہا اور راستہ میں ادھر ادھر کی دو ایک ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے اور

---

[1] کالج نمبر ۶۴۶۰ء زمانہ تعلیم ۸۳-۱۹۷۸ء

پھر مجھے گیٹ پر نہیں میرے باؤس ہٹ ہاؤس لے جا کر اتارا۔ میں نے شکریہ ادا کیا تو صرف اتنا کہا It was my pleasure & obligation

——— کیپٹن حسن منصور شیرازی[۱]

۱۹۸۲ء میں ۱۱ ستمبر کا فنکشن ہو رہا تھا علوی صاحب نے خود ہارمونیم پر ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح کی دھن نکالی اور ہمیں سکھائی۔ کوئی اور ہارمونیم بجانے والا نہ تھا۔ چنانچہ فنکشن کے دوران انہوں نے بیک گراؤنڈ میوزک بھی دیا۔

——— کیپٹن فاروق احمد صدیقی[۲]

۱۹۸۲ء میں جو ری یونین ہوئی تھی اس موقع پر ایک اردو ڈرامہ شامت اعمال بھی پیش کیا گیا تھا۔ اس میں اللہ نواز، ندیم عامر، عامر شہزاد، طاہر محمود اکبر، زاہد محمود کے علاوہ یہ خاکسار بھی تھا۔ فائنل شو ۳۰ نومبر کو مہمان خصوصی جنرل اقبال اور عالمگیر ینیر کے سامنے پیش ہونا تھا۔ علوی صاحب نے ۲۹ کے ڈریس ریہرسل سے پہلے اپنا فائنل ریہرسل ۲۸ کی شب آٹھ بجے رکھا تھا اور جن ایکٹرز کے نام میں نے لکھے ہیں ان میں سے تین (میرے علاوہ) دو کے دل میں کیا آئی کوئی ساڑھے سات بجے سرائے عالمگیر کی سیر کو نکل گئے۔ ہاؤس میں بہانا یہ بنایا کہ ڈرامہ کی ایک ضروری چیز لانی ہے۔ اب میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ کس نے کس کو بہکایا بہر حال آدمی کا شیطان آدمی ہے کسی نے کسی کو بہکایا یا سب ہی نے ایک دوسرے کو بہکایا۔ (گویا سب ہی شیطان تھے۔ اس کو راز ہی میں رہنے دیجئے) بہر حال ہوا یہ کہ گئے تو تھے صرف چائے کا گرم گرم ایک ایک کپ پینے وہاں ایک ایسا ظالم کیسٹ لگ گیا پھر ہمارے ایک دوست نے کیک پیسٹری میں بھی دلچسپی ظاہر کر دی پھر وہ اس کے انصاف کرنے میں مصروف رہے نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہمیں اس عیاشی سے ہوش آیا تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ بھاگم بھاگ موتی ہال پہنچے۔ ڈرامہ کا ریہرسل شروع تھا۔ وہ حصہ جس میں مجھے ایڈیٹر کا رول ادا کرنا تھا گزر چکا تھا۔ ہم چپکے سے جا کر بیٹھ گئے۔ زاہد محمود نے جو بندو کی نانی کا رول کر رہا تھا۔ مجھ سے چپکے سے آکر کہا۔ بھائی جان علوی صاحب

---

[۱] کالج نمبر ۱۸۸۸ء زمانہ تعلیم ۸۴-۱۹۸۰ء [۲] کالج نمبر ۲۲۳۹ء زمانہ تعلیم ۸۲-۱۹۷۹ء

بہت غصہ میں ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے سے آنکھوں آنکھوں میں کہا۔ آج خیر نہیں اور جاؤ سرائے۔ مختصر یہ کہ دوسروں نے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں جا کر علوی صاحب کو فیس کروں۔ ان کا خیال تھا میں کچھ زیادہ لاڈلا ہوں شاید کچھ بچت ہو جائے۔ مرتا کیا نہ کرتا میں سٹیج پر جا کر اس زاویے سے کھڑا ہو گیا کہ جل ہی مڑیں ان کی نگاہ مجھ پر پڑ جائے۔ وہی ہوا انہوں نے مجھے دیکھ تو لیا لیکن کچھ نہ کہا۔ جب سارا ریہرسل ختم ہو گیا اور سٹیج خالی ہو گیا تو انہوں نے بہت سخت لہجہ میں کہا۔

"فاروق احمد صدیقی، سامنے آیئے" میں سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ جس طرح انہوں نے میرا پورا نام لیا تھا میں سمجھ گیا تھا بہت زیادہ ناراض ہیں "فاروق احمد صدیقی آپ کو معلوم تھا کہ آج فائنل ریہرسل ہے" "یس سر" "آپ کو یہ بھی معلوم کہ آپ کو سٹیج کو Manage بھی کرنا ہے"

"یس سر، لیکن سر، دراصل سر—— ہوا یہ کہ سر" میں نے بات بتانے کی کوشش کی۔

"خاموش" وہ گرجے۔ ایسی گرج کسی نے پہلے نہ سنی تھی۔ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ میں بہت ڈرا۔ آج بہت جلال میں ہیں نہ جانے کیا سزا ملے۔ میں نے دوستوں کو دل ہی دل میں Curse کیا جنہوں نے مجھے اکیلا پھنسوا دیا تھا۔

"فاروق احمد صدیقی آپ کی سزا یہ ہے کہ آپ آئندہ دو گھنٹے تک مسلسل ریہرسل کرتے رہیں" چنانچہ آئندہ دو گھنٹے تک میں اور میرے شیطان دوست اکیلے سٹیج پر ریہرسل کرتے رہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ خود بھی وہاں بیٹھے رہے۔ صرف یہ کیا کہ ہدایات نہیں دیں خاموش رہے۔ اس سے بھی حیرت کی بات یہ ہے کہ دوسرے دن ڈریس ریہرسل تک اس کے بعد کبھی بھی انہوں نے ہماری حماقت کا تذکرہ نہیں کیا۔ اشارتاً بھی نہیں —— وہ سمندر تھے۔

—— کیپٹن خالد محمود[1]

ایک روز علوی صاحب موتی ہال کے دائیں طرف کے لان میں کلاس لے رہے تھے کہ یکا یک مشرق کی طرف سے گھٹا اٹھی اور دیکھتے دیکھتے آسمان پر چھا گئی۔ نہ یہ کہ اندھیرا چھا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اب موسلا دھار بارش ہوئی۔ اب ہوئی۔ لڑکوں نے کہا سر اندر چلیں،

---

[1] کالج نمبر ۲۲۸۱م زمانہ تعلیم ۸۱-۱۹۷۹ء اور ایڈجوٹینٹ ملٹری کالج از جولائی ۸۸ء تا حال۔

علوی صاحب نے ایک نظر اوپر آسمان کی طرف ڈالی اور کہا۔ آپ لوگ بے فکر رہیں بارش نہیں ہوگی۔" پھر وہ بادل، ابر بہار اور بارش پر شعر سنانے لگے۔ فرمایا بے نظیر شاہ کا شعر ہے:

گھٹا اودی اودی سی کیا چھا گئی۔ بہار چمن رنگ پر آگئی

محسن کاکوروی کا نعتیہ قصیدہ بادل کے ذکر سے ہی شروع ہوتا ہے۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

غالب کا شعر ہے:

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی پیتا ہوں روز ابر و شب ماہ تاب میں

ثاقب لکھنوی نے کیا خوب کہا ہے:

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں ابر بہار جانب گلزار دیکھ کر

ــــ ہم اشعار سننے میں ایسے محو ہوئے کہ بارش کا خیال ذہن سے اتر گیا کچھ دیر کے بعد جب بادل چھٹنے لگے تو ہم نے پوچھا سر آپ کو کیسے پتہ چلا کہ بارش نہیں ہوگی؟ اتنے زور کی گھٹا اٹھی تھی۔ فرمایا کچھ نہیں۔ تجربہ کی بات ہے پھر علم اور تجربہ کی بات چل نکلی ــــ علوی صاحب علم کا دریا نہیں سمندر تھے۔ ان کا ایک ایک لیکچر ایک کتاب ہوتا تھا۔

ــــ ناصر محمود اعوان ایم ایس سی[1]

اوائل ۱۹۸۲ء کا واقعہ ہے جب ہم لوگ سیکنڈ ائیر میں تھے تو کالج کے سالانہ ڈرامہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس روز اُردو کا آخری پیریڈ تھا۔ علوی صاحب نے گھنٹہ ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے کہا۔ مجھے دفتر میں کچھ کام ہے۔ اس لیے ریہرسل کے لیے چار بجے کے بجائے ساڑھے چار بجے آؤں گا۔ آپ میں کوئی والنیٹر ہے جو چار بجے آکر اپنے اپنے پارٹ یاد کریں میری بدقسمتی کہ میرے ذہن سے نکل گیا اور چند دوستوں کے ساتھ واکنگ آؤٹ شہر چلا گیا۔ پھر بارش شروع ہوگئی اس لیے واپسی پر دیر ہوگئی بمشکل چھ بجے کے قریب کالج پہنچے۔ کیفیٹریا میں بیٹھ کر چار پی۔ ٹیپو ہاؤس پہنچا تھا۔ پھر بھیگنے سے بچنے کے لیے مونی ہال

---

[1] کالج نمبر ۴۳۸۹ زمانہ تعلیم ۸۲-۱۹۸۰ء

کے برآمدوں کا شارٹ کٹ لیا۔ جب یونین آفس کے سامنے سے گزرنے لگا اسے بند پایا تو یکایک خیال آیا غضب ہوگیا آفس تو مجھے چار بجے کھولنا تھا۔ چابی تو میرے پاس ہے لیکن اس خیال سے کہ بارش میں کون آیا ہوگا قدرے اطمینان ہوا۔ لیکن جب چند قدم آگے بڑھا تو موسیٰ ہال کے کاریڈور میں کسی کو اوور کوٹ پہنے چھتری لیے کھڑے دیکھا۔ مجھے پہچاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ علوی صاحب ہیں۔ پریشانی اور ندامت سے مجھے پسینے آ گئے۔ آواز Choke ہو گئی اور بمشکل آئی ایم ساری سر کہہ سکا۔ وہ خاموش رہے پھر کہا تو صرف یہ کہا آپ لوگ جلدی سے Change کر آئیں۔ اس وقت میں نے محسوس کیا وہ سردی سے کپکپا رہے تھے۔ جو ڈارم میں پہنچا تو میرے روم میٹ نے کہا نامعقول ساڑھے چار بجے سے علوی صاحب تجھے تلاش کر رہے ہیں، اللہ اکبر، مرحوم ہمارے لیے صبر و تحمل کا کیا معیار چھوڑ گئے ہیں۔

——— لیفٹیننٹ خرم حسنین ہمدانی[۱]

۸۵-۱۹۸۴ء کے سیشن میں ڈیبیٹنگ کا وائس پریذیڈنٹ تھا۔ ایک بار جمعرات کی پریڈ پر میں ڈیبیٹنگ ہی کے کسی سلسلہ میں ذرا لیٹ پہنچا تو ایڈجوٹینٹ نے مجھے سارے کالج کے سامنے بہت سخت سست کہا۔ یہ بے عزتی میں برداشت نہ کر سکا اور اسی ذہنی اضطراب میں پہلے پیریڈ میں علوی صاحب کو اس عہدہ سے استعفیٰ لکھ کر پیش کر دیا۔ اور کچھ ایسا انداز اختیار کیا کہ اگر وہ برا مانتے تو حق بجانب تھے لیکن انہوں نے بڑی فراخدلی سے میری جذباتی باتوں کو سنا اور مجھے بڑی دلسوزی سے سمجھایا کہ زندگی میں اور خاص طور پر فوج میں جذباتیت نہیں چلتی بہر حال ایک طوفان تھا جو گزر گیا لیکن علوی صاحب کے ظرف اور مقبولیت کا اثر آج بھی باقی ہے۔ وہ مثالی استاد ہی نہیں انسان بھی مثالی تھے۔

---

[۱] کالج نمبر ۱،۴۴م زمانہ تعلیم ۸۶-۱۹۸۲ء

عظیم معلم اور عظیم تر انسان

——— کیپٹن سہیل فاروق[1]

شاید یہ بات زیادہ لوگوں کے علم میں نہ ہو کہ ادھر چند سالوں سے علوی صاحب چند پیریڈ انگریزی کے بھی لیتے تھے۔ ۱۹۸۲ء میں آٹھویں درجہ میں خود میں نے ان سے انگریزی پڑھی۔ انگریزی میں بھی پڑھانے کا سٹائل وہی تھا جو اردو میں تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ انگریزی گرامر اور تلفظ پر بھی خاص توجہ دیتے تھے اور زیادہ سے زیادہ انگریزی کے پڑھنے کو بار بار کہتے تھے۔ ادب اور زبان کا فرق سب سے پہلے انہیں نے سمجھایا۔ مجھے ایک لفظ Terrorize کا تلفظ نہیں آتا تھا۔ وہ انہوں نے بار بار ٹھیک کرایا اور بے مزہ نہیں ہوئے۔ فرسٹ ائر اور سیکنڈ ائر ۸۶۔۱۹۸۵ء میں دو سال لگاتار اردو پڑھنے کا موقع ملا جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ وہ ادب کو زندگی کے حوالے سے پڑھاتے تھے۔ اس لیے حالات حاضرہ کا تذکرہ بار بار آتا۔ صہیونیت (Zionism) پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا یہودی لابی نے دنیا میں جو پریشر گروپ بنایا ہوا ہے اور دنیا کے ذرائع ابلاغ پر جس طرح ان کا قبضہ ہے۔ اس کے سیاسی نتائج پر ان کی گہری نظر تھی۔ اسی پس منظر میں وہ ایرانی انقلاب پر تبصرہ کرتے تھے۔ اسی تناظر میں وہ کرنل قذافی کو کرنل کہنے پر بُرا مانتے تھے ان کا مؤقف یہ تھا کہ یہ شخص غیر روایتی انداز میں امت مسلمہ کی بہتری اور بھلائی کے لیے کام کرتا ہے ایک ہی پیریڈ میں آئن سٹائن، نطشے، مجدد الف ثانی، جمال الدین افغانی اور امریکہ کی سٹار وار کا ذکر آ جانا ہر روز کی بات تھی۔ میں حیران ہوں کہ ایسا وسیع النظر استاد اب کالج کو کیسے ملے گا۔

اب چند واقعات لکھتا ہوں جن سے ان کے کردار کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ ۱۰ نومبر ۱۹۸۷ء کو ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر اردو انگریزی ڈرامہ ہونا تھا اور وہ نومبر کی پہلی تاریخ تھی۔ جس دن انہوں نے کرداروں کو ان کے پارٹ تقسیم کیے اس سے پہلے امتحان ہو رہا تھا، وقت اتنا کم رہ گیا تھا کہ مجھے تشویش ہوئی کہ ڈرامے بروقت کیسے تیار ہو سکیں گے حالانکہ میرا اپنا کام صرف سٹیج سیکرٹری کا تھا۔ سر ڈرامے بروقت تیار ہو سکیں

---

[1] کالج نمبر ۴۵۲۱ھ زمانہ تعلیم ۸۷-۱۹۸۳ء

گے آج پانچ تاریخ ہے۔" انہوں نے شفقت سے مجھے ڈانٹا۔ کیوں نہیں ہوں گے ارادہ جو ہے، محنت جو کہیں گے We can, we will دھن کے تو وہ پکے تھے۔ دن رات ایک کرکے انہوں نے بظاہر ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ جوبلی سے ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے۔ فلم کی وجہ سے ریہرسل لیٹ ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا سہیل ریہرسل کو بہت دیر ہو گئی ہے۔ تم آج انگریزی کا ریہرسل لے لو۔ میں اردو کا دیکھتا ہوں۔ میں نے کہا سر حاضر ہوں لیکن ۹ بج کر ۴۰ منٹ پر ٹی وی پر جو پاسنگ آؤٹ پریڈ آ رہی ہے اس میں میرا کزن بھی پاس آؤٹ ہو رہا ہے۔" ٹھیک ہے اس وقت تک ریہرسل کرا لو۔ چنانچہ میں ریہرسل کرانے لگا۔ لیکن اس عرصے میں میں یہ بھی سوچتا رہا کہ کزن کی پاسنگ آؤٹ دیکھنا اپنی جگہ لیکن یہ کام بھی اہم ہے پھر استاد محترم نے فرمایا ہے آخر کار میں نے ارادہ کر لیا کہ ٹی وی پر پریڈ نہیں دیکھوں گا لیکن ساڑھے نو بجے علوی صاحب میری طرف آئے گھڑی دیکھی اور فرمایا "اب تم جاؤ۔" میں نے اصرار کیا لیکن وہ نہ مانے۔ اس طرح کی دلداریاں شفقتیں ہر روز ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن جہاں ضرورت ہوتی بہت سختی سے گرفت بھی کرتے انگریزی ڈرامہ کے آخر میں مجھے ایک جگہ پردہ کھینچنا ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کئی بار کہا تھا کہ اس کا بھی ریہرسل کر لینا لیکن معمولی کام سمجھ کر میں ٹال جاتا تھا۔ آخر کار۔ ۷ ار نومبر کے ڈریس ریہرسل میں جس کے مہمان خصوصی کمانڈنٹ اور مسز کمانڈنٹ تھے مجھ سے غلطی ہوئی اور پردہ وقت سے پہلے کھینچ لیا۔ انہوں نے فوراً نوٹ کیا اور پردہ کے پیچھے آ کر اتنے زور سے میری کلائی مروڑی کہ میں گھبرا گیا اور پھر شرمندہ ہوا اور زندگی بھر کے لیے سبق یہ سیکھا کہ چھوٹی سے چھوٹی بات کی تیاری ضرور کرنی چاہیے۔

ان کی علالت کے آخری زمانہ میں سی ایم ایچ جہلم میں ہم چند سینئر لڑکے ایک دو بار انہیں دیکھنے گئے تو انہیں سختی سے منع کر دیا۔ آپ لوگ ہر روز نہ آیا کریں پڑھا کریں۔ ہم نے یس سر کہا اور مزید کچھ دیر بیٹھنے کی اجازت چاہی وہ حد سے زیادہ کمزور ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد فرمایا اگر آپ لوگ برا نہ مانیں تو میں دوسری طرف کروٹ بدل لوں۔ آپ باتیں کرتے رہیں میں سنتا رہوں گا۔ اللہ اکبر! یہ اخلاق تھا۔ ہم نے محسوس

کیا کہ اگر ان کے بدن کو تھوڑا سا دبایا جائے تو شاید انہیں کچھ سکون ہو۔ ہم نے دبانے کی اجازت چاہی۔ فرمایا سنا ہے کہ بخار کی حالت میں بدن دبانے سے بخار تیز ہوجاتا ہے۔ آپ یہ تکلیف نہ کریں۔ ہم نے اصرار کیا تب کہیں جاکر انہوں نے ہمیں تھوڑا سا دبانے کی اجازت دی۔ وہ بھی غالباً ہماری دلداری کے لیے وہ وقت جو اس عظیم انسان اور استاد کی براہِ راست تیمار داری میں صرف ہوا، میری زندگی کا بہت قیمتی سرمایہ ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔ اس حقیقت کا ادراک کم از کم مجھے علوی صاحب کے حوالے سے ہوا۔

——— جی سی زاھد محمود[1]

سر علوی برسہا برس تربیت (عالمگیرین) کے اردو سیکشن کے ایڈیٹر رہے۔ رسالہ کے مضامین کے آخر میں جو جگہ بچ جاتی تھی وہ اپنی ذاتی Book of Quotations سے پُر کرتے تھے۔ ان مختصر اقوال، اقتباسات یا تبصروں کے حوالے سے ان کے ذہن و تخیل کی بلندیوں اور مطالعہ کی وسعتوں کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اس امر کا بھی کہ وہ اپنے طلبار کی فکری تربیت کس سطح پر کر رہے تھے اقتباسات کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

تعریف کرنے والا ظاہر کرتا ہے کہ کچھ دے رہا ہے مگر اصل میں چاہتا ہے کچھ اور لینا (نٹشے)

وہی لوگ اکثر غلطی پر ہوتے ہیں جو غلطی پر ہونا برداشت نہیں کرتے (لارا شفوکو)

ہم سادہ ترین لفظوں کا مطلب بھی نہیں جانتے مگر ہاں صرف اس وقت جب ہمارے دل میں محبت اور آرزو ہو۔ (ایمرسن)

فن کاری میں شان و شوکت، مظاہرہ بدتہذیبی ہے۔ سچے فن کار کی تخلیق میں انکسار ہوتا ہے۔ (ٹیگور)

میں انسانیت پر بڑا ایمان رکھتا ہوں۔ انسانیت سورج کی طرح ابر میں چھپ سکتی ہے مگر اس کا شعلہ بجھ نہیں سکتا۔ (ٹیگور)

کوئی تہذیب اس وقت تک صحت مند اور طاقت ور رہ سکتی ہے جب تک اس

---

[1] کالج نمبر ۳۰ ۴۹ د زمانہ تعلیم ۸۷-۱۹۸۲ء وائس پریذیڈنٹ کالج ڈیبیٹنگ سوسائٹی ۸۷-۱۹۸۶ء

کے دل میں کوئی بڑا تخلیقی مقصد موجود ہو، جو اس کے افراد کو ایک ہم آہنگی کے رشتے میں پرو دے۔
(ٹیگور)

ہر انتہائی حقیقت بھی حقائق کے ایک نئے سلسلے کی محض ابتدا ہوتی ہے۔ ہر شخص کی حیثیت اس دنیا میں اس قدر ایک کارکن کی نہیں ہے۔ جتنی ایک اشارے کی۔ اس طرف اشارہ کہ وہ کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ تمام انسان آنے والے زمانے کی چلتی پھرتی پیشین گوئیاں ہیں۔
(ایمرسن)

کوئی نیکی آخری یا انتہائی نہیں ہے۔ سب ابتدائی ہیں۔ عام لوگوں کی نیکیاں اولیاً کی خامیاں ہیں۔
(ایمرسن)

بے وقوف بننے کا سب سے یقینی طریقہ ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ ہوشیار سمجھنا۔
(لاراشفوکو)

اصل چیز یہ ہے کہ "مجھے کیا کرنا چاہیے" یہ نہیں کہ "لوگ کیا کہتے ہیں۔" دنیا میں رہ کر دنیا والوں کی رائے پر چلنا آسان ہے۔ اور تنہائی میں رہ کر اپنی رائے پر۔ لیکن بڑا آدمی وہ ہے جو عوام کے ہجوم میں رہ کر بھی پوری خوش مزاجی کے ساتھ تنہائی والی خود فکری پر قائم رہے۔
(ایمرسن)

اپنی ذات پر قائم رہو کسی کی نقالی مت کرو۔ تم اپنے گن ہر لمحہ نمایاں کر سکتے ہو لیکن اگر کسی دوسرے کی صفات اختیار کرو گے تو ان پر تمہارا قبضہ محض اوپری اور ادھورا ہو گا۔
(ایمرسن)

بچے اور استاد

تم اپنی محبت اپنے بچوں کو دو جس قدر دے سکو مگر اپنا تخیل ان کے حوالے نہ کرو اس لیے کہ ان کو تمہارے تخیل کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنا تخیل اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ تم سب کمانیں ہو جن سے تمہارے بچے تیروں کی طرح نکل کر فضا میں اپنا راستہ پیدا کرتے ہیں۔

معلّم اگر سمجھدار ہے تو یہ نہیں کہتا کہ میرے خانۂ عقل میں چلے آؤ، بلکہ خود تمہارے

دل کے آستانے کی طرف تم کھلا سنہ بنانا ہے۔ (خلیل جبران)

انسانی قانون کو صرف دو شخص توڑ سکتے ہیں۔ پاگل اور جینئس یہی دو انسان روحِ کائنات سے قریب ترین ہوتے ہیں۔ (خلیل جبران)

کسی نظریئے کی ایک بڑی دلکشی یہ بھی ہے کہ اس کی تردید کی جا سکے یہ باریک بین ذہنوں کو اس کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ (نطشے)

میں نے کوئی ایسی غلطی ہوتے نہیں دیکھی جس کا میں خود مرتکب نہ ہوا ہوں یا نہ ہو سکتا ہوں۔ (گوئٹے)

تاریخ نویسی بھی ماضی سے پیچھا چھڑانے کا ایک ڈھنگ ہے (گوئٹے)

ایک مختصر گیت :

موسم خریف میں میں نے اپنے تمام غموں کو اکٹھا کر کے اپنے باغ میں دفن کر دیا جب موسم بہار آیا اور گرمی زمین سے ازدواج کرنے آئی تو میرے باغ میں جو پھول اُگے وہ بے انتہا حسین، رنگین اور دوسرے تمام پھولوں سے مختلف تھے۔

میرے پڑوسی میرے پھولوں کو دیکھنے آئے اور سب نے مجھ سے کہا:

"اب کی مرتبہ جو موسم خریف آئے اور بیج ڈالنے کا وقت آئے تو تم ان پھولوں کے تھوڑے سے بیج ہمیں بھی دینا۔ ہم بھی ان کو اپنے باغ میں بوئیں گے۔ (خلیل جبران)

سائنس اور آرٹ ایک دوسرے سے اتنا قریبی تعلق رکھتے ہیں جیسے پھیپھڑے اور دل اگر ان میں سے ایک خراب ہو جائے تو دوسرا بھی اپنا کام ٹھیک نہیں کر سکتا۔ (ٹالسٹائی)

آپ خوشی کی تلاش میں نکلیں تو وہ آپ کو چکمہ دیتی رہے گی لیکن اگر آپ اپنے کام میں دل و جان سے منہمک ہو جائیے کسی مقصد کی دھن میں لگ جائیے۔ اپنے آپ کو خود پسندی اور خواہشوں کے اس خود غرضانہ گڑھے سے نکال کر جسے اپنی ذات کہتے ہیں۔ خود کو کسی ایسی چیز کے سپرد کر دیجئے جو آپ کی ذات سے عظیم تر ہو۔ پھر آپ پیچھے مڑیں تو دیکھیں گے کہ خوشی آپ کو حاصل ہو رہی ہے۔ (پروفیسر جوڈ)

اگر یہ صحیح ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اور غیر متوقع ہمیشہ واقع ہوتا ہے تو انسان اپنے تجربے سے سبق لینے میں کتنا نااہل رہا ہے۔ (برنارڈ شا)

شاعری:

شاعری بہترین اور مسرور ترین انسانی دماغوں کے بہترین اور مسرور ترین لمحوں کی یادگار ہے۔ شاعری انسان میں "الوہیت" کی کبھی کبھی نظر آنے والی جھلکیوں کو فنا ہونے سے بچا لیتی ہے۔

شاعری دنیا کے چہرے سے مانوس پن اور عامیانہ پن کے نقاب کو ہٹا دیتی ہے اور اس خوابیدہ حسن و جمال کو عریاں کر دیتی ہے جو صورتوں کے پیچھے روح بن کر جا گزیں ہے۔

شعر آئینہ ہوتے ہیں مستقبل کی ان عظیم و سیع پرچھائیوں کا جو "حال" پر پڑتی ہیں۔

شعرا دنیا کے غیر تسلیم شدہ قانون ساز ہیں۔ (شیلے)

بڑے اور چھوٹے:

میں نے ایک تالاب سے سمندر کا حال بیان کیا تو اس نے مجھے ایک تخیل پرست افسانہ طراز سمجھا جو مبالغے سے کام لے رہا ہے۔ اور جب میں نے سمندر کو تالاب کا حال سنایا تو اس نے مجھے ایک افترا پرداز انسان سمجھا جو کسی کی ہجو کر رہا ہے۔ (خلیل جبران)

بڑائی کی نشانیاں:

اپنے فرائض کو ہر شخص کے فرائض بنا دینے کی پستی ہرگز گوارا نہ کرنا اپنی ذمہ داریوں سے دست بردار نہ ہونا۔ نہ ان میں کسی کی شرکت چاہنا اپنے خصوصی حقوق کو اور ان کے استعمال کو اپنے فرائض میں شمار کرنا۔ (نطشے)

سب سے بڑی خامی میرے خیال میں یہ ہے کہ اپنی خامیوں کا احساس نہ ہو۔

(کارلائل)

یاد رکھیے! دنیا کی حسین ترین چیزیں وہ ہیں جو بیکار ترین ہیں۔ مثلاً مور اور گل نیلوفر۔

(رسکن)

زندگی بیشتر جھاگ اور پانی کے بلبلوں کی طرح ہے۔ لیکن اس میں دو چیزیں ایسی ہیں جو چٹان کی طرح مستحکم ہیں: دوسرے کے دکھ میں ہمدردی اور اپنے دکھ میں حوصلہ۔

(ایڈم لنڈسے گارڈن)

اگر ایک طبیب تمام بیماریوں کا ایک ہی نسخہ لکھے اور ایک ہی دوا سے علاج کرے تو یہ اکثر مریضوں کی ہلاکت کا باعث ہوگا۔ بالکل یہی حال معلّم کا ہے اور اگر وہ اپنے زیرِ تربیت لڑکوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے تو انہیں برباد کر دے گا۔ ان کے دلوں پر موت طاری کر دے گا اس کا فرض ہے کہ ہر شاگرد کے حال، عمر اور مزاج کے مطابق اس کی رہنمائی کرے۔ (امام غزالیؒ)

صرف ایک چیز ایسی ہے جس سے ہمیں خوف کھانا چاہیے۔ وہ ہے خوف۔
(فرینکلن ڈی روز ویلٹ)

بابا آدم نے سیب اس لیے نہیں کھایا تھا کہ انہیں پسند تھا بلکہ اس لیے کھایا کہ وہ ممنوعہ تھا۔ (مارک ٹوین)

یہ سارے اقتباسات "تفکر" کو جگاتے ہیں۔ کچھ سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہی علوی صاحب تھے۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز

—— آصف سعید[۱]

علوی صاحب قبلہ نے ہماری کلاس آٹھویں اے کو ۱۹۸۳ء میں انگریزی پڑھائی تھی۔ کتاب میں ایک سبق شاہ عبداللطیف بھٹائی پر تھا۔ چونکہ بھٹائی صوفی شاعر تھے اس لیے انہوں نے سبق شروع کرنے سے پہلے ہمیں بتایا کہ صوفی شاعر کیا ہوتا ہے یہ تصورات ہمارے لیے بالکل نئے تھے۔ یوں بھی آٹھویں درجے کے طلبہ کو شاعری کا شعور کیا ہوتا ہے جو وہ صوفیانہ شاعری کے تصور کو سمجھتے بہر حال انہوں نے بہت سادہ لفظوں میں شریعت اور تصوف کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں۔ لفظ تصوف کے معنی بھی بتائے پھر تصوف کی تاریخ بھی بتائی۔ اصحاب صُفّہ کا تذکرہ کیا بنو امیہ کے زمانہ بنو عباس کے دورِ حکومت کے بارے میں گفتگو کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ منصور حلاج کے نعرہ انا الحق کی وضاحت بھی کی کہ انا الحق میں خدا ہوں کا اصل مطلب کیا ہے۔ انہوں نے اس

---

[۱] آصف سعید۔ ڈی سی ایس ۶۳ زمانہ تعلیم از ۱۹۸۳ تا ۱۹۸۸ء

سلسلہ میں جو کچھ کہا اس کا مطلب کم از کم میں یہ سمجھا کہ جب خدا سے سچا تعلق پیدا ہو جائے تو پھر انسان سزا و جزا سے بلند ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ کی رضا چاہتا ہے اور بس۔ مجھے یاد پڑتا ہے انہوں نے اس سلسلہ میں حضرت رابعہ بصری کا ذکر بھی کیا تھا جو ایک دن بصرہ کی گلیوں میں ایک ہاتھ میں چراغ اور دوسرے میں پانی کا کوزہ لے کر جاتی نظر آئیں۔ لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ حضرت یہ کیا ماجرا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ جی چاہتا ہے کہ اس چراغ سے جنت کو آگ لگا دوں اور اس کوزہ سے دوزخ کی آگ کو بجھا دوں یہ واقعہ سُنا کر علوی صاحب نے غالب کا یہ شعر سُنایا۔

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

پھر انہوں نے برصغیر پاک وہند کے صوفیاء کے بارے میں بتایا۔ داتا گنج بخشؒ نظام الدین اولیاؒ۔ شاہ معین الدین اجمیری۔ بابا فرید۔ مجدد سرہندی وغیرہ بے شمار صوفیوں کا تذکرہ کیا اور اس بات پر زور دے کر کہا کہ ہندوستان میں اسلام سلاطین نے نہیں پھیلایا۔ یہ صوفیاء کی کرامت، ان کا اثر تھا کہ ہند کے بت کدہ میں اسلام کی روشنی پھیلی۔ یہاں تک پہنچ کر انہوں نے یہ سوال بھی پوچھا تھا کہ آخر صوفیا اسلام پھیلانے میں کیوں اتنے کامیاب ہوئے ہم کیا جواب دیتے۔ آخر خود فرمایا اس لیے کہ انہوں نے ذات پات کے مارے ہندوؤں کے نچلے طبقہ کو اسلام کا اخوت اور عدل و مساوات کا پیغام دیا تھا۔ اسلام سلامتی کا مذہب ہے ان صوفیا کی اپنی زندگی دردمندی، سادگی، محبت اور خدمت کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ یہ مردان باصفا اسلام کے پیغام کی روح کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کا پیغام محبت کا تھا جو دور دور تک پہنچا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی، اردیں صدی میں سندھ کے مقام بھٹ پر یہی دردمندی، اخوت اور خدمت کا پیغام لے کر بیٹھے۔ وہ صحیح معنوں میں صوفی تھے۔ ان کی شاعری سندھی میں ہے اس کا ترجمہ اردو انگریزی بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ میں نے پوچھا سر یہاں لکھا ہے کہ وہ موسیقی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک ساز بھی ایجاد کیا ہاں یہ صحیح ہے کہ وہ موسیقی کے بھی ماہر تھے۔ ان کی شاعری میں بھی گمبھیر موسیقی ہے۔ بھٹائی کی سی موسیقی اسلام میں جائز ہے۔ پھر انہوں نے صوفیا

کے کسی سلسلہ کا ذکر کیا جس میں سماع عام ہے۔ مولانا روم کے مرید قونیہ (ترکی) میں آج بھی ایک خاص قسم کی موسیقی کے ساتھ رقص کرتے ہیں، وہ Whirling Derveshes کہلاتے ہیں۔ مثنوی روم بھی ایک خاص دھن میں گائی جاتی ہے۔

پھر ۸۷-۱۹۸۶ء میں علوی صاحب سے گیارھویں اے میں زیرو پریڈ میں استفادہ کا موقع ملا۔ وہ ہمارے اردو کے استاد تھے۔ اردو کی کتاب میں امتیاز علی تاج کا ڈرامہ آرام وسکون تھا۔ علوی صاحب نے پہلے ڈرامہ کی تاریخ بتائی۔ گریک ڈرامہ سے شروع کیا۔ شکسپیئر اور برنارڈ شا کا ذکر بھی آیا۔ سنسکرت ڈرامہ میں شکنتلا اور میگھ دوت، بنگالی میں ٹیگور کے بارے میں بتایا۔ اردو ڈرامہ میں امانت کی اندرسبھا کا تعارف کرایا، پھر بمبئی کی تھیٹریکل کمپنیوں کا ذکر کیا۔ جب منشی حضرات ڈرامہ یا ناٹک لکھتے تھے۔ بیسویں صدی کے شروع کے آغا حشر کے ڈراموں، صید ہوس، یہودی کی لڑکی، رستم سہراب وغیرہ کا تفصیلی تعارف کرایا تھا۔ آغا حشر کے ڈراموں میں جو مزاحیہ کردار ہیں ان کا ذکر بھی کیا۔ پھر امتیاز علی تاج کے مشہور ڈرامہ انار کلی پر بحث کی۔ ان کے ریڈیائی ڈراموں جیسے قرطبہ کا قاضی کا بھی ذکر کیا۔ آخر میں آغا حشر اور امتیاز علی تاج کے ڈراموں کا تقابلی مطالعہ مرکزی خیال پلاٹ کردار نگاری، مکالموں کے لحاظ سے کیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ انھوں نے مرزا ادیب کے ڈراموں جیسے شیشے کی دیوار، لہو اور قالین وغیرہ کا ذکر بھی کیا تھا۔ ٹی وی کے ڈراموں میں خدا کی بستی، ایک محبت سو افسانے، انکل عرفی وغیرہ پر بھی باتیں ہوئیں۔

گھنٹہ پر گھنٹہ ختم ہو جاتا لیکن علوی صاحب کی وضاحتیں، تشریحیں، تاریخی پس منظر کے حوالے ختم نہ ہوتے۔ علوی صاحب نے محمد علی جوہر کا ایک شعر سنایا تھا۔

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا دور
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

جو کوئی بھی ان کی کلاس سے نکلتا اس کی دنیا بدل جاتی تھی۔

علوی صاحب کی کلاس میں دستور زباں بندی نہیں تھا۔ وہ علم کی طلب کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ اصل میں طالب علم وہ ہے جو علم کو خود طلب کرے

تلاش کرے، حاصل کرے، علم کو طلب کرنے کی ایک صورت سوال کرنا ہے جو نہ معلوم ہوا سے معلوم کرنا چاہیے۔ اس لیے وہ سوال پوچھنے کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے خصوصاً وہ سوال جن کا تعلق حالات حاضرہ سے ہوتا۔ وہ خود بھی ان امور پر روشنی ڈالتے تھے۔ جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں ان دنوں لبنان میں فلسطینیوں کے دو کیمپوں صابرہ اور شتیلا میں اسرائیلی فوجیوں نے وحشیانہ قتل عام کیا تھا جس کی لرزہ خیز تفصیلات اخبارات میں آ رہی تھیں۔ ایک روز ان سے پوچھا" سر یہ اسرائیل چیز کیا ہے جس نے اتنا طوفان بپا کر رکھا ہے"؟ ثاقب کے اس سوال سے وہ بہت خوش ہوئے فرمایا۔ ہم سب کو اور خاص طور پر طالب علموں کو حالات حاضرہ میں ضرور دلچسپی لینا چاہیے اسرائیل پاکستان کا بھارت کی طرح دشمن نمبر ون ہے۔ عراق کے ایٹمی ری ایکٹر کو اتنی دیدہ دلیری سے تباہ کرنے کے بعد اب اس کی حریفانہ نظریں کہوٹہ پر ہیں۔ پھر انہوں نے اسرائیل کی نسلی اور سیاسی تاریخ تفصیل سے بتائی۔ سیاسی تاریخ کے سلسلہ میں لارنس آف عریبیہ، شریف آف مکہ کا بھی ذکر کیا انہوں نے زور دے کر کہا موجودہ اسرائیل کی داغ بیل تو ۱۹۱۸ء میں اعلان بالفور کے ذریعہ برطانیہ بہادر نے ڈالی تھی لیکن اس کو عملی طور پر ممکن امریکہ نے بنایا۔ ان کے اصل الفاظ یہ تھے۔ Israel is the illegitmate child of Britain fathered by America

انہوں نے اس امر کی وضاحت بھی کی کہ کس طرح اسرائیل تمام مغربی دنیا اور خاص طور سے امریکہ کے سیاسی اور معاشی مفادات کی حفاظت کر رہا ہے۔ اس کا تعلق اسرائیل کی سٹریٹیجک پوزیشن اور مڈل ایسٹ کی تیل کی دولت سے ہے وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں کسی نے پوچھ لیا" سر اسرائیل کو اسرائیل کیوں کہتے ہیں؟ اس کا جواب بھی انہوں نے تفصیل سے دیا۔ حضرت ابراہیمؑ کی پہلی بیوی حضرت سارہؓ کے بیٹے حضرت اسحاقؑ تھے۔ ان کے بیٹے حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل تھا۔ حضرت یعقوب کے سلسلہ نسب بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰؑ وغیرہ بہت سے انبیاء اور پیغمبر ہوئے ہیں۔ یہودی اسی سلسلہ کی چیز ہیں۔ یہاں انہوں نے یہودیت (Zionism) کی تاریخ بھی بتائی تھی اور بتایا

تھا کہ یہودیوں کے عزائم تو یہ ہیں کہ مدینہ، شام، عراق سب علاقوں پر قبضہ کیا جائے۔ انہوں نے کسی کتاب کا تذکرہ بھی کیا تھا جس میں اسرائیل کے جارحانہ توسیعی منصوبوں کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے اسی سلسلہ میں یہ بھی بتایا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی دوسری بیوی حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل تھے۔ رسول اللہ آل اسماعیل ہی میں مبعوث ہوئے۔ بیشتر مسلمان عربوں کا نسلی تعلق آل اسماعیل سے ہے۔

علوی صاحب بہت گہرائی میں جاکر پڑھاتے تھے۔ انہوں نے اپنے طالب علموں کو صحیح معنوں میں طالب علم بنایا اس وقت آٹھویں درجہ میں ہمیں یہ باتیں دورازکار بلکہ بیکار نظر آتی تھیں۔ اب آکر ان کی قدر معلوم ہوئی ہے۔ ہفتہ میں ایک آدھ دن نصاب سے ہٹ کر اس طرح کی باتیں ہو جاتی تھیں۔ نصابی سبق ہی سے بات چل نکلتی تھی۔ ایک روز یاد نہیں کس حوالے سے یہ بتایا کہ کبھی کبھی ایک شعر یا ایک نظم سے کوئی شاعر ادب میں ایک مقام حاصل کر لیتا ہے یا کسی بڑے شاعر یا ادیب کی کوئی چیز اس طرح مشہور ہو جاتی ہے کہ اس کی دوسری تخلیقات یا اس کی شخصیت کے دوسرے پہلو پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ شعر کی مثال کے طور پر شعر سنایا۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینہ کے داغ سے　　اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

فرمایا اس کا دوسرا مصرعہ معرکے کی چیز ہے۔ ایک نظم کس طرح ایک معروف شاعر کو زندہ جاوید بنا دیتی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے خوشی محمد ناظر کی نظم جوگی کا حوالہ دیا۔ چونکہ وہ اس وقت ہم میں سے کسی نے نہیں پڑھی تھی۔ انہوں نے اس نظم کے بعض ٹکڑے مثلاً جوگی کا ناظر کو جواب۔

کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لیے آکے ستاتے ہو
میں پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں آکے پھنساتے ہو
ہم حرص وہوا کو چھوڑ چکے اس نگری سے منہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے تم لاکے وہی پہناتے ہو
تم پوجا کرتے ہو دھن کی ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی۔

ہم جوت جگلتے ہیں من کی تم اسکو آکے بجھاتے ہو۔

اسی سلسلہ میں طبا طبائی کی نظم "گورِ غریباں" کا ذکر بھی کیا۔

وداعِ روز روشن ہے گجر شام غریباں کا | چراگاہوں سے پلٹے قافلے ہیں بے زبانوں کے
خدا جانے تھے ان لوگوں میں کتنے جوہر قابل | خدا معلوم رکھتے ہوں گے یہ ذہن رسا کیسے
بہت سے گوہر شہوار باقی رہ گئے ہوں گے | کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہہ میں سمندر کے
ہزاروں پھول دشت دور میں ایسے بھی کھلے ہونگے | کہ جن کے مسکرانے میں ہے خوشبو مشک اذفر کی

اسی سلسلہ میں فرمایا۔ انار کلی امتیاز علی تاج کا پہلا ڈرامہ ہے بالکل نوجوانی کے دور کا۔ ۱۹۲۴ء میں چھپا۔ اس وقت تاج صاحب کی عمر بھی ۲۴ برس تھی۔ وہ ۱۹۷۰ء تک جیے بہت کچھ لکھا اور پروڈیوس کیا لیکن آج بھی مشہور انارکلی کے حوالے ہی سے ہیں۔ سنسکرت کے ڈرامہ نگار کالی داس نے اور بہت سے ڈرامے لکھے ہیں لیکن اس کی شہرت کا باعث شکنتلا ہے۔ عمر خیام رباعیات کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے حالانکہ وہ بلند مقام ہیئت داں اور ریاضی داں بھی تھا اگر گھنٹہ نہ ختم ہوجاتا تو خدا معلوم وہ کتنی مثالیں اور دیتے یہ ان کا طریقۂ تدریس تھا کہ علم کے دریچے کھولتے جاتے انہوں نے اتنا پڑھ رکھا تھا اور اس سے زیادہ اتنا سوچ رکھا تھا اور چاہتے تھے کہ کچھ ہم بھی پڑھیں اور سوچیں۔ جو عنوانات وہ ہمیں مضمون لکھنے کے لیے دیتے وہ بالکل انوکھے ہوتے جیسے اخباروں کے بغیر زندگی ایک ٹوٹی کرسی کی داستانِ غم، بلیک بورڈ کی آپ بیتی وغیرہ وہ ذہنی Originality کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اس لیے امتحان میں ان سے نمبر لینا آسان نہ تھا۔ گھسے پٹے فقروں اور طریقوں سے ان کی مستقل دشمنی تھی۔ انہوں نے طلبا کی ایک نہیں کئی نسلوں کو عمومیت Mediocrity کی دلدل سے نکالا۔ اور اپنے ذہن سے سوچنا سکھایا۔

وہ ڈبیٹنگ سوسائٹی کے انچارج بھی تھے، انگریزی، اردو کے انٹر ہاؤس مقابلوں کے لیے کم از کم ۴۰ لڑکوں کو وہ تیار کرتے تھے۔ یہ گھنٹوں کا کام تھا۔ خود لڑکے تھک جاتے تھے بلکہ اصلاح لیتے لیتے عاجز آجاتے تھے لیکن وہ نہیں تھکتے تھے کبھی کبھی ایک لفظ کا تلفظ دس دس بار ٹھیک کرنا یا کسی خاص فقرے کو ایک خاص انداز سے ادا کرنے

کی دس دس منٹ تک مشق کرانا معمولی بات تھی ایسے موقعوں پر نہ تو جھنجھلاتے اور نہ کوئی ایسا فقرہ یا جملہ کہتے جس سے کوئی لڑکا بد دل ہو یا احساس کمتری کا شکار ہو۔ ایسے موقعوں پر بیوقوف کہہ دینا اتنی بڑی بات نہیں ہوتی لیکن کم از کم میری موجودگی میں انہوں نے یہ بھی نہیں کہا۔

وہ بے حد سنجیدہ صورت تھے۔ بظاہر مزاج بھی سنجیدہ تھا۔ لیکن طبیعت میں مزاح بہت تھا۔ خوش دلی سے ایسا فقرہ چست کر دیتے کہ لطف آجاتا اور فضا یکسر بدل جاتی ایک بار فیملی پلاننگ پر گفتگو ہو رہی تھی کہنے لگے اگر کسی معجزہ سے ایسا انتظام ہو سکتا کہ ایک بار بیوی بچہ پیدا کرے، دوسری بار میاں تو شاید چوتھے بچے کی نوبت نہ آتی۔ یہ سن کر ہنس ہنس کر ہمارا برا حال لیکن وہ ایسے خاموش بیٹھے تھے کہ جیسے کچھ کہا ہی نہیں۔

سر علوی کے شاگردوں نے جب بھی ان سے کوئی سوال پوچھا یا مشورہ مانگا یہ کبھی نہ ہوا کہ انہوں نے اپنی مصروفیت کے باوجود جواب نہ دیا ہو یا وقت نہ دیا ہو ہم کیڈٹ ان سے اکثر اپنی تقاریر اور مضامین درست کراتے۔ وہ یہ زائد اور دقت طلب، کام خوش دلی سے کرتے رہتے تھے میں اس کی وضاحت ایک مثال سے کروں گا۔ ۸۶-۱۹۸۵ء کے سال کے لیے میں بزم ادب کا سیکرٹری رہا۔ جب میں نے چارج لیا بزم ادب دوبارہ احیاء کی ابتدائی منازل میں تھی اور مجھے بھی اندازہ نہ تھا کہ یہ کام کیسے کیا جاتا ہے پہلے اجلاس کے لیے میں ایک کتاب پر تبصرہ بھی کرنا چاہتا تھا اور مشورہ حاصل کرنے کے لیے سر علوی سے زیادہ موزوں کون ہو سکتا تھا۔ جب تین بجے ان کے دیئے ہوئے وقت پر ان کے گھر پہنچا تو سر کچھ دیر پہلے ہی کالج سے واپس آئے تھے اور کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد وہ فوراً میرے پاس آبیٹھے۔ اس دن میں دو گھنٹے سے زیادہ ان کے پاس رہا اور اس دوران چائے بھی پی۔ سر نے نہ صرف کالج میں بزم ادب کی روایات پر روشنی ڈالی بلکہ The Hundred وہ کتاب جس پر لکھنا چاہتا تھا زیر بحث آئی The Hundred چونکہ یہ شخصی خاکوں پر مشتمل کتاب ہے اس حوالے سے اور کتابوں کا بھی ذکر آیا۔ مغربی ادب اور پھر ہندوستان میں شخصیت نگاری پر بھی بات ہوئی۔ اس دن سر نے تنقید اور ادبی تنقید کا فرق بھی بتایا اور ادبی

تنقید کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی۔ بات سے بات نکلتی رہی بھٹو اور پاکستان کی خارجہ پالیسی، ملکی صورت حال، ڈیورنڈ لائن، پاک افغان سرحد کی بھی بات ہوئی۔ افغانستان میں آنے والے انقلاب کی بھی سر نے وضاحت کی۔ ان دو ڈھائی گھنٹوں میں جتنا کچھ معلوم ہوا وہ شاید بیسیوں کتابیں پڑھنے سے بھی حاصل نہ ہوتا۔

سر علوی نے ہماری آخری کلاس بروز بدھ چھٹے پیریڈ میں ۲۰ر جنوری کو لی اور یہ شاید ان کی آخری کلاس بھی تھی۔ مجھے یاد ہے کلاس کے فوراً بعد میں نے سڑک پر کھڑے کھڑے سر سے ایک شعر کا مطلب پوچھا۔ شعر یہ تھا۔

تمہارے خط میں اک نیا سلام کس کا تھا
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا

سر علوی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا "کوئی خاص بات نہیں، جیلس ہونا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کا بتنگڑ بنانا ہمارے شاعروں کی عادت رہی ہے۔" ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی شاید وہ غلام علی کی گائی ہوئی اس غزل کی تشریح کی درخواست میں میرا اصل مطلب سمجھ گئے تھے پھر چلتے چلتے کہا۔ آصف! داغ کے اس شعر میں جو بلاغت ہے جو لطیف طنز ہے۔ وہ شاعر کا کمال ہے۔ اچھے شعر کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ اس میں چونکا دینے والی کیفیت ہوتی ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے یہ اچھا شعر ہے باقی کچھ نہیں۔

سر علوی کے علم کی وسعت کا اندازہ کسے نہیں ہے لیکن مجھے سر کی گفتگو سننے کا موقع ۸ر نومبر ۱۹۸۶ء کے ایک سفر کے دوران میسر آیا، سر علوی، سر راشد اور کیپٹن شبیر حسین ڈرامہ کے کسی کام سے لاہور جا رہے تھے۔ میں نے ساتھ جانے کی اجازت چاہی۔ سفر میں گفتگو زیادہ تر سر علوی اور سر شبیر کے درمیان ہوئی۔ سر شبیر کوئی مسئلہ چھیڑتے تھے اور سر علوی اس کا تفصیل سے جواب دیتے۔ بات جرمنی کی کاروں سے شروع ہوئی اور جرمنی تاریخ، معاشرہ تہذیب، قومیت اور پھر نان گوئٹے کے پیام مغرب پر ٹوٹی جس کے جواب میں اقبال نے پیام مشرق لکھی۔ جرمن، انگریزی ادب اور ادیبوں کا تقابل بھی ہوا۔ سر علوی جس بے ساختگی اور روانی سے ادیبوں، کتابوں کے حوالے دے رہے تھے، وہ میرے لیے باعث حیرت

تھا۔ واپس آتے ہوئے پبلک سکول ایجوکیشن زیر بحث رہی اور پھر آخر میں ادبیات پر بحث چل نکلی۔ تمام موضوعات پر سر علوی کا علم اور ان کا مطالعہ ناقابل یقین حد تک وسیع تھا۔

سر راشد نے علوی صاحب کے انتقال کے دوسرے روز موتی ہال میں اپنی تعزیتی تقریر میں کہا جو لوگ رہتے ہی پہاڑوں پر ہیں انہیں پہاڑوں کی بلندیوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ان الفاظ کی صداقت کا شعور مجھے آج ہو رہا ہے جبکہ علوی صاحب ہمارے درمیان نہیں۔ میں اپنے تاثرات اور یادیں ٹینی سن Tennyson کے ان مصرعوں پر ختم کرتا ہوں:

But for the touch of a vanished hand
And the sound of a voice that is still

— ابرار حسین[۱]

میں علوی صاحب کا صرف ایک فقرہ نقل کروں گا جس نے مجھے سوچنا سکھا دیا۔ آج کی دنیا میں یہ کہنا کہ غریبوں کی مدد کرو محتاج کو کھانا کھلاؤ کافی نہیں۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ کون نظام غریبی کو جنم دے رہا ہے۔ کس طرح کی حکومت دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو ہوا دے رہی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کا پیٹ کاٹ کر دو کا سخاوت سے پیٹ بھر دینے کا نام ہمدردی نہیں ہے۔

— ذوالفقار احمد[۲]

علوی صاحب اردو کے حوالے سے ہمیں تاریخ خاص طور پر مسلمانوں کی تاریخ پڑھاتے بلکہ تاریخ کا مطالعہ کرنا سکھاتے تھے۔ تاریخ سے بات حال تک پہنچی اور پھر بہتر مستقبل کی تعمیر کے مسئلہ پر گفتگو ہوتی۔ ایک بار کلاس میں اقبال کا یہ قطعہ زیر بحث تھا۔

مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا — تو ان کو سکھا خارا شگافی کے طریقے
دارو کوئی سوچ ان کی پریشان نظری کا — دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی

---

[۱] کالج نمبر ۴۵۹۱ زمانہ تعلیم ۸۸-۱۹۸۳ء ہاؤس پریفیکٹ شیر شاہ ہاؤس، بابر ہاؤس۔

[۲] کالج نمبر ۴۵۹۸ زمانہ تعلیم ۸۸-۱۹۸۳ء

یں نے اس کے نوٹس لیے پھر ان کو دکھائے انہوں نے کافی کانٹ چھانٹ کی بلکہ اس کو دوبارہ اپنے قلم سے لکھا۔ وہ نذر قارئین کرتا ہوں۔

علامہ اقبال کا ایک قطعہ

آپ جانتے ہی ہیں ایک شاعر کا دل بڑا حساس ہوتا ہے وہ تو کسی جاندار کو بھی دکھ یں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔ دوسروں کے درد سے اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ پھر آپ اندازہ لگائیے کہ جب وہ اپنے اہل وطن، اپنے اہل قوم کو پس ماندگی اور زوال کا شکار ہوتے دیکھے گا تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔

علامہ اقبال ایک غیر معمولی ذہن اور بیحد حساس دل رکھتے تھے۔جب وہ برعظیم کے مسلمانوں کو مغربی تہذیب کی غلامانہ تقلید کرتے اور اپنی شاندار روایات سے منہ موڑتے ہوئے دیکھتے تو ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ان کا یہ قطعہ اسی دکھ کا ترجمان ہے۔

تو ان کو سکھا خاراشگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس قطعے میں نئی نسل کے معماروں یعنی ہماری درسگاہوں کے اساتذہ سے خطاب کر رہے ہیں۔وہ یہاں اساتذہ کو ایک ایسا نظریۂ حیات بتا رہے ہیں جو اس مردہ قوم میں زندگی کی حرارت پیدا کر دے۔وہ کہتے ہیں کہ نئی نسل مغرب کی چمک دمک سے مرعوب ہو کر رہ گئی ہے لیکن اس نے مغرب سے پختگی یا طاقت کا سبق نہیں لیا بلکہ اس کے نزاکت اور نفاست والے پہلو میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔اب یہ ہمارے معلمین کا کام ہے کہ وہ نوجوانوں میں سخت کوشی کا جذبہ ابھاریں، ان کو مہم پسند بنائیں۔انہیں زندگی کی سختیوں کا مقابلہ کرنا سکھائیں۔ان کے اندر وہ ہمت اور طاقت پیدا کریں جو پہاڑوں کے دل چیر کر رکھ دے جو صحرا اور دریا کو دو نیم کر سکے۔اسی طاقت کو وہ "خاراشگافی" کے لفظ سے موسوم کرتے ہیں۔

یورپ کی ظاہری رنگینیوں نے انہیں گمراہ کر دیا ہے۔ انہیں نازک اور آرام طلب بنا دیا ہے۔ یورپ والے خود تو فولاد کی دیو ہیکل مشینیں ڈھالتے ہیں لیکن ہم کو تہذیب اور ادب آداب کے چکر میں پھنسا گئے اور ہم آج تک اسی بات پر فخر کر رہے ہیں کہ ہم مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ ہم مشینیں بنانے کے قابل تو نہیں ہوئے البتہ ان کی بنائی ہوئی مشینوں، کاروں، ہوائی جہازوں، ریفریجریٹروں، کمپیوٹروں اور برقی آلات کو استعمال کر کے پھولے نہیں سماتے۔ حالانکہ ہمیں چاہیے کہ اپنی اس حماقت پر ہنسیں۔

پھر وہ ہماری غلامی کے اثرات کا ذکر کرتے ہیں اس غلامی نے ان کے خیالات میں قوت نہیں رہنے دی۔ انہیں اپنے مقاصد اور روایات پر یقین نہیں رہا ان کا ذہن ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔ کبھی وہ کسی چیز کے پیچھے بھاگنے لگے تو کبھی کسی اور نقطہ نظر کی طرف جھکنے لگے۔ غرض ان کی رہی سہی قوت اس پریشان خیالی کی نذر ہو گئی۔ فرنگی حاکموں نے رفتہ رفتہ ان کی صلاحیتوں کو کچل دیا۔ ان سے زندگی کا حوصلہ اور مقابلے کی ہمت چھین لی۔ وہ اپنے آپ کو کمزور اور نااہل سمجھنے لگے۔ اپنی اس حالت پر کڑھنے لگے۔ علامہ کے الفاظ میں دو سو سال کی غلامی نے ان کا دل توڑ دیا۔ اب ہمارے معلموں اور ہمارے روحانی پیشواؤں یعنی مذہبی رہنماؤں کا یہ فرض ہے کہ اس پریشان نظری، اس بے چارگی اور بے ہمتی کا کوئی علاج معلوم کریں۔ لیکن ہمارے دینی رہنما اس کے برعکس ہمیں یہ سبق پڑھانے لگتے ہیں کہ دنیا ہمارے لیے نہیں ہے۔ ہمیں صرف آخرت کی فکر کرنی چاہیے ادھر دوسری قوموں کا یہ حال ہے کہ ہمارے مقابلے میں سائنس، ٹیکنالوجی اور خوش حالی میں وہ ہم سے کوسوں آگے نکل چکے ہیں اور ہماری ہمت اور بھی جواب دیتی جاتی ہے اس لیے اے عالم دین ہونے کا دعویٰ کرنے والو! تمہیں چاہیے کہ مسلمانوں کو اس دوڑ میں شریک ہونے کے قابل بناؤ۔ ان میں حالات سے جنگ کرنے کا حوصلہ پیدا کرو۔ محنت کا راستہ دکھاؤ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنا نقطۂ نظر بدلو۔ پرانے نسخے اس پیچیدہ بیماری میں کام نہیں آئیں گے۔ دنیا بدل رہی ہے۔ انسانی ضرورتیں بھی بدل رہی ہیں۔ اس لیے اپنے طریقے بھی بدلو تاکہ قوم کی پریشان نظری کا علاج کر سکو۔

——— یاسر منیر بٹ[1]

سر علوی کا پیریڈ تھا، وہ بڑے انہماک سے کوئی نکتہ سمجھا رہے تھے کہ ایک لڑکا بالکل بلاوجہ ہنس پڑا اور ان کے اشارے سے منع کرنے کے باوجود ہنستا رہا۔ اس پر ہنسی کا دورہ سا پڑا ہوا تھا۔ بڑی عجیب صورت حال تھی کہ استاد کی تنبیہ کے باوجود وہ ہنسے جا رہا تھا ہمارا خیال تھا کہ علوی صاحب غصہ میں آکر ضرور اسے کوئی سزا دیں گے لیکن ہوا یہ کہ وہ نہ غصہ میں آئے اور نہ سزا دی۔ پڑھانا روک کر اس سے کہا تم جس بات پر ہنس رہے ہو وہ ضرور کوئی بڑی ہنسی کی بات ہوگی ہم سب کو بتاؤ تاکہ ہم بھی ہنسیں۔ اس نے وہ بات بتائی عام سی بات تھی۔ سب لڑکے ہنس پڑے۔ علوی صاحب بھی خوب ہنسے۔ پھر مسکرائے اور مسکراتے ہوئے اسے سمجھایا کہ پیریڈ کے دوران ہنسی کے پٹاخے نہیں چھوڑا کرتے اور اگر ایسا زبردست لطیفہ یاد آگیا ہے جس کو روکنے سے پیٹ میں درد پڑنے کا امکان ہے تو بے شک سب کو سناؤ تاکہ سب اس سے لطف اندوز ہوسکیں۔ انہوں نے ہماری کلاس کو How he kept his promise ڈرامہ بھی کروایا تھا۔

——— عاکف مشتاق[2]

ڈائمنڈ جوبلی کے ڈرامہ کے سلسلہ میں ۲۵ راکتوبر ۱۹۸۶ء کو موسٰی ہال میں ڈرامہ کے لڑکے جمع ہوئے تو انہوں نے ڈرامہ کی تاریخ، فن اور غرض وغایت پر مختصر سی گفتگو کی ساتھ یہ بھی کہا کہ رول کوئی بھی دیا جائے اصل چیز ایکٹنگ ہوتی ہے جس کے لیے مہارت ہی نہیں ذہانت اور تخیل چاہیے کہ ان حالات میں یہ اصل کردار کیا کرتا، کیا کہتا اور کیسے کہتا وغیرہ وغیرہ۔ مجھے ان سے اس سے پہلے پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ ان کی یہ تمہیدی تقریر سن کر میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ میں بھی کتنا بدقسمت ہوں کہ ملٹری کالج میں تین برس رہا۔ اور اس کی سب سے قیمتی چیز کے فیض سے محروم رہا۔ جو نتشی ڈرامہ ہندو کلچر اور ذہنیت پر ایک طنز ہے۔ اس کلچر کی باریکیوں سے ہم سب ہی ناواقف تھے اور پھر مجھے ایک ہندو ماں کا رول کرنا تھا۔ دونوں کام مشکل بہر حال انہوں نے یہ رول سکھانے میں مجھ پر

---

[1] کالج نمبر ۶۷۸۹ء زمانہ تعلیم ۸۷-۱۹۸۴ء [2] کالج نمبر ۷۳۲۲ء زمانہ تعلیم ۸۹-۱۹۸۴ء

بہت محنت کی اور میرے حوصلہ کو قائم رکھا۔ مشکل مقامات پر چادر لپیٹ کر اسی طرح چل کر اور بول کر بتاتے تھے جو میرے کردار کا تقاضا تھا۔ ریہرسل کے اوقات مقرر تھے جن کی سختی سے پابندی لڑکے نہیں کر پاتے تھے لیکن علوی صاحب کو کبھی لیٹ ہوتے نہیں دیکھا بعض لڑکے غیر ذمہ داری کا ثبوت بھی دیتے تھے۔ جیسے چپکے سے واکنگ آؤٹ یا کسی بہانے سے دیک اینڈ چلے جانا۔ اس کو بھی وہ برداشت کرتے تھے۔

وہ بہت اچھے ڈائریکٹر تھے۔ ڈرامہ بہت کامیابی سے پیش کیا۔ وہ فنکشن ختم ہو چکا لیکن مجھ پر جو اثر باقی ہے وہ ان کے علم، کردار کا ہے۔ کردار میں بھی خاکساری کا وہ اتنے بڑے تھے لیکن ہم کو بچوں کو بھی انہوں نے عزت دی اور اہمیت دی۔

——— جی سی عنایت حسین[1]

۱۹۸۶ء کی ڈائمنڈ جوبلی کے ڈرامہ میں حصہ لینے سے اور میٹرک میں ہونے کی وجہ سے میں کچھ ہچکچا رہا تھا انہوں نے کہا یہ پبلک سکول کی روایت ہے کہ لڑکے ہر طرح کی تعلیمی و تربیتی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں اور یہ تو شاندار مستقبل کے امین ایک ذہین لڑکے کی خاص پہچان ہے کہ لیڈر شپ کے پروگراموں اور سٹیج کی سرگرمیوں میں بھی نمایاں ہوتا ہے اور کتابی امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کرتا ہے۔ اس کالج کی بھی بہترین روایت یہی رہی ہے۔ زندگی کے سفر میں آخر کار وہی زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جن میں Confidence زیادہ ہو اور جو سٹیج پر آتا ہے اسے اپنے اوپر بھی اعتماد ہوتا ہے اور اپنی تیاری پر بھی۔

"سر، میں میٹرک میں ہوں۔ میں گولڈ میڈل لینا چاہتا ہوں"۔

— یہ سن کر وہ جلال میں آ گئے "عنایت میں یہی تو تمہیں سمجھا رہا ہوں، پڑھنا پڑھانا کوئی ایک دو دن دو ہفتے ایک دو ہفتے کا کام نہیں۔ جن کو پڑھنا ہوتا ہے پوزیشن لینا ہوتی ہے، وہ تمام سال بلکہ سالوں تواتر سے پڑھتے ہیں اور مسلسل اپنے مطالعہ کے دائرہ کو وسیع کرتے رہتے ہیں میری یہ بات یاد رکھو اگر تم اس ڈرامہ میں حوصلہ سے حصہ لوگے تو میڈل بھی لے سکو گے۔ یہی میں نے سہیل فاروق سے کہا ہے۔ دیکھو وہ تو کالج پریفیکٹ، یونین کا وائس پریذیڈنٹ

---

[1] کالج نمبر ۱۷۵۴ ۔ زمانہ تعلیم ۱۹۸۴-۸۷ء

سب کچھ ہے اور ڈرامہ میں بھی میرا معاون ہے۔ انشاءاللہ تم دونوں سُرخ رو ہو گے۔
علوی صاحب کی بڑی نظر تھی۔ ان کا کہنا صحیح ثابت ہوا۔ میں نے بھی اختر احسن
گولڈ میڈل اور بھائی جان سہیل فاروق ایف ایس سی میں فرسٹ آئے۔ اور گولڈ میڈل
حاصل کیا اور آل راؤنڈ بیسٹ کیڈٹ بھی قرار پائے۔ ڈرامہ "جوتشی" میں میرے علاوہ
بھائی جان زاہد محمود کا خاص کردار تھا وہ بھی کامیاب ہو کر پی ایم اے میں پہنچے۔

آخر میں، میں ایک اور بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ علوی صاحب کی شخصیت میں
Versatality بہت تھی۔ ڈرامہ، میوزک، ادب وغیرہ کے علاوہ وہ تیراک
بھی بہت اچھے تھے اور فن تیراکی کی باریکیوں کو خوب جانتے تھے۔ جس سال میں بیسٹ سومر
ڈیکلر ہوا انہوں نے مجھے بلایا اور میری سوئمنگ میں جو فنی یا ٹیکنکل خامیاں تھیں، انہوں
نے ان کی نشاندہی کی۔ وہ انٹر ہاؤس سوئمنگ کے مقابلوں میں سوئمنگ کے مستقل ریفری
ہوتے تھے۔

—— محمد قمرالاسلام[1]

علوی صاحب سے براہِ راست ہم نے چند روز ہی پڑھا تھا لیکن جب میں نے اور
آصف ستی نے ان سے درخواست کی کہ ہماری صبح کی اسمبلی کی تقریریں سن لیں تو ہر چند
کہ اس وقت چھٹی ہو چکی تھی وہ قریبی کلاس میں ایک لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گئے اور بڑے
سکون سے ہماری تقریریں سنیں اور ان کی اصلاح کی۔ ستی لفظ Triumphant کو
صحیح طریقے سے ادا نہیں کر رہا تھا۔ انہوں نے خاصا وقت اس لفظ کا تلفظ کروانے پر
لگایا اور ذرا بھی اکتائے نہیں۔ یا کسی طرح بے چینی کا اظہار نہیں کیا حالانکہ گھر جانے میں ان
کو یقیناً دیر ہو رہی تھی۔

—— جمیل احمد[2]

علوی صاحب سے میں نے براہِ راست نہیں پڑھا۔ ۱۹۸۷ء میں میرے کالج میں فرسٹ
ائر میں داخل ہونے سے چند ماہ پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا لیکن کالج میں وہ ایک زندہ

---

[1] کالج نمبر ۴۸۰۴ زمانہ تعلیم ۸۸-۱۹۸۵ء اور [2] کالج نمبر ۵۰۹۶ زمانہ تعلیم ۸۹-۱۹۸۷ء

Legend تھے۔ ان کی ایک بات جو میں نے سابق وائس پریذیڈنٹ کالج ڈبیٹنگ سوسائٹی سے سنی یہ تھی۔ جب حج سے واپس آکر پہلا پیریڈ لینے کلاس میں آئے تو کسی لڑکے نے بورڈ پر ان کے نام کے ساتھ حاجی عین الدین لکھ دیا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر مسکرائے پھر فرمایا حج بھی نماز کی طرح ایک فرض ہے۔ جب نماز پڑھنے پر کسی کو نمازی نہیں لکھتے یا کہتے تو کم از کم مجھے حج کے فرض کی ادائیگی کی سعادت پر حاجی لکھنے کی زحمت نہ کیجئے۔ ان کے مزاح کا یہ معیار تھا۔ اللہ اللہ!

رفقاء کار

——— میجر جنرل عبدالمجیب چودھری[1]

آج سے تقریباً ۳۲-۳۳ سال پہلے جب میں گورنمنٹ کالج لاہور سے اپنی تعلیم مکمل کرکے ملٹری کالج جہلم میں بحیثیت استاد تعینات ہوا تو سب سے پہلے جن لوگوں سے میری ملاقات ہوئی ان میں جناب عین الدین علوی کا نام سرفہرست ہے۔ اگرچہ ہمارے شعبے الگ الگ تھے، علوی صاحب اردو کے استاد تھے جبکہ میں شعبہ سائنس میں منسلک تھا۔ تاہم ایک ہی ہاؤس میں تقرری کی بنا پر ہم اکثر اوقات اکٹھے رہتے۔ اس سے مجھے علوی صاحب کو نزدیک سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا۔ گو ظاہری طور پر وہ بہت سنجیدہ بلکہ کچھ خشک سے اور غیر زندہ دل دکھائی دیتے تھے لیکن درحقیقت وہ بڑے دردمند، دوست نواز، زندہ دل اور مزاح پسند انسان تھے۔ ساتھ ہی سادگی اور انکساری بھی ان کی طبیعت کا خاصا تھی۔ لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی علم وفضل کے علاوہ اپنے فرض سے ان کی سچی محبت تھی۔ گرمیوں کی شاموں میں جب کام سے فراغت نصیب ہوجاتی تو اکثر چاندنی راتوں میں علوی صاحب، شفیق اور میں نہر کے کنارے سیر کیا کرتے اور شفیق صاحب کی بانسری کی سریلی دھنیں سن کر محظوظ ہوا کرتے۔ علوی صاحب ہارمونیم کے علاوہ غالباً کوئی اور ساز نہیں بجاتے تھے۔ لیکن فن موسیقی کے اسرار ورموز کے رازداں تھے۔ وہ مجسم استاد تھے۔ خصوصاً پبلک

---

[1] استاد ملٹری کالج ۵۶-۱۹۵۵ء، حال ڈائریکٹر جنرل آرمی ایجوکیشن۔

سکول کے استاد کی حیثیت سے ان کی کارکردگی مثالی بلکہ لاثانی تھی۔ پاکستان میں جب بھی پبلک سکول کے استاد کی تعریف لکھی جائے گی، وہ علوی صاحب کے حوالے ہی سے لکھی جائے گی۔

ایک آئیڈیل ہاؤس ماسٹر

——— کرنل این ڈی احمد[1]

۱۹۵۴ء کے اواخر میں جب میں (کیپٹن کے رینک میں) ملٹری کالج میں بحیثیت انسٹرکٹر کلاس سی پوسٹ ہوا تو اضافی ذمہ داری کے طور پر آکنلک ہاؤس کی ہاؤس افسری بھی تفویض ہوئی۔ اس وقت مسٹر علوی آکنلک ہاؤس کے ریذیڈنٹ ہاؤس ماسٹر تھے ان سے میری رسم وراہ یہیں شروع ہوئی۔ کرنل ایڈورڈ کی کمان تھی اور کالج کو پبلک سکول کے طور پر منظم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا جس کے نتیجہ میں کالج بہت سے انتظامی اور ڈسپلنی مسائل اور مشکلات سے دوچار تھا۔ آکنلک ہاؤس اپنے محل وقوع کی وجہ سے خاصا مشکل ہاؤس سمجھا جاتا تھا۔ جب میں ہاؤس کا چارج لے رہا تھا تو میرے پیش رو کیپٹن غلام علی نے مجھے وارن کر دیا تھا، ذرا ہوشیار رہنا۔ نک نیم تو اس ہاؤس کا شیش محل ہے لیکن ہے ٹیڑھی کھیر، وغیرہ وغیرہ (یہ کچا ہاؤس ۱۹۵۹ء میں گرا دیا گیا) یہ علوی صاحب کی تدبیر کاری تھی کہ جب سارے کالج میں مزید حالات بگڑے تو آکنلک ہاؤس کافی حد تک سنبھلا رہا۔ علوی صاحب کی انتظامی صلاحیت اور کام سے لگن وہ پہلی خوبی تھی جس سے میں بالکل شروع میں متاثر ہوا۔

۱۹۵۵ء کے اواخر میں کرنل رفیق کا تاریخی دور شروع ہوا جس کے چند ماہ بعد انہوں نے کالج کے چار ہاؤسوں کو سینئر اور جونیئر ہاؤسوں کی صورت میں نئے سرے سے منظم کیا۔ اس تبدیلی کے نتیجہ میں ہاؤس سٹاف بھی تبدیل ہوا۔ مجھے ایک جونیئر ہاؤس برڈووڈ ہاؤس کا ہاؤس آفیسر مقرر کیا گیا۔ میرے ریذیڈنٹ ہاؤس ماسٹر مسٹر علوی ہی بنائے

[1] استاد ملٹری کالج ۵۸-۱۹۵۵ء، کمانڈانٹ ملٹری کالج ۷۳-۱۹۷۰ء

گئے۔ میرے ہاؤس سٹاف میں مسٹر حیدری، مسٹر شفیق اور مسٹر عبدالمجیب (حال میجر جنرل اور ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن) بھی شامل تھے یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میرے رفقاء کار اس پایہ کے تھے، اس کی بھی ایک وجہ تھی۔ اصل میں کالج میں دو جونیئر ہاؤسوں کا قیام کرنل رفیق کا Ambitious project تھا۔ ان کے خیال میں نیا کالج یہیں سے ابھرتا تھا اس لیے ان دو جونیئر ہاؤسوں پر ان کی خصوصی توجہ تھی۔ نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں اور پبلک سکول تربیت پر بڑا زور تھا اور کام کا ٹیمپو تیز بلکہ بہت تیز تھا۔ مجھے یہاں یہ یہ اعتراف کرنے میں عار نہیں کہ اس وقت تک پبلک سکول سسٹم کا میرا کوئی تجربہ نہ تھا اس سسٹم کو سمجھنے اور برتنے میں مسٹر حیدری اور مسٹر علوی سے بہت مدد ملی۔ مسٹر علوی کو تو میں اس معاملہ میں اپنا راہ نما سمجھتا ہوں۔ میں نے اس وقت اس سلسلے میں ان کے علم سے اور عمل سے بہت کچھ سیکھا۔ برڈ وڈ ہاؤس نے نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں اپنا منفرد مقام حاصل کر لیا تھا اور یہ سب کچھ بڑی حد تک مسٹر حیدری اور مسٹر علوی کی وجہ سے ممکن ہوا۔ مسٹر حیدری نے برڈ وڈ کا ترانہ اسی زمانہ میں لکھا۔ مسٹر علوی نے ہاؤس کے انتظام وانصرام کے علاوہ ہاؤس کی سٹیج سرگرمیوں کو بھی بڑی حد تک سنبھالا ہوا تھا۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء ہم نے اے جی میجر جنرل امراؤ خان کی آمد پر ایک شاندار پروگرام سٹیج کیا تھا۔ اگلے سال فروری ۱۹۵۷ء میں برڈ وڈ کا سالانہ فنکشن کیا جس کے مہمان خصوصی ڈی۔ اے۔ ای کرنل جعفری تھے یہ بھی بڑا شاندار پروگرام تھا۔ یوں تو ہم ایک ٹیم کے طور پر کام کرتے تھے اور کام کرنے میں دن رات کی قید نہ تھی۔ تعلقات دوستوں کے سے تھے۔ سینئر اور جونئر کی تمیز نہ تھی۔ البتہ علوی صاحب ہاؤس کی زندگی میں ایک کلیدی حیثیت رکھتے تھے۔ فیصلے ہمارے مشترکہ ہوتے تھے لیکن ہاؤس عملاً ان کے گرد گھومتا تھا ان کی طبیعت میں انکساری اس حد تک تھی اور سیلف پروجیکشن سے وہ اس حد تک بلند تھے کہ ان کا یہ رول باہر کی دنیا کو معلوم نہ تھا نہ وہ اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں سے ممتاز سمجھتے تھے اور نہ ایسا کوئی تاثر دیتے تھے۔

ملٹری کالج چھوڑنے کے بعد اور ۱۹۶۸ء میں فوجدار ہاٹ کیڈٹ کالج چٹا گانگ کی سربراہی قبول کرنے سے پہلے جب میں نے انگلستان کے پبلک سکول سسٹم

کا تفصیلی مطالعہ کیا اور اس موضوع پر پاکستان ٹائمز اور مارننگ نیوز ڈھاکہ میں سلسلہ مضامین شروع کیا تو سچ پوچھئے تو اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ علوی صاحب اس سسٹم کو گہرائی میں جا کر سمجھتے تھے اور کس طرح ان کی نظر اس کی خوبیوں ہی پر نہیں خامیوں پر بھی تھی۔ پاکستان میں پبلک سکول ایجوکیشن کے بارے میں ان کا ذہن بہت صاف تھا وہ خود پبلک سکول کے آئیڈیل استاد تھے بلکہ انہیں تو کسی بڑے پبلک سکول کا ہیڈ ماسٹر ہونا چاہیے تھا جس سطح پر اور جس دائرہ میں انہوں نے کام کیا وہ یقیناً اس سے بڑے تھے۔ مجھے حال ہی میں معلوم ہوا کہ ان کے والد گرامی بدرالدین علوی صاحب علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک ممتاز استاد اور سکالر تھے اور یہ کہ پاکستان آنے کے بعد علوی صاحب نے سندھ کے ایک قصبہ ٹنڈو آدم میں ایک پبلک سکول قائم کیا تھا۔ ان کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے مجھ سے طویل تعلقات کے دوران میں ایک بار بھی اپنے خاندانی امتیازات یا ٹیڈم سکول کے تجربہ کا ذکر نہیں کیا۔ یہ کسر نفسی پبلک سکول کی نہیں تصوف اور درویشی کی خصوصیت ہے۔

جب ۱۹۷۱ء میں میں نے کالج کی سربراہی کا چارج لیا تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ جس طرح پندرہ سال پہلے برڈ وڈ ہاؤس کے روح رواں تھے اب ان کو یہ مقام پورے کالج میں حاصل تھا۔ میں نے ان کے تجربے اور تدبر سے حتی المقدور فائدہ اٹھایا۔ میری کمان کے دوران علوی صاحب نے ایک بار بھی پرانے مراسم کے حوالے سے کوئی رعایت نہیں چاہی لیکن میں اپنے طور پر چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح میں ان کے تدریسی بوجھ کو ہلکا کر سکوں تاکہ وہ تخلیقی و تنظیمی دائرہ میں کالج کی خدمت کرنے میں یکسوئی سے زیادہ وقت دے سکیں اور کام کی زیادتی سے ان کی صحت متاثر نہ ہو۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا اور ان کی دن رات کی مصروفیت جاری رہی بلکہ بڑھتی رہی۔

میری ان کی آخری ملاقات ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر ہوئی وہ اس سال دسمبر میں ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور میں مکان بنانا چاہتے تھے کچھ تصنیف و تالیف کا کام شروع کرنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے میں نے ایک مثالی ادارہ کھولنے کے امکان کا جائزہ لینے کو کہا تو بولے "خیال تو اچھا ہے خود میرا دل بھی چاہتا ہے کہ ایک پاکستانی پبلک سکول کا جو نقشہ میرے

ذہن میں ہے اسے بروئے کار لاؤں۔ لیکن سرمایہ کہاں سے آئے گا۔ کاروبار میں اسے پھنسانا نہیں چاہتا۔"

ملٹری کالج خوش قسمت ہے کہ ایسا معلم، ادیب اور تخلیقی فن کار اتنے عرصے تک اس کی جڑوں کو پانی دیتا رہا۔ میرا ملال صرف یہ ہے کہ ان کی صلاحیتوں سے قومی سطح پر کام کیوں نہ لیا جا سکا۔ وہ ایسے آرنلڈ[1] تھے جو ایک لحاظ سے گمنام رہے اور جن کی خاطر خواہ شہرت نہ ہو سکی۔

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پروا

——— میجر عبدالرشید[2]

۱۹۵۹ء میں جب میں پہلی بار ملٹری کالج میں پوسٹ ہوا تو تدریسی ذمہ داریوں کے علاوہ اورنگ زیب ہاؤس سے وابستہ کیا گیا جس کے ہاؤس ماسٹر عین الدین علوی تھے اور اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر ایک اور بہت لائق فائق استاد مسٹر فضل حق حیدری تھے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس وقت کے بہترین سٹاف سے میرا واسطہ پڑا۔ علوی صاحب میں خاندانی اشراف کی تمام صفات تھیں۔ انھوں نے کبھی مجھے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں ان کا ماتحت ہوں۔ ان کا نسبی تعلق علی گڑھ کے ایک مشہور علمی خانوادہ سے تھا جس کے علم و فضل کی روایت کو انھوں نے بدرجہ اتم قائم رکھا لیکن اعلان کبھی نہ کیا۔

صحت تو ان کی اس زمانے میں بھی بہت اچھی نہیں تھی بس تندرست تھے۔ صبح سے شام تک کام میں لگے رہتے سوائے اس آدھ گھنٹے کے جب وہ ہسپتال کے سامنے کے ٹینس کورٹ میں ٹینس کھیلتے تھے۔ وہ سارا وقت کام میں لگے رہتے۔

وہ بہت دیر میں سوتے تھے ان کے ہاؤس سٹاف میں ہونے کی وجہ سے اکثر رات گئے ہاؤس میں چیکنگ کے لیے آتا ان کے کمرہ سے روشنی آتی نظر آتی۔ غالباً عادتاً ایک ڈیڑھ بجے سوتے تھے۔ گیارہ سے ایک ڈیڑھ دو بجے کا وقت ان کے مطالعہ کا

---

[1] ڈاکٹر آرنلڈ آف رگبی جسے پبلک سکول سسٹم کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔
[2] استاد ملٹری کالج ۶۸-۱۹۵۹ء

تھا جس میں کبھی وہ ناغہ نہیں کرتے تھے اسی وجہ سے ان کی آنکھیں اکثر سرخ نظر آتیں۔ مطالعہ کا اتنا شوق بلکہ جنون میں نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔ ذہین اور محنتی اور قابل آدمیوں کی جہاں تعریف ہوتی ہے وہاں ان کے کچھ حریف یا رقیب بھی ہوتے ہیں لیکن جہاں تک میرے علم میں ہے سٹاف میں کوئی ان کا رقیب نہ تھا۔ یہ دوسرں کا کمال نہیں ان کا اپنا کمال تھا کہ وہ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ تحمل اور برداشت کا ان میں لازوال مادہ تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ اس وقت کے صاحب اقتدار جن پر یہ شعر صادق آتا تھا۔

گرمی سہی مزاج میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

ایک بار شام کو ہاؤس میں آئے مغرب کی نماز کا وقت تھا۔ اپنے زعم میں وہ ڈسپلن چیک کرنے نکلے تھے بہر حال ہوا یہ کہ جہاں لڑکوں پر بے دریغ ڈنڈا چلا وہاں علوی صاحب کی شان میں کچھ نامناسب الفاظ استعمال کیے جس جس نے سنا اس نے افسوس کیا علوی صاحب کی شخصیت ایسی تھی کہ اس عمر میں بھی لوگ انہیں محترم اور بزرگ سمجھتے تھے بعض لڑکوں کو اس حادثہ کا علم ہوا تو وہ طیش میں آگئے وہ اپنے آئیڈیل استاد کی توہین برداشت نہیں کر سکتے تھے بہر حال اسی شب میں علوی صاحب سے ملا میرا خیال تھا کہ شاید وہ اس حادثہ کا ذکر کریں گے لیکن انہوں نے اشارتاً بھی اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں وہ بڑے ظرف کے انسان تھے اور اتنے اونچے کہ کسی کی پھینکی ہوئی مٹی ان کے دامن تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ یہ واقعہ میں نے اس لیے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کالج میں مشکل وقت بھی دیکھا۔ ایک وقت ایسا تھا جب ان کی کماحقہ قدر بھی نہیں کی گئی لیکن انہوں نے ہر حال میں اپنے کام کو اپنے مشن کو جاری رکھا۔

میں نے کام کرنے والے لوگ اور بھی دیکھے ہیں لیکن عموماً ہوتا یہ ہے کہ جتنا کام کرتے ہیں اتنا یا اس سے زیادہ اعلان بھی کر لیتے ہیں یا پھر کام کی پوری قیمت وصول کرتے ہیں۔ شہرت سے، پروموشن سے یا کسی اور طریقے سے لیکن علوی صاحب کا شمار ان خال خال

لوگوں میں تھا جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ

ان کے اولڈ بوائز ان سے قابلِ رشک حد تک محبت کرتے اور عزت کرتے ہیں ان کو جگت باپ کی حیثیت حاصل تھی۔ میں نے اس کا نظارہ گذشتہ ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر بھی دیکھا۔ لوگ بے ساختہ ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ یہ شرف بے وجہ نہ تھا یہ محض علم و فضل کا کرشمہ بھی نہ تھا، یہ ان کی پوری شخصیت کا اعجاز تھا۔ وہ یارانِ تیز گام میں سے تھے۔ منزل پر جلد جا پہنچے ورنہ منزل تو ہر ایک کے لیے بیتاب ہے۔ بقول حفیظ جالندھری

ہوئی جاتی ہے کیوں بیتاب منزل مسلسل چل رہا ہوں آ رہا ہوں

——— محمد لطیف عباسی[۱]

پچھلے سال میں نے گلگت میں اولڈ بوائز کا ایک گیٹ ٹو گیدر اٹنڈ کیا تھا۔ وہاں پرانے استادوں کی باتیں چھڑیں تو ایک میجر عالمگیر نے بتایا ہم ایف ایس سی کے آخری سال میں تھے۔ جنوری کا مہینہ سردی بہت تھی۔ دھوپ نکلی تو باہر بیٹھنے کو جی چاہا۔ علوی صاحب سے کہا سر، کلاس باہر لیں' بڑے مزے کی دھوپ ہے۔ علوی صاحب لمحہ بھر خاموش رہے پھر فرمایا۔ باہر لے تو چلوں' دھوپ میں افیون کا اثر ہوتا ہے۔ وہاں آپ پڑھ نہیں سکیں گے دس بارہ برس کے بعد جب میں دوسروں سے کام لینے کی پوزیشن میں پہنچا تو علوی صاحب کا یہ فقرہ بار بار یاد آیا۔ کام کے وقت Relax نہ انھوں نے کبھی خود کیا اور نہ کرنے دیا۔ جو کچھ ان کی زندگی سے سیکھا وہ ان کے پڑھانے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔

——— کیپٹن غلام فرید اے ای سی

علوی صاحب استاد تو اردو اور عربی کے تھے لیکن انگریزی میں بھی ان کی مہارت کم نہیں تھی۔ ملٹری کالج میں میری پوسٹنگ ۸۵-۱۹۸۲ء کے دوران مجھ سمیت کئی آفیسرز نے ایم اے انگریزی کی تیاری کی۔ انگریزی کے کسی پرچہ میں کوئی دقت پیش آتی تو ہم انھی سے رجوع کرتے تھے۔ انگریزی نظم، نثر، تنقید اور ناول پر ان کی بہت گہری نظر تھی۔ شیکسپیئر اور

---

[۱] استاد ملٹری کالج از ۱۹۶۰ء تا حال

شار کے ڈراموں کے بہت سے ٹکڑے انہیں زبانی یاد تھے۔ وہ بغیر کسی تیاری کے فی البدیہہ مشکل مقامات کی تشریح کر دیتے تھے۔ مجھے بعد کو پتہ چلا کہ علی گڑھ میں انگریزی ان کا خاص مضمون تھا اور بی اے میں انگلش لٹریچر میں امتیاز لیا تھا۔ اور ۱۹۴۴ء سے مسلسل انگلش لٹریچر پڑھ رہے تھے ہمارے لیے تو وہ بحرالعلوم تھے۔

سٹاف روم میں تقریباً ہر روز وہ لڑکوں کی کاپیاں دیکھتے نظر آتے تھے اور اپنے خاص ایگل پن سے وہ ہر کاپی پر اس طالب علم کی رہنمائی کے لیے اشارے بھی لکھتے تھے اس اہتمام سے کاپیاں دیکھتے میں نے انہی کو دیکھا۔ چھٹی کے بعد گھنٹہ آدھ گھنٹہ اخبار دیکھنے میں گذارتے تھے۔ جنگ میں عقافی صاحب کا کالم بہت دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ ایک روز میں نے پوچھا کہ آپ اتنی مصروفیات کے ساتھ مطالعہ کس وقت نکال لیتے ہیں۔ فرمایا رات گیارہ بجے کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے پڑھ لیتا ہوں۔ میں نے کالج میگزین کے اُردو سیکشن میں ان کے ساتھ بلکہ ان کے ماتحت دو تین سال کام کیا۔ عام سینئرز کے برخلاف انہوں نے میگزین کا زیادہ کام خود کیا اور مجھے اور شتاق صاحب جو ان کے معاون تھے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ہم ان کی زیر نگرانی کام کر رہے ہیں۔ میگزین کی پروف ریڈنگ تک خود کرتے تھے ان کے زیر ادارت جو میگزین شائع ہوتے ان کا تنوع اور معیار دونوں قابل تعریف ہوتے تھے ہر سال میگزین میں خود ان کا اپنا ایک انشائیہ ہوتا تھا وہ بہت بلند پایہ صاحب طرز طنز نگار تھے۔ ان کو پڑھ کر رشید صدیقی، عبدالعزیز اور فلک پیما کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

۱۹۸۴ء کی بقرعید پر میجر احمد دین، چند دوسرے احباب اور میں نے مشترکہ طور پر ایک گائے خریدنے کا پروگرام بنایا ایک حصہ دار پروفیسر علوی صاحب بھی تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے اصرار سے کہا یہ قربانی کا معاملہ ہے۔ پیسوں کا خیال کیے بغیر اچھی سے اچھی راس خریدی جائے اور اسے ذبح کرنے کا بھی خاص اہتمام کیا جائے، قصائی بھی تجربہ کار ہو وغیرہ وغیرہ۔

مذہب، سیاست اور ادب میں وہ لبرل تھے اور بڑی بے باکی سے لیکن مدلل طریقے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ، سرسید، محمد عبدہ، اور قطب

شہید کے حوالے اکثر دیا کرتے تھے۔ وسیع القلب تھے اردو کے کٹر حامی ہونے کے باوجود جو پنجابی میں بات کرے اس سے پنجابی میں گفتگو کرتے تھے۔ عالی ظرف بھی تھے سٹاف میں اس وقت ایک صاحب ایسے بھی تھے جو اکثر حریفانہ گفتگو کرتے یہ بات ان کے علم میں تھی لیکن انہوں نے ہمیشہ درگزر کیا۔خود ان کے خلاف کبھی کچھ نہیں کیا۔ وہ طلبا کے استاد ہی نہیں تھے۔انہیں استاد الاساتذہ کا درجہ حاصل تھا۔

پروفیسر محمد مشتاق

علوی صاحب طرز ادیب تو تھے ہی مشرق و مغرب کے فلسفہ ہائے تعلیم پر بھی ان کی ماہرانہ نظر تھی۔ پبلک سکول طرز تعلیم پر ان کے ہمہ گیر مطالعہ، مشاہدہ اور عملی تجربہ کا نچوڑ ان کے مخصوص ادبی اسلوب میں سال بہ سال تربیت کے اداریوں میں جلوہ دکھاتا تھا۔۱۹۵۴ء میں انہوں نے کالج کے میگزین کے اردو سیکشن کی ادارت سنبھالی اور ۸۶-۱۹۸۵ء کے سالنامے تک جتنے اداریئے انہوں نے لکھے اگر ان کو یکجا کر کے شائع کر دیا جائے تو یہ تالیف نہ صرف ملٹری کالج کی تعلیمی و تربیتی پالیسیوں اور سرگرمیوں کا جائزہ ہو گی بلکہ تعلیم و تربیت پر ایک فکر انگیز مطالعہ بھی۔

پبلک سکولی نظام کے امور تعلیم پر ان کی ماہرانہ نظر تھی۔ایک پبلک سکول کے دائرۂ کار کے بارے میں ۷۰-۱۹۶۹ء کے تربیت کے اداریہ میں انہوں نے لکھا:

ایک اقامتی درسگاہ یا پبلک سکول میں سڑک، ادہ میدان، مسجد اور لائبریری ڈائننگ ہال اور ڈارمیٹریاں، باغ اور سبزہ زار بھی اتنے ہی اہم ہوتے ہیں جتنی نصابی کتابیں اور درس کے کمرے۔یہ کالج فقط درسگاہ نہیں ہے زندگی کی تجربہ گاہ بھی ہے۔یہاں طلبہ زندہ رہنے کا ڈھنگ سیکھتے ہیں اس لیے پبلک سکول میں اساتذہ کا کردار صرف معلم کا نہیں اتالیق اور معلم کا ہی ہوتا ہے۔

پبلک سکول کے اساتذہ کے رول اور طریق تعلیم و تربیت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

پبلک سکول میں استاد کے کام کی نوعیت عام سکولوں سے اتنی مختلف اور پیچیدہ ہوتی ہے کہ دونوں کو مشکل ہی سے ایک صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔پبلک سکول

کا استاد تو خود عمر بھر گورو ٹے کی طرح طالب علم رہتا ہے۔ اس کے خصائل میں شاید ہمدردی سب سے اہم ہے۔ طلبہ کے ساتھ اس کی گفتگو ادعا سے اس قدر خالی ہوتی ہے جیسے وہ اس سے زیادہ جانتے ہوں۔ اسے سقراط کے تجاہل عارفانہ سے کام لینا زیادہ پسند ہے۔ وہ سیر و تفریح میں ان کا ساتھی ہوتا ہے۔ مشاغل میں نہ وہ ان کا سرپرست بنتا ہے نہ ڈکٹیٹر بلکہ انہی کی ٹولی کا ایک ممبر بن جاتا ہے۔ اس رفاقت میں اسے بڑا پتا مارنا پڑتا ہے۔ وہ تمام مواقع جہاں جھٹ پٹ "بنا بنایا" طریقہ بتا کر کسی کام کو فوراً سلجھا دینے کی بے ساختہ خواہش پر غالب آنا ایک عام "غیر معلم" قسم کے آدمی کے لیے تقریباً ناممکن ہوا کرتا ہے۔ وہاں وہ چپ چاپ بیٹھا طلبا کو غلطیاں کرتے دیکھتا ہے لیکن صحیح راستے کی اطلاع گولی کی طرح نہیں داغ دیتا بلکہ انہیں محسوس کراتا ہے کہ ان سے کس نوعیت کی چوک ہو گئی ہے۔ پھر طلبہ ہی کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی سوجھ بوجھ سے پورا پورا کام لینے کی کوشش کریں خود دوسرے راستوں کو آزمائیں، بھٹکیں، لغزشیں کریں۔ یہاں تک کہ اس منزل تک پہنچ جائیں جہاں اگر معلم چاہتا تو انہیں شروع ہی میں اس کے دو جملے پہنچا سکتے تھے لیکن یہ آمرانہ طریقہ کار ان کے کس کام کا ہوتا؟ ان کی کون سی ذہنی، اخلاقی یا خلاقانہ صلاحیتیں تربیت پاتیں؟ اس قسم کے "حکم زدہ" کام سے تو طلبہ کا وہی تعلق ہوتا جو تاج محل بنانے میں سنگ مرمر اور عمارتی سامان ڈھو ڈھو کر لانے والے مزدوروں کا تھا۔ علم کا لطف تو اس میں ہے کہ وہ ذاتی شوق و جستجو کے بعد نصیب ہوا ہو۔ اس میں وہی مسرت اور عرفان ہوتا ہے جو آرشمیدس کو ثقل اضافی کے انکشاف سے ہوا تھا اور وہ حمام سے "یوریکا"، "یوریکا" کے نعرے لگاتا ہوا نکل پڑا تھا۔ جو راستے اپنی کوششوں سے دریافت کیے جائیں ان پر اٹھایا ہوا ہر قدم ایک فاتحانہ لطف رکھتا ہے۔ یہی فاتحانہ احساس تو ساری ذہنی اور اخلاقی ترقی کی جان ہے۔ اسی کا پیدا کرنا ہمارا پہلا مقصد ہے۔ اگر یہ پیدا ہو گیا تو علم تربیت اور قومی کردار سب کچھ حاصل ہو گیا۔

انہی بنیادی تصورات کے ماتحت ایک پبلک سکول میں محض کتابیں توجہ کا مرکز نہیں ہوتیں بلکہ اس قسم کے کاموں اور مشغلوں کی زیادہ سے زیادہ گنجائش پیدا کی جاتی

ہے جن میں لڑکوں کو لطف سعی، ذوق انکشاف اور لذت تخلیق کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملیں۔ ان مشاغل سے پبلک سکول کا طالب علم اتنی ذہنی تربیت اور اتنا اجتماعی شعور حاصل کرتا ہے جو انگریز کے دیئے ہوئے عام نظام تعلیم میں ہم محض کتاب خوانی اور امتحان پرستی کی جاہلانہ پالیسی کی بدولت حاصل کر ہی نہیں سکتے تھے۔

۱۹۵۴ء کے اوائل میں کالج کے پبلک سکول بننے کا اعلان ہوا تھا۔ اس پس منظر میں اپنے پہلے اداریہ میں وہ "بانی" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

اب ہمارے دھارے کا بہاؤ سخت گیری یک رنگ سے ہٹ کر انفرادی بالیدگی اور ـــ صلاحیتوں کے ارتقا کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہمیں اب ایسا ماحول پیدا کرنا ہے جس میں بچہ اگر ڈسپلن کی خلاف ورزی کر بیٹھے تو خود ہی اپنی نظر سے گر جائے۔

اب اچھے کاموں کا شوق پیدا کیا جائے گا۔ شائستگی کی آرزو دلوں میں پیدا کی جائے گی۔ بچوں کو اپنی محرکات (Impulses) کے اظہار کے ایسے وسیلے مہیا کیے جائیں گے جو دوسروں کے لیے ضرر رساں ہونے کے بجائے فائدہ مند ہوں۔ پھر جرم اور ضابطہ شکنی کی گنجائش برائے نام ہی رہ جائے گی۔ جرم یا شرارت ایسی بیماری ہے جس میں علاج سے زیادہ تیمارداری ضروری ہے۔

بچے کی فطرت یہی ہے کہ وہ ڈسپلن کی پابندی میں فخر محسوس کرتا ہے، بشرطیکہ اس کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے اور روک ٹوک کم ہو۔ عام خیال سراسر غلط ہے کہ لڑکوں کی "قوم" ہی نافرمان ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ سمجھ دار لڑکے جنہیں قدر و منزلت حاصل کرنے کی امنگ ہوتی ہے ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ قوانین کی پابندی کر کے بڑوں کی صف میں جگہ حاصل کریں۔

شائستگی کی یہ آرزو پیدا کر دینا ہی پبلک سکول کا سب سے بڑا کارنامہ ہوتا ہے اسی غذا سے شخصیت میں برگ و بار پیدا ہوتے ہیں اور ذہن و جسم دونوں ساتھ ساتھ ترقی کی منازل طے کرتے ہیں۔ ایک پبلک سکول میں کھیل کا میدان ڈرائینگ ہال مسجد باغ ہر مقام درسگاہ ہوتا ہے یہ اداریہ جون ۱۹۵۴ء کا ہے۔ سال ڈیڑھ سال کے بعد

اکتوبر ۱۹۵۵ء میں جب لیفٹیننٹ کرنل رفیق نے دوبارہ کالج کی کمان سنبھالی تو کالج کو پبلک سکول میں ڈھالنے کا کام زور شور سے شروع ہوا۔ اس تاریخی موڑ پر ۱۹۵۵-۵۶ء کے ترہیت کے اداریہ میں حال و قال کے عنوان سے انہوں نے لکھا۔

بذات خود پبلک سکول کا تصور بھی کچھ ایسا معصوم اور بے داغ نہیں ہے جہاں تک برطانوی پبلک سکول اور اس کے ہندوستانی ایڈیشنوں کا تعلق ہے۔ برطانیہ کے سیاسی مقاصد اور ان کی شہنشاہیت کے تقاضوں کی تکمیل ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ انہوں نے ہندوستانی طلبہ میں شہنشاہیت سے وفاداری اور عوام سے رعونت اور انگریز طلبہ میں ایک خاص طرح کی اکڑ اور انانیت پیدا کرنے کا فریضہ ہمیشہ بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ تاہم ان کی خوبیوں کا ذکر نہ کرنا بھی ناانصافی ہو گی۔ انہی سکولوں میں کردار کی پختگی، جفاکشی، دلیری بے باکی اور دوسرے سماجی خوبیاں بھی پرورش پائیں اور برطانیہ نے اپنے پبلک سکول نظام پر اگر فخر کیا ہے تو اسی کے بل پر۔

آج آزادی ملنے کے بعد ہم اہل پاکستان پبلک سکولوں کے تصور کو جوں کا توں ہضم نہیں کر سکتے۔ یہ حفظان صحت کے اصولوں سے بے پرواہی ہو گی۔ ہمیں اس کی رعونت اور ملوکیت پرستی چھوڑ کر اس کی وہ خوبیاں اپنانی ہیں جو ہمارے قومی مزاج سے ہم آہنگ ہوں ہمیں اپنے پبلک سکولوں سے طبقاتی برتری کا احساس مٹانا ہے اور کردار سازی کے وہ مواقع عام پاکستانیوں کے لیے فراہم کرنے ہیں جو انگریز قسم کے پبلک سکولوں نے صرف ایک طبقے کے لیے مخصوص کر رکھے تھے۔

اسی انشائیہ نما اداریہ میں آگے چل کر وہ ڈسپلن کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں

چند بد نصیب الفاظ ایسے ہیں جنہیں دنیا بے تکلف استعمال کرتی رہتی ہے لیکن مفہوم ایک آدھ بھولا بھٹکا ہی سمجھ لیتا ہو تو سمجھ لیتا ہو انہی میں سے ایک ڈسپلن بھی ہے آب و ہوا یا ذوق کے مطابق لیکن اطاعت گزاری اور خاکساری کا نام ڈسپلن ہے تو کہیں زہد و اتقا کا بعض کے نزدیک اس کا مطلب باانتشار جماعت کے اقبال اور درازی عمر کی دعایں مانگنے کے سوا کچھ نہیں تو کچھ حضرات فقط اس سنت کی پیروی کو

ڈسپلن کہتے ہیں جسے ان کے سفید رنگ آقا اپنے گندم گوں نیاز مندوں کے نائڈے کے لیے چھوڑ گئے ہیں، ایک دلچسپ غلط فہمی یہ ہے کہ اس کے تقریباً ہر مفہوم میں آنکھ بند کر کے حکم ماننے کا عنصر ضرور موجود نظر آتا ہے، خاص کر ہمارے تعلیمی اداروں میں جو خوف اور تسلیم و رضا کا نام ڈسپلن رکھ دیا گیا ہے علمی و تعلیمی دنیا اس مفہوم کو مدتوں پہلے ٹکسال باہر کر چکی ہے لیکن ہمیں یہ معنے کچھ اس قدر پسند آ گئے ہیں کہ ہم آج تک وہی لکیر پیٹ رہے ہیں۔ شاید اس لیے کہ نیا مفہوم قبول کرنے میں بڑے بڑے خطرات ہیں مثلاً نیا راستہ خود بنانے کا خطرہ — دل و دماغ پر زور ڈالنے کا خطرہ۔

۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستان کے اسلامی جمہوریہ پاکستان بننے کا اعلان ہوا تھا۔ اس ضمن میں ان کا ادراتی تبصرہ ملاحظہ ہو۔

جمہوریہ اسلامیہ کا اعلان کر کے ہم نے آخر اپنے ڈیڑھ صدی پرانے احساس کمتری کا طوق اتار پھینکا اور کھوئی ہوئی خود اعتمادی واپس لے لی۔ درحقیقت ہم نے یہ اعلان کیا اسلام ایک ایسا دستور حیات عہد حاضر کی پیچیدگیوں — اور فسادوں کا علاج ہے ہم نے یہ اعلان کیا ہے ہمارا دستور حیات وہ انقلابی پیغام ہے جس نے کرہ ارض کو مذہبی خرافات (Rituals) اور توہمات سے (Puests) کے جال سے، ذات پات کے بندھنوں سے، طبقاتی امتیازات سے، رنگ و نسل وطنیت کے تعصب سے نجات دلائی اور صحیح معنوں میں جدید دور Modernity کی بنیاد ڈالی۔ اسلامی جمہوریت نے تاریخ میں پہلی بار دنیا کے تمام انسانوں کی وحدت اور مساوات کا اعلان کیا — اپنے عمل سے۔

آج جمہوریہ اسلامیہ کا اعلان کر کے ہم نے پھر اسی عالمی وحدت کی تلقین کا بیڑا اٹھایا ہے۔ آج ہماری خودشناسی نے انگڑائی لی ... ہے۔ شاید اقبال کی روح اپنی اس پیشین گوئی کو امید کے سروں میں پھر گنگنا رہی ہو۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا، عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

پبلک سکول میں اساتذہ کا Calibre اور Commitment ان کا

پسندیدہ موضوع تھا۔ ۶۱-۱۹۶۰ء کے تربیت کے اداریہ میں انھوں نے اس موضوع پر ایک بار پھر لکھا:

خیالات کتاب میں مقید ہو کر بے جان رہ جاتے ہیں، ٹھہرے ہوئے تالاب کی طرح ان میں زندہ ذہنوں کے لیے کشش کہاں۔ نوجوانوں کے ذہنوں میں نئے تصورات اسی وقت پھوٹیں گے جب ان کے سامنے جیتے جاگتے سانس لیتے ہوئے، چلتے پھرتے، اور پھولتے پھلتے ہوئے تصورات موجود ہوں۔ میرا مطلب استادوں سے ہے۔ پاکستان کا نیا دور اصلاح کا دور ہے۔ اصلاح نئے خیالات مانگتی ہے۔ نئے خیالات جن کے نام سے کبھی سوسائٹی کی تیوری پر بل پڑ جاتے تھے۔ یوں تو استاد کا کام ہمیشہ سے یہ ہے کہ طلبہ کے اندر جو کچھ خفتہ ہے اسے بیدار کیا جائے اور وہ نت نئی چیزیں دریافت کرتے رہیں۔ اب خوشی کا مقام ہے کہ ہماری حکومت نے تعلیم کو وہ عزت دی ہے جس کی وہ مستحق ہے اور اساتذہ کو ان کے کام کے لیے بہتر مواقع مہیا کیے جا رہے ہیں۔ وقت کی پکار کا جواب دینا اب ہمارا کام ہے پہلے سے کہیں بڑی ذمہ داریاں ہمارے سامنے ہیں خصوصاً اقامتی درسگاہوں یا پبلک سکولوں کے سامنے۔

کھیلوں کے بارے میں یہ Cliche عام ہے کہ ان کے ذریعے کیریکٹر بلڈنگ ہوتی ہے۔ علوی صاحب آنکھ بند کر کے کسی نظریئے یا خیال کو تو مانتے ہی نہیں تھے انھوں نے کھیلوں پر یہ فکر انگیز تبصرہ کیا۔

—پبلک سکولوں میں اصولی طور پر کھیل کو حصول تعلیم سے بھی کچھ زیادہ وقار و وقعت دی جاتی رہی ہے اور اسے تشکیل کردار کا بہت بڑا ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں بھی فوقیت اسی مشغلے کو دینی چاہیے لیکن ہمارا عقیدہ ذرا مختلف ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہاں وہ کھیل تو آ گئے ہیں لیکن ان کھیلوں کے ساتھ وہ ایٹن اور ہیرو والی سپرٹ نہیں آ سکی جس کی بدولت عام خیال کے مطابق واٹرلو کی جنگ جیتی گئی تھی۔ اسی طرح پبلک سکول تو ہم نے بنا لیے مگر ان کا روایتی بنیادی مقصد مذہبی اور قومی کردار کی تشکیل اب تک ہماری گرفت میں نہیں آ سکا۔

علوی صاحب کے اداریئے کالج کی ذہنی تاریخ ہونے کے علاوہ تعلیمات پر خیال انگیز اور معنی خیز تبصروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے بہت کچھ روشنی حاصل کی جا سکتی ہے آخر میں، میں تبرک کے طور پر ان کے آخری تین اداریوں کے اقتباسات نقل کرتا ہوں۔
کسی دانا کا قول ہے کہ تعلیم کو دو چیزوں نے خراب کیا ہے۔ ایک "کتاب" نے دوسرے جبرِ استاد یعنی بید نے حقیقت یہ ہے کہ جو تعلیم کتاب تک محدود ہو اقبال کے الفاظ میں کسی کو صاحب کتاب نہیں بنا سکتی۔ ایک تجربہ کار ماہر تعلیم نے کہا تھا کہ کتاب خوانی تعلیم نہیں بلکہ کتابیں آپ کے حافظہ سے محو ہونے کے بعد جو کچھ آپ کے اندر رہ جائے وہ ہی تعلیم ہے۔ رہا استاد کا بید تو یہ تعلیمی دنیا کا نہایت ہی سخت جان بت ہے جسے توڑنے میں مغربی ممالک تو کامیاب ہو چکے ہیں لیکن ہم مشرق والے ابھی تک اس کے طلسم میں گرفتار ہیں اگرچہ بت شکنی کی کوششیں شروع ہو چکی ہیں اور ملٹری کالج بھی بت شکنی کی اس مہم میں سرگرمی سے حصہ لے رہا ہے۔

ہم اس ڈسپلن کو مسترد کر چکے ہیں جو سزا پر مبنی ہو اور اس ڈسپلن پر ایمان رکھتے ہیں جو طالب علم کے ذہن کے اندر سے پھوٹتا ہے۔ طالب علم اور معلم کے درمیان خوف اور تحکم کے رشتے کے بجائے ہم باہمی اعتماد کا رشتہ پیدا کر رہے ہیں۔

ملٹری کالج اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے جس میں بیک وقت دو مختلف انداز فکر ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں۔ ایک طرف فوجی نظم و نسق اور عسکری ماحول تو دوسری طرف نو عمر بچوں کی شخصیت کی تشکیل۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ ان دو زاویہ ہائے فکر کے تقاضے اکثر ایک دوسرے سے بہت دور جا پڑتے ہیں تاہم اس کے بہترین دور وہی رہے ہیں جن میں عسکری آب و رنگ اور تعلیم کے تقاضے آپس میں گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ یہ کام اتنا ہی مشکل ہے جتنا اقبال کے الفاظ میں "نہایت اندیشہ اور کمال جنون" کو یکجا کرنا۔

اس اداریہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ نشوونما ہو تو شخصیت کے تمام پہلوؤں کی ہو۔ ایک توازن اور تناسب کے ساتھ تعمیر کا حسن یہ ہے نقش و نگار بھی دلکش ہوں اور بنیاد بھی مضبوط، جمال بھی ہو اور جلال بھی۔ اسی طرح ہم چاہتے

ہیں کہ شخصیت کا کوئی پہلو کمزور نہ رہ جائے۔ ہمارا ادارہ ایک ایسا کارخانہ بن کر نہ رہ جائے جو محض اچھے کھلاڑی یا بڑے سپاہی یا صرف اچھے کمانڈر یا فقط کتابی کیڑے ڈھالتا رہے بلکہ خود دار ناقابلِ شکست صحت مند اور تخلیق پسند شخصیتیں تیار کرے۔

یہ اقتباس ۸۴-۱۹۸۳ء کے اداریہ کا تھا۔ اسی موضوع پر وہ ۸۶-۱۹۸۵ء کے اداریہ میں لکھتے ہیں۔

ڈسپلن کے بارے میں یہ نقطۂ نظر مسلسل نشوونما پا رہا ہے کہ روایتی فرماں برداری کے نظام پر مبنی ڈسپلن سطحی ہوتا ہے۔ حقیقی ڈسپلن وہ ہوتا ہے جو صحیح و غلط، نیک و بد اور مفید و مضر کے شعور سے پیدا ہوتا ہے جس میں کوئی دوسرا ہمیں انگلی پکڑ کر نہیں چلاتا بلکہ ہم خود اپنی مرضی اور ارادہ کی مدد سے قدم اٹھاتے ہیں۔ قدم ہی نہیں اٹھاتے بلکہ مسلسل اپنی کارکردگی کا جائزہ بھی لیتے رہتے ہیں۔ اپنا احتساب کر کے اپنی غلطیوں کو درست کرتے رہتے ہیں۔ یہ ڈسپلن کا روشن خیالانہ نظریہ ہے جس میں زندگی کی باگیں خود ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ جس میں ہم اپنے عمل سے اپنا راستہ بناتے ہیں ڈسپلن کے اس نظام میں کسی کے حکم کی تعمیل سب سے بڑی نیکی تصور نہیں کی جاتی۔ اس میں ہمیں اپنی دوڑ خود ہی دوڑنی پڑتی ہے۔ اسی لیے اس میں "کوشش" کی اہمیت اور قدر و قیمت تعمیل حکم والے روایتی ڈسپلن سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ ڈسپلن لیڈر پیدا کرتا ہے، جبکہ وہ ڈسپلن، صرف اچھے ماتحت پیدا کر سکتا ہے۔ یہ ڈسپلن خود فکری اور احساس ذمہ داری کی صفات پیدا کرنے پر زور دیتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر علوی صاحب کا یہ تبصرہ کلاسیکی حیثیت رکھتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فلسفہ تعلیم پر اور طریق تربیت کے جدید نظریوں پر ان کی کتنی گہری نظر تھی۔

۸۵-۱۹۸۴ء کے عالمگیرین میں وہ اپنی باتیں کے عنوان سے تعلیم نظام میں روایت اور تجربے کے موضوع پر لکھتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں اقامتی اداروں میں سارا نظام روایات (Traditions) پر چلتا ہے۔ وہ ترقی یافتہ قومیں بھی جو زندگی کے

تمام شعبوں میں جدت کی دلدادہ ہیں، تعلیم کے شعبے میں روایات کو ایک خاص اہمیت دینا ضروری سمجھتی ہیں۔ اصل میں جو چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں وہ روایت کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں انہیں تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی بلکہ انہیں تبدیلیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یوں تو تبدیلی اور تغیر زندگی کی سب سے بڑی علامت ہے لیکن کہیں کہیں اثبات بھی زندگی کی پہچان بن جاتا ہے۔ اچھی روایت کو توڑنا ایسا ہی ہے جیسے عمارت کی بنیاد کو اکھاڑنا۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم تخلیقی قوتوں اور تجربے کرنے کی امنگ کو ایک بنیاد اکھاڑنے اور دوسری بنیاد کو رکھنے میں ہی ضائع کرتے رہیں گے تو بنیاد پر عمارت کیسے اور کب کھڑی ہو گی اور نت نئی ضرورتوں کے مطابق ہم عمارت میں توسیع کیسے کر سکیں گے؟ تعلیم میں روایات کے تحفظ اور تقدس کے پیچھے یہی فلسفہ کارفرما ہے، روایات کی افادیت یہی ہے کہ وہ بنیادوں کو قائم رکھتی ہیں۔ وہ ہماری تخلیقی قوتوں کو تجربات کے شوق کو ضائع ہونے سے بچاتی ہیں اور اس شوق کا رُخ ایسی سمت میں موڑ دیتی ہیں جدھر اس سے بہترین کام لیا جا سکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ روایت اور جدت پسندی میں صحیح توازن قائم رکھا جائے، روایت کے ذریعہ بنیادی چیزوں کا تسلسل برقرار رہے اور اس کے ساتھ ساتھ نئے تعلیمی تجربے اور تخلیقی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔

علوی صاحب نے کالج میں اپنی اداراتی زندگی میں کم و بیش تیس اداریئے لکھے۔ ان میں سے ہر اداریہ اپنی جگہ اپنے موضوع اور طرز بیان کے لحاظ سے حد درجہ وقیع ہے علوی صاحب اداریہ نگاری کی ایسی روایت اور ایک ایسا معیار چھوڑ گئے ہیں جس کو دیکھ کر میر کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

——— خطیب عبدالغفار[1]

کالج کی مسجد میں ۱۹۸۵ء کے رمضان کے ختم قرآن کے موقع پر ایک تقریر کے سلسلہ میں، میں کچھ علمی مواد تلاش کر رہا تھا۔ تراویح کے بعد میں نے علوی صاحب سے پوچھا۔ میں علوم قرآنی پر کچھ مواد ڈھونڈ رہا ہوں۔ فوراً کہا شاہ ولی اللہ کی الفوز الکبیر آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ میں نے جواب دیا ہاں لیکن یہاں دستیاب نہیں۔ میں اسی کے بارے سے بات کر رہا تھا فرمایا جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے شاہ ولی اللہ نے الفوز الکبیر میں پانچ علوم قرآنی پر بحث کی ہے پھر انہوں نے کھڑے کھڑے پانچوں گنوا دیئے۔ یہ ان کے علم کا عالم تھا۔ واضح رہے کہ الفوز الکبیر عربی میں ہے اور درس نظامی میں پڑھائی جاتی ہے وہ بھی اونچے درجے کے مدرسوں میں۔ مجھے تو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ ان کے والد مولانا بدرالدین علوی علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر رہے تھے اور ان کا سلسلہ نسب حضرت خواجہ رکن علوی یک لکھی ثمرقندی تک پہنچتا ہے جو ایک لاکھ حدیثوں کے حافظ ہونے کی وجہ سے خواجہ یک لکھی کہلاتے تھے۔

ایک روز علوی صاحب کی موجودگی میں ارباب اقتدار میں سے ایک صاحب نے مجھ سے ایک معاملہ میں کچھ تند و تیز رویہ اختیار کیا۔ دوسرے تیسرے دن علوی صاحب نے اپنی موٹر سائیکل روک کر مجھ سے کہا: "مولوی صاحب آپ ملال نہ کیجئے گا۔ اہل علم کے ساتھ یہ ہوتا آیا ہے میں بھی اس وادی پُرخار سے گزرا ہوں اور گزر رہا ہوں۔ وَتَوَاصَوْا بالحق وَتَوَاصَوْا بالصبر کے سوا چارہ نہیں۔ حوصلہ رکھیے اور اپنا کام کرتے رہیے حَسبُنَا اللہُ وَنِعمَ الوَکِیل"

——— بریگیڈیئر محمد عثمان شاہ[2]

پروفیسر علوی سے ملٹری کالج میں آنے سے پہلے میری کوئی واقفیت نہ تھی یہاں آکر ہی میں نے انہیں جانا پہچانا اور ان کی غیر معمولی خصوصیتوں کا مجھے علم ہوا۔ بحیثیت استاد ان کے علم کا دائرہ محض ان کے مضمون تک محدود نہ تھا۔ جیسا کہ اکثر دیکھنے میں

---

[1] خطیب ملٹری کالج از ۱۹۷۸ء تا حال [2] کمانڈانٹ ملٹری کالج ۸۷-۱۹۸۴ء

آتا ہے بلکہ وہ بنیادی علوم وفنون پر حاوی تھے اور اس طرح انہیں یہاں کالج میں ایک مفکر اور دانشور کی حیثیت حاصل تھی۔ انہوں نے بہت پڑھا ہوا ہی نہیں بہت سوچا ہوا بھی تھا۔ اس لیے وہ تعلیم وتربیت سمیت بہت سے مسئلوں اور معاملوں میں اپنی سوچی سمجھی رائے رکھتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ملٹری کالج کی خوش قسمتی تھی کہ اسے اس پائے کا دانشور معلم اتنے طویل عرصے تک میسّر رہا۔

اُردو کے تو خیر وہ ماہر تھے ہی ان کی انگریزی بھی بے داغ تھی۔ ان کے بہت سے انگریزی ڈرافٹ میں نے دیکھے ہیں، زبان و بیان دونوں کے اعتبار سے میں نے ان تحریروں کو مکمل پایا۔ جس طرح ان کی گفتگو واضح اور موثر ہوتی تھی ان کی تحریر میں بھی یہ خوبی تھی اُردو کا کوئی اور بہتر لفظ نہ ملنے کی وجہ سے میں یہ کہوں گا وہ بہت ہی Genuine سچے، کھرے، باوقار، باکردار اور باعلم انسان تھے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل نصر اللہ خاں[1]

علوی صاحب کو میں نے کبھی ہاں میں ہاں ملاتے نہیں دیکھا۔ اپنی رائے کا برملا لیکن مدلّل طریقے سے اظہار کرتے اگر ان کی رائے کے خلاف فیصلہ ہوتا تو اپنے اختلاف کے باوجود اسے قبول کرتے۔ میں نے ان کو کبھی کرب کرتے بھی نہ دیکھا نہ سنا۔

بظاہر دیکھنے میں خشک نظر آتے تھے لیکن درحقیقت خوش مزاج تھے۔ محفلوں میں دلچسپ فقرے چست کرتے۔ بعض اوقات بہت سخت تنقید مزاحیہ انداز میں کر جاتے پروفیسر علوی مجلسی آدمی تھے۔ دوستوں میں، تقریبات میں، فلم شوز میں، آتے جاتے بھی تھے۔ سیر وسفر کا شوق بھی تھا، سوات، کاغان، گلگت اور کشمیر کی سیاحتوں کے واقعات سنایا کرتے۔

میں ان کے کام اور قابلیت کا ذکر قصداً نہیں کر رہا ہوں۔ اس میں تو وہ یکتا تھے ہی۔ ان کی آخری علالت کے دنوں میں مجھے تقریباً ہر روز ان کی عیادت کا موقع بلکہ شرف بھی ملا۔ ڈی۔ آئی لسٹ پر تھے مگر کیا مجال کہ ذرا گھبرائے ہوں یا مایوسی کا اظہار

---

[1] چیف انسٹرکٹر ملٹری کالج، ۵۰۔ ۱۹۸۵ء

کیا ہو۔ وہ الٹا ہمیں حوصلہ دیتے۔ اللہ اکبر۔

——— سعید راشد

علوی صاحب مزاح نگار سے زیادہ طنز نگار تھے۔ ان کے بہت ہی Subtle قسم کے طنزیہ انشائیے کالج میگزین کے تقریباً ہر شمارے میں ۱۹۵۴ء سے (جب انہوں نے ترہیت کی ادارت سنبھالی) ۱۹۸۶ء تک شائع ہوتے رہے۔ ان میں سے چیدہ چیدہ انشائیوں کے ٹکڑے پیش کیے جاتے ہیں۔

ان کا پہلا انشائیہ ہنسی کے عنوان سے ۱۹۵۴ء کے ترہیت میں شائع ہوا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں۔ ایک ہنسی وہ ہوتی ہے جو پھولوں کی طرح تر و تازہ اور شگفتہ ہوتی ہے اور مسرت کی ایک لہر دوڑا دیتی ہے۔ ایک ہنسی ہے کانٹوں کی طرح چبھنے والی جو بجلی کے جھٹکے کی طرح جھنجھوڑ دیتی ہے، طنز اور حقارت کی ہنسی، غصے کی ہنسی بھی آپ نے ضرور دیکھی ہوگی یا آپ غصے میں ہنسے ہوں گے۔ پھر سب سے انوکھی ہے بے بسی کی ہنسی۔ نطشے نے سچ کہا تھا کہ ہم اس لیے ہنستے ہیں کہ رو نہیں سکتے۔

۵۷-۱۹۵۶ء کے ترہیت میں ان کا ایک مزاحیہ جنگ کہ کمزوری کے نام سے شائع ہوا تھا اس کی ابتدائی سطریں یہ ہیں۔ حیوان اس وقت لڑتے ہیں جب ان کو بھوک لگتی ہے۔ خواہ وہ پیٹ کی بھوک ہو یا کسی اور قسم کی ——— لیکن انسان وہ حیوان ہے جو عموماً پیٹ بھرنے کے بعد لڑتا ہے۔ یہ ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا کہ اس دور کے انسان کی بھوک کس چیز سے سیر ہوتی ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ پیٹ بھرنے سے اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔

۶۰-۱۹۵۹ء کے شمارہ کے انشائیہ کا عنوان تھا۔ شعلہ سا لپک جائے ہے ۔ ۔ ۔ ۔

جس میں انہوں نے کلاسیکی موسیقی کی اچھی خاصی مزاج پرسی کی تھی۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ روح کی غذا بھی ضروری چیز ہے۔ لیکن بعض غذائیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر بالکل خالص کھائی جائیں تو کھانے والے ہی کو کھا جاتی ہیں غذا کے بارے میں روح کی عادتیں بھی جسم سے کچھ ایسی مختلف نہیں معلوم ہوتیں۔ اگر روح کو اس قدر خالص غذا ملے جیسی ہماری

کلاسیکی موسیقی تو بہت جلد وہ اس نفس عنصری سے پرواز کرنے کی کوشش شروع کر دے گی۔ ۶۲-۱۹۶۱ء کے تربیت۔ طنزیئے کا عنوان تھا۔ تہذیب اور چھلکے۔ اس کا ایک اقتباس دیکھئے۔

انسان جیسے جیسے مہذب ہوتا جا رہا ہے وہ اپنے احساسات، خیالات اور نیت کو اس سے بھی زیادہ نظر فریب پوشاک پہنانے لگا ہے جتنی وہ اپنے جسم کو پہناتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جسم کے کپڑے وہ ہر روز بدل دیتا ہے۔ مگر شعور و لاشعور کے کپڑے بدلنے میں وہ بےحد کاہل واقع ہوا ہے۔ ۶۴-۱۹۶۳ء کا انشائیہ "افواہ" میں اس طرح شروع ہوتا ہے افواہ بے پاؤں کے چلتی ہے، بے پر کے اڑتی ہے، بے دماغ کے سوچتی ہے۔

۶۹-۱۹۶۸ء کے تربیت میں علوی صاحب نے طالب علم کو موضوع گفتگو بنایا۔ طالبعلم کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ یہ ایک ایسا "جراثیم" ہے کہ درسگاہوں، اساتذہ اور امتحانات کے اینٹی بائٹک (Antibiotic) جس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ وہ ان سے محفوظ (Immune) ہو چکا ہے۔ وہ اکثر علم کے سمندر سے ایسا صاف گزر جاتا ہے کہ کپڑے تک نہیں بھیگتے۔ ۷۴-۱۹۷۳ء کے انشائیہ "چکر" میں یہ نکتہ آفرینی ملتی ہے۔ ساری کائنات چکر میں ہے۔ ستاروں اور سیاروں سے لے کر الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون تک سبھی دائرہ میں اور بے تحاشا چکر کاٹنے میں مصروف ہیں۔ چھوٹے بڑوں کے گرد اور بڑے اپنے سے بڑوں کے گرد کہکشاں کے نظام کسی اس سے بھی بڑے نظام کے گرد پھر یہ سارا نظام کائنات اس سب سے بڑی ہستی کے گرد جو مرکز بھی ہے اور محیط بھی یہاں بھی ہے اور وہاں بھی لیکن نگاہوں کی آلودگی سے بالاتر۔

۱۹۷۵ء کے گولڈن جوبلی نمبر میں طنزیہ برائے کے عنوان سے تھا۔ اس میں علوی نے جنگ برائے جنگ کے سلسلہ میں لکھا۔ لیکن صاحب جنگ وہ کافر چیز ہے کہ منہ سے لگی ہوئی آسانی سے نہیں چھٹتی بھی نہیں۔ جب تک بارود اور بم سلامت ہیں بیچاری فاختہ اور اس کی چونچ میں جھولتی ہوئی زیتون کی ٹہنی کیا کر سکتی ہے جنگ کی آگ تو وہ ہے کہ ایک بار بھڑک اٹھے تو عشق کی طرح بجھائے نہ بنے۔ بل

کے عنوان سے ۸۰-۱۹۷۹ء کے ترہیت میں شائع ہونے والے انشائیہ میں یہ عزم انگیز پیغام ملتا ہے۔

پہیے اور پل دونوں نے انسان کی مشکلیں آسان کی ہیں۔خواہ وہ گاڑی کا پہیہ ہو یا کارخانے کی مشین کا۔ دریا کا پل یا چھوٹے کا۔لیکن جو ہمت والے ہیں وہ پہیوں اور پلوں سے بے نیاز ہوتے وہ ہر چیلنج پر اپنے عزم کا پل باندھ لیتے ہیں۔بلکہ یوں کہیے کہ دریا ان کے احترام میں راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔پہاڑ ان کو دیکھ کر ایک طرف کو ہو جاتے ہیں۔ان کی راہ میں حائل ہونے کی جسارت کون کر سکتا ہے۔

۸۲-۱۹۸۱ء کے عالمگیرین کی زینت ان کا وہ خوبصورت طنزیہ بنا جس کا عنوان ستارے اور ایٹم بم تھا۔وہ یوں شروع ہوتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ ستاروں کی ایک ہی قسم ہوا کرتی تھی وہ جو رات کو آسمان پر چمکتے ہیں لیکن وقت کے ساتھ نسل میں اضافہ تو ہونا ہی ہے اب ماشاء اللہ ستاروں کی بے شمار قسمیں پیدا ہو چکی ہیں۔مثلاً آسمان کے تارے لوگوں کی آنکھ کے تارے فلمی ستارے دمدار ستارے وہ تارے جنہیں توڑ کر محبوب کے قدموں میں بچھانے کے لیے سکہ بند قسم کے عشاق ہر وقت کمر باندھے رہتے ہیں۔مگر فلک پیر پر ترس کھا کر رک جاتے ہیں۔کچھ ستارے ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے گاڑیوں ہوٹلوں اور حاکموں کی حیثیت ناپی جاتی ہے۔

۸۴-۱۹۸۳ء کے شمارہ میں سفر کی ابتدائیں ہوتی ہے۔کسی زمانہ میں سفر اسی وقت کیا جاتا تھا۔جب کوئی چارہ نہ رہ جائے۔امام ضامن باندھتے تھے رونا دھونا بھی بقدر توفیق ہو جاتا تھا۔لیکن اب لوگ گھر پر صرف اس وقت بیٹھتے ہیں جب کوئی چارہ نہ رہ جائے شاعر نے تو فلسفیانہ مفہوم میں سفر کو مصیبت اور حضر کو مجاز کہا تھا لیکن اب نہایت غیر فلسفیانہ مفہوم میں بھی ہم سفر کو --- اور خانہ نشینی کو ایک دھوکا یا سراب کہہ سکتے ہیں کیونکہ سفر ہی اب ہماری نارمل زندگی ہے۔گھر پر بیٹھنا اب ایک ایسی عیاشی بن گئی ہے جو کبھی کبھی میسر آسکتی ہے۔"

افراطِ زر (عالمگیرین ۸۵-۱۹۸۴ء) میں لکھتے ہیں "افراطِ زر کا دور دورہ ہو تو جیبوں میں نوٹوں کی کثرت ہوتی ہے اور بازار میں چیزوں کی قلت، ان حالات میں ظاہر ہے جیبیں خالی بھی بہت جلد ہو جاتی ہیں یعنی افلاسِ زر کا سامنا ہوتا ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ دانشوروں نے اس حالت کا نام افراطِ زر رکھ دیا ہے، یہ بھی ان لفظوں میں سے ہے جو ہوتے کچھ ہیں اور نظر آتے ہیں کچھ اور۔

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

مشرق اور مغرب۔ جھوٹے تصورات، وہ آخری فلسفیانہ انشائیہ تھا جو علوی صاحب کے قلم سے ۸۶-۱۹۸۵ء کے عالمگیرین میں شائع ہوا۔

یہ صحیح ہے کہ مشرق سے صرف سورج ہی طلوع نہیں ہوتا بلکہ فلسفہ، طبعیات، کیمیا، ریاضی، فلکیات، طب، تصوف، موسیقی، مصوری، سنگتراشی، رقص ڈرامہ بھی طلوع ہوئے لیکن جلد ہی اسے اندھیرے میں چھوڑ کر مغرب میں اجالا کرنے کے لیے چل دیئے۔ اب اس عظیم مشرق کو جس کے قصیدے پڑھتے ہم نہیں تھکتے۔ اس روحانیت سے لبریز مشرق کو عوام کے محاورے کے مطابق کس کی نظر کھا گئی؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرق کے زوال کا بیج خود اس کے اندر موجود تھا۔ اگر ایک طرف اس پر دیوتاؤں اور پیغمبروں کی فرماں روائی رہی تو اسی مشرق میں چنگیز، ہلاکو اور تیمور جیسے جابروں اور آمروں کی مہیب گرفت بھی رہی جس نے یہاں کے عوام میں تخلیقی جذبے، انفرادیت، ایجاد پسندی کی صلاحیتوں کو ناقابلِ بیان نقصان پہنچایا۔"

ملٹری کالج کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اس پائے کا مفکر انشا پرداز اتنے طویل عرصے تک اس کی آبیاری کرتا رہا۔

آخر میں، میں تبرک کے طور پر اقبال بر علوی صاحب کے چند تنقیدی مضامین کالج میگزین سے نقل کرتا ہوں تاکہ سند رہے کہ ان کی سوچ کا رُخ کیا تھا۔

فکر اقبال میں ملک و نسب اور نظریہ کا مقام

——— عین الدین علوی

ادب کی بڑی شخصیتوں پر ہمیشہ اختلاف اور مباحثے ہوتے رہے ہیں۔ خیام، حافظ، شیکسپیئر، برنرڈ شا، آسکر وائلڈ، ابن عربی، غالب، نٹشے، جوش (یہ فہرست ختم ہونے والی نہیں) یہ سب اختلاف و مخالفت کا نشانہ بنے ہیں۔ اگر کچھ انہیں دیوتا بنا بیٹھے تو بعضوں نے ان کی عظمت ہی سے انکار کر دیا۔

لیکن میرا خیال ہے اس طرح کے اختلاف رائے کی بنیاد نقاد کے ذاتی رجحان اور مزاج پر ہوتی ہے۔ برنرڈ شا کا رومان دشمن مزاج جو شاعرانہ حسن بیان پر طنز و مزاح کو ترجیح دیتا تھا شیکسپیئر کی عظمت کو گھٹانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اسی مزاج کے لوگ جوش پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور اس کی زبردست قوتِ بیان اور بے پناہ تشبیہہ و استعارہ تراشی کی طرف سے بھی آنکھ بند کر لیتے ہیں۔

اسی طرح کچھ حضرات اقبال کی بنیادی اسلام دوستی سے ناخوش ہو کر اس کے خیالات کی گہرائی اور پہنائی کی طرف پوری توجہ نہیں دیتے کیونکہ یہ حضرات ڈرتے ہیں کہ اقبال کی عظمت کے اعتراف سے کہیں ان پر قدامت پرستی کا الزام نہ لگ جائے۔

اس مضمون میں میری کوشش یہ ہے کہ اقبال کے ان نکتہ چینوں کا جواب دوں جو فرماتے ہیں کہ ابتدا میں اقبال کے یہاں وطن اور اہل وطن کے لیے محبت ہی محبت تھی۔ بلا لحاظِ مذہب و عقیدہ۔ لیکن بعد میں وہ فرقہ پرستی کی طرف آ گیا۔ اس کی ہمدردیاں صرف اپنے ہم مذہب افراد تک محدود رہ گئیں۔ اس کی انسان دوستی سمٹ کر اسلام دوستی بن گئی۔

میں واضح کروں گا کہ اس انداز فکر اور اس نکتہ چینی میں مغالطہ ہے۔ اصل میں اقبال کا کینوس اس وقت زیادہ محدود تھا جب اس کی محبت اور ہمدردیاں صرف وطن کی جغرافیائی حدود کی پابند تھیں اور اس وقت اس کے تصورات عالمگیر بنے جب وہ بتانِ رنگ و خون کو توڑ کر ملت میں گم ہو جانے کا سبق دینے لگا۔

انسانوں کی گروہ بندیاں عموماً دو قسم کی ہوتی رہی ہیں: ایک قبائلی یا جغرافیائی جو ترقی کر کے قوم پرستی اور وطنیت کا روپ اختیار کر لیتی ہے (۲) وہ گروہ بندی جو نظریئے، عقیدے یا فلسفۂ زندگی کے اشتراک پر مبنی ہوتی ہے، مثلاً روس، کیوبا، چیکوسلواکیا، بلغاریہ وغیرہ کا اتحاد یا گروہ بندی اشتراکی نظریۂ زندگی پر ہے۔ اسی طرح وہ ملک جو سرمایہ دارانہ مسلکِ زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔ مثلاً امریکہ، برطانیہ، فرانس، روڈیشیا، جنوبی افریقہ، انڈونیشیا، ملیشیا وغیرہ انہوں نے اپنی ہی انجمن امداد باہمی بنا رکھی ہے کہ اگر ان میں ایک کو خطرہ دکھائی دیتا ہے تو دوسرا اسلحہ سے لدے ہوئے جہاز لے کر دوڑتا ہے پھر لیجئے اسرائیل کی مخصوص ہیئت کو۔ وہاں اشتراک کی بنیاد نسل و وطن پر بھی ہے اور عقیدہ و نظریہ پر بھی۔ دونوں کا معجون مرکب کہہ لیجئے۔ یعنی یہ گروہ بندی قبائلی قسم کی بھی ہے اور نظریاتی بھی۔

مسلمانوں کی تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بھی دونوں اندازِ نظر ادل بدل کر آتے رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے بعض ادوار میں ہندوستان کی سکونت ہی کو اتحاد کا رشتہ سمجھا۔ نظریئے یا عقیدے کی بنا پر جو ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی ہوتی ہے، اسے اتحاد کا وسیلہ بنانے کی بجائے جغرافیائی سرحدوں اور نسلی وحدت کو وسیلہ بنایا۔ لیکن یہ ایک فرسودہ Primitive انداز نظر ہے کیوں کہ جیسے جیسے انسان کی جبلتوں اور جذبوں میں ارتفاع (Sublimation) ہوتا ہے ویسے ویسے انسان سرزمین یا قبیلے کی بجائے فکر و خیال کو زیادہ اہمیت دینے لگتا ہے۔ ظاہر ہے یہ بات اتنی اہم نہیں ہے کہ کوئی کیا کھاتا، کیا پہنتا، کون سی زبان بولتا ہے، کہاں رہتا ہے اور کس کا پڑپوتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ کیا سوچتا ہے، کیا محسوس کرتا ہے، اس کے ارادے کیا ہیں، آرزوئیں کیا ہیں۔ یعنی سکونت اور نسل اتنی اہم نہیں جتنا طرزِ فکر اور نظریۂ زندگی۔

ہم اقبال کے یہاں بھی اسی طرح رفتہ رفتہ ارتفاع کی کارفرمائی دیکھ سکتے ہیں جس طرح انسانی معاشرے میں ہوتی رہی ہے۔ وہ نسلی، وطنی یا جغرافیائی رشتۂ اتحاد سے آگے بڑھا اور اس نے محسوس کیا کہ فکر یا نظریئے کی بنیاد پر انسانی شیرازہ بندی زیادہ ٹھوس ہو گی کیونکہ اس کا ذہن ترقی پسند تھا۔ یہ عجیب منطق ہے کہ اس ذہنی ترقی کو نا پسندیدہ

قرار دے دیا جائے اور اس پر فرقہ پرستی کا لیبل لگا دیا جائے۔ بتانِ رنگ و خون کو توڑنے کا پیغام بھی اگر رجعت پسندی ہے تو پھر ترقی پسندی اور روشن خیالی کسے کہتے ہیں۔ روڈیشیا، جنوبی افریقہ اور ان کی سرپرست طاقتیں کھلم کھلا یا مکارانہ ڈپلومیسی کی نقاب اوڑھ کر اب بھی رنگ و نسل کے بت پر بے گناہ انسانوں کو جس طرح بھینٹ چڑھا رہی ہیں، وہ غالباً اقبال کے ان نقادوں کی نگاہ میں ترقی پسندی ہے۔

اقبال نے اسلام میں رنگ و نسل کے بتوں کی شکست کا امکان دیکھا۔ اسلام میں محبت کی بنیاد نسلی عصبیت یا وطن کی حدود پر نہیں بلکہ افکار اور عقائد کی وحدت پر ہے۔ بہتر انسان کا پیمانہ بھی حسب و نسب نہیں بلکہ نیکی اور پاکبازی ہے، پھر اگر اقبال انسانوں کو رنگ و نسل کے بجائے توحید کے رشتے میں منسلک دیکھنا چاہتا ہے تو اعتراض کی کوئی معقول وجہ؟ انسانوں کا اتحاد ہونا ہی ہے تو نسل اور وطن کے تنگ دائرے کے مقابلے میں اگر زیادہ وسیع بنیاد پر ہو تو برائی کیا ہے؟

آپ کہہ سکتے ہیں کہ پھر تمام انسانوں کا اتحاد کیوں نہ ہو۔ صرف مسلمانوں کا کیوں؟ یہ خیال ہے تو نہایت معقول لیکن انسان ابھی تک اتنے غیر جانبدار نہیں ہو سکے ہیں کہ کسی شرط کے بغیر بھائی بھائی بن سکیں۔ انسان دوستی بڑا پیارا مسلک ہے لیکن یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ مسلک آج کی دنیا میں عملاً اتنا ہی نایاب ہے جتنا یہ پیارا ہے انسان دوستی کا مسلک ابھی تک ایک زندہ قوت Effective force نہیں بن سکا ہے آپ پھر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام بھی موجودہ دنیا میں ایک موثر نظریہ زندگی یا ایک زندہ قوت کے روپ میں کہیں نظر نہیں آتا۔ میں مانتا ہوں کہ وہ اس وقت اسلام صرف ایک عقیدہ یا تھیوری ہے لیکن کم از کم ماضی میں ایک تاریخ ساز اور حیات افروز قوت رہ چکا ہے۔ اسے دوبارہ اپنی خفتہ قوت اور صلاحیت کا احساس تو دلایا جا سکتا ہے۔ اس احساس کے بعد اسے ایک زندہ قوت بن کر دوبارہ ابھرنے میں بہت دیر نہیں لگے گی۔ کیوں کہ اس کے پیروسارے کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے ہیں اس کے مقابلہ میں کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ انسان دوستی Humanism کے پیروؤں کی تعداد سمندر میں قطرے کے برابر ہے۔

یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ اسلام اور انسان دوستی متضاد چیزیں ہیں اسلام ہی نے تو سب سے پہلے انسان دوستی کا اعلان کرتے ہوئے قبیلے، وطن یا دولت کی خاطر خون ریزی کی ممانعت کر دی اور اعلیٰ انسانی قدروں کو برتری اور خوبی کا معیار ٹھہرایا۔ اور یہی دونوں چیزیں انسان دوستی کے مسلک کی بھی بنیاد ہیں۔

یہاں نکتہ چیں کہہ اٹھیں گے کہ اسلام میں خوں ریزی کی اجازت ہے یہ کون سی انسان دوستی ہے! تو میں عرض کروں گا کہ خون ریزی کی اسلام اجازت نہیں دیتا، صرف دفاع کی اجازت دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلام میں صرف انسانی اقدار کی خلاف ورزی ظلم اور ناانصافی کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت ہے۔ یہ تو آپ بھی مانتے ہوں گے کہ انسانی اقدار کا خون ہوتے دیکھنا اور کچھ نہ کرنا انسان دوستی ہرگز نہیں۔ کیا فلسطینی عربوں اور روڈیشیا اور جنوبی افریقہ کے کالوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف تلوار نہ اٹھانا خود ایک ظلم نہیں؟ مجاز جیسا انسان دوست شاعر اسی لیے کہتا ہے۔

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھالے تو بڑا کام ہے یہ!

اس ظلم سے بھری دنیا میں کبھی کبھی تلوار اٹھانا جائز ہی نہیں ہوتا بلکہ نہ اٹھانے کے مقابلے میں زیادہ خوب صورت اور خوش گوار فعل بن جاتا ہے۔

اب پھر ان نقادوں کی طرف آیئے جو کہتے ہیں کہ یورپ سے واپسی کے بعد اقبال کی نظر محدود اور اس کی ہمدردیاں اپنے ہم مذہبوں کے لیے مخصوص ہو گئیں۔ ٹھنڈے دل سے دیکھئے تو ہر شاعر اپنے مخصوص معاشرے کے مسائل کو اوّلین اہمیت دیتا ہے اسے ہمدردی تو ساری انسانیت سے ہوتی ہے لیکن خون کے آنسو وہ انہی کے لیے بہاتا ہے جو سب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اقبال کا ردعمل بھی فطری ہے وہ بھی بہت بڑا انسان دوست ہوتے ہوئے سب سے زیادہ فکر، ہمدردی پریشانی اور دکھ ان کے لیے محسوس کرتا ہے جو فکر اور نظریئے کے اعتبار سے اس کے قریب ترین ہیں جن کے ساتھ اس کا تاریخی اور جذباتی تعلق ہے۔ اور اس گناہ کے سبھی بڑے بڑے شعراء مرتکب

ہوئے ہیں۔ ملٹن، سعدی، رومی، گوئٹے، نٹشے، ایمرسن، ٹیگور، وکٹر ہیوگو ان میں سے چند ہیں۔ ان تمام ادیبوں اور مفکروں پر اپنوں سے ہمدردی کا زیر دست الزام لگ سکتا ہے۔ گوئٹے جرمنوں کو شرم دلاکر تیز گامی کی ترغیب دیتا ہے۔ نٹشے جرمنوں کو Master Race یا حکمراں نسل دیکھنے کے لیے فلسفیانہ افسانہ تراشیاں کرتا ہے۔ خلیل جبران لبنانیوں کی فلاکت پر آنسو بہاتا ہے ہیوگو اتنا بڑا انسان دوست (Humanist) ہوتے ہوئے بھی فرانس کے لیے اپنا تعصب نہیں چھپا سکتا۔ وہ مسلمانوں کے اس قصور کو کبھی معاف نہیں کر سکتا کہ انھوں نے کبھی فرانس کی شہنشاہیت سے ٹکر لی تھی۔

پھر اگر اقبال اپنی ملت کے لیے پگھلتا ہے تو کون سی سنگین خطا ہے جس کی بنا پر اسے فرقہ پرستی کا مرتکب اور انسان دوستی سے منحرف قرار دے دیا جائے۔

اقبال کا اپنوں کے ساتھ لگاؤ اگر تنگ نظری ہے تو دنیا کے سب بڑے شاعر اقبال کی طرح تنگ نظر ہیں۔

خلعت انگریز یا پیرہن چاک چاک

(یوم اقبال کی ایک تقریر)

—— عین الدین علوی

محترم حاضرین!

امتحان کی کاپیاں دیکھنا برسوں سے میرا مشغلہ رہا ہے (فی الحال یہ بتانا ضروری نہیں کہ پسندیدہ مشغلہ یا ناپسندیدہ) علامہ اقبال کے متعلق کوئی سوال ہو تو ناممکن ہے کہ ہر کاپی میں یہ فقرہ نہ دوہرایا گیا ہو کہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری سے قوم کو جگا دیا اس جملے کی تکرار کچھ ایسے تسلسل سے ہوئی ہے کہ یقین سا ہونے لگتا ہے کہ قوم کا پسندیدہ مشغلہ "سونا" ہے لوگ کہتے ہیں زمانہ بہت بدل گیا ہے لیکن اس وقت اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے زمانہ نہیں بدلا۔ قوم کا وہ حصہ جو اس ہال میں بیٹھا ہے اس کی معقول تعداد اپنے اسی پسندیدہ مشغلے سے دل بہلاتی رہی ہے۔

لیکن حضرات! اس غیر معمولی انسان کی خاطر جس نے آپ ہی کے قول کے مطابق قوم کو جگایا تھا آج رات تھوڑی دیر جاگ لینا کچھ ایسی فضول خرچی نہیں ہوگی۔

حضرات۔ اقبال کو خودی کا شاعر کہا گیا۔ اس کے علاوہ عشق کا شاعر، ملت کا شاعر، کسی نے علامہ کہا۔ کسی نے ترجمان حقیقت، کسی نے شاعر انقلاب لیکن مجھے حیرت ہے کوئی یہ کیوں نہیں کہتا کہ اقبال آزادی کا شاعر ہے۔

کچھ حضرات کو شبہ ہوتا ہے کہ جسے حکومت برطانیہ نے سر کا خطاب دیا ہو اسے تو دائیں بازو والا سمجھنا چاہیے۔ اسے آزادی سے کیا واسطہ۔ لیکن یاد رکھیئے کوئی بڑا دماغ محض خطابوں یا عہدوں سے کبھی نہیں خریدا جا سکتا۔ حالی و شبلی کو بھی انگریز نے شمس العلماء کا خطاب دے کر لبھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر کیا ان کی حق گوئی میں کوئی کمی آئی؟ آج میری بات چیت سے ظاہر ہو گا کہ شاعر مشرق کی حق گوئی و بے باکی بھی سر کے خطاب کو کبھی خاطر میں نہیں لائی۔

کسی طرف سے دبے دبے لہجے میں یہ سوال سنائی دیتا ہے "کیا وہ کبھی جیل گئے تھے کیا انہوں نے کھدر پہنا؟" لیکن حضرات کیا اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے؟ یہی سوال قائداعظمؒ کے بارے میں بھی دوہرائے جا چکے ہیں۔ آزادی کے جہاد کا راستہ صرف جیل ہی سے تو نہیں گزرتا۔ تحریک آزادی کی جو خدمت ہمارے اس عظیم شاعر نے کی ہے وہ سب سے بڑی ہے لوگ شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ آزادی کا تصور ہمارے دلوں میں اسی نے زندہ کیا۔ ہم جو سو برس سے اس دال روٹی پر مطمئن ہو چلے تھے جو انگریز کے "جیل خانے" میں ہمیں مل جاتی تھی، اسی کی ولولہ انگیز آواز سے چونکے اور ہماری سمجھ میں آنے لگا کہ یہ وہ روٹی ہے جس سے ہماری قوت پرواز گھٹتی جا رہی ہے۔

ہمارے بعض نقاد اپنی کچھ مصلحتوں کے تحت یہ فرمانے لگے ہیں کہ اقبال اب پرانا ہو گیا۔ وہ Out of date ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن آپ خود دیکھ لیں گے کہ دس سال بعد یہ خود آؤٹ آف ڈیٹ ہو جائیں گے۔ اقبال زندہ اور جوان ہے۔ اور زندہ و جوان رہے گا کہ دور حاضر کی تمام پیچیدگیوں کو اس نے سمجھا ہے، ہم

سب سے زیادہ سمجھا ہے۔ اقبال کی اپنی زندگی میں امپیریلزم ـــــ برطانوی سامراج ہماری زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ آج ہم مشرقی ملکوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے نیا نو آبادیاتی نظام برطانوی سامراج بھی صرف ہماری سیاسی غلامی تک محدود نہیں تھا۔ اور نئی سامراجیت بھی امداد اور سرپرستی کا خوش نما برقع اوڑھ کر ہمارے دلوں میں اتر جاتی ہے۔ ہماری روحوں پر مسلط ہو جاتی ہے۔ اقبال کی غیر معمولی ذہانت نے شہنشاہیت کا اصل بھیانک چہرہ بھی ہمیں دکھا دیا اور نئے سامراج کی برقع پوش حکمرانی کا برقع بھی اتار کر پھینک دیا۔ وہ حکمرانی جو ہماری سوچ، ہمارے ارادوں، ہمارے خوابوں، ہماری پسند ناپسند غرض ہمارے سارے وجود کو اپنے چنگل میں دبوچ لیتی ہے جو پہلے محتاج بناتی ہے پھر محکوم۔

انگریز کی غلامی کے نقصانات کیا تھے؟ انگریز نے ہمیں اپنی ہی نظر میں چوتھے درجے کا انسان بنا دیا ہماری تخلیقی قوتیں چھین لیں۔ ہمارا قومی غرور، ہمارا شاندار تہذیبی کردار (Role) چھین لیا۔ غلامی نے ہمیں یقین دلایا کہ تم کچھ نہیں ہو۔ گورے سب کچھ ہیں۔ تمہاری تاریخ سے تو "بوئے خون آتی ہے"۔ دماغ ہے تو سفید آقاؤں کے پاس، طاقت ہے تو ان کے بازو میں۔ حکومت سجتی ہے تو ان پر۔ رہا علم اور تحقیق کا میدان تو اس میں ان کے دسترخوان کے بچے کھچے ٹکڑے ہاتھ آ جایا کریں تو اپنی خوش نصیبی سمجھو۔ تم کمزور ہو اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ ان کی دی ہوئی بیساکھیوں کا سہارا ضروری ہے۔

خدا کی شان دیکھئے کہ سفید قوم اس ملت کو تہذیب سکھانے آئے جس نے خود دنیا کو تہذیب سکھائی۔ یہ نوبت کیوں آئی؟ اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ جب تک ہماری قوم ہر لحظہ تحقیق اور جستجو میں مصروف تھی، آزاد تھی اور غالب تھی۔ لیکن جب ہم نے نئی باتیں سوچنا چھوڑ دیا۔ ہم دوسروں کے پیروں تلے کچلے گئے، ہم غلام ہو گئے۔

غلامی اصل میں دل و دماغ کی ایک خاص حالت کا نام ہے جس میں ہم اپنی نالائقی کو تسلیم کر لیتے ہیں کسی اور قوم کو اپنا سرپرست مان لیتے ہیں۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ حاکم قوم کرسی کو ہمارے لیے خالی کر کے چلی بھی جاتی ہے پھر بھی ہم رہتے ہیں غلام ہی۔

حضرات! اقبال اسی غلامی کی جڑ تک پہنچا۔ اس نے محض ظاہری سیاسی غلامی کی زنجیریں توڑ دینا کافی نہیں سمجھا۔ وہ تو ہمارے سامنے اتنا اونچا آئیڈیل رکھتا ہے کہ سیاسی آزادی اس کا ایک معمولی سا نتیجہ ہے۔ وہ آئیڈیل کیا ہے؟ ایک نئی دنیا پیدا کرنا۔
وہ چاہتا ہے ہم زندگی کا ڈھانچا ہی سرے سے بدل ڈالیں۔ ہم اپنے تیشے سے اپنا راستہ بنائیں۔ وہ دوسروں کے راستے پر چلنا حرام سمجھتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک خوددار قوم کی توہین ہے۔ ایک ایسی قوم جو جدت طراز ذہن رکھتی ہو۔ جسے تخلیق کے گُر معلوم ہوں۔ وہ دوسروں کے افکار اور مانگے ہوئے نظام زندگی کی پیروی کس طرح کر سکتی ہے۔ قوم کی خودی یہی ہے اقبال ہمیں یوں غیرت دلاتا ہے۔

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی کیا اپنی خودی تک بھی نہیں تجھ کو رسائی

کبھی وہ غلامی پر رضامند ہو جانے والی اس قوم پر یوں کڑھتا ہے۔

حلقۂ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں آہ محکومی و تقلید و زوال تحقیق

اسے دکھ ہے تو یہ کہ ہمارے جسم ہی انگریز کے غلام نہیں، ہمارے فکر و خیال بھی غلام ہو گئے ہیں۔

ترا وجود سراپا تجلی افرنگ کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

آزادی کا اصل تقاضا ہے کہ ہم فرنگ سے رہنمائی لینا چھوڑ دیں۔

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

چند صدیاں پہلے وہ وقت بھی گزرا ہے کہ ہم چٹان تھے۔ مگر عیار فرنگی نے اپنے تہذیبی اور فکری ہتھکنڈوں سے چٹان کو پگھلا کر پانی کر دیا۔ پھر اقبال آیا اور اس نے یاد دلایا کہ ہم چٹان ہیں۔ وہ فاتحانہ انداز سے اعلان کرتا ہے کہ:

ع مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختی خارا

وہ آزادی کا شیدائی تھا اور غلامی کو موت سے بدتر سمجھتا تھا۔

موت ہے اک سخت تر، جس کا غلامی ہے نام
مکر و فن خواجگی کاش سمجھتا غلام

حضرات! اقبال کے نزدیک اسلام اور غلامی دو ایسی چیزیں ہیں جو اکھٹی نہیں ہو سکتیں کیوں کہ مومن تو خواجۂ الفاظ ہوتا ہے جب کہ کافر اور غلام بندۂ افلاک ۔یہ دنیا اقبال کے افلاک میں کافر کو شکار کر لیتی ہے اور مومن کا شکار ہو جاتی ہے۔ دیکھئے آزادی اور اسلام کا تعلق کس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔

ع قبول حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں

یعنی اللہ تعالیٰ تکبیر بھی اسی کی قبول کرتا ہے جو آزاد ہو۔

اس وقت میں پھر وہی بات دوہرانا چاہتا ہوں جو میں اکثر آپ سے کہتا رہتا ہوں کہ ہمیں آج اقبال سے رہنمائی لینے کی جتنی ضرورت ہے اتنی شاید پہلے بھی نہیں تھی۔ اگر ہم اقبال کے اس مشورے کو یاد رکھتے کہ کسی اور کی روشنی کا طواف کرنے کی بجائے اپنے ہی سینے میں شعلہ روشن کرو تو آج غیر ملکی ماہرین کے مشوروں کے لیئے کاسہ نہ پھیلاتے ہم تو نئی سامراجیت کے اس طرح شکار ہو گئے ہیں کہ ریڈی میڈ قمیضوں کی طرح ریڈی میڈ فلسفہ اور ریڈی میڈ سائنس، یہاں تک کہ عقل بھی ریڈی میڈ استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اقبال کی یہ للکار بھول چکے ہیں کہ:

بوریائے خود بہ قالینش مدہ
بیذق خود را بہ فرزینش مدہ
آنچہ از خاک تو رست اے مرد حر
آں فروش و آں بہ پوش و آں بخور[1]

آزادی اور خود کفیلی کا اس سے زیادہ بر ملا پیغام اور کیا ہو سکتا ہے۔

غلامی کے ناسور کے خلاف اقبال کے دل میں ایسی آگ بھڑک رہی تھی کہ وہ نظم ہی ہی نہیں نثر میں بھی یہی آواز اٹھاتا ہے۔ قائد اعظم ؒ کے نام ایک خط میں وہ لکھتا ہے:

---

[1] ترجمہ: اس (مغرب اور اہل مغرب) سے اگر قالین بھی ملے تو اپنے بوریئے کے بدلے ہرگز قبول نہ کر۔ اپنے پیادے کے بدلے میں اس کا فرزیں بھی ملے تو نہ لے۔ اے آزاد انسان! وہی پہن، وہی کھا اور وہی فروخت کر جو تیرے وطن کی مٹی سے اُگے۔

"مسلمان عام طور پر یہ سوچتا ہے کہ اس کی غریبی ہندو بنیے یا سرمایہ دار کی بدولت ہے۔ یہ حقیقت ابھی وہ پوری طرح نہیں سمجھا کہ یہ انگریز کی حکومت کی بدولت بھی ہے۔"

اسی خط میں آگے چل کر اسلام اور آزادی کا تعلق یوں ظاہر کیا ہے:

"اسلامی شریعت کے نفاذ کا امکان اس ملک میں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں قائم نہ ہو جائیں۔"

حضرات! آزادی، اقبال کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اور جیسا پہلے کہہ چکا ہوں اقبال کے یہاں آزادی کا مفہوم ان کی دوسری اصطلاحوں کی طرح نہایت وسیع اور گہرا ہے۔ اور اس زاویئے سے دیکھیں تو ان کا سارا کلام آزادی کے نکتے ہی کی تفسیر ہے۔ میں نے آپ کے صبر کو آزمانے سے پرہیز کیا اور ان کے کلام سے صرف چند اشارے پیش کیے۔ مجھے امید ہے کہ ان کے دو جملے اور سنا لینے کے بعد آپ مجھے روسٹرم چھوڑنے کی اجازت دیں گے یہ جملے علامہ مرحوم کے اس پیغام میں ہیں جو ۱۹۳۷ء کے سال نو کے آغاز پر ریڈیو نے نشر کیا تھا مشرقی ملکوں کی آزادی پر چھاپہ مارنے والی مغربی قوموں کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"کمزور قوموں کو غلام بنانے اور ان پر اپنی حکومت مسلط کرنے کے بعد انہوں نے غلام قوموں کے اندر تفرقے کا بیج بو دیا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کا گلا کاٹیں اور جاگیرداری کے ڈنڈے تلے زندگی بسر کریں اور شہنشاہیت کی جونک پورے اطمینان سے ان کا خون چوستی رہے۔"

حضرات! کیا آج بھی اس مرد دور اندیش و حق آگاہ کے یہ الفاظ ایک اور مفہوم میں ہم بہ ظاہر آزاد ہو جانے والے ملکوں پر صادق نہیں آتے؟

اقبال کا رویّہ ابلیس کے بارے میں

(یوم اقبال کا ایک لیکچر)

—— عین الدین علوی

سُنا ہے کہ ایک صاحب کا ذریعۂ معاش جلد سازی تھا لیکن مطالعے کا ذوق بھی رکھتے

تھے اور علم کا زعم بھی۔ چنانچہ جو کتابیں جلد بندھنے کے لیے ان کے پاس آتی تھیں آپ ازراہ علم دوستی ان کی غلطیاں بھی درست کر دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے کسی شناسا نے قرآن مجید جلد باندھنے کے لیے دیا۔ جب وہ اپنا قرآن مجید واپس لینے آیا تو آپ نے فرمایا، "لو بھئی۔ جلد بھی باندھ دی ہے اور تصحیح بھی کر دی ہے۔" گاہک نے ذرا حیرت سے آپ کی طرف دیکھا تو فرمانے لگے کہ اللہ کی برگزیدہ کتاب میں ابلیس کا ناپاک نام اچھا نہیں لگتا تھا چنانچہ اس کی جگہ کہیں آپ کا اور کہیں آپ کے والد ماجد کا نام لکھ دیا کہ آخر آپ شریف اور صالح لوگ ہیں۔

یہ ایک مضحکہ انگیز لطیفہ سہی لیکن یہ ابلیس کے بارے میں ہمارے عام رویے کی صحیح تصویر ہے۔ لیکن اقبال کا رویہ ابلیس کے ساتھ، ان بزرگ کے یا ہمارے معروف رویے سے مختلف ہے۔ اقبال ابلیس سے ناراض یا خوف زدہ نہیں، وہ اس کو ناپاک یا اچھوت نہیں سمجھتے بلکہ خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور شاید اس خیر مقدم میں ہمارے بعض صوفیائے کرام اور قدیم مسلمان مفکر مثلاً امام غزالی، منصور حلاج اور محی الدین ابن عربی بھی شامل ہیں جو ابلیس کے اندر ایک جذبۂ عشق دیکھتے ہیں۔ وہ عشق جو محبوب کی وحدانیت میں کسی کا شرک گوارا نہیں کرتا۔

اقبال نے کائنات میں ابلیس کو کیوں قبول کیا ہے؟ اس کا سیدھا سا جواب تو یہی ہے کہ جب خود اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو ضروری سمجھا تو اقبال کیوں نہ سمجھتے۔ لیکن ہر انسان دوست اتنا تو ضرور سوچتا ہے کہ ہماری دنیا پر بدی کا یعنی جناب ابلیس کا راج کیوں ہے۔ انکا کاروبار ہر سمت کیوں پھیلا ہوا ہے۔ آخر کیوں بڑے بڑے سورما اس کے سامنے جھکتے نظر آتے ہیں بڑے بڑے پاک باز کیوں اس کے سامنے اتنے بے بس ہو گئے کہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ انسان سوچتا ہے کہ خدا تو عادل، قادر، توانا، رحیم، رحمان اور دانا و بینا ہے۔ عقل و حکمت سے اس کا کوئی کام خالی نہیں۔ پھر اس کی دنیا میں ناانصافی، جہالت اور اندھیر کیوں؟ یہ قحط وبا۔ سیلاب، طوفان ــــ یہ موت کا کاروبار کس لیے؟ قدم قدم پر انسان کو بھٹکانے اور بھٹکانے والی چیزیں کیوں؟ ــــ جو لوگ سوچ کی اس سطح پر رک جاتے ہیں، گہرائی

ہیں نہیں اترتے وہ منکر اور دہریہ ہو جاتے ہیں۔

آیئے ہم سطح کی تہہ میں جھانکنے کی کوشش کریں۔ ان مشکل سوالوں کے جواب کئی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ہماری عقل محدود ہے۔ خدا کی حکمتیں لامحدود ہیں محدود کس طرح لامحدود کو سمجھے؟ لیکن یہ جواب ایک فلسفی کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ زندگی نیکی اور بدی کے تانے بانے سے مل کر بنی ہے۔ البتہ بدی سے چھٹکارا پانے کی جدوجہد انسان کا نصب العین ہے۔ گوتم بدھ کا یہی نقطۂ نظر تھا۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں وہ زندگی نہیں ہو سکتی جو جنت میں ہو سکتی ہے جنت فی الحال صرف فرشتوں کی بستی ہے۔ اس کا ایک ہی رنگ ہے۔ صرف سکون، راحت، عیش جاوداں نیکی، روشنی ــــ صرف عدم احتیاج! اس میں غم نہیں، موت نہیں، بدی نہیں، اندھیرا نہیں ایسی دنیا عالم بالا یا عالم ملکوت میں ہے اور صرف فرشتوں کے لیے ہی موزوں ہے انسانوں کے لیے نہیں۔ انسان ایسی یک رخی دنیا سے بہت جلد اکتا جاتا وہ تو غالب کے لفظوں میں اس کا قائل ہے کہ:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

دکھ کا اور موت کا دھڑکا نہ لگا ہو تو زندگی کی تگ و تاز ہی ختم ہو جائے۔ نشاطِ کار تو موت ہی کی بدولت ہے۔

تیسرا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ پیدا کرنے والے کو ایک ڈرامہ دیکھنا منظور تھا۔ اس نے ڈرامہ رچایا۔ ڈرامہ بنتا ہے کشمکش اور تصادم سے ــــ نیکی اور بدی، دکھ اور سکھ، ملائکہ اور ابلیس کا تصادم ٹکرانے سے ہی بہترین صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔ خدا نے اپنی وحدانیت کے سناٹے سے اکتا کر ایک ہنگامۂ شوق دیکھنا چاہا تو اس نے شیطان پیدا کیا۔ تصادم کے لیے۔ اسی کی بدولت زندگی کا ہنگامہ برپا ہوا ــــ شیطان ہی کی بدولت زندگی کا سمندر طوفان سے آشنا ہوا۔ انسان جو زندہ تھا اس حریف سے ٹکرا کر اور بھی زندہ ہو گیا۔ اس نے جھپٹنا اور پلٹنا سیکھا لہو گرم رکھنے کا بہانہ مل گیا۔ مصیبتوں غموں اور دکھوں سے مقابلہ کر کر کے اسے اپنی طاقت کا اندازہ ہوا۔ اپنی خودی کا شعور ہوا۔ کیونکہ:

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھلتے ہیں

اقبال نے اسی لیے کہا کہ:

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

اور یہ بھی کہ:

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

اسی لیے اقبال کے خیال میں خطرے سے زیادہ دلکش اور کوئی چیز نہیں۔ وہ نوجوانوں کو دعا بھی دیتا ہے تو یہ کہ:

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے　　کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

وہ جوانی جو ناز و نعمت اور عیش و عشرت کی گود میں گزر رہی ہو کسی کام کی نہیں۔ اگر جوانی مہم پسند نہ ہو تو وہ جوانی ہی نہیں:

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

اگر آپ زندگی کے سمندر سے قیمتی موتی نکالنا چاہیں تو سمندر میں غوطے لگانے پڑیں گے۔ طوفانوں کے طمانچے سہنے پڑیں گے:

محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غواص　　کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا

دُکھ، بدی یا برائی سے ـــ جسے مذہبی زبان میں ابلیس کہتے ہیں ـــ ہم لوگ عام طور پر اس قدر بیزار ہیں کہ اسی کی وجہ سے دنیا کو ہم نے کبھی ایک ڈراؤنا خواب، کبھی قید خانہ، کبھی دار المحن اور کبھی جہنم کہا۔ لیکن اقبال کو ایسی دنیا پسند نہیں جس میں شیطان نہ ہو۔

مزی اندر جہان کور ذوقے　　کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

(ایسی بے ذوق اور سپاٹ دنیا میں زندہ رہنا فضول ہے جس میں صرف خدا ہو، شیطان نہ ہو)

وہ زندگی ہی کیا جس میں کسی کے ساتھ زور آزمائی نہ کرنی پڑے۔ وہ جوانی ہی کیا جو اپنے لہو کی آگ میں نہ جلے۔ وہ لہو کیا جو آنکھ سے نہ ٹپکے، وہ دل ہی کیا جس کا شیشہ کبھی غموں سے نہ ٹکرائے اور چور چور نہ ہو جائے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اقبال کے خیال میں زندگی مکمل ہی تب ہوتی ہے جب ناکامیوں، بے تابیوں، آہِ سحر اور نالۂ نیم شب سے واسطہ پڑتا ہے۔ اپنی نظم فلسفہ غم میں بڑی خوبصورت تشبیہوں سے انہوں نے اس خیال کو واضح کیا ہے۔

جسے ہم حق کے راستے میں باطل کی دیوار، خدا کے نور کو چھپا دینے والا، شیطان کا پھیلایا ہوا اندھیرا کہتے ہیں، اسی چیز کو صوفیا کی زبان میں اللہ تعالیٰ سے جدائی یا "فراق" کہتے ہیں۔ یہی فراق زندگی کے ہنگاموں اور جدوجہد کا راز ہے۔ اس ہجر میں جو تڑپ ہے اسی سے زندگی کی حرارت ہے۔

زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

براؤننگ نے اسی لیے آسمان کو دیکھ کر کہا کہ: Ah But a man's reach must exceed his grasp or what is Heaven for ?

قدرت نے انسان کو نامہربان اور ناسازگار ماحول میں اسی لیے تو پھینکا ہے کہ وہ اس سے لڑتا رہے۔ گھٹنے کبھی نہ ٹیکے۔ مصیبتیں، سختیاں، دکھ اور برائیاں قدم قدم پر اس کا راستہ روکتی ہیں لیکن وہ ان کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

انہی برائیوں، انہی مصیبتوں کا نام ابلیس ہے۔ انسان کے بہترین جوہروں کے اظہار کے لیے ابلیس بہت ضروری تھا۔ اللہ میاں نے اسی لیے تو ابلیس کو انسان کے سامنے سجدے کا حکم دیا۔ پھر خود ہی اس سے انکار بھی کروا دیا۔ ایک خاص نکتۂ نظر سے دیکھیں تو اس کے انکار میں بغاوت کم ہے ایثار زیادہ۔ شیطان کے انکار نے اللہ کا غضب اپنے سر لے لیا اور انسان کو زمین پر اللہ کا نائب بنوا دیا۔ یوں شیطان کے لہو نے انسان کی کہانی کو رنگین بنایا۔ وہ انسان سے مسلسل ٹکر لینے والا حریف ہے۔ اسی کا سوز و ساز درد و داغ اور جستجو و آرزو تو انسانی زندگی میں حرارت اور ولولے کا راز ہے۔

اگر وہ سجدہ کر دیتا تو پھر انسان کے لیے زمین پر کرنے کو کیا رہ جاتا۔ روحانی ترقی کیسے

ہوتی اگر شرار بولہبی چراغ مصطفوی سے ستیزہ کار نہ ہوتا۔ انسان جب سے دنیا میں آیا بدی کی طاقتوں سے لڑتا رہا اور لڑتا رہے گا۔ یہ مرحلہ شوق کبھی طے نہیں ہو گا۔ یہ جنگ ہمیشہ جاری رہے گی۔

ذرا سوچیے اگر یہ دنیا جنت ہوتی، ابلیس اور ابلیسیت کا نام ونشان نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ اگر وہ سب کچھ جس کی آرزو کی جاسکتی ہے پہلے ہی سے ہمیں مل جاتا تو... ہماری زندگی جاگتی آنکھوں کا خواب بن جاتی۔ انسان مسلسل اونگھتے رہتے کیونکہ اس سے زیادہ مفید مشغلے کی گنجائش ہی نہ ہوتی۔ زندگی میں تب و تاب اور جستجو و آرزو اگر ہے تو ابلیس ہی کے دم سے۔ اسی لیے اقبال کے ہاں ابلیس کا امیج (image) خاصا شاندار ہے "جبریل و ابلیس" میں ابلیس پورے اعتماد کے ساتھ جبریل پر اپنی برتری کا اظہار کرتا ہے۔ جاوید نامے میں تو اس کا کردار ایک توحید پرست کی حیثیت سے اور انسان کے حریف کی حیثیت سے بڑا باوقار نظر آتا ہے۔

اقبال ہی کیا، ہر بڑے مفکر نے اس بات کو محسوس کیا ہے کہ شر نہ ہو تو خیر میں چمک دمک نہیں آتی۔ خزاں کے بغیر بہار نہیں نکھرتی۔ موت نہ ہو تو زندگی کی قدر کیا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے کہ عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ (ایسا ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو لیکن وہ تمہارے لیے بہتر ہو) اکثر برائی سے اچھائی جنم لیتی ہے انسان نے روحانی ترقی کے مرحلے طے کیے، کائنات کی سرکش طاقتوں کو زیر کیا تو کس طرح؟ کیا اس میں حضرت ابلیس کارفرما نہیں؟ اقبال نے بھی Give the Devil his due والی کہاوت کے مطابق ان حضرت کی ناقابل انکار خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

جبریل کے سامنے اس کا یہ ناز کچھ ایسا بے جا تو نہیں:

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

ڈپٹی ہائی کمشنر میجر جنرل عبدالرحمان نے بھی دیکھا تھا۔ بعد کو ان دونوں اصحاب نے کمانڈنٹ کو خطوط لکھے اور یہ بھی لکھا کہ لڑکے جسمانی لحاظ سے قدرے کمزور نظر آتے ہیں ان کی خوراک کو بہتر بنایا جائے چنانچہ اس سلسلے میں ضروری اقدامات کیے گئے۔

رفیق صاحب لڑکوں کی ہمت افزائی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے اس موقع پر بھی جب ہماری باکسنگ ٹیم لاہور سے فاتحانہ آئی تو سارا کالج لائن اپ ہوا۔ اور نہر کے اس پار کالج کے بینڈ نے ہمارا استقبال کیا۔

کامیابیوں کو دوسرے بھی اچھالتے ہیں اور بہت زور سے اچھالتے ہیں۔ لیکن ہر کوئی کرنل رفیق نہیں ہوتا۔ ان کا کام کھرا اور سچا تھا۔ ان کے جرنیل اور دی آئی پی لڑکے ہی تھے یہ بات ہم سب کو خوب معلوم تھی کہ ہمارا کرنل شیر ہے۔ کسی کی پروا نہیں کرتا۔ اصل میں یہی اعتماد تھا جس کی وجہ سے وہ بحیثیت قائد کے اتنے کامیاب ہوئے۔

اب میں ان کی جرأت اور حوصلہ کی ایک مثال دیتا ہوں۔ جنرل ایوب سالانہ تقریب تقسیم انعامات پر تشریف لائے تھے۔ وہ فنکشن اس جگہ ہوا تھا۔ جہاں آج موسٰی ہال ہے میں آکنلک ہاؤس کا ہاؤس پریفیکٹ تھا۔ میری ڈیوٹی ایم پی کی تھی یہ کہ سی ان سی کی کار کے سوا کسی اور کار کو پریڈ گراؤنڈ میں نہ جانے دوں۔ باقی سب کاروں کو کمانڈنٹ کے دفتر کے پیچھے جو کار پارک بنایا گیا تھا۔ وہاں کھڑا ہونا تھا۔ میں ان احکامات کے مطابق سٹار کاروں کو بھی جنرل کار پارک کی طرف ہاتھ دے کر بھیجتا رہا۔ جب ایجوٹینٹ جنرل میجر جنرل شیر علی کی کار پہنچی تو اس کو بھی میں نے یہی سگنل دیا کہ کار ادھر لے جائی جائے۔ انہوں نے اشارہ سے مجھے بلایا کہ کیا بات ہے؟ میں نے کہا "سر سوائے سی ان سی کی کار کے کسی اور کار کو براہِ راست گراؤنڈ میں نہیں جانا ہے۔" انہوں نے کہا "دیکھتے نہیں میں کون ہوں" میں نے عرض کیا۔ آپ جنرل ہیں لیکن مجھے جو حکم ملا ہے میں اس کی پابندی کروں گا۔ وہ بہت جھلائے، پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے بتا دیا۔ ۱۵۲۰ محمد اعظم کار تو خیر انہوں نے کار پارک میں کھڑی کرادی لیکن سخت برہمی کی حالت میں گراؤنڈ تک پہنچے اور رفیق صاحب سے شکایت کی کہ کوئی کیڈٹ اعظم وہاں کھڑا ہے بہت بدتمیز ہے۔ اس نے یہ کیا ہے

رفیق صاحب نے جواب میں صرف یہ کہا "سر! یہ اس کا قصور نہیں، میرا حکم یہی تھا۔" جنرل صاحب بہت جز بز ہوئے لیکن رفیق صاحب نے پوری ذمہ داری خود قبول کر لی ایسے موقعوں پر عام طور پر لوگ کیا کرتے ہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔

ملٹری کالج کے طلبہ کو وہ اپنی اولاد کی طرح بلکہ شاید اس سے زیادہ چاہتے تھے اور ان کے خلاف وہ کوئی بات نہیں سن سکتے تھے۔ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب وہ کھاریاں میں کرنل ایڈم تھے۔ کھاریاں کلب کی بار میں ایک غیر ذمہ دار لیفٹیننٹ کرنل نے نشہ کی ترنگ میں ملٹری کالج کے لڑکوں کے کردار کے متعلق کوئی نازیبا فقرہ کہا۔ رفیق صاحب یہ فقرہ سنتے ہی وہ جلال میں آ گئے اور اس کو انگیٹھی میں دے مارا کہ لوگوں کو چھڑانا مشکل ہو گیا۔ بار بار کہتے تھے۔ دے آرمائی سنز۔ دے آرمائی سنز" وقت کے بڑے پابند تھے لیکن وقت انسانوں سے بڑھ کر نہیں تھا۔ ایک بار کسی میٹنگ میں جا رہے تھے۔ یکایک اطلاع ملی کہ ڈرائینگ ماسٹر حکیم صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ فوراً رک گئے ان کے سی ایم ایچ میں داخلے کا انتظام کیا اور دوسری ضروری امداد بھی کی۔ میٹنگ میں اطلاع دی کہ چند منٹ دیر میں آؤں گا۔

کالج میں سردیوں کی صبح کی پی ٹی ہمیشہ عذاب سمجھی گئی ہے لیکن جب ہم دیکھتے تھے رفیق صاحب گھوڑے پر سوار ہمارے ایسے کپڑوں میں ملبوس پی ٹی گراؤنڈ میں پہلے سے انتظار کر رہے ہیں تو ہمیں اپنے ساتھ زیادتی کا کوئی احساس نہیں ہوتا تھا۔

—— خادم حسین[1]

یہ واقعہ ۱۹۵۲ء کا ہے۔ میں سائیکل کا ایکسیڈنٹ کر کے سی ایم ایچ جہلم میں زیر علاج تھا وہیں مجھے اطلاع ملی تھی کہ کمانڈانٹ کرنل زیدی کا تبادلہ ہو گیا ہے ان کی جگہ کون آ رہا ہے اس کا مجھے علم نہ تھا۔ ایک روز صبح صبح ایک نرس گلاب کے پھولوں کا ایک خوب صورت گلدستہ لے کر آئی۔ اس نے مسکرا کر کہا مبارک ہو۔ تمہارے نئے کمانڈانٹ نے یہ پھول بھیجے ہیں اور ساتھ ہی یہ پیغام بھی کہ شام کو وہ خود دیکھنے آئیں گے۔ گلدستہ دیکھ کر میں بہت

---

[1] مینجر سٹیٹ لائف کالج نمبر ۱۵۱ - زمانہ تعلیم ۱۹۴۶ - ۵۴ء

چیک کرنے آتے تھے ان کی اس بات سے میں نے خود اتنا اثر لیا کہ اپنی تیس سالہ فوجی زندگی میں ہمیشہ ان کی اس مثال کو سامنے رکھا۔ ڈیوٹی کو صرف ڈیوٹی نہ سمجھا بلکہ اس سے بہت آگے جا کر کام کرنا کم از کم میں نے انہی سے سیکھا۔

میجر محمد صفدر[1]

ہر شخص کو سمجھنے، اس کی شخصیت کی نہر میں اترنے کا ایک لمحہ ہوتا ہے میں نے کرنل رفیق کو اس وقت پہچانا جب ۸۰۷ محمد رقیب کی حادثاتی موت پر میں نے ان کے ردِ عمل کو دیکھا جو حالت کسی باپ کی اپنی جوان اولاد کی ناگہانی موت پر ہوتی ہے ان کی اس وقت وہ حالت تھی، اس سے پہلے میں ان کو ایک سخت ڈسپلن پسند کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اس واقعہ کے بعد میری رائے ان کے بارے میں بدل گئی۔ رقیب کے ہاکی کھیلتے ہوئے سر میں چوٹ لگی تھی اس کی ہاکی گراؤنڈ میں جہاں آج کل موطی ہال کے سامنے فوارہ ہے۔ ۲۵ کی لائن پر ۱۲۳۴ رشید نے تقریباً ۳۰ گز کے فاصلہ سے ہٹ لگایا تھا گیند غیر متوقع طور پر اچھلی اور رقیب کی کنپٹی پر جا لگی۔ چوٹ سے اس کی آنکھیں نہیں کھلتی تھیں۔ وہ اپنے پیروں سے سکین ہاؤس تک آیا لیکن ہسپتال جا کر بے ہوش ہوا تو پھر ہوش میں نہیں آیا۔ یہ سارا واقعہ میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ اس سے زیادہ متاثر تھا پھر رفیق صاحب نے اس واقعہ سے جو اثر لیا اور جس طرح رقیب کی تیمارداری کی پھر اس کے جنازہ پر میں نے ان کی جو حالت دیکھی، اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ انہیں کیڈٹس سے کتنا تعلق ہے۔ کالج سے یہ گہرا جذباتی تعلق ہی ان کی کامیابی کی بنیاد بنا۔ خوبیاں ان میں اور بہت سی تھیں جن کی وجہ سے لڑکے ان کی سخت گیری کے باوجود ان سے بھاگتے نہیں تھے۔ لیڈرشپ کیا ہوتی ہے اس کا جو معیار انہوں نے قائم کر کے دکھایا تھا وہ آج بھی میرے لیے اور غالباً ان کے دور کے ہر عالمگیرین کے لیے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہنے کو تو وہ انفنٹری کے تھے لیکن انہوں نے پہلی بار پی ٹی، ڈرل سے زیادہ تعلیمی سرگرمیوں کو اہمیت دی۔

---

[1] کالج نمبر ۱۵۰۰

——— تنویر احمد سید[۱]

یہ واقعہ ۱۹۵۲ء کے اواخر کا ہے۔ میں آکلنگ ہاؤس کی کچن ڈیوٹی پہ تھا اور آکلنگ ہاؤس کے راشن روم میں راشن کا رجسٹر کھولے راشن کا حساب کر رہا تھا۔ آپ نے تو دیکھا ہے لیکن بہت سے پڑھنے والوں کو علم نہ ہو گا کہ آکلنگ ہاؤس کچا ہاؤس تھا۔ اور اس کا میس اس کے پیچھے تھا۔ اور راشن روم اس کا آخری کمرہ تھا۔ سنسان اور ویران، آس پاس کا علاقہ بھی یوں ہی پڑا تھا۔ وہ سر شام گھوڑے پر سوار وہاں آگئے اور راشن کر سیدھے پاس آئے۔ کیا ہو رہا ہے تنویر؟ سر، حساب کر رہا ہوں بہت خوش ہوئے۔ میرے شانے تھپتھپائے ایسا احساس فرض چاہیے۔ تنویر مجھے یقین ہے کہ تم زندگی میں بہت ترقی کرو گے۔ جاتے جاتے اتنا اور کہا "کیپ دی کچن کلین" اور گھوڑے پر سوار ہو کر کالج کے کسی اور کونے کھدرے کو دیکھنے چلے گئے۔ ان کی عادت تھی صبح شام گھوڑے پر کالج کے کونے کونے کا چکر لگاتے تھے۔

——— بشیر احمد مرزا[۲]

یہ واقعہ ۱۹۵۳ء کا ہے۔ رسول ہیڈ ورکس کی طرف ہم شکار کے لیے گئے تو کرنل رفیق بھی ہمارے ساتھ تھے اس طرف کسی نالے میں نہائے تو کمانڈانٹ کرنل رفیق کو پکڑ کر ہم نے غوطے دیئے پھر انہوں نے بھی ہمیں باری باری غوطے دیئے۔ کالج سے باہر وہ بالکل مختلف ہوتے تھے۔

——— محمد اعظم خان[۳]

لاہور میں گرفن انسٹی ٹیوٹ آل پاکستان باکسنگ کے مقابلے کراتا تھا۔ ۵۳-۱۹۵۲ء میں جو ٹیم لاہور اس ٹورنامنٹ میں حصہ لینے گئی تھی اس میں میں بھی شامل تھا اس زمانے میں جنرل اعظم لاہور کے جی او سی تھے انہوں نے ہمارے فائنل مقابلے دیکھے تھے اور آخر میں انعامات تقسیم کیے تھے انہوں نے ہماری ٹیم کو اپنے گھر چائے پر بلایا اور ہماری بڑی ہمت افزائی کی۔ ہمارے فائنل مقابلوں کو جالندھر میں پاکستان کے

---

[۱] کالج نمبر ۱۵۰۵ [۲] مینجر سٹیٹ لائف کالج نمبر ۱۵۱۸ زمانہ تعلیم ۵۴-۱۹۴۵ء [۳] کالج نمبر ۱۵۲۰

ـــــــــ میجر عمر حیات

کرنل رفیق نے آتے ہی آؤٹ ڈور مشاغل میں بہت اضافہ کر دیا تھا۔ شکار کلب کے آفیسر انچارج راؤ عبدالوہاب تھے۔ ان کے ساتھ کئی بار ترکی کی پہاڑیوں میں شکار کے لیے گئے۔ ۱۷۰۰ افضل بھی شکار پارٹی کا ممبر تھا۔ رائڈنگ بھی ہابی کے طور پر شروع ہوئی تھی۔ ۱۵۲۳ کاظم، ۱۶۲۳ اختر، ۱۶۵۶ منصور، ۱۰۰۱ یونس اور میں اس رائڈنگ کے والنیٹر ممبر تھے۔ کرنل رفیق خود بھی اچھے رائڈر تھے۔ صبح سویرے پی ٹی پر اکثر گھوڑے پر آتے تھے اور اکثر شام کو کالج کے سارے علاقے کا چکر لگاتے تھے۔ اگرچہ آتے ہی انہوں نے ڈسپلن کو کافی کھینچا تھا سینئرز سے بھی کافی بازپرس ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود اندر سے ہمارا احساس کشادگی اور پھیلاؤ کا تھا اور بہت سی نئی باتوں کی ہماہمی سے بجائے بیزار ہونے کے ہمیں کچھ حاصل کرنے کی خوشی اور فخر تھا۔

۱۹۵۵ء میں، میں پی ایم اے میں تھا۔ میں کسی مختصر چھٹی پر پنڈی آیا۔ بس سٹینڈ کے قریب یکایک ملاقات ہو گئی۔ دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ہیلو عمر حیات کیسے ہو، کورس کیا جا رہا ہے۔ میں نے کہا "شکر ہے..... آپ کی دعا سے سب ٹھیک ہے بس آپ سے ایک مشورہ کرنا ہے" "وہ کیا؟" انہوں نے پوچھا میں نے کہا "پاسنگ آؤٹ قریب ہے میں کس آرم میں جاؤں" انہوں نے دریافت کیا۔ کس آرم نے تمہیں کالج میں نامزد کیا تھا۔ یہ اس کا حق ہے" میں نے جواب دیا "نامزد تو مجھے آرمڈ نے کیا تھا۔ لیکن وہاں کا خرچہ بہت ہے اور میں انفنٹری ٹائپ ہوں" فرمایا "عمر! دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وفاداری کا تقاضا کیا ہے۔ باقی چیزوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خرچے کی بات آدمی پر ہے کون کہاں کتنا خرچہ کرتا ہے میرے خیال سے تو تمہیں اپنی آبائی یونٹ میں جانا چاہیے یا کم از کم کوشش تو کرو۔"

ان کا جملہ "دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وفاداری کا تقاضا کیا ہے" زندگی کے کئی مرحلوں میں مجھے یاد آیا۔ اور ہر بار مجھے اس سے نئی روشنی ملی۔ ملک و قوم سے وفاداری کا سبق

---

[1] کالج نمبر ۱۳۹۴

ہم نے ان ہی سے سیکھا ان سے پہلے ہم چھوٹے چھوٹے ذاتی مفادات کے کنوئیں میں گرے پڑے ہوئے تھے۔ اور افق پار کی دنیا کی خبر نہیں تھی۔

—— کرنل محمد افضل جنجوعہ[۱]

وہ اپنے اصولوں میں بظاہر بے رحم Ruthless ضرور تھے ان کی انتہا پسندی سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کا فلسفہ تربیت واضح تھا کہ کالج کے مفاد کی خاطر فرد کو قربان کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ جب بھی ایسا موقعہ آتا وہ خطا کار کی قطعاً کوئی رعایت نہیں کرتے تھے اس وقت مجھے اس لڑکے کا نام یاد نہیں آ رہا جو کالج سے بھاگ گیا تھا۔ پھر اسے انہوں نے کسی قیمت پر قبول نہیں کیا بڑی بڑی اونچی سفارش آئی۔ لیکن وہ اپنے فیصلے پر اڑے رہے جب اس لڑکے کی غریبی کی دلیل آئی تو انہوں نے جواب دیا اچھے سے اچھے سکول میں اس کی تعلیم کے اخراجات میں اٹھاؤں گا لیکن کالج کے ڈسپلن کو تہس نہس نہیں ٹوٹنے دوں گا۔

اسی طرح سزا کا معاملہ تھا۔ میں نے ان کا پہلا دور دیکھا ہے سنا ہے کہ دوسرے دور میں وہ کافی بدل گئے تھے لیکن پہلے دور میں بعض قصوروں پر بے تحاشا سزا دیتے تھے قصوروار کی رعایت کرنے کو وہ قومی اور اجتماعی وفاداری کے منافی سمجھتے تھے۔ اس نقطۂ نظر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اپنے اصولوں کو انہوں نے نہایت دیانتداری سے عملی جامہ پہنایا بغیر کسی رو رعایت کے۔ آج کونٹری کی سزا کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا انہوں نے کونٹری دی۔ بغیر کسی جھجک کے دی کیونکہ وہ اجتماعی ڈسپلن اور خطا کار کی اصلاح کے لیے اس کو ضروری سمجھتے تھے۔

لیکن یہ ان کے کردار کا صرف ایک پہلو تھا۔ ان کی اصل شخصیت ان کے کام میں تھی اس کی صرف ایک مثال دوں گا۔ ڈیری فام سے صبح کا دودھ مکھن چار بجے آتا تھا۔ بحیثیت ڈیوٹی کیڈٹ آفیسر کے جب بھی میں اس کی چیکنگ کے لیے ملک روم گیا۔ اکثر ان کو وہاں موجود پایا۔ ڈیوٹی افسر کبھی ہفتے میں ایک بار آتا تھا۔ لیکن وہ ہفتے میں کم از کم تین چار بار خود

---

[۱] کالج رول نمبر ۱۴۷۷

ہو گیا تھا۔ یہ سوچتا رہا کہ نئے کمانڈانٹ کیسے ہوں گے کہ چارج لیتے Excite
ہی پہلا کام یہ کیا کہ اپنے ان دیکھے شاگرد کو یاد کیا۔ شام کو وہ نئے کمانڈانٹ مجھے دیکھنے
آئے۔ یہ کرنل رفیق تھے جن پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔

——— بریگیڈئر محمد مشتاق[1]

رفیق صاحب نے جو کچھ کالج میں کیا اس کی نوعیت Tactics یعنی محدود تدبیروں
کی نہیں بلکہ Strategy یعنی دور رس نتائج کی حامل تدابیر کی تھی Tactical
اقدامات کے اچھے یا بُرے نتائج فوراً سامنے آجاتے ہیں لیکن Strategic
اقدام بہت بڑی چیز ہوتے ہیں۔ رفیق صاحب نے کالج کے مزاج اور فضا کو بدلا وہ
بنیادی طور پر Strategic تبدیلی تھی۔ اس کے مثبت اثرات برسہا برس کے بعد ان
کے طلباء کے کردار، کارکردگی اور لائف سٹائل میں ظاہر ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں رفیق صاحب
کا سب سے بڑا Contribution یہی ہے اور ہمارے لیے اشارہ بھی یہی ہے کہ
تعمیری کاموں میں بنیادی اہمیت Strategic سمت کی ہوتی ہے ورنہ لوگ اصلاح
شروع کرتے وقت ضمنی اور فروعی کاموں میں الجھ جاتے ہیں۔ ترجیحات کا صحیح تعین نہ
ہونے سے بات نہیں بنتی۔"

——— میجر محمد صادق[2]

ان کا پہلا دور تازہ ہوا کا ایک جھونکا تھا جس نے کالج کے شب و روز بدل دیئے
اس دور میں کالج نے صحیح معنوں میں پاکستانیت کی فضا میں سانس لی۔ ورنہ اس سے پہلے
کالج کی ڈگر وہی تھی جو ماقبل تخلیق پاکستان تھی۔

س ... تم ہی جو انقلابی اقدامات کیے ان کا لب لباب یہ تھا کہ لڑکوں کو بوائز
کمپنی کی سطح سے اٹھا کر صحیح معنوں میں کیڈٹس یا انڈر آفیسرز کی سطح پر لایا جائے چنانچہ
وہ تمام کام جن سے "بوائے کمپنیت" کی بو آتی تھی انہوں نے یک قلم موقوف کر دیئے۔
مثلاً پہلے لڑکے دھوبی گھاٹ سے اپنے کپڑوں کا بنڈل سر پہ اٹھا کر لاتے تھے۔ چھٹی سے

---

[1] کالج نمبر ۱۵۵۲ [2] کالج نمبر ۱۵۸۹

آنے کے بعد کھرپے سے اپنے اپنے ہاؤس کے علاقے کی گھاس صاف کرتے تھے۔غرضیکہ ادھر سے ادھر ڈھوتے تھے انہوں نے ان برسوں کی روایتوں کو ختم کر دیا۔ چونکہ یہ کیڈٹس کی عزت نفس کے منافی تھیں اس سلسلے میں انہوں نے آرمی کے این سی اوز اور کالج کے سینئر کیڈٹ آفیسرز کو سیلوٹ کرنے کا رواج بھی ختم کر دیا۔ جونیئرز کو سینئرز کی اردلی میں دینے کا دستور بھی متروک ہوا۔ اسی طرح سالہاسال سے لاکر ایک خاص سٹائل سے سجانے اور کپڑے، چیزیں رکھنے کا انداز چلا آرہا تھا انہوں نے اسے بھی آسان کر دیا تھا تاکہ اس مشغلہ میں غیر ضروری وقت و توجہ صرف نہ ہو۔

کالج کا پہلا "پیٹرن" پیچھے چلنے (Following) راسخ کرنے کے نقطۂ نظر سے تھا انہوں نے اسے آگے چلنے (Leading) کی راہ پر لگایا۔ آگے چلنے کے لیے کچھ دیکھنا، سوچنا پڑتا ہے اور اپنے طور پر کچھ قدم اٹھانے کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے اس کے لیے آگہی چاہیے اپنی بھی اور ماحول کی بھی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے انہوں نے لڑکوں کو ڈائری لکھنے کی ترغیب دی، خود احتسابی Self-Discipline کے لیے آنر سسٹم جاری کیا رہنمائی کے لیے ماہانہ انٹرویوز شروع کروائے۔ تفریح و تربیت کی غرض سے آؤٹ ڈور سرگرمیوں کا ایک منظم سلسلہ شروع ہوا۔ سرملٹوے ڈنر نائٹ کا اہتمام ہوا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ایک میس کے کچھ لڑکے دوسرے میس میں مہمان ہوتے تھے اور اپنے دوستوں سے کھانے کی میز پر گپ شپ کر سکتے تھے علاوہ ازیں بریج اور ہاؤس ٹائی بھی شروع کی گئی۔

مجھے یاد ہے کہ رفیق صاحب نے جہلم میں ایک فلم سیمن اینڈ ڈیلائیلا دکھلانے کا اہتمام کیا تھا اسی طرح سرائے عالمگیر میں ایک سرکس آیا تھا۔ اس کا ایک شو بھی صرف کالج کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ رفیق صاحب کے پہلے دور کے سرسری جائزے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انہوں نے ملٹری کالج میں تعلیم و تربیت کا کتنا متوازن اور ہمہ گیر پروگرام شروع کیا تھا۔

اب میں اپنے تاثرات بیان کرتا ہوں۔ کمانڈانٹ صاحب کی ذاتی زندگی کے بارے میں ہمیں تجسس تو بہت تھا۔ لیکن اس کے متعلق ہماری۔ معلومات بہت کم تھیں

——— لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین[1]

کرنل رفیق نے جو آنر کوڈ دی تھی، وہ اب بھی مجھے یاد ہے اور میں اپنی اولاد کو بھی بتاتا رہتا ہوں۔ اور جب تک فوج میں رہا اپنے جوانوں کو بھی اسی کی تعلیم دیتا تھا۔ اصل آنر کوڈ تو انگریزی میں تھی اس کا ترجمہ یوں ہو سکتا ہے۔

۱۔ میں اپنی عزت کی قسم کھا کر عہد کرتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔

۲۔ میں عہد کرتا ہوں کہ میں ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کروں گا۔ جس سے مجھ پر، میرے خاندان پر، میرے کالج پر یا ملک پر کوئی حرف آئے۔

۳۔ اگر مجھ سے کبھی کوئی غلط کام سرزد ہوا تو میں از خود اس کی رپورٹ اپنے سینئر کو دونگا۔

۴۔ اگر میں نے کسی اور کو کوئی غلط کام کرتے دیکھا (اور اگر اس نے خود اس کی رپورٹ) نہیں کی تو میں اس کی رپورٹ اپنے سینئر سے کروں گا یہ عہد انہوں نے ہم سے قرآن پر ہاتھ رکھوا کر لیا تھا، ہمیں زبانی یاد کروایا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہمارے لاکرز پر بھی یہ لکھا لگا ہوتا تھا۔ اس وقت یہ بڑی حد تک میکانکی عمل تھا۔ سمجھے اور کچھ بغیر سمجھے اس کو دہراتے رہتے تھے۔

جب میں خود افسر بنا، تھوڑا بہت پڑھا لکھا اور دنیا کو دیکھا بھالا تو پتہ چلا یہ سسٹم کوئی نئی چیز نہیں۔ امریکہ کی ملٹری اکیڈمی ویسٹ پوائنٹ میں بھی اس کا تجربہ ہوا ہے۔ یہ آنر کوڈ بھی کم و بیش وہی ہے۔ کوٹھڑی کی سزا بھی بعض اداروں میں رائج رہی ہے لیکن اس دریافت سے کرنل رفیق کے تجربہ کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ کوئی نیا خیال بھی بالکل نیا نہیں ہوتا۔ تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ نئی چیز یہ تھی کہ انہوں نے کس خلوص سے اور کس قوت سے، کس عزم سے، کس جذبے سے کالج کو بنانے اور سنوارنے کی کوشش کی۔ آنر کوڈ اور آنر سسٹم کا اجراء ان کی سوچ کے پس منظر میں دیکھنا چاہیئے کوئی بھی اصلاحی کوشش مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوتی اس کی جزوی کامیابی ہی بہت

---

[1] کالج نمبر ۱۶۲۳

ہوتی ہے اس جزوی کامیابی کی ایک مثال مجھے یاد آئی۔ سرائے عالمگیر میں کوئی تھیٹر کمپنی آئی ہوئی تھی۔ کرنل رفیق نے پورا ہال کالج کے لیے ریزرو کرا لیا۔ لڑکوں سے کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی کرسیاں ساتھ لے جائیں (یاد رہے کہ پہلے ہم سینما وغیرہ دیکھنے باہر جاتے تو بیٹھنے کے لیے اپنے کمبل ساتھ لے جاتے تھے) واپسی پر افراتفری میں کچھ لڑکے بلکہ خاصے لڑکے اپنی کرسیاں راستے میں سڑک پر چھوڑ آئے۔ کرنل رفیق کو رپورٹ ہوئی یا انھوں نے خود دیکھا مختصر یہ کہ انھوں نے پورے کالج کو فال ان کرا لیا پہلے تو سخت جھاڑ پلائی پھر کہا اگر وہ لڑکے جو کرسیاں چھوڑ کر آئے تھے خود ہاتھ اُٹھا دیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ انہیں کچھ نہیں کہوں گا ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ انھوں نے پھر اپنے الفاظ دہرائے تو ایک اٹھا۔ ہر ایک کو تجسس ہوا کہ جواں مرد کون ہے ہر کوئی گردن گھما گھما کر اور پنجوں کے بل اُچک کر دیکھنے لگا اور وہ کون تھا؟ ۱۴۶۷ یوسف جس کو یار لوگوں نے جنگلی کا نک نیم دے رکھا تھا اس کی دیکھا دیکھی کچھ اور ہاتھ بھی کھڑے ہوئے کچھ دیر میں ان میں مزید اضافہ ہوا۔ رفیق صاحب نے خوش ہو کر بڑی زوردار تقریر کی۔ یوسف کی بڑی تعریف کی۔ بہت ہمت افزائی کی۔ ان کے وہ الفاظ مجھے نہیں بھولتے۔

"بی اے، مین، بوائز! غلطی ہو تو اس کی ذمہ داری بھی قبول کرو۔ یاد رکھو، اخلاقی جرأت بڑی چیز ہے۔ یہ کردار کی پہلی شرط ہے۔"

اس واقعہ کو میں بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ کچھ تو اس لیے کہ اس سے اٹر سسٹم کی جزوی کامیابی کا ثبوت ملا۔ اور بڑی حد تک اس لیے کہ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ لوگ جنہیں ہم جنگلی سمجھتے ہیں، جن کو ہم کچھ اہمیت نہیں دیتے۔ اکثر وہی راندۂ درگاہ، درماندہ، قبیلے کی آنکھ کا تارا ثابت ہوتے ہیں۔ ۱۸۱۱ اکرم کو جب تک وہ کالج میں رہا کوئی اہمیت نہیں دی گئی آج وہی ہمارا اکلوتا نشان حیدر ہے اور کالج اس پر فخر کرتے نہیں تھکتا۔ اس لیے اداروں میں، گھر میں، ملک میں ہر ایک کو اہمیت دینی چاہیے۔ رفیق صاحب سے پہلے خواص کو اہمیت حاصل تھی۔ رفیق صاحب کو نمبر ون مارکس میں اس لیے دیتا ہوں کہ انھوں نے عام لڑکوں کو اہمیت دینی شروع کی اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی

.امیج بنی کہ افسر ایسا ہوتا ہے سلاس امیج کا تعلق ــــــــــــــــــــــ
کسی خاص واقعہ سے نہیں ان کا ٹوٹل امپیکٹ اس طرح کا تھا پھر بھی ایک واقعہ ایسا ہے جس نے میرے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا۔

وہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے گروپ کو آئی ایس ایس بی جانے سے پہلے لیڈر شپ پر ایک لیکچر دیا تھا۔ اس کا ایک نکتہ یاد رہ گیا ہے۔ غالباً اس لیے بھی کہ اب میں اس کا تھوڑا بہت فلسفہ بھی جانتا ہوں۔ دوران گفتگو انہوں نے کہا یہ جو بار بار کہا جاتا ہے کہ جوانوں کے سامنے اپنی مثال پیش کرو۔ جو کام کرنے کو کہتے ہو وہ کرکے دکھاؤ۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ آپ کوئی انسٹرکٹر ہیں کوئی کام کرکے یا "ڈیمانسٹریٹ" کرکے اس کام کو کرنا سکھا رہے ہیں جو وہ نہیں جانتے۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر ان کو مورچہ کھودنا ہے اور آپ مورچہ کھودنے میں پہل کرتے ہیں تو اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ آپ انہیں مورچہ کھودنا سکھا رہے ہیں "ناٹ ایٹ آل" یہ کام تو مسلسل مشق کی وجہ سے شاید وہ اپنے سینئر افسر سے بہتر کر سکتے ہوں۔ جب میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ جوانوں کے ساتھ کام کرنے میں پہل کریں۔ خصوصاً مشکل تکلیف دہ، یا بظاہر چھوٹا کام کرتے ہیں، تو اس کا مقصد نفسیاتی ہوتا ہے ان کو یہ احساس دینا ہے کہ آپ ان کے ساتھ ہیں۔ ان جیسے ہیں۔ ان میں سے ایک ہیں انسانی طور پر آپ کو ان پر کوئی برتری حاصل نہیں جو کام وہ کر رہے ہیں وہ آپ بھی کر سکتے ہیں یا شاید بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ آپ کی سینیارٹی انتظامی ہے۔ چونکہ ذمہ داری کی نوعیت مختلف ہے آپ کام کروا رہے ہیں۔ وہ کر رہے ہیں۔ اور آپ اور بہت سی چیزیں سوچ رہے ہیں۔ جو ان کا درد سر نہیں۔ یہ مثال کا فلسفہ انہوں نے سمجھایا اور جس طرح سمجھایا (کیونکہ وہ خود اس کی زندہ مثال تھے) یہ بات میرے دل میں گھر کر گئی بلکہ زندگی اور کام کے بارے میں میری پوری سوچ متاثر ہوئی اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اپنی یونٹ میں جب بھی میں جوانوں کے لنگر میں ان کا کھانا چیک کرنے گیا تو اس طرح نہیں جیسا کہ میس حوالدار بڑے اہتمام سے ایک اعلیٰ درجے کی ٹرے میں نیپکن کے ساتھ بہت ہی صاف پلیٹ میں سالن روٹی وغیرہ ٹیسٹ کرنے کے لیے پیش کرتا ہے اور افسر بڑی شان سے اسے

علیحدہ کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر بڑے کروفر سے چکھتا ہے اور رہبارک لکھ کر چلا جاتا ہے میں نے ہمیشہ جوان کے ساتھ بیٹھ کر اس کی روٹی میں سے ایک ٹکڑا توڑ کر اس کی پلیٹ میں سے سالن چکھا ہے۔ اسی طرح ۶۵ اور ۷۱ کی جنگوں میں، میں نے کوشش کی کہ میں انسانی اور سماجی سطح پر اپنے آدمیوں سے الگ نظر نہ آؤں۔ یہ سب رویے کی بات ہوتی ہے۔ رفیق کا اثر مجھ پر یہ رہا ہے کہ صاحبیت اور افسریت کا قائل نہیں رہا۔ افسری یہ ہے کہ بندہ کردار میں اور کارگزاری میں اپنے سب ساتھیوں سے بہتر ہو اور سب سے بڑی بات کہ Inspire کر سکے۔ یہ بہت مشکل بات ہے لیکن بغیر اس وژن کے اس آئیڈیل کے، بات نہیں بنتی۔ کرنل رفیق نے اس وقت ہمیں پہاڑی کے اس پار (Beyond the hill) دیکھنا سکھایا اور مختصر یہ کہ انہوں نے ملٹری کالج کو جو Adrift تھا اسے ایک سمت اور ایک عظیم مقصد کا شعور دیا اور ہمیں بھی ایک Ideal اور وژن دیا۔ اسی لیے میں انہیں ایک عظیم آدمی سمجھتا ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ وقت کی ایک بہت اہم ضرورت تھے۔ اور ان کی ضرورت آج بھی باقی ہے۔

—— نذیر احمد[۱]

پہلا واقعہ نومبر ۱۹۵۲ء کا ہے۔ ہم چند لڑکے محمد رفیع پی ڈی ۱۷۳۹ اور میں برڈووڈ ہاؤس میں کچن ڈیوٹی پر تھے۔ میز پر مٹر کی پھلیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اور ہم ان کے دانے نکال رہے تھے کہ یکایک کرنل صاحب گیمس ڈریس میں وہاں آ گئے۔ ہم تینوں بڑے انہماک سے مٹر چھیل رہے تھے۔ دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔ وہیں ہمارے ساتھ ہی بنچ پر بیٹھ گئے اور خود مٹر نکالنے لگے۔ چار پانچ منٹ ہم سے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ کچن ڈیوٹی کے بارے میں پوچھا کھانے کے بارے میں پوچھا اور پھر برڈووڈ ہاؤس کے پیچھے کی پی ٹی گراؤنڈ کی طرف چلے گئے۔ اس روز جب مٹر پلاؤ میز پر سرو ہوا تو میں نے اپنے دوست سے کہا۔ ہوشیار۔ یہ پلاؤ جو تم کھا رہے ہو اس میں کمانڈنٹ صاحب کے نکالے ہوئے مٹر کے دانے بھی شامل ہیں۔ سب کو بڑی حیرانی ہوئی پھر میں نے پورا قصہ سنایا۔

---

[۱] کالج نمبر ۱۹۲۲

دلچسپ ایک خبر سینئر لڑکوں میں عام تھی جس کی بعد کو تصدیق بھی ہوئی کہ وہ رات گئے اکثر جہلم کلب جاتے تھے لیکن ہمیں حیرت ہوتی اس بات پر کہ وہ لائٹس آؤٹ کے بعد تک تو ہمارے ساتھ ہوتے ہیں۔ کلب کب جاتے ہیں۔ سوتے کب ہیں۔ نپولین کی طرح وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو نیند کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے یہ بہت سی باتیں جو میں نے اب لکھی ہیں اس وقت ان کے بارے میں نہ سوچا تھا نہ سمجھا تھا اس وقت تو ہمیں ان کی جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا ان کا وہ بے داغ بے حد سمارٹ لباس اور اس سے بھی زیادہ پُر وقار چلنے کا انداز تھا۔

آخر میں ایک دلچسپ واقعہ لکھتا ہوں۔

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب وہ کھاریاں میں کرنل ایڈم تھے۔ کلب میں کسی امریکن افسر کو الوداعی ڈنر دیا جا رہا تھا کہ اس افسر نے اپنی تقریر میں کہا۔ میری خواہش تھی کہ میں کچھ عرصے اور پاکستان میں ٹھہرتا تاکہ پاکستانی افسروں کو ادب و آداب سمیت کچھ سکھا سکتا یہ سن کر کرنل رفیق یکایک کھڑے ہو گئے اور خاصے درشت لہجے میں کہا "جناب ہماری تاریخ اس دور سے بھی پہلے کی ہے جب آپ امریکنوں کا جغرافیہ بھی نہیں تھا۔ جہاں تک آداب و ادب کا تعلق ہے۔ ہمیں آپ سے کچھ نہیں سیکھنا۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ اس محفل میں کور کمانڈر بھی موجود تھے لیکن جب پاکستان، پاکستانیوں پر حرف آ رہا ہو تو وہ کسی پروٹوکول کی پرواہ نہیں کرتے۔

——— کرنل محمد یونس[۵۷]

واقعہ یہ ہے کہ میں ان کے دور میں چند مہینے ہی کالج رہا۔ وہ جولائی ۱۹۵۲ء میں آئے تھے۔ میں اس وقت آئی ایس ایس بی کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ ستمبر اکتوبر میں میں سلیکٹ ہو کر پی ایس سی ٹی ایس کوسٹر چلا گیا لیکن یہ چند مہینے میرے لیے سالوں پر بھاری تھے اگر میں یہ کہوں کہ جس طرح ان کا کالج میں آنا کالج میں انقلابی اور دور رس تبدیلیوں کا باعث بنا اسی طرح ان چند مہینوں نے اور دوسرے کیڈٹس کی طرح مجھے بھی ایک نیا طرز احساس۔ ایک نئی سوچ اور ایک مشن بلکہ وژن دیا۔

---

[۵۷] کالج نمبر ۱۶۰۶

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

برسوں سے ہم ایک ڈگر پہ چل رہے تھے۔ پی ٹی پریڈ، ڈرل، کلاسز پہ پیپ، کھانا اور سونا اس دائرہ میں ہم گھوم رہے تھے کوئی خاص آئیڈیل کوئی وژن نہیں تھا۔ اگر کوئی بڑی سے بڑی امنگ تھی تو یہی کہ افسر بن جائیں۔ کیسا افسر، اور کس لیے اس کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس وقت تو خیر ان چیزوں کا ادراک کیا ہوتا۔ لیکن آج جب میں پیچھے مڑ کے دیکھتا ہوں اور زندگی کے تجربات کی روشنی میں اس کا تجزیہ کرتا ہوں تو اس کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان سے پہلے ہم ایک چٹیل صحرا میں سفر کر رہے تھے۔ سامنے کوئی پہاڑ نہیں تھا جس کی چوٹیوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکیں جو ہمیں انسپائر کر سکے جو ہمارے کیریر ہیرو کے طور پر سامنے آئے جو ہمیں یہ امیج دے کہ فوجی افسر ایسا ہوتا ہے۔ کمانڈ ایسے کی جاتی ہے لیڈر شپ اسے کہتے ہیں۔ قیادت کے گُر یہ ہیں۔

ان کی پرسنیلٹی کے ظاہری پہلو ہی کو دیکھئے مثلاً جب ہم پی ٹی پر جاتے اور دیکھتے کہ کمانڈنٹ کرنل رفیق ایک اونچے سیاہ گھوڑے پر اپنا چوڑا سینہ تانے بیٹھے ہیں، چہرے پر جلال ہے۔ کیڈٹس کو یوں عقابی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جیسے کوئی جنرل لڑائی سے پہلے اپنے ٹروپس کا معائنہ کرتا ہے اور جب "کاشن" دیتے تھے تو "مائی گاڈ" ساری پریڈ گراؤنڈ گونج جاتی تھی۔ یہ معمولی باتیں نہیں ہیں۔ پُرجلال انداز، شاندار ٹرن آؤٹ اور پُر شکوہ کاشن۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو اس عمر میں نوجوان کیڈٹوں کے دلوں میں لاشعوری امنگیں جگا دیتی ہیں جے ایس پی سی ٹی ایس میں جب مجھے ایک پلاٹون کو کمان کرنے اور کاشن دینے کا پہلی بار موقعہ ملا تو کرنل رفیق کی کاشن مجھے ہانٹ کرتی تھی۔ یہ تو ظاہری پہلو تھا جو اتنا Impressive تھا لیکن اس سے زیادہ اہمیت ان کی انسپائرنگ بلکہ charismatic شخصیت کی تھی اور ان کی عزت کی جاتی تھی۔

ان کی عزت رسمی نوعیت کی نہیں تھی جو رینک یا اتھارٹی کی وجہ سے کی جاتی ہے جس کا دل اور دماغ سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ ان کی برتری ان کی شخصیت و کردار پر مبنی تھی۔ ان کی عظمت دل پر اثر کرتی تھی۔ ان کے حوالے سے کم از کم میری

تربیت سے فائدہ بھی انہی نے سب سے زیادہ اٹھایا۔

آخر میں ؛ میں ان کی ایک اور خصوصیت کا ایک واقعے کے حوالے سے ذکر کروں گا۔ وہ یہ کہ وہ لڑکوں کی ہمت افزائی اور عوصلہ افزائی بہت کرتے تھے جب ہم گرلفین انسٹی ٹیوٹ لاہور سے باکسنگ جیت کر آئے تو ہمارا شاہانہ استقبال ہوا۔ نہر کے اس طرف بینڈ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اب باکسنگ ٹیم اس طرح کالج کی طرف بڑھی کہ براس بینڈ آگے آگے تھا۔ نہر سے کالج تک سڑک کے دونوں طرف لڑکے کھڑے تالیاں بجا رہے تھے۔ گیٹ پر کرنل رفیق اور سٹاف نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ جناب مزہ آگیا عزت سے بڑھ کر دنیا میں کیا چیز ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ہمت افزائی صرف باکسنگ ٹیم کی نہیں تھی۔ سارے لڑکوں کی تھی بالواسطہ طور پر ان کے عوصلے بھی بلند ہوئے انہوں نے بھی قیادت کا گر سیکھا کہ کام کی قدر کرو۔ محنت کی عوصلہ افزائی کرو آج ان لڑکوں میں سے دو چار نہیں بیسیوں آرمی اور سول میں اعلیٰ عہدوں پر ہیں اور ایک خاص سوچ رکھتے ہیں ایک چراغ سے کتنے چراغ جلے ہیں اور ان سے اور کتنے چراغ جلیں گے۔

پچھلے دنوں کالج میں جانا ہوا۔ گیٹ پر وہ پرانا نیم دائرہ نما گرین بورڈ نظر نہیں آیا۔ جس پر بڑے بڑے سفید حروف میں لکھا تھا۔ "انٹر لوپرن گو آؤٹ تو سرو" پرانے گیٹ کی جگہ ایک بے حد خوبصورت گیٹ تھا۔ اس پر بہت چمکتی ہوئی خاصی قیمتی قندیلیں بھی نصب تھیں۔

——— بریگیڈئر محمد اکرم[1]

جولائی ۵۲ء میں کرنل رفیق کے آنے سے پہلے بھی کالج میں ایف اے سی سی کام کر رہا تھا۔ کرنل زیدی تھے، مسٹر حیدری تھے، مسٹر راشد تھے لیکن ان غیر نصابی سرگرمیوں سے جو لوگ استفادہ کر رہے تھے وہ زیادہ تر پرائیوٹ لڑکے تھے اور ان کی تعداد محدود تھی زیادہ تر لڑکے میری طرح نظر انداز ہو رہے تھے۔ رفیق صاحب نے آکر سب پر

---

[1] کالج نمبر ۱۹۲۸

ذاتی توجہ دی وہ اس طرح کہ ہر ایک لڑکے سے انٹرویو لیا۔ ہر ایک کو دو چار منٹ بلکہ بعض کو تو اس سے زیادہ وقت دیا اس طرح ان کو لڑکوں کی اور ڈسپلن کی پرابلمز کا اندازہ ہوا اور عام لڑکوں کو بھی احساس ہوا کہ ہم بھی کچھ ہیں ہمارا بھی کوئی ہے۔ اور یہ بھی نہیں کہ ان کا یہ رویہ صرف لڑکوں کے ساتھ ہی ہو۔ سٹاف بلکہ کلاس فور ملازمین تک ان کو اپنا سمجھتے تھے اسی اپنائیت کا نتیجہ تھا کہ جب اپریل ۱۹۵۳ء میں انہیں یکایک کالج چھوڑنا پڑا تو لڑکے تو لڑکے۔ مسٹر اقبال ایسے عمر رسیدہ استاد بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو رہے تھے۔ انہوں نے ہر ایک سے کام لیا۔ کیڈٹس تو چکر میں رہتے ہی تھے۔ سٹاف کو بھی کسی گھڑی چین نہ تھا۔ دوسرے ملازمین بھی ہر وقت بھاگ دوڑ میں لگے تھے سٹاف ہر طبقہ کی دیکھ بھال بھی وہ اس طرح کرتے تھے کہ وہ ان کے اشارے پر اپنا آرام بھی قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ کالج میں پڑھی ہوئی کتابیں کب کی بھول گئیں لیکن لیڈرشپ کے جو سبق انہوں نے پڑھائے وہ اب بھی یاد ہیں بلکہ اب ان کی قدر و قیمت زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔

——— عبدالحفیظ[۱]

کرنل رفیق میں ایک پُراسرار قوت کشش تھی وہ ایک دم متاثر کرتے تھے خاص طور پر نوعمری میں ایسی پرشکوہ اور پُراسرار شخصیت سے واسطہ ذہن کو نئی بلندیوں سے آشنا کرتا ہے پھر اندر سے ان کی شخصیت ایسی تھی جس نے طلبہ کو زندگی کی بنیادی قدروں سے روشناس کیا۔

——— لیفٹیننٹ کرنل مہدی حسن[۲]

ملٹری کالج میں میرا زمانہ تعلیم ۱۹۴۸ء سے اکتوبر ۱۹۵۲ء تک رہے۔ کرنل رفیق جولائی ۵۲ء میں پہلی بار آئے۔ اس طرح صرف چند ماہ مجھے ان کے زیر تربیت رہنے کا موقعہ ملا یہ دن بھی وہ دن تھے جب میں ایف ۔ پی ایم اے کے آئی ایس ایس بی کی تیاری کر رہا تھا لیکن اوائل ستمبر ۵۲ء میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے زندگی بھر کے لیے ایک سبق سکھا دیا۔

---

[۱] کالج نمبر ۱۹۷۰ء۔ [۲] کالج نمبر ۱۹۶۲ء

ہدایت کہ وہ آکنلک ہاؤس میں کھانا چیک کرنے آئے۔ کھانا اس دن کسی وجہ سے خراب پکا تھا۔ انہوں نے چکھا اور کہا یہ ٹھیک نہیں۔ دوسرا پکواؤ۔ دوسرا کھانے کی گھنٹی بجنے ہی والی تھی۔ میں سینئر کیڈٹ آفیسر تھا۔ میرے منہ سے نکل گیا سر، یہ ناممکن ہے۔ یہ سن کر انہوں نے کہا، کبھی یہ لفظ منہ سے نہ نکالنا۔ جس کو پہلے سے امپاسبل سمجھتے ہو وہ پاسبل کیسے ہوگا۔ بلاؤ سی کیو ایم ایس اور سی ایس ایم کو۔ مختصر یہ کہ پھر ہم نے بھاگ دوڑ کی اور بازار سے سبزی منگوا کر گھنٹے سوا گھنٹے بھر میں کھانا میز پر لگوا دیا۔ بہت خوش ہوئے۔ ہم تینوں کو شاباش دی پھر مجھ سے کہا زندگی میں بار بار ایسے مرحلے آتے ہیں جب کوئی کام ناممکن نظر آئے ضروری نہیں کہ واقعی ناممکن بھی ہو۔ اگر ہے بھی تو اس کا حل ڈھونڈھنا چاہیے۔ میں نے تمہارے کاغذات دیکھے ہیں تم کمیشن کے لیے جا رہے ہو۔ تمہاری کارکردگی سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم سلیکٹ ہو جاؤ گے۔ اور ان کی ہمت افزائی سے میں سیلیکٹ بھی ہوا۔ لیکن اس سے بڑھ کر وہ سبق تھا جو اس تجربے سے سیکھا کہ چیلنج خواہ کتنا ہی بڑا ہو اس کو فیس کرنا چاہیے میں نے پوری سروس میں ان ایسے Drive اور Push کا آدمی نہیں دیکھا۔

—— راجہ محمد افضل[1]

یہ واقعہ ۱۹۵۲ء کا ہے۔ ہم لوگ کھاریاں کی طرف شکار کے لیے گئے اس شکار پارٹی میں کوئی تیس پینتیس افراد تھے۔ لڑکوں میں ۱۶۴۰ حفیظ، ۱۵۲۳ کاظم کمال، ۱۶۹۳ ہاکی والا امان اللہ، ۱۷۳۸ سلطان، ۱۸۲۶ اکرم، ۱۷۰۹ منور کے نام یاد رہ گئے ہیں۔ سٹاف میں لیفٹیننٹ راؤ صاحب اور مسٹر شمسی تھے۔ جمعے کے دن رات کو کھاریاں کے قریب ایک گاؤں میں پہنچے، دارے یا مہمان خانے میں ہم سب لوگوں کے لیے چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ نمبردار نے ہماری خاطر تواضع کا خاصا اہتمام کیا تھا۔ صبح سویرے مرغابیوں کے شکار کے لیے جھیل پر پہنچے۔ گنیں تو چار پانچ ہی تھیں تین سٹاف کے پاس دو سے باری باری ہم شوق فرماتے تھے دوپہر کو وہیں کھانا کھاتے شام کو دن ڈھلتے واپس آتے اور پھر شکار کو بھون کر کھاتے۔ یہ سلسلہ ہفتہ اتوار

---

[1] کالج نمبر ۱۷۰۰

دو دن چلا۔ بہت انجوائے کیا انوار کی شام واپس آرہے تھے تو رفیق صاحب نے اپنی گن خود اٹھائی ہوئی تھی۔ ہم میں سے کئی نے اصرار کیا سر ہمیں دے دیں لیکن وہ نہ مانے۔ واپسی پر ہم لوگ چپ چاپ چلے آرہے تھے۔ انہوں نے کہا کچھ گاؤ چپ کیوں ہو۔ کاظم فوراً شروع ہو گیا چل چل رے نوجوان، چلنا تیرا کام، اس کو دیکھا دیکھی ایک دو اور نے بھی تانیں اڑائیں کاظم تو بے باک تھا۔ اس نے کہا سر آپ بھی کچھ سنائیں کرنل صاحب نے جواب دیا "مائی اردو واز ناٹ گڈ"، کاظم فوراً بولا میں اُردو میں سنانے کے لیے نہیں کہہ رہا۔ انگریزی میں کوئی چیز ہو جائے چنانچہ چلتے چلتے کئی ٹیونیں وسل کیں اور مجھے خیال پڑتا ہے کہ انہوں نے کوئی ملائی گانا بھی سنایا تھا۔ اس کے ختم ہونے پر بڑی زور دار تالیاں بجی تھیں۔

اس وقت تو ہم خوش ہوئے تھے کہ دیکھا کرنل صاحب سے بھی گانا گوا لیا نا۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ ان کا ہمارے ساتھ شکار پر ساتھ رہنا اور کھانا پینا اور بے تکلفی سے گانا سب سوچی سمجھی تدبیریں تھیں۔ ہماری تربیت کے لیے ایک اور واقعہ بھی یاد آرہا ہے جس سے کم از کم میں نے بہت اثر لیا۔ یہ واقعہ باکسنگ رنگ کا ہے۔ انٹر ہاؤس باکسنگ کے مقابلے ہو رہے تھے۔ جہاں آجکل کالج آڈیٹوریم کا سٹیج ہے اس جگہ باکسنگ رنگ تھا۔ سٹاف کے لیے رکھے صوفے پر کرنل صاحب بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ ہی مسٹر اقبال بیٹھے تھے کرنل صاحب نے پہلے ان کو سگریٹ آفر کیا اور پھر لائٹر سے بے خیالی میں پہلے اپنا سگریٹ سلگا لیا۔ سلگاتے سلگاتے انہیں خیال آگیا فوراً آئی ایم ساری" کہا اپنا سگریٹ زمین پر پھینکا پھر پہلے ان کا سگریٹ سلگایا اس کے بعد نیا سگریٹ نکال کے اپنے لیے سلگایا۔ یہ پورا منظر فلم کی طرح میری آنکھوں میں محفوظ ہے۔

آخر میں ایک ایسا واقعہ کا بھی ذکر کرنا چاہوں گا جس کا تعلق مجھ ہی سے ہے یہ بات ۵۴ کے شروع دنوں کی ہے، میں آرمی کلاس میں آئی ایس ایس بی کی تیاری کر رہا تھا کہ گھر سے اطلاع ملی کہ رشتے داروں سے کچھ جھگڑا ہوا ہے۔ میں بہت پریشان ہوا کچھ اس لیے بھی کہ ہمارے گھر کوئی تھانے کچہری کا چکر لگانے والا نہ تھا۔ میں نے کرنل صاحب سے تذکرہ کیا انہوں نے کہا جو زیادتی ہوئی ہے۔ اسے ایس پی کے نام

ایک درخواست میں لکھ دو۔ میں نے کہا میں کیسے لکھوں۔ میں نے کبھی اس طرح کی درخواست نہیں لکھی تو انہوں نے خود ایس پی کو لکھا اور ایس ایچ او کو کالج میں بلایا اور کہا جو کچھ افضل سے پوچھنا ہے یہیں پوچھ لو۔

اس طرح کی کرم فرمائی وہ ہر کیڈٹ پر کرتے تھے۔ سزا بھی خلوص سے دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب اپریل ۱۹۵۴ء میں یکایک ان کا تبادلہ ہوا تو کاظم جیسے لڑکے جن کی انہوں نے سخت پٹائی کی تھی ان کے جانے کے وقت آنسوؤں سے روئے۔

—— محمد یونس کیانی[1]

رفیق صاحب کے بارے میں میرا تاثر ان کے پہلے ایڈریس کا ہے۔ کالج ہال کے دائیں دروازے پر اسسٹنٹ کمانڈنٹ اور چیف انسٹرکٹر میجر اے ایچ ابراہیم کے خیر مقدمی سیلوٹ کا جس سمارٹ انداز سے انہوں نے جواب دیا اور جن قدموں سے وہ ڈائس کی طرف بڑھے میں اس منظر کو کبھی نہیں بھول سکتا پہلی چیز جس نے مجھے متاثر کیا وہ ان کا بے حد سمارٹ ٹرن آؤٹ تھا اور اس سے بھی زیادہ متاثر کن عقابی آنکھیں۔ چہرہ بھی دمک رہا تھا ان کے تیور بتا رہے تھے جیسے وہ کسی میدان جنگ کی کمان سنبھال رہے ہوں۔ ہال میں سناٹا تھا۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز تھیں۔ اور سب کی آنکھیں روسٹرم پر مرکوز تھیں وہ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بولے۔ مجھے الفاظ یاد نہیں انداز یاد ہے ان کی آواز کی گونج نے ان کے پُرعزم طریق تقریر نے، ان کے لہجے کی قوت نے، ان کی سوچ کی صداقت نے ہمیں دل کی گہرائیوں تک ہلا کر رکھ دیا۔ جب ایڈریس ختم ہوا۔ اور ہم لوگ باہر آئے تو ہم وہ نہیں تھے جو ہال میں جاتے وقت تھے۔ ملٹری کالج میں ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی۔

ان کے لیکچر نے ہمیں اپنی تعلیم کی بلکہ اپنی زندگی کی ایک نئی مقصدیت سے آگاہ کیا ایک واضح اور قابل فخر منزل کا شعور دیا۔ اور سب سے بڑھ کے یہ امنگ کہ ہم ایک آزاد اور نئی مملکت کے دست و بازو ہیں ہمیں کچھ کرنا ہے ہم کچھ کر سکتے ہیں اور اور پھر کالج میں ایک بالکل نئے ٹیمپو سے کام شروع ہوا ایسا ٹیمپو جس میں ہماری

---

[1] کالج نمبر ۱۷۱۰

امنگیں شامل تھیں۔ وہ دن کالج میں انقلابی تبدیلیوں کے دن تھے۔ ہر صبح ایک نیا پیام لاتی تھی اور ہر روز کوئی نہ کوئی نئی چیز سامنے آتی تھی ہر طرف ایک ہلچل تھی، ایمرجنسی کا سا سماں تھا۔ صبح سے شام بلکہ رات گئے تک کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا اور جو سستی کرتا یا دائیں بائیں چلنے کی کوشش کرتا اس کے لیے سخت اور فوری سزا تھی۔ چونکہ وہ خود ہر جگہ موجود تھے اور ہر کام کی خود نگرانی کرتے اس لیے کسی کے بچ کر نکل جانے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

اس زمانے کی تبدیلیوں کو میں اب یاد کرتا ہوں اور ان کا تجزیہ کرتا ہوں تو میں اس نتیجہ پہ پہنچتا ہوں کہ ان کا فلسفہ تعلیم یہ تھا کہ ہمیں اپنی پہچان ہو کہ ہم کیا ہیں ہماری منزل کیا ہے، ان کا زور دریافت پر تھا۔ انفرادیت کی جستجو پہ تھا۔ اس نکتہ کو میں مثالوں سے واضح کروں گا۔

۱۴ راگست ۱۹۵۲ ر کو یوم آزادی کے موقع پہ سیدھی سی عام بات تو یہ ہوتی کہ اس روز چھٹی کی جائے لڑکے اور استاد آرام کریں یا سیر و تفریح میں دن گزاریں لیکن انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے ۱۴ راگست کو کس طرح منایا؟ اس زمانے کے لڑکوں اور استادوں کو یاد ہو گا۔ مجھے بھی یاد ہے کہ انہوں نے سب کالج کو جمع کیا اور کالج کے گیٹ کے سامنے سڑک کے اس پار جو تین کھیل کے میدان ہیں ان کے چاروں طرف باڑھ لگوائی۔ شیشم کے درخت لگوائے اور اس پروجیکٹ میں سٹاف بھی شریک ہوا بعد کو ہر ایک لڑکے کو ایک ایک پودے کو صبح سویرے پانی دینے کی ذمہ داری دی۔ مقصد کیا تھا؟ مقصد پاکستان سے تعلق استوار کرنا تھا۔ اس بات کا احساس دلانا تھا کہ قومی مفاد کو مستحکم کرنا بھی ہماری ایک ذمہ داری ہے۔ کچی عمر میں بچے ہر بات نہیں سمجھتے لیکن رویے اسی عمر میں بنتے ہیں۔ پاکستانیت کا پہلا سبق میں نے ملٹری کالج ہی میں پڑھا۔ اور اس بات کا شعور مستحکم کرنے کے لیے کہ ہم ملٹری کالج کے فرزند ہیں۔۔ اور قابل فخر فرزند ہیں اور اس فرزندی کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں انہوں نے پیتل کی پٹی پر کالج کا نام کندھوں پہ لگانے کے لیے بنوایا۔ کلاس کے تشخص کے لیے کلاس کا نشان بازوں پر لگوایا۔

کرنل رفیق نے ہمیں قطار (پریڈ) اور کتاب کی محدود دنیا سے نکال کر کھلی فضا میں اپنے دست دبازو آزمانے کی لذت اور افادیت سے آشنا کیا۔ باغبانی، ہائکنگ رائڈنگ جیسے آؤٹ ڈور مشغلوں کی انہوں نے ہمت افزائی کی رائڈنگ کا ذکر آیا ہے تو یہ لطیفہ بھی سناتا چلوں کہ رائڈنگ کے لیے ہم کیپٹن اسمٰعیل کا گھوڑا استعمال کرتے تھے جس کو اس کے اصطبل سے نکالنا تو ایک مرحلہ تھا۔ میں عمر حیات اور کاظم کمال تین اس کو مار مار کر لائن یا رننگ لاتے تھے۔ لیکن واپسی میں وہ ایسی برق رفتاری دکھاتا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا صرف کاظم شہید اسے قابو کرتا تھا۔ بعد کو پتہ چلا کہ کیپٹن اسمٰعیل نے اپنے سائیس کو حکم دے رکھا تھا کہ صرف رائڈنگ سے واپسی پر اسے چارہ ڈالا جائے۔

اب میں اس دور کے چند واقعات لکھتا ہوں جو مجھے خاص طور پر یاد رہ گئے ہیں۔

پہلا واقعہ ۸۰، ا محمد رقیب کی حادثاتی موت کا ہے۔ وہ بھی سکین ہاؤس میں میری طرح کیڈٹ سارجنٹ تھا۔ ہاکی کھیلتے ہوئے سر میں چوٹ لگی اور پھر جاں بر نہ ہو سکا۔ اس کے انتقال پر کرنل رفیق کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شخص جو بظاہر سنگ خارا نظر آتا ہے رفیق القلب بھی ہے۔ رقیب کی میت کو آنسوؤں سے آخری سلام کر کے ہاؤس واپس آیا تو انسان کی خود غرضی، تنگ نظری اور بے حسی کا بھی ایک نظارہ دیکھا۔ میں اسے بھی لکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ رقیب کا لاکر کھلا پڑا ہے اور لڑکوں نے اس کی کٹ کے نئے آئیٹم پرانوں سے بدل لیے ہیں حد یہ کہ ہاکی بھی بدل چکی ہے اللہ اکبر! اس کا نام دنیا ہے۔

ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے اس کا تعلق کرنل رفیق سے ہے۔ ان کا تقریر کرنے کا ایک خاص انداز تھا۔ ایک روز پریپ میں میں کلاس (دسویں اے) کے سامنے انکے لب ولہجہ اور سٹائل میں ان کی افتتاحی تقریر کی نقل اتار رہا تھا۔ وہ یکایک کھڑکی پر نمودار ہوئے ان کو دیکھتے ہی میں ایک دم چپ ہو گیا۔ میں کیا ساری کلاس سمجھی کہ اب شامت آئی لیکن انہوں نے برا نہیں مانا۔ بلکہ مسکرا کر کہا "کیری آن آئی دانٹ ٹو لسن ٹو یو"، چنانچہ میں نے وہ تقریر پھر دہرائی سخوش ہوئے۔ مجھے شاباش دی اور چلے گئے۔ جاتے وقت صرف اتنا کہا۔ لیکن پریپ پڑھنے کے لیے ہوتا ہے، وہ شرارت، شوخی، بدتمیزی اور حکم عدولی

میں فرق کرتے تھے۔

ان کے چارج لیتے ہی جو بالکل نئے فنکشن ہوئے ان میں سے ایک برنیس ٹرنٹ تھا۔ دوسرا ایلوکیوشن کانٹیسٹ، خطابت کے اس مظاہرے میں حیدری صاحب کے بعد انہوں نے خود بھی حصہ لیا تھا۔ اور ابراہام لنکن کی مشہور زمانہ گیٹسبرگ سپیچ کی تھی اسی خطابتی مقابلہ میں میں نے خود جان رسکن کی وہ تقریر پیش کی تھی جو اس نے رائل ملٹری کالج وولوچ کے کیڈٹس کے سامنے کی تھی۔ یہ تقریر رسکن کی کتاب دی کراؤن آف وائلڈ اولیو سے لی گئی تھی۔ اسی زمانے میں اردو کا ایلوکیشن کانٹیسٹ بھی ہوا تھا جس میں واجد اور میں نے خوشی محمد ناظر کی نظم جوگی پورے ڈرامائی تاثر کے ساتھ پیش کی تھی۔ واجد جوگی بنا تھا۔ اور راکھ ملے جوگی کا روپ دھارے جوگیوں کی طرح آگ کے سامنے بیٹھا تھا۔

کاروان زندگی کی وہ پہلی منزل نہیں بھولتی۔ اب بظاہر خزاں ہے لیکن بوئے یاسمن باقی ہے۔

——— بریگیڈئر سلطان احمد ستارۂ جرأت دوبار[1]

نومبر ۵۲ء کی سالانہ تقریب کے انعامات کے موقع پر کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان مہمان خصوصی تھے۔ تقریب کا آغاز پریڈ کی سلامی سے ہونا تھا۔ کسی غلطی سے مہمان خصوصی مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے آ گئے اور جنرل سیلوٹ لینے ڈیس پر کھڑے ہو گئے۔ کرنل رفیق نے بڑے معنی خیز انداز میں اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور خاموش کھڑے ہو گئے دو منٹ کے بعد انہوں نے یہ جتانے کے لیے آپ پہلے آ گئے ہیں پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ اور بالکل صحیح وقت پر پریڈ شروع کروائی اور یہ بات سارے کالج نے نوٹ کی۔ اس جلسہ تقسیم انعامات پر مجھے ذوکتابیں Tales from Shakespeare اور نسیم حجازی کا ناول شاہین انعام میں ملی تھیں۔

۱۹۵۳ء کے اوائل میں ۱۷۸۰ ہاکی کا بال لگنے سے رقیب کی ناگہانی موت پر سارے کالج پر اداسی طاری تھی۔ انہوں نے اس موقع پر موت کے فلسفہ پر ایک بہت ہی موثر تقریر کی اور افسردگی کا رخ پُرعزم زندگی کی طرف موڑ دیا ۷۳-۱۹۷۲ء میں، میں کھنڈار میں ۷۰ بریگیڈ کمان کر رہا تھا اس کی ایک یونٹ کرنل رفیق کی پرانی بٹالین ۱۹ پنجاب بھی تھی۔ اس وقت ۱۹ پنجاب

[1] کالج نمبر ۱۷۳۸ زمانہ تعلیم ۱۹۴۷ء

ہیں رفیق صاحب کے زمانہ کا کوئی ایک آدھ افسر اور جے سی او ہی ہو گا لیکن یونٹ میں ان کی یاد تازہ تھی۔ ۱۹ پنجاب کے افسر نے مجھے یہ واقعہ سنایا کہ ۱۹ پنجاب جس کے وہ کرنل کمانڈانٹ بھی تھے نے انہیں ۱۹ پنجاب کے شہیدوں کی یاد میں منعقدہ ایک تقریب میں انہیں مہمان خصوصی کے طور پر بلایا تو جب وہ اختتامی تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو جذبات سے اتنے مغلوب ہوئے کہ ان کی آواز رندھ گئی اور ان کے آنسو بہنے لگے۔ ان کے آنسوؤں کو دیکھ کر ساری بٹالین کی ہچکی بندھ گئی اسپری ڈی کور Espirit De corps کا اس سے بڑھ کر مظاہرہ چشم فلک نے کبھی کیا دیکھا ہو گا۔

۱۹۷۳ء میں، میں پی او ڈبلیو تھا۔ میرے بیٹے حیدر کو لارنس کالج میں داخلہ کے لیے میرے بھائی لے کر گئے تو انھوں نے حیدر کو پہچان لیا اور اس کی مناسب دیکھ بھال کی لیکن جب میں قید سے واپس آیا تو اس دن جو طلبا سے ملاقات کا دن نہ تھا انھوں نے ملاقات کی اجازت مجھے بھی نہ دی۔

—— لیفٹیننٹ جنرل پیر داد خان ستارۂ جرأت [۱]

ملٹری کالج کا نام ذہن میں آتے ہی جو ایک تصویر فوراً میرے ذہن میں ابھرتی ہے وہ بریگیڈیر محمد رفیق کی تصویر ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ میرا ہی حال نہیں یہ تجربہ ہر اس عالمگیرین کا ہو گا جو خوش نصیبی سے ان کے دور میں ملٹری کالج کا طالبعلم رہا ہے۔

اس عمر میں اور اپنے کیریر کی اس منزل میں آکر اور زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ کر اور بے شمار افسروں اور اچھے اچھے تعلیم یافتہ افراد سے مل کر یہ میری پختہ رائے ہے کہ زمانہ طالب علمی میں اور زمانہ تربیت میں غیر معمولی ذہن اور کردار کے اساتذہ سے واسطہ غیر معمولی اثرات رکھتا ہے۔ ذہن لاشعوری طور پر اونچے معیاروں اور بلند رویوں سے متاثر ہو جاتا ہے اور وقت آنے پر ان منزلوں کی طرف قدم خود بخود اٹھ جاتے ہیں۔

بریگیڈیر رفیق کالج میں دو بار کمانڈنٹ رہے۔ میں ان کے پہلے دور میں ان کا طالبعلم رہا۔ یہ دور مختصر رہا پورا سال بھی نہیں لیکن میں نے ان سے لازوال اثرات قبول کیے۔

---

[۱] کالج نمبر ۱۷۳۹

کسی فرد کو ادارہ بن جانے کی سعادت آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ بریگیڈیئر رفیق کا نام ملٹری کالج کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا کیونکہ انھوں نے ملٹری کالج کو ایک کردار دیا۔ ایک انفرادیت دی اور ایک امتیاز دیا۔ اس انفرادیت کی اب میں تھوڑی بہت توضیح کرنا چاہتا ہوں۔

قیادت اور سیادت کی صفات کا تذکرہ کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ لیکچروں اور تقریروں میں بھی ان خوبیوں کا ذکر بار بار آتا ہے اس لیے ہر طالب علم جانتا ہے کہ لیڈر شپ کے تقاضے کیا ہیں۔ اس کی صفات کیا ہیں۔ اچھا قائد یا افسر کون ہوتا ہے یا اچھے قائد کو کیسا ہونا چاہیے لیکن جاننے سے بات نہیں بنتی اس لیے سب انسانوں کو خاص طور پر طلبہ کو ایک حوالہ چاہیے۔ ایسا انسان چاہیے جو ان صفات کا جیتا جاگتا نمونہ ہو ان کی ایک زندہ مثال ہو۔ جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے۔

بریگیڈیئر رفیق ایک ایسے ہی قائد تھے۔ لیڈر شپ کی تمام بنیادی صفات اور خصوصیات ان کی ذات میں بلکہ زندگی میں موجود تھیں اس لیے وہ بہت موثر انسان تھے، ان کا زور کردار کی تعمیر پر تھا۔ اور خود ان کا کردار پارس پتھر کی تاثیر رکھتا تھا جو بھی ان کے قریب آتا وہ ان کے کردار کی تاثیر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

کردار سازی کا انہیں جنون سا تھا۔ اور خدا نے انہیں اتنی جسمانی توانائی اور قوت برداشت دی تھی کہ وہ اپنے مقاصد کے لیے دن رات ایک کر سکیں۔ کالج کے علاوہ انہیں کسی اور چیز سے نہ کوئی تعلق تھا اور نہ دلچسپی ان کی ساری توجہ ساری توانائی کالج پر مرکوز تھی۔ اور کالج ان کے لیے پاکستان کی علامت تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان کا پہلا لیکچر سائنس ہال میں ہوا تھا۔ اور ان کے لب ولہجہ کی گرج سے سارا ہال ہل کے رہ گیا تھا طلبہ کو ڈھیلی ڈھالی نہیں ایسی ہی پرجوش اور پرعزم شخصیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ سخت تھے لیکن انصاف کے ساتھ۔ خلوص کے ساتھ سخت تھے اور ایسی سختی آخر کار طلبہ بہت پسند کرتے ہیں ان کی سختی ایک جہاندیدہ باپ کی سختی تھی جو آخر کار آئیڈیل بن جاتی ہے۔

ایک چیز جو میں نے اس زمانے میں خاص طور پر نوٹ کی وہ یہ تھی کہ انہوں نے اس کالج کو ایک قومی رُخ دینے کی کوشش کی۔ ورنہ اس سے پہلے اس پر تاج برطانیہ کا سایہ ضرورت سے بہت زیادہ تھا۔ ۱۹۵۰ء میں جو سلور جوبلی منائی گئی اور پھر کالج کا جو رسالہ تربیت نکلا اس میں شکر گزاری کے ساتھ جارج پنجم کا تذکرہ بھی موجود تھا اور پورے صفحہ کی بڑی تصویر بھی شامل تھی۔

بریگیڈیئر رفیق نے کردار سازی پر جو زور دیا اس کا نتیجہ میں نے ستمبر اور دسمبر کی جنگوں میں خود دیکھا۔ ۷۱ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان میں میرے ساتھ کئی عالمگیرینز تھے اور ان میں سے ہر ایک جرأت کی تصویر تھا۔ اور پاکستان کے حوالے سے بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ کسی لیڈر کا کمال یہ ہے کہ وہ خود قومی مقاصد کی علامت بن جائے بریگیڈیئر رفیق کو یہ مقام حاصل تھا۔

——— میجر نصیر احمد[1]

جولائی ۱۹۵۲ء میں جب رفیق صاحب نے پہلی بار کالج کی کمان سنبھالی تو وہ تاب و توانائی کا زندہ مجسمہ تھے۔ ان کی عقابی آنکھوں کی کوئی تاب نہیں لا سکتا تھا جب وہ مشکی گھوڑے پر سیدھے بیٹھے ہوئے کالج کا دورہ کرنے نکلتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے شیر بیٹھا ہوا ہے ان کو دیکھ کر ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ مجھ پر ایک اثر ان کی ظاہری شاندار شخصیت کا بھی ہے دوسرا تاثر یہ ہے کہ وہ کٹر پاکستانی تھے قائداعظمؒ کے بعض مقولے انہوں نے کالج کی دیواروں پر لکھوا دیئے تھے جیسے

God has given us a Grand Opportunity to show our worth as Architects of A new State, let it not be said that we did not prove Equal to the Task.

آج یہ الفاظ ہمارے دلوں میں نقش ہیں۔

---

[1] کالج نمبر ۱۸۰۷ زمانہ تعلیم ۵۵-۱۹۴۸ء

——— صوبیدار محمد اکرم[1]

جب کرنل رفیق پہلی دفعہ کالج میں تشریف لائے تو انہوں نے کالج میں آنر سسٹم کا آغاز کیا۔ مقصد یہ تھا کہ کیڈٹوں میں اپنی خودی کا شعور پیدا ہو۔ اور وہ اس کی روشنی میں کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کریں۔ رجمنٹل سسٹم کے مقابلہ میں جس میں دوسرے کی دی ہوئی سزا کا خوف ہی کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کا محرک تھا اس سسٹم کا اجراء ایک جرأت مندانہ تجربہ تھا جو تربیت کے بارے میں ایک نئی سوچ کو ظاہر کرتا ہے کمانڈنٹ صاحب نے پہلے ہر لڑکے کو اپنے دفتر میں بلا کر قرآن پاک پر ہاتھ رکھوا کر آنر کوڈ کی قسم لی۔ یہ چار فقرے تھے۔ میں اپنی عزت کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ میں ہمہ وقت اپنی بہتری کے لیے کوشاں رہوں گا۔ میں کبھی کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے میری، میرے خاندان پر یا میرے کالج کی بدنامی ہو۔ اگر کبھی اتفاق سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تو میں جرأت سے کام لے کر اس کی رپورٹ اپنے سینئر سے کروں گا اور اگر میں نے کسی اور کو غلط کام کرتے دیکھا اور اس نے خود اس کی رپورٹ نہ کی تو اس کی رپورٹ بھی اپنے سینئر کو کروں گا۔ میں عزم کرتا ہوں کہ میں اپنے کالج اور اپنے ملک کا نام سربلند رکھوں گا۔

آنر سسٹم کو تقویت دینے کے لیے ہر ہاؤس میں ایک ایک آنر شاپ بھی کھولی گئی تھی۔ آنر شاپ سے لڑکوں کو عملی طور پر دیانت داری کی تربیت ملی اور انہوں نے ضمیر کی آواز کو ترغیب کے وقت سننا سیکھا۔ یہ ایک تجربہ تھا جو پورے طور پر کامیاب تو نہ ہوا لیکن اس کی اصلی کامیابی یہ تھی کہ طلبہ ڈسپلن کے ایک نئے تصور اور طریقے سے روشناس ہوئے مزید براں یہ کہ ان کو کچھ آسانیاں بھی ملیں مثلاً ڈاک کے لفافے حاصل کرنے کا مسئلہ حل ہو گیا۔ طلبہ کی ضروریات کو آسانی سے پورا کرنا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔

ان کے آنے سے پہلے بہت زیادہ عہدے ہوتے تھے مثلاً ایک سیکشن (ڈارم) میں ایک لانس کارپورل اور ایک کارپورل ہوتا تھا۔ تین سیکشنوں پر ایک سارجنٹ ہوتا پھر ہاؤس کی سطح پر سی ایس ایم ہوتا۔ ایک ہی کیو ایم ایس ہوتا۔ یہ سینئر عہدیدار اپنے کندھے پر سبز پٹی لگاتے تھے جس پر عہدہ کی سفید کھڑی دھاریاں ہوتی تھیں۔ ریہ

[1] کالج نمبر ۱۸۰۸

کیڈٹ این سی او زہاؤس ہی میں رہتے تھے) جبکہ کیڈٹ آفیسرز سرخ پٹی لگاتے تھے جس پہ پلاٹون کمانڈر کی ایک، کمپنی کمانڈر کی دو اور کالج ہیڈ بوائے یا بٹالین انڈر آفیسر کی تین سنہری دھاریاں ہوتی تھیں۔ کیڈٹ آفیسرز کا میس علیحدہ ہوتا تھا اور انہیں کیڈٹ اردلی رکھنے کی اجازت بھی تھی جو ان کے کمرہ میں جاکر ان کی چپلیں وغیرہ پالش کرتا۔ اور بستر و وردی ٹھیک کرتا۔ اس سسٹم کو بھی انھوں نے ختم کیا۔ ان کی جگہ جونیئر سینیئر پریفکٹ مقرر کیے اور کیڈٹ آفیسرز میس ختم کر دیا گیا۔ ان کی رہائش ہاؤس میں کر دی گئی اور کیڈٹ آفیسرز کو سیلوٹ کرنے کا جو رواج تھا وہ بھی ختم کر دیا گیا۔

ایک اور تبدیلی جو انھوں نے کی وہ یہ تھی کہ صبح سویرے ناشتے سے پہلے کا پی ٹی پریڈ ختم کر دیا۔ پی ٹی کے وقت ہاؤس میں سیلف سٹڈی شروع ہوئی اور پی ٹی کلاس کے دوران شروع کے چار پیریڈ میں کسی پیریڈ میں ہوتی۔ اور کلاسوں کے وقت میں ایک پیریڈ کا اضافہ کر دیا پہلے چھ پیریڈ ہوتے تھے اب سات ہو گئے۔ صبح کے وقت ہاؤس میں سیلف سٹڈی کے پیریڈ کی نگرانی کے لیے کرنل رفیق خود بھی آتے تھے۔

کالج سے باہر بغیر اجازت جانے پر سخت پابندی تھی۔ چونکہ ۱۹۵۵ء میں ان کے دوسرے دور کے شروع ہونے سے پہلے لڑکے رات کو بہت آوارہ گردی کرنے لگے تھے اس لیے جب انھوں نے چارج سنبھالا تو رات کو ڈارمیٹری سے باہر نکلنے پر سخت پابندی لگا دی اور اس کی چیکنگ کا نظام اتنا سخت تھا کہ حد نہیں۔ ہر ڈارمیٹری سے باہر ایک بکس لگا ہوا تھا جس میں لڑکوں کے بستروں کی پلان کے مطابق ہر لڑکے کے نام کی ڈسک لگی تھی تاکہ معلوم ہو کہ ڈارمیٹری میں کون لڑکا کس جگہ ہے پھر رات کو کوئی افسر چیکنگ کرتے کم از کم ایک بار وہ خود بھی آتے۔ کیا مجال کہ کوئی لڑکا ادھر ادھر ہو جائے ان کی اس طرح کی سختیوں سے شریف لڑکوں کو بہت سکون ملا۔

کالج میں ان کی کوئی انٹیلی جنس سروس تھی یا نہیں لیکن نگرانی کا نظام حیرت انگیز حد تک اتنا موثر تھا کہ بعض اوقات متعلقہ لڑکے کو بھی علم نہیں ہوتا تھا کہ میں چیک ہو

لے کالج نمبر ۱۸۰۸

گیا ہوں۔ جب کمانڈنٹ صاحب اس کو دفتر میں بلاتے تب اس کو پتہ چلتا، کہ یہ بات ہے۔ یہ ان کے نظم ونسق کی خوبی تھی کہ انہیں ہر وقت معلوم رہتا کہ کالج میں کیا ہو رہا ہے میرا خیال ہے کہ کوئی خاص سراغ رسانی کا نظام نہیں تھا۔ صرف ان کی مستعدی ہمت اور دلچسپی تھی جس طرح ماں گھر کا کوئی کام کر رہی ہو۔ اس کا دل ہی نہیں نظر بھی بچے پر رہتی ہے اور اگر بچوں میں سے کوئی نظر کے سامنے نہ بھی ہو تو بھی اس کی چھٹی حس اسے بتا دیتی ہے کہ کون بچہ کہاں ہو گا۔ اور کیا کر رہا ہو گا۔ اصل میں محبت سب سے بڑا ریڈار ہے تعلق ہو تو سب کچھ پتہ چلتا رہتا ہے کرنل صاحب کو اپنے مشن سے جو عشق تھا، اسی نے ان کی چھٹی حس کو بیدار کر دیا تھا۔ دوسرے وہ خود اتنے مستعد اور اور متحرک تھے کہ لامحالہ ان کے عملے کو مستعد رہنا پڑتا تھا۔ میں یہ لکھ کر یہ نتیجہ نکالنا چاہتا ہوں کہ جب تک کوئی بڑا مقصد پیش نظر نہ ہو انسان غیر معمولی قوت اور مستعدی سے کام نہیں کر سکتا اور دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی افسر بظاہر زیادہ مستعد نظر آتا ہے۔ تو تاڑنے والے بھی غضب کی نظر رکھتے ہیں، وہ بھی سمجھ جاتے ہیں کہ اس کی تہ میں کیا ہے۔ رفیق صاحب کا سارا کام کھرا اور سچا تھا۔ ریاکاری کا تو ان پر سایہ تک نہیں پڑا تھا ان کی غیر معمولی مقبولیت اور کامیابی کا راز ان کی سچی لگن میں مضمر تھا۔

—— شوکت جنجوعہ[1]

کرنل رفیق کے آنے سے پہلے کالج کی دو خصوصیتیں تھیں پہلے یہ کہ سخت ریجی مینٹیشن تھا۔ دوسرے کلاس سسٹم سا تھا۔ عہدیدار لڑکے مراعات یافتہ تھے باقی کی حیثیت غلاموں کی سی تھی انہوں نے ریجی مینٹیشن کی گرفت کو کافی حد تک ڈھیلا کیا۔ اب شاید لوگوں کو یقین نہ آئے مگر یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۵۲ء میں لاکر سیٹ کرنے کا ایک سیٹ نمونہ تھا۔ اس سے سر موانحراف کرنے کی اجازت نہیں تھی انہوں نے اسے ختم کیا۔ بعض مراعات صرف کیڈٹ این سی اوز اور کیڈٹ آفیسرز کو حاصل تھیں۔ مثلاً پہلے صرف ان کی وردی پر استری ہوتی تھی، باقی لڑکے اپنے کپڑوں پر برش پھیرتے تھے۔ گویا تمیز بندہ و آقا کپڑوں

---

[1] کالج نمبر ۱۸۲۱-

میں بھی روا رکھی جاتی تھی ان کے حکم سے سب لڑکوں کے کپڑے پریس ہونے لگے۔ کچن میں ترکاری بنانے یا ذبح شدہ مرغوں کے پر نوچنے کی ڈیوٹی پر ہر سیکشن سے کیڈٹوں کی ڈیوٹی لگتی تھی۔ انہوں نے اس کو ختم کیا کیڈٹوں کے ذمے صرف وہ کام رکھے جن سے تربیت کا کوئی پہلو نکلتا ہو محض "فٹیک" سے لڑکوں کو نجات دلادی۔ اسپتال کو جو کھانا جاتا تھا اس کو تبدیل کیا۔ ہفتے میں دو روز چکن تھا انہوں نے ایک روز مچھلی رکھ دی کیڈٹ میسوں سے ہر دوپہر دفتر میں کھانا آتا تھا۔ اس کو چکھتے تھے اور ہر ہاؤس کو نمبر دیتے تھے۔ اور جس میس کا کھانا ہفتہ میں اوّل رہتا اس کے باورچیوں کو نقد انعام دیا جاتا۔

میجر جنرل محمد اکرم

۱۹۵۲ء کے اواخر میں کالج کے لیے وہ ایک تاریخی دن تھا جب نئے کمانڈانٹ کرنل رفیق نے کالج ہال میں کالج کی تاریخ کے پہلے پرنس ٹرسٹ کا افتتاح کیا۔ یہ صرف ایک معلوماتی فنکشن نہ تھا بلکہ ایک نئے دور کا آغاز اور کالج کی نئی تعلیمی و تربیتی ترجیحات کا غماز جو کالج کے نئے رول — ایک آزاد نظریاتی مملکت پاکستان کے لیے روشن دماغ فوجی افسر تیار کرنے کے مقصد سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ خوش قسمتی سے اس عظیم مقصد کی تکمیل کے لیے کالج کی زندگی کے اس تاریخی موڑ پر کالج کو کرنل رفیق جیسا Dynamic اور Charismatic رہنما اور رہبر ملا۔ اور سب سے بڑھ کر Committed

فروری ۵۳ء کے شروع میں کالج کے (غالباً پہلے ایلوکیوشن کانٹیسٹ Elocuton Conest کی تصویر آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ جب سٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا کہ اب مسٹر حیدری شیکسپیئر کے ڈرامہ جولیس سیزر سے مارک انٹونی کی مشہور Funeral سپیچ Recite کریں گے۔ اسی وقت سٹیج کے روسٹرم کو لٹا کر اس پر سیاہ کپڑا ڈال دیا گیا گویا یہ سیزر کا تابوت تھا اتنے میں رومن سینیٹروں کے روایتی لباس میں سٹیج کے داہنے بازو سے مسٹر حیدری نمودار ہوئے مسٹر حیدری کا ناک نقشہ بھی کلاسیکی تھا اور رنگ صاف وہ حیرت انگیز طور پر رومن لگ رہے تھے۔ جب وہ شروع ہوئے۔

Friends, Romans, country men, lend me your ears,

I come to bury Ceasar not to praise him.

تو ہال میں سناٹا چھا گیا۔ کیا آواز تھی کیا Expression تھا۔ کیا ڈرامیٹک Touches کہ وہ منظر الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب انہوں نے سپیچ ختم کی تو حاضرین ایسے سحر زدہ بیٹھے تھے کہ تالیاں بجانے میں ایک لمحہ کی دیر لگی۔ اس کے فوراً بعد اعلان ہوا کہ اب کمانڈانٹ لیفٹیننٹ کرنل محمد رفیق ابراہام لنکن کی مشہور گیٹسبرگ سپیچ کا اقتباس پیش کریں گے۔ تو ایک بار پھر ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ابھی پچھلا Excitement ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک دوسرا Excitement شروع ہو گیا مسٹر حیدری انٹرنیشنل سطح کے Dramatist اور Elocutionist تھے اپنے فن میں حرفِ آخر ان کے بعد بڑے بڑے فنکار بھی آنے سے جھجکتا۔ بہر حال کرنل رفیق تو کرنل رفیق تھے۔ بہر حال پردہ اٹھا۔ انھوں نے ابراہام لنکن کا میک اپ تو نہیں کیا ہوا تھا لیکن ابراہام لنکن کے سٹائل میں سفید تھری پیس سوٹ پر سیاہ بو ضروری لگائی ہوئی تھی انہوں نے اپنی عقابی نظریں اوپر اٹھائیں اور سپیچ شروع کی جب اس فقرہ پر پہنچے

The brave men, living or dead who struggled here, consecerated it for above our power to add or detract. The world will little note, nor long remember, what we sav here, but convener forget what they did here,

توان کی آواز کی گھرج سے ہال تھر تھرانے لگا۔ اور جب آخر میں یہ فقرہ:

This Nation, under God shall have a new Birth of freedom and that Government of the People by the People, for the people, shall not perish from the Earth.

ادا کیا تو ایک لمحہ کو ان کی آواز بھرا سی گئی یوں جیسے یہ الفاظ وہ خود پاکستان کے لیے کہہ رہے ہوں۔ (شاید اسی لیے انہوں نے یہ تقریر منتخب کی تھی) میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس ایلوکیوشن نے کس طرح ہمارے دلوں میں پاکستانیت کی آگ بھر دی۔ اور کتنا زبردست

ہوا۔ ہمارے ذہنوں پر اس تقریر کا اور کرنل رفیق کی شخصیت کا Impact
آج یہ جو پاکستانیت عالمگیر بنز کی پہچان ہے، یہ بڑی حد تک کرنل رفیق کی مدبرانہ تربیت کا نتیجہ ہے۔

——— عنایت خان بھٹی انجینئر[1]

ملٹری کالج کا جو لڑکا کالج سے ڈائریکٹ فوج میں چلا جائے ایک لحاظ سے اس کا سفر محفوظ راستوں پر ہوتا ہے۔ معاشی لحاظ سے بھی اور سماجی اعتبار سے بھی، ملٹری کالج کی قدر اور پھر خاص طور سے کرنل رفیق کی قدر کوئی ہم سے پوچھے جو سول میں گئے۔ گویا آندھی اور طوفان میں انجانی راہوں پر قدم رکھا۔ اپنے آپ کو بپھری ہوئی بے رحم موجوں کے حوالے کیا۔ پھر اگر ہم ساحل سے لگ سکے یا منزل مراد پر پہنچے اور سرخ رو بھی ہوئے تو یہ یقیناً بڑی حد تک اس تربیت کا فیض تھا جو کالج میں ہمیں ملی۔ تربیت سے شخصیت بنتی ہے قدروں کو ایک رخ ملتا ہے ذہنی اور جذباتی رویے مستحکم ہوتے ہیں۔ لائف سٹائل بنتا ہے۔ کام کرنے اور کام لینے کے طریقوں کا شعور ہوتا ہے۔

اس تربیت کا سرچشمہ بڑی حد تک خود کرنل رفیق کی ذات تھی۔ ان کی سخت کوشی، بااصولی اور ضبط کی عادت میرے کیریئر میں ہر مرحلے پر میرے لیے انسپریشن کا ذریعہ رہی ہے عموماً بچپن کا ہیرو بچپن کے ساتھ ہی پیچھے رہ جاتا ہے نوجوانی کا ہیرو نوجوانی کے شام و سحر کا طلسم ٹوٹتے ہی ذہن سے رخصت ہو جاتا ہے لیکن رفیق صاحب وہ ہیرو ہیں جن کی قدر و منزلت کا احساس زندگی کے گہرے تجربے کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔

——— لیفٹیننٹ جنرل آر ڈی بھٹی

سی ایس ڈی سے کالج کو کچھ فارن کلاتھ الاٹ ہوا جس میں ایک بہت اچھا گرم سوٹ پیس بھی تھا جس پر سارے سٹاف کی نظریں تھیں۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ چونکہ کپڑا بہت اچھا ہے اس لیے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں ایک ٹکڑا کوٹ کے لیے اور دوسرا پینٹ کے لیے تاکہ جب لاٹری پڑے تو ایک کے بجائے دو افسر اس سے استفادہ

[1] کالج نمبر ۱۸۵۶

کر سکیں۔ چنانچہ جب لاٹری ڈالی گئی تو اتفاق سے پینٹ کا پیس خود کرنل رفیق کے نام اور کوٹ کا ٹکڑا ایک دوسرے افسر (میجر ہاشمی) کے نام نکلا۔ میجر ہاشمی نے In good faith کہا سر! یا تو آپ میرا کوٹ پیس لے لیں یا پھر اپنا پینٹ پیس مجھے دے دیں۔ تاکہ ہم میں سے ایک کا سوٹ مکمل ہو جائے۔ انہوں نے جواب دیا۔ ہاشمی! پیشکش کا شکریہ لیکن میں یہ Bargain پسند نہیں کروں گا۔ مجھے جو پیس لاٹری میں ملا ہے بس اس میں کمی بیشی نہیں چاہتا۔

یہ واقعہ رفیق صاحب کی شخصیت کا آئینہ دار ہے افلاطون نے اپنی Republic کی بنیاد Justice کو بنایا ہے۔ اسلام کے سماجی اور معاشی نظام میں عدل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے حکومت ہو یا لیڈر شپ کی صورت ہو بغیر عدل کے نہ مستحکم ہوتی ہے اور نہ موثر۔ رفیق صاحب کی شخصیت اور تربیت میں Fair Play کو بنیادی حیثیت حاصل تھی صرف کہنے کی حد تک نہیں سو فیصد عملی صورت میں بھی۔ یہی وہ سب سے قیمتی چیز ہے جو انہوں نے ملٹری کالج کو دی۔ باہر کی ٹیموں سے سپورٹس کے مقابلے ہوں۔ بورڈ کے امتحانات ہوں یا کالج میں ڈسپلن کے کیس ہوں۔ وہ عدل کے تمام تقاضوں کو سونے کی تول پورا کرتے تھے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ جب ایک ڈسپلن کیس میں اس دور کے ایک بہت اونچے افسر کا بھانجا یا بھتیجا Involve ہوا تو انہوں نے قطعاً رعایت نہیں کی اور اپنی نوکری کو داؤ پر لگا کر انہوں نے تعزیری کارروائی مکمل کر کے چھوڑی (اسی طرح کے ایک کیس میں جب وہ لارنس کالج کے پرنسپل تھے انہوں نے حاکم وقت کی سفارش ٹھکرا دی تھی۔ اس کی تفصیل کردار ساز کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے) ان کی Moral integrity اور Credibility قطعاً Absolute تھی قائداعظم کی طرح وہ Un-purchaseable اور In-corruptable تھے۔ ان کی یہی وہ خصوصیت تھی جس سے شعوری طور پر اور لاشعوری طور پر ان کے تمام شاگردوں نے کچھ نہ کچھ اثر قبول کیا جس کے اثرات آج بھی ان کی نجی زندگی اور پروفیشنل لائف میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اگست ۵۲ء میں جس طرح پاکستان کے نام پر سینکڑوں پودے لگوا کر یوم آزادی منایا وہ اس بات کا اشارہ تھا۔کہ وہ تعلیم میں قومی Orientation کو کتنی اہمیت دیتے ہیں ۔ بعد کو ان کے دوسرے دور میں بھی پاکستانی قومیت (Pakistani Nationalism) کا یہ رنگ اور گہرا ہوتا گیا۔

۶۔دسمبر ۱۹۵۵ء کے کالج کے ویکلی میگزین نیوز اینڈ ویوز کی جو کاپی میرے پاس محفوظ ہے۔اس کے پورے سرورق پر ہمارا عہد (Our pledge) کے عنوان سے جو چار سطریں درج ہیں وہ یہ ہیں:

Land of our Birth, our faith and pride
For whose dear sake our fathers died
Oh, Mother land, we pledge to thee,
Head, heart and hand through the years to be

یہ عہد، اس امتیازی شان سے نیوز اینڈ ویوز کے سرورق پر چار سال تک جب تک رفیق صاحب کالج میں رہے فلیش (Flash) ہوتا رہا۔اس کا طلبا پر جو اثر ہوا ہوگا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔پاکستانیت کے جذبے کو پروان چڑھانے کو ان کی ترجیحات میں اولیت حاصل تھی۔کالج کے اکیڈیمک بلاک کی بیرونی دیواروں پر قائداعظم کے اقوال انہوں نے لکھوائے تھے جن پر آتے جاتے نظر پڑتی رہتی تھی۔

There is nothing greater in this world than your own conscience and when you appear before your God you can say that you did your duty with the highest sense of integrity and with loyalty and faithfullness.

جونیئر بلاک کی دیوار پر جنرل چیٹ وڈ کی یہ ولولہ انگیز کوٹیشن لکھی تھی:

The safety, honour and welfare of your country come first always and every time. The honour, welfare and comfort of the men you command come next. Your own ease, comfort and safety come last and every time.

جو جس طرح میرے دل میں اتر گئی ہے اس طرح دوسروں کے دلوں اور ذہنوں میں محفوظ ہو گی۔ یہ لاشعوری اثرات بہت دور رس نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔

یہ جو پاکستانیت آج عالمگیر بیز کی پہچان ہے یہ وجہ نہیں یہ بڑی حد تک اس تربیت کا نتیجہ ہے جس کا اہتمام رفیق صاحب نے کالج کی تاریخ کے ایک اہم موڑ پر بڑے مدبرانہ طریقے سے کیا تھا۔

—— لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد فرمان[1]

۱۹۵۲-۵۳ء میں بچپن میں ان کا جو تاثر ذہن نے قبول کیا تھا اب وہ مستحکم ہو گیا ہے اس وقت وہ ایک غیر معمولی انسان نظر آتے تھے۔ گفتگو میں، پابندی وقت میں، لباس میں اپنے کام کرنے کے انداز میں وہ ہمیں ایک ہیرو نظر آتے تھے۔ ہر عمر میں اور لڑکپن و نوجوانی میں خاص طور سے انسان کو ہیروز کی تلاش ہوتی ہے جن کے حوالے سے وہ اپنی شخصیت کی راہ تلاش کر سکے وہ ایک ایسے ہیرو تھے۔ میرا خیال ہے کہ ملٹری کالج میں اور پھر لارنس کالج میں انہوں نے سینکڑوں طلبہ کو متاثر کیا۔ ان کے حوالے سے بے شمار نوجوانوں نے زندگی کی بنیادی قدروں اور رویّوں کا شعور حاصل کیا اور ان کی طرح زندگی گزارنے کی شعوری و لاشعوری کوشش کی یہ معمولی بات نہیں، ایک ہیرو کا یہی کام ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ جہاں بھی گئے، گہرا نقش چھوڑ آئے۔

ان کا چلنے کا انداز ہی تیر کی طرح سیدھا نہیں تھا، برتاؤ کا طریقہ بھی سیدھا تھا کوئی لاڈلا نہیں تھا۔ ذاتی پسند ناپسند کا معاملہ نہیں تھا۔ اور پھر کالج میں انقلابی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ ایک نیا کالج جنم لے رہا تھا۔

—— بریگیڈیئر سلطان جہانگیر[2]

۱۹۵۶ء کے اوائل میں انہوں نے آرمی کلاس کے سینئر کیڈٹس کو سٹاف کے ساتھ ٹینس کھیلنے کی اجازت دی۔ مجھے یاد ہے کہ اس گروپ میں میرے علاوہ ۱۸۶۲ ارحمدل، ۱۸۸۸ رؤف اور ۱۸۷۱ سجاد حیدر بھی تھے۔ شروع شروع میں تو ہم سٹاف کے ساتھ کھیلتے

---

[1] کالج نمبر ۱۸۸۶، حال سفیر پاکستان برما [2] کالج نمبر ۱۸۷۰ء

ہوئے جھجکتے تھے کچھ دنوں کے بعد کھل گئے تھے، اقبال صاحب، بلگرامی صاحب، مولوی محمد حسن صاحب جیسے بزرگ استادوں اور خود کمانڈانٹ کرنل رفیق کے ساتھ بے تکلفی سے کھیلتے تھے سروس کرنے وقت جملے بھی ہوتے رہتے تھے۔ رفیق صاحب میں اسپورٹس مین سپرٹ بھی بہت تھی۔ ٹینس کورٹ پر وہ بہت لائٹ موڈ میں ہوتے تھے۔ ہار کر یا سروس کھو کر میں نے انہیں جھنجلاتے نہیں دیکھا کبھی کبھی کھیل کے دوران کولڈ ڈرنکس بھی چلتے تھے ہر بار سٹاف یا کمانڈنٹ کو زیر بار کرنا ہمیں اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے ہماری کوشش ہوتی کہ کھیل ختم ہوتے ہی ہم کورٹ چھوڑ دیں ایک روز ہم کھیل کے بعد اپنی جرسیاں اٹھا کر چلنے ہی والے تھے کہ وہ ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے تم لوگ اپنے کولڈ ڈرنکس کے لیے آفیسرز میس کو چٹ کیوں نہیں لکھتے؟

ان کے اس سادے سے ایک جملے نے ہماری دنیا بدل دی۔ دوسروں کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میری زندگی میں یہ جملہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کولڈ ڈرنک کے لیے پہلی چٹ لکھنے کی خوشی میں کبھی نہیں بھول سکتا اس سے جو اعتماد اور جو احساس ذمہ داری پیدا ہوا اس نے زندگی کے آئندہ مرحلوں کو پانی دیا۔

آج جب میں اس جملہ کو یاد کرتا ہوں اور اس کا تجزیہ کرتا ہوں تو بے اختیار ان کی قیادتی عظمتوں کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے اکثر ان کی سختی کا تذکرہ ہوتا ہے لیکن یہ سختی بہت سوچی سمجھی سختی تھی اور اس کے پیچھے ایک مفکر اور ماہر فن قیادت کا ذہن تھا ان کی شخصی اور قیادتی صلاحیتیں اس پایہ کی تھیں کہ ان سے قومی سطح یا کم ازکم فوجی سطح پر کوئی بہت بڑا کام لینا چاہیے تھا۔ ایسے جینئس روز روز پیدا نہیں ہوتے مجھے یقین ہے کہ ان کی سیرت و کردار پر یہ کتاب قیادت کے نصاب میں جگہ پائے گی اور اس سے اس میدان کے نوواردوں اور پختہ کاروں کو بڑی روشنی ملے گی۔

——— کموڈور سید سجاد حیدر[1]

یہ واقعہ نومبر ۱۹۵۵ء کے اوائل کا ہے۔ نیوی میں کمیشن کے لیے میں آئی ایس ایس بی پاس

---

[1] کالج نمبر ۱۸۷۱۔

کر چکا تھا اور غالباً میڈیکل وغیرہ کے سلسلے میں کالج ہی میں تھا۔ ان ہی دنوں میرے والد صاحب کی آنکھوں کا آپریشن ٹیکسلا ہسپتال میں ہوا تھا۔ میں اس وجہ سے کچھ پریشان سا تھا۔ میں نے کرنل صاحب سے چھٹی کے لیے کہا تو فرمایا۔

" جاؤ ابھی جاؤ! تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اب جب تک ان کی آنکھیں ٹھیک نہ ہو جائیں تم ان کے پاس ہی ٹھہرو۔"

ان حالات میں چھٹی دینے سے تو شاید کوئی بھی انکار نہ کرتا لیکن انہوں نے جس انداز سے، جس خلوص سے اور جس شفقت سے مجھے چھٹی دی اور اصرار کر کے فوراً بھجوایا۔ اس کا نقش میرے دل پر تا زیست رہے گا۔

اسی طرح ۷۸۰ رقیب کی حادثاتی موت پر ان کا جو جذباتی رویہ تھا اس کا نقش بھی میرے دل پر ثبت ہے۔ ہاکی کھیلتے ہوئے رقیب کے سر میں چوٹ آگئی تھی یہ چوٹ مہلک ثابت ہوئی۔ یہ واقعہ ان کے پہلے دور ۵۳-۱۹۵۲ء کا ہے۔ اس دور میں وہ بڑے جلال میں تھے رقیب کی موت کے سانحہ پر ہم نے دیکھا یہ شخص جو سنگ خارا نظر آتا ہے۔ بے حد جذباتی بھی ہے سی ایم ایچ جہلم میں وہ تمام رات رقیب کے پاس بیٹھے رہے اس کی موت پر آنسوؤں سے روئے۔ وار میموریل (یادگار شہداء) پر اس کی نماز جنازہ بڑے اہتمام سے کرائی اور پورے اعزاز سے اس کے تابوت کو رخصت کیا۔ یہ سب کام کوئی بھی سی او ہوتا کرتا۔ لیکن میں بات اس جذبے (فیلنگ) کی کر رہا ہوں جس کے ساتھ انہوں نے ان رسوم کو انجام دیا وہ سو فیصد پُر خلوص تھے۔ سچے اور کھرے تھے۔ بچوں کا دل صاف ہوتا ہے ان کی نظر الفاظ پر نہیں دل پر جاتی ہے ان کے پہلے دور میں، میں بہت جونیئر تھا۔ اس وقت بھی مجھے اور سب کو یقین تھا کہ نیا کمانڈنٹ خواہ سخت ہو لیکن بالکل کھرا اور سچا ہے — رفیق صاحب کی Credi-bility ہمیشہ ہر دور میں بہت اونچی رہی۔

اقبال نے اپنے مثالی انسان میں، قہاری و غفاری اور قدوسی و جبروت، ان چار عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ کرنل رفیق کے اندر یہ دو متضاد صفات غفاری و قہاری بیک وقت بہت صحیح تناسب کے ساتھ موجود تھیں۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ اچھے ہمدرد، شفیق لوگ

کمزور ہوتے ہیں، وقت آنے پر دب جاتے ہیں۔ ان کی قوت فیصلہ کمزور ہوتی ہے۔ وہ اہم سے اہم اصولی معاملے میں بھی مفاہمت کی راہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ ان میں انصاف کے لیے ٹکرانے اور برائی یا ظلم سے مقابلہ کرنے کی ہمت اور اس کو زیر کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ مختصر یہ کہ یہ لوگ ذاتی طور پر اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن قیادت ان کے بس کی چیز نہیں ہوتی وہ احساس تحفظ نہیں دے سکتے اس کے برخلاف جو لوگ موثر، فعال اور قائدانہ صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ عموماً بے اصولے ہوتے ہیں۔ حقیقی ہمدردی اور گہری شفقت سے عاری، لوگ ان سے ڈر سکتے ہیں ان کی عزت نہیں کر سکتے۔ لیکن کرنل رفیق میں شفقت کے ساتھ صلابت اور جرأت تھی۔ وہ جرأت سے مشکل فیصلے کر سکتے تھے اور ان پر اڑنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے روایتی معنوں میں تو شاید نہیں لیکن عملی طور پر کرنل رفیق میں مومن کی بہت سی صفات موجود تھیں۔ گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

ان کو دیکھ کر اور ان کے رویے اور کردار سے کم از کم مجھے اندازہ ہوا کہ کردار کسے کہتے ہیں، دیانت کیا ہے — قیادت کے اوصاف کیا ہوتے ہیں۔ ان کے حوالے سے مجھے بہت سی انسانی اور مذہبی قدروں کا ادراک ہوا۔

وہ لوگ جو کالج میں جولائی ۷۵ء میں موجود تھے، انہیں یاد ہوگا کہ کرنل رفیق نے چارج لیتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ ہر لڑکے سے فرداً فرداً انٹرویو لیا تھا۔ مجھے یاد ہے کمانڈنٹ کے بنگلے میں باری باری پانچ پانچ لڑکے جاتے تھے ڈرائینگ روم میں ایک قرآن شریف رکھا تھا۔ اس پر ہاتھ رکھ کر بات شروع کرتے تھے اور جس کے دل میں جو بات ہوتی تھی جو پرابلم ہوتی تھی جو خوف ہوتا تھا یا کوئی تجویز ہوتی تھی وہ بے دھڑک بیان کرتا تھا۔ یہ ان کا ایک انقلابی اقدام تھا میرا خیال ہے کہ ان سے پہلے اور غالباً ان کے بعد بھی کسی نے ہر لڑکے سے اتنا تفصیلی انٹرویو نہ لیا ہوگا۔ یہ شاید پہلا اور غالباً آخری موقع تھا جب ہر لڑکے کو برابر کی اہمیت دی گئی اور ہر لڑکے کو خواہ وہ لائق ہو یا نالائق، ذہین یا غبی، تیز طرار ہو یا شرمیلا اسے موقع دیا گیا کہ کمانڈنٹ سے براہِ راست گفتگو کرے۔ اس ہمہ گیر انٹرویو سے جہاں انہیں کالج کی اندرونی صورتحال ڈسپلن کی کیفیت کا علم ہوا ہوگا وہاں جونیئرز کو اس کا سب

سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں احساس تحفظ ملا، ہمیں احساس ہوا کہ ہمارے سرپرستی لئے ہوئے ان کے دفتر کے آگے سجیشن باکس لگا ہوا تھا۔ انٹرویو کے بعد کوئی چھوٹی موٹی بات ہوتی تو ہم لکھ کر ڈال دیتے۔ ورنہ کسی بڑے مسئلہ کی صورت میں براہِ راست ان سے بات کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن وہ چونکہ ہر موقعہ پر ہر جگہ خود موجود ہوتے تھے۔ اس لیے کالج میں کم ہی کوئی ایسی بات ہوتی جس کا انہیں علم نہ ہوتا۔

۱۹۵۲ء کے یوم استقلال ۱۴ اگست کو انہوں نے انوکھے انداز سے منایا۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۴ اگست کی صبح کو سارا کالج گیٹ سے باہر سڑک پار کھیلوں کی گراؤنڈ میں جمع ہوا تھا۔ وہاں ہر لڑکے نے اپنے حصے کا پودا لگایا۔ استادوں نے باڑھ کے بیج ڈالے۔ پھر ہر لڑکا صبح سویرے پی ٹی کے وقت ایک لوٹا پانی اپنے پودے کو دیتا تھا۔ برس ہا برس کے بعد جب میں ادھر سے گزرا تو وہ پودے اونچے پیڑ بن چکے تھے۔ اب بھی جب کبھی ریل پر یا کار پر ادھر سے گزرتا ہوں تو جھانک کر ان بلند و بالا پیڑوں کو دیکھ لیتا ہوں جو ایک شخص کی پاکستان سے محبت اور اس کے فلسفہ تربیت کی علامت ہیں۔ اگر قومی دنوں کو اس طرح تعمیری طریقے سے منانے کی روایت ملک میں رواج پا جائے تو بہت سے مسائل حل ہو جائیں اور ایسا تعمیری قومی رویہ پیدا ہو جائے جس کی ہمیں بحیثیت قوم سب سے زیادہ ضرورت ہے اگر قومی اور مذہبی تہواروں پر کسی منصوبے کے تحت رضا کارانہ طور پر کچھ نہ کچھ Donate کیا جائے خدمت کی شکل میں، اشیاء کی شکل میں اور نئے فلاحی اداروں کی شکل میں تو قوم کی تقدیر بدل جائے۔

پہلے ریجمنٹل سسٹم تھا۔ اس کی بنیاد اتھارٹی کے جبر پر تھی۔ اس جبر کی جگہ عزتِ نفس کے شعور اور جذبے نے آنر سسٹم کی شکل میں لی۔ آنر سسٹم پورے طور پر کامیاب نہیں ہوا۔ دنیا میں کوئی سسٹم بھی پورے طور پر کامیاب نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا اثر ضرور ہوتا ہے آنر سسٹم کا اثر بہت گہرا ہوا۔

کریکٹر بلڈنگ کا نام تو بہت لیا جاتا ہے لیکن صحیح قسم کی کریکٹر بلڈنگ مربوط اور منظم طریقے سے، ایک منصوبے اور نصاب کے مطابق کی تو کرنل رفیق ہی نے کی۔ اور اس قسم

کی اخلاقی تحریک کو موثر بنانے کے لیے جس قسم کی محرک Dynamic شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ تب و تاب بھی ان کی شخصیت میں تھی۔

وطن کی محبت اور وطن سے تعلق پر بھی انھوں نے زور دیا۔ ۱۴ اگست پر شجر کاری کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ قائداعظم کے فرمودات انھوں نے کالج کے کلاس رومز کی بیرونی دیواروں پر جلی حروف میں لکھوائے۔

اب میں ان چھوٹی چھوٹی انتظامی باتوں کا ذکر کروں گا جن سے ہم طلبہ کی زندگی پر خوشگوار اثر پڑا۔ مثلاً کیڈٹس میسز کا کھانا بہت بہتر ہو گیا۔ چاروں ہاؤسوں کا دوپہر کا کھانا ہر روز وہ خود چیک کرتے تھے۔ کھانے کا رجسٹر تھا ہر روز اس پر نمبر دیئے جاتے تھے جس ہاؤس کے نمبر زیادہ ہوتے اسے انعام سے نوازا جاتا۔ شام کا کھانا سٹاف کے علاوہ خود دیکھتے تھے باورچی خانوں کی صفائی پر خصوصی توجہ تھی۔

جب اکتوبر ۱۹۵۵ء میں دوسری بار وہ یہاں آئے تو انھوں نے سکاؤٹنگ کو بہت اہمیت دی۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے ڈنر نائٹ کا اہتمام کیا۔ پورے تکلفات کے ساتھ ہر ہاؤس کی ٹائی علیحدہ تھی۔ کھانے کے بعد ہر ہاؤس میں ورائٹی پروگرام ہوتا تھا۔

ان کے دوسرے ٹرم میں مجھے زیادہ رہنے کا موقع نہیں ملا۔ میں نیوی کے کمیشن میں پہلی بار میڈیکل میں فیل ہو گیا تھا۔ اس کی اپیل وغیرہ کرنی تھی جب انہیں معلوم ہوا کہ میری یہ پرابلم ہے حالانکہ وہ ان دنوں نئے نئے آئے تھے اور بے انتہا مصروف تھے اس کے باوجود انھوں نے نیول ہیڈ کوارٹرز کراچی سے بار بار رابطہ قائم کیا بہت تگ و دو کے بعد میرا کام کرایا۔

نیوی میں کمیشن کے بعد میں تربیت کے لیے انگلستان چلا گیا پھر عرصے تک باہر رہا۔ اس عرصے میں کبھی کبھار ان سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ وہ نیوی میں میری ترقی کی رفتار سے بہت خوش تھے۔ ۱۹۷۵ء میں جب میں گھوڑا گلی کالج میں کمانڈر نیوی کی حیثیت سے تعارفی لیکچر دینے گیا تو ان سے ملاقات ہوئی۔ گلے لگایا تو وہ خوشی سے پھٹ پڑے۔ میری وی آئی پی کی طرح پذیرائی کی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ انہیں میری

ترقی سے قلبی خوشی ہوتی ہے۔ اپنے فخر اور خوشی کا اظہار انہوں نے میرے تعارف میں بھی کیا۔

میرا خیال نہیں یقین ہے کہ ملٹری کالج کے ہر اولڈ ملدائے سے ان کا رویہ یہی تھا عام حالات میں شاید باپ بھی بیٹے سے مل کر اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا وہ اولڈ بوائز سے مل کر خوش ہوتے تھے ملٹری کالج ان کی کمزوری بن گیا تھا۔ جب بھی ملاقات ہوتی ملٹری کالج ضرور موضوع ہوتا۔ اور اپنے کاموں کو کم کر کے اور اپنے سٹاف کے کاموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا ان کی عادت تھی۔

—— بریگیڈیئر عبدالرؤف[1]

اصلاح کے تین مرحلے ہوتے ہیں۔ پہلا صورت حال کا جائزہ لینے کا۔ دوسرا اصلاحی اقدامات کی منصوبہ بندی کا اور تیسرا ان کی تعمیل کا۔ یہ تیسرا مرحلہ سب سے مشکل ہوتا ہے زندگی کا کوئی شعبہ ہو اس میں اصلاح کار عموماً یہیں مار کھاتا ہے اور اسی مرحلہ میں ناکام ہوتا ہے۔ ملٹری کالج میں اصلاح احوال کے لیے رفیق صاحب نے جو اقدامات کیے ان میں حیرت انگیز کامیابی کا راز یہ تھا کہ اس تیسرے مرحلے پر انکی مکمل گرفت تھی کوئی اصلاحی قدم ہو۔ کوئی حکم ہو وہ اس کی تکمیل پر پوری توجہ دیتے تھے۔ کام چوری یا حکم عدولی کی گنجائش ہی نہیں چھوڑتے تھے کام کروانے کے معاملہ میں وہ بلامبالغہ "جن" تھے اب اتنی سی بات کہ کوئی سینئر لڑکا حجام سے صبح سوتے میں شیو نہ کرائے اس کی چیکنگ بھی ہوتی تھی۔ وہ چانس پر کچھ نہیں چھوڑتے تھے۔

ہم سینئر کیڈٹس کو اپنے استادوں کی حالت دیکھ کر رحم آتا تھا۔ لمبی لمبی میٹنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ہر وقت ہر جگہ کوئی نہ کوئی موجود ہوتا تھا۔ ہر طرف ایمرجنسی کا سماں نظر آتا تھا اب وہ شب و روز یاد کرتا ہوں تو رفیق صاحب اور دوسرے اساتذہ کی قدر دل میں دو چند ہو جاتی ہے۔ انہیں کام کرنے کا جنون تھا۔ ان کا خلوص چھلک چھلک جاتا تھا۔

بہت سخت گیر تھے لیکن ویلفیئر خصوصاً ملازموں کے ویلفیئر کا اہتمام بھی کرتے تھے، وقت کی پابندی ہو، لباس کی نفاست یا ادب و آداب کی شائستگی جس عمل کی توقع

---

[1] کالج نمبر ۱۸۸۸

وہ ہم سے کرتے تھے وہ پہلے خود کرتے تھے۔ کہنے کو تو یہ بات بہت آسان نظر آتی ہے لیکن ایسا کرنا مشکل ترین کام ہے انہوں نے اس مشکل کو آسان کیا ہوا تھا۔

——— بریگیڈئر محمد ایوب ملک[1]

یہ قصہ شنیشن محل (آکلنلک ہاؤس) کا ہے۔ ہم سینئر لڑکے صبح سویرے سویرے سوتے حجام سے شیو بنوا لیا کرتے تھے۔ جب کرنل رفیق کے علم میں یہ بات آئی تو حکم ہوا کہ لڑکے خود شیو کیا کریں۔ ان کے حکم دینے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس کی تعمیل کی چیکنگ بھی ضرور کریں گے۔ میں آکنلک ہاؤس کا پریفیکٹ بھی تھا۔ وہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے خواہ مخواہ رسک لینے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ میں نے جانتے بوجھتے چانس لیا اور منظور باربر کو (جو پانچ روپے کے عوض یہ خدمت انجام دیا کرتا تھا) ساڑھے چار بجے صبح کا وقت دے دیا۔ جو معمول کے وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے تھا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ مجھے خیال آیا اس وقت کون بستر سے نکلتا ہے۔ بہر حال دوسرے روز ساڑھے چار بجے جب منظور نے شیو کرنا شروع کیا تو کرنل رفیق دروازے پر نمودار ہوئے ایک نظر دیکھا اور آگے بڑھ گئے منظور کے تو ہوش اڑ گئے۔ اس نے مجھے جھنجھوڑ کے اٹھایا۔ "ملک صاحب اٹھو۔ ملک صاحب اٹھو" میں انگڑائی لے کے اٹھا۔ کیا ملک صاحب ملک صاحب کا شور مچا رکھا ہے کیا بات ہے۔" کرنل رفیق صاحب ابھی ابھی چیک کر کے گئے ہیں۔" اس نے تقریباً کانپتے ہوئے کہا۔

میں نے پوچھا کچھ کہا تو نہیں۔ وہ بولا نہیں۔ تو میں نے بڑی شان بے نیازی سے کہا تم فکر نہ کرو۔ میں ہاؤس پریفیکٹ ہوں تمہارے الاؤنس میں ایک روپے کا اضافہ کل سے تم ساڑھے تین بجے آنا۔" چنانچہ دوسرے روز منظور نے ساڑھے تین بجے رات کے اپنی کارروائی شروع کی۔ ابھی وہ شیو کے لیے صابن ہی لگا رہا تھا کہ اوپر سے رفیق صاحب نازل ہو گئے چھڑی ان کے ہاتھ میں تھی۔ پھر وہ جو شروع ہوئے تو پھر کوئی حدوحساب ہی نہیں۔ یہاں تک کہ چھڑی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی خود مجھے حیرت ہے کہ میں نے اس پٹائی کو برداشت کیسے کیا۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو مار سے بچا ہو۔

---

[1] کالج رول نمبر ۱۹۱۲۔

اس داستان کا اگلا حصہ یہ ہے کہ جب کمیشن ملنے کا وقت آیا تو محض کرنل رفیق کی وجہ سے پنجاب رجمنٹ لی تاکہ شاید کبھی ان کے نیچے سروکرنے کا موقعہ مل جائے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل عطا محمد

میں اگست ۱۹۵۰ء میں کالج میں دس گیارہ برس کی عمر میں پانچویں درجے میں داخل ہوا تھا۔ اور ۱۹۶۰ء میں ایف اے کر کے کالج کو خیر باد کہا۔ میں نے کرنل رفیق کے دونوں دور دیکھے اور دوسروں کے دور بھی۔ اب جو تاثرات و واقعات میں بیان کرنے جا رہا ہوں۔ ان کی اہمیت ان کا پس منظر بیان کیے بغیر واضح نہیں ہوگی اس لیے میں پہلے ان حالات سے شروع کرتا ہوں جن سے میں، کالج میں اپنے داخلے کے وقت دو چار ہوا تھا۔

ریجمنٹل سسٹم نوآبادیاتی دور کی ضرورت تھا اس کی کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہوں گی۔ لیکن اس کی جس صورت سے اپنے کالج میں داخلے کے وقت دوچار ہوا وہ خاصی بھیانک تھی۔ دس گیارہ سال کے معصوم بچے سینئرز کے رحم وکرم پر تھے۔ جاڑوں میں بھی صبح بہت سویرے چار ساڑھے چار بجے بستر سے کھینچ کے اٹھایا جاتا۔ پھر جھاڑو سے سیکشن کا فرش صاف کرایا جاتا۔ تیل سے فرنیچر چمکایا جاتا۔ سینئر سیکشن کمانڈر کی چپلیں صاف کرنا اور ان پر پالش کرنا بھی فرائض میں شامل تھا۔ دراصل جونیئرز کی حیثیت سینئرز کے اردلیوں کی سی تھی۔ پلاٹون کمانڈرز کمپنی کمانڈرز، جو کیڈٹ آفیسر کہلاتے تھے اور ہاتھ میں بید رکھتے تھے۔ ان کو "فیگ بوائے" یا اردلی رکھنے کی باقاعدہ اجازت تھی۔ لڑکوں کو کوارٹر ماسٹر سٹورز سے کھرپے بھی "کٹ اینٹو" میں مہیا کیے جاتے تھے۔ چھٹیوں کے بعد کالج کی گھاس کی کٹائی کا شرف بھی کیڈٹس ہی کو ملتا تھا۔ سینئرز اچھی خاصی مارکٹائی کرتے تھے اور اگر ہاتھ سے یا بید سے نہ مارتے تو ایسی ذلت آمیز سزائیں دیتے جیسے جاؤ ڈے لیٹرین کا فرش صاف کرو (یہ ڈے لیٹرین بر ڈووڈ ہاؤس اور سکین کے درمیان تھے اس جگہ جہاں اب بس کا گیراج ہے بجائے عزت نفس کے ذلت نفس کا ہر سامان تھا۔ چھوٹے لڑکے اکثر روتے رہتے اور ماں باپ کو کوستے رہتے کہ ہم نے کیا قصور کیا ہے کہ ہمیں اس گہرے اور اندھے کنوئیں میں

کالج رولیمبر ۱۹۲۱ء۔

پھینک دیا ہے خود میں کبھی کبھی سوچتا تھا کہ آیا واقعی میں اپنے والدین کا حقیقی بیٹا ہوں یا مجھے انہوں نے کسی سڑک پر سے اٹھایا تھا کیا! نہیں خبر نہیں کہ میں یہاں کس جہنم سے دوچار ہو رہا ہوں؟ اس ماحول میں شفقت نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سکون نہیں تھا جو زندگی کی پہلی ضرورت ہے۔ ہر وقت ایک دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کس وقت کوئی سینئر کٹ لگا دے۔

اس سسٹم میں پل کر اور یہ سارے دکھ اٹھا کر جواب خود سینئر ہو گئے تھے انکی ایک عجیب ذہنیت بن گئی تھی۔ وہ ڈسپلن کے بہانے اور سخت کوش بنانے کی آڑ میں ہر قسم کے ظلم کو روا رکھتے اور ہم جونیئرز کی بے بسی پر ہنستے تھے۔ ہمارے آنسوؤں کا مذاق اڑاتے تھے اور کہا کرتے تھے۔

"بچو! یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ہم نے تو بہت کچھ بھگتا ہے" گویا وہ پچھلا حساب بھی ہم سے چکاتے تھے۔ وہ بھی سود در سود کالج میں زیادہ زور پی ٹی پریڈ لاکر بنانے، ڈرلیں اور کٹ انسپکشن کرانے پر تھا۔ کچھ غیر نصابی سرگرمیاں بھی تھیں۔ لیکن ان کا دائرہ فیض بھی تھوڑے سے خاص قسم کے لڑکوں تک محدود تھا۔

اس زمانے کی ایک اور ڈرل کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں آجکل یادگار شہداء ہے۔ یہاں پہلے فلیگ سٹاف پہلی جنگ عظیم کا وار میموریل تھا جس کی گول سیڑھیوں کے وسط میں کوئی سو فٹ کے قریب اونچا فلیگ سٹاف تھا۔ اس میموریل کو صاف رکھنے اور جھنڈا چڑھانے اتارنے کے لیے ہر ہفتہ ایک کمپنی (ایک ہاؤس) ڈیوٹی پر ہوتی تھی۔ پھر اس کمپنی کی بھی ایک پلاٹون تین دن پر ہوتی۔ باقی تین دن دوسری پلاٹون، پھر ہر پلاٹون کے تینوں سیکشن ایک ایک دن ڈیوٹی کرتے اس طرح مہینے میں ایک بار ہر سیکشن کو یہ ڈیوٹی کرنا پڑتی تھی۔ سنگ مرمر کے ہر ٹکڑے کو رگڑ رگڑ کر چمکانا پڑتا تھا سنگ مرمر کے چبوترہ پر ان رجمنٹوں کے نام لکھے ہوئے تھے جنہوں نے جنگ عظیم اوّل میں حصہ لیا تھا اور اس کالج کے لیے چندہ دیا تھا۔ اور اس پر لکھا تھا **Lest we forget** یعنی ایسا نہ ہو کہ ہم بھول جائیں۔ جنگ عظیم کے ان مقتولوں کی یادگار کی دیکھ بھال ہمارے

ذمے تھی۔کبھی فلیگ پول پر یونین جیک لہراتا تھا جس کو صبح شام سلامی دی جاتی تھی لیکن یہ اگست ۴۷ء سے پہلے کی بات ہے۔

ہوسکتا ہے کہ کسی کو ان حالات کی اس تصویر میں زیادہ سیاہی نظر آئے لیکن میں نے پوری سچائی سے کم از کم اپنے احساسات کو بیان کر دیا ہے، میرا خیال ہے کہ دوسرے جونیئرز کے بھی کم و بیش یہی احساسات ہوں گے۔

ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ مسٹر شمسی، مسٹر ضمیر صدیقی، مسٹر اقبال، مسٹر ایوب، مسٹر مظہر، مسٹر حیدری، مسٹر راشد، مسٹر ماجد صدیقی، مسٹر بلگرامی جیسے لائق اور فائق اساتذہ کالج میں آچکے تھے اور تعلیم کا معیار بلند ہو رہا تھا لیکن جب لڑکا کلاس سے باہر رجمنٹل سسٹم کی وجہ سے اتنی ذہنی اور نفسیاتی بے چینیوں کا شکار ہو تو پڑھنا اس نے خاک ہے۔

مختصر یہ کہ ان حالات میں، اس پس منظر میں کرنل رفیق نے جولائی ۱۹۵۲ء میں پہلی مرتبہ کالج کی پرنسپلی سنبھالی۔ اصل میں رجمنٹل سسٹم کی ایک تعلیمی ادارہ میں کوئی جگہ نہیں تھی ادارہ بھی وہ جس کا مقصد ایک آزاد اسلامی مملکت کے لیے باحوصلہ اور باتدبیر افسر پیدا کرنا ہو۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ کرنل رفیق کی سفارش پر یا از خود اس وقت کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان نے اسی سال کالج کے سالانہ تقسیم انعامات کے موقع پر کالج کو نئے سرے سے پبلک سکول سسٹم پر منظم کرنے کا حکم دیا۔ لیکن ان کے حکم دینے سے پہلے ہی کرنل رفیق نے پرانے سسٹم کو سیدھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ سینئرز سے باز پرس شروع کر دی تھی۔ ان کے اختیارات کو لگام ڈالنی شروع کر دی تھی فضول قسم کے ہر وقت کے انسپکشن ختم کر دیئے تھے۔

ان کے آنے سے کالج ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ اگرچہ وہ سسٹم فوری طور پر بدلا نہیں لیکن ان کی اپنی کوششوں سے اس کا ڈنک نکل گیا اور ہم جونیئرز نے سکھ کا سانس لیا۔ اگرچہ جسمانی مشقت کا ٹیمپو کم نہیں ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ اگست ۱۹۵۲ء میں کرنل رفیق نے گیٹ سے باہر باڑھ اور پودے لگوائے تھے ان کو صبح سویرے لوٹا لے کر پانی ڈالنے جانا پڑتا تھا۔

اس زمانے کی ایک اور بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سینیئرز کا ظلم ہم پر تو کم ہو گیا تھا لیکن خود ان کی پبلک کیننگ کا نظارہ اکثر دیکھنے میں آتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان ڈسپلن کی بہت سخت سزا دیتے تھے اور سینیئرز جونیئرز کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے ان کے اس دور میں سلامتی کا احساس پیدا ہوا اور ترازو کے پلڑے برابر ہونے لگے اور جن محرومیوں اور زیادتیوں کا زیادہ تر جونیئرز شکار تھے ان کا بھی بڑی حد تک ازالہ ہو گیا۔

کرنل رفیق کا یہ دور زیادہ تر شاک ٹریٹ منٹ کا دور تھا جو بہت جلد ارباب اقتدار کی مصلحتوں کی نذر ہو گیا۔ اپریل ۱۹۵۳ء میں یکایک ان کا تبادلہ ہو گیا اور وہ کام ادھورا رہ گیا جو انہوں نے نو مہینے پہلے شروع کیا تھا ان کے جانے کے بعد پھر دو سال کالج پر بڑے سخت گزرے ۱۸ جنوری ۱۹۵۴ء کو کالج ہال میں نئے کمانڈنٹ کرنل سلطان سکندر نے اعلان کیا کہ آج سے پرانا ختم نظام۔ اس وقت سے کالج ایک پبلک سکول ہے۔ ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام کھڑا کرنا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ ترکمنٹل سسٹم اچھا برا جیسا بھی سہی ایک فریم ورک تو تھا۔ ڈسپلن کو قائم رکھنے کا ایک طریق کار تو تھا۔ اس کے ہٹنے پر ایک خلا پیدا ہو گیا۔ پھر لارنس کالج سے کرنل ایڈورڈز آئے ان کو پبلک سکول کا تجربہ تھا۔ خیال تھا کہ وہ کالج کو پبلک سکول کے طور پر منظم کر سکیں گے۔ ان پر تبصرہ کرنا میرا منصب نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ بات بنی نہیں اور ڈسپلن اس حد تک خراب ہو گیا تھا کہ عزت کیا جان تک محفوظ نہ رہی۔ لڑکے چاقو چھریوں سے لڑنے لگے۔ رات کو وہ اودھم مچتا کہ حد نہیں آس پاس بھی ہنگامے ہونے لگے ملٹری کالج ایک ادارے کی حیثیت سے تباہی کے گڑھے میں گرنے لگا تھا کہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو کرنل رفیق دوبارہ کمانڈنٹ مقرر ہو کر آئے۔

ایک شکستہ اور بوسیدہ عمارت کو نئی بنیادوں پر اٹھانا کوئی آسان کام نہ تھا منجملہ اور رکاوٹوں کے فنانس کی رکاوٹیں بھی تھیں کرنل رفیق نے انتہا درجے کی کوشش کر کے ظاہر و باطن کی ہر چیز بدل دی۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۱ء کا سالانہ فنکشن بر ڈوڈ ہاؤس کے پیچھے کے میدان میں ہوا تھا۔ میجر جنرل شاہد حامد مہمان خصوصی تھے۔ اس موقع پر پہلی بار سب لڑکوں نے کالج ٹائی کے ساتھ ورسٹڈ کی پتلون پر کالج بلیزر پہنا۔ یہ بلیزر صرف ظاہر کی

نہیں باطن کی تبدیلی کا مظہر بھی تھا۔

آنر سسٹم جاری ہو چکا تھا۔ عزت نفس پر زور تھا۔ کردار سازی کی مہم جاری تھی۔ ہم نصابی سرگرمیوں کے ذریعہ شخصیت کی نشوونما کو اولیت دی جا رہی تھی۔ بی اے سپیشل کا امتحان ختم کر کے پنجاب یونیورسٹی کے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات کے لیے تیاری شروع ہو چکی تھی۔ کرنل رفیق بار بار کہا کرتے تھے کہ مجھے کتابی کیڑے نہیں چاہئیں مجھے متوازن شخصیت چاہیے۔

ایک غیر معمولی خصوصیت جو ان کے اندر تھی وہ یہ تھی کہ وہ اپنے زیر کمان ہر فرد کو اچھی طرح جانتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے کسی لڑکے کو اس کے نام سے نہ بلایا ہو۔ اور اس کے پورے کوائف کا انہیں علم نہ ہو۔ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ دلچسپی حافظے کی مدد کرتی ہے۔ یہ بھی غلط نہیں لیکن وہ اور طریقے بھی استعمال کرتے تھے جب میں کالج پریفیکٹ ہوا تو انہوں نے مجھے کہا۔

"تم اپنے کمرہ کے لیے پورے کالج کے لڑکوں کا چارٹ بناؤ۔" پھر انہوں نے اپنا چارٹ دکھایا، کہنے لگے "ہر روز دفتر میں اس چارٹ کو ضرور دیکھتا ہوں اور ہر ہاؤس کے لڑکوں کو پہچاننے کا میں باری باری اپنا ٹیسٹ لیتا ہوں۔ مثلاً بغیر نام نمبر دیکھے ہوئے میں چیک کرتا ہوں یہ کون ہے کس کلاس میں ہے۔ کہاں سے آیا ہے وغیرہ۔" پھر انہوں نے اپنی ڈائری دکھائی اس میں ہر ایک کے لیے صفحہ تھا اور مشاہدات کے اشارے تھے کہنے لگے۔ "مجھے چند مہینے اس کام میں مہارت حاصل کرنے میں لگے۔ انٹرویو کرنے سے بھی بہت مدد ملی۔"

ان کی جسمانی توانائی اور قوت برداشت کا ایک واقعہ سناتا ہوں ایک روز انہوں نے ہماری سیکنڈ ائر کلاس کو سوئمنگ پول میں چیلنج کر دیا کہ دیکھیں کون زیادہ لمبائیاں کرتا ہے آٹھ دس۔ پندرہ پھر طے کیا جو تھکتا جائے وہ باہر نکلتا جائے۔ ہم نوجوان لڑکوں نے بڑا زور مارا لیکن آخر میں وہی پول میں رہے مقصد اس مقابلے کا یہ تھا کہ ہم اپنی قوت برداشت کو بڑھائیں اسی طرح چھوٹے بچوں کے ساتھ پول میں کھیلتے تھے۔ آٹھ آٹھ دس انہیں قابو میں کر لیتے پھر وہ سب کو پانی میں غوطہ دیتے اس طرح کھیل کھیل میں بچوں

کا پانی کا ڈر نکل جانا۔

میں سمجھتا ہوں کہ کرنل رفیق کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے جونیئرز کے لیے کالج کو اندھے کنوئیں کے بجائے گھر کا آنگن بنا دیا۔ جس میں ماں، جاڑوں کی دھوپ میں اپنے بچے کو اپنی گود میں بٹھائے چوری کھلا رہی ہوتی ہے۔ انہوں نے ہر لڑکے کو وہ چیز دی جس کی اس کو ضرورت تھی۔ سینیئرز کو انسان بنایا۔ ذمہ داری دی، اعتماد دیا، قیادت کی صلاحیتوں کو ابھارا اور جونیئرز کو شفقت سے نوازا۔

جرأت کردار کی وہ خصوصیت تھی جو وہ ہر لڑکے میں ابھارنا چاہتے تھے۔ باکسنگ بھی انہوں نے اسی مقصد سے سب لڑکوں کے لیے لازمی کی تھی لیکن باکسنگ کی باقاعدہ مشق بھی کراتے تھے۔ باکسنگ کے لیے جوڑے بڑی احتیاط سے بناتے تھے، صرف وزن ہی نہیں لڑکے کا تجربہ، قد کاٹھ اور مزاج بھی دیکھتے تھے۔ پھر باکسنگ کی ریفریئنگ خود کرتے تھے۔ مقصد ایک کو دوسرے سے پٹوانا نہیں بلکہ اس وسیلہ سے اس کے اندر حوصلہ اور قوت مزاحمت کو بڑھانا اور اعتماد کو تقویت دینا تھا۔

سکول باکسنگ کے مقاصد پیشہ ورانہ باکسنگ سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ میں اس بات کو اس تفصیل سے اس لیے لکھ رہا ہوں تاکہ جو لوگ ان کو پہلے سے نہیں جانتے ان کو بھی اندازہ ہو جائے کہ وہ کس پایہ کے ماہر تعلیم اور ماہر تربیت تھے اور ان کی نظر کن پہلوؤں اور کن جزئیات پر ہوتی تھی۔

اب میں ایک نہایت اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ وہ اکثر لوگوں کی رائے دوسروں کے بارے میں اپ ٹو ڈیٹ نہیں ہوتی۔ وہ آدمی بدل جاتا ہے لیکن لوگوں کی کسی پرانے مشاہدہ یا معلومات پر مبنی رائے نہیں بدلتی۔ مثلاً کرنل رفیق کالج میں دوبار آئے جو وہ ۵۲ء میں تھے وہ ۱۹۵۵ء میں نہیں تھے اور پھر ۱۹۵۵ء کے رفیق اور ۵۹ء کے رفیق میں بھی فرق تھا۔ اور یہ فرق جلال سے جمال کی طرف، سختی سے شفقت سزا سے درگزر کی طرف سفر کا تھا۔ ۱۹۵۵ء کے دور میں وہ بتدریج زیادہ شفیق ہوتے گئے تھے۔

اب میں ۱۹۵۸ء کے اواخر کا وہ واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے ان کی نئی اپیروچ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ہوا یہ کہ سکین ہاؤس کے پیچھے جو کچا بلاک تھا اس میں ہم سینئر کلاسز کے لڑکے رات کو پریپ کر رہے اور چونکہ امتحان قریب تھا اس لیے بلیک بورڈ پر کچھ لکھائی بھی ہو رہی تھی۔ یہ کیا بات تھی کہ بلیک بورڈ کو صاف کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ۲۰۵۲ شربت خان سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے ڈسٹر ڈھونڈا تو ڈسٹر نہ ملا۔ اب شربت کو ایک نئی شرارت سوجھی اس نے زعفران کو کندھوں کی طرف سے پکڑا اور ۲۰۸۱ سعید نے پیروں کی طرف سے اور اس کو ڈسٹر بنا کے بورڈ صاف کرنے لگے۔ عجب مضحکہ خیز منظر تھا۔ ساری کلاس کا ہنس ہنس کے بُرا حال تھا کہ ایک دم کرنل صاحب کی پالتو کتیا لوسی دروازے پر نمودار ہوئی جو اس بات کا سگنل تھا کہ کرنل رفیق آ رہے ہیں۔ چنانچہ دوسرے لمحے وہ سامنے تھے ان کو دیکھتے ہی شربت اور سعید نے زعفران کو ایک دم چھوڑ دیا وہ دھڑام سے نیچے گرا۔ بیچارے کے کافی چوٹ آئی۔ رنگ میں بھنگ پڑ چکا تھا۔ پوری کلاس سناٹے میں تھی۔ شرارتیں تو پہلے بھی ہوتی تھیں۔ لیکن اب کے معاملہ ہی اور تھا میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے مجھے اشارہ سے بلایا اور کہا "سینئر کلاسز کو باہر جمع کر دو"، جب سب جمع ہو گئے تو انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں بڑے دکھ سے کہا "اگر میری چار برس کی کوششوں کا یہی انجام ہے تو میں کل کالج چھوڑ کر جا رہا ہوں۔" صرف یہ ایک جملہ کہا اور اپنے دفتر کی طرف چلے گئے۔

ہم لوگوں کو فکر ہوئی کہ بات تو بگڑ گئی۔ اب کیا کیا جائے۔ ہمارا ان سے رشتہ باپ بیٹے کا تھا۔ مختصر یہ کہ ہم وفد بنا کر ان کے پاس گئے اور معافی مانگی پھر انہوں نے ایک لمبا لیکچر دیا اسی دوران انہوں نے کہا جب میں یہاں آیا تھا تو میرے بال سیاہ تھے اب سفید ہو رہے ہیں یہ سب تمہارے لیے ہے، تمہارے مستقبل کے لیے پاکستان کے لیے میرا خیال ہے ان کے اس روز کے لیکچر کا جتنا ہم پر اثر ہوا اتنا کسی اور لیکچر کا کبھی نہیں ہوا تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ اپنے دوسرے دور کے آخری دنوں میں انہوں نے جسمانی سزا

تقریباً ختم کر دی تھی یا اس کی ضرورت ختم ہو گئی تھی۔

مختصر یہ کہ کرنل رفیق ہمیں اندھیرے سے اجالے میں لائے اس ادارہ کو انہوں نے ایک ضمیر اور ایک ذہن دیا۔ زندگی کی مثبت قدروں سے آشنا کیا اور تعلیم کا جو اصل مقصد ہے شخصیت و کردار کی تعمیر و ترقی کو ملحوظ رکھا۔ وہ فرشتہ نہیں تھے۔ میں ان کی کمزوریوں سے بھی واقف ہوں۔ سالانہ تقریب انعامات کے ڈنر پر ایک بار انہیں قدرے مخمور دیکھ کر میں خود رو پڑا تھا۔ لیکن ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ بحیثیت مجموعی انہوں نے اپنی زندگی سے دنیا کو کیا دیا۔

فرشتہ سے بڑھ کر ہے انسان بننا مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

——— لیفٹیننٹ کرنل سردار خان[1]

اگست ۱۹۷۰ء سے نومبر ۱۹۷۱ء تک میں نے گورنرز ہاؤس ڈھاکہ میں گورنر کے ایک مشیر کے طور پر کام کیا۔ اس زمانے میں بریگیڈیئر رفیق گورنر کی انسپکشن ٹیم کے چیئرمین تھے ہمارے پاس جو کرپشن اور دوسری بدعنوانیوں یا مسائل کے کیس آتے تھے ہم ان کے پاس بھیجتے تھے بریگیڈیئر رفیق جس بے لاگ طریقے سے اور جس تفصیل سے تفتیش کرتے تھے اور متعلقہ عوامل کا تجزیہ کرتے تھے اور تجاویز و سفارشات پیش کرتے تھے، وہ ایک نایاب تحفہ ہے جو اس غیر معمولی انسان نے اس ملک کو پیش کیا۔ ان کی رپورٹوں کی ایک کاپی سی ایم ایل اے سیکرٹریٹ راولپنڈی کو بھی بھیجی جاتی تھی۔ ان کو پڑھا جائے تو نہ صرف ملک کے نظم و نسق کو سدھارنے کی بیش بہا تدابیر سامنے آئیں گی بلکہ سقوط ڈھاکہ کے پس منظر پر بھی بہت قیمتی روشنی پڑے گی۔ مجھے چونکہ گورنر کو ان رپورٹوں پر بریف کرنا ہوتا تھا اس لیے مجھے انہیں تفصیل سے پڑھنے کا موقع ملا جو کام بھی انہوں نے ملٹری کالج کے چھوٹے سے جزیرہ میں کیا وہ تو اس کام کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں جو پورے ملک کے لیے انہوں نے ڈھاکہ میں کیا۔ مجیب الرحمان کیس کو جس طرح انہوں نے تیار کیا وہ کاغذات میں نے نہیں دیکھے۔ لیکن سنا ہے وہ بھی تاریخی اہمیت کا مواد ہے جو نیشنل آرکائیوز

---

[1] کالج نمبر ۱۹۵۵ زمانہ ۵۶ - ۱۹۴۹ء

یں محفوظ رہنا چاہیے۔

——— ڈاکٹر سرفراز مرزا [1]

ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مرحوم نے کالج کی سربراہی محض رسمی سربراہی کے لیے ہی قبول نہ کی تھی بلکہ عزم و عمل کے ساتھ اپنے موقف پر شدت سے عمل پیرا ہونے کے لیے کی تھی۔ ان کا موقف کالج کی بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں زیر تعلیم طلبا کی ٹھوس تربیت بھی کرنا تھا۔ اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے مادر وطن کی اس عظیم درسگاہ کی سربراہی قبول کرتے ہی اولین فرصت میں جو اہم قدم اٹھایا وہ کالج کے ہر طالب علم سے فرداً فرداً بنفس نفیس ملاقات کا تھا۔ ان ملاقاتوں کا سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا جس میں انہوں نے ایک ماہر نفسیات کی طرح طالب علموں کے اذہان کو پڑھا اور ان کے متعلق اپنی ابتدائی رائے قائم کی۔ یہ بلاشبہ ایک انوکھا تجربہ تھا جس سے ہم پہلے واقف نہ تھے مرحوم مجھے ذاتی طور پر ایک سپاہی سے زیادہ نفسیاتی معالج محسوس ہوئے کہ ان کے دور میں کیے گئے بیشتر اقدامات کے پیچھے ایک ماہر نفسیات کے ذہن کی سوچ عود کرتی دکھائی دیتی رہی۔ یہاں میں عرض کرتا چلوں کہ مزاجاً میری طبیعت اگرچہ ذہنی اور روحانی طور پر کالج کے اس دور میں رائج قوانین اور طور طریقوں سے مطابقت نہیں رکھتی تھی لیکن پھر بھی میں نے مرحوم کی بے پایاں شفقتوں اور کچھ سختیوں کے ملے جلے تاثر کے ساتھ اس درسگاہ سے بہت کچھ سیکھا جو صرف انہی کا حصہ ہے۔

——— میجر جنرل طارق نظامی

جب میں یادوں کے دریچے کھولتا ہوں تو رفیق صاحب کی شخصیت کا پہلا تاثر وہ ہے جو انگریزی کے لفظ Awe سے ذہن میں آتا ہے۔ ان کی ظاہری ہیئت اور شکل و شباہت ایسی تھی جسے دیکھ کر جلال و جبروت کا احساس ہوتا تھا۔ یہ تاثر ۱۹۵۲ کا ہے جب میں خود دس گیارہ برس کا تھا اور چھٹی کلاس میں پڑھتا تھا۔ ان کے دوسرے دور میں ان کی شخصیت کا جمالی پہلو بھی ابھر کر سامنے آیا۔ اب زندگی کا بہت سا سفر کرنے اور بہت سی

---

[1] کالج نمبر ۲۰۰۰ زمانہ تعلیم ۵۸-۱۹۵۱

منزلوں سے گزرنے کے بعد جو ہیں کالج میں دور رفیقی کا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے یہ خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں رفیق صاحب کی سربراہی میں غالباً ملٹری کالج ہی وہ واحد ادارہ تھا جہاں اسلام کے سماجیکو سوشل تصور عدل کو نظم و نسق میں اور طلبہ کے تربیت کے سسٹم میں اس طرح سمو دیا گیا تھا کہ عدل پورے ماحول کی رگوں میں دوڑتا پھرتا معلوم ہونے لگا تھا۔ یہ بڑا کارنامہ اور تجربہ تھا۔

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد سعید ستارۂ جرأت تمغۂ بسالت[۱]

کرنل رفیق نے ۵۳-۱۹۵۲ء میں مارننگ جرکس کے بعد صبح کا پریپ شروع کیا تھا (پوری پی ٹی کی باری کلاسز کے دوران ایک پیریڈ میں ہوتی تھی) ہر روز خود چیک کرنے آتے تھے۔ یہی حال شام کے پریپ کا تھا۔ ہر روز موجود ہوتے۔ اور کینوس شوز پہن کر آتے تاکہ برآمدہ میں چلنے کی آواز نہ آئے۔ برآمدہ کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر واچ کرنے کا ان کا خاص سٹائل تھا ان کے دو پالتو کتے ڈاگس ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتے بلکہ آگے آگے ہوتے لیکن کیا مجال کہ کبھی بھونکیں یا کلاس میں داخل ہو جائیں۔ رفیق صاحب کے دور میں بے انتہا ایکسٹرا کریکولر سرگرمیوں کے باوجود رزلٹ سو فیصد رہا اور میری طرح کے کھلنڈرے بھی پاس ہوتے گئے تو سوا اس کا راز یہی تھا کہ پڑھائی کے وقت بڑی سختی اور اور پابندی سے کراتے تھے۔

——— ایم گلستان خان[۲]

جب میں بیسویں پی۔ ایم۔ اے لانگ کورس کے تحریری امتحان میں ناکام ہونے کے بعد بریگیڈیر (اس وقت لیفٹیننٹ کرنل) رفیق کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اب رینکس میں بھرتی ہونا چاہتا ہوں۔ "رینکس میں کیوں؟"
چونکہ اس وقت آئی۔ ایس۔ ایس۔ بی میں ناکام رہنے پر رینکس میں بھرتی ہونا لازمی نہ رہا تھا۔ اس لیے انہیں میرے رینکس میں بھرتی ہونے کی خواہش پر تعجب ہوا۔ جب

---

[۱] کالج نمبر ۲۰۲۷، زمانہ تعلیم ۵۸-۱۹۵۱ء، حال ڈی آئی جی۔
[۲] تاجر و صنعت کار حال مقیم انگلینڈ کالج نمبر ۲۰۳۱ زمانہ ۵۷-۱۹۵۱ء

میں نے وضاحت کی کہ میں کمیشن کے لیے دوسری بار بھی قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہوں
اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ اس طرح والدین کی کچھ مالی مدد بھی کر دوں تو انہوں نے فرمایا "تمہاری
پہلی خواہش بالکل بجا ہے۔ میں اس کی بر آوری کے لیے دعا گو ہوں خدا کامیاب کرے
لیکن رہی بات والدین کے لیے کچھ کر سکنے کی۔ تو اس سلسلہ میں میرا خیال ہے کہ شاید یہ
تمہاری خواہش فوری طور پر پوری نہ ہو سکے۔ رنیکس کی تھوڑی سی تنخواہ سے تم کیا کیا کرو گے
بہر حال جذبہ تمہارا صائب اور قابل قدر ہے جو بچے والدین کی خدمت کو مقدم سمجھتے ہیں،
اللہ تعالیٰ ان کے رزق میں دیر سویر بہت برکت دیتا ہے۔ اور خود ان کی اولاد ان سے
اس سے زیادہ حسن سلوک کرتی ہے۔ گلستان اس سوچ پر میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں
وہ کچھ دیر میری طرف غور سے دیکھتے رہے۔ میں نے ان کی عقابی نگاہوں کی ٹھنڈی گرمی
کو اپنے قلب کے اندر اترتے ہوئے محسوس ہوا۔ اور مجھے یک گونہ طمانیت کا احساس ہوا۔
اور نامعلوم ساحوصلہ بھی ہوا کہ میرے فیصلہ کی تائید غیب سے ہو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد
انہوں نے مجھے جہلم کے ریکروٹنگ آفیسر کے نام ایک خط دیا۔ جاؤ میرے بچے خدا حافظ
God bless you اپنے دوسرے مقصد کو بھی نہ بھولنا۔ اللہ برکت دے گا"
میں رفیق صاحب کو پیر مانتا ہوں۔ ان کی دعا سے اللہ نے میرے رزق میں ایسی برکت دی
جو میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی۔ بہر حال مختصر یہ کہ آرمرڈ کور میں بھرتی ہو کے بعد
میں ۲۲ ویں لانگ کورس کے لیے سیلکٹ بھی ہوا۔ لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ میں میڈیکل
کلیر نہ کر سکا۔ اور زمانہ کی لہروں نے یہاں انگلستان کے ساحل پر لا پھینکا۔ ۳۰ سال کے
بعد کردار ساز پڑھی تو پرانی یاد تازہ ہوئی۔ کردار ساز میں ایک جگہ لکھا ہے کہ کرنل رفیق
حج پر جانا چاہتے ہیں لیکن جا نہ سکے۔ انشاء اللہ میں ان کے لیے عمرہ کرنے کی سعادت
حاصل کروں گا۔ کالج میں اپنے قیام کے آخری سال (۱۹۵۷ء) میں میرا قد بہت نکل آیا
تھا اور میرے اساتذہ بھی ازرہ کرم Tallest boy of the College
کے نام سے پکارتے تھے۔ میں رابرٹس ہاؤس کا ہاؤس سیکرٹری تھا۔ سٹر ڈے فنکشن میں
میرے پرفارمنس سے خوش ہوئے اور فنکشن کے بعد ڈارمیٹری سے باہر نکلنے لگے تو مجھے

شاباش دی اور پوچھا How is the tallest boy of the college
میں نے جواباً عرض کیا۔ سر میں بخیر ہوں۔ پھر پڑھائی کے بارے میں پوچھا اور یہ بھی کہا
What about some bad habits ان کا اشارہ میری تعلیمی کوتاہیوں کی
طرف تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہر طالب علم کو کتنی اچھی طرح جانتے تھے۔
میں پچیس برس سے یہاں انگلستان میں ہوں ایک کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت
سے ہر سطح کے اور ہر شعبہ کے چھوٹے بڑے آدمیوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے کہ اس پس منظر
میں، میں اب بھی انہیں اپنا ہیرو سمجھتا ہوں وہ بہت بڑے لیڈر اور ارض پاکستان کے
بڑے قابل فخر فرزند تھے۔ کاش ہمارے پیارے وطن میں ایسے لوگ زیادہ ہوتے۔
—— بریگیڈیر سعید اختر[۱]

کرنل رفیق کی لیڈر شپ ٹوٹل لیڈر شپ تھی۔ جب جنوری ۵۴ء میں کالج کا پہلا
ڈیکلمیشن کانٹیسٹ ہوا تو حیدری صاحب کے علاوہ رفیق صاحب نے بھی اس میں
حصہ لیا۔ اور ابراہام لنکن کی مشہور گیٹسبرگ سپیچ کر کے سپیچ کرنے کی بھی مثال قائم کر دی
۵۵ کے اواخر میں جب وہ دوبارہ آئے اور یوم اقبال کے جلسے باقاعدہ شروع ہوئے تو ۱۹۵۶ء
کے یوم اقبال کی انہوں نے صدارت کی اور آخر میں اقبال کی ایجوکیشنل فلاسفی پر اچھی خاصی
صدارتی تقریر کی۔ اس سے ایک ماہ پہلے ۲۳ مارچ کو پاکستان کے یوم جمہوریہ بننے
پر انہوں نے آزادی کی ذمہ داریوں کے موضوع پر جو ولولہ انگیز تقریر کی تھی وہ بہتوں کو
یاد ہوگی۔ اگلے سال مئی ۱۹۵۷ء میں انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی صد سالہ تقریبات
میں اپنی اختتامی تقریر میں انہوں نے قائداعظم کا قول بار بار یاد دلایا کہ آزادی کو باقی رکھنا
اور پروان چڑھانا آزادی حاصل کرنے سے بھی زیادہ صبر آزما عمل ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ انہوں
نے تربیت کو Institutionalise کیا کردار سازی کے آڈ سسٹم آنر کورٹ
شخصیت سازی کے لیے پریفیکٹوریل ذمہ داریاں سوشل سرگرمیاں ہر جمعہ کو تقریری مقابلے
ہر کلاس اور ہر ہاؤس کا ڈرامہ بے شمار ہابیز ایکسکرشن تقریباً ہر ہفتے آؤٹنگ —— غرض
تربیت کے ہر پہلو کو ایک روایت کی شکل دے دی۔

[۱] کالج نمبر ۲۰۴۰ زمانہ تعلیم ۵۸-۱۹۵۱ء

——— بریگیڈیر محمد اقبال[1]

لیڈرشپ میں لیڈر کے Social Response کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ میری طرح بے شمار اولڈ بوائز نے ان سے خاص طور پر اس معاملہ میں استفادہ کیا ہو گا اس سلسلہ میں بہت چھوٹے درجے کے ملازموں سے ان کے حسن سلوک کی ایک مثال یاد آرہی ہے۔

پرانے آکنلک ہاؤس کے سامنے، سرائے کی طرف جو ایک چھوٹا گیٹ تھا، اس کے ساتھ سوئیپرز کے کوارٹرز تھے۔ وہ ان کلاس فور سرونٹس کے کوارٹرز پر بھی کبھی کبھی جاتے تھے اور موقع پر ان کے مسائل سنتے اور ان کا فوری حل ڈھونڈتے۔ ایک روز خبر اڑی کہ کرنل صاحب بھنگیوں کے کوارٹرز میں چائے پیتے دیکھے گئے ہیں۔ ہم لوگوں کو بڑا تجسس ہوا کہ کیا واقعی ایسا ہوا ہے جب اس حادثے کی تصدیق ہوئی تو سچ پوچھئے کہ ہمیں بڑا شاک ہوا لیکن برسہا برس کے بعد جب میں نے خود اپنی یونٹ کی کمان سنبھالی تو ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔

ملٹری کالج ایسا ادارہ محض کتابیں پڑھانے اور پی ٹی پریڈ کرانے کے لیے نہیں قیادت کے گُر سکھانے کے لیے ہوتا ہے۔ رفیق صاحب سے پہلے ایم سی ایک پرانے گھر کی طرح تھا جس میں رہا نہیں جاتا لیکن جسے آپ گرا بھی نہیں سکتے۔ رفیق صاحب نے اسے تازہ زندگی دی اور صبح کی پی ٹی اور پیڑوں کو پانی دینے جیسی قابل نفرت چیزوں کو بھی اپنی ذاتی مثال سے قابلِ قبول اور قابل قدر بنا دیا۔

——— شربت خان محسود[2]

۱۹۶۷ء میں، میں یو۔ بی۔ ایل ہری پور میں پوسٹ تھا۔ کسی نے بتایا کہ کرنل رفیق بریگیڈیر ہو کر باغ میں ایک بریگیڈ کمان کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں خط لکھا اور ساتھ ہی دعوت بھی دے دی کہ کبھی ادھر سے گزریں تو ملاقات کا موقع دیں۔ مجھے خیال ہی نہ رہا کہ باغ اور ہری پور کا روٹ براہ راست مشترک نہیں ہے۔ بہر حال ہوا یہ کہ وہ ہری پور میں مجھ سے خاص طور پر ملنے آئے اور شام تک مجھے ڈھونڈ نکالا۔ حال احوال پوچھا کالج کی پرانی باتیں کیں اور

---

[1] کالج نمبر ۲۰۴۸ [2] وائس پریذیڈنٹ الائیڈ بنک کالج نمبر ۲۰۵۳ زمانہ تعلیم ۶۰-۱۹۵۱ء

واپس چلے گئے۔ یہ تکلیف محض اس لیے اٹھائی کہ ایک پرانے شاگرد نے یاد کیا تھا۔
۷۵ء میں میں سوات میں تھا۔ خیال آیا کہ میں بچے کو لارنس کالج میں داخل کراؤں چنانچہ میں بچے کو لے کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ اتفاق سے وہ اس دن بنگلہ میں اکیلے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے چار بنا کر پلائی جب میں نے بچہ کی بات شروع کی تو کہا شربت۔ ویسے بچوں کو داخل تو ہم نرسری میں بھی کر لیتے ہیں لیکن میں بغیر کسی خاص وجہ کے اتنی کچی عمر میں بچوں کو ماں باپ سے جدا کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ گھر کے آنگن کی بات ہی اور ہوتی ہے بچوں کو تم خود تھوڑا بہت وقت دیا کرو پانچویں تک گھر پر پڑھاؤ۔ پھر دیکھیں گے چونکہ تم میرے بچوں کی طرح ہو اس لیے یہ مشورہ دے رہا ہوں پرنسپل کی حیثیت سے بات نہیں کر رہا ہوں۔

——— لیفٹیننٹ جنرل محمد اشرف[1]

میں کالج میں جولائی ۱۹۵۱ء سے اکتوبر ۱۹۵۶ء تک زیر تعلیم رہا اس عرصے میں مجھے دوبار بریگیڈیئر رفیق کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ ۵۳-۱۹۵۲ء میں ایک جونیئر کیڈٹ کی حیثیت سے اور ۵۶-۱۹۵۵ء میں ایک سینئر کیڈٹ کی حیثیت سے۔ تیسری بار ۶۲-۱۹۶۱ء کے دیر باجوڑ آپریشن میں میں ان کے ساتھ شریک کارزار رہا۔ وہ پنجاب رجمنٹ کی ایک بٹالین کمان کر رہے تھے اور میں اسی بریگیڈ کی ایک بٹالین میں ایک جونیئر افسر تھا۔ لیکن یہ تعلق بالواسطہ تھا۔ بلاواسطہ نہ تھا۔ ان کی شخصیت و کردار کا براہِ راست مطالعہ کرنے اور اس سے متاثر ہونے کا موقعہ مجھے ملٹری کالج ہی میں ملا۔ اور پھر بعد کو ان کے بارے میں بہت کچھ سنا بھی۔ اپنی زندگی ہی میں وہ اپنے امتیازی کردار اوصاف کے لیے معروف ہو گئے تھے اب تو ان کی حیثیت ایک Legend کی سی ہو گئی ہے۔

ملٹری کالج کے کمانڈنٹ کی حیثیت سے ان کی شخصیت و کردار کا نقش میرے ذہن پر بہت گہرا ہے کالج کو صحیح رُخ دینے اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں انہوں نے کالج کی جو تاریخی خدمت انجام دی ہے اس کی وجہ سے اور اس کے حوالے سے ان کو جس عزت و احترام اور شکر گزاری کے جذبے سے یاد کیا جاتا ہے، اس طرح غالباً کسی اور کو

[1] کالج رول نمبر ۲۰۷۹۔

یاد نہیں کیا جاتا۔ حق یہ ہے کہ ان کا کام ہی اتنا بڑا ہے کالج کی زندگی کے ایک اہم موڑ پر جب کالج کو پبلک سکول کی طرز پر منظم کیا جارہا تھا۔ انہوں نے اس کی قیادت سنبھالی۔ اور اسے ایک اعلیٰ معیار کے قومی ادارے کا آب ورنگ دیا ملک کے پبلک سکولوں میں یہ پہلا ادارہ تھا جس میں قومی شعور کو شعوری طور پر فروغ دینے کے اقدامات کیے گئے۔

دنیا میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ایک بہتر دنیا کا تصور کرسکتے ہیں جو خواب دیکھتے ہیں جو Visionary ہوتے ہیں لیکن خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کا کوئی نقشہ ان کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ گویا وہ اپنے تصور یا آئیڈیل ازم کی ٹکنالوجی نہیں جانتے۔ اور اگر جانتے بھی ہیں تو شخصیت کی اس قوت Dynamism اور تاب و توانائی سے محروم ہوتے ہیں جو قیادت کا جوہر ہے بریگیڈیئر رفیق میں یہ تینوں چیزیں بیک وقت موجود تھیں وہ ایک Visionary Idealist بھی تھے وہ اپنے تصورات کو حقیقت میں بدلنے کے لیے ضروری طریق کار بھی وضع کرسکتے تھے اور ان کی شخصیت میں بھی اتنی قوت تھی کہ وہ اس طریق کار یا پلان کے مطابق عملی اقدامات کرسکیں۔ اعلیٰ درجہ کی قیادت کا یہ مرحلہ سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے بڑے بڑے باصلاحیت لوگ اور Idealist یہاں مار کھا جاتے ہیں لیکن بریگیڈیئر رفیق کی شخصیت میں یہ نایاب لیکن بہت ضروری عنصر موجود تھا انہوں نے ہر طرح کی رکاوٹوں کے باوجود کالج کی تعلیم و تربیت کے معیار کو بلند کرنے کی بھرپور جدوجہد کی۔ کام لینے میں وہ بہت سخت تھے لیکن بہت دردمند قائد تھے اور بحیثیت ایک ماہر تعلیم کے وہ ایک تعلیمی ادارہ کی سربراہی کے فن میں طاق اور اس کے تقاضوں اور ضرورتوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ خود تنظیمی Self-Discipline پابندی وقت، دیانتداری، جسمانی اور اخلاقی جرأت، قوانین و ضوابط کی پابندی، وفاداری اور خودداری جیسی صفات کی نشوونما کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ دیکھا جائے تو ان صفات کو اہمیت دینا نئی بات نہیں جب بھی قیادت کی بات تربیت کی بات ہوتی ہے ان صفات کا ذکر ضرور ہوتا ہے نئی بات یہ تھی کہ ان صفات کی تربیت اور نشوونما کرنے کا انہوں نے ایک نظام بھی وضع کیا اور ایسے اقدامات بھی کیے جن کے ذریعے سے ان کی نشوونما ہو سکے۔ مثلاً خود تنظیمی سیلف ڈسپلن اور دیانتداری کے فروغ کے لیے انہوں نے آنر سسٹم شروع کیا تھا:

خود اعتمادی، ذمہ داری اور دوسری قیادتی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے کیڈٹ عہدیداروں کو کافی ذمہ داریاں دی گئی تھیں۔ وہ دُور سے ان پر نظر رکھتے تھے اور ضروری رہنمائی کرتے تھے۔ وہ ڈسپلن کی پابندی کرانے کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ جو لڑکا بار بار کی تنبیہہ کے باوجود اپنے طور طریقے نہ بدلتا اور قوانین وضوابط کی سنگین خلاف ورزی کرنے سے باز نہ آتا - وہ اس کی پبلک کیننگ کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ کونٹری جیسی سخت سزائیں بھی دیتے تھے ان کے فلسفۂ تربیت میں اجتماعی مفاد کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ ان سے لڑکے بہت ڈرتے تھے صبح سے لے کر رات گئے تک وہ ہر جگہ، ہر مقام، نصابی یا غیر نصابی ہر سرگرمی پر خود موجود ہوتے تھے ایسا کرنا آسان کام نہیں۔ اس کے لیے بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ کام کرنے اور کام لینے میں انتہائی انہماک کے بعد، ان کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں، رفقائے کار اور کیڈٹس کے مفادات کا تحفظ کرنے اور ان کے مسائل کے حل کرنے میں غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ یہ دلچسپی محض دکھاوے کے لیے یا رسمی فقرے کہنے تک محدود نہیں ہوتی تھی۔ یہ دلچسپی کھری اور سچی تھی وہ اپنے ماتحتوں کے مسائل کو حل کرنے میں اتنی سرگرمی دکھاتے تھے جیسے یہ ان کے اپنے ذاتی مسائل ہوں۔ یہ ادارہ ان کی رگ وپے میں رچ بس گیا تھا۔ ملٹری کالج ان کے لیے سب کچھ تھا۔ ملٹری کالج اور بریگیڈیئر رفیق ایک ہی چیز کے دو نام تھے اس گہری وابستگی سے انہیں ذاتی طور پر نقصان بھی پہنچا۔ لیکن انہوں نے اصولوں پر کبھی مفاہمت نہیں کی۔ انہوں نے کالج کے مفاد کو ہمیشہ مقدم رکھا، ہر قیمت پر۔

میں سمجھتا ہوں کہ بریگیڈیئر رفیق کا سب سے بڑا اور سب سے اہم کنٹری بیوشن جس سے ان کے طلبہ خاص طور پر مستفید ہوئے یہ تھا کہ انہوں نے کردار اور قیادت کا ایک معیار اور ایک سٹائل ذاتی طور پر ہمارے سامنے رکھا۔ ہر موقع کے لیے موزوں ترین اور بہترین لباس، چلنے کا انداز، گفتگو کا لب ولہجہ، بے انتہا وقت کی پابندی بے لاگ انصاف، بے انتہا جفاکشی اور مشنری سپرٹ ان سب چیزوں سے ہم سب متاثر ہوئے سُنا ہے کہ بعد کو انہوں نے مے نوشی کلیتاً ترک کر دی تھی لیکن اس زمانے میں ان کی مے نوشی بھی کوئی راز نہیں تھی لیکن اس میں بھی ان کے کچھ اصول تھے

انھوں نے کبھی کسی کو ان محفلوں میں گھسیٹنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس شغل کو اپنے فرائض منصبی کی راہ میں مخل ہونے دیا۔ خواہ تمام رات کلب میں گزر جائے لیکن صبح کو پی ٹی سے لیٹ کبھی نہیں ہوئے اور بکثرت سگریٹ نوشی کی عادت کے باوجود روزے بھی قضا نہیں کیے اور نہ کرنے دیئے۔

میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ بریگیڈیر رفیق ہر اعتبار سے ایک مثالی کمانڈنٹ تھے۔ ان کا نام آج بہت گہرے احترام سے لیا جاتا ہے ان کو خراج عقیدت پیش کرنے میں وہ لوگ بھی پیچھے نہیں ہیں جو کبھی ان کی تادیبی کارروائیوں سے متاثر ہوئے تھے۔ وہ اپنے ہم عصروں اور ساتھیوں سے بلند بہت بلند تھے اور مزید برآں وہ ایک پلیشہ ور سپاہی بھی بہت اونچے درجے کے تھے۔ بہترین فیلڈ کمانڈر، رفیق کار اور دوست بھی۔ ان پر خدا کی رحمتیں ہوں۔

—— راجہ حامد نواز[1]

میرے دل میں کرنل رفیق کی جو بات پتھر کی لکیر کی طرح بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ ان کی انصاف کی عادت ہے۔ یہ صفت جو انسانیت کی جان ہے ان میں بدرجہ اتم تھی یتام کا وقت تھا کہ ایک بہت بڑے افسر کا اے ڈی سی آیا کہ فلاں لڑکے کے لیے چھٹی چاہیے اسے کسی تقریب میں جانا ہے۔ گیٹ پر انتظار کر رہے ہیں۔ کرنل صاحب بپھر گئے اسے چھٹی نہ دینا تھی نہ دی۔ اس طرح کا ایک واقعہ ایک ریڈ ٹیپ کے ساتھ لارنس کالج میں پیش آیا۔ انھوں نے صاف کہہ دیا بلاشبہ بچے کو کالج سے نکال لیں میں بے قاعدہ چھٹی نہیں دے سکتا۔ انھوں نے نکال لینے کا فیصلہ کیا انھوں نے کھڑے کھڑے لڑکے کو فارغ کر دیا۔ حالانکہ ان سے ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں وہ ان کے باغ سیکٹر میں معرکہ آرا تھے۔ سزا ہے تو سب کے لیے جزا ہے تو سب کے لیے۔ وہ کسی وجہ سے کسی تفریق کے قائل نہیں تھے۔ پاکستان پرستی میں اصول پرستی میں غرض بہت سی باتوں میں وہ ملٹری کالج کے قائد اعظم تھے۔

---

[1] کالج نمبر ۲۰۸۳ زمانہ تعلیم ۵۸-۱۹۵۱ء ڈی ایس پی

ــــــــ ڈاکٹر محمد خان پی ایچ ڈی[1]

رفیق صاحب کی کنٹری بیوشن کا ان ہی کو صحیح اندازہ ہو سکتا ہے جنہیں ان کے دور سے پہلے یا بعد یہاں کے حالات کا کچھ تجربہ ہو۔ مجھ سے پوچھئے کہ مجھ پر کیا بیتی تھی۔ یہ ۱۹۵۱ء کے اواخر کی بات ہے۔ میں ٹائیفائیڈ کے بعد اٹھا تھا۔ سر کے بیشتر بال جھڑ گئے تھے۔ رابرٹس ہاؤس میں میرے سیکشن کمانڈر صاحب نے جو اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے، مجھے سامنے کے لان پر سو فرنٹ رول کی سزا سنا دی۔ ایسی نادر شاہی سزاؤں کی کوئی اپیل نہیں تھی۔ خیریت اسی میں ہوتی تھی کہ ان کی تعمیل کی جائے چنانچہ میں نے مجبوراً سو فرنٹ رول کیے اور جب کر چکا تو زمین آسمان گھومتے ہوئے نظر آ رہے تھے اور سر میں آگ لگی ہوئی تھی کچھ دیر کے بعد میں نے سر پر ہاتھ پھیرا تو پتہ چلا کہ سر میں گوکھرو چبھے ہوئے ہیں یہ ایک مثال ہے ان اذیتوں کی جنہیں رفیق صاحب نے آ کر روکا بلکہ بند کیا اور پھر ایک جونیئر ہاؤس قائم کیا تاکہ نئے بچے سینئرز کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہیں۔ اس رجمنٹل سسٹم میں کیڈٹ عہدیداروں کو بڑے اختیارات حاصل تھے جو وہ اکثر غلط استعمال کرتے تھے۔

کرنل رفیق کے زمانے میں تخلیقی کام بھی بہت ہوا۔ ہاؤسز کے ترانے لکھے گئے۔ حیدری صاحب نے انگریزی میں اور حسن صاحب نے اردو میں نظمیں لکھیں۔ فائن آرٹس اینڈ کلچرل سنٹر نے یادگار ڈرامے پیش کیے۔

ــــــــ بریگیڈیئر رب نواز خان[2]

میرا خیال ہے کہ ایک پبلک سکول کے پرنسپل کو بیک وقت شاعر، سائنس دان، کمانڈر اور مرشد ہونا چاہیے۔ شاعر تاکہ اس کا کوئی وژن ہو۔ تاکہ وہ افق کے پار دیکھ سکے سائنس دان کا تحقیقی و تجرباتی ذہن رکھتا ہو تاکہ وہ اپنے خوابوں کو بروئے کار لانے کی ٹیکنالوجی وضع کر سکے کمانڈر ہو تاکہ اپنی منزل کی طرف جرأت سے پیش قدمی کر سکے اور پھر وہ مرشد بھی ہو تاکہ اس کے اپنے کردار اور لائف سٹائل سے طلبا روشنی اور گرمی پا سکیں۔

---

[1] کالج نمبر ۲۰۸۷ [2] کالج نمبر ۲۰۹۲

رفیق صاحب اتنے کامیاب ہوئے اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ ان کا ایک وژن تھا۔ ان میں تجربات کرنے کا حوصلہ تھا اور اپنے تصورات کو بروئے کار لانے کے لیے ایک فوجی کمانڈر کا عزم بھی۔

اکتوبر ۱۹۵۵ء میں جب وہ دوبارہ پوسٹ ہو کر آئے تو کالج کے ڈسپلن کی حالت بہت غیر ہو چکی تھی۔ کسی وجہ سے چارج لینے دینے میں دیر ہو رہی تھی۔ وہ آفیسرز میس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں اس میدان میں جہاں اب موتی ہال ہے کھیل ہوتے تھے وہ گھنٹوں میس کے لان میں کھڑے لڑکوں کو آتے جاتے اور کھیلتے دیکھتے رہتے۔ راتوں کو وہ کالج میں گھومتے اور لڑکوں کی حرکتوں کو دیکھتے چونکہ ابھی انہوں نے چارج نہیں لیا تھا۔ وہ ایک خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے لڑکوں نے انہیں بے ضرر سمجھ کر ان کا نوٹس لینا ہی چھوڑ دیا تھا۔ انہیں کیا خبر تھی کہ یہ خاموش تماشائی ان کی ہر حرکت کو نوٹ کر رہا ہے اور ایک روز ان کو سیدھا کر کے رکھ دے گا۔ انہوں نے چارج لینے کے بعد جو انقلابی اصلاحات شروع کیں ان میں ایک اقدام جونیئر ہاؤس کا قیام بھی تھا۔ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے مجھے اس ہاؤس کا ہاؤس پریفیکٹ مقرر کیا۔ یہ پریفیکٹی میرے کیرئر کی پہلی اینٹ تھی۔ جونیئر ہاؤس پر ان کی بڑی توجہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ نیا کالج یہاں سے پیدا ہو گا۔

منجملہ اور اصلاحات کے انہوں نے کالج میں آنرسسٹم کا تجربہ بھی کیا۔ آنرسسٹم کا ایک حصہ آنرکورٹ کا نظام بھی تھا۔ ڈارم سے لے کر کالج کی سطح تک کورٹس تھیں۔ ان کا طریقہ کار متعین تھا۔ ان کی اصل کوشش یہ تھی کہ سزا کے خوف پر مبنی طریق تربیت کی جگہ عزت نفس پر مبنی طریق تربیت رائج کیا جائے۔ یہ ایک سچی اور بھرپور مخلصانہ کوشش تھی۔ آنرسسٹم سے لڑکے فرشتے نہیں بن گئے لیکن انہیں ایک نئے اور زیادہ متحرک طریق تربیت کا تجربہ ضرور ہوا۔ عزت نفس کے تصور اور شعور نے کم ازکم ان کی ذہنی دنیا ضرور بدل دی میں نے کالج ہیڈ بوائے کی حیثیت سے مرکزی آنرکورٹ کی صدارت بھی کی ہے۔ اس تجربے کی روشنی آج تک میرے ساتھ ہے۔

بریگیڈیئر رفیق کا سب سے بڑا اور سب سے اہم کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے اس

ادارہ کو ایک ضمیر دیا۔ ایک ٹھوس اخلاقی بنیاد دی اور کردار کی تعمیر اور شخصیت کی نشوونما کو کالج کی ترجیحات میں سب سے اوپر رکھا۔ ۱۹۵۷ء میں، جب میں ایف ایس سی فرسٹ ائر میں تھا تو انہوں نے مجھے کالج کا ہیڈ بوائے مقرر کیا تھا۔

اس زمانے میں ہیڈ بوائے کی ذمہ داریاں بہت زیادہ اور بہت اہم تھیں۔ ایک طرح سے کمانڈانٹ کے سٹاف افسر کے طور پر لیکن اس کے اختیارات کے بغیر کام کرنا پڑتا تھا۔ اختیار کے ساتھ کام کرنا آسان ہوتا ہے لیکن جب ملٹری لا کی طاقت پیچھے نہ ہو تو پھر قیادت اور شخصیت کی طاقت سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں نے اپنی سروس میں ہر سطح کی سٹاف افسری کی ہے لیکن کالج کی ہیڈ بوائے شپ سب سے مشکل مرحلہ تھا خصوصاً اس وجہ سے کہ بریگیڈیئر رفیق جیسے قائد کے معیار اور توقعات پر پورا اترنا آسان نہ تھا۔ کالج ہیڈ بوائے ہوئے مجھے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ انہوں نے مجھے بلا کر کہا۔ کالج میں ایک تفریحی میلہ فن فیئر لگانا ہے۔ اسے اور لڑکوں کو تمہاری نگرانی میں منظم کرنا ہے۔ رہنمائی کے لیے میں ہوں گا ، سٹاف ہو گا لیکن منصوبہ بندی اور اس کی تعمیل تمہاری ہو گی میں تو مہمان خصوصی کے طور پر تمہارے دیئے وقت پر آنا پسند کروں گا۔ ایک نیا تجربہ اور چیلنج تھا بہر حال فن فیئر ہوا اور خوب ہوا۔ مرحوم کے انتقال سے کچھ ہی دن پہلے جب میں ان سے سی ایم ایچ لاہور میں ملا تو منجملہ اور باتوں کے انہوں نے اس فن فیئر کا ذکر بھی کیا اور کہا رب نواز اس میلہ کا مقصد یہ تھا کہ تمہیں اور دوسرے سینئر لڑکوں کو انتظام و انصرام کی عملی تربیت ملے اور آگے چل کر چیف آف سٹاف کے فرائض بھی سنبھالنے پڑیں تو اس کے لیے بھی زمین تیار ہو چکی ہو۔ اس لیے کہ سٹاف جاب خواہ کسی سطح کا ہو اس کے بنیادی تقاضے ایک ہی سے ہوتے ہیں۔

آؤٹ ڈور سرگرمیوں، پکنک ، شکار، سائیکلنگ وغیرہ کا اہتمام وہ بڑے تواتر اور شوق سے کراتے تھے اور اکثر خود ساتھ جاتے تھے سائیکلنگ کلب کو انہوں نے سائیکلیں خرید کر دی تھیں ایک اتوار کو میں نے ہیڈ بوائے کی حیثیت سے اپنی کلاس کے لیے ہیڈ رسول تک سائیکلوں پر جانے کی اجازت لی اور ہم لوگ کوارٹر ماسٹر سٹور سے

سائیکلیں لے کر نکلے۔ ابھی نہر کے پل تک ہی پہنچے تھے کہ کسی نے تجویز پیش کی کہ چلو گجرات چلتے ہیں۔ وہاں گارڈن کالج کی فٹ بال ٹیم کا کسی مقامی کالج کی ٹیم سے میچ تھا۔ گجرات جانے کے شوق کی اصل وجہ یہ تھی کہ گارڈن کالج کی ٹیم کی کپتانی ایک ایکس ملٹری کالج شوکت کر رہا تھا۔ مختصر یہ کہ ہم لوگ سائیکلوں پر گجرات گئے، میچ دیکھا، واپس بھی اسی طرح آئے لیکن ساٹھ میل کی سائیکلنگ رنگ لائی اور دو لڑکوں کو تکان سے بخار ہو گیا اور وہ کالج سپتال میں داخل ہو گئے۔ صبح کو کرنل صاحب حسب معمول ہسپتال گئے تو ان دو کو ہسپتال میں دیکھ کر حیران ہوئے۔ پوچھا کہ بخار کیوں ہوا تو بات کھل گئی اس وقت تو وہ خاموش رہے۔ شام کو کھیلوں پر آئے تو مجھے دیکھ کر دھاڑے "رب نواز ادھر آؤ" ان کی آواز میں گرمی تھی میں سمجھ گیا کہ بات کیا ہے۔ جب میں ان کے پاس گیا تو بہت سختی سے پوچھا "میں نے تو تمہیں ہیڈ رسول جانے کی اجازت دی تھی تم گجرات کیوں گئے۔ تم ذمہ دار آدمی ہو" میں کیا جواب دیتا میں نے بس اتنا کہا۔ آئی ایم سوری سر، وہ بہت غصہ میں تھے اور میرے ساتھ پہلی بار اتنے ناراض۔ وہ پھر دھاڑے "بلڈی ویل، ڈونٹ ڈو اٹ اگین" اور آگے بڑھ گئے۔

ایک اور واقعہ ان کی ہم سے چاہت کا ہے جس رات ہم لوگوں کا انٹر کا رزلٹ آؤٹ ہونے والا تھا۔ انہوں نے سوئمنگ پول پر آئس کریم پارٹی کا اہتمام کیا۔ دیر تک تیراکی ہوتی رہی۔ پھر آئس کریم چلی۔ کوئی پونے بارہ بجے کے بعد لاہور سے فون پر رزلٹ معلوم کیا۔ ایک کے سوا سب پاس ہو گئے تھے انہیں مبارک باد دی اور وہ جو ایک مضمون میں ناکام ہوا تھا اسے دیر تک دلاسا دیتے رہے مجھے یاد ہے کہ اس رات کوئی تین بجے کے قریب یہ مجلس برخاست ہوئی۔

سینئر کلاسز کی کردار سازی پر ان کی خصوصی توجہ تھی۔ اس موضوع پر کلاس سے باہر اکثر لیکچر دیا کرتے تھے۔ زبان پر بڑا عبور تھا۔ بڑی قوت سے بولتے تھے۔ کھری سچی باتیں خلوص اور محبت سے کہی ہوئی دل پر اثر کرتی تھیں ماتحتوں کے ساتھ رویے پر بہت زور دیتے تھے۔ اخلاقی جرأت بھی ان کا خاص موضوع تھا۔ کہا کرتے تھے کہ صحیح موقع

پر صحیح بات کسی مصلحت سے نہ کہنا بدترین بزدلی ہے۔ سینئر سے وفاداری اور تابعداری
کا مطلب ذاتی تابعداری نہیں قناعت کے موضوع پر بھی اکثر بولتے تھے۔ ایک فقرہ
مجھے اب بھی یاد ہے کہا کرتے "ایک چپاتی اور ایک گلاس پانی۔ اصل ضرورت تو صرف اتنی ہے۔"
تقریر کرنے اور ڈرامہ پر بہت زور دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ہر کلاس کی ہر سیکشن
نے کالج ہال میں ڈرامے سٹیج کیے۔ مقصد یہ تھا کہ ہر لڑکا سٹیج پر آئے اسی طرح تقریر کرنا
بھی باکسنگ کی طرح ہر لڑکے کے لیے لازمی تھا کلاس اور ہاؤس فنکشنز کے علاوہ پورے
کالج کا سالانہ ڈرامہ اور ایلوکیشن کانٹیسٹ علیحدہ ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس زمانے میں
مسٹر حیدری اور مسٹر علوی نے جس پائے کے انگریزی اور اردو ڈرامے سٹیج کیے ان کا معیار
پیشہ ور تھیٹریکل کمپنیوں سے بھی کم نہیں بلند تر ہوتا تھا۔
بریگیڈیر رفیق کی نظر کیڈٹس کی قوت تقریر پر بھی رہتی تھی جب انہوں نے دیکھا کہ میں
پبلک سپیکنگ سے تھوڑا سا کتراتا ہوں تو انہوں نے مسٹر حیدری سے کہا رب نواز کو
ڈرامے میں ڈالیے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے انگریزی ڈرامہ "ٹو ہیڈز آر بیٹر دین ون" میں کاسٹ
کیا جس کے نتیجے میں میری سٹیج کی جھجک مکمل طور پر دور ہو گئی اور پھر تقریر بھی کوئی مسئلہ
نہ رہا اس طرح وہ ہر ایک کے ساتھ کرتے جس کی شخصیت کا جو پہلو کمزور دیکھتے اس کو
ترقی دینے کی انتہائی کوشش کرتے ان کے لیے ہر لڑکا اہم تھا اور سب سے زیادہ اسکا کردار۔
وہ جو ان کی سختی ضرورت سے زیادہ مشہور ہے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ غیر ذمہ دار
اور غلط آدمی کی خواہ وہ کسی درجے کا ہو وہ سخت باز پرس کرتے تھے اور فرض کی ادائیگی میں
قصداً کوتاہی کو ہرگز معاف نہیں کرتے تھے۔ میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ جب میں
سیکنڈ ایئر میں تھا تو ہمارے ایک استاد بدقسمتی سے اپنے فرائض کو پوری کیا تھوڑی سی
ذمہ داری سے بھی ادا نہیں کر رہے تھے۔ اکثر دیر سے بھی آتے اور جب دیر سے آتے تو پچھلے
دروازے سے آتے کہ سامنے کا دروازہ کمانڈانٹ کے آفس سے نظر آتا تھا۔ ایسی باتیں
ان کی عقابی نگاہوں سے بھلا کہاں چھپی رہ سکتی تھیں۔ ایک روز انہوں نے مجھے بحیثیت
کلاس مانیٹر کے بلا لیا اور مجھ سے پوچھا کتنا نصاب پورا ہو گیا ہے اس کے جواب میں جو

صورتحال تھی میں نے اس سے انہیں آگاہ کردیا۔ ان کو ان صاحب کے دیر سے آنے اور پیچھے کے دروازے سے چھپ کر کلاس میں آنے کی بھی خبر تھی۔ اس کی بھی انہوں نے تصدیق چاہی۔ جو حقیقت تھی میں نے بتادی۔ اس آخری بات پر میں نے دیکھا کہ ان کا رنگ متغیر ہوگیا۔ دوسرے تیسرے دن سنا کہ ان کا تبادلہ ہوگیا ہے۔ برسہا برس کے بعد جب ان سے اس واقعہ کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا "رب نواز، میں شاید اس انسٹرکٹر کے کم پڑھانے کو یا خراب پڑھانے کو برداشت کرلیتا لیکن اس کے دیر سے "وہ بھی چھپ کر آنے کو میں برداشت نہ کرسکا۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ شخص کیریر میں بہت خوار ہوا لیکن یہ اس کا اپنا قصور تھا۔ بے شک کوئی استاد کم پڑھائے یا خراب پڑھائے لیکن طلبہ کے کردار پر تو منفی اثر نہ ڈالے۔ اس کو میں برداشت نہیں کرسکتا" نا اہل مخلص کو وہ برداشت کر لیتے لیکن جھوٹے اور بد دیانت کی ان کی دنیا میں جگہ نہیں تھی۔

—— بریگیڈئر منیا ناحمد ستارۂ جرأت[1]

کالج میں رفیق صاحب کے دور سیادت پر ایک جملے میں تبصرہ کروں تو یہ ہوگا کہ ان کی نظر ہمارے مستقبل پر تھی۔ ہم حال مست تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑا سمجھتے تھے، اور محدود تعلیمی مقاصد سے آگے ہماری نظر نہیں تھی۔ انہوں نے ہمیں بلند تر تعلیمی اور تربیتی مقاصد اور منزل کا شعور دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے حصول کے لیے ضروری سسٹم بھی وضع کیا اور اسے بڑی تندہی اور جانفشانی سے چلایا۔ جو صفات و کردار وہ طلبہ میں پیدا کرنا چاہتے تھے ان کے لیے ضروری تکنیک وضع کرنا ان کا سب سے اہم کارنامہ ہے مثلاً انہیں خود اعتمادی پیدا کرنی تھی۔ دنیا کا سامنا کرنا سکھانا تھا۔ اس کے لیے سٹیج پر آنا لازمی ٹھہرا۔ اس کالج کی تاریخ میں یہ شاید پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ ہر ہاؤس نے ورائٹی شو کیا ہو ہر لڑکا سٹیج پر آیا ہو۔ جس تواتر سے مباحثے۔ خطابتی مقابلے، ڈرامے برینس ٹرسٹ اور توسیعی لیکچر ان کے زمانے میں ہوئے ان کی مثال ملنا مشکل ہے، آداب مجلس اور آداب میس کے لیے انہوں نے صرف ایک بروشر ہی نہیں چھپوا کر دیا بلکہ اس تواتر

---

[1] کالج نمبر ۲۱۲۴

اور اہتمام سے ڈنر نائٹس کروائیں کہ پھر وہ لڑکے کسی محفل میں، کسی مجلس میں یا کسی میس میں کسی عنوان سے پیچھے نہ رہے اسی طرح آؤٹ ڈور سرگرمیوں کو جتنا اس زمانے میں فروغ ہوا۔ وہ اپنی ایک انتہا ہے، منگلا، ہیڈ رسول، جگو ہیڈ، کھبوڑہ، گجرات، لاہور پورا پورا کالج جاتا تھا۔ ان تمام موقعوں پر وہ بذات خود موجود ہوتے تھے اور ڈسپلن کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ لڑکوں کو اس عمر میں معلومات سے زیادہ شوق آگہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے جنکے حوالے سے وہ زندگی کی بنیادی قدروں کو پہچان سکیں یہ کام رفیق صاحب اور ان کے رفقا نے کیا میری طرح بہت سے طلبا نے آرمی افسر کی امیج کرنل رفیق سے لی ہوگی انسان کی انتہا یہ ہے کہ وہ حوالہ بن جائے۔ رفیق صاحب کو یہ مقام حاصل تھا۔

—— محمد اعظم[1]

دسمبر ۵۲ء میں سرمائی تعطیلات شروع ہونے کا وقت آیا تو سب لڑکے جیسے گھڑیاں گن رہے تھے۔ جوں ہی آخری گھنٹی بجی، سب بھاگے بہتوں نے دوپہر کا کھانا ہی نہیں کھایا۔ دیکھتے دیکھتے ہاؤس خالی ہو گیا۔ میرے اکاؤنٹ میں بیلنس نہیں تھا اس لیے خالی ہاتھ رابرٹس ہاؤس کے سامنے شریں کے اونچے درخت کے نیچے اکیلا تھا رفیق صاحب نے وہاں مجھے اس طرح تنہا و اداس کھڑے دیکھا تو مجھے آواز دی۔ اعظم ادھر آؤ۔ کیا بات ہے۔ مجھے بتانا پڑا کہ یہ قصہ ہے۔ صرف اتنی سی بات ہے وہ مجھے اپنے بنگلہ پر لے گئے اپنے اردلی سردار کو میرے ساتھ کیا جس نے میرپور کا ٹکٹ لے کر میرے حوالے کیا اور خرچ کے لیے مزید رقم بھی دی۔ جب بس چلنے لگی تو اس نے یہ بھی بتایا کہ کرنل صاحب نے کہا ہے خیریت سے گھر پہنچنے کی اطلاع دینا۔

باکسنگ کے چیف ریفری کرنل صاحب خود بنتے تھے اور باکسرز کی ایک ایک مومنٹ پر نظر رکھتے تھے۔ باکس آن کہتے وقت جس طرح وہ شیر کی طرح دھاڑتے تھے اس سے میرے دل میں بھی جوش کی آگ لگ جاتی تھی مجھے یقین ہے کہ رفیق صاحب

---

[1] کالج نمبر ۲۱۱۸ زمانہ تعلیم ۵۸-۱۹۵۲ اے وی پی یو بی ایل

کی باکس آن کی دھاڑ نے بہتوں کو باکسنگ رنگ میں ہی نہیں، زندگی میں بھی شیر بنا دیا ہو گا۔ کم از کم میرے ساتھ تو یہی ہوا۔

——— میجر جنرل نذر حسین[۱]

طلبہ کو صرف نصابی تعلیم ہی کی نہیں بلندیوں کی ایک امیج کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں ایک آئیڈیل بھی چاہیے جس کے حوالے سے وہ بلندیوں اور عظمتوں کا تصور کر سکیں اور شعوری و لاشعوری طور پر ان بلندیوں اور عظمتوں کی طرف بڑھ سکیں۔

ملٹری کالج جہلم کے لیے یہ کام بریگیڈیئر رفیق نے کیا۔ ان کی امیج نے طلبہ کی کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ اگر میں کہوں کہ وہ میری طرح بے شمار دوسرے طلبہ کے آئیڈیل تھے تو غلط نہ ہو گا۔ ان کی مسحور کن شخصیت پورے کالج پر چھائی ہوئی تھی۔ ان کی غیر معمولی شخصیت کے ظاہری پہلو ہی کو لیجیے۔ ان کی سیاہ آنکھوں میں مقناطیسی کشش تھی کشادہ پیشانی چہرے کے تیکھے نقوش چوڑا سینہ، ان کو دیکھ کر قوت اور صلابت کا احساس ہوتا تھا بھوڑا سا جھٹکے کے ساتھ چلتے تھے۔ چلنے کا یہ انداز بھی ان کی پُرجلال شخصیت کا ایک حصہ بن گیا تھا ان کی جسمانی تاب و توانائی، قوت برداشت، صبح سے شام تک ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہونے کی طاقت اور عادت ہمارے لیے حیران کن تھی۔ ملٹری کالج کے طلبہ کے لیے جن میں سے بیشتر کو آگے چل کر فوج ہی میں اہم خدمات انجام دینی تھیں ایسے کمانڈنٹ کا ہونا از حد ضروری تھا۔ جو اونچے سے اونچے فوجی افسر کے معیار پر پورا اترتا ہو اور جو ظاہری اعتبار سے بھی امپریس کرے۔

یہ تو ان کا ظاہری پہلو تھا اب ان کے دل و دماغ کی طرف آئیے۔ قیام پاکستان تک ملٹری کالج ایک سیکیولر ادارہ تھا۔ اس میں قوم پرستی کی کوئی جگہ نہیں تھی (ہو ہی نہیں سکتی تھی) رفیق صاحب نے طلبہ میں پاکستانی قومیت کا شعور شعوری طور پہ پیدا کیا۔ یہ ان کے فلسفہ تعلیم اور طریق تربیت کا ایک بنیادی تصور تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ سکین ہاؤس اور برڈووڈ ہاؤس میں جو جونیئر ہاؤس تھے گھنٹوں اس موضوع پر باتیں کرتے تھے اور

---

[۱] کالج نمبر ۱۳۳، ۲

بڑے جوش وجذبے سے کرتے تھے نیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے ، یا میں بھی پاکستان ہوں تو بھی پاکستان ہے ۔ اس طرح کے نغمے تو اب سننے میں آئے ہیں۔ یہ احساس انہوں نے ہمیں تیس برس پہلے ملٹری کالج میں دیا تھا۔ یہ ان کی بصیرت تھی۔ ان کی یہ اپروچ پاکستان کے عملی طور بہت کام آئی۔ ستمبر اور دسمبر کی جنگوں میں ان کے طلبہ کی کارکردگی میں ان کی تربیت کے اثر کو صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ اور اب ان کے بہت سے شاگرد بہت سے اہم منصبوں پر فائز ہیں اور ایک خاص سوچ کردار اور طریق کار رکھتے ہیں۔ اس کا کریڈٹ بھی بالواسطہ طور پر انہیں کو جاتا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ پہلے ایک ہاؤس پریفیکٹ کی حیثیت سے اور پھر کالج کی مجلس مباحثہ کے نائب صدر کی حیثیت سے ان کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور ان سے بہت کچھ سیکھا جو آج کام کر رہا ہے۔

ڈسپلن میں ان کے معیار بہت سخت تھے۔ ایک واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ ایک ڈبیٹ تھی۔ میں وائس پریذیڈنٹ کی حیثیت سے صدارت کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لڑکے سونے لگے ہیں۔ میں نے معمول کے مطابق ان کو تنبیہ کی اور یاد دلایا کہ ہال کے آداب کا تقاضا کیا ہے۔ غالباً اس لیے کہ ڈبیٹ انگریزی میں تھی اور بہت دیر ہو گئی تھی کچھ لڑکے پھر اونگھ گئے۔ حسب دستور بریگیڈیئر رفیق کی نظر ان پر تھی۔ ڈبیٹ کے بعد وہ لڑکے فالن کر لیے گئے۔ پہلے تو خاصی دیر انہیں کھڑا رکھا گیا پھر حکم ملا کہ سب خطاکار صبح سویرے پانچ بجے پی ٹی گراؤنڈ میں حاضر ہوں۔ دوسرے روز اتوار تھا۔ (اس زمانے میں ہفتہ وار چھٹی اتوار کو ہوتی تھی) جب لڑکے صبح سویرے گراؤنڈ پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ رفیق صاحب بھی پی ٹی کٹ میں وہاں موجود ہیں اس روز بارش بھی ہوئی۔ وہ اسی بارش میں بھیگتے انہیں ۸ ۹ مائل سٹون تک لے گئے اور واپس لائے آتے جاتے سب سے آگے وہ خود تھے۔

اسی ایک واقعہ کا تجزیہ ان کے طریق قیادت پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ سزا کی دوڑ میں خود بھی شامل ہو کر گویا انہوں نے خود کو بھی سزا دی۔ یہ قیادت کے اس کلاسیکی

اصول کی طرف اشارہ تھا۔ کہ زیر تیاذنوں کی ناکامی سے قائد کو بالکل بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

دوسرا پہلو غالباً یہ تھا کہ ناپختہ ذہن اس سزا کو کوئی فضول تادیبی کارروائی نہ سمجھیں بلکہ کردار کی تربیت کا ایک ذریعہ جانیں۔

—— سید زمان خان[1]

۱۹۵۷ء کی بات ہے یوم جمہوریہ ۲۳ مارچ کی تقریب پر کالج ہال میں تقریریں ہو رہی تھیں۔ چند مقررین نے جن میں ایک استاد بھی شامل تھے۔ سیاست دانوں کو بہت سخت سست کہا۔ چونکہ انہی دنوں مشرقی پاکستان اسمبلی کے اندر ایک ہنگامہ میں اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر صاحب ہلاک ہو گئے تھے کرنل رفیق نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا ادارہ اور افراد میں فرق کرنا چاہیے۔ سیاست کاری کے ادارہ کو Sweeping انداز میں کنڈم کرنا صحیح ذہنی رویہ نہیں بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ ان کی نظر کہاں تھی۔

ایک بار گرمیوں میں ہمارا سکیبن ہاؤس ۴۴۰ کے ٹریک میں ایتھلیٹکس کی پریکٹس کر رہا تھا لڑکے پسینے میں شرابور تھے۔ دیر تک کھڑے اپنی عقابی نظروں سے ہمیں دیکھتے رہے جب کھیل کا وقت ختم ہوا تو سارے ہاؤس کو اکٹھا کیا اور بتایا کہ گرمیوں میں آنکھوں میں گرد اور پسینہ جانے کا امکان رہتا ہے اس کے مضر اثرات سے بچنے کے لیے آنکھوں کو واش کرنا چاہیے پھر انہوں نے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ کا پیالہ بنا کر آنکھوں کو واش کرنے کا طریقہ بھی بتایا اس طرح کی بے شمار باتیں تھیں جو وہ ہمیں دن رات بتاتے رہتے تھے بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں ہماری تربیت سے کتنی دلچسپی تھی۔ اپنی باتوں کو دیکھ کر زندگی کی طرف ہمارے اپنے رویے مرتب ہوئے آج پاکستان کو سب سے زیادہ ضرورت کرنل رفیق ایسے انسانوں کی ہے۔

---

[1] کالج نمبر ۲۱۳۹ زمانہ تعلیم ۶۱-۱۹۵۲ء

۔۔۔۔۔۔۔ تنویر حسین شاہ[1]

غالب کا ایک شعر ہے۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

بعض اوقات لفظوں کا انتخاب اور ان کے ادا کرنے کا لب و لہجہ دل کے معاملے اور ذہن کی سوچ کو ظاہر کر دیتا ہے۔ بریگیڈئر رفیق کے ذہن کی سوچ اور دل کے جذبے کا اندازہ اس فقرے سے ہو سکتا ہے کہ جو دسمبر ۱۹۵۸ء کی سردیوں میں پی ٹی کے وقت انہوں نے مجھے انتہائی غصہ میں کہا۔ اور وہ فقرہ یہ تھا "مائی بلڈی فٹ، یو آر اے مسلم سولجر" پس منظر اس فقرہ کا یہ ہے کہ اس صبح شاید معمول سے کچھ زیادہ ہی سردی تھی یا مجھے ہی لگ رہی تھی بہر حال ۴۰۰ ٹریک پر دوڑتے ہوئے میں نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی بغلوں کے نیچے دبائے ہوئے تھے تاکہ سردی کچھ کم لگے۔ مجھے اس طرح دیکھا تو برس پڑے "مائی بلڈ فٹ۔ یو آر اے مسلم سولجر"

برسہا برس کے بعد جب میں خود کھاریاں میں ایک مشنری سکول کا پرنسپل تھا اور وہ لارنس کالج گھوڑا گلی کے پرنسپل تھے تو اس زمانے میں ان سے جو ملاقاتیں ہوئیں ان سے اندازہ ہوا کہ ان کی نظر بلندیوں پر تھی۔ وہ ایک مسلم نشاۃ ثانیہ کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ملٹری کالج اور گھوڑا گلی کی پرنسپلی ایک عظیم تر مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ تھی۔ ہر وژنری (خواب دیکھنے والا) آئیڈیلسٹ اپنے زمانے سے آگے اور اپنے اردگرد کے افراد سے مختلف ہوتا ہے۔ یہی صورت ان کے ساتھ بھی تھی۔ ان کی کبھی کبھی کی بے صبری (Impatience) بھی اپنے خوابوں، اپنے مشن سے اتنی وابستگی Commitment کی وجہ سے تھی۔

۔۔۔۔۔۔۔ میجر اختر حسین[2]

بریگیڈئر رفیق جیسے آدمی دنیا میں نہیں کتابوں میں ملتے ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مہربان دیو کسی دیومالائی کہانی کے اوراق سے نکل کر ہمارے سامنے آگیا ہے وہ جہاں ہوتے، وہ جگہ وہ فضا ایک پُراسرار کہربائی قوت سے معمور ہو جاتی تھی۔ اگر براہِ راست

---

[1] کالج نمبر ۸۵۸ [2] کالج نمبر ۱۶۲۳

ہمکلام نہ بھی ہوتے تب بھی محسوس یہی ہوتا کہ جیسے روئے سخن ہماری طرف ہے۔ ان کی شخصیت کی تحریکی قوت کچھ ایسی تھی کہ وہ لوگ بھی جو میری طرح ان کے بہت قریب نہیں تھے، وہ بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور نئے افقوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہونے کی امنگ اور ترنگ محسوس کرتے تھے۔ دل چاہتا تھا کہ اندھیروں سے روشنی میں آئیں اور تیشہ لے کر کوئی جوئے شیر نکالنے کے لیے نکل جائیں۔

——— بریگیڈیر عبدالرزاق تمغۂ امتیاز[۵]

یہ واقعہ ۱۹۵۶ء کی گرمیوں کا ہے۔ سٹریٹ نائٹ موری (یو ایس آئی سروس فیچر) کے لیے مجھے دیر ہو رہی تھی۔ میں بس سے نکل کر بھاگا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا مولی ہال کے قریب بہت کم روشنی تھی۔ پھر بھی مجھے کسی نے ٹوکا۔ آستین نیچی کرو۔ (ملیریا پری کاشن کا موسم تھا) میں نے کہا سر آستین بہت لمبی ہے۔ جواباً کرنل رفیق نے میری آواز کو پہچان کر کہا۔ ? Is it Razzaq اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو کس حد تک جانتے تھے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر[۶]

ملٹری کالج میں ایک سے ایک آفتاب و ماہتاب استاد رہا ہے ۔۔۔ حیدری صاحب، بلگرامی صاحب، مظہر صاحب، شمسی صاحب، قاضی صاحب، علوی صاحب، مولانا محمد حسن صاحب، یہ لوگ کرنل رفیق سے پہلے اور بعد میں بھی رہے لیکن ان سے جو تخلیقی و ترببیتی کام انہوں نے لیا، اس کی نظیر نہیں ملتی اور جو لڑکوں پر امپیکٹ تھا اس کا تو کہنا ہی کیا مثلاً ۱۹۵۸ء اور ۱۹۵۹ء میں انہوں نے روزوں کے ساتھ تراویح پڑھنا بھی شروع کیں تو اس کا بڑا امپیکٹ ہوا۔ وہ چین سموکر تھے۔ جب لڑکوں نے دیکھا کہ وہ پھر بھی روزے رکھ رہے ہیں تو سرفراز اور اختر ایسے لڑکے جو کسی طور پر سموکنگ نہیں چھوڑتے تھے، انہوں نے سگریٹ چھوڑ دیا۔ سردیوں میں انہیں ٹی شرٹ میں دیکھ کر ہمیں ٹھنڈ کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہماری تربیت کے سلسلے میں کن نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے تھے، اس کا اندازہ اس امر سے

---

[۵] کالج نمبر ۱۹۸۶ء [۶] کالج نمبر ۱۹۹۶ء

ہو سکتا ہے کہ پریپ میں جو اساتذہ ڈیوٹی پر ہوتے تھے ان سے کہا گیا تھا کہ وہ پریپ ڈیوٹی پر کینوس شوز پہن کر آئیں تاکہ برآمدہ میں یا کلاس میں چلنے پھرنے سے طلبہ ڈسٹرب نہ ہوں۔

——— میجر محمد تسلیم[1]

ان کی قوتِ برداشت اور قوت کار بھی حیرت انگیز تھی۔ اس سے ہمیں حوصلہ ہوتا تھا۔ سردیوں میں ہم جرسی میں ہوتے لیکن وہ اسی طرح بند گلے کی سفید ٹی شرٹ میں نظر آتے۔ یہ غالباً ۱۹۵۸ء کے رمضان کا قصہ ہے کہ وہ سکین ہاؤس (جو جونیئر ہاؤس تھا) افطار کے وقت آئے اور سحری کر کے گئے۔ وہ جونیئر ہاؤسوں کو بہت وقت دیتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ بچوں کی رہنمائی اور ہمت افزائی کی جائے۔ میرا خیال ہے کہ ان سے سب سے زیادہ استفادہ اس دور کے جونیئر طلبہ ہی نے کیا۔

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد زمان[2]

یہ واقعہ ۱۹۵۵ء کے اواخر کا ہے کالج میں انہیں آئے تھوڑا عرصہ گزرا تھا۔ ہر چند کہ انہوں نے جونیئرز کو کچھ نہیں کہا تھا ابھی سینیئرز ہی کی جھاڑ پونچھ ہو رہی تھی لیکن ڈرے ہوئے ہم بھی تھے کہ وہ ہاؤس میں چکر لگاتے ہوئے میری نمبر دو سیکشن میں بھی آ گئے اس وقت میں بوٹوں پر پالش کر رہا تھا۔ انہوں نے برش اور پالش میرے ہاتھ سے لے لیا اور کہا میں تمہیں پالش کرنا سکھاتا ہوں۔ پھر انہوں نے تھوڑا سا پانی منگوایا۔ مجھے یاد ہے کہ میں پالش کی ڈبیہ کے ڈھکن ہی میں پانی لایا تھا انہوں نے سیکشن کے باقی لڑکوں کو بھی جمع کر لیا اور سب کے سامنے ڈیمانسٹریٹ کیا کہ بوٹ پر پالش کیسے کیا جاتا ہے اور بوٹ چمکانے کی ترکیب کیا ہے۔ واقعی جب بوٹوں میں چہرہ نظر آنے لگا تو انہوں نے بوٹوں کو چھوڑا۔ ہم سب لڑکے ان کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے یہ ڈیمانسٹریشن دیکھتے رہے جیسے کوئی تماشا ہو رہا ہو۔

میری دوسری یاد سردیوں کی پی ٹی کے بارے میں ہے ہم نے درخواست کی کہ ہمیں نیکر کے بجائے پینٹ پہننے کی اجازت دی جائے۔ دوسرے روز ہم نے دیکھا کہ ان کا بیٹا

---

[1] کالج نمبر ۲۲۰۵ [2] کالج نمبر ۲۲۱۸

بھی ان کے ساتھ ہے اور اس نے بھی نیکر اور بنیان پہنی ہوئی ہے وہ عمر میں ہم سے چھوٹا تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ وہ کیا سمجھانا چاہتے ہیں۔

——— رسول خان[۵]

کرنل رفیق صاحب نے کالج کو شوپیس نہیں بنایا لڑکوں میں کسی عنوان سے تمیز نہیں کی۔ سب پر یکساں توجہ دی اور سب کو یکساں مواقع دیئے۔ ان کے دور کی ہر چیز بیس سکیل پر ہوتی تھی سب کے لیے ڈرامے ہو رہے ہیں تو ہر ہاؤس ریہرسل کر رہا ہے۔ تقریریں مذاکرے ہیں تو ان میں بھی سب شریک ہیں۔ باکسنگ ہے تو سب کے لیے۔ پکنک کے لیے سب جا رہے ہیں۔ تعلیمی و مطالعاتی سیر و سفر ہے تو سب شریک ہیں۔ اس دور کے اولڈ بوائز کو یاد ہوگا کہ منگلا فورٹ، رسول ہیڈ ورکس، کھیوڑہ، لاہور گیا تھا تو سارا کالج گیا تھا۔

اس پالیسی کا نتیجہ یہ کہ کسی کو احساس محرومی نہیں ہوا اور سب کی صلاحیتیں چمک اٹھیں۔ ان کے دور میں مجھ ایسے بیک بنچرز Back Benchers کو بھی توجہ ملی اور مواقع ملے اور میرا خیال ہے کہ یہی وہ خاموش اکثریت تھی جس نے رفیق صاحب کے طرز تربیت سے سب سے زیادہ استفادہ کیا۔

دوسری بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ان کے یہاں کوئی مراعات یافتہ طبقہ نہیں تھا تو سزا کے وقت بھی کسی کی رعایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سکین ہاؤس کی آنرشاپ پر چوری میں جو لڑکا پکڑا گیا تھا، اس کی جرنیلی بیک گراؤنڈ کے باوجود رفیق صاحب نے اسے کالج سے نکال کے چھوڑا۔ انصاف کے تقاضے جس طرح انھوں نے پورے کیے ہیں نے اس کی ایسی مثال کہیں اور نہیں دیکھی۔ ان کے بعض فیصلے بہت سخت بھی نظر آتے تھے مثلاً آکنلک ہاؤس کے فاروق یا غلام احمد باکسر کا نکالا جانا۔ لیکن یہ بھی اصولی بات تھی۔ وہ ملک و قوم کے مفاد کو فرد کے مفاد پر قربان نہیں کرتے تھے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد اسحاق[۶]

میں کالج میں ۱۹۵۴ء میں پانچویں درجے میں داخل ہوا تھا۔ نومبر ۱۹۵۵ء میں کرنل رفیق

---

۵ کالج نمبر ۲۲۳۲، ۶ کالج نمبر ۲۲۴۴

کے آنے تک سال ڈیڑھ وہ تکلیف وہ دور بھی دیکھا جب ڈسپلن نام کی کوئی چیز کالج میں باقی نہیں رہ گئی تھی اور ہم جونیئرز خاص طور سے عدم تحفظ کے احساس کا شکار تھے۔ کرنل رفیق کے آتے ہی ہم نے سکھ کا سانس لیا جو نیئرز پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ بڑے لڑکے تو خیر ان سے کانپتے تھے۔ جونیئرز ان سے شوخیاں کرنے سے بھی باز نہیں آتے تھے مثلاً میں بھی ان چند چھوٹے لڑکوں میں سے ایک تھا جو کبھی کبھی صبح پی ٹی کے وقت جب وہ سکین ہاؤس کے سامنے سے گزرتے ہوتے تو اچک کر ان کی سائیکل کے پیچھے بیٹھ جاتے۔

وہ بھی جونیئر ہاؤسوں ــــ بروڈوڈ ہاؤس اور سکین ہاؤس۔ پر بہت مہربان تھے۔ رات کے پریپ کے بعد وہ اکثر ہمارے ہاؤس میں آتے تھے اور دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ ان کا باربار آنا بھی ہماری تربیت کا ایک بہانہ تھا۔ ہم ان سے فرمائش کرتے "سر، مسلز دکھائیں" وہ فوراً اپنے بازوؤں کے مسلز کے کرتب دکھاتے۔ کوئی کہتا سر ملائی گانا سنائیں۔ وہ اس کی فرمائش بھی پوری کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روز ایک شوخ گول مٹول لڑکے نے کہا۔ سر، مجھ سے پنجہ لڑائیں۔

چنانچہ فوراً سٹول بیچ میں رکھ دیا گیا۔ اور جناب وہ رفیق صاحب جن کے جلال کی بڑی دھوم تھی، اس کی فرمائش پوری کرنے لگے وہ ایک مہربان لیکن باشعور دیو کی طرح تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تربیت سے جتنا استفادہ ہم اس وقت کے جونیئرز نے کیا کسی اور نے نہیں کیا۔

کرنل رفیق کا دور کالج میں انقلابی تبدیلیوں کا دور تھا۔ آنر سسٹم تھا۔ آنر کورٹس تھیں، ہر ہاؤس کی اپنی ٹائی تھی۔ ہر ہفتہ باقاعدہ ڈنر نائٹ ہوتی تھی۔ جس میں ڈنر نائٹ کے پورے تکلفات برتے جاتے تھے اور کھانا کھانے کی مروجہ آداب سکھائے جاتے تھے ڈنر کے بعد ہر ہاؤس میں ورائٹی پروگرام ہوتا تھا جس میں دوسرے سٹاف کو بھی بلایا جاتا تھا۔

ہم نصابی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ تقریباً ہر ہفتے کوئی نہ کوئی انٹر ہاؤس

فنکشن ہونا تھا۔ سکین ہاؤس کے ۲۱۳۹ سلیم اختر، ۲۴۳۳ ممتاز اختر اور ۲۱۸۰ افتخار جعفر، سینئر ہاؤسوں کو مات دیا کرتے تھے۔ محمد حسن صاحب نے ایک بار "ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ" نامی نظم کالج ہال میں سنائی تھی۔ بعد کو اس سلسلہ کی دوسری نظمیں بھی سنائیں اور میرا نام ہی ٹوٹ بٹوٹ پڑ گیا تھا۔

مولوی محمد حسن صاحب کا ذکر آ گیا ہے تو یہ بتاتا چلوں کہ یہ بزرگ صورت اور نیک سیرت استاد زندہ دل اور چاق و چوبند تھے۔ ہمارے ساتھ ہر پکنک پر جاتے تھے۔ غالباً ۱۹۵۷ء میں منگلہ فورٹ پر جب پکنک کے لیے گئے تھے تو انہوں نے منگلہ پر ایک نظم برجستہ کہہ کر سنائی تھی۔

اس زمانے کے شب و روز کو اب اس عمر اور اس عہدے پر آ کر یاد کرتا ہوں تو یہ احساس ابھرتا ہے کہ کرنل رفیق کا سب سے بڑا کنٹری بیوشن یہ ہے کہ انہوں نے کالج کی ایک پوری نسل کو اخلاقی قدروں اور پاکستانیت کا شعور دیا۔ خصوصیت سے اس دور کا ملٹری کالج کا کوئی اولڈ بوائے ایسا نہ ہوگا جو پاکستان سے شدید جذباتی تعلق نہ رکھتا ہو۔ اس رویہ کے بیج انہی نے ہمارے اندر بوئے تھے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل عبد الجلیل ای ایم ای

۱۹۵۷ء میں پورے کالج نے ہیڈ رسول پر دو روزہ کیمپ کیا تھا جب ٹرک آئے تو انہوں نے کہا کوئی والنٹیئر ہے جو ہیڈ رسول تک پیدل جانا چاہے۔ سینئر کیڈٹس میں سے پانچ چھ نکلے۔ اچھے خاصے تگڑے تھے۔ جونیئرز میں سے میں اور ۲۲۶۰ محمد یٰسین سامنے آئے ہم دونوں دبلے پتلے دھان پان چھوٹے قد کے تھے انہیں بڑی حیرانی ہوئی بولے۔ بیس میل کا معاملہ ہے بولو۔ کیا کہتے ہو؟ کر لو گے۔ میں نے کہا جی ہاں کوشش تو ضرور کریں گے۔ کہا "گو اہیڈ"۔ انہوں نے کوئی آدھ گھنٹہ پہلے چلا دیا۔ ابھی چار پانچ میل ہی گئے تھے کہ ان کی جیپ آ گئے تُو کی جلیل، یٰسین تھک گئے ہو تو جیپ میں آ جاؤ۔ لوسر! ہم دونوں نے بیک وقت کہا "دبٹس" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ اسی طرح انہوں نے ہیڈ رسول تک ہم پر نظر رکھی اور کئی بار پوچھا۔

یہ انکا طریق تربیت تھا۔ پہلے چیلنج پیدا کرتے تھے پھر دیکھتے تھے کہ اسے کون قبول کرتا ہے اور کیسے قبول کرتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ چھٹی حس کے مالک تھے جب بھی کوئی غلط کام کی کوشش کی لازمی طور پر پکڑے گئے اتھلیٹک گراؤنڈ میں صبح کی پی ٹی ہوتی تھی ایک بار میں ہاؤس سے پیچھے رہ گیا یعنی کوئی منٹ آدھ منٹ لیٹ ہوا ہوں گا۔ جوں ہی وہ پیچھے سے سائیکل پر آئے میں سنبھلنے کی جھاڑی کے پیچھے ہو گیا۔ چھوٹا سا تو تھا میرا خیال تھا کہ بڑی ہوشیاری سے اپنے آپ کو چھپا لیا ہے جوں ہی وہ آگے نکلے میں چپکے سے جا کر ہاؤس میں شامل ہو جاؤں گا۔ مگر ہوا یہ کہ میں ابھی اچھی طرح چھپا بھی نہیں تھا کہ انہوں نے پکارا "رن اپ جلیل میک ہیسٹ" میں اب تک حیران ہوں کہ انہوں نے مجھے پہچانا کیسے۔ غالباً ہیر لے سے اندازہ لگا لیا کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔ آپ اس چھوٹے سے واقعے سے اندازہ لگائیں کہ انہیں اپنے طلبہ سے کتنا تعلق تھا۔ یہ تعلق صرف فرض کا نہیں۔ ایک مشن کا تعلق تھا۔ حواس ان ہی چیزوں کے بارے میں تیز ہو جاتے ہیں جن میں ہماری گہری دلچسپی ہو۔

—— لیفٹیننٹ کرنل منیر احمد افضل انجینئر[۵۰]

یہ واقعہ اواخر نومبر ۱۹۵۵ء کا ہے میں جونیئر ہاؤس سکین ہاؤس کی دوسری ڈارم میں تھا کہ رات کو یکایک آنکھ کھلی تو دیکھا کہ کمانڈنٹ کرنل رفیق ایک لڑکے کا کمبل جو سوتے میں گر گیا تھا، آہستہ سے ٹھیک کر رہے ہیں پھر انہوں نے کھڑکی کا آدھا پٹ بند کر دیا اور پھر لائٹ آف کر کے دبے پاؤں چلے گئے۔

رفیق صاحب نے آ کر جہاں بہت سے اقدامات کیے تھے ان میں سے ایک پندرہ روزہ اخبار نیوز اینڈ ویوز کا اجرا بھی تھا جس کے اردو سیکشن اخبار و افکار کا میں ایڈیٹر اور راشد صاحب نگران تھے مجھے یاد ہے کہ کالج میں ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستان کا پہلا یوم جمہوریہ حقیقی جوش اور ولولے سے منایا گیا تھا اس موقع پر نیوز اینڈ ویوز کا ایک خصوصی نمبر نکالا گیا تھا۔ جس میں منجملہ اور چیزوں کے مولوی محمد حسن صاحب کی نظم ہمارا آئین بھی شامل ہوئی تھی مجھے یاد ہے کہ اس کے سرورق اور دوسرے صفحات کا سٹینسل میں نے خود کاٹا تھا۔ اس وقت اردو ٹائپ نہیں آیا تھا۔

۱۹۵۶ء ہی کی گرمیوں کا ایک واقعہ ہے یہ اس زمانے کی بات ہے جب آک ہاؤس ابھی گرایا نہیں گیا تھا اور میں سکین ہاؤس سے آکنلک ہاؤس میں منتقل ہو گیا تھا

۵۰ کالج نمبر ۲۲۶۲

مجھے یاد ہے کہ نماز تراویح کے بعد وہ ہمیں مسجد کے باہر پرلانے پاور ہاؤس کے سامنے کی سڑک
پر ملے وہاں سے ہمارے ساتھ آکنلک ہاؤس تک آ گئے پھر وہاں صحن میں کھڑے کھڑے
باتیں شروع کر دیں۔ موضوع یاد نہیں رہا۔ ان کی باتیں پاکستان اور کردار کے حوالے سے
ہوتی تھیں۔ اسی طرح رات کا ڈیڑھ بج گیا کہ ان کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا ان کا اردلی سگریٹ
کا پیکٹ ہاتھ میں لیے آ پہنچا یہ بات ہم نے اس وقت بھی نوٹ کی تھی کہ دیکھو ان کا اردلی
کتنا وفادار ہے۔ زیر دستوں کی اس طرح کی وفاداری بے وجہ نہیں ہوتی۔

شروع شروع میں ہمیں حیرت ہوتی تھی کہ وہ ہر لڑکے کے بارے میں اتنی زیادہ
باتیں کیسے جانتے ہیں۔ انٹرویو تو خیر انہوں نے سب سے کیا تھا پھر بھی سینکڑوں لڑکوں
کے کوائف یاد رکھنا کون سا آسان کام ہے۔ بعد کو پتہ چلا کہ دفتر اور گھر میں ہر لڑکے
کا فوٹو لگا رکھا ہے۔ پھر خفیہ خبر ملی کہ ایک ڈائری ہے جس میں ہر لڑکے کا ایک صفحہ ہے
اس طرح کے میکانکی انتظامات خواہ کتنے بھی ہوں، اس سے بات نہیں بنتی۔ اصل
چیز جواب میں سمجھتا ہوں یہ تھی کہ یہ سب پاکستان سے عشق کا کرشمہ تھا وہ پاکستان کے
حوالے سے ہر لڑکے سے ایک گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ اسی لگاؤ کی وجہ سے وہ ہر ایک کو اتنا زیادہ
جانتے تھے۔

انہوں نے سارے کالج کو دو تین دنوں کے لیے کھیوڑہ، منگلا، رسول ہیڈ وغیرہ پر
پکنک کے لیے کیمپ کرانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس سے ہمیں بہت مفید عملی
تربیت ملی۔ رسول ہیڈ پر اپنا ٹینٹ انہوں نے خود نصب کیا۔ پھر کیا تھا ان کو دیکھ کر
ہم سب بھی لگ گئے۔

ان کی تربیت ہمہ گیر تھی انہوں نے گڈسمینز پر سولہ صفحے سائیکلو سٹائل کروا کے سب
کو دیئے تھے اور ایک دن کالج ہال میں کئی گھنٹے لگا کر انہوں نے چھپے ہوئے اوراق کی غلطیوں
کی اصلاح کی اور مندرجات کی وضاحت کی ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے تھک گئے لیکن وہ
گھنٹوں کھڑے کھڑے اور بول بول کر نہیں تھکے۔ ان کی قوت کار اور قوت برداشت ہمارے
لیے مستقل طور پر حیرت کا باعث بنتی تھی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہم آئندہ زندگی میں جب

کبھی زیادہ دیر تک اور تھکا دینے والا کام کرنا پڑا۔ رفیق صاحب کی مثال سامنے رہی اور کام ناقابل برداشت نہ معلوم ہوا۔

ان کی نظر بہت دور تک ہمارے مستقبل پر تھی۔ غالباً اسی لیے انہوں نے ہمیں ایک انگریزی فلم ڈیوک آف ویسٹ پوائنٹ دکھائی تھی۔ یہ امریکی ملٹری اکیڈمی ویسٹ پوائنٹ کے شب و روز کی داستان تھی اس میں کونٹری کی سزا اور آنر سسٹم کا تذکرہ بھی تھا۔ یہ دونوں چیزیں ذرا مختلف شکل میں یہاں بھی رائج کی تھیں۔ جب ہم پاکستان کی ملٹری اکیڈمی میں گئے تو ہمیں اکیڈمی کا لائف سٹائل اجنبی معلوم نہیں ہوا اس کو ہم فلم میں دیکھ چکے تھے اور اسکی ایک جھلک خود کالج کے لائف سٹائل میں موجود تھی میں سمجھتا ہوں کہ ایک ماہر تعلیم ہی کی حیثیت سے نہیں ایک ماہر تربیت کے لحاظ سے بھی ان کے طریق کار اور اقدامات اور پروگراموں کا تفصیلی مطالعہ ہمارے تربیتی اداروں کے لیے بہت کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔

——— کیپٹن (نیوی) گل زمان ستارۂ جرأت[1]

میں چند چھوٹی چھوٹی باتیں لکھتا ہوں جن سے پورے آؤٹ لک پر بڑا خوشگوار اثر پڑا۔ مثلاً ڈائننگ ہال میں بنچوں کی جگہ کرسیوں نے لی۔ کٹلری کراکری بدلی۔ ڈنر نائٹ ہونے لگی کھانے پینے کے آداب سکھائے جانے لگے۔ کھانے کا مینو بدلا۔ ہفتے میں ایک دو دن نوس جام بھی ملنے لگا۔ اس وقت شاید ہم ان آراموں اور لذتوں کو ہی اہمیت دیتے ہوں اور یہ اندازہ نہ ہو کہ ان چیزوں سے ہماری سوچ پر بھی دور رس اثرات پڑیں گے اسی طرح مجھے یاد ہے کہ جب غالباً ۵۷ء میں ہم منگلا فورٹ دیکھنے گئے یہ اس وقت کی بات ہے جب منگلا ڈیم بننا شروع نہیں ہوا تھا۔ ٹرک آ کر کھڑے ہوئے اور بیٹھنے کا وقت آیا تو سامنے سے رفیق صاحب اپنی مخصوص چال کے ساتھ نمودار ہوئے اب اندر بیٹھنے کی ڈرل شروع ہوئی بعض لڑکے جوش میں آ کر ٹرک کے دائیں بائیں سے چڑھنے لگے۔ وہ دھاڑے "سٹاپ دیٹ"

——— کیپٹن (نیوی) سکندر حیات ستارۂ جرأت[2]

کالج سے ہم نے بہت کچھ سیکھا لیکن جو سب سے اہم چیز سیکھی اس وقت اس کی اہمیت کا علم نہ تھا۔ مثلاً ایک یہ کہ Organize کیسے کیا جاتا ہے۔ اسکا ڈیمانسٹریشن

---

[1] کالج نمبر ۲۲۹ [2] کالج نمبر ۲۳۱۵

ہم نے ۵۸ء کے ہارس اینڈ کیٹل شو کے موقعہ پر دیکھا۔ پورے کالج کو حرکت میں آنا تھا اس وقت تو ہماری ساری دلچسپی اس تماشہ پر مرکوز تھی اس کا قطعاً علم نہیں تھا کہ تماشا تو گزر جائے گا لیکن اس ٹرپ کو منظم ہوتے دیکھنے کا جو تجربہ ہے وہ عملی زندگی کے بہت سے موقعوں پر کام آئے گا۔ میں کالج میں ۵۹ء - ۵۶ء تک تین برس رہا اور خوش قسمتی سے یہ تینوں سال میں نے کرنل رفیق کے زیر تربیت گزارے اور کسی پروجیکٹ کو عملی صورت دینے کا ڈھنگ میں نے زیادہ تر انہی سے سیکھا۔ اگر میں کہوں کہ میرے ستارۂ جرأت کے پیچھے بھی کرنل رفیق تھے تو ایسا غلط نہ ہو گا۔

—— سلیم اختر کیانی[1]

رفیق صاحب کے زمانے میں رزلٹ بھی سو فیصد رہے۔ ان کے دور میں پنجاب یونیورسٹی کے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان شروع ہوا اور متواتر بہترین رزلٹ آیا۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ تربیت اچھی ہو تو تعلیمی معیار از خود اچھا ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ یہ نصابی نتائج کسے یاد ہیں اور ان کی کیا اہمیت ہے؟ کرنل رفیق نے نصابی نتائج کی ڈفلی کبھی نہیں بجائی۔ وہ جو کام کر رہے تھے اس کے نتائج دنوں میں نہیں برسوں میں اور زندگی کے کارزار میں نکلتے ہیں۔ اور چنانچہ نکلے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے معرکے اس کے گواہ ہیں۔ سول یا فوج ان کا جو شاگرد جہاں ہے وہ ان عظیم انسانی اور اخلاقی قدروں کا تھوڑا بہت اثر ضرور لیے ہوئے ہے جن کی ایک زندہ و تابندہ علامت خود وہ تھے۔ یہ وہ میراث ہے جو وہ ملٹری کالج میں چھوڑ گئے ہیں۔ اب یہ کالج کا کام ہے کہ وہ اس عظیم میراث سے استفادہ کرے۔ اسے مستحکم کرے اور اسے آگے بڑھائے۔

اس زمانے میں کالج کا میوزک سنٹر موجودہ شیر شاہ ہاؤس تھا اور اس کے انچارج ریٹائرڈ حوالدار عنایت تھے۔ براس بینڈ کے سازوں کو اچھا بجا لیتے تھے۔ ایک روز میں میوزک سنٹر گیا تو دیکھا کہ حوالدار صاحب ششدر بیٹھے ہیں۔ کلارنیٹ ان کا محبوب ساز تھا۔ وہ ساتھ رکھا تھا میں نے کہا ماسٹر صاحب خیریت تو ہے۔ کہنے لگے غضب ہو گیا۔ ابھی کرنل صاحب اٹھ کر گئے ہیں۔ میں نے کہا تو کیا ہوا۔ کوئی گڑبڑ ہو گئی۔ وہ بولے نہیں میں

---

[1] کالج نمبر ۲۳۱۹

تو لاعلمی میں مارا گیا۔ نہ جانے نوکری رہے یا جائے۔ میں نے کہا بتایئے تو سہی ایسی بھی کیا بات ہے۔ تو کہا کل کے ڈرامے کے دوران مجھے کلارنیٹ بجانا ہے۔ میں اکیلے میں بیٹھا آنکھیں بند کیے جوانی کے زمانے کی ایک پرانی دھن بجا رہا تھا۔ دیر تک بجاتا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھا کرنل صاحب بیٹھے ہیں۔ میں ایک دم رک گیا۔ کہنے لگے۔ بجایئے بجایئے یہی دھن پھر بجایئے میں نے بجائی نہ جانے وہ کس موڈ میں تھے۔ خلاف معمول بار بار فرمائش کر کے بہت کچھ سنا۔

یہ کہانی سن کر میں نے تبصرہ کیا کہ ماسٹر صاحب اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے یہ تو خوش ہونے کی جا ہے۔ اس پر ماسٹر اللہ دتہ بولے بات یہ ہوئی بجاتے ہوئے میں جب بھی سُر سے اُترا۔ انہوں نے ٹوکا۔ اور پھر بجانے کو کہا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ انہیں تو میوزک کی اچھی خاصی جانچ ہے اس سے پہلے میرا خیال تھا کہ فوجی افسر ہے اسے کیا خبر کہ میوزک کیا ہوتا ہے جس طرح لاپرواہی سے چاہتا بجاتا رہتا۔ اب مجھے بہت ہوشیار رہنا پڑے گا۔ میں نے ہنس کر کہا۔

" گھبرایئے نہیں۔ اب آپ کی قدر بھی زیادہ ہوگی۔ جو جس فن کو جانتا ہے اس کی قدر بھی زیادہ کرتا ہے"۔

وسط اکتوبر ۱۹۵۵ء میں جب وہ دوسری بار کمان لینے آئے تو کرنل ایڈورڈ کمانڈانٹ تھے۔ ان سے فوراً چارج لینے میں کسی تکنیکی وجہ سے دیر تھی۔ انہوں نے چارج لینے سے پہلے کے چند ہفتے کالج کو دیکھنے میں صرف کیے راتوں کو بھیس بدل کر گھومتے تھے اس زمانے میں کالج میں ان ڈسپلن انتہا درجے کا تھا۔ سینئر لڑکوں کی غنڈہ گردی انتہا کو پہنچی تھی مار پیٹ بھاگ دوڑ آئے دن کی واردات تھی۔ بہر حال بہت سے لڑکوں کو انہوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ ان کے کرتوت کیا ہیں جب انہوں نے چارج لیا تو پہلا کام اس غلط عنصر کا کالج سے اخراج تھا۔ گو چھان پھٹک تو بہت ہوئی پھر ایک آدھ کیس ایسا بھی تھا جسے کہہ سکتے ہیں کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گئے ایک ایسے لڑکے سے کچھ دنوں کے بعد ان کے ہاں فریاد کی۔ رفیق صاحب کھلے ذہن کے آدمی تھے۔ وہ

اس لڑکے کی وضاحت سے مطمئن ہو گئے کہ اسے نکالنے میں غلطی ہوئی ہے۔ کہنے لگے تم اچھے سے اچھے کالج میں پڑھو۔ اخراجات میں برداشت کروں گا لیکن یہاں دوبارہ داخلہ ممکن نہیں۔ یہ واقعہ سی آئی میجر ولی اللہ کے سامنے کا ہے۔

——— کرنل اخلاق احمد[1]

یہ قصہ ۱۹۵۷ء کا ہے اتوار کا دن تھا۔ برڈووڈ ہاؤس (غزنوی ہاؤس) کے پیچھے کی گراؤنڈ میں مجھ سمیت کچھ لڑکے ہاکی کھیل رہے تھے چھٹی کے دن کی وجہ سے کوئی کچھ پہنے تھا کوئی کچھ کپڑے بھی رنگ برنگ کے تھے فٹ ویئر میں بھی فرق تھا۔ کوئی چپل پہنے کوئی بوٹ، صرف ایک آدھ ہی کے پاؤں میں پی ٹی شوز تھے جب ہمیں وہ دور سے اپنی مخصوص سائیکل پر آتے نظر آئے تو ہم گھبرائے ہم نئے نئے آئے تھے لیکن اتنا ضرور معلوم تھا کہ کرنل صاحب برابر ٹرن آؤٹ کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ خیال ہوا ضرور ناراض ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سائیکل انہوں نے ٹاہلی کے درخت کے نیچے کھڑی کی اور ہم سے کہا۔ آؤ میں تمہیں ہاکی کھیلنا سکھاؤں۔ انہوں نے ایک دائرہ سا بنایا اور اس پر پتھر رکھے اور ہمیں بتایا کہ اس طرح سٹک ورک کی مشق کرو پھر گیند کو روکنے، ہٹ کرنے وغیرہ کی ترکیب بتاتے رہے جس طرح انہوں نے ہمیں ہاکی کھیلنے کی تکنیک سکھائی اس سے اب میرا خیال ہے کہ وہ ضرور خود کبھی ہاکی کھیلتے رہے ہوں گی۔

——— نثار کیانی[2]

اس زمانے میں پی ٹی برڈووڈ ہاؤس کے پیچھے کے میدان میں ہوتی تھی ایک دن صبح سویرے معمول کے مطابق اپنے ہاؤس رابرٹس ہاؤس سے ڈبل کرتا ہوا نکلا سب سے جونیئر ہونے کی وجہ سے سب سے پیچھے تھا۔ یکایک میں رُکا اور ہاؤس کی دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کے پیشاب کرنے لگا۔ اتنے میں پیچھے سے کرنل رفیق سائیکل پر آ گئے سائیکل روکی۔ میرا تو خوف سے پیشاب بند ہو گیا۔ انہوں نے پوچھا "ہوز دیر" میں نے کہا نثار اتنے عرصے میں انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں "دیٹس ناٹ دی پلیس۔ ناؤ ڈبل اپ" اور پیڈل پر پاؤں رکھ کر آگے بڑھ گئے۔ اور انہوں نے کبھی کوئی

[1] کالج نمبر ۲۳۴۵ [2] کالج نمبر ۲۳۵۳

بازپرس نہیں کی یہ خیال کہ وہ بہت سخت تھے اور بات بات پر سزا دیتے تھے بالکل غلط ہے۔

آخر میں، میں ایک اور واقعہ بھی سنانا چاہتا ہوں۔ مجھے کالج میں داخل ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ مجھے اپنی دادی اماں کے انتقال کی خبر ملی۔ میں ایک دم رونے لگا۔ چھٹی تو انہوں نے مجھے فوراً دے دی۔ اس زمانے میں ہمارے گاؤں بدلوٹ تک سواری کا انتظام بھی غیر یقینی تھا۔ انہوں نے پوچھا کیسے جاؤ گے میں نے کہا بس سٹاپ سے ہمارے گاؤں کے لوگ آتے جاتے ہیں انہوں نے مجھے فوراً جیپ پر بٹھایا اور شہر میں بس سٹینڈ تک چھوڑ آئے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل اعجاز احمد[۱]

بریگیڈیئر رفیق کی ہر بات انفرادیت لیے ہوتی تھی۔ ایک بار بتایا کہ دن کا اخبار اٹھانے سے پہلے میں سگریٹ سلگاتا ہوں اور سگریٹ کی آخری راکھ جھاڑنے سے پہلے اخبار پڑھ کر رکھ دیتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ کرنل رفیق کا خاص کنٹری بیوشن یہ ہے کہ انہوں نے کام اور کردار کا ایسا معیار اپنے طلبہ کے سامنے رکھ دیا کہ وہ کہیں ہوں، زندگی کی کسی منزل میں ہوں، وہ روشنی ان کی رہنمائی کرتی رہتی ہے۔

——— لیفٹیننٹ کرنل اقبال شاہین[۲]

ہفتے کے دن پہلا پیریڈ پنجم الف میں وہ خود لیتے تھے۔ موضوع لیڈرشپ یا کردار ہوتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں ایک ناقابل بیان چمک تھی وہ اس یقین سے بولتے تھے جیسے مستقبل کے قاسموں، طارقوں اور صلاح الدینوں سے مخاطب ہوں وہ خود ایک عظیم کردار ساز تھے اور کردار ان کا خاص موضوع تھا۔

میری طرح ان کے بہت سے طالبعلموں کو وہ واقعہ یاد ہو گا جو انہوں نے اس عظیم اولمپک چیمپئن کے بارے میں سنایا تھا جو دوبار سونے کا تمغہ جیت چکا تھا تیسری بار جب وہ اپنی اولمپک زندگی کی آخری اور سب سے اہم دوڑ دوڑ رہا تھا اور تقریباً جیت چکا تھا کہ اس کا ہاتھ حریف دوڑ باز سے ٹکرایا تو اس نے پیچھے مڑ کر آئی ایم ساری کہا۔ اور دوڑ ہار گیا۔ لیکن یاد ہے کہ اس دن انہوں نے سارے پیریڈ اسی نکتے پر گفتگو کی

[۱] کاکول نمبر ۱۰۵۲۵ [۲] کاکول نمبر ۲۲۶

کہ اس کی ہار میں کتنی بڑی جیت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہی واقعہ کوئی اور سناتا تو اس کا وہ اثر ہرگز نہ ہوتا جو ان کے سنانے سے ہوا۔

آخر میں، میں ایک واقعہ کا ذکر کروں گا جس کا تعلق صرف مجھ سے ہے۔ اس زمانے میں جاڑوں کے پریپ میں رات کو گریٹ کوٹ پہن کر جاتے تھے جس کی لمبی اور گہری جیبیں ریوڑیاں بھرنے کے کام آتی تھیں۔ ایک روز جو ریوڑیاں میں نے کینٹین سے لیں وہ کچھ زیادہ ہی کڑاکے دار تھیں۔ ان کے کڑکنے سے دوستوں کے کان کھڑے ہوئے پھر جو چھینا جھپٹی شروع ہوئی اس سے کلاس کا سکون کچھ ضرورت سے زیادہ تہہ و بالا ہوا۔ اور پھر یکایک خاموشی چھاگئی جب میں نے پلٹ کے دیکھا تو کرنل رفیق صاحب کی خون منجمد کرنے والی نظروں کو اپنے اوپر مرکوز دیکھا (مشہور تھا کہ ہر غلط موقعے پر کرنل صاحب آموجود ہوتے ہیں ایک بار پھر صحیح ثابت ہوا) انھوں نے اشارہ سے باہر آنے کو کہا میں باہر آگیا وہ مجھے اپنے ساتھ دفتر لے گئے سارے رستے کوئی بات نہ ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ فاصلہ اور خاموشی کبھی ختم نہ ہوگی۔ دفتر میں انھوں نے پہلے یہ کہا۔ ریوڑیاں کھاؤ میں ان کی نظروں سے سمجھ گیا کہ ریوڑیاں کھانی ہی پڑیں گی میں نے جیسے تیسے ریوڑیاں کھائیں بلکہ نگلیں۔ پھر میرا نام لے کر کہا شاہین! کلاس کو ڈسٹرب نہیں کیا کرتے اب ان کے منہ سے اپنا نام سن کے مجھے حیرت ہوئی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت اس بات پر کہ آہستہ سے **You can go** کہا اور اپنے کام میں لگ گئے جاتے وقت جو فاصلہ بہت طویل معلوم ہوتا تھا واپسی میں بے انتہا سکڑ چکا تھا۔ جب کلاس میں پہنچا تو سب نے پوچھا کیا ہوا کیا ہوا۔ میں نے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور کتاب اٹھالی۔ اس دن پریپ میں جتنا مزہ آیا اتنا پہلے کبھی نہ آیا تھا۔

—— ضمیر حسین

یہ واقعہ ۱۹۵۸ء کے سالانہ فنکشن کے ڈنر کا ہے۔ یہ ڈنر اس ہال میں ہو رہا تھا جہاں آج کل میوزیم ہے۔ اتفاق سے میں اور ۲۳۱۹ سلیم کیانی سامنے سے گزرے۔ کرنل رفیق

کالج نمبر ۲۳۸۰

کی نظر پڑی تو بلا لیا۔ تم پاکستان کے لیے کیا کرو گے؟" انہوں نے یکایک سوال کر دیا۔ میں چونکہ ان دنوں شاعری کرتا تھا اور ذرا زیادہ جذباتی تھا میرے منہ سے فوراً نکل گیا "سر، میں پاکستان کے لیے جان دے دوں گا۔ نہیں، نہیں۔ پاکستان کے لیے زندہ رہو زندہ اور ہر روز جان دو۔۔۔" پھر جو وہ شروع ہوئے تو کم از کم دس منٹ تک اس موضوع پر بڑے جوش سے بولتے رہے۔

یہ موضوع ان کی رگ و جان تھا۔ رفیق صاحب نے کالج میں بہت ہی اہم تاریخی اقدامات کیے۔ لیکن میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ہمیں پاکستانی ہونے کا شعور دیا۔ اور پاکستان سے تعلق (کمٹ منٹ) کا جذبہ پیدا کیا۔ انہوں نے ملٹری کالج جہلم کو شعوری طور پر ایک قومی ادارہ بنایا۔ پبلک سکولوں کی سپرٹ میں قومیت کا شعور ہے لیکن برصغیر میں انگریزوں نے تعلیم کو قومیت سے بوجوہ دور رکھا تھا۔ اس زمانہ میں دوسرے پاکستانی پبلک سکولوں اور کیڈٹ کالجوں میں انگریز پرنسپلوں کا راج تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ پاکستانیت کو پروان کیا چڑھاتے۔ اس وقت تمام پاکستان میں غالباً ملٹری کالج ہی ایک ایسا ادارہ تھا جس کا پرنسپل اپنے طلبہ میں پاکستانیت کا شعور پروان چڑھا رہا تھا انگریزی تعلیم کی غرض و غایت کو جس طرح انہوں نے سمجھا کم کسی نے سمجھا ہو گا۔ عجب بات ہے کہ جو شخص زیادہ انگریز نظر آتا تھا وہ سب سے زیادہ پاکستانی تھا۔

——— کیپٹن (نیوی) محمود علی ڈوگر[۱]

میری پہلی یاد چھٹی کے دن سے متعلق ہے۔ چھٹی کے دن ہمارے نہایت قرینے اور احتیاط سے گھر جانے کا کرنل رفیق نے اتنا اہتمام کیا تھا جیسے کوئی وار گیم شروع ہو رہا ہے ہر چیز منظم اور مربوط انہوں نے لڑکوں کو اپنے سامنے ٹرکوں پر سوار کرایا۔ اور سوار کرانے کی اپنی اکسر سائز تھی۔ یہاں بھی ضبط و نظم کا پہلو نمایاں تھا۔ کون کس جگہ کہاں جا رہا ہے کس کے ساتھ، کس کے ہاں۔ یہ سب چیزیں ریکارڈ کی گئی تھیں انہوں نے روانگی کی کارروائی کو خود چیک کیا اور ایک پارٹی کو اپنے سامنے گاڑی پر سوار کرایا۔

---

[۱] کالج نمبر ۲۴۰۲۔

۱۹۵۸ میں رسول ہیڈ ورکس تک سارے کالج کو لے گئے تھے۔ گاڑیاں بھی ساتھ تھیں لیکن تمام راستے ہمارے ساتھ چلے۔ راستے کے دونوں طرف کھیت تھے لیکن انہوں نے سمجھایا کہ تم نے گندم کی ایک بالی پر بھی قدم رکھ دیا تو کسان کا نقصان تو چند پیسوں کا ہوگا لیکن تمہارے کردار پر داغ لگ جائے گا۔

—— محمد ایوب ملک[1]

اس زمانہ میں باکسنگ سب کے لیے لازمی تھی۔ میری باکسنگ ۲۴۰۵ اقبال سے آپڑی۔ ہم دونوں دوست تھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا کہ رنگ میں ایک دوسرے کو ماریں خواہ ایسا کھیل کھیل ہی میں کیوں نہ ہو۔ بہر حال جب باکسنگ شروع ہوئی تو ہم نے باکسنگ کرنے کا ڈرامہ شروع کر دیا اچھل کود تو بہت کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کو اصلی مُکّے کم مار رہے تھے۔ کرنل رفیق حسب معمول خود جج تھے اور اپنی عقابی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ وہ بھانپ گئے کہ قصہ کیا ہے۔ تین راؤنڈ مکمل ہونے پر انہوں نے جو فیصلہ سُنایا وہ یہ تھا۔ یہ باؤٹ کینسل۔ کل پھر ہوگی اور حوالدار پہلوان سے کہا آج ای ڈی پر ان کا پسینہ بھی نکلواؤ۔ پھر ہم دونوں کو بلا کر سمجھایا۔ دوستی کا یہ مطلب نہیں کہ انسان سپورٹسمین شپ ہی کو بھول جائے۔ زندگی میں اگر آگے بڑھنا ہے تو ڈرا جنگ نہیں چلے گی۔

—— میجر محمود اختر شاہین[2]

۱۹۵۷ء کے ہارس اینڈ کیٹل شو میں سارا کالج گیا تھا۔ اتنے سارے لڑکوں کو سیٹیں کہاں سے ملتیں۔ انہیں ایک گوشے میں بیٹھنا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ وی آئی پی انکلوژر میں نہیں بیٹھے جب تک ایک ایک لڑکے کو جگہ نہیں مل گئی وہ کھڑے رہے اور پھر انہوں نے شو بھی ہمارے ساتھ دیکھا یہ اور اسی طرح کی بہت سی باتوں کو دیکھ کر ان کے سینکڑوں شاگردوں کے ذہن میں قیادت کی ایک امیج بن گئی کہ سربراہی کیسے ہوتی ہے۔

اس ہارس شو کے موقع پر وہ ہمارے ساتھ ہی بیرک میں ٹھہرے تھے۔ ایک رات کے ورائٹی فنکشن میں اے میرے دل کہیں اور چل کی دھن انہوں نے ڈہسل کی تھی اور ہمیں

---

[1] سیلز مینجر پی آئی اے کالج نمبر ۲۴۰۴ [2] کالج نمبر ۲۴۱۱

ایک نئی ذمہ دارانہ آزادی کا شعور دیا تھا۔ ڈرامے اور میوزک پر زور دے کر انہوں نے کالج کی خشک اور بے رنگ زندگی کو "رومانٹک ٹچ" دینے کی کوشش کی جو "ٹین ایج" طلبہ کی ایک اہم نفسیاتی ضرورت تھی۔ انہوں نے ہمیں Mediocrity کی منزلوں سے گزارا اور Beyond the Hill افق کے پار دیکھنا سکھایا۔

۔۔۔ اصغر علی خان[1]

رفیق صاحب محسن تو اس دور کے تمام عالمگیرینز کے تھے لیکن میرے وہ مربّی تھے ان کی نظر کرم سے کالج میں داخل ہوا۔ اور ان کی تربیت نے زندگی کی راہیں روشن کیں۔ مجھے کالج کے زمانے سے ان کی رحلت تک مسلسل ان سے نیاز حاصل رہا۔ وہ ایک علیحدہ اور طویل داستان ہے اس وقت میں آخری دور کی چند ملاقاتوں کی روئداد لکھتا ہوں۔

یہ ۱۹۷۳ء کا قصہ ہے ہم تین اولڈ بوائز میں ۲۱۵۸، تنویر حسین شاہ اور ۲۲۴۶ میجر محمد اسلم ان سے ملنے گھوڑا گلی گئے۔ میں اس وقت تک پاکستان اٹامک انرجی کمیشن سے متعلق ہو چکا تھا۔ تنویر شاہ کھاریاں میں ایک سکول کے پرنسپل تھے اور میجر اسلم آرمی کے افسر بن چکے تھے۔ ہم تینوں کے احوال سے وہ بہت خوش ہوئے اور ہمیں باری باری مبارک باد دی۔ پھر کالج اور پاکستان کی باتیں شروع ہوئیں ہم نے بریگیڈیئر صاحب سے گلہ کیا کہ آپ کی ملٹری کالج کی تربیت نے ہمیں بہت پریشان کیا ہے۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا "وہ کیسے؟"

ہم نے کہا "سر معاشرہ کی رائج الوقت قدریں کچھ اور ہیں۔ بے لاگ دیانت، جراٴت اظہار اور بیباکی۔ اصول پرستی گھاٹے کا سودا بن گئی ہے۔ ہم کیا کریں۔ ہم تو اپنے آپ کو مس فٹ سمجھنے لگے ہیں۔

جب انہوں نے دیکھا کہ ہم لوگ اس مسئلہ کے بارے میں خاصے سنجیدہ ہیں تو انہوں نے کہا "ہاں یہ مسئلہ ہے تو سہی۔ لیکن یہ مسئلہ نیا نہیں۔ قدروں کی کشمکش ہر دور، ہر زمانے، ہر معاشرہ میں رہی ہے اور رہتی ہے بدقسمتی سے ہمارے یہاں اس مسئلہ نے قدروں کے بحران کی شکل اختیار کر لی ہے اس کے اسباب و وجوہ پر میں اس وقت بحث نہیں کرتا

---

[1] کالج نمبر ۲۴۱۲

اس سے بات بہت پھیل جائے گی۔ میں تم لوگوں سے صرف یہ کہوں گا کہ اس صورتحال سے مایوس یا دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا زندگی بھر کا تجربہ ہے کہ محنت اور دیانت دیر سویر ضرور رنگ لاتی ہے پھر انسان کو یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ اچھا کام کوئی ایسا بکاؤ مال نہیں جس کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کی جائے۔ اور وہ بھی فوری طور پر۔ اچھا کام ایک فرض ہوتا ہے ایک کوشش ایک جہاد۔ اس کا انجام تکمیل یا کامیابی ہماری ذمہ داری نہیں یہ اللہ تعالیٰ کا Prerogative ہے۔ لیکن یہ عقیدہ کی بات ہے۔ یوں بھی ہماری ذمہ داری محدود ہے۔ جتنا کچھ ہم کر سکتے ہیں، وہی ہماری ذمہ داری ہے میرا یہ ایمان ہے کہ بھلائی میں کوئی برائی نہیں۔ اس سلسلہ میں تیسری بات یہ ہے کہ انسان کو اپنی امنگوں میں بھی معقول ہونا چاہیے اور اس کے رویوں کا حقیقت پر مبنی ہونا بھی ضروری ہے۔ خود میری زندگی تمہارے سامنے ہے میں نے کچھ حدود کے اندر رہ کر ان قدروں پہ عمل کیا ہے۔ اکثر افسران بالا کو میرا رویہ ناگوار گزرا۔ انہوں نے سزا یا تنبیہہ مجھے ادھر سے ادھر بھی کیا لیکن قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ ہر تبدیلی میرے حق میں گئی یاد رکھو محنت اور دیانت کبھی رائیگاں نہیں جاتی اور کبھی کبھی انسان کو اس کی توقع سے زیادہ ملتا ہے جب میں بھرتی ہوا تو میجر سے آگے جانے کی مجھے توقع نہیں تھی۔ لیکن اللہ نے اس سے بہت زیادہ دیا۔ نوکری محنت اور دیانت کے ساتھ ساتھ سمجھ سے بھی کرنی چاہیے باقی اللہ مالک ہے قناعت بھی کوئی چیز ہے ورنہ ہوس کی تو کوئی انتہا نہیں۔" یہ ملاقات کافی کی پیالی پر ختم ہوئی جس کی تلخی بہت اچھی لگی۔ اس عرصے میں ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ اندر سے کوٹ منگوا کر بریگیڈیئر صاحب نے پہن لیا تھا۔ کوٹ پہنتے ہوئے بتایا کہ ڈھاکہ ہی میں مجھے دمے کی ہلکی سی تکلیف شروع ہو گئی تھی، پھر عجیب کیس ہیں، میں دن رات مصروف رہا اور اس طرف توجہ کرنے کا موقعہ نہیں ملا بریگیڈیئر صاحب نے خلاف معمول ہمیں بنگلے کے برآمدے ہی سے رخصت کیا بارش میں باہر نکلنے سے ڈاکٹر نے انہیں سختی سے منع کر رکھا تھا۔ گھوڑا گلی سے آتے ہوئے ہم تینوں ان کی صحت کی طرف سے متفکر ہوئے انہیں گھوڑا گلی کی آب و ہوا کے پیش نظر وہاں نوکری نہیں کرنی چاہیے تھی۔

معلمی کا شوق انہیں بہت مہنگا پڑا۔

اگلے سال ۱۹۷۴ء میں، ہم پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس بار مظاہر شاہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ مظاہر کا انگلینڈ میں معاش کا اچھا سلسلہ ہے آپکی تفصیلات سے وہ بہت خوش ہوئے۔ میرے یہ بتانے پر کہ میں بھی ستمبر میں اعلیٰ سائنسی تربیت کے لیے انگلینڈ جا رہا ہوں تو فرمایا "ویل ڈن اصغر۔ تم صحیح سمت چل رہے ہو لیکن وہاں کے سماجی ماحول کے منفی اثرات سے چوکنے رہنا" معاشرتی برائیوں کا ذکر چل نکلا تو مظاہر شاہ نے ایک انوکھی تجویز پیش کی اور وہ یہ تھی کہ ایک "ٹیرر گروپ" ترتیب دیا جائے جو راشی اور بددیانت بڑوں اور چھوٹوں کا محاسبہ کرے اور ان کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ مظاہر شاہ بڑے جوش میں تھے، ان کی ساری تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ بے ایمانی کا بے رحمی سے صفایا کرنا ہی سب کے ساتھ سب سے بڑا رحم ہو گا جب مظاہر نے بریگیڈیئر صاحب سے اس ٹیرر گروپ کی کمان سنبھالنے کو کہا تو وہ بے اختیار ہنسنے لگے اور ہنستے ہی چلے گئے۔ لیکن ہمارے لیے ہنسنا مشکل تھا چونکہ ہم اس بارے میں خاصے سنجیدہ تھے جب انہوں نے اپنی اضطراری ہنسی پر قابو پا لیا۔ اور ہماری سنجیدگی کو دیکھا تو بڑے پیار سے لیکن سنجیدہ لہجے میں کہنے لگے "میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ تمہارا مقصد صحیح ہے لیکن طریق کار ناقابل عمل، نباہ کن اور بچگانہ ہے۔ برائیاں ٹیرر سے ختم نہیں ہوتیں پھر تمہیں پتہ نہیں کہ برائیوں کی جڑیں کتنی گہری ہیں اور مفاد پرست گروپ کتنے مضبوط ہیں وہ تمہارے ٹیرر گروپ کو سب سے پہلے اپنے ٹیرر کا نشانہ بنائیں گے اور تمہارے اپنے آدمی تمہارا سر پیش کر دیں گے۔ بہر حال تمہارا جذبہ اچھا ہے۔ میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں" یہ ملاقات سب ملاقاتوں سے زیادہ دلچسپ اور خیال انگیز ثابت ہوئی۔ بعد کو انگلستان میں مظاہر سے بات ہوئی تو ہمیں خود ہنسی آئی کہ اس طرح کی بچگانہ بات ہم نے کیوں کی۔

یہ واقعہ ۱۹۷۶ء کا ہے۔ میں انگلستان سے اپنی سائنسی تربیت مکمل کر کے وطن واپس آیا تو پہلی فرصت میں لارنس کالج میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پہلے تو مغرب کی سائنسی ترقی اور وہاں میری تعلیم پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ پھر یکایک کہا "نور حسین (میرے والد)

کے لیے بڑے فخر کا مقام ہے۔" میں نے کہا۔ سر! وہ فخر کرنے اور خوش ہونے کے لیے اب اس دنیا میں نہیں۔ ان کا انتقال میری عدم موجودگی میں ہو گیا تھا۔ یہ سن کر وہ سکتے میں آ گئے۔ آنکھیں نم سی ہو گئیں کچھ دیر فضا میں گھورتے رہے۔ یقیناً انہیں ملٹری کالج میں گزرے ہوئے دن یاد آ رہے تھے۔ پھر رندھی ہوئی آواز میں بولے۔ "گاڈ بلیس ہم اصغر تمہارا باپ ایک بڑا آدمی تھا۔ دیانت دار، فرض شناس اور وقت کا پابند۔ ایسے لوگوں سے قومیں بنتی ہیں۔" جب میری بس مری کی خم بہ خم پہاڑیوں سے نیچے اتر رہی تھی تو یہ سوچ رہا تھا کہ یہ شخص خود کتنا بڑا ہے جو ایک ریٹائرڈ سپاہی اور درماندہ چپڑاسی میں عظمت ڈھونڈتا ہے اور اس کو سلام کرتا ہے۔

——— ڈاکٹر فاروق احمد[1]

کرنل رفیق سکین ہاؤس کے جونیئر لڑکوں پر بہت مہربان تھے۔ اکثر شام کو یا پریپ کے بعد آتے اور جونیئرز سے لائٹ باتیں کرتے۔ ایک روز آئے تو ۲۳۰۸ افتخار اور ۲۳۵۴ شبیر علی نے فرمائش کی۔ سر کوئی سانگ سنائیں تو انہوں نے ایک ملائی اور ایک انگلش سانگ سنایا۔ انگلش سانگ سننے کے لیے سارا ہاؤس جمع ہو گیا تھا۔ بڑی بھرپور آواز تھی۔ در و دیوار تھر تھرانے لگے تھے۔

——— محمد یونس[2]

یہ واقعہ ۱۹۵۷ء کا ہے کالج میں داخل ہوئے ابھی مجھے چند دن ہی ہوئے تھے۔ پی ٹی اس زمانے میں برڈوڈ ہاؤس کے پیچھے کی ایتھلیٹک گراؤنڈ میں ہوتی تھی۔

صبح سویرے سارے ہاؤس پی ٹی گراؤنڈ میں جمع ہوتے۔ پی ٹی سے پہلے وارم اپ کرنے کے لیے ایک کھیل ساہوتا تھا ہاؤس کی قطار کا ایک لڑکا بھاگ کر چاروں سکواڈرن کا چکر لگا کر قطار کے دوسرے لڑکے کو آکر چھوتا تھا تو وہ بھاگنا شروع کر دیتا تھا۔ اس طرح یہ ایک طرح کی ریلے ریس ہو جاتی تھی چونکہ ہاؤسوں میں مقابلے کی صورت ہوتی تھی اس لیے اس بھاگ دوڑ میں بڑی ہلچل مچی ہوتی تھی۔

---

[1] کالج نمبر ۲۴۱۳ زمانہ ۵۹-۱۹۵۷ء [2] کالج نمبر ۲۴۱۵

میں جونیئر لڑکوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ مجھے شرارت سوجھی یا چالاکی تو بجائے پورا چکر کاٹ کے آنے کے ایک شارٹ کٹ لیا اور بھاگ کر اپنی لائن میں شامل ہو گیا۔ ٹھیک اس وقت کرنل رفیق کی گرجدار آواز گونجی No, that's not on

پہلے تو میں حیران ہوا کہ یہ آواز کہاں سے آئی چونکہ ابھی پوری طرح اجالا نہیں ہوا تھا کم از کم میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ یقیناً وہ کسی ایسی جگہ کھڑے تھے جہاں سے وہ ہم پر نظر رکھ سکیں۔

ان کے اس فقرے نے میری کاروباری زندگی میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ زندگی کی طرح بزنس میں بھی شارٹ کٹ ہوتے ہیں لیکن جب بھی کوئی ایسا موقعہ آیا ہے میں نے آپ سے کہا ہے نہیں یوں نہیں!

یہی میں اپنے بچوں اور دوستوں سے کہا کرتا ہوں۔ شارٹ کٹ سے بات نہیں بنتی۔ شارٹ کٹ آخر میں سب سے لمبا راستہ ثابت ہوتا ہے۔

—— لیفٹیننٹ کرنل عبدالمجید[1]

رات کے ایک پریپ کا واقعہ ہے کلاس میں بیٹھا بجائے پڑھنے کے ڈیسک کے تالہ کو ہاتھ میں لے کر بار بار کھول بند کر رہا تھا جس سے کلک کلک کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ میں اس کھیل میں محو تھا کہ یکایک محسوس ہوا کہ کمانڈانٹ کرنل رفیق کھڑکی پر اپنے مخصوص انداز سے ہاتھ رکھے کھڑے ہیں۔ ان کی سختی مشہور تھی، میں اندر سے کانپ گیا لیکن تالہ کھولنے بند کرنے کا عمل جاری رکھا جانا تھا کہ اب بند کیا تو خیر نہیں۔ انہوں نے نام لے کر کہا مجید باہر آؤ۔ میں ڈرتے ڈرتے باہر گیا تو صرف اتنا کہا۔ "اگر پڑھنے کو دل نہیں چاہتا تو ڈیسک پر سر رکھ کر سو جاؤ۔ دوسروں کو ڈسٹرب نہ کرو۔ ڈسپلن کے تقاضوں کی وجہ سے ہاؤس میں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ کھیل کے بعد واپس آتے ہوئے سنتھے کی باڑھ پھلانگنے کی ہٹک مارتا گرد اڑاتا آ رہا تھا کہ کمانڈانٹ کرنل رفیق سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اور اس Legend کی تصدیق ہو گئی کہ جب بھی جہاں کوئی غلط کام ہو گا کرنل رفیق آ موجود ہوں گے۔ سائیکل

---

[1] کالج نمبر ۲۶۴۴ زمانہ تعلیم ۶۳ - ۱۹۵۸ء

سے اترے اور صرف یہ کہا۔ میرے بچے، چیزیں بگڑتے نہیں بنتے دیر لگتی ہے۔"

ـــــــ لیفٹیننٹ کرنل نصیر عابد[1]

یہ واقعہ مئی ۱۹۵۷ء کا ہے۔ میں تازہ تازہ کالج میں داخل ہوا تھا کہ وہ ہماری ڈارم میں آ گئے اور نئے لڑکوں سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ میرا بستر انگیٹھی کے قریب تھا اور وہاں ڈارم کی جھاڑو پڑی ہوئی تھی انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ جھاڑو کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں مجھے معلوم نہ تھا میں چپ رہا پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ انگریزی میں اسے بروم کہتے ہیں یہ لفظ نیا تھا اس کو ادا کرنے میں مجھے کوئی دقت ہوئی تو انہوں نے مجھ سے اس کا تلفظ بار بار کروایا۔ اور کہا اب اس کو یاد رکھنا پھر جاتے ہوئے انہوں نے ونگ پریفیکٹ کو بلایا اور کہا نئے لڑکوں کو آس پاس کی اور عام استعمال کی چیزوں کے نام انگریزی میں بتاؤ۔ میں کل چیک کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے دوسرے روز آکر چیک کیا۔ پہلے مجھ ہی سے پوچھا "ہیلو نصیر تو پھر اسے کیا کہتے ہیں" بروم سر، بہت خوش ہوئے دوسرے لڑکوں سے دو چار لفظ پوچھے۔ شاباش دی اور چلے گئے۔

حکم دے کے اس کی تعمیل میں "فالو اپ" کرنا ان کا خاص طریق کار تھا ان کو ڈاج نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن وہ ڈاج کرنے کی ضرورت کو سب سے پہلے ختم کرتے تھے ان ڈسپلن کے اسباب کی طرف سب سے پہلے ان کی نظر جاتی تھی۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں سارا کالج تین دن کے لیے ہیڈ رسول ورکس پکنک اور کیمپ کرنے گیا تھا بیشتر لڑکے ٹرکوں پر گئے تھے اور کچھ سائیکلوں پر اور کچھ نے پیدل جانے کے لیے "والنٹیئر" کیا تھا۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا اور کمانڈانٹ صاحب ہمارے گروپ کے ساتھ تھے۔ یہ ان کی قیادت کا سٹائل تھا۔ اسی نے ہمیں انسپائر کیا۔

ـــــــ بریگیڈیر نعیم اکبر امتیازی سند[2]

ان کی جو تصویر میرے ذہن میں ہے، یہ ہے کہ وہ رات کو پریپ میں کھڑکی کے پاس کھڑے پریپ کرتے دیکھ رہے ہیں، نہ جانے کیا اتفاق تھا کہ جب بھی میں نے پیچھے مڑ

---

[1] کالج نمبر ۲۲۲۵ [2] کالج نمبر ۲۲۲۶

کر دیکھا وہ ہمیشہ کھڑکی سے لگے کھڑے نظر آتے۔ ہمیں اس زمانے میں حیرت ہوتی تھی کہ وہ ہر جگہ ہر وقت کیسے نظر آجاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ نہ بھی ہوں تو خیال یہی رہتا تھا کہ وہ کہیں آس پاس موجود ہیں، ان کی موجودگی ہر جگہ محسوس کی جاتی تھی۔ ان کا ڈر ضرور تھا۔ لیکن کشش بھی تھی۔ لڑکے ان سے بھاگتے نہیں تھے ان کی طرف کھنچتے تھے اس کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان سے وہ بھی متاثر تھے جو ان سے سخت سزا پاتے تھے۔

ان کے الوداعی کھانے کا منظر اب بھی میری آنکھوں میں پھرتا ہے۔ ان لائنز میں ڈنر تھا جہاں آج کل یادگار شہداء ہے کہیں روشنی تھی اور کہیں تھوڑا تھوڑا اندھیرا۔ کھانا تو جیسے کھایا ہی نہیں گیا۔ جب الوداعی تقریروں کا وقت آیا تو بڑی جذباتی فضا ہو گئی تھی۔ محبت اور عزت کا اس سے زیادہ بے ساختہ اور پُر جوش اظہار کم از کم میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔

——— بریگیڈیر مقصود الحسن[1]

اب تو کالج میں باقاعدہ سینما ہال ہے ۱۹۵۷ء میں ایسا کوئی ہال نہ تھا۔ اور ۱۶ ملی لیٹر کی فلمیں وہ بھی یو ایس آئی کی دکھائی جاتی تھیں اس جگہ جہاں اب بائیولیبارٹری ہے اس کھلے میدان میں بنچوں پر بیٹھ کر معلوماتی فیچر فلمیں زبردستی دیکھنا بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔ ان فلموں کو ہم نے مچھر مار فلموں کا نام دے رکھا تھا کچھ اس لیے کہ اکثر مچھروں پر فلمیں دیکھتے اور زیادہ اس لیے کہ زیادہ وقت مچھروں سے نبرد آزما رہتے۔ کچھ دل جلے مونگ پھلی سے اور پیسے والی ٹافیوں سے دل بہلاتے رہتے اور جب موقعہ ملتا دو چار کھسک بھی جاتے لیکن وہ کسی نے کہا ہے۔ سو دن چور کے ایک دن شاہ کا۔ ایک روز فلم کچھ زیادہ ہی بورنگ تھی یا ویک اینڈ کا موڈ تھا کہ انٹرویل کے بعد دو چار نہیں پچاس ساٹھ لڑکے غائب ہو گئے۔ چنانچہ وہی ہوا جس کی توقع کی جا سکتی تھی انہوں نے فوراً تاڑ لیا کہ خاصے لڑکے کھسک گئے ہیں اس وقت تو وہ خاموش رہے فلم ختم ہوتے ہی انہوں نے کالج ہیڈ بوائے کو حکم دیا کہ کالج فالن کر کے رول کال لی جائے۔ رول کال لیتے لیتے کچھ لڑکے بر ڈوڈ ہاؤس اور سکین ہاؤس سے بھاگ کر آ کر شامل ہو گئے لیکن آکنلک ہاؤس

---

[1] کالج نمبر ۲۴۲۸

چونکہ بہت دور تھا اس لیے پکڑے گئے۔ سچی بات یہ ہے آکینز آکنلک ہاؤس کے لڑکے اس طرح کے کاموں میں کچھ زیادہ ہی پیش پیش ہوتے تھے چنانچہ جب رول کال ہوئی تو ۱۴ لڑکے غیر حاضر نکلے جس میں بیشتر آکینز تھے ان میں فاروق بھی تھا۔ رول کال کے بعد حکم ملا کہ غیر حاضر لڑکے صبح سویرے پی ٹی کٹ میں گراؤنڈ میں حاضر ہوں۔ ہمارا خیال تھا کہ پی ٹی سٹاف وغیرہ ایکسٹرا ڈرل کے ذریعے رگڑا دے گا لیکن وہاں خود کرنل صاحب پی ٹی کٹ میں موجود تھے اور جس خراب موڈ کی توقع کی جا سکتی تھی وہ نہ تھا جاتے ہی حکم ملا "روڈ واک اینڈ رن ان ٹو پبی۔ یلائز" چنانچہ ہم پبی کی طرف چلنا شروع ہو گئے اور وہ ہمارے ساتھ تھے۔

میں نے اکثر اس واقعہ کے بارے میں سوچا ہے کہ وہ خود ہمارے ساتھ کیوں بھاگتے رہے۔ بہر حال یہ تھا ان کی قیادت کا سٹائل۔ اس واقعہ یا حادثہ کا بیان نامکمل رہے گا اگر میں یہ نہ بتاؤں کہ اسی چکر میں فاروق غریب کا پتہ کٹ گیا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ فاروق جب آکنلک ہاؤس سے آیا تو سفید قمیض کے نیچے سلیپنگ سوٹ کے سے رنگ کا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ کرنل رفیق صاحب اسے اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر دھاڑے کہ یہ کیا ہے اگر وہ صاف بات کرتا تو شاید بچ جاتا۔ ان کے فلسفہ تربیت میں جھوٹ اور چالاکی کو معاف کر دینے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس چھوٹی سی نوٹ بک میں جس میں ہر لڑکے کو ایک صفحہ دیا گیا تھا۔ فاروق پر کچھ اور مشاہدات بھی ہوں۔ بہر حال بعض اوقات ہمیں ان کے فیصلے بہت سخت لگتے تھے ان میں سے ایک فاروق کا اخراج بھی تھا لیکن مجھے اس امر کا سو فیصد یقین ہے کہ ان سے اجتہادی غلطی تو ہو سکتی تھی لیکن ان کا ہر فیصلہ بالکل بے لاگ ہوتا تھا۔ اسی چیز کو ہم آج تک یاد کرتے ہیں۔ اور جوں جوں اپنا تجربہ بڑھتا جاتا ہے۔ ان کی قدر بڑھتی جاتی ہے۔

کرنل رفیق سے متعلق میری پہلی یاد سوئمنگ پول میں غوطے کھانے کی ہے۔ یہ واقعہ ۱۹۵۰ء کا ہے میں چھٹے درجے میں داخل ہوا تھا اور تیرنا بالکل نہیں جانتا تھا۔ میں سوئمنگ پول کے اتھلے کنارے پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اور دوسروں کو تیرتے بڑی حسرت سے دیکھ

رہا تھا کہ کسی نے مجھے بازوؤں سے اٹھایا اور دھڑام سے پانی میں پھینک دیا یہ حادثہ اتنی بے خبری میں ہوا تھا کہ پانی میں گرتے ہی میری ایک چیخ تو ضرور نکلی جان بچانے کے لیے میں نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے دوسرے لمحے میں نے دیکھا کہ کمانڈانٹ بھی میرے ساتھ ہیں اور مجھے سہارا دے کر ہاتھ پاؤں مارنے میں مدد دے رہے ہیں اس خیال سے کہ وہ میرے ساتھ ہیں ڈوبنے کا خوف میرے دل سے جاتا رہا اور میں پانی سے اوپر رہنے کی جدوجہد کرتا رہا۔ تو جناب یہ تھی میرے تیرنا سیکھنے کی ابتدا اور اس کی ابتدا کرنل رفیق نے کی تھی ہر لڑکے پر نظر رکھنا اور اس کی تربیتی ضرورتوں کا خیال رکھنا ہی ان کا کھل جا سم سم تھا۔

میری ایک اور یاد ان کے سکین ہاؤس میں اکثر آنے کی ہے۔ سکین ہاؤس جونیئر ہاؤس بلکہ بے بی ہاؤس تھا۔ یہاں وہ بہت وقت گزارتے تھے اور ہمارے ساتھ دوستوں کی طرح کھیلتے تھے ایک روز اسحاق نے یا کسی اور شوخ لڑکے نے کہا۔ سر انگلش سانگ بہت سن چکے آج اردو میں کچھ سنائیے۔ انھوں نے کہا "مجھے اردو سانگ نہیں آتا۔ بے بی کے ساتھ کوئی دھن سن لو" جب ہم نہ مانتے اور اردو اردو کی رٹ لگا رکھی تو انھوں نے اپنی مخصوص بھرپور آواز میں یہ بند سنایا۔

بڑھے چلو، بڑھے چلو مجاہدو، رکنا نہیں تمہارا کام

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کا لب و لہجہ انگریزی تھا اور آواز میں گونج تھی۔ جن لوگوں نے انہیں اردو انگریزی میں بولتے سنا ہے وہ اس کا تصور کر سکتے ہیں۔

بات لمبی ہوتی جاتی ہے لیکن ایک واقعہ اور ذہن کی دہلیز تک آکر دستک دے رہا ہے، اسے بھی بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ۱۹۵۸ء کے ہارس شو میں جب سارا کالج لاہور جانے لگا تو وہ میرے پاس کالج اسپتال آئے "ہیلو مقصود کیا حال ہے" انھوں نے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں پوچھا میں نے اس کا جواب دینے کے بجائے یہ کہا، سر کالج ہارس شو پر جا رہا ہے؟ میری آواز میں یقیناً حسرت تھی۔ وہ ایک دم میرے دل کی بات سمجھ گئے۔ مجھے تھپتھپاتے ہوئے کہا، "ڈونٹ وری۔ اگلے سال تم ضرور ہارس شو پر

جاؤ گے۔ خواہ کالج جائے یا نہ جائے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔" مجھے یقین ہے کہ اگلے سال میں ضرور ہارس شو دیکھتا۔ اگر وہ اگلے سال کے ہارس شو تک کالج میں ہوتے۔

ان کی کمانڈ کا جو سٹائل تھا وہ لاشعوری طور پر ہی نہیں شعوری طور پر بھی میرا آئیڈیل رہا ہے۔ آخر میں، میں ان کی پاکستانیت کے حوالے سے ایک واقعہ بتانا چاہتا ہوں۔

جب وہ کالج چھوڑ رہے تھے تو کالج کے صدر دروازے کے قریب کھڑے ہو کر انہوں نے ہمیں جو آخری نصیحت کی وہ یہی تھی تم لوگ پنجابی، پٹھان، سندھی، بلوچ نہیں ہو۔ پاکستانی ہو۔ مجھے الفاظ صحیح یاد نہیں۔ مفہوم یہی تھا۔ پاکستانیت کی یہی سپرٹ کم و بیش ان کے طلبہ میں بھی ہے۔

——— ممتاز اختر[1]

ان کی قوت ارادی بے پناہ تھی۔ سگریٹ پیتے تھے اور بہت پیتے تھے لیکن وہ اس عادت سے بھی مغلوب نہیں تھے۔ ۱۹۵۸ء کے رمضان میں کئی بار انہوں نے سکین ہاؤس کے میس میں افطار کیا لیکن یہ نہیں کیا کہ افطار کرتے ہی سگریٹ سلگا لیا ہو۔ بڑے اطمینان سے افطار کیا۔ گھوم پھر کر باتیں کرتے رہے۔ کھانے کے بعد گھر جا کر سگریٹ پیا ہو تو اور بات ہے قوت برداشت ان میں بہت تھی۔ ارادہ تو خیر پتھر کا تھا ہی۔

۱۹۵۸ء کے سالانہ تقریب انعامات کے موقع پر رات کو ڈرامہ تھا اس کے بعد ایک دن کی چھٹی ہونا تھی۔ لڑکوں نے اس خیال سے کہ یہ سب سے چھوٹا ہے اور پہلا ہے مجھے گھیرا اور کہا کہ تم کرنل صاحب سے کہو کہ دو دن کی چھٹی دیں تاکہ گھر جا سکیں۔ چھٹی کسے بری لگتی ہے چنانچہ ڈرامے کے بعد میں نے موقع پاتے ہی کہا۔ سر، ہمیں دو دن کی چھٹی چاہیے فرمانے لگے "کیا کرو گے" عرض کیا، گھر جائیں گے، فرمایا "گھر جانے سے کیا ہو گا" میں نے کہا والدین سے ملیں گے۔ کہنے لگے "وہ کیا کریں گے" میں نے کہا "پیار کریں گے" اس کے جواب میں انہوں نے جذباتی ہو کر فرمایا "کیا ہم نہیں تمہارے والدین کی طرح پیار نہیں کرتے اگر نہیں کرتے یا نہیں کر سکے تو ہم اپنے فرض میں کوتاہی کرتے رہے ہیں" اتنا کہہ کر وہ اور جذباتی ہو گئے۔ میں بے اختیار رونے لگا۔ میرے ساتھی بھی رو رہے تھے اور ساتھ ہی

[1] کالج نمبر ۲۴۳۳

جناب رفیق صاحب بھی مجھے تھپتھپاتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے۔

ان کے زمانے میں تمام اساتذہ آبزرویشن سلپ بھیجا کرتے تھے۔ جہاں کہیں وہ کسی بچے کو صحیح یا غلط کام کرتے دیکھتے اس کی اطلاع ہاؤس ماسٹر صاحب کو دی جاتی۔ خود رفیق صاحب ہر فنکشن کے بعد کیڈٹوں کو ان کی اچھی کارکردگی پر ذاتی طور پر مبارک باد دینا نہ بھولتے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے کالج میں داخل ہونے کے کچھ عرصے بعد کالج ہال میں اپنی پہلی تقریر کرنے کے بعد میں ہاؤس واپس آگیا تھا اور سونے کی تیاری کر رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کمانڈنٹ صاحب چلے آرہے ہیں اور پوچھ رہے ہیں۔ ممتاز کدھر ہے؟ پھر میرے لاکر پہ آئے اور مجھے شاباش دی۔

——— نصیر پراچہ[1]

اپریل ۱۹۵۷ء میں داخلے کے امتحان اور انٹرویو کے لیے میں باہر ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ سب لڑکے اپنے بزرگوں کے ساتھ آئے تھے۔ میں اپنے حالات کی وجہ سے اکیلا تھا۔ دوسرے تیسرے دن جب لڑکے اپنے بڑوں کے ساتھ تانگوں میں بیٹھ کے جہلم جانے لگے تو مجھے اکیلا کھڑے دیکھ کر پوچھا تمہارے ساتھ کون ہے میں نے بتایا کہ یہ بات ہے تو انہوں نے فوراً مجھے اپنے ساتھ موٹر بائیک پر بٹھایا اور سی ایم ایچ چھوڑ آئے۔ پھر واپسی پر اور دوسرے تیسرے دن جہلم آنے جانے کا بھی بندوبست کیا۔

ان کے لیے یہ عام بات ہوگی۔ شاید وہ دوسرے دن بھول ہی گئے ہوں۔ لیکن میرے دل میں یہ واقعہ روشنی کی ایک کرن بن کر اتر گیا ہے۔ جب بھی میں کسی کو اکیلا دیکھتا ہوں تو بے اختیار جی چاہتا ہے اس کی منزل تک اس کے ساتھ چلوں!

——— میجر (ریٹائرڈ) سلیم اختر[2]

۱۹۵۷ء میں آٹھویں درجے میں، میں کالج میں داخل ہوا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں دس برس کے بعد یکایک ایک برفانی رات کو ان سے ملاقات ہوئی۔ میں ان دنوں مری میں سنو وارفیئر کا کورس کر رہا تھا۔ ایک رات پارٹیاں کی اکسرسائز پر گئے تو سڑک پر ایک فیٹ گاڑی کو کھڑے

---

[1] کالج نمبر ۲۴۳۹ [2] کالج نمبر ۲۴۵۲

دیکھا۔ دیکھتے ہی میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ بریگیڈیر رفیق کی گاڑی ہے وہ ان دنوں باغ میں ایک بریگیڈ کمان کر رہے تھے۔ مری آرہے تھے کہ راستے میں گاڑی خراب ہو گئی۔ گاڑی کو پہچانتے ہی میں نے قریب جا کر کھٹ سے سیلوٹ مارا۔ سر! فوراً پوچھا، "کیا تم آنچو نہیں؟" میں نے کہا یس سر پھر بغل گیر ہو گئے۔ ۱۹۵۸ء میں ہماری کلاس نے ایک ڈرامہ کیا تھا۔ اس میں میں آنچو بنا تھا۔ اس وقت سے میرا نام آنچو پڑ گیا تھا۔ اس زمانے میں ہر کلاس انگریزی اُردو کا ڈرامہ کرتی تھی۔

——— تاج محمد خٹک[1]

میں اس امر کو اپنی خوش قسمتی اور سعادت سمجھتا ہوں کہ مجھے کرنل رفیق جیسے آدمی کو قریب سے دیکھنے اور ان سے کچھ سیکھنے کا موقعہ ملا۔ میں نے زندگی ایڈمنسٹریشن اور لیڈرشپ کی بہت سی قدروں کمان کے حوالے سے سمجھا۔

یہ واقعہ ۱۹۵۸ء کا ہے میں برڈوڈ ہاؤس (اب محمود غزنوی ہاؤس) میں تھا۔ اس وقت اس کے ہاؤس ماسٹر کیپٹن قسیم صدیقی صاحب تھے اور ہاؤس پریفیکٹ افتخار جعفر، ہاؤس ماسٹر صاحب نے حکم دیا کہ سب لڑکے لاکرز میں لگانے کے لیے تالے خریدیں۔ جو میں کسی وجہ سے نہیں خرید سکا تھا۔ پچھلی رات ہاؤس پریفیکٹ نے خاصی جھاڑ دی تھی۔ میں آٹھویں درجے میں تھا۔ آخری گھنٹہ تھا۔ چھٹی کے بعد میں کلاس میں پریشان بیٹھا تھا۔ رفیق صاحب ادھر سے گزرے مجھ سے کہا کہ دفتر میں آؤ۔ دفتر میں گیا تو پوچھا کیا بات ہے۔ میں نے بتایا کہ تالا نہیں خرید سکا ہوں سزا ملے گی۔ انہوں نے صدیقی صاحب کو بلایا اور کہا لڑکوں کو تالے کے بغیر زندہ رہنا سکھایئے انگریزی میں ان کے الفاظ یہ تھے۔

Teach them to live without locks.

——— بریگیڈیئر ذوالفقار علی شاہ بخاری[2]

کرنل رفیق کے ظاہر پر "صاحبیت" غالب تھی۔ ان کے باطن کا اندازہ ہمیں اس دن ہوا جب وہ کالج کے فن فیئر پر اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ تشریف لائے جو مشرقی

---

[1] کالج نمبر ۲۲۶۶ [2] کالج نمبر ۲۲۶۹

روایات کے عین مطابق کسی قسم کی آرائش و زیبائش سے قطعاً معرا سر سے پاؤں تک نہایت سادہ سفید لباس میں ملبوس تھیں۔ ایک آدھ فنکشن میں وہ ان کے ساتھ اور بھی آئیں، ہر بار ان کو اسی طرح دیکھا۔ اللہ اکبر وہ شخص جو بظاہر انگریزیت کا دلدادہ نظر آتا تھا اس کا قلب اور باطن کتنا مشرقی تھا۔ اس کے برعکس ان کو دیکھیے جو مشرقیت کا پرچار کرتے نہیں تھکتے تھے۔ ان کا عملاً کیا حال تھا (اور ہے) دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

ایک اور چھوٹا سا واقعہ یاد آرہا ہے۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں جب گرین ہاؤس اور وھائٹ ہاؤس (اب ٹیپو سلطان ہاؤس، اورنگ زیب ہاؤس) بن کر تیار ہوئے تو آکنلک ہاؤس اور رابرٹس ہاؤس کے سینئر لڑکوں کو توقع تھی کہ انہیں کو ان دو نئے ہاؤسوں میں بھیجا جائے گا اور توقع بیجا نہ تھی آکنلک ہاؤس تو کچا تھا اسے بوسیدگی کی وجہ سے ہی گرایا جانے والا تھا۔ اس لیے خیال تھا کہ شاید دونوں سینئر ہاؤس وہاں جائیں غالباً جونیئر لڑکوں نے بھی وہاں جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اب فیصلہ کیسے ہو۔ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ امتحان سے بہت پہلے اعلان کر دیا کہ جس ہاؤس کی کارکردگی بہتر ہوگی، اس ہاؤس کو نیا ہاؤس ملے گا۔ اس مقابلے میں جونیئر جیتے اور وہ نئے ہاؤسوں میں چلے گئے۔ منافقت سے کلی گریز اور عدل گستری یہ دو چیزیں ہیں جن سے میں بہت متاثر ہوا۔

— لیفٹیننٹ کرنل اعجاز رفیع [1]

میں ۱۹۵۸ء میں کالج میں ساتویں درجے میں داخل ہوا تھا۔ میرے ذہن میں ان کی پہلی یاد داخلہ کے انٹرویو کی ہے۔ گیارہ برس کا جو بچہ پہلی بار اس طرح کے انٹرویو کے لیے آتا ہے وہ پہلے سے گھبرایا ہوتا ہے اور اگر انٹرویو بورڈ کا رویہ بھی جارحانہ ہو تو لڑکا تو گیا۔ لیکن ان کا رویہ بہت مشفقانہ تھا۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ لڑکا کچھ بولے۔ کچھ کہے اپنے آپ کو ظاہر کرے۔ بعض لوگ امتحان یا انٹرویو اس نیت اور اس طریقے سے لیتے ہیں کہ امیدوار کو بتائیں کہ وہ کتنا نالائق اور کتنا جاہل ہے ان کا رویہ یہ تھا کہ امیدوار کو یہ حوصلہ دیں کہ وہ کتنا جانتا ہے اس میں کتنی صلاحیت ہے۔ مجھے بعد کو پتہ چلا کہ زندگی

---

[1] کالج نمبر ۲۴۷

اور لوگوں میں ان کا رویہ روشنی تلاش کرنے کا ہے۔ تاریکی ڈھونڈنے کا نہیں۔

کالج میں داخلہ کے بعد شام کو پہلی بار میں کیڈٹس میس گیا۔ تو ابھی میس کی گھنٹی نہیں ہوئی تھی، لڑکے باہر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں کرنل رفیق آگئے۔ اس وقت پہلی بات جو میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ انہوں نے وہاں کھڑے جس لڑکے سے بھی بات کی اسے اس کے نام سے پکارا حد یہ کہ جب میں سامنے سے گزرا تو مجھ سے بھی کہا " ہیلو رفیع ہاؤ آر یو" یہ پرسنل ٹچ ان کا خاصا تھا آئندہ ایک سال میں جو میں نے ان کے زیر تربیت گزارا تو مجھے پتہ چلا وہ تو نام کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتے ہیں اور مزید جاننے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے آبز رویشن سسٹم جاری کیا ہوا تھا کہ اگر سٹاف کسی وقت کسی لڑکے کی کوئی مثبت یا منفی بات دیکھے تو ایک چٹ پر نوٹ کر کے کمانڈانٹ کے سجیشن باکس میں ڈال دے۔ وہ اسے نوٹ کر کے ہاؤس ماسٹر کو بھیج دیتے تھے۔

پہلے سال میں ایک اور چیز نے مجھے متاثر کیا وہ ان کا اپنا بے داغ لباس تھا۔ ہر موقعہ پر صبح سے شام تک ان کا اپنا لباس موزوں اور بہترین ہوتا تھا کیا مجال کہ کہیں سلوٹ ہو یا پتلون کی کریز کبھی ٹوٹی ہو۔ جب سی وی سوٹ میں ہوتے تو ایک سلور چین ان کے کوٹ کی جیب میں ضرور ہوتی تھی۔ یہ ان کی خاص پہچان تھی۔

ان کی چال بھی ایک انفرادیت رکھتی تھی اور اکثر لڑکے ان کی چال کی اور بولنے کے انداز کی نقل کرتے تھے۔

صبح کی پی ٹی پر وہ ہم سے پہلے موجود ہوتے تھے اور بگل بجنے سے ایک لمحے پہلے ان کے ایک خاص انداز سے ناک صاف کرنے کی آواز آتی جو اس بات کا سگنل ہوتا کہ وقت ہو گیا ہے اور وہ آگئے ہیں۔ یہ میں ۱۹۵۸ء کی سردیوں کی بات کر رہا ہوں۔ ناک صاف کرنے، رومال استعمال کرنے کا بھی ایک خاص انداز تھا۔ انہی سردیوں میں ان کا لڑکا ریاض بھی پی ٹی کٹ میں ان کے ساتھ ہوتا تھا۔

انہیں لڑکوں کو کالج سے باہر لے جانے کا بڑا شوق تھا۔ ہر ہفتے کوئی نہ کوئی گروپ باہر پکنک منانے جاتا۔ ایک ٹرم میں پورا کالج کہیں کیمپ کرتا۔ کھانا وانا بھی لڑکے پکاتے

اور دوسرے انتظامات بھی لڑکوں کے سپرد ہوتے۔ ۱۹۵۸ء دسمبر کے ہارس اینڈ کیٹل شو میں پورا کالج ریل سے لاہور گیا تھا۔ دو تین تھرڈ کلاس کی بوگیاں انہوں نے ریزرو کرالی تھیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ رہے۔ کھایا پیا بھی ہمارے ساتھ؛ حد یہ کہ جب لڑکوں نے ڈبے ہی میں ورائٹی پروگرام کیا تو انہوں نے ملائی گانے بھی سنائے اور لطف کی بات یہ کہ تمام عرصے ہر جگہ ساتھ رہنے کے باوجود انہوں نے فاصلہ قائم رکھا اور ان کا رعب پہلے کی طرح باقی رہا۔

——— کرنل غلام علی[1]

دسمبر ۵۸ء کی سردیوں میں ہم ٹیپو سلطان ہاؤس سے برڈوڈ ہاؤس کے پیچھے کی گراؤنڈ میں پی ٹی کرنے آتے تھے۔ جرسی کے باوجود ہم سردی سے بے حال ہو جاتے تھے۔ اس وقت کرنل رفیق کو نصف بازوؤں کی سفید بنیان اور سفید شارٹس میں دیکھ کر کچھ حیرت آمیز پرائڈ ہوتی ہے دوسری حیرت اس بات پر ہوتی کہ جوں ہی وہ اپنی گہرے سبز رنگ کی ریلے سائیکل کے پیڈل سے پاؤں ہٹاتے ٹھیک اس وقت پی ٹی کا بگل ہوتا۔ ناممکن تھا کہ اس ڈرل میں ایک سیکنڈ بھی ادھر سے ادھر ہو جائے۔ وہ پورے کالج کی پی ٹی کو ایک Vantage پوائنٹ پر ایک خاص پروقار سٹائل ہاتھ پیچھے باندھ کے ——— کھڑے ہو کر واچ کرتے تھے کیا مجال ہے کہ کوئی لڑکا ذرا سا بھی Wilfully ہل جائے اور ان کی عقابی نظروں کی گرفت سے بچ جائے۔

کرنل رفیق کی سختی مشہور ہے لیکن یہ سختی غلط کاروں کے لیے تھی۔ میرٹ Recognize ہوتی تھی۔ کانٹے کی تول حق حق دار کو ملتا تھا اور بغیر مانگے ملتا تھا لیکن جو مستی کرتا اس کے لیے ان سے بُرا کوئی نہ تھا۔

رفیق صاحب کی "فاروقیت" ان کی سب سے قیمتی Legacy ہے، اس کا شعوری اور لاشعوری اثر اس پوری نسل پر ہے جو ان کے ہاتھوں ملٹری کالج میں پروان چڑھی اور اب یہ روایت ان کے اولڈ بوائز کے حوالے سے کچھ نہ کچھ آگے بڑھ رہی ہے۔

---

[1] کالج نمبر ۲۴۷۶، زمانہ تعلیم ۱۹۵۸ء - ۶۲

ـــــــ بریگیڈئر یعسوب علی[1]

رفیق صاحب نے منجملہ اور باتوں کے دو کام بڑی تاریخی اہمیت کے کیے۔ ایک تو قومی جذبے کو جگایا۔ دوسرے "سب سرگرمیاں سب کے لیے" کے اصول پر تربیت کی۔ یہ محض اتفاق نہ تھا کہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کے پہلے جمہوریہ پر حیدری صاحب نے Hail Republic Day اور رفیلہ محمد حسین صاحب نے اپنی نظم "پاس ہوا اپنا دستور" سنائی۔ اور کالج کا ترانہ کے جی آر کے بجائے پی ایم سی کی ترمیم کے ساتھ پیش کیا گیا پھر جب تک وہ رہے ہر سال یہ تقریب بڑے اہتمام سے منائی جاتی رہی۔ اس طرح مئی ۱۹۵۷ء میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے صد سالہ جشن کی تقریب بھی منائی گئی ان موقعوں پر وہ خود بھی ایک مقرر کی حیثیت سے تقریر کرتے تھے ان کے دور کی ایک بہت قیمتی روایت عمومیت تھی۔ تقریری مقابلے ہیں تو لڑکوں کی کھیپ کی کھیپ حصہ لے رہی ہے۔ مئی جون ۵۸ء کا جشن تمثیل ہے تو سارے ہاؤس، ساری کلاس سٹیج شو کر رہی ہیں، کھیوڑہ، رہتاس منگلا، لاہور کے ایکسکرشنز ہو رہے ہیں تو سارا کالج آ جا رہا ہے رسول ہیڈ ورکس کا پانچ روزہ کیمپ ہے تو پورا کالج وہاں فروکش ہے۔ ان کاوشوں کے پیچھے جو فلسفہ ہے وہ دیکھنے کی چیز ہے انہوں نے برین ٹرسٹس جنرل نالج کے مقابلوں، مضمون نویسی کے مقابلوں، توسیعی لیکچروں کے ذریعے کالج کے کری کیولم کو وسعت اور گہرائی دی۔

ان کے دور میں علی گڑھ سپرٹ بھی پروان چڑھی، حسن صاحب، ایوب صاحب، علوی صاحب، بلگرامی صاحب، راشد صاحب، مظہر صاحب یہ سب علی گڑھ کے ہی ساختہ پرداختہ تھے اور جو نہیں تھے جیسے کیپٹن مختار، مسٹر حیدری، مسٹر اقبال وہ بھی اپنے اپنے دائرہ میں باکمال تھے اور ان سے انہوں نے صحیح کام لیا۔ یہ ان کا کمال تھا۔

ـــــــ محمد رشید[2]

کرنل صاحب چھوٹے بچوں پر بہت مہربان تھے۔ چھٹی کے دن گھنٹوں سومنگ کراتے چار چار پانچ پانچ بچے مل کر ان کو غوطے دیتے اور وہ ان سے پانی میں کھیلتے۔ مجھے پہلے

---

[1] کالج نمبر ۲۴۷۹ زمانہ تعلیم ۶۳-۱۹۵۸ء [2] کالج نمبر ۲۴۸۲ زمانہ ۶۲-۱۹۵۸ء

تو بالکل تیرنا نہیں آتا تھا انہی نے تیرنا سکھایا۔ جب تھوڑا بہت سیکھ گیا تو گہرے میں جانے سے ڈرتا تھا۔ اتھلے میں دو چار ہاتھ پاؤں مار کر منڈیر پہ جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ ایک روز اسی طرح بیٹھا تھا کہ انہوں نے ایک لڑکے کو سمجھا بجھا کر بھیجا۔ اس نے آتے ہی مجھے گہرے پانی میں دھکا دے دیا چند غوطے کھانے کے بعد لامحالہ ہاتھ پاؤں مارے اور بالآخر کنارا پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس تمام عرصے میں وہ مجھے برابر میرے پیچھے پیچھے تھے میں حیران ہو رہا تھا کہ وہ مجھے بچاتے کیوں نہیں آخر کار ہاتھ دے کر انہوں نے باہر نکالا۔ شاباش دی اور کہا۔ بس اب تمہیں تیرنا آ گیا ہے۔ اب گہرے سے نہ ڈرنا۔"

مسٹر فضل حق حیدری کا انٹرویو

راشد: حیدری صاحب جب بریگیڈیر رفیق کا نام آتا ہے تو آپ کے ذہن میں کون سی پہلی امیج ابھرتی ہے؟

مسٹر حیدری: ان کے پہلے ایڈریس کی جب ۷ رجولائی ۱۹۵۲ء کو پرانے کالج ہال میں وہ افتتاحی خطاب کے لیے کھڑے ہوئے تو مجھ سمیت سارا سٹاف بلکہ سارا کالج ہمہ تن سوال تھا۔ لیکن جب جنٹلمین کے بعد وہ شروع ہوئے اور آہستہ آہستہ آنکی پُر رعب پاٹ دار آواز بلند ہونا شروع ہوئی اور فصیح اور بلیغ انگریزی کا دریا چڑھنا شروع ہوا تو چند لمحوں کے بعد ہم لوگ سحر زدہ ہو چکے تھے اور جب قریب دو گھنٹے کے بعد ان کی تقریر ختم ہوئی تو کالج میں ایک نئی سحر طلوع ہو چکی تھی۔ ایک نئے عہد کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور ہم لوگوں کی وہ حالت تھی جو کبھی قدیم یونانیوں کی اوریکل کو سننے کے بعد ہوتی ہوگی۔

راشد: اس خطاب کا کوئی اہم نکتہ؟

مسٹر حیدری: اپنی تقریر کے شروع ہی میں انہوں نے اپنے مخصوص لب ولہجہ میں بہت زور دے کر کہا تھا "کوئی لیڈر پیدا نہیں ہوتا۔ ہر ایک بڑا آدمی اپنے آپ کو بناتا ہے مسلسل جدوجہد، انتھک محنت، ناقابل شکست عزم، اور اپنے امکانات کو بروئے کار لانے کا عزم۔ یہ صفات چاہئیں" یہ الفاظ اس یقین اس قوت کے ساتھ ادا کیے گئے تھے۔ سٹاف تو کیا کوئی سست ترین لڑکا بھی ایسا نہ تھا جو اس آواز سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جب وہ تقریر کرنے اٹھتے تھے تو بہت سے سوال، بہت سے اندیشے ذہنوں میں تھے لیکن جب وہ تھینک یو جنٹلمین کہہ کر بیٹھے ہیں تو ہر اندیشہ دور ہو چکا تھا ہر سوال کا جواب مل چکا تھا۔ اور ہر فرد ایک نئے اعتماد کے احساس سے سرشار تھا۔ اپنے اوپر اعتماد، اپنی مادر درس گاہ پر فخر مادر وطن پر فخر اور اس شخص پر بھی اعتماد جو ان کی قیادت کی ذمہ داری اٹھانے والا تھا۔

ملٹری کالج کے لیے اس خطاب کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ چونکہ یہ طلبا میں ایک

نیا نقطہ نظر، قدروں کا نیا احساس، ذمہ داری/فرض کی اہمیت کا ایک بلند تر احساس سزا کے خوف کے روایتی تصور پر نہیں، بلکہ عزت نفس اور خودی کے تصور پر مبنی لے کر آیا ان کے اس اعلان پر کہ آج سے سزا ختم۔ سب کو حیرت ہوئی، "کیا عملی طور پر اس کا اطلاق ممکن ہے؟ کیا یہ آئیڈیل ازم یہاں چل سکتا ہے؟ ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال تھے۔ چند مہینوں میں کالج کی دنیا بدل گئی۔ اس نشاۃ ثانیہ کی ابتدا نئے خیالات نئے تجربات سے شروع ہوئی۔ نئے دور کا سب سے واضح مظہر آنر سسٹم تھا۔ اس سسٹم نے کیڈٹس کے اندر اپنی ذات کا، اپنی شخصیت کا اپنے امکانات اور اس کے نتیجہ میں ذمہ داریوں کا ایک نیا شعور پیدا کیا۔ اس انقلابی تجربے نے کالج کو ایک نئی منزل سے آشنا کیا۔ سب کی سوچوں کے رُخ بدل گئے۔ متحرک رویّوں نے جنم لیا۔ ذہن کو جلا دینے کی ایک نئی امنگ پیدا ہوئی۔

ان کی خطابت بے حد موثر تھی لیکن اس کی تاثیر ان کے حسن بیان سے زیادہ ان کے حسن نیت میں تھی۔ انہوں نے کسی ایسی چیز کی تلقین نہیں کی جس پر وہ خود عمل پیرا نہ ہوں ان کی حیثیت پارس کی سی تھی۔ جو ان کے قریب آتا تھا، سونا بن جاتا تھا۔

کمانڈانٹ کی حیثیت سے ان کی عزت کی جاتی تھی استاد کی حیثیت سے ان کا احترام تھا۔ اور ایک رہنما فرشتہ کی حیثیت سے ان کی تقلید کی جاتی تھی لیکن سب سے بڑھ کر وہ باپ تھے۔ مربّی اور محسن، اس ایک لفظ میں سب پہلو آجاتے ہیں۔ ان کے فلسفہ تربیت کا بنیادی نقطہ یہ تھا۔ کہ طلبا کو زیادہ سے زیادہ عملی تربیت دی جائے اور باشعور احساس ذمہ داری بیدار کیا جائے۔ کوئی فنکشن ہو، کوئی موقع ہو۔ ان کی پہلی ترجیح طلبہ کی قیادتی تربیت ہوتی تھی ورنہ بہت سے لوگ ایسے موقعوں کو دوسرے غلط یا ثانوی حیثیت کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ طلبا کے مفاد اور قومی مفاد کو ملحوظ رکھنے ہی میں ان کی جیت تھی۔ یہ جو آج انہیں اتنی عزت سے یاد کیا جاتا ہے، اس کا راز بھی یہی ہے کہ وہ کم از کم ان کمزوریوں سے بلند تھے جو عام ارباب اقتدار کے پاؤں کی زنجیریں بن جاتی ہیں۔

راشد : آپ کا اشارہ کن زنجیروں کی طرف ہے ؟

مسٹر حیدری: ہمارے اچھے لوگ بھی خوف اور حرص کے دائرے میں بلکہ بھنور میں پھنسے رہتے ہیں۔ اے سی آر کا خوف اور اپنی کور کے مفادات کی حرص۔

راشد : حیدری صاحب۔ آپ کو ان کے کردار کے کس پہلو نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

مسٹر حیدری ؛ کہا جاتا ہے کہ بعض لوگ دوسروں کی عزت کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھے جو دوسروں کی توہین کو اپنی توہین سمجھتے تھے ہوا یوں کہ ایک سٹاف کانفرنس میں ایک صاحب نے ان کے پیش رو کے بارے میں ایک ایسا فقرہ کہا جس سے انکی تنقیص وتنقید کا پہلو نکلتا تھا یہ سننا تھا کہ رفیق صاحب فوراً جلال میں آ گئے اور کہا میں اپنے پیشرو کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سننا چاہتا۔ انہوں نے اپنے نقطۂ نظر سے ان حالات میں کالج کے لیے کام کیا۔ آپ اپنا کام کیجئے اور تنقید وتنقیص کرنے میں اپنا وقت ضائع نہ کیجئے۔

راشد : پھر ان صاحب کا ردعمل کیا تھا؟

مسٹر حیدری : وہ غریب تو اتنے شرمندہ ہوئے کہ حد نہیں۔

راشد : بات ہی ایسی تھی۔

مسٹر حیدری: اگر دیکھا جائے تو ان غریب کا بھی کچھ ایسا قصور نہ تھا زمانے کی ریت ہی ایسی ہے کہ بیشتر مقتدر حضرات اپنے پیش روؤں پر تنقید سننا پسند کرتے ہیں، چھوٹے بڑے سماجی گروپ میں کچھ درباری تو ضرور ہوتے ہیں۔ وہ اشارہ پاکر سیاہ کو سیاہ تر بلکہ سفید کو بھی سیاہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں میں ایک عام بات کہہ رہا ہوں۔ رفیق صاحب کے میں بہت قریب رہا ہوں مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کسی پیشرو، رفیق کار یا سینئر پر منفی تنقید کی ہو انہیں اپنے اوپر اور اپنے کام پر اتنا اعتماد تھا کہ انہیں کسی پر پتھر پھینکنے یا کسی کو اس کے قد سے چھوٹا کر کے پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کاش ان کی خلوت وجلوت کی باتیں چپکے سے ٹیپ ہو سکتیں ان کی بیشتر گفتگوئیں تو کالج ہی کے بارے میں ہوتی تھیں۔ کالج ان کے لیے ایک مقدس مشن ایک Passion کی حیثیت رکھتا تھا۔ کالج کے بعد دوسرا موضوع پاکستان ہوتا تھا۔ کبھی کبھی مذہب بھی زیر بحث آتا تھا۔ یا پھر لائٹ گپ شپ

موسیقی کا بھی ذوق تھا۔ ان کے ہاں سی ایم ایچ جہلم کے کرنل رشید ساز و آہنگ کی محفلیں اکثر سجاتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا لیکن انہوں نے ذاتیات کو کبھی موضوع نہیں بنایا۔ یہ بھی ان کی بڑائی کا ایک پہلو تھا۔ ان کی اپنی سوچ تھی۔ اپنا نقطۂ نظر تھا۔ اپنا طریق کار تھا۔ وہ خود "یس مین" بالکل نہیں تھے اور یس مین کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے جس سے اختلاف کرنا ہوتا برملا کرتے اسی طرح کسی کی اصلاح کرنی ہوتی تو اسے بلا کر دو ٹوک بات کرتے۔ گھما پھرا کر اشارۃً کنایتہً بات کرنا ان کا وطیرہ نہیں تھا۔

راشد: حیدری صاحب۔ ابھی آپ نے کہا کالج کے بعد ان کا موضوع پاکستان ہوتا تھا اس کی کوئی مثال۔

مسٹر حیدری: وہ کٹر پاکستانی تھے۔ وہ پاکستان کے خلاف مذاق میں بھی ایک لفظ نہیں سن سکتے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں جہلم کلب میں سٹیشن کمانڈر کی میم کو جھاڑ پلانے کا قصہ میں آپ کو کئی بار سنا چکا ہوں۔ ان کے آنے سے پہلے یہ کالج ملک معظم حضور شاہ برطانیہ کا ضرورت سے زیادہ وفادار تھا (۱۹۵۱ء کے تربیت کے جوبلی نمبر میں جارج پنجم کے پورے صفحے کی جو تصویر چھپی تھی اسے یاد کیجیے) انہوں نے اس ادارہ کی روح کو پاکستانی بنایا۔

راشد: گویا مشرف بہ پاکستان کیا۔

مسٹر حیدری۔ وہ اس کالج کے ایک ماسٹر بلڈر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

——— مسٹر عبدالحمید قریشی

جب وہ یہاں کمانڈانٹ ہو کر آئے تو انہوں نے مجھے اپنے استاد کی حیثیت سے وی آئی پی ٹریٹ منٹ دینا شروع کیا جو بعض اوقات میرے لیے بڑی شرمندگی کا باعث بنتا تھا۔ اس لیے ایک روز جب انہوں نے مجھے اپنے بنگلے پر دعوت دی تو میں نے اس مسئلہ پر ان سے سیر حاصل گفتگو کی اور آخر کار میں نے ان سے یہ معاہدہ کیا کہ بنگلے کے اندر جو مرتبہ وہ مجھے دینا چاہیں دیں لیکن کالج میں ہمارا رشتہ کمانڈانٹ اور انسٹرکٹر کا ہوگا۔ میں نے ان سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ وہ لوگوں کو یہ نہ بتائیں کہ انہوں نے کبھی مجھ سے پڑھا بھی ہے لیکن انہوں نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ اگرچہ خود میں نے کسی کو اس

بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن وہ اہم شخصیتوں کو بڑے فخر سے بتایا کرتے تھے کہ مسٹر عبدالمجید قریشی میرے کپورتھلے کے استاد تھے یہ عظیم انسان کسی کی عزت کرنے یا قدر کرنے سے خائف نہیں تھا۔ کام سے انہیں عشق تھا۔ ذمہ داری کا احساس جتنا اور جیسا ان کو تھا اس کی نظیر کم از کم میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ ایک بار میں کوئی ڈیڑھ بجے رات ان کے بنگلے کے لان سے ان سے رخصت ہوا۔ اور مین گیٹ کے راستے سے سرائے میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ رات بھیگ چلی تھی۔ فضا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ اس لیے ذرا آہستہ قدم اٹھاتا چلا۔ جب میں خود محمود غزنوی ہاؤس کے پیچھے کی طرف پہنچا تو دیکھا کہ رفیق صاحب ہاؤس سے نکل رہے ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ حالانکہ ان دنوں ان کے ایک پاؤں میں پلاسٹر آف پیرس بھی لگا ہوا تھا فٹ بال کھیلتے ہوئے پاؤں میں کوئی چوٹ آجانے کی وجہ سے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ میرے اٹھتے ہی تیزی سے ہاؤس چیک کرنے روانہ ہو گئے تھے۔

ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ہر جگہ، ہر وقت ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان میں جسمانی توانائی غیر معمولی تھی۔ بہت کم وقت سو کر یا آرام کر کے وہ بہت زیادہ کام کر سکتے تھے۔ اکبر بادشاہ، نپولین وغیرہ کے بارے میں پڑھا تھا کہ بہت کم سوتے تھے۔ اور انتھک تھے یہ صفت میں نے رفیق صاحب میں اپنی آنکھوں سے دیکھی۔

میں اکثر ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھا ہوں لیکن مجھے یاد نہیں کہ کبھی انہوں نے کسی کی برائی کی ہو۔ حالانکہ ایسے لوگ تھے جو ان میں کیڑے نکالتے تھے۔ ایسے لوگ تھے جنہوں نے انہیں کسی نہ کسی موقعہ پر نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے سامنے بھی کسی کو کسی کی برائی کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ بنیادی طور پر نڈر آدمی تھے اور بزدلی کے ہر مظاہرے سے انہیں نفرت تھی۔

ان کی آخری علالت کے دوران ایک آدھ بار ان کی عیادت کو گیا۔ اس وقت میں نے یہ بات نوٹ کی کہ وہ اپنی ذات کے بارے میں بھی بہت کم بات کرتے تھے۔ اکثر بیماروں کی عادت ہو جاتی ہے کہ وہ عیادت کرنے والے سے اپنی بیماری اور علاج کی تفصیلات بیان کرتے رہتے ہیں۔ رفیق صاحب نے شدید بیماری کی حالت میں بھی اپنے آپ کو

یا اپنی بیماری کو موضوع گفتگو کبھی نہیں بنایا۔ اگر عیادت کے لیے آنے والا ملٹری کالج سے وابستہ رہا ہوتا تو اس سے بیشتر وقت کالج کی باتیں کرتے رہتے۔ ورنہ پاکستان اور عالم اسلام زیر بحث رہتا۔

مسٹر ایوب خاں کی یادیں

۲۴؍ اکتوبر ۱۹۵۵ء کی صبح نو بجے ان کا لیکچر تھا۔ ہر طرف ہلچل تھی کہ نئے کرنل کا پہلا ایڈریس ہے جانے کیا کہیں گے۔ اس وقت کیمسٹری ہال کالج ہال کا کام دیتا تھا۔ وہاں لیکچر تھا پونے نو بجے کے قریب میں سٹاف روم کے سامنے سے گزرا تو دیکھا کہ سامنے ڈرائینگ ماسٹر قاضی عبدالحکیم صاحب صوفے پر دوہرے ہوئے بیٹھے ہیں۔ میں قریب گیا تو دیکھا کہ ان پر دمے کا شدید دورہ پڑا ہے۔ بمشکل انہوں نے اتنا کہا کمانڈانٹ صاحب سے کہو میرا کوئی بندوبست کریں۔ مجھے میرے گھر کے قریب سی ایم ایچ بہاولپور داخل کرائیں ان کو یہ بھی بتانا کہ اس وقت میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ قاضی صاحب کی حالت اتنی غیر تھی کہ دیکھی نہیں جاتی تھی چونکہ وقت بہت کم تھا۔ میں سیدھا ہال گیا وہاں سب لوگ بیٹھ چکے تھے۔ رفیق صاحب باہر گھڑی پر نظر رکھے کھڑے تھے۔ سٹاف افسر بمع سی آئی دروازے پر تھے۔ میں نے جاتے ہی کہا۔ سر مجھے فوری طور پر آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ وہ مجھے ایک طرف لے گئے تو میں نے مختصراً انہیں صورت حال سے آگاہ کیا اور قاضی صاحب کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے صرف اتنا کہا "تھینک یو مسٹر ایوب۔ آپ بیٹھئے" میرے اندر کی طرف رُخ کرتے ہی انہوں نے سٹاف افسروں کو اشارہ کیا۔ اس عرصے میں وقت ہو چکا تھا۔ زیادہ سے زیادہ انہوں نے ایک منٹ اور لیا ہو گا (غالباً تمام زندگی میں یہ پہلا ایک منٹ ہو گا جب وہ لیٹ ہوئے ہوں گے) اور وہ اندر داخل ہو گئے۔ اور اپنی مشہور تین گھنٹے کی تقریر کی جو کالج میں ایک نئے تاریخی دور کا نقطہ آغاز تھی۔ میں تقریر بھی سن رہا تھا اور کبھی کبھی یہ بھی خیال آتا تھا کہ یہ تو تقریر میں محو ہیں غریب قاضی صاحب کا کیا حشر ہوا ہو گا۔ لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے تقریر کے اختتام پر تقریباً سوا بارہ بجے ایس ایم نے بتایا کہ قاضی صاحب کو جیپ پر بٹھا کر ایک

آدمی کے ساتھ سی ایم ایچ بہاولپور روانہ کیا جا چکا ہے جب تین چار ماہ کے بعد قاضی صاحب صحت یاب ہو کر لوٹے۔ تو اب مسئلہ ان کی طویل چھٹی اور تنخواہ کا تھا۔ اب وہ اس مسئلے سے پریشان تھے اور خاصے پریشان تھے: رفیق صاحب نے کہا۔ قاضی صاحب یہ آپ کا دردِ سر نہیں آپ بچوں کے کورس پر توجہ دیجئے اور کمی پوری کرا دیجئے۔ یہ مسئلہ مجھ پر چھوڑ دیجئے اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ یہ ان کی خوئے دلنوازی تھی۔ کام کی قدر بھی کرتے تھے اور انسان کی بھی۔

۱۹۵۶ء کے اواخر میں جب سویلین انسٹرکٹر کو بھی کمیشن کرنے کی کارروائی شروع ہوئی تو انہوں نے انتہائی کوشش و کاوش سے اے جی جنرل امراؤ کو قائل کیا کہ سب کو ان کی سینارٹی سے کمیشن کیا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے جنرل امراؤ یکایک مشرقی پاکستان چلے گئے جس کی وجہ سے ان کی سکیم پر جزوی طور پر عمل ہو سکا۔ کچھ کمیشن ہو گئے اور کچھ رہ گئے۔ جو رہ گئے تھے ان کے بارے میں جی ایچ کیو کی تجویز تھی کہ انہیں فوری طور پر کالج سے فارغ کر دیا جائے اس کے لیے احکامات بھی جاری ہونے لگے تھے کہ پھر رفیق صاحب آڑے آئے اور انہوں نے ان احکامات کو منسوخ کروایا نہ صرف منسوخ کروایا بلکہ انتہائی تگ و دو کر کے سویلین اساتذہ کو مستقل بھی کروایا۔ اور جب یہ سب کچھ ہو گیا تو نہایت خاموشی سے ہمیں بتایا کہ آپ لوگ مستقل کر دیئے گئے ہیں۔ میں چونکہ ان دنوں چھٹی پر ہنگو میں تھا اس لیے انہوں نے مجھے وہاں اطلاع دی۔ اس طرح کہ جیسے یہ کام از خود ہو گیا ہے۔ اس کا ذرا کریڈٹ نہیں لیا۔ وہ اتنے بڑے تھے کہ انہیں اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔

اب میں دو چار باتیں ان کے انتظامی رویوں کے بارے میں بتاتا ہوں۔ ٹرن آؤٹ کو وہ جتنی اہمیت دیتے تھے وہ سب کو معلوم ہے اس لیے کپڑوں کو اکثر چیک کرتے جب لڑکوں نے بار بار یہ بتایا کہ سر دھوبی بنڈل نہیں لایا تو انہوں نے ادھر بھی توجہ دی دھوبیوں کے کپڑے لانے لے جانے کا پروگرام بنایا۔ متعلقہ افراد کو اس کی تعمیل کی ہدایت کی۔ اور اس پروگرام کی ایک کاپی جیب میں رکھ لی۔ ایک دن ہمارے ہاؤس کے کچھ لڑکوں کو انہوں نے چیک کیا۔ ان کا جواب وہی کہ دھوبی کپڑے نہیں لایا۔ وہ ہاؤس

میں آئے اور ہاؤس ماسٹر مسٹر مظہر صاحب سے پوچھا۔ انہوں نے تصدیق کی کپڑے واقعی دو دن لیٹ ہیں حالانکہ انہوں نے دھوبی سے رابطہ قائم کیا ہے اور اے او لیفٹیننٹ شعیب کو بھی اطلاع دی ہے۔ رفیق صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے اور چلے گئے لیکن وہ کہیں اور نہیں گئے۔ سیدھے دھوبی گھاٹ پہنچے۔ وہیں اے او کو بھی بلالیا اور جیب سے پروگرام نکالا۔ پھر جو ڈرامہ ہوا ہو گا۔ اس کا اندازہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جو ان کے باز پرس کرنے کے طریقے سے واقف ہیں۔ دوسرے روز اے او لیفٹیننٹ شعیب نے مظہر صاحب سے بڑا گلہ کیا اس گلہ سے ہمیں کچھ اندازہ ہوا کہ ان کی کتنی کھنچائی ہوئی ہو گی ان کی انتظامی صلاحیت بے پناہ تھی کہا کرتے تھے حکم دے دینا۔ آرڈ نکال دینا پلان بنا دینا آسان ہے اصل مرحلہ اور اصل کام ان کی تکمیل و تعمیل ہے اور یہ فن ان کو آتا تھا۔ اور بہت اچھی طرح آتا تھا۔

سخت لیکن ضروری اقدام کے لیے جس جرأت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں بدرجہ اتم تھی۔ دوسرے دور میں جب وہ آئے تھے تو کالج کی ڈسپلنی حالت تکلیف دہ اور خطرناک حد تک خراب ہو چکی تھی۔ اس صورتحال کے پس منظر میں انہوں نے تمام اساتذہ کے تعاون سے ہر لڑکے کی کارکردگی، صلاحیت اور کردار کا جائزہ لیا۔ اور اتفاق رائے اس امر پر ہوا کہ ستر بہتر لڑکوں کو کالج سے فارغ کر دینا ہی ان کے اور کالج کے مفاد میں ہو گا۔ یہ رائے تو ہم سب کی تھی لیکن آخری فیصلہ تو ان ہی کو کرنا تھا جو انہوں نے بادل نخواستہ کیا اور جب ایک بار فیصلہ کر لیا تو اس سے ہٹے نہیں۔ مجھ سے ایک بار انہوں نے کہا بھی۔ مسٹر ایوب اتنے بہت سے لڑکوں کو بیک وقت نکالنا میری زندگی کا کٹھن ترین فیصلہ تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اس سے کتنے لڑکے اور کتنے خاندان متاثر ہوں گے لیکن مجھے اس کا بھی شعور تھا کہ اگر کالج کو پاک وصاف نہیں کیا گیا تو پھر سارے کے سارے لڑکے اس صورتحال سے متاثر ہوں گے اور پھر جو نقصان ہو گا۔ وہ دس گنا زیادہ پورے ایک ادارہ کا نقصان ہو گا۔ قومی مفاد کا تقاضا یہی تھا کہ یہ سخت گیر مگر ضروری قدم اٹھایا جائے۔ جہاں انہوں نے یہ تطہیر کی وہاں بے شمار تعمیری تدابیر بھی کیں۔ لڑکوں کی تعلیمی و تربیتی

سرگرمیوں کو ہی بدرجہا درجہ بہتر نہیں بنایا، ان کے کھانے پینے کے معیار، کپڑے اور رہنے سہنے کی سہولتوں کو بھی بہتر بنایا۔ یہاں میں ایک مثال لڑکوں کی "کٹ" کی دیتا ہوں۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں ان کے دوبارہ آنے سے پہلے ڈسپلن ہی کی نہیں۔ لڑکوں کی کٹ کی بھی بری حالت تھی۔ ایک عرصے سے کنڈ منیشن بورڈ نہیں ہوا تھا۔ کپڑے چادریں غلاف بو دینے لگے تھے۔ میں سابرٹس ہاؤس میں ہاؤس ماسٹر تھا میں نے ہاؤس آفیسر صاحب سے کہا کہ آپ کبھی کسی ڈارمیٹری کے اندر جاکر بھی دیکھیں کہ صفائی اور کٹ کی کیا حالت ہے۔ وہ کچھ زیادہ نازک مزاج اور نفیس طبع تھے۔ انھوں نے شان بے نیازی سے کہا۔ ایوب صاحب چھوڑیئے۔ میں ڈارمس کی بو برداشت نہیں کر سکتا اور شاید اسی لیے انھوں نے کبھی ہاؤس کے صحن سے برآمدہ میں قدم نہیں رکھا تھا۔ لیکن جب رفیق صاحب آئے اور انھوں نے اپنی پالیسی تقریر میں "کٹ" اور اس کی فوری تبدیلی کا تذکرہ حتمی الفاظ میں کیا اور کہا "ہاؤس آفیسرز اور ہاؤس ماسٹرز خود قابل تبدیل کپڑوں اور سامان کی فہرستیں تیار کریں تو دوسرے دن ان صاحب نے خود مجھ سے کہا ایوب صاحب آپ بھی سہ پہر کو آجائیے گا۔ "آج تو کٹ" کا حساب کتاب کرنا ہے میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ رفیق صاحب نے ان حضرت کو کس مصیبت میں پھنسا دیا۔ جو ڈارم کی بو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ میلے پھٹے پرانے کپڑوں کی بد بو کیسے برداشت کریں گے۔ مختصر یہ کہ کٹ کنڈ منیشن پریڈ کا سماں دیکھنے کے قابل تھا۔ تھوک کے بھاؤ کپڑے بدلے گئے۔ دوسرے روز نئے کپڑوں میں لڑکوں کی چھب اور اکڑ دیکھنے کے قابل تھی۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ گھنٹوں کی اس کارروائی میں وہ خود موجود رہے اور لڑکوں کے نئے کپڑے تک اپنے سامنے فٹ کرائے۔

اب دو ایک دلچسپ واقعات سناتا ہوں جن کے بغیر ان کی شخصیت کی تصویر مکمل نہیں ہوگی۔

یہ قصہ این ڈی احمد صاحب کی الوداعی دعوت کا ہے۔ آفیسرز میس میں کھانے کے بعد محفل جمی ہوئی تھی۔ یاران محفل چہک رہے تھے۔ رات بھیگ رہی تھی اور میں بور ہو رہا تھا۔ جب نیند کا غلبہ زیادہ ہوا تو سر کو دو ایک جھٹکے لگے۔ اتفاق سے ٹھیک اس وقت

رفیق صاحب کی مجھ پر نظر پڑی وہ سرور کے موڈ میں تھے۔ دیکھتے ہی بھڑک اٹھے "مسٹر ایوب، اب تو محفل رنگ پر آ رہی ہے اور آپ کو نیند آنے لگی ہے" میں بیزار بیٹھا تھا۔ میرے منہ سے نکل گیا۔ مجھے محفل کے اس طرح رنگ پر آنے سے دلچسپی نہیں اور نہ میں رات کو دیر تک جاگنے کا عادی ہوں میرا اتنا کہنا تھا گویا رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ سب سناٹے میں آ گئے اور رفیق صاحب غصے سے اٹھ کر باہر جانے لگے۔ کچھ لوگوں نے ان کو منانے کی کوشش کی کچھ نے میرے لتے لیے۔ ایک نیم لفٹین صاحب کچھ زیادہ آگے بڑھے اور انہوں نے فقرہ چست کیا۔ جو لوگ آداب محفل نہیں جانتے انہیں یہاں ہونا ہی نہیں چاہیئے یہ بات انہوں نے اس وقت کہی جب رفیق صاحب دروازے سے نکل کر برآمدہ میں قدم رکھ رہے تھے لیکن اس برہمی کی حالت میں بھی انہوں نے یہ فقرہ سن لیا۔ ایک دم پلٹے۔ اور ان صاحب سے سرزنش کے لہجے میں کہا۔ "تمہیں اس معاملہ میں دخل دینے کی ضرورت نہیں" پھر خود ہی آ کر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ اور کہا "مسٹر ایوب ٹھیک ہی کہتے ہیں واقعی بہت دیر ہو گئی ہے" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے "مسٹر ایوب آئی گیو یو فل مارکس" ان کے اس رویے سے میرا حوصلہ بھی بڑھا میں نے کھڑے ہو کر کہا۔ سر آپ ہمیشہ یہی کہتے ہیں صاف اور سچ کہو میں نے جو میرا احساس تھا صاف صاف بیان کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ آپ اس کی قدر کریں گے۔ یہ سن کر وہ میرے پاس آئے مجھے گلے لگایا۔ اور پھر حاضرین کی طرف کر کے، حضرات، یہ بات یہاں ختم ہوتی ہے اور یہ فقرہ انہوں نے انتہائی نرمی اور مروّت سے کہا۔ سب کو خوشگوار حیرت اور مسرت ہوئی۔ یہ واقعہ ان کی جذباتیت اور ہوش مندی اور شائستگی اور مروّت کی ایک منہ بولتی مثال ہے۔ مولوی محمد حسن صاحب جو خود اپنی ذات سے ایک انجمن تھے اکثر اس واقعہ کا ذکر کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ واقعہ ان کی پوری شخصیت کا غماز ہے۔ اس سے ان کی پوری شخصیت کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شخصیت میں کرم نوازی کا عنصر دوسرے عناصر پر غالب تھا۔ اس کو بھی ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔

رفیق صاحب اپنی جیب میں ایک چھوٹی سی ڈائری رکھتے تھے۔ اس میں ہر کام

نوٹ کرتے رہتے تھے اور جب تک وہ کام ہو نہ جائے، اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔
۱۹۵۲ء کے اواخر میں میں نے ان سے درخواست کی کہ مجھے کالونی کے نئے کوارٹرز میں منتقل ہونے کی اجازت دی جائے۔ انہوں نے کہا۔ ایوب صاحب آپ کو معلوم ہے کہ ابھی تک کالونی کے کوارٹرز پورے طور پر مکمل نہیں ہوئے کچھ کام باقی ہے۔ اگر آپ اسی حالت میں وہاں جانا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے جواب دیا جی ہاں اس حالت میں بھی مجھے وہاں جانا منظور ہے۔ چنانچہ میں وہاں منتقل ہو گیا۔ اس وقت تک وہاں بجلی تک نہیں آئی تھی صرف پانی کا نلکا تھا۔ دو تین دن بعد کرنل صاحب شام کو میرے کوارٹر پر آئے اور پوچھا آپ یہاں کیسا محسوس کر رہے ہیں۔ میں نے کہا سر، فلاں فلاں چیز کی کمی ہے فلاں کام مکمل ہونا باقی ہے۔ اس کی وجہ سے کچھ تکلیف ہے۔ اگر رفیق صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو صاف کہہ دیتا کہ آپ کو تو معلوم تھا کہ کام ابھی مکمل نہیں ہوا۔ یہ جانتے ہوئے بھی آپ اپنی خوشی سے یہاں آئے ہیں، اب شکایت کس بات کی۔ انتظار کیجئے۔ لیکن رفیق صاحب تو رفیق صاحب تھے۔ انہوں نے اپنی چھوٹی سی ڈائری نکالی اور جو کام ہونا باقی تھا اور جو چیزیں لگنا باقی تھیں، ان سب کو نوٹ کر لیا دوسرے دن انہوں نے اے او کو وہ کام نوٹ کرا دیا اور خود بھی ایم ای ایس کے افسروں سے بات کی اب ایم ای ایس کا اپنا ایک طریقہ اور کام کرنے کی رفتار ہوتی ہے ظاہر ہے یہ کام دو چار دن میں پورا ہونے والا نہیں تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ چند روز کے بعد سے سٹاف روم میں چائے کے بریک میں وہ ہر روز مجھ سے پوچھتے مسٹر ایوب، کچھ کام ہوا۔ میں کہتا، نہیں سر، ابھی یہ سلسلہ ہفتے بھر چلتا رہا بلگرامی صاحب قبلہ بڑے ظریف الطبع تھے انہیں مذاق سوجھا۔ کہنے لگے ایوب صاحب اور رفیق صاحب کا معاشقہ ہو گیا ہے روز انہی کو پوچھتے ہیں۔ میں بھی دل میں شرمندہ تھا کہ نامکمل گھر میں بیکار شفٹ ہوا۔ اب ان کو پریشان کر رہا ہوں۔ یا اس سے تو بہتر تھا کہ میں انہیں بتاتا ہی نہیں۔ مختصر یہ کہ جب تک انہوں نے میرے گھر کو ٹھیک نہیں کروا لیا۔ ایم ای ایس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

یہ تو ایک واقعہ ہے۔ سٹاف کے ہر ممبر بلکہ کالج کے ہر ملازم کا وہ اتنا ہی خیال

کرتے تھے اگر ان سب واقعات کو اکٹھا کیا جائے تو اپنی جگہ ایک کتاب بن سکتی ہے۔ اب آخر میں یہ بتاتا ہوں کہ بقول ان کے انہیں کالج کیوں چھوڑنا پڑا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جب وہ کالج میں دوسری بار پوسٹ ہو کر آنے لگے تھے تو انہوں نے جی ایچ کیو سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کالج کے معاملات میں بے جا مداخلت نہیں کریں گے۔ کچھ عرصے تک وہ اس عہد پر قائم رہے، پھر انہوں نے کالج کے معاملات میں خاص طور سے داخلوں کے مسئلہ میں دخل اندازی شروع کر دی۔ یہ اختلاف زیادہ بڑھا تو ڈائریکٹر صاحب نے بات ڈی جی ایم ٹی جنرل حمید تک پہنچائی اور شکایت کی کہ یہ میرا حکم نظر انداز کر رہے ہیں۔ ڈی جی ایم ٹی نے انہیں بلا بھیجا۔ یہ گئے تو وہ بھرے بیٹھے تھے۔ چھوٹتے ہی کہا۔ آرمی میں ڈسپلن پہلی ضرورت ہے اور اس موضوع پر ایک لمبی تقریر جھاڑ دی۔ اس کے جواب میں انہوں نے اپنے دلائل پیش کیے اور فائل سے جی ایچ کیو کی یقین دہانی نکال کر دکھائی اور بتایا کہ اس طرح مداخلت سے نتائج پر کیا اثر پڑے گا۔ ڈی جی صاحب جلال میں آ گئے اور گرم ہو کر کہا کچھ بھی ہو آپ کو حکم ماننا ہے جب بات یہاں تک پہنچی تو کرنل صاحب نے بالکل رسمی انداز سے دو قدم پیچھے ہٹ کر ٹھک سے جنرل صاحب کو سیلوٹ کیا۔ آل رائٹ سر اور پھر کہا میں فوری طور پر اپنی پوسٹنگ چاہتا ہوں۔ اور انہیں پوسٹ آؤٹ کر دیا گیا۔

رفیق صاحب نے اپنے اوپر ملٹری کالج میں بہت Strain ڈالا۔ جب ۱۹۵۵ء میں آئے تو تاب و توانائی سے بھرپور تھے۔ سارے بال سیاہ تھے لیکن جب چار سال بعد ۱۹۵۹ء میں کالج سے جانے لگے تو بالوں میں چاندی چمکنا شروع ہو گئی تھی اور ہلکی سی دمے کی شکایت بھی جسے ان سے بہت قریب رہنے والے ہی محسوس کر سکتے تھے۔ انہوں نے بہت Exert کیا۔ بڑائی کی کچھ قیمت تو ہوتی ہے لیکن ان کا ہر نقش قدم ایک چراغ بن گیا ہے۔

بات کو ختم کرنے سے پہلے ان کی دو ایک اور غیر معمولی خصوصیتوں کا ذکر کرنا چاہوں گا اول تو یہ کہ بہت کھلا ذہن تھا ہر ایک کی سنتے تھے۔ ہر نئی تجویز پر توجہ دیتے تھے

اور اختلاف رائے کو خوش دلی سے برداشت کرتے تھے۔ رینک یا اقتدار کے ساتھ لوگوں کا برخود غلط ہو جانا عام ہے۔ لیکن وہ خود صاحب الرائے اور صاحب اختیار ہوتے ہوئے بھی دوسروں سے رائے اور تجویزیں مانگتے تھے اور اکثر ان کو قبول بھی کر لیتے تھے، یہ بھی کم ظرف کی بات نہیں۔ میں تو یہ کہا کرتا ہوں کہ ملٹری کالج کے لیے ان کی حیثیت ایک تحفہء خداوندی کی سی تھی۔ ورنہ یہ جگہ بہت سوکھ چکی تھی اور خزاں کی گرم ہواؤں کی زد میں تھی۔

بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) محمد شفیع (سابق ڈی اے ای) کا تجزیہ

۵۳-۱۹۵۲ء میں جب میں ملٹری کالج جہلم میں بطور اکیڈیمک انسٹرکٹر اور ہاؤس آفیسر متعین تھا تو مرحوم بریگیڈیئر (اس وقت لیفٹیننٹ کرنل) محمد رفیق کی کمان میں کچھ عرصہ ملازمت کرنے کا موقعہ ملا۔ اپنے تقریباً تیس سالہ دور ملازمت میں مجھے کئی جگہ کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو وقت میں نے مرحوم کی رہنمائی میں ملٹری کالج میں گزارا وہ غالباً سب سے زیادہ صبر آزما، مشقت طلب لیکن نتیجہ خیز تھا۔ ہر روز محسوس ہوتا تھا کہ ماحول میں ایک بیّن اصلاح کی صورت نمودار ہو رہی ہے۔ چنانچہ اپنے دیگر رفقار کار کی طرح ایک احساس حصول مقصد تھا جو ہم سب کو کشاں کشاں رفیق صاحب کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

جونہی رفیق صاحب نے زمام کار سنبھالی اس کے بعد ہفتوں، مہینوں میں نہیں بلکہ دنوں کے اندر اندر ہر ادنیٰ اور اعلیٰ کارکن کو بمع کیڈٹوں کے یہ محسوس ہوا کہ اب پچھلی سہل انگاری کے طریقوں سے کام نہیں چلے گا۔ اور فوری اور ٹھوس کارروائی ہی سے رفیق صاحب کی تشفی کی جا سکتی ہے۔

رفیق صاحب کی شخصیت میں ہیبت اور کشش پہلو بہ پہلو موجود تھیں۔ اچھا کام سرانجام دے کر ان کے سامنے سرخ رو ہونے میں گہری خوشی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کسی کوتاہی پر ان کی سرزنش کا خوف بھی سر پر سوار رہتا تھا۔ ان کی غیر معمولی طور پر موثر شخصیت کے اجزائے ترکیبی کیا تھے؟ اس موضوع پر اپنا تجزیہ

پیش کرتا ہوں۔

تاب و توانائی:

میرا خیال ہے کہ ان کی پرکاری میں ان کی ظاہری صورت و ہیئت کو بھی اتنا ہی دخل تھا جتنا کہ باطنی سیرت و صفائی ذہن کو۔ وہ ایک گٹھے ہوئے ورزشی جسم کے مالک تھے۔ رنگ گو قدرے سانولا مگر نکھرا ہوا۔ چہرے کے نقوش ستے ہوئے آنکھیں بالخصوص بڑی چمکدار تھیں جن میں بڑی جاذبیت تھی۔ اکثر و بیشتر ان کے چہرے بشرے پر ایک خوش آمدیدانہ قسم کی مسکراہٹ غالب رہتی۔ چوڑا چکلا سینہ تھا۔ جسم گوشت پوست کا نہیں بلکہ فولاد کا بنا ہوا دکھائی دیتا۔

ان کی قوت کار اور قوت برداشت بھی غیر معمولی تھی۔ ان کا زیادہ وقت کالج میں گھومنے پھرنے میں گزرتا تھا۔ بہت تیز چلتے تھے لیکن چال میں ایک قسم کا وقار اور تمکنت تھی۔ دفتر میں بہت کم وقت گزارتے تھے۔ اس پھرتیلے پن کی وجہ سے ہر شخص اپنی جگہ چوکنا رہتا کہ معلوم نہیں کس وقت آدھمکیں اور ٹرخانے والوں کی موقع پر گردن دبوچ لیں۔

کھلا ذہن:

ان کی کامیابی کا دوسرا راز ان کا کھلا ذہن تھا۔ وہ ہر کس و ناکس کی اچھی تجویز کا خیر مقدم کرتے اور اس پر اولین فرصت میں عمل کر کے اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ میں نے اپنے لمبے عرصۂ ملازمت میں بہت کم ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جن کے دل و دماغ کے دریچے تازہ جھونکوں کے لیے اس درجہ کھلے ہوں۔ انہوں نے کبھی یہ تاثر نہیں دیا کہ میں عقل کل ہوں حالانکہ یہ وہ کمزوری ہے جو عموماً ارباب اختیار و اقتدار میں عہدے اور منصب کی بلندی کے تناسب سے بڑھتی جاتی ہے۔ اور آخر میں لے بیٹھتی ہے رفیق صاحب اس کمزوری سے بدیہی طور پر مبرا تھے وہ صحیح معنوں میں ٹیم ورک کے قائل تھے اور اپنے رفقاء کار کی موزوں تجویزوں اور مشوروں کو اپنے لائحہ عمل میں جذب کر کے وہ ٹیم سپرٹ پیدا بھی کر سکتے تھے، اپنے اسی رویے کی وجہ سے وہ اپنی ٹیم کے ہر فرد سے ان کی صلاحیتوں کی آخری حد تک کام لے سکے اور اپنے ماتحتوں کے تجربوں کے نچوڑ کو کام

میں لا کر اصلاح احوال کی وہ کامیاب کوشش کی جو آمرانہ بند ذہن کے رویے سے ممکن نہیں تھی ۔ لیکن کھلے ذہن سے یہ مراد نہیں کہ وہ کوئی موم کی ناک تھے کہ دوسروں کی رایوں اور مشوروں کے رحم و کرم پر ہوں ۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے اپنے تصورات بہت واضح تھے ۔ اپنی ترجیحات کے بارے میں ان کے ذہن میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا اور ان کی اپنی قوت تمیز بہت تیز اور قوت فیصلہ بہت مستحکم تھی ۔ باتوں سے یا عالمانہ بحثوں سے انہیں چکر نہیں دیا جا سکتا تھا ۔ انہیں اصول اور فرع کا فرق معلوم تھا ۔ وہ جانتے تھے کہ کہاں اڑنا ہے ، کہاں دبنا ہے کس کی بات سننی ہے اور کس کو لتاڑنا ہے ۔

میں رفیق صاحب کا اسی لیے قائل ہوں کہ شریف النفس اور کریم النفس ہونے کے ساتھ وہ سنگ خارا بھی تھے ۔ مومن کی فراست بھی رکھتے تھے ۔ پیتے بازی، چالاک، خودغرض انسان خواہ کسی بہروپ میں آئے وہ اسے فوراً پہچان لیتے تھے ۔

میں نے ان سے جو بات سیکھی وہ یہی تھی کہ ضروری نہیں کہ بھلا آدمی کمزور بھی ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ مضبوط آدمی آمرانہ رویہ بھی رکھتا ہو ۔

انسان دوست رویہ :

وہ بہت سخت گیر تھے ۔ غلطی کی صورت میں ان کی گرفت سے بچنا تقریباً محال تھا لیکن وہ مردم آزار ہرگز نہیں تھے ۔ ان کی کامیابی کی تیسری وجہ ان کا کمانڈ کی بابت انسان دوست رویہ تھا ۔ وہ اپنے ماتحتوں پر جہاں سختی کرتے وہاں ان کی حتی الامکان مدد کرنے سے بھی گریز نہ کرتے مثلاً مجھے یاد ہے کہ ان کے پہلے دور کمان میں جس میں رفتار کار دوسرے دور کے مقابلے میں زیادہ تیز تھی' انہوں نے سب سٹاف کو خصوصاً چار ہاؤس ماسٹروں کو (جو ہمہ وقتی انسٹرکٹر کے فرائض بھی انجام دیتے تھے) اتنے گوناگوں کام سونپنے کہ ان سے عہدہ برآ ہونا تقریباً ناممکن ہو گیا ۔ چنانچہ تنگ آ کر ہم ہاؤس ماسٹروں نے ایک لمبا چوڑا چارٹ بنایا جس میں تمام قسم کی ڈیوٹیوں کی تفصیل اور ان کی کماحقہ' ادائیگی کے لیے درکار وقت کا مفصل حساب لگایا جس سے معلوم ہوا کہ دن رات کے ۲۴ گھنٹوں کے مقابلے میں بشمول کم از کم جسمانی حوائج کے ۲۶ ، گھنٹے درکار ہیں ۔

ہم یہ عرضداشت لے کر جب رفیق صاحب کی خدمت میں وفد کی صورت میں حاضر ہوئے اور کہا ہمارے حساب میں اگر مبالغے سے کام لیا گیا ہے تو وہ نکال دیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اب تو ہمارے پاس اپنی بیویوں سے بات کرنے کے لیے بھی وقت نہیں رہ گیا ہے تو خوب ہنسے اور فی الفور اوقات کار میں مناسب حد تک تخفیف کر دی۔ اس قسم کے اور کئی واقعات سے ان کے ہمدردانہ رویے کی عکاسی ہوتی ہے۔

نوکری برائے خدمت:

ایک اور خاصیت جوان کی قیادت کو دوسروں سے ممیز کرتی ہے، وہ نوکری برائے نوکری نہیں بلکہ نوکری برائے خدمت کا اصول تھا۔ مرحوم اس بات کا اپنے آپ کو سختی سے پابند سمجھتے تھے کہ حکام بالا کے ناجائز دباؤ کے نیچے آکر وہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے مستحق افراد کی حق تلفی ہوتی ہو۔ آخری بار جب گھوڑا گلی کالج میں جہاں ریٹائرمنٹ کے بعد پرنسپل بنا دیئے گئے تھے میری ان سے ملاقات ہوئی تو مرحوم نے انکشاف کیا کہ ملٹری کالج میں میرٹ کی بنا پر داخلے کے اصول میں اوپر سے ناروا خلاف ورزی اور غیر مستحق لڑکوں کو ان پر ٹھونسنے کے خلاف احتجاج کے طور پر انہوں نے کمانڈ سے علیحدگی کا مطالبہ کیا تھا۔ بعد میں دباؤ ڈالنے والوں نے اپنی غلطی کا اعتراف بھی ان سے کیا۔

میرے یہ تاثرات ان کے پہلے دور قیادت کے بارے میں ہیں جو ۵۳-۱۹۵۲ء میں تقریباً سال بھر جاری رہا اس کے دو سال بعد جب ایک برطانوی نژاد پرنسپل کے زیر سایہ ملٹری کالج کی کشتی بری طرح گرداب میں پھنسی تو اس سے نکالنے کیلئے ایک بار پھر رفیق صاحب جیسے تجربہ کار کھویئے کا سہارا لینا پڑا۔

ان کے ذہن میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ قوت تحریر و تقریر دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔ اپنا مافی الضمیر مختصر اور واضح لفظوں میں بیان کرنے پر قادر تھے۔ سامع یا قاری کو کسی قسم کی غلط فہمی نہیں رہتی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ وہ دوستوں کے ساتھ مروت اور مخالفوں کے ساتھ فراخدلی سے پیش آتے تھے۔

ان کا کشادہ سینہ کینہ اور گھٹیا جذبات سے پاک تھا۔ اکڑفوں والوں کی خوب خبر

لیتے اور گرے ہوؤں پر شفقت کرتے۔

—— بڑے مہمان نواز تھے۔ ان کے دستر خوان پر ہر قسم کے لوگ نظر آتے۔

—— قومی خزانے کو امانت تصور کرتے اور کبھی اپنی ذات کیلئے اس سے فائدہ نہ اٹھاتے۔

کاش کہ ان جیسی بے باک اور بے داغ ملازمت زیادہ لوگوں کے حصے میں آئے۔

بلگرامی صاحب کے تاثرات

باسمہ سبحانہ

بریگیڈیئر رفیق مرحوم کی سیرت و کردار کو ہم قرآن حکیم ہی کے الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں۔

اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ۔

یعنی کافروں کے لیے وہ پتھر کی چٹان۔ آپس میں رحمدل، سراپا رحمت و شفقت۔

کہتے ہیں کہ ہر شخص کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ کسی کی کم کسی کی زیادہ — مگر جو کسی قیمت پر نہیں خریدا جا سکتا تھا۔ وہ رفیق تھے۔ نہ وہ جعفر ہو سکتے تھے نہ صادق، بلکہ اپنے دور کے ہر جعفر و صادق سے نمٹنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔

ملٹری کالج میں دو بار بحیثیت کمانڈنگ آفیسر آئے۔ دونوں دفعہ کالج کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کے لیے انتظامی قابلیت کے لحاظ سے ان کا جو درجہ تھا وہ اگر کسی سربراہ مملکت کو بھی حاصل ہوتا تو اس کے لیے باعث فخر ہوتا۔

میرا اور اقبال صاحب کا ان کے ہاں اچھا خاصا آنا جانا تھا۔ لیکن میں نے انہیں کسی ملازم پر غصہ کرتے یا سختی سے پیش آتے نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ ایک ملازم نے ایک قیمتی سیٹ کا ایک برتن اپنی لاپرواہی سے توڑ دیا۔ ہم سمجھے اب اس کی خیر نہیں۔ انہوں نے صرف اتنا کہا مسٹر یہ تم نے کیا کیا۔

رفیق صاحب کے لائف سٹائل سے یہ اندازہ بالکل نہیں ہوتا تھا کہ اندر سے یہ کتنے روایتی اور مشرقی ہیں۔ اس امر کی وضاحت میں ایک واقعہ سے کروں گا۔ ایک بار چوہان صاحب، اقبال صاحب اور میں نے یہ سازش کی کسی طرح گھیر گھار کے رفیق صاحب کو بھی برج کلب کا ممبر بنانا ہے۔ چنانچہ اقبال صاحب نے اپنے مخصوص سفارتی انداز میں اس

بات کو چھیڑا۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ حسن طلب کا رخ کس طرف ہے۔ مسکرائے اور کہا۔ میں برج میں آپ کا ساتھ ضرور دیتا لیکن جوانی کے زمانے سے میں نے ماں جی سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ کبھی جوا نہیں کھیلوں گا۔ میں اپنے وعدہ پر قائم رہنا چاہتا ہوں لیکن اگر آپ مجھے اپنے کلب کا خاموش ممبر بنا سکیں تو اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ چنانچہ انہیں کلب کی اعزازی رکنیت دے دی گئی۔ اگر کبھی ان کا کوئی برج باز دوست آجاتا تو ہم لوگ بلائے جاتے اور لمبی محفل جمتی اور وہ روایتی میزبان کا کردار ادا کرتے۔

یہ آخری واقعہ جو میں لکھ رہا ہوں لاہور کا ہے ایک بار ان سے ملنے گیا تو ایک نیا انکشاف ہوا۔ وہ ایک باریش بزرگ سے جو جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے تھے، گھنٹہ سوا گھنٹہ گفتگو کرتے رہے۔ صاف اور سلیس اردو میں۔ لیکن اس تمام عرصے میں انہوں نے انگریزی کا ایک لفظ استعمال نہیں کیا حالانکہ سیاسی، اقتصادی بحث تھی اس میں انگریزی اصطلاحوں کا آنا جانا گزیر سا تھا۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ رفیق صاحب کسی چیز میں ملاوٹ پسند نہیں کرتے تھے۔ زبان میں بھی نہیں۔

میر کارواں کی یاد میں

عین الدین علوی

ہندوستان اور پاکستان کے طول و عرض میں بہت سے اچھے انسانوں غیر معمولی انسانوں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ غیر ملکوں کے جوہر قابل کو دیکھنے اور ان سے مستفید ہونے کے موقعے بھی ملتے رہے۔ لیکن ان میں ایسے افراد بہت کم نظر آئے جن کے لیے دل احترام سے جھک جاتا ہو۔ جن کے پاس بیٹھ کر روح کو بالیدگی نصیب ہوتی ہو، جنہیں "ارتقا" کا نشان کہا جا سکے۔

بریگیڈیئر رفیق مرحوم انہی چند غیر معمولی انسانوں میں سے ایک تھے۔

کسی شخص کی بڑائی ناپنے کا پیمانہ میرے خیال میں یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے کتنا بے پروا اور کسی بڑے مقصد میں کتنا منہمک رہتا ہے۔ مرحوم اس معیار پر پورے اترتے تھے، انہیں دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ وہ قیادت کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔

اگر ایک رہنما کی لازمی صفتیں یہ ہیں کہ وہ :

خیال کو جلد سے جلد عمل کا روپ دے سکتا ہو۔

دوسروں سے جو کام لینا چاہتا ہو اسے پہلے خود کر کے دکھائے۔

اپنے ہر منصوبے کی عملی تفصیلات اوروں سے پہلے مرتب کر لیتا ہو۔

افسردہ اور بجھے دلوں میں کام کرنے کا ولولہ پیدا کر سکتا ہو۔

مقاصد کی خاطر آرام و آسائش کو قربان کر دینا جانتا ہو۔

سختیوں اور صعوبتوں کا ایسی خوشی سے سامنا کرے جیسے یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہو۔

تو بریگیڈیر رفیق یقیناً ایک رہنما تھے، کیوں کہ یہ تمام اوصاف ان کی ذات میں جمع تھے جلال کے ساتھ جمال اور قاہری کے ساتھ دلبری کا جو مظاہرہ ہم نے ان کی شخصیت میں دیکھا وہ کہیں اور بہت کم نظر آتا ہے۔

مقصد کی لگن :

پہلی ہی ملاقات میں یہ محسوس ہوا کہ وہ اس قسم کی شخصیت ہیں جو ایک دھن میں مگن رہتی ہے، ایک خیال میں سرشار، ان کی یہ دھن، یہ "جذبہ غالب" ملٹری کالج کو مثالی بنانے کا عزم تھا۔ وہ تعلیم اور اس کے مقاصد کا نہایت بلند تصور رکھتے تھے وہ انسانیت کی بہترین قدروں کو یہاں پھولتا پھلتا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ یقیناً اس ادارے کے "معمار اعظم" تھے تقسیم ہند کے بعد اس کالج کے سربراہوں میں ان کی شخصیت بہت بلند و بالا نظر آتی ہے۔ وہی تھے جنھوں نے اس کالج کو پبلک سکول کا روپ دینے کے لیے شب و روز محنت کی اور بڑی خوش اسلوبی سے یہ دشوار کام کر کے دکھا دیا۔ یہ کام ایک ایسا صاحب نظر ہی کر سکتا تھا جو فلسفہ تعلیم کی روح سے بھی آشنا ہو اور عملی دشواریوں سے نمٹنا بھی جانتا ہو۔ ہر دیکھنے والا محسوس کرتا تھا کہ انھوں نے اپنی ذات کو کالج میں گم کر دیا تھا۔ یا یوں کہیے کہ کالج نے سمٹ کر ان کا پیکر اختیار کر لیا تھا۔

تعلیم کا محرم اسرار : کسی قوم کو واقعی ایک قوم کے سانچے میں ڈھالنا تعلیم ہی کا

کارنامہ ہوتا ہے۔ تعلیم کا مشن اتنا ہی وسیع ہے جتنی خود کائنات۔ اسے ایک طرف علم کے بیکراں سمندر کی غواصی بھی کرنی ہے تو دوسری طرف آدمیوں کو انسان بنانا ہے اور یہی تعلیم کا سب سے مشکل مرحلہ ہے جسے مغربی ممالک بھی اپنی تمام ترقیوں کے باوجود سر نہیں کر سکے ہیں۔

ایک تعلیمی ادارے کا کام صرف طلبہ کے ذہنوں میں معلومات کے "تخم" انڈیل دینا اور نئی باتوں کے انکشاف کی ترغیب دینا ہی نہیں بلکہ اس کا کام مستقبل کی تصویر بنانا اور مستقبل کی بنیادیں رکھنا بھی ہے۔ رفیق مرحوم تعلیمی ادارے کی اس تہہ بہ تہہ نوعیت سے اچھی طرح آشنا تھے۔ اڈیپر میں نے کہا تھا کہ وہ ایک ہی دھن میں سرشار تھے۔ دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کا وجدانی ذہن کچھ محدود اور یک طرفہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن وہ اس خامی کا شکار نہیں ہوئے۔ انکی شخصیت ہمہ گیر اور بسیار پہلو بھی تھی۔ بہترین انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ ان کی شخصیت میں ایک لوچ بھی تھا۔ اور بہت سی انسانی خوبیاں بھی۔ ان میں ایک مقناطیسی کشش تھی کہ جہاں وہ ہوتے حاضرین کی توجہ انہی کی طرف رہتی۔

شہرت سے بے پروا:

ان کے سامنے ایک ایسا نصب العین تھا جو رفعت میں آسمان کو چھوتا تھا اور یہ تھا اچھے انسانوں کی تخلیق، یہ ان کا جنون بن گیا تھا۔ ان کے نزدیک کالج کی ٹیموں کا فتح مند ہونا، ٹرافیاں جیتنا، امتحانات میں امتیازی پوزیشن لینا، مختلف میدانوں میں شہرت حاصل کرنا (یعنی وہ تمام چیزیں جو آجکل کسی تعلیمی ادارے کی کامیابی کا ثبوت سمجھی جاتی ہیں) اتنی اہم نہیں تھیں جتنا طلبہ کا کردار اور ان کی شخصیت۔

اچھے خاصے با اصول انسانوں اور قدآور منتظمین کو ایک کمزوری میں اکثر مبتلا دیکھا گیا ہے ان کے مقاصد کتنے ہی تعمیری ہوں ان کی پُر امید نگاہیں اخبار کے کالموں اور ریڈیو ٹی وی کے پروگراموں کی طرف بھی لگی رہتی ہیں۔ اگر پبلسٹی ہو جائے تو تسکین کا احساس ہوتا ہے اور اگر ذرائع ابلاغ خاموشی اختیار کر لیں تو ایک تشنگی رہ جاتی ہے۔ بلکہ بعض حضرات کے یہاں تو کارکردگی کا پروگرام اور پبلسٹی کا پروگرام دونوں متوازی چلتے ہیں۔ لیکن رفیق صاحب اس اعتبار سے بھی عظیم تھے۔ ان کے نزدیک اصل چیز تعلیمی و تربیتی جد و جہد تھی۔ شہرت

اور نام و نمود کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

طلبہ میں جو صفتیں پیدا کرنے کے لیے وہ جنون کی حد تک کوشاں تھے وہ تھیں ہمیشہ سچ بولنا اور کسی سے خوف نہ کھانا۔ سچائی اور دلیری، انہیں دو بنیادی صفتوں پہ وہ سب سے زیادہ زور دیتے تھے۔ کیوں کہ ان کے خیال میں کردار کے ستون یہی ہیں۔ انہوں نے ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا جس میں یہ صفتیں پھل پھول سکیں۔ وہ جب اور جس کیڈٹ میں ان کا مظاہرہ دیکھتے اس کا اعتراف اور حوصلہ افزائی کرنا نہ بھولتے۔ ان کے برعکس خصائص یعنی جھوٹ اور بزدلی کو وہ کسی قیمت پر گوارا نہیں کرتے تھے۔

اس زمانے میں باکسنگ ہر کیڈٹ کے لیے لازمی تھی۔ ایک بار ایک کیڈٹ نے باکسنگ رنگ میں بزدلی کا مظاہرہ کیا۔ حریف کے حملوں سے خوف زدہ ہو کر بار بار منہ چھپانا اور پیٹھ دکھانا اور میدان چھوڑ چھوڑ کر بھاگنا شروع کیا۔ پہلے تو انہوں نے اس کی سوئی ہوئی غیرت کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ دل بڑھایا لیکن جب اس کا رویہ کسی طرح نہ بدلا تو وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ یہ کیڈٹ عزم اور کردار کی اس پختگی سے محروم ہے جو فوج کے افسر کے لیے لازمی ہے چنانچہ انہوں نے اس کو گھر بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

حسن عمل کے ساتھ حسن خیال :

وہ بے حد عمل پسند اور متحرک انسان تھے لیکن ان کی عملیت میں بھی خیال پرستی کی ایک جگمگاہٹ ہوتی تھی۔ ان کا ذہن ہر وقت نئے خیالوں، نئے ارادوں اور منصوبوں سے لبریز رہتا تھا۔ لیکن وہ خیالوں کی دنیا میں ہی کھوئے رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان ارادوں اور خیالوں کو عمل کا روپ دینے میں دیر نہیں لگاتے تھے۔ ہر نئے خیال کے اندر کوئی نہ کوئی ایسا پہلو ضرور ہوتا ہے جسے عملی شکل دی جا سکتی ہے۔ وہ اسی پہلو کو مجسم کر دکھانے کے لیے بیتاب رہتے تھے اور ایسا کرنے کی ان میں زبردست صلاحیت تھی۔ مارکس نے کہیں کہا تھا کہ فلسفیوں نے دنیا کو سمجھنے کی کوشش تو بہت کر لی۔ اب انہیں دنیا کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بریگیڈیئر رفیق بھی ایک "جان بیتاب" رکھتے تھے جو فرسودہ اور بے سود چیزوں کو یکسر بدل دینا چاہتی تھی۔

دلوں کو گرمانے کا سلیقہ:

لیکن آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ جو لوگ بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ عموماً اپنے ماتحتوں میں اپنی جیسی لگن، تبدیلی کی آرزو اور ذوق وشوق پیدا نہیں کر پاتے مگر رفیق جیسا میر کارواں جس کی

"نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز"

ہو، دلوں کو گرمانا خوب جانتا تھا۔ اس کا ذاتی جوش و ولولہ اثر کرنے والی چیز تھی۔ وہ ٹھنڈے پتھروں میں چنگاریاں پیدا کر دکھاتا تھا۔ ان کے اندر دوسروں میں لگن اور ذوق وشوق بیدار کرنے والی جو صفات تھیں ان میں سے دو میرے خیال میں بہت اہم تھیں۔ ایک ان کا ہر منصوبے کے ساتھ پورا خلوص۔ دوسرے طلبہ اور اساتذہ کی محنت اور کوششوں کا بھرپور اعتراف اور داد و تحسین جس کے بعد ان کی ہمت دوچند ہو جاتی تھی۔ ان سے دو چار باتیں کر لینے کے بعد دشوارترین کام بھی آسان نظر آنے لگتے۔

جمہوری مزاج:

ان کے کردار میں قابل رشک پختگی تھی اور یہی پختگی ان کے راستے میں مشکلات کی دیواریں بھی کھڑی کر دیتی تھی۔ ڈسپلن کا معاملہ ہو تو وہ سفارش یا دباؤ کے سامنے چٹان بن جاتے تھے شاید اسی لیے بعض سطح بین نگاہوں کو ان کا انداز آمرانہ نظر آتا تھا۔ لیکن درحقیقت جمہوریت پسندی اور کشادہ ظرفی ان کا مزاج تھی۔ وہ اچھے مشورے نہایت فراخ دلی سے قبول کر لیتے تھے۔ اظہار خیال کی پوری آزادی دیتے تھے، اساتذہ کو بھی اور طلبہ کو بھی اس سلسلے میں وہ بعض دوسرے کمتر صلاحیتوں والے حضرات کی طرح کسی کامپلکس کا شکار نہیں تھے۔ مہینے میں ایک بار (اور ضروری ہو تو اس سے بھی پہلے) سٹاف کے ساتھ کانفرنس ان کا معمول تھا جس میں نئے منصوبوں کی ضروریات، پرانے منصوبوں پر عملی کام کا جائزہ، کیڈٹوں کی انفرادی کامیابیوں اور کوتاہیوں پر بے جھجک بحث وگفتگو ہوتی تھی۔ کانفرنس کے دوران اساتذہ کے پیش کردہ مفید مشورے نہایت مستعدی سے سنے اور منظور کیے جاتے تھے۔ ان پر جلد از جلد عمل شروع ہو جاتا تھا۔ اس طرح ان اساتذہ کو

درس گاہ کے معاملات میں اپنی شرکت کا خوش آئند احساس پیدا ہوتا اور درس گاہ سے ان کی وابستگی بڑھتی تھی۔

خوشی اور برہمی ذاتی نہیں اصولی تھی :

وہ ذاتی اور نجی قسم کی ملاقاتوں میں تواضع اور مشرقی خوش خلقی اور میزبانی کا دلاویز نمونہ تھے لیکن سرکاری اور منصبی امور میں ان کو کسی ایسی بات پر سمجھوتے کے لیے آمادہ کرنا بے حد مشکل تھا جسے وہ نامناسب سمجھتے ہوں قواعد وضوابط کی خلاف ورزی پر چشم پوشی بھی ایک ایسی ہی چیز تھی۔

ایک ہاؤس ماسٹر نے اپنا تجربہ ہمیں سنایا کہ وہی کرنل رفیق جو دو گھڑی پہلے ان سے نہایت دوستانہ اور ملاطفت آمیز گفتگو کر رہے تھے۔ جب ایک بظاہر معمولی سی فروگذاشت پر دفتر میں بلاکر درشت لہجے میں بازپرس کرنے لگے تو وہ (ہاؤس ماسٹر) حیران رہ گئے اور انہیں شدید جھٹکا محسوس ہوا۔ لہجے کی یہ غیر متوقع درشتی ذرا دیر پہلے کی دلآویزی کے مقابلے میں کچھ اور بھی زیادہ تلخ محسوس ہوئی۔ اس ذہنی چوٹ سے افاقہ پانے میں انہیں خاصا وقت لگا۔ لیکن ان کے اس طرزِ عمل کا سب سے خوبصورت پہلو یہ ہے کہ اس قسم کی سرزنش کے بعد ان کا رویہ دوبارہ اس طرح متوازن ہوجاتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں کیوں کہ ایسی کسی برہمی کے پیچھے ذاتی کدورت کا شائبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔

ایک اور ہاؤس ماسٹر — جنہوں نے محض برادرانہ ہمدردی کے جذبے کے تحت ایک رفیق کار کی تائید وحمایت ایک ایسے معاملے میں کی تھی جس پر کرنل صاحب اس سے برہم تھے روایت کرتے ہیں کہ ”جب کرنل رفیق کو پتہ لگا کہ میں اس معتوب افسر کے ساتھ پوری ہمدردی رکھتا ہوں اور کرنل صاحب کے فیصلے کو غیر منصفانہ سمجھتا ہوں تو میں نے اندازہ لگایا کہ جیسا کہ عموماً ہوا کرتا ہے، میرے بارے میں ان کا رویہ مخالفانہ اور انتقامی ہوجائے گا اور عنقریب مجھے بھی ناخوشگوار صورتحال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر ان نتائج کے لیے آمادہ کرلیا تھا۔ لیکن جب اس معاملے میں ان کے ساتھ گفتگو ہوئی تو میں ان کے اعلیٰ ظرف اور ان کے بڑے دل کا قائل ہوگیا میرے ساتھ ان کے رویّہ میں

کدورت کا شائبہ بھی نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سرے سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

ایک ماہر تعلیم :

اگرچہ وہ معروف معنوں میں تعلیم کے آدمی نہیں تھے۔ ان کا تعلق انفنٹری سے تھا مگر درحقیقت وہ تعلیم سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ پی ایم اے اور جے ایس پی سی ٹی ایس جیسے تربیتی اداروں سے وابستہ رہ چکے تھے۔ تعلیم کے اصول نظریات اور نفسیات کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس شعبے میں ایسی بصیرت پیدا کرلی تھی جو محض تعلیم و تدریس کی ڈگریوں سے نہیں آتی۔

کالج کے مشن میں انقلابی تبدیلی :

ایک بڑا آدمی جہاں بھی ہو سب سے پہلے وہاں کی فکری اساس پر اثر انداز ہوتا ہے بریگیڈیئر رفیق نے ملٹری کالج کی فکری بنیادوں میں ایک صحت مند تبدیلی پیدا کی۔ ان سے پہلے کالج میں مرکزی حیثیت اور بنیادی اہمیت فوجی ڈسپلن کی تھی۔ انہوں نے کالج کی تاریخ میں پہلی بار کیڈٹ کی شخصیت کو درس گاہ کا مرکز اور محور قرار دیا۔ ان کے خیال میں کالج کی تمام سرگرمیوں کا مقصد، اس کے سوا کچھ نہیں کہ کیڈٹ کی پوشیدہ صلاحیتیں آشکار ہوں کالج کے مشن کے بارے میں یہ نقطۂ نظر ایک انقلاب سے کم نہیں تھا۔ انکے زیادہ تر اقدامات اور منصوبے اسی نئے مقصد کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ وہ کیڈٹوں میں پیش قدمی اور خود فکری کی نشوونما کے لیے زیادہ سے زیادہ موقعے دیتے تھے۔ آنر سسٹم، ہاؤس کورٹ (طلبہ کی عدالتیں) پریفیکٹوں کی عزت و احترام۔ ان سب اقدامات کا مقصد یہی تھا۔ وہ ڈسپلن کو محض "حکم" کے ذریعے نافذ کرنے کے قائل نہ تھے۔ وہ طلبہ کے دل میں ڈسپلن کی پابندی کا شوق و جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے وہی راہیں، وہی تدبیریں اختیار کی تھیں جو ایک روشن دماغ ماہر تعلیم اختیار کرسکتا ہے۔

وہ عزت نفس کے احساس کو ایک بہت بڑی محرک طاقت مانتے تھے۔ اسی لیے وہ سب سے زیادہ زور اس بات پر دیتے تھے کہ کیڈٹوں میں اپنی عزت کا احساس پوری طرح بیدار ہوجائے۔ آنر سسٹم کا نفاذ اسی کوشش کا ایک حصہ تھا۔ یہ اقدام

ابھی ابتدائی مرحلوں میں تھا اور کامیابی کی راہ پر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ٹھوس نتائج سامنے آنے لگے تھے۔ طلبہ ایسی حرکتوں سے احتراز کرنے لگے تھے جن سے ان کی آن اور عزت پر حرف آئے۔ اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس پر پردہ ڈالنے کے بجائے جرأت کے ساتھ اس کا اعتراف کر لیتا تھا۔ طلبہ میں سچ بولنے کی جرأت قانون کا احترام بے خوفی اور دیانت داری جیسی صفات ابھرنے لگی تھیں لیکن اسی دوران ان کا تبادلہ ہو گیا اور پھر اس مفید تجربے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

سخت کوشی کا فلسفہ:

بڑا آدمی وہ ہے جس کی نگاہ آسان راستہ چھوڑ کر دشوار کا انتخاب کرتی ہے۔ جسے شدید خطروں سے دست و گریباں ہو کر لطف و مسرت ملتی ہے۔ میرا خیال ہے کسی شخص میں عام لوگوں سے جس قدر زیادہ صعوبتیں جھیلنے کی ہمت اور صلاحیت ہوگی، وہ اسی قدر بڑا لیڈر ہو گا۔ بریگیڈیر رفیق مرحوم کو اس معیار پر پرکھا جائے تو وہ ایک بڑے لیڈر تھے۔ وہ لیڈر ہی نہیں "لیڈر ساز" تھے۔ اس کالج کے سابق طلبہ سے پوچھ کر دیکھئے کہ انہوں نے کس طرح پتھروں کو تراش کر ہیرا بنا دیا۔ کس طرح سینکڑوں کیڈٹوں میں قائدانہ صلاحیتیں پیدا کر دیں جن طلبہ نے ان کے عزم، حوصلے اور سخت کوشی کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور شب و روز مشقتوں کا لطف اٹھایا وہ فولاد اور چٹان ہو گئے۔ تلخیٔ ایام ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ جو حالات ایک اوسط صلاحیت والے افسر کے لیے حوصلہ شکن کہے جا سکتے ہیں، وہ رفیق کے بنائے ہوئے افسروں کے لیے ایک معمولی چیز ہوتے ہیں کیوں کہ رفیق کی تربیت سے "تلخ زندگانی" ان کے لیے انگبین بن گیا تھا۔

صبح کو پی ٹی پر "زمستانی ہوا" کے تھپیڑے کھانا، سردی میں ٹھنڈے پانی سے نہانا اکثر جان لیوا گرمی میں پنکھا چلائے بغیر اپنے کام جاری رکھنا، ٹرانسپورٹ موجود ہوتے ہوئے میلوں پیدل چلنا، یہ وہ سپاہیانہ عادات تھیں جن پر وہ خود بھی کاربند تھے اور دوسروں کو بھی کاربند دیکھنا چاہتے تھے۔

ایسا بھی ہوتا تھا کہ اساتذہ جب اٹھتے بیٹھتے تو زبانیں شکوہ و شکایت میں رواں

ہو جاتیں ان کی سخت کوشی اور سخت گیری پر تبصرے ہوتے۔ اس شخص نے ہمیں مشقت میں ڈال دیا ہے۔ مشین بنا کر رکھ دیا ہے۔ لیکن آخر میں جب یہ خیال آتا کہ ہر افسر کھیلوں پر ہفتے میں دو دفعہ ڈیوٹی دیتا ہے۔ پریڈ میں ہر افسر کی باری دس پندرہ روز بعد ہی آتی ہے لیکن یہ شخص ہر روز کھیلوں پر بھی موجود ہوتا ہے اور پریڈ کے وقت بھی بلا ناغہ حاضر، اسی طرح صبح کو وہ سب سے پہلے بیدار ہوتا ہے اور رات کو سب کے بعد بستر پر جاتا ہے تو ہر شکوہ سنج خود ہی اپنے شکوے پر نادم ہو کر رہ جاتا۔

ہمدردی و دمسازی:

کیڈٹوں کی شخصیت کی نشوونما اور ڈسپلن کے بعد جس چیز کو وہ بڑی اہمیت دیتے تھے، وہ ماتحتوں کی ضروریات اور بنیادی آسائشوں کا اہتمام تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں کی اس قدر عزت اور احترام کرتے تھے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ جس طرح ایک اچھے ڈاکٹر کے زندگی بخش رویئے سے مریض کو آدھی شفا ہو جاتی ہے اسی طرح ان کا انداز گفتگو ہمت و حوصلہ بڑھا دیتا تھا اور دل موہ لیتا تھا۔ ان کی تقریر کا انداز بھی بڑا موثر اور دل پذیر تھا چھوٹے چھوٹے فقرے جن میں یقین اور اعتماد کا زور ہوتا تھا، دل سے نکلتے اور دل میں اترتے تھے۔

احترام قانون کا تصور:

قانون اور ضابطوں کی پابندی کرانے میں وہ بڑے سخت گیر تھے ان کا طریقہ یہی تھا کہ جو کام دوسروں سے کرانا چاہتے تھے، اسے خود اوروں سے پہلے کرتے تھے۔ قانون پر خود سختی سے کاربند ہوتے اس کے بعد دوسروں سے اس کا مطالبہ کرتے۔ ہمارے ملک میں بہت سی خامیوں کی جڑ یہی ہے کہ لوگ قانون کا احترام کرنا نہیں جانتے — رفیق صاحب کی صحبت میں بیٹھ کر قانون کی اہمیت کا احساس بیدار ہو جاتا تھا۔ ہم لوگ کہا کرتے تھے کہ پاکستان کو آٹھ دس رفیق میسر آ جائیں تو ملک کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ مگر رفیق تو ایک ہی تھا۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ہم یہ بھی کہتے تھے کہ کالج کی مختصر بساط اس قدر متحرک اور پُر عزم شخص کے لیے "ظرف بقدر شوق" نہیں۔ اسے کچھ اور وسعت چاہیے۔ ایسا شخص تو کم از کم ایک صوبے کا انتظامی سربراہ ہونا چاہیے۔

سزا کے بارے میں نقطۂ نظر:

اوپر میں نے ذکر کیا تھا کہ وہ ڈسپلن کے لیے تشویق اور نفسیاتی طریقوں سے پورا کام لیتے تھے لیکن جن ہنگامی حالات میں انہوں نے ملٹری کالج کی کمانڈ دوبارہ سنبھالی تھی، ان میں وہ قانون شکنی کو سنگین چیز سمجھتے تھے اس لیے ایسی نوبت بھی آجاتی تھی کہ سزا دینا لازمی ہو جاتا تھا۔ کسی سنگین قصور یا قانون شکنی پر وہ کیڈٹوں کو بید زنی کی جسمانی سزا بھی دیتے تھے اور اس شدت کے ساتھ کہ اس کے عینی شاہدوں کو دوبارہ ویسے قصور کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ میں ذاتی طور پر سزا کے اس طریقے کو تعلیم کے تمام اصولوں کے خلاف سمجھتا ہوں۔ اور میں نے اس بارے میں ان کے سامنے ایک سے زیادہ بار اظہار خیال کیا۔

بہر حال اس سلسلے میں ان کا اپنا نقطۂ نظر تھا۔ ان کے نزدیک اگر کوئی فرد رضا و رغبت سے ڈسپلن پر آمادہ نہ ہو اور اسے درسگاہ سے خارج کرنے میں بھی ضوابط کی رکاوٹیں حائل ہوں تو پھر ماحول کو مزید بگاڑ سے بچانے کے لیے تشدد کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا بہر حال سزا کے سلسلے میں دو دبستان فکر ہمیشہ رہے ہیں۔ ایک حامی دوسرا مخالف اور شاید ہمیشہ برقرار رہیں گے۔

اس تمہید کے بعد جو بات میں کہنے والا ہوں اس پر میں خود بھی تعجب کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ یہ ہے کہ ایسے کیڈٹ بھی جو بید زنی کی سزا کے جسمانی اور ذہنی کرب سے گزرتے تھے، وہ بھی پکا یقین رکھتے تھے کہ اس سزا میں ذاتی عناد یا نفرت کا عنصر قطعی نہیں ہے اور یہ کہ ان کو سزا اس لیے ملتی تھی کہ وہ اس کے مستحق ہوتے تھے۔ چنانچہ ہم نے یہ عجیب اور رقت آمیز سماں اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ۱۹۵۳ء میں پہلی کمانڈ کے بعد تبادلے کے وقت ایک ایسا کیڈٹ جس نے بھی سزا پوری شدت کے ساتھ جھیلی تھی ان کو پھولوں کا ہار پہنانے کے لیے سب سے آگے تھا اور اس کی آنکھوں میں عقیدت و احترام کے آنسو تھے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تقریباً ایک سال کے اندر جب ڈسپلن مستحکم ہو گیا تو یہ جسمانی سزا ختم ہو گئی اور اگلے دو ڈھائی سال میں شاید ہی کبھی اس کی نوبت آئی ہو۔

لوہے کے اندر ریشم :

ان کی شخصیت کو سطحی نظر سے دیکھنے والے کبھی اس کی صحیح پیمائش نہیں کر سکتے۔ ان کا انداز شاید یہ ہو کہ وہ درشت مزاج، مروت سے بے نیاز اور مذہبی شعائر سے بیگانہ تھے لیکن ان کے ظاہری "زرہ بکتر" کے اندر ایک بڑا احساس اور گرم دل دھڑکتا تھا۔ وہ دوسروں کے دُکھ اور تکلیف کو اپنے دکھ کی طرح محسوس کرتے تھے۔ وہ قانون اور اصول کے جتنے سخت تھے انسانی تعلقات میں اتنے ہی بامروّت اور نرم دل تھے۔

مذہبی شعور :

اگرچہ وہ مذہبی ظواہر کے پابند نہیں تھے لیکن ان کو قریب سے دیکھنے والے خوب جانتے تھے کہ ان کے دل میں اسلام کی عظمت کا جو احساس اور اس کی جس قدر محبت تھی وہ ہزار ہا دینداری کا دعویٰ رکھنے والوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی وہ اللہ تعالیٰ پر پختہ ایمان اور توکل رکھتے تھے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو انسانیت کا عظیم ترین معلم سمجھتے تھے ان کا دل حضورؐ کی محبت سے لبریز تھا۔ رمضان کا وہ خصوصی احترام کرتے، پورے روزے رکھتے اور پابندی سے مسجد میں تراویح پڑھتے تھے۔

سرسری نظر سے دیکھنے والے کو ایک اور غلط فہمی بھی ہوتی تھی۔ وہ لباس وضع اور طرزِ معاشرت سے "صاحب بہادر" کا پورا نمونہ نظر آتے تھے لیکن اندر سے بڑے کشادہ ظرف تھے اور چھوٹی سے چھوٹی حیثیت کے آدمی کا احترام کرنے والے وہ "درجہ چہارم" کہلانے والے ملازمین کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور انکی محنت و مشقت کی بڑی قدر کرتے تھے انہوں نے اس قابلِ قدر روایت کا آغاز کیا تھا کہ عید میلاد کی تقریب میں، بڑے کھانے میں افسروں اور کیڈٹوں کے شانہ بشانہ درجہ چہارم کے تمام ملازمین بھی شریک ضیافت ہوں۔ یہ اسی عظیم ہستی کے درسِ مساوات کا ایک عملی مظاہرہ تھا جسکے میلاد کا جشن ہو رہا تھا۔ افسوس کہ یہ روایت بھی انکے بعد جاری نہ رہ سکی۔

ذریعہ تعلیم کے بارے میں نقطہ نظر :

وہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے برقرار رکھنے کے حامی تھے اور اس میں

تبدیلی کے پیہم اور مدلل مطالبے کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ ان کی سب سے بڑی دلیل اس کی حمایت میں یہ ہوتی تھی کہ انگریزی کا ذریعہ تعلیم ہونا طلبہ کے لیے ایک چیلنج ہے اور اردو میڈیم کے مقابلے میں مشکل تر نصب العین پیش کرتا ہے جس کے لیے طلبہ کی بہترین صلاحیتوں کو سرگرم عمل ہونا پڑتا ہے میں ذاتی طور پر انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے ہمیشہ خلاف رہا ہوں جس کے دلائل پیش کرنا اس موقع پر غیر ضروری ہے۔ مجھے کبھی کبھی اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر مرحوم سے تبادلۂ خیال کا اتفاق ہوتا رہا۔ ظاہر ہے میں انہیں ان کے موقف سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکا لیکن ان کی یہ خوبی قابل داد ہے کہ باوجود اس کے کہ اس مسئلے پر ان کے خیالات ایک طبعی میلان کی شکل اختیار کر چکے تھے اور یہ ان کی "پالیسی" کا معاملہ بن گیا تھا۔ پھر بھی انہوں نے میرے تردیدی دلائل پر کبھی ناگواری خاطر کا اظہار نہیں کیا، بلکہ ان کو پوری رواداری سے سنتے تھے۔ نقطۂ نظر کے اختلاف کا احترام ان کی بہت بڑی خوبی تھی۔

طلبہ سے آگاہی:

وہ ایک مثالی پرنسپل کی طرح بڑے باخبر تھے۔ اپنے ایک ایک طالب علم کے خاندانی حالات سے آگاہ، اس کی مصروفیات، اس کے میلانات، اس کی ترقی یا تنزل پر نگاہ رکھنے والے۔ ان کی یہ صفت اکثر ہاؤس ماسٹروں کو بھی حیرت میں ڈال دیتی تھی اور خود کیڈٹوں کو بھی ہر کیڈٹ کا یہی خیال تھا کہ اسی پر ان کی خصوصی توجہ ہے ان کے بے شمار شاگرد ہیں جو پرجوش انداز میں اعتراف کرتے ہیں کہ ان میں کردار اور صلاحیتوں کی کوئی خوبی ہے تو کرنل رفیق کی دی ہوئی ہے۔ کتنے ہی افسر ہیں جو کہتے ہیں کہ ان کی شخصیت کرنل رفیق کی تخلیق ہے۔

اصول کی خاطر قربانی:

ہمارے ملک میں اس قحط الرجال کے زمانے میں بھی قابلیت، ذہانت، ذکاوت اور تیزی و طراری کی کمی نہیں ہے۔ اگر کمی ہے تو اس چیز کی جسے اصول پرستی اور راست کرداری کہتے ہیں بریگیڈیئر رفیق مرحوم ان کمیاب انسانوں میں سے تھے جو اصولوں اور

راستی کی خاطر بڑی سے بڑی تکلیفیں اٹھانے اور خطروں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

وہ ملٹری کالج میں دوبار کمانڈانٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کی پہلی کمانڈ ۵۳-۱۹۵۲ء میں دس ماہ سے زیادہ قائم نہ رہ سکی۔ صرف اس لیے کہ ان سے ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے پر اصرار کیا گیا جسے وہ صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

دوسری بار انہیں کالج کی کمانڈ ۱۹۵۵ء میں اس وقت سونپی گئی جب کہ چند اسباب وعوامل کی بدولت طلبہ میں تشدد، قانون شکنی اور سرکشی کے مظاہرے سامنے آنے لگے تھے ڈسپلن کا قصر لڑکھڑانے لگا تھا اور قریب تھا کہ زمین بوس ہو جاتا۔ اس صورتحال میں اگر کسی ایک شخص کی طرف پُرامید نگاہیں اٹھتی تھیں کہ وہ اس گرتی ہوئی عمارت کو نہ صرف سنبھال سکتا ہے بلکہ دوبارہ اس کی شاندار روایات کو زندہ کر سکتا ہے، تو وہ کرنل رفیق تھے۔

اور واقعی انہوں نے اپنے اس دورِ سربراہی میں ساڑھے تین سال تک شبانہ روز محنت سے کالج کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ ان کو ایک دشوار ترین کام دیا گیا تھا۔ ایک سخت بیمار ادارے کو دوبارہ صحت مند بنانا اور دوسرے اس کی فوجی روایات اور آثار کو تبدیل کر کے پبلک سکول نظام کے سانچے میں ڈھالنا۔

اس کام کے دوران بڑے سخت مقام آئے۔ بڑے نازک مرحلوں سے واسطہ پڑا۔ لیکن وہ ان مراحل سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے۔ انہوں نے اس دوران اونچی سے اونچی سفارش یا دباؤ کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے اور بالآخر اسی پختگی اور استقامت نے ان کو ۱۹۵۹ء میں دوبارہ کمانڈ سے محروم کر دیا۔ جب کہ ان کے کئی قابلِ قدر منصوبے جو پبلک سکول نظام کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے بے حد اہم تھے تشنۂ تکمیل رہ گئے۔

اس دوسری کمانڈ کے دوران، علی الصباح سب سے پہلے پی ٹی گراؤنڈ پر موجود ہونے والا، کھیلوں اور پریڈ کا ہر روز بہ نفسِ نفیس مفصل معائنہ کرنے والا شام کو میس میں محفل آرا ہونے والا کرنل رفیق راتوں کو اکثر ایک ایک بجے تک دفتر میں بیٹھ کر انتظامی منصوبوں کی تفصیلات بھی مرتب کرتا اور اربابِ اختیار کو پرزور اور پختہ دلائل

سے اپنے منصوبوں، درسگاہ کی ضروریات اور مطالبات کا قائل کرنے کے لیے مراسلے بھی لکھنا۔

آخر تک سرگرم :

اس میں بلا کا دم خم تھا۔ لیکن شب و روز کی شدید محنت آخر رنگ لانے لگی۔ تکان کے اثرات نمودار ہونے لگے۔ برانکائٹس کا موذی عارضہ لاحق ہو گیا۔ یہ قدرت کی طرف سے تنبیہ تھی کہ کام کی بے پناہ رفتار میں وقفوں کی ضرورت ہے لیکن آرام کا لفظ اس غیر معمولی انسان کی لغت میں نہیں تھا۔ وہ فطرت کے اس سگنل سے بے نیاز سرگرم کار رہا۔ چنانچہ یہ تکلیف مستقل شکل اختیار کر گئی۔ پھر مشرقی پاکستان کے نامساعد ماحول میں گزارے ہوئے دو سال، اس کے بعد لارنس کالج گھوڑا گلی کی سربراہی جہاں ناموافق کوہستانی آب و ہوا اور چڑھائی کی مشقت جیسے اسباب نے مرض کو شدید کر دیا اور پھر اس نے ضیق النفس کی صورت اختیار کر لی۔

افسوس!

کون کہہ سکتا تھا کہ صحت، چستی اور توانائی کا یہ پیکر ایک کھنڈر بن کر رہ جائے گا۔ آخر میں دل کا عارضہ بھی ہو گیا جس کا دوسرا دورہ پیغام اجل ثابت ہوا۔

لیکن غیر معمولی بات یہ ہے کہ علالت اور مرض کی شدت کے باوجود ان کے حوصلے نے کبھی شکست نہ کھائی۔ زندگی کے بارے میں ان کا رویہ آخر تک پُر امید، روشن، مطمئن اور مثبت ہی رہا۔ وہ کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوئے۔ نہ اپنی ذات کے بارے میں، نہ ملک و قوم کے بارے میں۔

بسیار شیوہ ہاست ... :

ہم نے تو ان کو تعلیمی ادارے میں کام کرتے دیکھا۔ لیکن ان کی شخصیت بسیار جہت یعنی صلاحیتوں سے بھرپور تھی۔ ملٹری کالج میں ان کی شخصیت کے کئی ایسے جوہر ہماری نظروں سے اوجھل رہے جو خالص فوجی ماحول میں، بلکہ میدان جنگ ہی میں نمایاں ہو سکتے تھے۔ ان کے ہونہار شاگردوں نے جو اس وقت فوج میں اہم کلیدی عہدوں پر فائز ہیں ہمیں بتایا ہے کہ کالج سے تبادلے کے بعد جب وہ شمال مغربی سرحد پر

تعینات تھے تو باجوڑ کی مہم میں انہوں نے بروقت پیش قدمی کر کے اور خود نہایت اہم فیصلے کر کے کس لیے جگری اور اعلیٰ جنگی فراست و مہارت کا نمونہ پیش کیا۔ اگر وہ اس موقع پر خود فکری، پیش قدمی اور برمحل فیصلے میں پس و پیش سے کام لیتے تو ہماری فوج کا نہ جانے کتنا جانی نقصان ہوتا اور سپاہیوں کے حوصلے پر جو زہریلا اثر پڑتا اس کا تو اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ان کی دلیری نے جوانوں میں ایک نئے عزم کی لہر دوڑا دی۔ وہ عزم جس کے قدم فتح کے سوا کسی منزل پر نہیں رُکتے۔ یہی موقعے ہوتے ہیں جب قیادت اپنے آپ کو منوا لیتی ہے۔

دو محبوب:

ہم نے یہی دیکھا کہ دیارِ غیر — ملایا — میں پیدا ہونے والے اس پُرجوش پاکستانی کے دو ہی محبوب تھے۔ ایک پاکستان، دوسرا ملٹری کالج، اگر ان کا بس چلتا تو پاکستان کے ہر نوجوان کو "آفاق گیر" بنا دیتے۔ پاکستان کی آن کے بارے میں وہ کس قدر حساس تھے اس کی ایک چھوٹی سی مثال وہ واقعہ ہے جو محب گرامی حیدری صاحب نے سنایا تھا جہلم کلب میں کچھ انگریز اور بیش تر پاکستانی افسر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کلب کے ماحول میں آپ جانتے ہی ہیں گفتگو محتاط نہیں ہوتی۔ پیمانہ و صہبا کے زیر اثر زبانیں کچھ اور بھی آزاد اور بے لگام ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کے ایک انگریز سینئر افسر کی بیوی اپنے انگریز ہم نشین سے باتیں کرتے ہوئے پاکستانیوں کے بارے میں ایک توہین آمیز لفظ کہہ بیٹھی جو دور بیٹھے ہوئے کرنل رفیق کے کانوں تک پہنچ گیا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی آواز گونجی "کس نے پاکستان کی توہین کی ہے؟"

معاملہ خاصا سنجیدہ ہو گیا اور ماحول میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ کرنل رفیق نے اصرار کیا کہ خاتون اپنے الفاظ واپس لے۔ ادھر انگریز افسروں نے دفاع پہ کمر باندھی۔ کچھ پاکستانی افسروں نے بھی معاملے کو رفع دفع کرنے کے لیے ان کا ساتھ دیا۔ لیکن کرنل رفیق اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک اس خاتون نے برسرِ عام معافی نہیں مانگ لی۔

ملٹری کالج سے ان کا جذباتی لگاؤ بھی غیر معمولی تھا۔ ۱۹۵۹ء میں انہوں نے ملٹری کالج کو خیر باد کہا تھا۔ لیکن کالج کے واقعات اور کیڈٹوں کی بہت سی تفصیلات آخر تک انکے حافظے پر نقش تھیں۔ جب بھی کالج کے سابق طلبہ یا ہم اساتذہ میں سے کوئی ان سے نیاز حاصل کر لے جاتا تو پرانی یادوں کا البم ان کی نگاہوں کے سامنے کھل جاتا اور اکثر جذبات میں ایسا مد و جذر برپا ہوتا کہ رقت طاری ہو جاتی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ملٹری کالج کی سربراہی کا زمانہ ان کے بہترین دنوں میں سے تھا۔ کالج کی ترقی اور کامیابیوں کا ذکر سنتے تو روحانی خوشی محسوس کرتے تھے۔ کالج کی بہتری اور ترقی کی تجاویز آخری ایام میں بھی ان کے ذہن میں موجود تھیں۔ ان کے جانے کے بعد اس درس گاہ کو کئی نشیب و فراز سے گزرنا پڑا، ترجیحات بدلتی رہیں لیکن انہوں نے کالج کو جو نصب العین دیا تھا، جو سماجی اور اخلاقی قدریں عطا کی تھیں، جن روشن راہوں سے آشنا کیا تھا، وہ ہمیشہ جستجو کرنے والوں کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔

محسوس کر رہا ہوں کہ مرحوم کی شخصیت کا یہ خاکہ طویل تو ہو گیا مگر ابھی بہت تشنہ ہے۔ ایک بڑے انسان کی شخصیت کو چند سطروں یا صفحوں میں سمیٹنا آسان نہیں۔

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

اس لیے قلم روکتا ہوں۔

کیپٹن (ریٹائرڈ) سید واصف علی کے تاثرات

راشد: سر رفیق صاحب کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟

سید صاحب: ان کے کردار میں فاروقی انداز تھا۔ گرم دم جستجو نرم دم گفتگو۔ جلال و جمال دیانت و فراست کا یہ حسین امتزاج کسی کسی میں ہوتا ہے۔ وہ قائد اعظم کی قبیل کے آدمی تھے، وہی شان وہی تمکنت، وہی جرأت، وہی حرارت

گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

ان کے لیے بھی کہا جا سکتا ہے۔

ان میں ایک خاص طرح کی عاجزی اور خاکساری بھی تھی وہ اپنی تعریف کو پسند نہیں

کرتے تھے اور اپنے آپ کو پروجیکٹ کرنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کتاب کا جواز یہی ہے کہ ان انسانی اور اخلاقی قدروں کو اجاگر کیا جائے جنکی وہ علامت تھے۔

راشد: ان کے تعلیمی رول کے بارے میں کچھ فرمایئے۔ بحیثیت معلم کے آپ نے انہیں کیسا پایا؟

سید صاحب: اگرچہ وہ سکہ بند استاد نہیں تھے۔ معلمی کی کوئی رسمی سند ان کے پاس نہیں تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر معلم اور مصلح تھے۔ تعلیم و تعلّم کے اسرار و رموز پر ان کی عارفانہ نظر تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ عملی طور پر ان سے بڑا ماہر تعلیم کم از کم مجھے اپنی زندگی میں نہیں ملا۔ کتابی باتیں دہرانا اور بات ہے لیکن فلسفہ تعلیم اور طریق تعلیم کا ادراک ہونا اور چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحیثیت میتھڈ افسر پی ایم اے میں، بحیثیت چیف انسٹرکٹر جے ایس پی سی ٹی ایس میں اور بحیثیت کمانڈانٹ ملٹری کالج میں اور بحیثیت پرنسپل گھوڑا گلی کالج میں وہ کامیاب رہے اور بہت کامیاب رہے۔ ان کی حیثیت پارس پتھر کی سی تھی جس کو لگا اسے کندن بنا دیا۔

راشد: جے ایس پی سی ٹی ایس کی کوئی خاص یاد؟

سید صاحب: اس زمانے میں کوئٹہ میں ایک شیکسپیئر سوسائٹی تھی۔ اس نے کئی ڈرامے سٹیج کیے تھے۔ ایک بار رفیق صاحب مجھے ایک ڈرامہ میں لے گئے۔ غالباً اوتھیلو تھا۔ یوں بھی انہیں مطالعہ کا شوق تھا۔ انگریزی تو قلم برداشتہ لکھتے تھے اور بے تکلف بولتے تھے آخر میں ایک بہت اہم خصوصیت کا ذکر کروں گا۔ وہ یہ کہ مرحوم بر خود غلط بالکل نہیں تھے اپنی بلانوشی کے زمانے میں بھی بنیادی طور پر مذہبی انسان تھے۔ اور مذہبی قدروں پر ان کا بڑا پختہ یقین تھا۔ رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ نامعقول آدمی معقول شاعر نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں لامذہب آدمی معقول قائد نہیں ہوتا۔ رفیق صاحب نے مجھ سمیت بے شمار انسانوں کو اپنے کردار سے متاثر کیا اور ان کے کردار کو بقدر ظرف پختہ کیا۔ یہ کوئی معمولی کام اور کارنامہ نہیں ہے۔

—— میجر (ریٹائرڈ) عبدالعزیز ہاشمی اے۔ ای۔ سی

ملٹری کالج میں میں چند سال انسٹرکٹر اور پھر چیف انسٹرکٹر رہا۔ یہ ادارہ مجھے اس

حوالے سے عزیز ہے کہ یہاں مجھے میرا رہبر و ملا۔ وہ شخصیت جس نے کم ازکم مجھ گنہگار کے دل میں عزم فاروقی اور عدل فاروقی کی یاد تازہ کر دی۔

کرنل رفیق کی (اس زمانے میں وہ لیفٹیننٹ کرنل تھے اس لیے اضطراری طور پر اسی طرح نام ذہن میں آتا ہے) خصوصیت تھی کہ وہ جزئیات میں جاتے تھے انہوں نے کیڈٹس کو حکم دے رکھا تھا کہ موزوں پر گارٹر استعمال کریں تاکہ موزے نیچے نہ گریں۔ اور ان کی ایک یہ عادت بھی تھی کہ چھوٹے سے چھوٹا حکم دے کر اس کو چیک ضرور کرتے تھے چنانچہ کیڈٹس کے لباس کی پڑتال پر گارٹر بھی دیکھے جاتے تھے۔ یہی ہدایت سٹاف کو بھی تھی کہ وہ موزوں پر گارٹر استعمال کریں اسی طرح پریپ کے وقت سٹاف کو ربرسول کے جوتے پہننے کی ہدایت تھی تاکہ کیڈٹس ڈسٹرب نہ ہوں ــــ میری عادت گارٹر استعمال کرنے کی نہیں تھی۔ دو ایک بار میرے موزے نیچے دیکھ کر میرے بعض احباب نے کہا بھی۔ ہاشمی کرنل صاحب نے چیک ضرور کرنا ہے بہتر ہے کہ تم گارٹر لے لو۔ میں نے سنی ان سنی کر دی۔ ایک روز سٹاف روم میں میرے پاؤں کی طرف غور سے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ آج پیشی ہو گی لیکن کوئی بلاوا نہیں آیا۔ کئی دن، بلکہ کئی ہفتے گزر گئے۔ میں بھول بھال بھی گیا کہ ایک روز باتیں کرتے کرتے یکایک رُک گئے اور بڑی خوش دلی سے کہا۔ ہاشمی لڑکوں کے ڈریس انسپکشن میں گارٹر ضرور دیکھا کرو۔ جوتے پر موزے پڑے اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ میں سمجھ گیا کہ ان کا اصل مطلب کیا ہے۔

اس واقعہ سے میں یہ نتیجہ نکالنا چاہتا ہوں کہ ان کی ترجیحات کا بھی ایک نظام تھا۔ وہ کم اہم باتوں کی اصلاح میں کچھ انتظار کر لیتے تھے لیکن کسی ایسی فروگذاشت کی جس کا اثر لڑکوں پر پڑنے کا احتمال ہو وہ قطعاً برداشت نہیں کرتے تھے۔

آخر میں، میں مرحوم و مغفور کی ایک اور صفت کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ ان میں قوت برداشت بھی بہت زیادہ تھی۔ ہمارے دو ایک ساتھی تھے جو ان کے فلسفہ تربیت اور طرز تربیت سے متفق نہیں تھے اور ان سے کھلے دل سے تعاون نہیں کرتے تھے۔ ان کی کمزوریوں کا بھی انہیں علم تھا۔ لیکن یہ انہیں کا ظرف تھا کہ انہوں نے ان کمزوریوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں سرکاری معاملوں میں وہ سخت گیر تھے مذاقی معاملوں میں

ان کا رویہ عفو و درگذر تھا۔ دوسروں کی نہیں کہتا، میں تو انہیں اپنا مرشد سمجھتا ہوں۔ اور میں ایک مفکر کے اس خیال سے متفق ہوں کہ آجکل کے درویش اور اولیاء دفتروں، تعلیمی اداروں، کارخانوں، اسپتالوں اور تجربہ گاہوں میں بھی ملتے ہیں یا ملنے چاہئیں۔

——— بریگیڈئر عنایت الرحمٰن صدیقی

میں اس امر کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ ۵۸-۱۹۵۷ء میں جب میں ملٹری کالج میں ایک لیفٹیننٹ تھا، مجھے کچھ عرصہ بریگیڈئر رفیق کی زیر قیادت کام کرنے اور کچھ سیکھنے کا موقعہ ملا۔ پہلی بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ صرف ایک کامیاب سربراہ ایک موثر منتظم اور ایک عظیم قائد ہی نہیں بلکہ وہ ایک خاص طرز تربیت و تعلیم کے حامل بھی تھے، جسے رفیقیت کہا جا سکتا ہے۔

انسان کی طرح ادارہ کا بھی ایک جسم ہوتا ہے۔ پھول پتے، درو دیوار، فرش اور پردے، تعلیمی نتائج اور ہم نصابی سرگرمیاں ان سب کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ ضرورت بھی ہے لیکن ادارہ کی ایک روح بھی ہوتی ہے۔ اس کا ضمیر بھی ہوتا ہے۔ اس کا کردار بھی ہوتا ہے جس چیز کو میں رفیقیت کہتا ہوں وہ یہ تھی کہ انہوں نے اس ادارہ کی روح کو تازہ کیا اس کو اسلامی اور قومی آب و رنگ دیا۔ شعوری طور پر اس کی اخلاقی حس بیدار کی۔ طلبہ کی قدروں اور رویوں کو اولیت دی، ان کی شخصیت کے نشوونما کو فوقیت دی اور ظواہر کو ثانوی سمجھا اور ثانوی حیثیت دی۔ ایسا کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ قدروں اور رویوں کی تربیت دقت طلب ہی نہیں دیر طلب کام ہے۔ یہ کوئی دکھانے کی چیز نہیں، نہ اس کے نتائج فوری طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ امتحانی نتائج، مقابلوں میں جیتی ہوئی ٹرافیاں، درو دیوار کی آرائش، پھول پتوں کا حسن، یہ سب چیزیں فوری طور پر متاثر کرتی ہیں۔ یہ سب چیزیں نظر آنے والی ہیں۔ اگر مقصد صرف خوش کرنا اور نام آوری ہو تو ان چیزوں پر تھوڑی سی توجہ دینے سے بہت چوکھا رنگ آ سکتا ہے اور بڑی واہ واہ ہو سکتی ہے لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ جن لڑکوں نے بہت اچھے نمبر لیے ہیں، بہت سی ٹرافیاں جیتی ہیں وہ اندر سے کیسے ہیں، ان کا ذہن کتنا روشن، کتنا تخلیقی ہے۔ ان کی قدریں، ان کے رویے کیا ہیں۔ بحیثیت ایک

انسان اور ایک پاکستانی کے ان کے کتنا وزن ہے وہ عملی زندگی میں صرف کامیاب ہوں گے۔ یا دنیا کو ان سے، ان کے علم سے، ان کے تجربے سے، ان کے عہدے سے کوئی فرق پڑے گا۔

رفیق صاحب نے اس پہلو پر زور دیا۔ اس نوعیت کی تربیت کو اولیت دی۔ اور مکمل تعلیم کو ٹوٹل ایجوکیشن کے تصور کو عملی طور پر بروئے کار لائے یا لانے کی بھرپور کوشش کی۔ اسی کو میں رفیقیت کہتا ہوں۔ ان کی ذاتی مثال قدروں اور رویوں کی تربیت کا سب سے مؤثر ذریعہ تھی۔ صبح کے تڑکے سے رات گئے تک وہ کالج میں متحرک نظر آتے تھے۔ جزئیات پر نظر رہتی تھی۔ ان کی ترجیحات بہت واضح تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ طاعت میں مے وانگبیں کی لاگ نہیں تھی۔ زندگی ہی میں نہیں نوکری میں بھی ہزاروں خواہشیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔ لیکن ان کی بظاہر صرف ایک ہی خواہش تھی کہ ہر لڑکا اندر سے بدلے۔ اتنا گہرا "کمٹ منٹ" ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے یہ ان کی بے لوث محبت اور بے باک صداقت کا ثمر ہے کہ آج ان کا نام زندہ ہے۔ اور کام بھی زندہ ہے ورنہ مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے۔ ان کے ایک چراغ سے کتنے چراغ روشن ہوئے۔ اصل چیز تو ادارہ کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے۔ میں نے پرنس چارلس کے گارڈن سٹون پبلک سکول میں پڑھایا ہے۔ دیکھنے میں شان و شوکت سے خالی تھا۔ عمارات میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ایٹن اور ہیرو کو بھی میں نے دیکھا ہے انہوں نے بھی اپنی قدامت کے نشانات کو باقی رکھا ہے۔ جن ڈیسکوں اور میزوں پر چرچل ـــ ایسے بڑے آدمیوں نے کبھی بچپن میں نام کھودے تھے ان پر اب شیشے کی تختیاں لگی ہیں اور اب بھی ان سکولوں کو ظاہری ٹیپ ٹاپ سے مبرا رکھا گیا ہے۔ ایک اجنبی کو بھی صاف نظر آجاتا ہے کہ یہ ادارہ اوپر سے نہیں اندر سے دیکھنے کی چیز ہے۔ اور اس کی توانائی کا سرچشمہ بھی ان دیکھی چیزوں میں ہے۔

آخر میں، میں ان کے طریق کار کی دو ایک مثالیں دوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک سٹاف

میٹنگ میں طلبہ کے نتائج زیر بحث تھے کہ ایک صاحب نے لڑکے کی کارکردگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا اس میں سپارک یا شعلہ نہیں ہے۔ اس تبصرہ پر رفیق صاحب نے جو تبصرہ کیا وہ قابل غور ہے۔ انھوں نے کہا آپ تعلیم کے ماہر ہیں آپ پیشہ ور استاد ہیں آپ کو بہتر معلوم ہو گا کہ کسی لڑکے کو سپارک ایسے مبہم لفظ سے مترد کر دینا سائنٹفک طریقہ نہیں۔ آپ اس کے غبی یا نا اہل ہونے کی ٹھوس مثالیں دیجیے۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے، وہ اس سے مختلف ہے یہ کہہ کر انھوں نے اپنی ڈائری نکالی جس میں ہر لڑکے پر ان کے مشاہدات اشاروں کی شکل میں درج تھے۔ انھوں نے کہا میں نے اسے پی ٹی پر دیکھا ہے۔ ٹھیک ٹھاک پی ٹی کر رہا تھا۔ سردی تھی لیکن ہاتھ بغل میں دیئے ہوئے نہیں تھے۔ بس میں میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے سینئرز کو پہلے سر و کیا۔ یہ سب مشاہدات تو کچھ اور کہتے ہیں۔ میرا مقصد آپ کی ہمت شکنی نہیں۔ آپ نے کچھ کہا تو ہے۔ کچھ دلچسپی تو لی ہے۔ اس لڑکے کو اپنی توجہ کے قابل تو سمجھا ہے۔ یہ مثبت رویہ ہے۔ اور کسی پر کچھ نہ کہنے سے کسی کا نوٹس ہی نہ لینے سے، بحث میں حصہ ہی نہ لینے سے یقیناً بہتر ہے۔ اس لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ اپنے طلبہ میں اتنی دلچسپی لیتے ہیں لیکن ساتھ ہی آپ سے بلکہ سب اساتذہ سے درخواست کروں گا کہ لڑکوں کو مختلف جگہوں پر مختلف زاویوں سے دیکھیں اور کسی لڑکے کے بارے میں اچھی یا بری جو رائے بھی قائم کریں وہ مختلف النوع ٹھوس مشاہدات پر مبنی ہونی چاہیے اور اس کو واضح الفاظ میں استعارہ کے بغیر پیش کیا جائے۔

یہ خود ان کے طریق کار کی ایک مثال ہے وہ اپنے رفقائے کار کی اہلیتوں اور صلاحیتوں کو خوب سمجھتے تھے اور ہر ایک سے اس کا بہترین پہلو نکال لینا ان کو خوب آتا تھا۔ ایک لیڈر کا ایک امتحان یہ بھی ہوتا ہے کہ اس نے خود کس پائے کے لیڈروں کی تربیت کی، جو اس کے کام کو جاری رکھ سکیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ بعض بہت کامیاب قائد محض اس لیے دور رس نتائج پیدا نہیں کر سکے کہ وہ خود تو چاند سورج تھے لیکن اپنے پیچھے کوئی ستارہ بھی نہیں چھوڑا۔ رفیق صاحب نے اپنے سٹاف میں اور اپنے طلبہ میں بھی قیادت کے جوہر پروان چڑھائے جو اپنے اپنے دائرے میں حسب توفیق ''رفیقیت'' کو زندہ و تابندہ

رکھے ہوئے ہیں میں ان کی نظر کی کیمیا اثری کا بڑا قائل ہوں۔ ذرہ کو آفتاب بنانا انہیں آتا تھا۔ اس کی مثال میں خود اپنے حوالے سے دینا چاہتا ہوں۔ ۱۹۵۷ء میں کیپٹن مرتضیٰ کے تبادلہ پر انہوں نے مجھ سے کہا۔ صدیقی تم رابرٹس ہاؤس سنبھالو۔ میں اس وقت لیفٹیننٹ تھا۔ رابرٹس ہاؤس سینئر ہاؤس تھا اور پرابلم ہاؤس تھا۔ میں جھجکا اتنی بڑی ذمہ داری کو میں اٹھا سکوں گا یا نہیں۔ بہرحال ان کے اعتماد کو بھی میں ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا بہت بہتر سر، اور ہاؤس کا چارج لے لیا۔ اب یہ ذمہ داری میرے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی میں نے پہلے روز ہی لڑکوں کے ذاتی فائل دفتر سے نکلوائے اور رات کو ان کو لے کر بیٹھ گیا۔ یہ اس کمرہ کا قصہ ہے جہاں اب راشد صاحب کا ڈرائینگ روم ہے۔ رات کے گیارہ بجے، بارہ بجے، ایک بجا میں فائلوں میں محو تھا کہ کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب دروازہ پر دستک ہوئی۔ میں نے دل میں کہا لو آئی اب کوئی مصیبت، ہاؤس میں کوئی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہوگا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے کہا۔ کم ان اور جناب جب دروازہ کھلا تو اپنی خاص چھڑی ہاتھ میں لیے کرنل رفیق نظر آئے۔ پوچھا اتنی رات گئے کیا ہو رہا ہے۔ فائل تو سامنے کھلے پڑے تھے۔ میں نے کہا سر، فائل دیکھ رہا ہوں۔ ایک دم بولے صدیقی میں نہ کہتا تھا کہ تم یہ کام کر لوگے۔ یہی تو سپرٹ ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہت دیر تک میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ان کی یہ خاص عادت تھی کہ وہ جونیئر سٹاف کی خاص طور سے ہمت افزائی کرتے تھے۔ اور ان کو مختلف النوع کام دے کر اور ان کی رہنمائی کر کے ان کی شخصیت کے امکانات کو بروئے کار لانے میں مدد دیتے تھے یہ بھی تخلیقی عمل ہے۔ آخر میں، یہ بھی کہوں گا کہ اس میں میری کوئی تخصیص نہیں تھی۔ وہ ہر ایک کے کام اور لگن کی قدر کرتے تھے مختصر یہ کہ ان کے فیض تربیت سے بقدر ظرف ہر ایک نے حصہ پایا۔ مجھے یقین ہے کہ ملٹری کالج کی تاریخ میں دور رفیقی قطب ستارہ کی طرح ہمیشہ تابندہ رہے گا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں

—— لیفٹیننٹ کرنل غلام رسول تسنیم اے ای سی

یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے کہ جب میری بیگم بیمار ہوئیں تو انہیں سی ایم ایچ داخل کرنا

پڑا۔ اس کے بعد معمول کے رعایتی چار جز کاٹے گئے۔ اس پر آڈٹ نے اعتراض کر دیا کہ آفیسر کی عمر شادی کی مراعات ملنے کی حد سے کم ہے۔ اس لیے پورے چار جز کاٹے جانے چاہئیں تھے جو خاصی رقم بنتی تھی۔ کرنل رفیق نے یہ دلیل لے کر کہ یہ آفیسر کمیشن سے پہلے شادی شدہ تھا اس لیے یہ ان مراعات کا حقدار ہے۔ باقاعدہ یہ کیس لڑا بہت سی نظیریں پیش کیں۔ کافی دنوں یہ کیس چلتا رہا۔ آخر میں جب یہ کیس ختم ہو گیا تو مجھے بلا کر صرف یہ بتایا کہ آڈٹ کے کچھ اعتراضات تھے جن کو رفع کر دیا گیا ہے۔ آپ کا استحقاق مستند ہے اس لیے جب کبھی ضرورت ہو اس حق سے استفادہ کریں۔ ان کے بتانے کے انداز سے مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ یہ کیس کتنا مشکل تھا۔ دوسرے دن میں قدوس صاحب اکاؤنٹنٹ کے دفتر میں لڑکوں کے پاکٹ منی کے سلسلہ میں گیا تو انہوں نے کہا۔ تسنیم صاحب مبارک ہو۔ آپ کا کیس ختم ہو گیا ورنہ سی این ای کیس کے طور پر آپ کو بڑا تاوان بھگتنا پڑتا۔ یہ دیکھیے! سامنے فلیگ لگا فائل پڑا تھا اس وقت میں نے وہ لمبی چوڑی خط و کتابت دیکھی جو انہوں نے اس سلسلہ میں کی تھی۔ پھر جب مجھے ان کے لاپرواہی سے اس کیس کے بارے میں بتانے کے بارے میں خیال آیا تو اور حیرت ہوئی۔ یہ ان کی شخصیت کا خاص انداز تھا کہ بڑے سخت ٹاسک ماسٹر تھے اور Perfectionist تھے۔ ہر کام کے اعلیٰ ترین معیار سے کم تر پر خوش کیا، راضی بھی نہیں ہوتے تھے خوب سے خوب تر کی تلاش میں خود بھی سرگرداں رہتے تھے اور دوسروں کو بھی سرگرداں رکھنے کی بڑی تندہی سے کوشش کرتے رہتے تھے لیکن دلداری میں بھی کم نہیں تھے۔ دوسرے کے درد کا درماں کرنے میں بے انتہا تگ و دو کرتے تھے۔ اور وہ بھی ماں کے رویّے کے ساتھ خاموشی سے، بغیر احسان جتائے۔ بغیر کریڈٹ لیے۔ اللہ اکبر! کیا انسان تھا۔ میں ان کی عظمت کے اس پہلو کو خاص طور سے سلام کرتا ہوں۔

تصورات اور تاثرات

——— سعید راشد فیضی

میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جتنا بڑا کام ہو اتنا Involvement چاہتا ہے ادارے، خاص طور پر وہ ادارے جو قومی اہمیت رکھتے ہوں اور تخلیقی و تعمیری سرگرمیوں میں مصروف ہوں، ان کی سربراہی مشکل ذمہ داری ہے جس سے ایک عام کیریر آفیسر عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ جس کی اپنی Commitment's ہوتی ہیں، کیریر کو بنانا ہے، آگے بڑھنا ہے اس کی نظر "اے سی آر"، "بڑے" "پی آر" بڑا اوپر کے افسروں پر "اپنی کور" کے مفادات پر تو ہوگی یہ تو تقاضے یا Compulsions ہوئے نوکری کے، پھر خاندان ہے، بیوی بچے ہیں، گھر بنانا ہے، Assets بڑھانے ہیں بچوں کی تعلیم کو دیکھنا ہے۔ ان کے مستقبل کو محفوظ بنانا ہے وغیرہ وغیرہ ہزار بکھیڑے ہیں۔ ان سب کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے اس طرح ترجیحات Priorities کچھ اس طرح مرتب ہوتی ہیں کہ ادارہ کی سربراہی دوسرے ذاتی مقاصد Ends کے حصول کا ایک ذریعہ یعنی Means بن جاتی ہے۔ یہ دہ پڑا رہتا ہے یا ڈالا جاتا ہے۔ خدمت کا یا کام کا لیکن اصل مقصود کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ حال کچھ تعلیمی اداروں کا ہی نہیں، قومی زندگی کے دوسرے شعبوں کا بھی ہے۔

قومی نوعیت کے تعلیمی و تربیتی ادارے Quality کے لحاظ سے اسی وقت بلند ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں جب انہیں ایسے سربراہ ملتے ہیں جو Total involvement دے سکتے ہوں جن کی پہلی ترجیح یعنی پہلی محبت ادارہ ہو۔ جو عام کیرئر آفیسر کی کمزوریوں کا شکار نہ ہوں۔

ملٹری کالج جہلم ہی کو لیجیے اس ادارہ کو قائم ہوئے ساٹھ برس ہوئے ہیں۔ اس طویل عرصے میں صرف دو نام ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ پاکستان کی تاسیس سے پہلے ڈی ایچ سٹیبنگ کا اور پاکستان بننے کے بعد بریگیڈیئر رفیق کا۔ آپ دونوں کی زندگی اور "لائف سٹائل" کو دیکھیے۔ سٹیبنگ خاندان اور "کیرئر" کی دوسری زنجیروں سے بالکل آزاد تھا بیوی "ہاؤس کیپنگ" کرتی تھی ایک بیٹا تھا جو لندن میں تھا کبھی یہاں نہیں آیا۔ کیرئر

کی زنجیروں کا حال یہ تھا کہ دس برس یہاں رہا اس سے کئی جونیئر کرنل ،بریگیڈئر پروموٹ ہوئے۔ خود اسے "پروموشن آفر" بھی ہوا لیکن اس نے "ایم سی" کی کرنیلی (اور اس ادارہ کے ذریعے تاج برطانیہ کی خدمت) کو ترجیح دی پھر وہ براہِ راست کمانڈر انچیف سے "بھرو" تھا۔ اس پر دس "باس" بیٹھے ہوئے نہیں تھے اگر تھے بھی تو اسے ان کی پرواہ نہیں تھی (چونکہ اسے نوکری کی پرواہ نہیں تھی) یہی حال بریگیڈئر رفیق کا تھا۔ وہ بھی اندر سے درویش تھے۔ انہوں نے کیریئر کے تقاضوں یعنی Compulsions کی گھاس کی پتی کے برابر بھی پرواہ نہیں کی۔ ان کا کردار ان کی Courage of Conviction اس درجہ اور اس پائے کی تھی کہ انہوں نے اپنے ضمیر کے Terms پر کمانڈانٹی کی اور جب ان پر اوپر سے پابندیاں عائد کی گئیں تو انہوں نے بجائے جھکنے کے چھوڑنا مناسب سمجھا۔ وہ درویش صفت انسان تھے اور Personal Commitments کے معاملہ میں بھی بے نیاز تھے۔ ان کا تعلق Involvement ایک مشنری کا تعلق تھا۔

اسی ضمن میں قومی سطح کے تعلیمی و تربیتی اداروں، خاص طور پر پبلک سکولوں کے اساتذہ کے بارے میں بھی چند معروضات ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں۔ ان اداروں میں عام اداروں کی طرح صرف اچھے انسٹرکٹر یا معلم ہی نہیں چاہئیں جو نصاب کو اچھی طرح پڑھا سکیں بلکہ کم از کم پانچ سات استاد ضرور اس Calibre شخصیت اور Devotion کے ہونے چاہئیں جو اپنے اپنے شعبہ یا مضمون میں ایک حوالہ بن سکیں اور جو کسی نصابی یا ہم نصابی سرگرمی میں ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہوں تاکہ ان کے شاگرد ان کے حوالے سے تعلیم کے معیاروں کا ادراک کر سکیں اور اپنے آپ کو دریافت کر سکیں۔

اس نکتے کو میں دو ایک مثالوں سے واضح کرتا ہوں۔ حیدری صاحب مرحوم کو لیجئے ۱۹۴۲ء میں وہ کالج میں آئے اور (ایک آدھ سال کے وقفے کے ساتھ) ۱۹۶۹ء کے اواخر میں اسے خیر باد کہا۔ ۸۷۔ ا جنرل اقبال نے ان سے ۱۹۴۳ کچھ دنوں پڑھا تھا۔ ۹۹۲۔ بریگیڈئر محمد صادق خان چیئرمین گورنرز انسپکشن ٹیم بھی اسی طرح انہی دنوں کچھ عرصے ان کے شاگرد رہے تھے۔ ۱۹۸۲ء میں تقریباً چالیس سال کے بعد جب میں نے ان دونوں سے

جرأتوں کے نشان اور کالج کی ہسٹری کے سلسلے میں انٹرویو لیا تو کالج کا ذکر آتے ہی ان کی زبان پر بے ساختہ پہلا نام حیدری صاحب تھا۔ شاگرد کیڈٹ سے جنرل بن جائے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے دنیا دیکھے خواہ اعلیٰ سے اعلیٰ اداروں میں تربیت حاصل کرے اور کسی استاد کو ایک حوالے کے طور پر یاد کرے تو وہ ''کے جی آر آئی ایم سی'' کا ایک استاد ہو۔ وہ بھی تربیتی آمریت Regimentation کے دور کا۔ بات ہو رہی تھی اسے کہتے ہیں شخصیت جس کسی نے ملٹری کالج میں ان سے انگریزی پڑھی ہے وہ اس تجربے کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ اس پڑھائی کے مواد Contents سے تو وہ غالباً ایک آدھ سال بعد ہی آگے نکل گیا تھا۔ جس چیز کا Impact باقی ہے۔ وہ ان کے پڑھانے کا انداز معیار اور سب سے بڑھ کر شخصیت ہے جو رویّوں، قدروں اور لائف سٹائل سے بنتی ہے (تصور کیجئے کہ حیدری صاحب کے بعض شاگرد آج بھی ان کے Talents ہی نہیں ان کی نفاست کو بھی یاد کرتے نہیں تھکتے) اسی طرح ان کے ڈرامے لوگوں کو بھلائے نہیں بھولتے۔ اردو میں یہ حیثیت عین الدین علوی صاحب کو حاصل رہی ہے ان کے حوالے سے ان کے طلبہ جانتے ہیں کہ علم کی گہرائیاں کیا ہوتی ہیں ادب کیا چیز ہے تنقید کیا ہوتی ہے۔ تحریر کا حسن کسے کہتے ہیں۔ طنز و مزاح کا معیار کیا ہے۔ تقریر و تمثیل کے گر کیا ہیں۔ اسی طرح ہر قابل ذکر ادارے کے اپنے اپنے رفیق، حیدری اور علوی ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں تاکہ ان کے حوالے سے طلبہ کو زندگی کی بنیادی قدروں، رویّوں، شخصیت کے جمال و کمال، فن کے افقوں اور علم کی سرحدوں کا کچھ شعور لاشعوری طور پر ہوتا رہے اور پھر وہ اپنے آپ کو Discover کرنے کی منزل سے اپنے آپ کو Develop کرنے کے مقصود کی طرف ذوق و شوق سے بڑھ سکیں اور یہی تمام تعلیم و تربیت کا مقصد وحید ہے اس پایہ اور کردار کے اساتذہ کمیاب تو ہیں نایاب نہیں ہیں ڈھونڈنے والوں کی البتہ کمی نظر آتی ہے قومی زندگی کے ہر شعبہ میں اس قبیل یعنی Breed کے کار پردازوں کی پیداوار (معاشی معنوں میں) قومی منصوبہ بندی کا ایک لازمی جز ہونا چاہیے مجنوں نہ رہے تو صحرا کا کیا بنے گا؟

مختصر یہ کہ اگر قومی اداروں کو خاص طور سے اعلیٰ سطح کے قومی تعلیمی اداروں کو بچانا ہے اور پاکستان کو پروان چڑھانا ہے تو ان کی سربراہی کے لیے "رفیقوں" کو ڈھونڈھنا پڑے گا۔ اور ان میں پڑھانے اور ہاؤس ماسٹری کرنے کے لیے "حیدریوں" اور "علویوں" کی ضرورت پڑتی رہے گی۔

اب میں بریگیڈیر رفیق کے طریق قیادت کے بارے میں چند ذاتی تجربات کے حوالے سے کچھ عرض کروں گا اپنے دوسرے دور میں چارج لینے کے کچھ دنوں بعد انھوں نے تمام سٹاف سے ملاقات کی ٹھی جب میری باری آئی تو دو چار رسمی جملوں کے بعد ہی انھوں نے یہ پوچھ کر مجھے حیرت میں ڈال دیا کہ آپ کے گھر میں بے بی کب متوقع ہے پھر مزید کہا مجھے معلوم ہے کہ آپ یہاں تنہا ہیں آپ فکر نہ کریں میں نے میٹرن (مسز کارنیلیس) کو بتا دیا ہے کہ وہ ہر روز آپ کے گھر جا کر چیک کر لیا کریں اور ڈیلیوری تک چھٹی نہ جائیں۔ دوسرے یہ کہ غالباً آپ کیس مشن اسپتال جہلم میں کروانا چاہتے ہیں اس لیے میں نے شعیب (لیفٹیننٹ شعیب اے او) سے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ ایمبولینس آپ کے لیے ریزرو رکھیں۔ اس کے بعد کالج کی باتیں ہوتی رہیں جب میں اٹھ کر چلنے لگا تو انھوں نے میز کی دراز سے ایک لفافہ نکالا" شاید آپ کو کچھ پیسوں کی ضرورت پڑے۔ آسان قسطوں میں اکاؤنٹنٹ کو واپس کر دیجیے گا" لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوئی۔ ۱۲ر نومبر ۱۹۵۵ء کی صبح یہ وہی تھے جنھوں نے مجھے کلاس سے بلا کر بچی کے پیدا ہونے کی مبارک باد دی۔ اور کہا آپ کلاس چھوڑ کر ابھی اسپتال جائیں۔ میں پیریڈ کا انتظام کرتا ہوں۔ یہ توجہ صرف میرے لیے مخصوص نہیں تھی۔ میٹرن کو حکم تھا کہ آل رینکس کے گھروں کا چکر لگاتی رہیں۔ چنانچہ وہ ہر روز صبح دس بجے دفتر میں ان کو بریف کرتی تھیں کہ صحت و صفائی سے متعلق کہاں کیا پرابلم ہے اور اس کو ترجیحی بنیاد پر حل کیا جاتا تھا۔ ان کی ہمدردی کے "ریڈار" کی پہنچ دور دور تک تھی۔

ایک حدیث پاک ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار ایک صحابی کو مسجد نبوی سے بلی کے نوزائیدہ بچے نکال پھینکنے سے منع فرمایا تھا۔ اس حدیث کو سن کر علامہ اقبال کا تبصرہ یہ تھا۔ مادرانہ شفقت (مدرہڈ) رسالت کا جزوِ عظیم ہے۔

رسالت قیادت کی بلند ترین صورت ہے چنانچہ کوئی قیادت بغیر مادریت کے عنصر کے موثر نہیں ہوتی تھی۔

اوائل نومبر ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے کہ میں ایک روز صبح سویرے، سکین ہاؤس کے پیچھے جونیئر سکاؤٹس یعنی کبس کو کالج کے سالانہ فنکشن کے لیے تیار کرا رہا تھا لیکن ان کے پاؤں نہیں ملتے تھے۔ رفیق صاحب بھی سامنے کھڑے تھے۔ اتنے میں سامنے سکین ہاؤس میں میرے گھر کا دروازہ کھلا اور بشیر (میرا ملازم لڑکا) دوڑتا ہوا آیا اور بیگم کا یہ پیغام پہنچایا کہ بچی کو کوئی تکلیف ہے آپ آئیں۔ بشیر نے یہ پیغام تقریباً سرگوشی کے انداز میں دیا تھا لیکن وہ سمجھ گئے کہ کوئی بات ہے۔ فوراً مجھ سے کہا "مسٹر راشد آپ گھر کو اٹینڈ کریں۔ ان کے سٹیپ میں ٹھیک کرواتا ہوں۔" رفیق صاحب نے ایک مہم شروع کی تھی کہ ہر لڑکا سٹیج پر آئے۔ اس کے لیے ہر کلاس کو اپنا علیحدہ ڈرامہ کالج ہال میں پیش کرنا ہوتا تھا ایک رات میں اپنی کلاس ہفتم سی کے ڈرامے کی ریہرسل کروا رہا تھا کہ وہ حسب دستور ریہرسل دیکھنے آ گئے۔ اسی روز اتفاق سے ریہرسل میں دیر ہو گئی اور مجھے نیند کے دو ایک جھونکے آئے۔ انہوں نے دیکھا تو فوراً کہا "مسٹر راشد آپ آرام کریں۔ باقی ریہرسل میں لے لوں گا۔"

اب میں ان کی اصول پرستی کے دو واقعے سناتا ہوں۔ سکین ہاؤس کی آنرشاپ میں ایک لڑکا بار بار گھپلا کر رہا تھا۔ اور اس کی دوسری حرکتیں بھی قابل تعزیر تھیں۔ آخر کار مجھے اس کی رپورٹ کرنا پڑی۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کا تعلق دو دو تین تین سٹارز کی فلیگ کاروں کے گھرانے سے ہے لیکن انہوں نے معمول کے مطابق چھان بین کی اور اسے قصوروار پا کر اس کا پتہ کاٹ دیا۔ پھر کیا کچھ طوفان نہ آیا ہو گا۔ لیکن انہوں نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ اسی کبس کے سلسلے میں، میں ہاؤس کی آنرز رولنگ بک لیے دفتر میں بیٹھا تھا کہ فلیگ سٹاف ہاؤس مری سے جی او سی نے فون کیا۔ وہ اپنے ان دو رشتے دار بچوں کا رزلٹ جاننا چاہتے تھے جنہوں نے انہی دنوں داخلے کا امتحان دیا تھا انہوں نے بغیر تکلف کے بتا دیا کہ ایک میرٹ لسٹ پر ہے دوسرا معیار پر پورا نہیں اتر سکا۔ اور فون رکھ دیا۔

ارسطو نے تو صرف اپنی خیالی ریاست میں جسٹس (عدل) کو بنیاد بنایا تھا رفیق صاحب نے عملی طور پہ ایسا کر دکھایا تھا۔

تاج بگلر کی زبانی

راشد : پہلے تو آپ اپنی کہانی سنائیں۔

محمد تاج : پورا نام راجہ محمد تاج ہے۔ کریالے کا رہنے والا ہوں۔ ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوا۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۱ء تک ۲۲/۲ پنجاب رجمنٹ میں نوکری کی۔ ۱۹۳۳ء میں کالج میں ملازم ہوا اور ۱۹۶۶ء تک ۳۳ سال یہاں کالج میں بہت سی ڈیوٹیاں کیں۔ بگلر رہا۔ کمانڈانٹ کے دفتر کا خاص چپراسی رہا۔ آفیسرز میس اور کمانڈانٹ کے بنگلے پر بھی کچھ عرصے کام کیا۔ لیکن کالج میں مشہور تاج بگلر کے نام سے ہوا۔ چونکہ شروع کے سولہ سترہ سال بگلری ہی کی اور اسی میں نام پیدا کیا۔

راشد : وہ کس طرح؟

تاج : میں ٹائم کا بہت پابند تھا۔ اور بڑا زوردار بگل بجاتا تھا۔

راشد : وہ بگل پھٹنے کا کیا قصہ ہے؟

تاج : یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ سیلبی صاحب میجر کمانڈانٹ تھے کہ ایک روز صبح میں نے پوری سانس سے بگل جو بجایا تو بگل پھٹ گیا۔ مغنی صاحب کوارٹر ماسٹر تھے۔ انہوں نے اسٹور سے دوسرا بگل نکلوا کے دیا۔ بگل پھٹنے کی بڑی خبر بنی۔ کمانڈانٹ نے پانچ روپے انعام دیا تھا۔ نئے لڑکے بالے جو کالج میں داخل ہونے تھے۔ مجھ سے اکثر پوچھتے تھے کیوں چاچا یہ خبر ٹھیک ہے۔ پھر کہتے ہمیں بگل پھاڑ کے دکھاؤ۔ میں ہنس کر ٹال جاتا۔

راشد : اب کرنل رفیق کی بات کرتے ہیں۔

تاج : میں نے کالج میں بہت دنیا دیکھی لیکن سچی بات یہ ہے کہ جو کام انہوں نے کیا وہ کسی اور نے نہیں کیا۔

راشد : مثلاً؟

تاج : مثلاً کالج کا ٹن آؤٹ ٹھیک کیا۔

راشد : ڈسپلن ؟

تاج : جی ہاں ڈسپلن۔ٹائم کے بہت پابند تھے۔صبح کی پی ٹی پر سب سے پہلے آتے تھے۔چٹی پینٹ، چٹی بنیان، چٹے جوتے، چٹی جرابیں پہنتے تھے۔افسروں کی پی ٹی سب سے پہلے ہوتی تھی اس پر وہ سب سے پہلے آتے تھے۔ادھر وہ موتی ہال والی گراؤنڈ میں قدم رکھتے ادھر میں بگل بجاتا۔ایک روز وہ سامنے نظر نہیں آئے میں نے بگل بجا دیا۔وہ ایک منٹ بعد آئے۔پوچھا۔پہلے بگل کیوں بجایا۔میں نے اپنی ٹائم پیس آگے کر دی۔ان کی اپنی گھڑی ایک منٹ پیچھے تھی۔وہ گھڑی انہوں نے کلائی سے اتار کے فرش پر دے ماری ان کے اردلی نے مجھے بتایا کہ اس دن سے وہ ایک گھڑی غسل خانے میں بھی رکھنے لگے تھے۔میں نے کچھ دنوں ان کے بنگلے پر بھی کام کیا۔

راشد : ان کے رہن سہن کے بارے میں کچھ بتائیے ؟

تاج : یہ اس زمانے کی بات ہے جب سٹاف کی چار کا حاجی غلام رسول کا ٹھیکہ تھا میں چار بناتا تھا اور دلاور افسروں کو پیش کرتا تھا۔ایک روز چاء کی پیالی پر کوئی نشان تھا۔کرنل صاحب نے زور سے چمچہ پیالی پہ مارا۔" یہ کیا ہے" اور غصے سے اٹھ کر چلے گئے اور حکم دیا دفتر آؤ۔دفتر گیا تو بابو قدوس صاحب اکاؤنٹنٹ نے کہا کرنل صاحب نے ایک روپیہ جرمانہ کیا ہے۔میں نے کہا میرا قصور نہیں۔میں نوکری چھوڑ دوں گا جرمانہ نہیں دوں گا۔انہوں نے یہ بات جا کر کرنل صاحب کو بتائی انہوں نے کہا۔تاج سے کہو بنگلے پر آئے۔سہ پہر کو بنگلے پر گیا تو ان کے اردلی سردار خان نے کہا کرنل صاحب نے یہ ایک روپیہ دیا ہے۔جاؤ جرمانہ ادا کر دو۔میں پھر اکڑ گیا میں نے کہا میں نہ روپیہ لوں گا اور نہ جرمانہ دوں گا۔یہ بات سردار خان نے اندر جا کر بتا دی۔تھوڑی دیر کے بعد کرنل صاحب نے مجھے بلایا اور کہا۔"مجھے پتہ چل گیا ہے تمہارا قصور نہیں تھا۔میں نے غصے میں جرمانہ کر دیا ہے۔اب میں واپس نہیں لے سکتا۔میری بات جائے گی۔تم یہ پانچ روپے لے لو۔جرمانہ ادا کر دو بات ختم کرو۔" میں نے کہا یہ بات ہے تو میں جناب کا تابعدار ہوں یہ نوٹ میں نہیں لوں گا۔لیکن

جرمانہ ادا کروں گا۔ میں جب چلنے لگا تو کرنل صاحب کو میں نے سردار خان سے کہتے سنا ''جو آدمی کام میں تگڑا ہو وہ غصہ بھی کرتا ہے۔ نکما ہر بات پی جاتا ہے''

راشد : بڑے پتے کی بات ہے۔

تاج : جی ہاں۔ وہ کام کی قدر کرتے تھے اور آدمی کو پہچانتے تھے۔ غلط آدمی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ فرمان نائی بہت گندہ رہتا تھا۔ بار بار کہنے پر اس نے اپنی عادت نہیں بدلی تو اسے چلتا کیا۔ ایک لانگری رابرٹس ہاؤس کے میس میں مٹر چھیلتے ہوئے مٹر کے دانے کھا رہا تھا۔ وہ جالی دار کھڑکی کے پیچھے سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی انہوں نے فوراً چھٹی کر دی لیکن کام والے ایماندار آدمیوں کے نخرے بھی اٹھاتے تھے۔ جب میں میس میں کام کرتا تھا تو ایک بار میں نے انہیں ٹوک بھی دیا تھا۔

راشد: وہ کیا واقعہ تھا؟

تاج : میس میں مہمانوں کا کھانا تھا۔ کھانا مجھے لگوانا تھا۔ وہ برتنوں کی الماری کھول کے برتنوں کو نکال نکال کے ان پہ انگلی پھیر کے ان کی گرد چیک کرنے لگے۔ میں نے کہا جناب الماری کے برتن چیک کرنا انصاف نہیں۔ آپ میز کے برتنوں کو دیکھنا اگر گرد ہو تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔ میرے ٹوکنے پر وہ الماری کا پٹ بند کر کے ڈائننگ ہال میں چلے گئے۔ پھر روشنی میں ایک ایک پلیٹ کو چیک کیا۔ جب ہر پلیٹ کو شیشے کی طرح صاف اور چمکتا ہوا پایا تو ویل ڈن ویل ڈن بولا۔ اور پانچ روپے انعام کے دیئے۔ ایک بات اور بتانا چاہتا ہوں۔

راشد : جی۔

تاج : وہ یہ کہ وہ کالج کی حد میں اور گھر کے اندر اور ہوتے تھے۔ جب کرنل صاحب بریگیڈیئر ہو کر لارنس کالج کے پرنسپل تھے میں ان سے ملنے ان کے بنگلے پر گیا۔ جھپا مار کے ملے۔ گھر میں مہمان بنا کے ٹھہرایا۔ اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور بٹھایا۔ چلتے وقت بار بار کہا۔ کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ نیا بریگیڈیئر آ گیا ہے، میں لاہور جا رہا ہوں۔ وہاں آنا

افسوس ہے کہ پھر میں لاہور نہ جا سکا۔ اور پھر سنی تو انہونی سنی۔

نادر خان مالی کا انٹرویو

راشد: پہلے تو آپ اپنے بارے میں بتائیں۔ کالج میں کب سے ہیں۔ کیا کام کر رہے ہیں۔

نادر خاں: نام تو نادر خان ہے، نادرا مشہور ہوں۔ ۱۹۵۲ء کے پہلے مہینے کی پہلی تاریخ کو مالیوں میں بھرتی ہوا تھا۔ جب سے آج تک مالی کا کام کر رہا ہوں۔

راشد: کرنل رفیق صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے۔

نادر خاں: بڑے چنگے غریب پرور تھے۔

راشد: ان کے چنگے پن اور غریب پروری کی کوئی مثال۔

نادر خاں: کالج کے ایک پرانے لانگری شفیع نے سودی کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ کالج ہی کے کلاس فوروں کو بھاری سود پر قرضہ دیتا تھا۔ بعض لوگوں کی تو آدھی تنخواہ شفیع کی تھیلی میں چلی جاتی تھی۔ چیزیں بھی گروی رکھتا تھا۔ اس سے سارے عاجز تھے کرنل رفیق ہفتے کے ہفتے دربار کرتے تھے وہاں کسی نے بتایا کہ ہم تو شفیع کے ہاتھوں برباد ہو رہے ہیں۔ دربار کے بعد کرنل صاحب کے حکم سے بابو قدوس اکاؤنٹنٹ نے شفیع کو بلوایا۔ سارے قرضوں کا حساب لیا اس کا سارا روپیہ کلاس فوروں کی طرف سے ادا کیا اور اس کو وارننگ دی کہ آئندہ کسی کو سودی قرض دیا تو خیر نہیں۔ پھر کرنل صاحب کے حکم سے ہمارا ایک فنڈ کھولا گیا تھا۔ ہر بندے کے ہر مہینے تین روپے کٹتے تھے۔ اس فنڈ سے ہمیں ضرورت کے وقت بغیر سود کے قرض مل جاتا تھا۔ اور بال بچوں کی شادی بیاہ، اور غمی کے موقعوں پر کرنل صاحب علیحدہ سے رقم دلواتے تھے۔ کسی کی حالت زیادہ پتلی ہوتی اپنے پاس سے بھی کچھ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ کلاس فوروں کے گھر والوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ آپ کو یاد ہو گا کرنل صاحب صبح شام گھوڑے پر سارے کالج کا چکر لگاتے تھے، ہر جگہ جاتے تھے۔ راستے میں کلاس فور کا کوئی بچہ بالا ملتا تو گھوڑا روک کر اس سے دو ایک باتیں کرتے پوچھتے کوئی تکلیف تو نہیں، اسی طرح ملیٹرن صاحبہ بھی

کلاس فوروں کے گھروں کا چکر لگاتی تھیں۔ این سی اوز کے کوارٹرز بھی جاتی تھیں۔
صفائی بھی چیک کرتی تھیں اور بیماروں کی خبر کرنل صاحب کو دیتی تھیں۔
راشد: یہ تو ایک طرفہ بات ہوئی۔ دوسری طرف بھی تو دکھایئے کام لینے میں کیسے تھے۔
نادر خاں: جناب اس کا کیا پوچھنا۔ کام لینے میں بھی کتنے سخت تھے اس کا کیا بتاؤں۔ ہر شخص ڈرتا رہتا تھا اگر ذرا سی بھی سستی کی تو مارا جاؤں گا۔ کیونکہ ہر چیز کی چیکنگ خود کرتے تھے۔ سنتری چوکیدار کیا مجال کہ سو جائے۔ یا ادھر ادھر ہو جائے۔ سخت کھنچائی کرتے تھے۔ بے ایمانی پر کھڑے کھڑے نکال دیتے تھے۔ وحید وغیرہ تین باربروں نے کچھ بالوں کی مشینوں کا چکر چلایا تھا۔ انہوں نے تینوں کو چلتا کیا۔
راشد: کوئی اور بات؟
نادر خاں: صاحب کو پھولوں کا بہت شوق تھا۔ وہ سال کے سال پھولوں کی نمائش کرواتے تھے۔ قادر بخش مالی کو انہوں نے چوغہ پہنوا کے انعام دیا تھا۔ اس نے گل داؤدی اتنے بڑے بڑے اگائے تھے کہ حد نہیں۔ اس زمانے میں سرکلر روڈ پر پھول ہی پھول ہوتے تھے ہاں ایک اور بات یاد آئی۔ انہوں نے کلاس فوروں کی تعلیم کے لیے رات کو ایک گھنٹے کی کلاس بھی لگوائی تھی۔

صادق مسیح ہیڈ سوئیپر کا انٹرویو

راشد: صادق آپ کا پورا نام کیا ہے۔ کب نوکری شروع کی۔
صادق: صادق مسیح میرا پورا نام ہے ۱۹۵۱ء میں چوتھے مہینے کی نو تاریخ کو میں نے کلاس فور کی حیثیت سے نوکری شروع کی تھی اب ہیڈ سوئیپر ہوں۔ میں نے کرنل رفیق کے دونوں دور دیکھے ہیں۔
راشد: کرنل صاحب کیسے تھے؟
صادق: گورا ٹائپ آدمی تھا۔ زیادہ تر انگلش میں گٹ پٹ کرتے تھے۔ سگریٹ بہت پیتے تھے۔ صفائی کا بڑا شوق تھا۔ سختی ہماری آتی تھی۔ کالج میں آتے ہی انہوں نے صفائی کا چکر چلایا۔ برسوں کا گند اٹھوایا۔

ہم غریبوں کو بڑی عزت دی اور بڑا سہارا دیا۔

راشد : وہ کیسے ؟

صادق : بڑے کھلنے میں وہ سویپر سمیت سارے کلاس فوروں کو بلواتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک بار دن کا بڑا کھانا دفتر کے سامنے (وہاں جہاں آجکل لائبریری ہے) ہوا تھا یہ انہی کی شان تھی کہ انہوں نے ہمیں اتنی عزت دی غریب پرور بہت تھے۔ جب کبھی لڑکے چھٹی جاتے تھے اس دن کا سارا فریش راشن وہ کلاس فور میں بانٹ دیتے تھے۔ ہم لوگ انتظار کرتے رہتے تھے کہ کب لڑکے چھٹی جائیں۔

راشد : لیکن سخت بھی تو تھے ؟

صادق : کام لینے میں بڑے سخت تھے اور بڑی سخت سزا دیتے تھے۔ ٹارچ سونٹی کے ساتھ راتوں رات گھومتے رہتے تھے مجال ہے کہ کوئی چوکیدار سونا تو بڑی بات ذرا ادھر ادھر ہو جائے۔ ہمیں حیرانگی تو یہ تھی کہ وہ سوتے کس وقت تھے۔ ان کے آنے سے پہلے کالج میں اودھم مچا ہوا تھا۔ انہوں نے لڑکوں کو ٹائٹ کر کے رکھ دیا۔ کیا مجال کہ رات کو ہاؤس سے باہر کوئی لڑکا نظر آجائے۔ مارنے پہ آتے تو مارتے بھی بہت تھے سونٹی تک ٹوٹ جاتی تھی۔

راشد : سنا ہے کہ آپ لوگوں کے ہاں انہوں نے چاء بھی پی۔

صادق : ہمارے کوارٹروں کا چکر اکثر لگاتے رہتے تھے۔ ایک بار انہوں نے لال کے ہاں چاء بھی پی تھی۔ ایسے بندہ پر تو انسان جان بھی دے سکتا ہے۔ ان کے جانے کے بعد تو ہمیں بہت ذلیل کیا گیا تھا۔ خود مجھے بے گناہ پر جو مار پڑی وہ خدا کسی کو نہ پڑوائے۔

راشد : ہم کرنل رفیق کی بات کر رہے تھے۔

صادق : ویسا بندہ پھر دیکھنے میں نہیں آیا۔

حیدری صاحب

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد خالد مسعود[1]

فوٹو گرافی میں ان کی مہارت اَننی تھی کہ کلر فلم کو ڈیولپ کیا۔ اور ہمیں بھی اس کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا۔

ایک بار ایک لڑکے نے ان سے شکایت کی کہ سر میرے لاکر سے حلوہ کسی نے نکال لیا ہے۔ یہ مسئلہ چند دوسرے لڑکوں کا بھی تھا۔ انہوں نے لائٹس آؤٹ کے وقت ہاؤس کو جمع کیا اور کہا۔ آپ لوگ یہاں آئے ہی آرٹ آف لونگ سیکھنے کے لیے ہیں۔ آرٹ آف لونگ کا پہلا اصول گیو اینڈ ٹیک یعنی تعاون ہے۔ آپ اپنی چیزیں دوسروں کے ساتھ شیئر کریں، دوسرے آپ کے ساتھ از خود شیئر کریں گے۔ باہمی اعتماد و مروّت کی فضا پیدا ہوگی جس سے سب کو فائدہ ہوگا۔ بہر حال جس کسی کو یہ اصول پسند نہیں اور جو کوئی اپنی زندگی اپنے دائرہ میں محدود ہو کر بسر کرنا چاہتا ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ وہ اپنا حلوہ یا جو چیز بھی ہے یہاں ہاؤس آفس میں جمع کرا دے۔ جب وہ چاہے گا میں آفس کھلوا دیا کروں گا۔ وہ اپنا حلوہ اکیلے اکیلے کھا کر اپنا دل خوش کر لیا کرے۔

——— کرنل منیر چوہان[2]

حیدری صاحب سے میں نے پڑھا بھی، ان کے ڈرامے بھی دیکھے۔ لیکن میں نے جو اثر ان سے قبول کیا وہ براہِ راست نہیں، بالواسطہ طور پر ان کی تحریر سے تھا۔ وہ تربیت کے انگلش سیکشن کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے ۶۳-۱۹۶۲ء کے تربیت کے آخر میں Readers' Treasure Chest کے عنوان سے کارڈنل ہنری نیومن کی Definition of a gentleman اور رڈیارڈ کپلنگ کی نظم تبرک کے طور پر نقل کی تھی۔ اصل میں یہ ان کے اپنے ٹریژر چیسٹ کے دو گوہر گراں مایہ تھے جو انہوں نے ہم طلباء کو عطا کیے ان دو تحریروں کا میری زندگی میں ایک خاموش مگر موثر کردار رہا ہے۔ آج ان کی یاد میں یہ خزانہ میں قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔ جو جو پڑھے وہ ان کے لیے دعا کرے۔

---

[1] کالج نمبر ۲۵۶۴ زمانہ تعلیم ۶۴-۱۹۵۹ء [2] کالج نمبر ۲۵۶۴ زمانہ تعلیم ۶۴-۱۹۶۰ء

—— بریگیڈئر محبوب المظفر[1]

حیدری صاحب ایل، ای، ایس سے کوئی ایکسرسائز کرا رہے تھے، جب ایک جملہ پر تقریباً ساری کلاس اٹک گئی۔ آخر میں انہوں نے مجھ سے کہا۔ علامہ تم بتاؤ۔ شکر ہے کہ میرا جواب صحیح نکلا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ اب وہ مجھے اکثر علامہ کہہ کر پکارتے رفتہ رفتہ یہ لفظ میری Super-ego میں چلا گیا اور میرے لیے اپنی پہچان بن گیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ حیدری صاحب نے اس کچی عمر میں ہی مجھے خود آگہی کی راہ پر ڈال دیا تھا۔ اور مجھے میری منزل سے آگاہ کر دیا تھا تو غلط نہ ہوگا۔

—— زندگی کے سفر میں جانی اور انجانی راہوں پر سفر کرتے کرتے کہیں سے کہیں آ گیا ہوں مگر دل کے نہاں خانے میں "علامہ" بننے کی حسرت آج بھی باقی ہے۔

—— خدایا اس استاد کی قبر کو اپنی رحمتوں کے نور سے بھر دے جس نے مجھے میری منزل سے آشنا کیا۔

—— بریگیڈئر عبدالرزاق

میں ۱۹۵۳ء میں کالج میں پانچویں میں داخل ہوا تھا۔ حیدری صاحب ہفتے میں دو دن نرسری رائم کا پیریڈ ایف اے سی سی میں لیتے تھے۔ خود پیانو پر بیٹھ جاتے۔ جب رائم رواں ہو جاتا تو اس کی موومنٹ سکھاتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلا رائم Old Mac Donald had a Farm تھا۔

Quack, Quack, here is a quack there's a quack

کی آواز اور موومنٹ کو لڑکے بہت انجوائے کرتے تھے۔ ایک اور رائم

Mulberry Bush

Here we go round a mulberry bush

On a cold and frosty morning

بھی بہت مقبول تھا۔ پھر یہ رائمز سالانہ تقریب انعامات پر جونیئر ٹیپلے کے ساتھ سٹیج پر پیش کیے جاتے تھے۔

---

[1] کالج نمبر ۲۵۴۳ زمانہ تعلیم ۶۴-۱۹۵۹ء

فروری ۱۹۵۸ء میں جو انگلش ایلوکیشن ہوا تھا اس میں کمانڈانٹ کرنل رفیق کے علاوہ مسٹر حیدری نے بھی حصہ لیا تھا۔ انہوں نے جولیس سیزر سے مارک انٹنی کی مشہور Funeral Speech کرنی تھی۔ ان کے سٹیج پر آنے سے پہلے سٹیج کے روسٹرم کو لٹا کر اس پر سیاہ کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔ گویا یہ سیزر کا فن تھا۔ اب مسٹر حیدری رومن سینیٹر مارک انٹنی کے روپ میں سٹیج پر نمودار ہوئے۔ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ساتھ ہی ایک خاموش ہیجان بھی تھا۔ ایک بالکل نیا ڈرامائی منظر ہمارے سامنے تھا۔ پھر حیدری صاحب شروع ہوئے۔

Friends, Romans, Countrymen, lend me your ears;
I come to bury Caesar, not to praise him.
The evil that men do lives after them.
The good is oft interred with their bones:
So let it be with Caesar. The noble Brutus
Hath told you Caesar was ambitious:
If it were so, it was a grievous fault;
And grievously hath Caesar answer'd it.
Here, under leave of Brutus and the rest,
For Brutus is an honourable man;
So are they all, all honourable men,
Come I to speak in Caesar's funeral.
He was my friend, faithful and just to me:
But Brutus says he was ambitious;
And Brutus is an honourable man.
He hath brought many captives home to Rome,
Whose ransoms did the general coffers fill:
Did this in Caesar seem ambitious ?

When that the poor have cried, Caesar hath wept
Ambition should be made of sterner stuff:
You Brutus says he was ambitious;
And Brutus is an honourable man.
You all did see that on the Lupercal
I thrice presented him a kingly crown,
Which he did thrice refuse: was this ambition ?
Yet Brutus says he was ambitious;
And, sure, he is an honourable man.
I speak not to disprove what Brutus spoke,
But here I am to speak what I do know.
You all did love him once, - not without cause:
What cause withholds you, then, to mourn for him?
O judgement, thou art fled to brutish beasts,
And men have lost their reason; - Bear with me;
My heart is in the coffin there with Caesar,
And I must pause till it come back to me.

خطابت کے جادو کا یہ ناقابل فراموش منظر کاش تاریخ کے لیے ویڈیو ٹیپ کیا جا سکتا۔
دسویں میں بھی حیدری صاحب سے انگریزی پڑھی۔ نصاب میں ایک
کتاب Treasure Island بھی تھی۔ وہ اس کو اتنے ڈرامائی انداز میں پڑھاتے
جیسے اسے سٹیج کر رہے ہوں۔ نصاب میں کئی کتابیں تھیں Treasure Island
کو ہم Pleasure Island کہتے تھے۔ لیکن اس کی باری کے علاوہ بھی اکثر اصرار
کیا کرتے کہ سر آج Pleasure Island ہو جائے۔ چونکہ میں ڈراموں میں آتا
رہتا تھا۔ وہ کلاس میں اکثر مجھ سے مکالمے ادا کرواتے Accent اور Intonation۔
اور Expression کے Concepts انہی نے واضح کیے۔ اکثر بتاتے کہ

لب ولہجہ سے جملے کے معنی بدل جاتے ہیں۔ ایک جملہ اس وقت یاد آرہا ہے۔

What an example to be followed

انگریزی زبان اور فائن آرٹس کا جو ذوق انہوں نے طلبا کی کئی نسلوں میں پیدا کیا وہ ان کی ناقابل فراموش خدمت ہے۔

—— میجر ابرار حسین

۱۹۴۹ء کے سالانہ ڈرامہ Virginian Mummy میں حیدری صاحب نے بوڑھے سائنس داں ڈاکٹر گیلن کا کردار خود ادا کیا تھا۔ حاضرین و ناظرین میں مہمان خصوصی لیفٹیننٹ جنرل میکے کے علاوہ جی ایچ کیو کے دوسرے اکابر اور کشمیر میں متعین یو این او کے آبزرورز بھی موجود تھے اور سب عش عش کر اٹھے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں حیدری صاحب نے شیکسپیئر کے ڈرامے مرچنٹ آف وینس میں بھی شائیلاک کا رول کیا تھا۔ حیدری صاحب ہی نے کالج میں ڈرامے وغیرہ سٹیج کرانے شروع کیے۔ دو ایک اور ہندو انسٹرکٹر بھی اس فن میں دلچسپی لیتے تھے۔ مسٹر بلدیو کمار کے علاوہ اینٹی ملیریا کے انچارج ایک اور ہندو آفیسر کیپٹن واسودیوا تھے جو کالج کے ڈرامیٹک شوز میں (جو کمانڈانٹ کے دفتر کے پیچھے سٹیج کیے جاتے تھے۔ ہندو کلچر کو پروجیکٹ کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے اور رام راج پر کوئی نہ کوئی آئیٹم ضرور شامل کراتے تھے۔ ایک سمارٹ سا ہندو لڑکا درشن کمار تھا عموماً وہ ستیاجی کا کردار ادا کیا کرتا تھا۔ رام راج ڈراموں میں وہ آفیسر خود بھی کوئی نہ کوئی پارٹ ضرور ادا کرتے تھے۔ وہ موسیقی میں بھی دخل رکھتے تھے۔ اور چھانٹ چھانٹ کے ہندو نغیم کے گانے مسلمان لڑکوں سے بھی گواتے تھے۔ ۱۰۵۶ محمد شریف کی آواز بہت اچھی تھی اس سے انہوں نے جو گانا گوایا اور جو کالج میں بہت مقبول ہوا تھا۔ یہ تھا۔

تیرے سوا کون میرا، کرشن کنھیّا بھگوان کنارے سے لگا دو میری نیّا

یہ بات ریکارڈ پر لانے سے میرا مقصد یہ بتانا ہے کہ چند غیر متعصب اور انسان دوست ہندو انسٹرکٹرز —— مسٹر کمار، مسٹر اتوک سنگھ، ڈاکٹر شام لال مس سدھو —— کے سوا جو ہندو انسٹرکٹرز تھے وہ شدید تعصب کا شکار تھے۔ ان میں سے کچھ ڈھکے چھپے اور

کچھ کھلم کھلا۔ ہندو کلچر اور متحدہ ہندوستانی قومیت کا پرچار کرتے رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں میں مسلم قومیت کا جذبہ ہندو سکھ لڑکوں اور آفیسرز کے آنے کے بعد اور ابھرا۔

مسٹر ایٹن

——— لیفٹیننٹ کمانڈر محمد نواز

۱۹۳۲ء میں کچھ عرصہ میں نے سر ایٹن سے دسویں میں انگریزی پڑھی۔ چونکہ فوج کے لیے میری عمر کم تھی، مسٹر ایٹن نے مجھے اپنے ساتھ جونیئر کلاسسز کو پڑھانے پر لگا لیا تھا۔ وہ مجھے پڑھانے کے طریقے بھی سکھاتے اور خود پڑھنے کے لیے کتابیں بھی دیتے تھے پہلی کتاب جو انہوں نے مجھے دی اور جس سے میرے اندر پڑھنے کا شوق بیدار ہوا وہ سٹیونسن کی ٹریژر آئی لینڈ تھی۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے چارلس ڈکنس سے متعارف کرایا۔ میرے شوق کو دیکھ کر انہوں نے اپنی ذاتی لائبریری کے دروازے میرے لیے کھول دیئے تھے۔ وہ اور ان کی مسز مجھ سے ناول ڈسکس بھی کرتی تھیں۔ جارج ایلیٹ اور برانٹے سسٹرز کو میں نے ان کے کہنے پر پڑھا مختصر یہ کہ تھوڑے عرصے میں انگلش کلاسکس کو میں چاٹ گیا۔ ہارڈی کا سٹائل بہت مشکل ہے۔ اسے بھی پڑھ ڈالا۔ سکاٹ کے ویورلی سیریز کو بھی کھنگالا۔

مسٹر ایٹن نے مجھے سکول لائبریری کا اسسٹنٹ بھی بنا دیا تھا۔ جس کی تین الماریاں سنٹرل ہال کے ایک گوشے میں رکھی تھیں۔ ایک الماری میں کچھ کتابیں اردو کی بھی تھیں: تذکرہ اولیاء، شبلی کی سیرت النبی اور محمد حسین آزاد کی قصص ہند اور دربار اکبری میں نے سکول کی لائبریری سے لے کر ہی پڑھی تھیں۔

مسٹر ایٹن کا مجھ پر یہ بڑا احسان ہے کہ ان کے توسط سے میری انگریزی اردو کی بنیادیں مضبوط ہوئیں اور ذہن کو بالیدگی بھی نصیب ہوئی۔

لے کالج نمبر ۸۱۔ زمانہ تعلیم ۳۳-۱۹۲۵ء

کرنل سٹیبنگ

——— بریگیڈئر عطا محمد[1]

سٹیبنگ مجھ سمیت اپنے بہت سے شاگردوں کو کرسمس کارڈ بھیجتے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں مجھے اپنے گاؤں پڑھ فتحال کے پتے پر کرنل سٹیبنگ کا کرسمس کارڈ ملا۔ اور اس کے ساتھ ایک نوٹ بھی تھا کہ سٹیبنگ اسپتال میں داخل ہیں انھوں نے پنشن آفس کو ہدایت کی ہے کہ ان کے دیئے ہوئے چند پتوں پر ان کی پنشن کے حساب سے کرسمس کارڈ بھیج دیئے جائیں۔ مجھے یاد ہے کہ کارڈ پر کوئن این کی تصویر بنی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

——— بریگیڈئر محمد حیات ستارۂ جرأت[2]

کرنل سٹیبنگ کا فلسفہ تربیت یہ تھا کہ عہدہ میں جو جتنا زیادہ سینئر ہوتا اس سے اتنی زیادہ باز پرس ہوتی۔ چنانچہ سینئر کیڈٹ آفیسرز کی آئے دن سختی آئی رہتی تھی ۹۸ مائل سٹون تک کی ایکسٹرا ڈرل ملنا آئے دن کی بات تھی۔ ایک روز سینئر پریفکٹس اس طرح اسی ڈی پر تھے تو کرنل سٹیبنگ نے جونیئر پریفکٹس کو بنگلہ پر چاء پر بلایا (ان کا طریقہ تربیت یہ تھا کہ جوں جوں سنیارٹی بڑھتی جاتی وہ سوشل روابط بڑھاتے جاتے) چاء پر مسز سٹیبنگ نے جو کیک رکھا اس کی شکل مشہور لنڈن برج کی سی تھی۔ کیک انھوں نے اس طرح کاٹنا چاہا کہ اصل برج سلامت رہے لیکن اتفاق سے چھری غلط چل گئی اور سارا کیک ایک دم بیٹھ گیا۔ مسز سٹیبنگ سسکیاں بھرنے لگیں "ہائے! میرا لنڈن اسی طرح تباہ ہو رہا ہے" (وہ زمانہ جنگ عظیم دوئم کی ابتدا کا تھا اور لنڈن پر جرمن بمبار طیارے دن رات بمباری کر رہے تھے) انہیں روتا دیکھ کر ہم بھی کچھ متاثر سے نظر آنے لگے۔ یہ دیکھ کر کرنل سٹیبنگ بولے "مسز کچھ جذباتی ہوگئی ہیں۔ ان سے ہمدردی ضرور کرو لیکن خبردار اس سے اثر بالکل نہیں لینا۔ تم لوگ مرد ہو۔ تمہیں آگ اور خون سے کھیلنا ہے۔ تمہیں اور ہمیں جرمنوں اور جاپانیوں کو ہرانا ہے۔"

---

[1] کالج نمبر ۶۸۸

[2] کالج نمبر ۷۴۸، زمانہ تعلیم ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۳ء

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین بلمیؒ[1]

میں ۱۹۴۶ء میں سینئر کیڈٹ آفیسر تھا۔ اور باکسنگ کا ہیرو بھی۔ چند ہفتوں کے کے بعد سلیکشن بورڈ کے سامنے بھی جانا تھا کہ چارج شیٹ ہو گیا۔ انہوں نے حسب دستور پوچھا "گلٹی آر ناٹ گلٹی"۔ میں نے کہا۔ "نو سر" بہر حال انہوں نے کیننگ کی۔ یہ ان کے بنگلہ کے سائڈ روم کی بات ہے۔ پھر وہ رو پڑے۔ میں جانتا ہوں ——— لیکن میں مجبور تھا۔ جب ٹی او کسی کو پیر ڈیوس کرے تو میرے پاس کوئی چوائس نہیں ہوتی۔ محمد حسین! آئی ایم ساری! بہت جلد تم قابل فخر آفیسر ہو گے۔ بہت جلد" شدت جذبات سے ان کی آواز بھرا گئی۔

سٹینڈنگ کام میں، انتظام میں، لباس میں، وقت کی پابندی میں، لگن میں، ہمدردی میں مستعدی میں۔ ہر بات میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان اوصاف سے عالمگیر ہیز کی کئی نسلوں نے اثر قبول کیا۔ زیادہ نہیں تو کم۔ اور پھر یہ تمام تربیت پاکستان کے کام آئی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ان کے انتقال سے کچھ ہی عرصہ پہلے میں ان کے سلام کے لیے ان کی خدمت میں ٹورکی میں حاضر ہو سکا۔

——— میجر ابرار حسین[2]

کرنل سٹیڈنگ **Imaginative** بھی تھے۔ بہت دور کی سوچتے تھے اور نت نئے تجربے کرتے رہتے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں جب بہت جونیئر تھا تو انہوں نے کالج ایک دن کے لیے کیڈٹ آفیسرز کے سپرد کر دیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے شروع میں جب میں ایف ایس سی فرسٹ ائر میں تھا تو انہوں نے تین دن کے لیے ایکسر سائز شیر خاں چلائی۔ ایکسر سائز یہ تھی کہ تین دن کے لیے سات سینئر کیڈٹ آفیسرز کے عہدے معطل کر دیئے اور کیڈٹ بٹالین کا سارا انتظام پکے آفیسرز، کیپٹن صدیقی، بخاری، نوٹیال، ہیمن، لیفٹیننٹ واحدی لیفٹیننٹ ساہی کے سپرد کر دیا۔ اس عرصے میں کیڈٹ آفیسرز پلین کیڈٹس بنا دیئے گئے تھے۔ بڑا دلچسپ تجربہ تھا جس سے سب سے زیادہ کیڈٹ آفیسرز نے سیکھا۔

---

[1] کالج نمبر ۸۹۲ زمانہ تعلیم ۴۹-۱۹۴۲ء [2] کالج نمبر ۱۰۳۳ کالج نمبر ۴۹-۱۹۴۲ء

اسی طرح ایک روز انہوں نے ہماری ایف ایس سی کلاس سے کہا آج تمہیں کھلی چھٹی ہے۔ کل صبح تک جو چاہے کرو۔ جو قاعدہ ضابطہ توڑو تم سے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ حیرت کی بات ہے کہ بیشتر نے کچھ بھی نہ کیا ایک نے بے وقت گھنٹی بجا دی دو ایک فوراً اٹھ کر سرائے گئے اور وہاں سے ریوڑیاں خرید لائے۔ ایک دو نے گیمس کے وقت سونا پسند کیا یا سائیکل چلائی۔ صرف ایک نے کمپنی کمانڈر سے جھگڑا کیا۔

سٹیبنگ نے ۱۹۴۳ء میں کالج کی لائف کی جو فلم بنوائی اس کا نام ہی لیڈرز آف ٹومارو رکھا۔ ۱۹۴۴ء میں جی ایچ کیو سے ٹیم منگوائی کہ آؤ دیکھو میرے کیڈٹس آفیسر بننے کے قابل ہیں یا نہیں؟ ٹیم آئی اور بہت امپریس ہوئی جب کالج کو اپنے کیڈٹس براہِ راست سلیکشن بورڈ کے سامنے بھیجنے کا استحقاق حاصل ہوا تو انہوں نے پہلے بیچ میں چھ کیڈٹس ۷۸۰ کاظم حسین، ۷۶۱ محمد اسلم جوشی، ۶۴۴ عبدالمتین، ۷۲۴ محمد سرور اور ۷۵۰ عبدالرحمٰن ایس ایس بی کے سامنے بھیجے اور چھ کے چھ سلیکٹ ہوئے۔ ایکسٹینشن انٹری کے بعض لڑکوں کے لیے آرمی سپیشل پاس کرنا مشکل ہو رہا تھا (انہوں نے پارٹ بی نہیں کیا ہوا تھا) ان کو انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے میٹرک کے امتحان میں بٹھوایا۔ اور جو آرمی سپیشل کر چکے تھے یا میٹرک کر کے آئے تھے ان کے لیے ۱۹۴۴ میں ایف ایس سی کلاسز جاری کروائیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کالج کی تعلیمی ترقی کے لیے انہوں نے بہت کچھ کیا۔ اس سپر مین کی زیارت کے لیے میں ۱۹۶۴ میں انگلینڈ بھی گیا۔ افسوس میرے پہنچنے سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ تاریکی میں ان کی قبر کو سیلوٹ کر کے واپس آگیا۔

مسٹر انصاری، مسٹر نند لال اور مسٹر کمار

——— لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین بھٹی[1]

۱۹۴۳ء میں ناردرن کمانڈ کے باکسنگ ٹورنامنٹ میں کالج کو بھی شرکت کرنا تھی۔ ٹیم میں میرے علاوہ ۱۱۶۶ اسلم، ۹۳۰ منصیدار، ۸۳۵ حق نواز کیانی، ۱۱۵۱ اشتشو بال بھی تھے۔ دو تین ہفتے پہلے سخت تیاری شروع ہوئی۔ یوں تو باکسنگ کے انچارج اور کوچ کیپٹن کرائچ

[1] کالج نمبر ۸۹۲ زمانہ تعلیم ۴۲-۱۹۴۰ء

تھے۔ لیکن سٹیبنگ خود بھی ریہرسل پر موجود رہتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ ہر راونڈ کے لیے تازہ دم سپیئر لایا جاتا کہ باکسر کا سٹیمنا بنا رہے۔ ان ہی دنوں میری کچن پر لیفٹ کی ڈیوٹی آ گئی اوّل تو ڈیوٹی لمبی پھر اس سے پیچیدہ کام راشن بک کو مکمل کرنے کا۔ جس میں خاصا وقت لگتا تھا۔ سکین ہاؤس میں مسٹر کمار میرے ہاؤس ماسٹر تھے۔ میں نے ان سے کہا "سر مجھے باکسنگ کی پریکٹس کے لیے بھی جانا ہے۔ راشن بک میں آ کر بناؤں گا اور رات کو دیر سے سبمٹ کروں گا۔ کہنے لگے" جو ڈیوٹی تم کرنے جا رہے ہو وہ اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے اگر ہو سکا تو تمہاری کچھ مدد کرنے کی کوشش بھی کروں گا۔ تم یہ بک میرے پاس چھوڑ جاؤ" میں تھینک یو سر، کہہ کر رنگ پر چلا گیا۔ اس وقت خیال نہ آیا کہ مدد کرنے سے ان کی کیا مراد ہے۔ بہر حال جب میں دیر سے واپس آیا تو انہوں نے راشن بک میرے حوالے کی۔ اور صرف یہ کہا میں نے ساری انٹریز پنسل سے کر دی ہیں تم قلم سے پکی کر لو۔ میں نے بے اختیار تھینک یو سر کہا۔ تو فرمایا تم شکریے میں کنگ کو ناک آؤٹ کر کے آؤ تو بات ہے" میں نے کہا سر! میں کوشش کروں گا۔ کہ آپ کو مایوسی نہ ہو" کنگ سے ان کا اشارہ فرسٹ پنجاب کے نائک لہری سنگھ تھا۔ جو باکسنگ کنگ آف فرسٹ پنجاب کہلاتا تھا، اور جس سے میری فائٹ تھی۔ دوسرے تیسرے دن سائنس کے استاد مسٹر نند لال جو لیفٹ ان ہاکی کھیلتے تھے۔ اور ہاکی کے بہت اچھے کوچ تھے ملے۔ کہنے لگے مجھے معلوم ہے کہ باکسنگ کی پریکٹس میں تمہارا بہت وقت صرف ہو رہا ہے اور تمہارا مقابلہ بھی کنگ سے ہے۔ کالج کی عزت کا معاملہ ہے تم اپنی پریکٹس جاری رکھو۔ پڑھائی کی فکر نہ کرو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہر چند کہ کالج میں پرائیویٹ ٹیوشن کی اجازت نہیں ہے۔ میں تمہیں اپنے وقت میں پڑھایا کروں گا۔ یہ انعام میری طرف سے ہو گا۔ تم اس کم بخت کنگ کو تخت سے اتارو Dethrone کرو" جب ٹیم پنڈی جانے لگی تو مسٹر انصاری نے کوپنوں، (اس زمانہ میں لفظ پیسوں کے بجائے خرچ کے لیے کوپن ملتے تھے) کی موٹی سی گڈی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "محمد حسین! یہ گڈی تمہاری تم اس کے غرور کا سر نیچا کرو" (ان کا اشارہ بھی لہری سنگھ کی طرف تھا جس نے چیلنج کیا ہوا تھا کہ ہے کوئی مائی کا لال! جو لہری سنگھ کو

ہرائے) ـــــ انصاری صاحب کا نام آیا تو میرے دل میں ان کی محبت کا چراغ جلا۔ استاد تو سب ہی شفیق ہوتے ہیں وہ بہت ہی شفیق تھے۔

پنڈی میں جب میں لہری سنگھ کو ناک آوٹ پنچ مار رہا تھا تو میرے ذہن میں ایک خیال یہ بھی تھا اپنے استادوں کے سامنے سرخ رو ہونا ہے۔

پینتالیس سال بعد یہ سطریں لکھ رہا ہوں' ان عظیم استادوں کو یاد کر رہا ہوں اور آنکھیں نم ہیں۔

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

کہ جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

مسٹر انوک سنگھ

ـــــ میجر ابرار حسین

یہ واقعہ اوائل ۴۷ء کا ہے۔ اتوار کا دن تھا میں کسی دوست سے ملنے آکنلک ہاؤس گیا تو مسٹر انوک سنگھ (ہمارے سوکس اور جنرل نالج کے استاد جو آکنلک ہاؤس سے ملحقہ کوارٹر ہی میں رہتے تھے) نے مجھے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھ کر آواز دی ہیلو، مسٹر حسین" مسٹر" کے لفظ کے ساتھ انھوں نے میرا نام لے کر مجھے بلایا تو میں قدرے چونکا۔ (چونکہ اس زمانہ میں کالج نمبر یا کیڈٹ رینک چلتا تھا) بہرحال سیلوٹ کر کے ان کے سامنے جا کھڑا ہوا تو انہوں نے صرف اتنا کہا "مسٹر حسین! واپسی میں مجھ سے مل کر جانا" مجھے یہ سن کر خوشگوار حیرت ہوئی چونکہ اس زمانہ میں انسٹرکٹرز عام طور پر الگ تھلگ رہتے تھے۔ بہرحال جب کچھ دیر کے بعد میں ان سے ملنے گیا تو برآمدہ میں مسٹر انوک سنگھ اور مسز انوک سنگھ نے میرا یوں استقبال کیا جیسے میں کوئی وی آئی پی ہوں۔ مجھے ڈرائینگ روم میں لے جا کر بٹھایا۔ وہاں پُرتکلف چاء کا سامان آراستہ تھا۔ مسز انوک سنگھ نے بڑی خاطر تواضع کی اور زیادہ تر وہی باتیں کرتی رہیں۔ کہنے لگیں "حسین! تمہیں یاد ہے کہ ریجنٹ سینما میں جب ہم ایک رات فلم دیکھنے گئے تھے تو تم نے ہمیں بہت لک آفٹر کیا تھا۔ ہم لوگ خاندانی ٹیچرز ہیں۔ مسٹر سنگھ کو ان کے گرو نے اپنے گھر رکھ کر پڑھایا تھا۔ یہ ابھی تک گرو جی کی تصویر کو پرنام کیا کرتے ہیں۔

ـــ تم نے سینما ہال میں ہماری اتنی Respect کی۔ مسٹر سنگھ بہت خوش ہوئے۔ میں

بھی اپنی ٹیچرز کو Greetings بھیجتی رہتی ہوں۔" ـــــ یہ ملاقات یا دعوت مجھے آج تک یاد ہے۔ کالج میں کچھ عرصے کے لیے ایک اینگلو انڈین چیف انسٹرکٹر میجر ہولڈین آئے تھے۔ وہ بھی کبھی کبھی سینیئر لڑکوں کو اپنے گھر بلاتے تھے اور ان کی ہندو مسز میزبانی کرتی تھیں۔ مسز سٹیبنگ بھی کیڈٹ آفیسرز کو اپنے بنگلے پر بلاتی تھیں۔ حسن اتفاق سے مسز کمار مسز میجر ہولڈین، مسز انوک سنگھ تینوں بہت سمارٹ ہونے کے علاوہ یونیورسٹی گریجویٹ تھیں اور بہت سوشل بھی۔ اور جہاں تک ہم کیڈٹس کا تعلق ہے ہمارے لیے مادر مہربان بھی۔ مجھے بہت دکھ کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ کم از کم اس وقت ہمارے اپنے ہم مذہب انسٹرکٹرز ہم سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ سوائے کیپٹن رحمان کے۔

میٹرن مس سدھو

ـــــ میجر ابرار حسین علوی[1]

یہ واقعہ ۴۶ ۱۹ء کا ہے، میں سوئمنگ پول کو صاف کرتے ہوئے سلپ ہوا اور کندھے کی ہڈی فریکچر ہو گئی۔ سخت تکلیف تھی۔ جیسے تیسے لڑکوں نے مجھے کالج اسپتال پہنچایا۔ میٹرن مس سدھو نے مجھے فرسٹ ایڈ دی۔ پٹی باندھی سلنگ لگائی۔ چوٹ کی تکلیف کے علاوہ میں کچھ شاک کی حالت میں بھی تھا۔ مس سدھو نے ڈریسنگ اردلی نور خاں کو آر ایم او ڈاکٹر شمسی کو بلانے بھیجا۔ اور اپنے کوارٹر سے چاء منگوا کر مجھے پلائی۔ جب تک ڈاکٹر شمسی آ نہیں گئے۔ وہ مسلسل میرے پاس بیٹھی رہیں۔ اور مجھ سے میرے خاندان کی باتیں کرتی رہیں مقصد یہ تھا کہ میرا دل بہلا رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایم ایچ جہلم بھجوا دیا۔ وہاں چھ ہفتے داخل رہا۔ وہاں روٹین قسم کی نرسنگ سے واسطہ پڑا۔ تو اپنی مس سدھو بہت یاد آئیں۔

سارجنٹ سر سدھو صحیح معنوں میں میٹرن (ماں) تھیں سب کو اپنی توجہ سے نوازتی تھیں بڑی ہنس مکھ، بڑی شاندار پرسنلٹی کی مالک، مس سدھو سکھ تھیں۔ وہ اپنی خوشی سے اگست ۴۷ء کے بعد بھی یہاں رہیں وہ غیر مسلم خاتون تھیں۔ ۱۴ اگست ۴۷ء کی پریڈ کی تقریب میں سفید ساڑھی میں شریک ہوئیں۔ جنوری ۴۸ء میں ان کو کالج کے سٹاف نے جہلم ریلوے سٹیشن سے بڑے

---

[1] کالج نمبر ۱۰۳۳، زمانہ تعلیم ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۹ء

اہتمام سے رخصت کیا۔ ان کی گاڑی کے گزرنے کے وقت کالج کے لڑکے کالج گیٹ کے سامنے کی گراؤنڈ میں ریلوے لائن کے متوازی کھڑے ہو گئے تھے وہ پھولوں میں لدی کمپارٹمنٹ کے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ لڑکوں نے بڑے جوش سے ہاتھ ہلا ہلا کر انہیں خدا حافظ کہا۔ یہ خراج تھا اس مادرانہ پرسنل ٹچ کو جس سے انہوں نے ہماری دیکھ بھال کی تھی۔ بچوں کے دل کا ریڈار یہ بتانے میں کبھی غلطی نہیں کرتا کہ کون ان کے ساتھ مخلص ہے اور کون نہیں۔

اقبال صاحب

——— میجر ابرار حسین[1]

اقبال صاحب نے ہمیں انٹرنیشنل افیئرز سے آشنا کیا اور ملکی معاملات کو بھی گہری نظر سے دیکھنا سکھایا۔ فروری ۴۸ء کے اواخر میں کالج میں جو تاریخی ڈیبیٹ ہوئی تھی اس کا سبجیکٹ ———

انہی کا دیا ہوا تھا۔ یہ ڈیبیٹ تیار بھی انہی نے کرائی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ ڈیبیٹ کالج کے سنٹرل ہال میں (جو آج کل میوزیم ہے) ہوئی تھی۔ اکرم ظفر ۱۲۲۳ موضوع کے حق میں اور ۱۰۳۱ شیر افضل کیانی اس کے خلاف بولتے تھے۔ اس وقت ہال میں سی این سی موجود تھے۔ لیکن لڑکوں نے بیک زبان فیصلہ اسلامی آئین کے حق میں دیا تھا۔ اقبال صاحب کئی دن اس موضوع کو آرمی کلاس میں ڈسکس کرتے رہتے۔ اقبال نے ہماری نظریاتی بنیادوں کو معبود کیا۔ جب ۱۹۴۹ء میں لیاقت علی خاں نے روس کے دورہ کی دعوت کے باوجود امریکہ کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا تو اقبال صاحب نے کہا تھا کہ آج آئندہ بیس تیس برس کے لیے پاکستان کی سیاسی معاشی اور خارجہ پالیسی کا فیصلہ بھی ہو گیا۔

——— لیفٹیننٹ جنرل پی ڈی خان ستارۂ جرأت[2]

اقبال صاحب انٹرنیشنل افیئرز پر اتھارٹی تو تھے ہی۔ میں ان کی شخصیت کی تب و تاب کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت بھی وہ پچاس پچپن کے تو ہوں گے۔ لیکن چہرہ پر خوشدلی کی مسکراہٹ۔ اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک، ان کی پہچان تھی۔

---

[1] کالج نمبر ۱۰۳۳ زمانہ تعلیم ۴۹-۱۹۴۲ء اور [2] کالج نمبر ۱۰۳۹ زمانہ تعلیم ۵۴-۱۹۴۸ء ور

وہ آرمی کلاس کے انچارج تھے۔ انہوں نے ہمارے مستقبل پر نظر رکھ کر ہمیں پڑھایا اور ہمارے ذہنی افق کو وسیع کیا۔ میں ان کے Devotion کے علاوہ ان کے Vision کی بھی داد دیتا ہوں۔

—— اقبال صاحب ناقابل فراموش ہیں۔ ماہ و سال کی گرد نے بہت سی یادوں کو دھندلا دیا ہے لیکن ان کی یاد تازہ ہے۔

—— لیفٹیننٹ جنرل محمد اشرف[1]

شروع میں میری دلچسپی سپورٹس وغیرہ میں زیادہ تھی۔ باکسنگ کا بھی شوق تھا مسٹر اقبال نے اصرار کر کے مجھ سے ایک مضمون لکھوایا جس کی بنا پر جنوری ۵۶ میں مجھے کالج کے ویکلی میگزین نیوز اینڈ ویوز کا سب ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ یقیناً وہ اس طرح میری شخصیت کے ارتقاء میں توازن پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ۱۹۵۵ء میں میں نے ایف ایس سی فرسٹ ائیر کلاس جوائن کر لی تھی۔ میں اسے مکمل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب کمیشن کے لیے فارم جانے لگے اور میں نے فارم جمع نہ کیے تو انہوں نے مجھ سے باز پرس کی کہ فارم کیوں نہیں بھیج رہے ہو، میں نے وضاحت کی۔ ساتھ ہی یہ بہانہ بھی کیا کہ سپانسر کون کرے گا۔ اب تو وقت نہیں رہا۔ فرمایا "یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ میں سپانسر کیے دیتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ آرمی میں جانا ہے یا نہیں؟ میں نے کہا جانا ہے "تو پہلے موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور جلد سے جلد اپنی پروفیشنل زندگی کا آغاز کرو۔ ایک دن کی سنیارٹی سے بھی کبھی کبھی بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ رہا سوال سیلیکٹ ہونے کا تو مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ تم پہلی کوشش میں ہی منتخب ہو جاؤ گے۔" مرحوم اقبال صاحب کی خصوصی توجہ کے لیے میں تازندگی ان کا احسان مند رہوں گا۔ میں ان کے Vision کی بھی داد دیتا ہوں۔ جب تک معلم مربی نہ ہو بات نہیں بنتی۔

مسٹر مظہر علی خان

—— لیفٹیننٹ جنرل پی ڈی خان ستارۂ جرأت[2]

ایک پبلک سکول قسم کے تعلیمی ادارہ میں طلبا کو نصابی تعلیم کے علاوہ ایسی مختلف النوع

---

[1] کالج نمبر ۲۰۷۹ زمانہ تعلیم ۵۶-۱۹۵۱ء [2] کالج نمبر ۱۲۳۹ زمانہ تعلیم ۵۴-۱۹۴۸ء

شخصیتوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔کہ جن کے ساتھ غیر رسمی ذہنی اور سوشل رابطے سے اور ان کے لائف سٹائل کو صبح وشام دیکھ کر، وہ شعوری اور لاشعوری طور پہ اپنی زندگی کی قدروں اور رویوں کو تشکیل دے سکیں یہ Intellectual اور Social exposure ہی اس طرح کے اداروں کی سب سے بڑی دین ہوتی ہے۔ملٹری کالج میں آزادی کے بعد کے عشرے میں جب میں وہاں زیر تعلیم تھا تعلیم کے اس Dimension کی نشوونما کا وافر سامان موجود تھا۔مختلف مزاجوں اور صلاحیتوں اور قابلیتوں کے اساتذہ کی ایک Galaxy موجود تھی۔ان میں سے ایک مسٹر مظہر تھے اپنے مضمون پہ کامل عبور سے استاد کو جو اعتماد حاصل ہوتا ہے۔وہ ان میں تھا بڑی پُروقار اور پرُسکون شخصیت تھی۔پرُسکون سے میرا اشارہ ان کی رفتار وگفتار کے مخصوص انداز سے ہے اس وقت بھی وہ چالیس کے پیٹے میں تھے۔شادی نہیں کی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر رویّہ اور مزاج پدرانہ بلکہ مادرانہ تھا۔ Mr. Mazhar is one of those who left a lasting impression on my mind.

مسٹر ایوب

——— لیفٹیننٹ جنرل پی ڈی خان ستارۂ جرأت[۱]

بظاہر خشک، تنہائی پسند اور ذرا فاصلے پر رکھنے اور رہنے کے عادی، لیکن اندر سے درد مند اور مخلص، یہ تھے مسٹر ایوب! پڑھانے کے پورے پرڈوکول ملحوظ رکھتے تھے۔کبھی کسی کو مارا نہیں، کوئی سزا نہیں دی۔یہ صرف ان کے چہرے کی سرخی اور انگریزی کی تیزی سے اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ جلال میں ہیں۔ان کی شخصیت ان کا سٹائل مسٹر مظہر سے ایک سو اسی ڈگری مختلف تھا۔لیکن موثر وہ بھی بہت تھے۔عالمگیر نیئر کی تعلیمی ہی نہیں اخلاقی بنیادوں کو استوار کرنے میں ان کا بھی بہت ہاتھ ہے۔

---

[۱] کالج نمبر ۱۴۳۹ زمانہ تعلیم ۵۴-۱۹۴۸ء

مسٹر حسن کے بیان میں - ۲۱۴۹ منظور حسین ایڈووکیٹ کے تاثرات کا حصہ

آونگ لانی آں سچ وہو	ماہڑے بانکوں نے آں چاچوا
آپوں تے ٹری گیا کتش وہو	ماہڑے بانکوں نیاں چاچوا
آپوں تے ٹری گیوں نوکری چاکری	اساں کی وی گیوں کھر پا داتری
آپوں تے کھاندا کے ناں ٹوڈا	اسی تے کھاندے بھت وہ ہو
ماہڑے بانکوں نیاں چاچیا	کتڑے بچھڑے ڑبنکی ڑبنکی مر گئے
دشمن ساہڑیاں واڈیاں وڈی گئے	آونگ لانی آں سچ وہو

ماہڑے بانکوں نیاں چاچوا

حوالدار پہلوان خان

———لیفٹیننٹ جنرل پیرداد خان

جب میں "چراغوں کی قطار" کا مسودہ دیکھ رہا تھا تو دیگر Luminaries کے ساتھ مجھے ایک ایسے شخص کا نام جو گو رینک میں چھوٹا لیکن بحیثیت انسان کے بڑا تھا نظر نہ آیا۔ بعد میں مسٹر راشد سے پتہ چلا کہ ان کا نام اصل مسودہ میں شامل ہے۔ میرا اشارہ حوالدار پہلوان خان کی طرف ہے جو ہمارے پی۔ ٹی انسٹرکٹر تھے۔

حوالدار خان پی ٹی انسٹرکٹر ہونے کے علاوہ باکسنگ کے کوچ اور انچارج بھی تھے نومبر ۱۹۵۲ء میں گرفن انسٹیٹیوٹ لاہور کی ریڈکراس باکسنگ ٹورنامنٹ کی چمپئن ٹیم انہی نے تیار کی تھی۔ اپنے کام سے Total Devotion کی جو امیج اس وقت پہلوان خان کے حوالے سے میرے ذہن میں ابھرتی تھی وہ آج (۳۵) پینتیس سال کے بعد بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ پہلوان خان لڑکوں میں بہت مقبول تھے اور ان کی عزت خاص طور پر اس لیے کی جاتی تھی کہ وہ Firm بھی تھے۔ بے جا رعایت نہ وہ کرتے تھے نہ کوئی ان سے لبرٹی لینے کی جرأت کر سکتا تھا Kind اور Firm کا Combination بہت کمیاب ہے اور یہی ان کا امتیاز تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کو یوں ہی پسند نہیں کر لیا جاتا جب تک وہ خود کچھ نہ ہو اور اس کے پاس زندگی کو دینے کے لیے کچھ نہ ہو۔
Unless he has something to offer in life and to life.

پہلوان خان اس قبیل کے انسان تھے ان کے پاس زندگی کو دینے کو بہت کچھ تھا۔ نومبر ۱۹۵۴ء سے جب میں نے کالج کو خیر باد کہا۔ حوالدار پہلوان خان سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ نہیں معلوم وہ کہاں ہیں اور کیسے ہیں۔ خدا انہیں خوش رکھے کہ انہوں نے اپنے کردار سے ہمارے راستہ میں ایک دیا جلایا۔

—— کرنل اخلاق احمد[1]

پہلوان خان باکسنگ کے کوچ، اتھلیٹکس کے انچارج تھے۔ ٹریک بھی وہی بنواتے تھے۔ ۱۹۵۷ء میں کرنل رفیق نے سال میں دوبار اتھلیٹکس کے مقابلے شروع کروائے تھے۔ اس کے لیے پہلوان ٹریک تیار کروا رہے تھے۔ پسینہ پسینہ تھے۔ اسی حالت میں انہوں نے کھانا منگوایا اور پیڑ کے نیچے بیٹھ کر کھایا۔ میں نے پوچھا آپ نے سٹاف میس میں کھانا کیوں نہیں کھایا۔ بولے کام پر اپنی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن آرام سے کھانا کھانا بھی تو ضروری ہے۔ "ڈیوٹی اس سے زیادہ ضروری ہے۔" پھر یہ میرا شوق ہے۔ ٹریک بنے گا۔ آپ لوگ دوڑیں گے باڈی بنائیں گے۔ جب ٹریک بن چکا تھا تو میں پریکٹس کرنے جس وقت بھی ٹریک کا رُخ کیا کرتا تھا اکثر پہلوان خان کو وہاں پاتا۔ میں نے پوچھا "آپ وقت ناوقت کیا ہمیں چیک کرنے آتے ہیں"؟ بولے نہیں ٹریک کو چیک کرنے آتا ہوں۔ جس چیز کو چیک نہ کیا جائے وہ خراب ہو جاتی ہے۔ حوالدار پہلوان خان کا سینہ بہت چوڑا تھا کوئی ۴۶-۴۴ انچ تو ہو گا۔ میں نے ایک روز پوچھا "سٹاف ایکسرسائز تو سب ہی کرتے ہیں۔ سینہ چوڑا کرنے کا نسخہ بتائیں۔ بولے خوش رہا کرو۔

—— لیفٹیننٹ جنرل محمد اشرف[2]

کسی انسان کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنے کام کو جانتا ہے اور دل لگا کر کرتا ہے۔ پی ٹی انسٹرکٹر حوالدار پہلوان خان کا بھی یہی حال تھا۔ اپنے کام کو جاننے میں کامل اور اسے شوق سے کرنے میں انتھک، باکسنگ وغیرہ سب سپورٹس میں چونکہ میری خصوصی دلچسپی تھی۔ اس لیے ہر روز پہلوان خان سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ اس قریبی

[1] کالج نمبر ۲۳۴۵ زمانہ تعلیم ۶۲-۵۶ ۱۹ء [2] کالج نمبر ۲۰۷۹ زمانہ تعلیم ۵۶-۱۹۵۱ء۔

تجربے کی بنا پر میرا یہ تاثر تھا اور آج بھی ہے کہ وہ شخص محض پی ٹی انسٹرکٹر نہیں بلکہ استاد تھا۔ دل سے لڑکوں کا بھلا چاہتا تھا اور اپنے سٹائل میں لڑکوں کی تربیت پر نظر رکھتا تھا۔ ۱۹۵۵ء کے اواخر کا واقعہ ہے مجھ سمیت آکنلک ہاؤس کے کچھ سینئر لڑکوں کا ہاؤس کے پیچھے کے نالہ کے قریب کبڈی کھیلتے ہوئے گاؤں کے کچھ لڑکوں سے جھگڑا ہو گیا۔ وہاں کالج کا جو آدمی سب سے پہلے پہنچا وہ پہلوان خان تھے۔ یہ اس زمانے کے طلبار کی خوش قسمتی تھی کہ کمانڈانٹ کرنل رفیق تھے۔ استادوں میں اقبال صاحب چوہان صاحب، حیدری صاحب، علوی صاحب، بلگرامی صاحب ایسے ایسے لاجواب استاد تھے۔ میٹرن تھیں تو وہ مسز کارنیلیئنس جیسی، اردلی تھے تو تاج بگلر جیسے اور پی ٹی انسٹرکٹر تو حوالدار پہلوان خان۔ سب اپنی اپنی فیلڈ میں یکتا، ایک طالب علم کتابیں تو بیشک استادوں سے پڑھتا ہے لیکن سیکھتا سب سے ہے۔ اس لیے ملٹری کالج ایسے اداروں میں ہر کارکن کی اہمیت ہوتی ہے۔

——— میجر جنرل نذر حسین

حوالدار پہلوان خان کی آنکھوں میں بڑی پرقوت چمک Glare تھی۔ ان کا اپنا Charisma تھا۔ ان میں اور کرنل رفیق میں شخصیت کی بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ میرا خیال ہے کہ سپورٹس کے دائرہ میں وہ سب سے زیادہ کرنل رفیق کے مشن کو ان کے اپنے سٹائل میں آگے بڑھا رہے تھے۔

——— بریگیڈئر عبد الرزاق

یہ واقعہ ۱۹۵۷ء کا ہے۔ گرفن انسٹیٹیوٹ لاہور کے اوپن باکسنگ ٹورنامنٹ میں میری فائٹ ایک مکرانی باکسر سے آ پڑی۔ باکسنگ کے کوچ حوالدار پہلوان خان نے مجھ سے کہا۔ رزاق! تمہیں اس مکرانی سے نہیں لڑنا۔ یہ پروفیشنل ہے۔ اس کا وزن بیشک تمہارے اتنا ہے لیکن یہ پرانا باکسر ہے۔" میں اکڑ گیا کہ مجھے ضرور لڑنا ہے۔ پہلوان خان نے کہا " میرے بچے! نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ باکسنگ کھیل ہے لڑائی نہیں۔ میں مفت میں تمہیں پٹوانا نہیں چاہتا۔ یہ کوئی جوڑ نہیں۔ کوئی باکسنگ نہیں۔" وہ لمحات

مجھے نہیں بھولتے جب میں لڑنے کی ضد کر رہا تھا اور وہ باکسنگ کوچ ہو کر مجھے لڑنے سے منع کر رہے تھے۔ ان کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا۔

کرنل این ڈی احمد

— شاہد احمد[1]

کرنل این ڈی احمد کو میں ایک کوٹیشن کے حوالے سے یاد کر رہا ہوں۔

Sow an act, reap a habit, sow a habit, reap a character, sow a character reap a destiny.

جو انہوں نے ایک بہت بڑے پینل پر لکھوا کر کالج لائبریری (موجودہ میوزیم) میں آویزاں کرادی تھی۔ میں ہی جانتا ہوں کہ اس ایک جملے نے میری زندگی میں کتنا کردار ادا کیا ہے۔ لائبریری کے صدر دروازے کے اوپر اسی طرح ایک بہت بڑے فریم میں انہوں نے قومی ترانے کا انگریزی ترجمہ (جو بقول ان کے ۱۹۷۰ء میں ڈھاکہ آبزرور میں شائع ہوا تھا) آویزاں کرایا تھا۔ وہ بھی نذر قارئین کر رہا ہوں۔

NATIONAL ANTHEM

Blessed be thou sacred land,
Happy be thou beautious realm,
Thou symbol of high resolve,
Land of Pakistan.
Blissful be thou citadel of faith,
The order of our sacred land,
The might of brotherhood of man,
May nation, country and state,
Shine in glory everlasting,

---

[1] کالج نمبر ۳۰۹۰۵ زمانہ تعلیم ۷۲-۱۹۶۷ء، پی سی ایس

Blessed be the goal of ambition,
Our flag of crescent and star,
Guide to progress and perfection,
Interpretter of the past, glory of
The present, inspiration of our future,
Symbol of Almighty's protection.

کرنل اکرام امین

——— فلائٹ لیفٹیننٹ جاوید قمر[1]

اکرام امین کو کمزور مضمونوں کے لڑکوں کے نمبر زبانی یاد ہوتے تھے۔ ان کو وہ بہت Chase کرتے تھے۔ اتوار کو سب ہی لڑکے دیر سے سو کر اٹھتے تھے اگر ان میں سے کوئی لمبی تانے سو رہا ہوتا تو اس کی رضائی کھینچ کر کہتے بادشاہو اب تو اٹھ جاؤ یا میں اٹھاواں۔ انہوں نے بعض خاص خاص لڑکوں کے نام، نک نیم، چوہدری جی، خلیفہ، ڈانک رکھ چھوڑے تھے۔ یکم مئی کو مزدوروں کے دن کی چھٹی تھی۔ ٹیپو ہاؤس میں آئے۔ تو ہا ؤس ماسٹر صاحب نے ہماری سفارش کی سر یہ علم کے مزدور ہیں ان کو جہلم جا کر یوم مئی منانے کی اجازت دی جائے۔ اکرام صاحب نے برجستہ جواب دیا نہیں صدیقی صاحب یہ علم کے مزدور نہیں علم کے مِل کے مالک ہیں ان کو چھٹی کہاں یہ اپنا حساب کتاب سنبھالے رکھے۔

He was feared, respected and loved. All in one. Great man !

——— میجر ساجد غنی[2]

وہ کالج میں ہر وقت موجود محسوس ہوتے۔ ہر ستون، ہر دروازے، ہر روزن دیوار سے جھانکتے نظر آتے۔ ان کی سرزنش عموماً آنکھوں آنکھوں میں ہوتی تھی جس کا مطلب

---

[1] کالج نمبر ۲۳۸۷ زمانہ تعلیم ۷۵-۱۹۷۲ء [2] کالج نمبر ۱۴۱۳ ، زمانہ تعلیم ۷۶-۱۹۷۱ء

سمجھنے میں دیر نہیں لگتی تھی۔ اور جو دیر لگاتا وہ اسے سیدھا کرنے میں دیر نہیں لگاتے تھے۔
غفاری و قہاری کا ایسا امتزاج میں نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔ وہ بیک وقت پُر مغز استاد
سخت گیر باپ، اور شفیق ماں تھے۔ فروری ۴۷، ۱۹ء کا قصہ ہے۔ ہم لوگ میٹرک کے امتحان
کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک رات انہوں نے تین بار میرا لحاف سیٹ کیا۔ تیسری بار جب
وہ لائٹ بجھا کر باہر چلے گئے۔ تو صبح کی اذان کی آواز آئی۔ اسی دن مجھے بھی یقین آیا کہ وہ
ہر رات سارے کالج کو دو تین بار چیک کرتے ہیں۔ پتہ نہیں سوتے کس وقت تھے۔
اتنی توانائی کہاں سے آگئی تھی۔ ان کی مقناطیسی آنکھوں میں ان کی پوری شخصیت تھی۔

کرنل رفیق

——— لیفٹیننٹ جنرل پیر داد خان ستارۂ جرأت

۱۹۵۲ء کے اواخر میں کالج کے لیے وہ ایک تاریخی دن تھا۔ جب نئے کمانڈانٹ کرنل رفیق نے کالج ہال میں کالج کی تاریخ کے پہلے Brains Trust کا افتتاح کیا۔ یہ صرف ایک معلوماتی فنکشن نہ تھا بلکہ ایک نئے دور کا آغاز اور کالج کی فنی تعلیمی و تربیتی ترجیحات کا غماز جو کالج کے نئے رول — ایک آزاد نظریاتی مملکت پاکستان کے لیے روشن دماغ فوجی افسر تیار کرنے کے مقصد سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ یہ کہ خوش قسمتی کہ اس عظیم مقصد کی تکمیل کے لیے کالج کی زندگی کے اس تاریخی موڑ پر کالج کو کرنل جیسا Dynamic اور Charismatic اور سب سے بڑھ کر Committed رہنما اور رہبر ملا۔

فروری ۵۳ء کے شروع میں کالج کے پہلے ایلوکیوشن کانٹیسٹ Elocuton conest کی تصویر آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ جب سٹیج سکریٹری نے اعلان کیا کہ اب مسٹر حیدری شیکسپیئر کے ڈرامہ جولیس سیزر سے مارک انٹونی کی مشہور Funeral سپیچ Recite کریں گے۔ اسی وقت سٹیج کے روسٹرم کو لٹا کر اس پر سیاہ کپڑا ڈال دیا گیا۔ گویا یہ سیزر کا تابوت تھا۔ اتنے میں رومن سینیٹروں کے روایتی لباس میں سٹیج کے داہنے بازو سے مسٹر حیدری نمودار ہوئے۔ مسٹر حیدری کا ناک نقشہ بھی کلاسیکی تھا؛ اور رنگ صاف، وہ حیرت انگیز طور پر رومن لگ رہے تھے۔ جب وہ شروع ہوئے۔

Friends, Romans, country men, lend me your ears,
I come to bury Ceasar not to praise him.

تو ہال میں سناٹا چھا گیا۔ کیا آواز تھی کیا Expression تھے کیا ڈرامیٹک Touches کہ وہ منظر الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب انھوں نے سپیچ ختم کی تو حاضرین ایسے سحر زدہ بیٹھے تھے کہ تالیاں بجانے میں بھی ایک لمحہ کی دیر لگی۔ اس کے فوراً بعد اعلان ہوا کہ اب کمانڈانٹ لیفٹیننٹ کرنل محمد رفیق ابراہام لنکن کی مشہور گیٹسبرگ سپیچ کا اقتباس پیش کریں گے تو ایک بار پھر ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ابھی پچھلا Excitement ختم نہیں ہوا

تھا کہ ایک دوسرا Excitement شروع ہو گیا۔ مسٹر حیدری انٹرنیشنل سطح کے Dramatist اور Elocutionist تھے۔ اپنے فن میں حرف آخر ان کے بعد بڑے سے بڑا فنکار بھی آنے سے جھجکتا۔ لیکن کرنل رفیق تو کرنل رفیق تھے، بہر حال پردہ اٹھا انہوں نے ابراہام لنکن کا میک اپ تو نہیں کیا ہوا تھا۔ لیکن ابراہام لنکن کے سٹائل میں سفید تھری پیس سوٹ پر سیاہ بو ضرور لگائی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی عقابی نظریں اوپر اٹھائیں اور سپیچ شروع کی۔ جب اس فقرہ پر پہنچے:

The brave men, living and dead who struggled here, consecrated it for above our power to add or to detract.

تو ان کی آواز کی کھرج سے ہال تھرتھرانے لگا۔ اور جب آخر میں یہ فقرہ:

This Nation, under God shall have a new Birth of Freedom and that Government of the People by the people, for the people, shall not perish from the Earth.

ادا کیا تو ایک لمحہ کو ان کی آواز بھرا سی گئی یوں جیسے یہ الفاظ وہ خود پاکستان کے لیے کہہ رہے ہوں۔ (شاید اسی لیے انہوں نے یہ تقریر منتخب کی تھی) میں کہہ نہیں سکتا کہ اس ایلوکیوشن نے کس طرح ہمارے دلوں میں آگ بھر دی اور کتنا زبردست Impact ہوا۔ ہمارے ذہنوں پر اس تقریر کا اور کرنل رفیق کی شخصیت کا۔ What a man !

——— لیفٹیننٹ جنرل آر ڈی بھٹی

۶ دسمبر ۱۹۵۵ء کے کالج کے ویکلی مضامین نیوز اینڈ ویوز کی جو کاپی میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کے پورے سرورق پر ہمارا عہد Our pledge کے عنوان سے جو چار سطریں درج ہیں وہ یہ ہیں۔

Land of our Birth, our faith and pride
For whose dear sake our fathers died,
Oh, Mother-land, we pledge to thee,
Head, heart and hand through the years to be

یہ عہد، اس امتیازی شان سے نیوز اینڈ ویوز کے سرورق پر چار سال تک (جب تک رفیق صاحب کالج میں رہے) فلیش (Flash) ہوتا رہا۔ اس کا طلباء پر جو اثر ہوا ہو گا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پاکستانیت کے جذبے کو پروان چڑھانے کو ان کی ترجیحات میں اوّلیت حاصل تھی۔ کالج کے اکیڈیمک بلاک کی بیرونی دیواروں پر قائداعظم کے اقوال انہوں نے لکھوائے تھے۔ جن پر آتے جاتے نظر پڑتی رہتی تھی۔

There is nothing greater in this world than your own conscience and when you appear before your God you can say that you did your duty with the highest sense of integrity and with loyalty and faithfulness.

جونیئر بلاک کی دیوار پر جنرل چیٹ وڈ کی یہ ولولہ انگیز کوٹیشن لکھی تھی:

The safety, honour and welfare of your country come first always and every time. The honour welfare and comfort of the men you command come next. Your own ease, comfort and safety come last and every time.

یہ کوٹیشن جس طرح میرے دل میں اتر گئی ہے اس طرح دوسروں کے دلوں اور ذہنوں میں محفوظ ہو گی۔ یہ لاشعوری اثرات بہت دوررس نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔

یہ جو پاکستانیت آج عالمگیر بنیر کی پہچان ہے یہ بے وجہ نہیں یہ بڑی حد تک اس تربیت کا نتیجہ ہے جس کا اہتمام رفیق صاحب نے کالج کی تاریخ کے ایک اہم موڑ پر بڑے مدبّرانہ طریقے سے کیا تھا۔

علوی صاحب

——— لیفٹیننٹ جنرل محمد اشرف

آکنلک ہاؤس کے پیچھے مہے گاؤں تک کھلا میدان تھا۔ کھیت تھے۔ ہم آکیز کبھی کبھی چھٹی کے دن ادھر آؤٹنگ کے لیے نکل جایا کرتے تھے۔ ایک روز ہم مہے گاؤں کے پاس سے گزر رہے تھے تو گاؤں کے چند لڑکوں نے کبڈی کے لیے چیلنج کیا۔ ہم نے چیلنج منظور کیا لیکن یہ کہا ”آج نہیں کل آپ بھی اپنی تیاری کر لیں ہم بھی کر لیں گے“۔ چنانچہ دوسرے روز یہ معرکہ ہوا اور ان کو بُری طرح سے ہرایا لیکن وہ لڑکے ہار نہیں مانے اور لڑنے پر اتر آئے۔ مجبوراً ان کی تواضع کرنی پڑی۔ دوسرے روز ان لوگوں نے کالج آکر رپورٹ کی اور چند دوسرے جھوٹے الزام بھی لگائے۔ تفتیش کے لیے کیس بالآخر آکنلک ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر مسٹر علوی تک پہنچا۔ انہوں نے ہاؤس میں پوچھ گچھ شروع کی تو میں نے ان سے عرض کیا "سر، پارٹی کا سرغنہ میں تھا۔ یہ دوسرے لڑکے تھے اور اصل واقعہ یہ ہے کہ (کرنل فیق کا آنر سسٹم شروع ہو چکا تھا) جب میں واقعہ بیان کر رہا تھا تو وہ غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

Is it the whole truth

Yes Sir, it is !

”مار کھائی یا مارا؟“

ظاہر ہے کہ پٹائی کی تھی تبھی تو وہ شکایت لے کر آئے“۔ ٹھیک ہے لیکن اس قسم کی معرکہ آرائی میں اپنا وقت اور توانائی ضائع کرنے کا فائدہ تم جا سکتے ہو۔

— وہ بڑے Mature ہاؤس ماسٹر تھے۔ آکنلک ہاؤس سینئر ہاؤس تھا۔ جب بھی کوئی ڈسپلن کا مسئلہ کھڑا ہوتا وہ اسے ایک عام انسٹرکٹر کی طرح نہیں ایک تجربہ کار ماہر تعلیم استاد کی طرح حل کرتے تھے۔

جناب سعید راشد صاحب اور کتاب کے بارے میں

فروری ۱۹۸۸ کو جناب عین الدین علوی صاحب تھوڑی سی علالت کے بعد اپنے مالک حقیقی سے جا ملے تو سعید راشد صاحب کو احساس ہوا کہ وہ میدان عمل میں اکیلے رہ گئے ہیں۔ ایک رفیق اور ہمدم کا اسطرح چلے جانا راشد صاحب کی زندگی میں ہیجان بپا کر گیا۔ ابھی وہ اپنی رفیقہ حیات کے غم کو بھلا بھی نہ پائے تھے کہ رفاقت کے ایک اور غم کا پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑا لیکن قلم نے پھر سہارا دیا اور قلم کی ایک ہی جنبش کے ساتھ نذرانۂ عقیدت کے طور پر "علوی نامہ" لکھ ڈالا۔ بس یہی "چراغوں کی قطار" کا آغاز تھا تاکہ علوی صاحب جیسے روشنی کے مینار سے بھٹکے ہوئے اپنا راستہ تلاش کر سکیں۔

"چراغوں کی قطار" قلم کی زد سے باہر نکلی تو میرے سپرد کر دی گئی۔ اس طرح یہ کتاب جہلم سے لاہور کی مسافت طے کرتی ہوئی اپنے آخری مراحل میں داخل ہوئی جسمیں کتابت پروف ریڈنگ تصیحات پرنٹنگ وغیرہ سب ہی شامل تھے۔ کاتب اسلم چیلیانوالہ نے کتابت کی۔ آخری منازل جسمیں تصیحات بھی شامل ہیں کچھ ناگزیر وجوہ کی بناء پر اپنی رفاقت برقرار نہ رکھ سکا اور پھر میری اپنی بے ہنگم زندگی کی وجہ سے کتاب قارئین تک وقت پر نہ پہنچ سکی جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ پروف ریڈر اشفاق انور

صاحب نے اپنے کام کو خوب نبھایا جو قابل ستائش ہے۔ "نیا پیام پرنٹرز" نے آگے بڑھ کر کتاب کو قارئین تک پہنچانے میں مدد کی جو لائق تحسین ہے۔

یوں تو راشد صاحب نے تقریباً ۲۱ کتابیں لکھ ڈالیں لیکن یہ کتاب اپنی نوعیت میں یکتا ہے۔ سعید راشد صاحب کی ہر کتاب کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد ہے "پاکستانیت کا فروغ"۔ بس اسی مقصد کے حصول کے لئے سعید راشد صاحب کا نہ تھکنے والا قلم ان شخصیات کے بارے میں چلتا رہا۔ جو غالباً عام فہم میں ایسے انسان تھے جو آئے اور چلے گئے لیکن پاکستان کی پاک سرزمین پر انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔ انہیں راشد صاحب کی آنکھ ہی دیکھ سکتی تھی چنانچہ اس حقیقت کی تلاش کا کام سعید راشد صاحب نے اپنے ذمہ لے لیا جو ہمالیہ کو سر کرنے سے کم نہ تھا۔ نمعلوم کتنی سردی کی راتوں کو سعید راشد صاحب کے قلم کی رفتار نے گرم کئے رکھا اور کتنے ہی گرمی کے دن اور وہ بھی جہلم کے، ان کے قلم کی سیاہی سے ٹھنڈے ہوتے رہے۔ کہاں کہاں نہیں گئے۔ کس کس کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔ ایک استاد کی حیثیت سے اپنے پرانے شاگردوں اور رفقاء کی یادوں کے دریچے کھولے تاکہ ان سے گزر کر آنیوالی روشنی کو ہم سب تک پہنچایا جا سکے۔ اساتذہ کا کھلی کتاب کی طرح پیش کیا جانا اور ان کے کردار کی وہ جھلکیاں جو فی زمانہ ناپید ہو کر رہ گئی ہیں اس طرح بیان کرنا کہ وہ آنیوالی نسلوں کے لئے مشعل راہ بنیں راشد صاحب ہی کا کمال ہو سکتا ہے۔ اسی لئے اس کتاب کا نام "چراغوں کی قطار" رکھا گیا ہے۔ تاکہ اسے پڑھنے والا روشنی حاصل کر سکے اور روشنی کی کسے ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ ملکہ بھی راشد صاحب ہی کو حاصل ہے کہ وہ تاریخ کو ایک انوکھے انداز میں قلم بند کرتے ہیں اور اسے ادب کی چاشنی سے اور بھی مزیدار بنا دیتے ہیں۔ ادب قیود اور حدود کی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔ بابا بلھے شاہ کا کلام، شیکسپیئر، جوش ملیح آبادی، غالب، ملٹن، بائرن، کیٹس کے شہ پارے، اقبال کا آفاقی پیغام اور نہ جانے کہاں کہاں کی کٹھ مٹھ نے اس کتاب کو اور ہی جاذب نظر و شوق بنا دیا ہے۔ جزاک اللہ۔

خدا کی ذات کو پہچاننے کے لئے ریاض کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ نمعلوم کتنے نروان کی نذر ہو گئے اور پھر بھی اسکی ذات کو نہ پہنچ سکے لیکن سعید راشد صاحب کی زندگی میں ذرا جھانکیں تو احساس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر سانس خدا کی مخلوق سے پیار اور اس کی خدمت میں گزرا بقول سعید راشد صاحب کے "مجھے ہر انسان میں اور خاص کر

اس معصوم بچے میں خدا نظر آتا ہے جو اپنے والدین کو چھوڑ کر حصول تعلیم کے لئے کوسوں دور ملٹری کالج آتا ہے"۔ چنانچہ اپنے رب کی خوشی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اسی مقولے کو اپنایا اور نبھایا "جگ راضی تو رب راضی"۔ اس طرح راشد صاحب کو ہم سب میں خدا نظر آیا ہے۔

کالج چھوڑنے کے چند سال بعد جب میں شاید کیپٹن تھا سعید راشد صاحب کے نیاز حاصل کرنے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہیں اسی طرح پایا جسطرح وہ میری طالب علمی کے زمانہ میں تھے۔ مادیت کے اس دور سے متاثر ہو کر میں نے گستاخی کی اور عرض کیا کہ یہ سادگی اور خلوص صرف ABSTRACT چیزیں ہیں۔ آپ طالب علم اور اس کے والدین کو اپنے خلوص کی خالی خولی پڑیا تو پکڑا دیتے ہیں لیکن آپ اپنے لئے کسی سے بھی کچھ حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔ راشد صاحب نے نہایت ہی شفقت سے میری بات کاٹی اور کہنے لگے "جسے آپ Abstract کہہ رہے ہیں اسی کی ہم سب کو ضرورت ہے باقی تو سب سراب ہے یعنی نظر کا دھوکہ۔ میں صرف اپنے رب سے مانگتا ہوں جب مانگتا ہوں اور جو مانگتا ہوں مل جاتا ہے"۔ اور واقعی راشد صاحب نے اپنے تمام معاملات خدا کے سپرد کئے رکھے۔ اور میدان عمل میں اپنا چراغ نہایت ہی نا مساعد حالات زندگی کی اونچ نیچ کی آندھیوں کے باوجود جلائے رکھا سفید پوشی جو غالباً ہر بے لوث اور جذبۂ خدمت سے سرشار معلم کا عموماً مقدر ہوتی ہے اپنا طرۂ امتیاز بنائے رکھا اور اسی تھوڑے میں نہ صرف بیگم اور چھ بچوں کا پیٹ پالا بلکہ ہم طالب علموں کو کالج کے زمانہ میں اور بعد میں ہماری بیگمات اور بچوں کو بھی نوازتے رہے۔ جب بھی جہلم سے گزرنے اور کالج جانے کا اتفاق ہوا تو وہ راشد صاحب کے دستر خوان سے سیر ہو کر اٹھا اس میں راشد صاحب کی مرحومہ بیگم جو جگ کی آنٹی تھیں برابر کی شریک تھیں خدا ان کی مغفرت کرے۔ جب خدائے برتر آسانیاں پیدا کرتا ہے تو پھر جوڑے بھی اسی طرح بنا دیتا ہے سبحان اللہ۔

کالج کی تاریخ سینوں میں دفن ہوتی چلی جا رہی تھی اور وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور بیسویں صدی اپنے آخری پندرھواڑے میں داخل ہو چکی تھی۔ عالمگیرینز ایسوسی ایشن نے محسوس کیا کہ کالج کی تاریخ کو قلم بند کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ کہنے کو تو سب کام ہی آسان ہوتے ہیں لیکن جب ان کی تکمیل کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے تو پھر پتہ چلتا ہے کہ "آئس برگ" کتنا پانی کے نیچے ہے۔ اس "آئس برگ" کو اٹھانے کی اگر کسی میں طاقت

تھی تو وہ راشد صاحب ہی کے بازو تھے۔

جنہیں نان جویں بخشی ہے تو نے
انہیں بازوئے حیدر بھی عطا کر

چنانچہ راشد صاحب کی رات دن کی انتھک محنت ہر عالمگیرین کے گھر میں داستان علم و عمل کے روپ میں اپنی پوری آب و تاب سے آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ بنی ہوئی ہے لیکن راشد صاحب کی طبیعت میں چین و قرار کہاں ایک چیلنج سے نبرد آزما ہو کر سرخرو ہوئے تو دوسرے چیلنج کی تیاری میں لگ گئے اور وہ بھی از خود ابھی داستان علم و عمل پریس میں بھی نہیں پہنچی تھی کہ "چراغوں کی قطار" پر انہوں نے راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر لیا اور تو اور مجھ جیسے ناتواں کے کاندھوں پر بھی بوجھ شاید اس لئے ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ دیکھ سکیں کہ کہیں ان کی تربیت میں کوئی کمی کا عنصر تو نہیں رہ گیا اور اس طرح وہ خود تو ایک امتحان سے دوچار ہوئے سو ہوئے لیکن اپنے پر جو بیتی وہ شاید میں یا میرا خدا ہی جانتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ جہاں میں سرفراز ہوا وہاں میں نے اور مجھ جیسے سینکڑوں طالب علموں نے راشد صاحب کا دِیا ہر حال میں روشن کئے رکھا جو ان کے لئے باعث راحت و اطمینان ہے۔ میں نے ایک دن ڈرتے ڈرتے مؤدبانہ انداز میں گزارش کر ڈالی " سر آپ اتنا کچھ لکھ ڈالتے ہیں ان کتابوں کو کون پڑھیگا کس کے پاس اتنا وقت ہے" جواب ملا " میرا قلم اور اس کی سیاہی میرا علم اور اس کی آگہی بلکہ ہر وہ چیز جس سے میں وابستہ ہوں یا وہ مجھ سے وابستہ ہے اسکی پہچان صرف اور صرف پاکستان ہے اسی لئے میری ہر تحریر پاکستانیت کے فروغ کے لئے وقف ہے۔ میں اگر زندہ ہوں تو پاکستانیت کے لئے اور انشاء اللہ خاتمہ بالخیر بھی پاکستانیت پر ہی ہو گا"۔ بس آپکا پاکستانیت پر غیر متزلزل یقین ہی وہ نکتہ ہے جو آپ کی زندگی کا محور ہے۔

عجب اتفاق ہے کہ ایک درویش صفت انسان جب ایسے کاموں کا بیڑا اٹھاتا ہے جنکی پہچان ہی پاکستانیت ہے تو اس کے لئے وسائل بھی خدا تعالی کی ذات خود بخود اسی طرح فراہم کرتی ہے کہ آج کی دنیا میں بھی کرشمہ دکھائی دینے لگتے ہیں۔ پاکستان کا دنیا کے نقشہ پر ابھرنا ایک کرشمہ سے کم نہ تھا قائم و دائم رہنے والا پاکستان راشد صاحب جیسے سپوتوں کی خدمات کو کبھی نہ بھلا سکے گا اور ان کے روپ میں پاکستانیت ہمیشہ ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیگی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیس بائیس کتابوں کا مصنف اور سفید

پوشی۔ جی ہاں یہ بھی راشد صاحب کا ہی طرہ امتیاز ہے کہ ناشرین اور پرنٹرز اور پبلشرز ان کی کمائی پر کمال مہربانی سے ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ مجھ جیسے کسی طالب علم نے گزارش کی کہ یہ سراسر زیادتی ہے اور اس کا ازالہ ہونا چاہئیے ان کے خلاف کیس کر دیں۔ کہنے لگے "کیس کرنے سے ان کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچے گی جو مجھے گوارا نہیں میرا گزارہ الحمدللہ ہو رہا ہے بس اتنا ہی تو چاہئیے کہ بغیر کسی کا محتاج ہوئے زندہ رہ سکوں اور وہ اللہ تعالی کی خاص کرم نوازی سے مجھے حاصل ہے شکر ہے رب جلیل کا۔"

یہ خدائے بزرگ و برتر کا خاص انعام ہے کہ وہ ریٹائر ہوتے ہوئے بھی ریٹائر نہیں ہوئے بلکہ کالج کی ۳۸ سالہ رفاقت کے بعد وہ ایک دن کے لئے بھی تو فارغ نہیں بیٹھے اور انہیں آرمی کینٹ پبلک سکول جہلم میں بطور پرنسپل جوان کے شایان شان عہدہ ہو سکتا تھا مل گیا چنانچہ اب وہ ایک نئے چیلنج سے بخوبی واحسن عہدہ برا ہو رہے ہیں۔

خدا کی خاص عنایت و کرم ہے کہ ریٹائرمنٹ کے وقت وہ اپنی ذمہ داریوں سے بھی سبکدوش ہوئے یعنی تین بیٹیاں ڈاکٹری سے فارغ التحصیل ہو کر ماشاء اللہ اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں چوتھی ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں اور جسمانی معذوری کے باوجود اپنے ابو کی خدمت میں جنت کما رہی ہیں۔ بڑے بیٹے مسعود انجینئرنگ کی تعلیم کے آخری مراحل امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں طے کر رہے ہیں جبکہ سب سے چھوٹے بیٹے اپنی جسمانی معذوری کے باوجود خود ایک روشنی کا مینار ہیں اور ایف سی کالج میں چوتھے سال یعنی بی اے فائنل کرنے کو ہیں اور ساتھ ہی ساتھ راولپنڈی میں ایک گھر کے مالک بھی ہو گئے۔ یہ گھر جس طرح بنا وہ خود کرشمہ سے کم نہیں اس لئے کہ جس شخص کو سوائے اپنے فرائض کی ادائیگی کے،، گھر کے بیڈ روم کے سوئچ تک کا پتہ نہ تھا اس کے لئے گھر بنانے کے مراحل کجا!!!

یہ ہیں وہ ذمہ داریاں جنہیں خدا نے صرف اس لئے اپنے ذمہ لے لیا کہ راشد صاحب نے اپنی ذات سے بے نیاز ہو کر اس کی مخلوق کی بے لوث خدمت کی اور اسی بناء پر میں انہیں (Favoured Child of God) کہتا ہوں۔

ع۔ جس کا عمل ہے بے غرض اسکی جزا کچھ اور ہے

کرنل سلطان حیدر



"چراغوں کی قطار" عقیدت کی دیوالی ہے اِس کتاب میں ملٹری کالج جہلم کے اساتذہ کے احوال ہیں۔ یہ وُہ اساتذہ ہیں جن کی تربیت نے اس کالج کے طلبہ کو آگے چل کے فقط اعلیٰ فوجی افسر ہی نہیں بنایا بھلا انسان بھی بنایا، وُہ انسان جو غیرت، محنت، ایثار، اخلاص اور ایمان کے باب میں دوسروں کے لیے روشن مثال ہو، جبھی تو چراغ سے چراغ جلتا ہے اور چراغوں کی قطار وجود میں آئی ہے"

پروفیسر محمد منور
ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور